جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا.

ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی، کیمونسٹ، سوشلسٹ اور دیگر کفار
کے اسلام پر اعتراضات کے مسکت اور مدلل جوابات

دفاعِ اسلام

اسلام پر کفار کے اعتراضات اور اُن کے جوابات

حسب الارشاد
شیخ حرم حضرت محمد مکی حجازی دامت برکاتہم

تالیف
مولانا اِمداد اللہ انور

دارُ المعارف ملتان

جَآءَ الحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔
ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی، کیمونسٹ، سوشلسٹ اور دیگر کفار
کے اسلام پر اعتراضات کے مسکت اور مدلل جوابات
دفاعِ اسلام
حسب الارشاد
شیخ حرم حضرت مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
تالیف
مولانا اِمداد اللہ انور
اُستاذ جامعہ قاسم العُلوم، مُلتان
سابق مُعین التحقیق مفتی جمیل احمد تھانوی جامعہ اشرفیہ لاہور
دارُالمعارف
عنایت پور، تحصیل جلالپور پیر والا، مُلتان
رابطہ نمبر: 0300-6351350=0614012566

ملنے کے پتے

مولانا مفتی محمد امداد اللہ انور جامعہ قاسم العلوم کچہری روڈ ملتان

رابطہ نمبر: 0300-6351350=061-4012566

مکتبہ رحمانیہ اقرأ سنٹر اردو بازار لاہور	نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی
مکتبۃ العلم اردو بازار لاہور	بیت القرآن اردو بازار کراچی
صابر حسین شمع بک ایجنسی اردو بازار لاہور	اسلامی کتب خانہ بنوری ٹاؤن کراچی
مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور	مکتبہ رشیدیہ اردو بازار کراچی
مکتبہ سلطان عالمگیر اردو بازار لاہور	مکتبۃ الاحمد ڈیرہ اسماعیل خان
ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور	مکتبہ فریدیہ جامعہ فریدیہ E/7-اسلام آباد
بک لینڈ اردو بازار لاہور	مکتبہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
اسلامی کتب خانہ اردو بازار لاہور	مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ
مولانا اقبال نعمانی سابقہ طاہر نیوز پیپر صدر کراچی	مکتبہ عارفی جامعہ امدادیہ ستیانہ روڈ فیصل آباد
مظہری کتب خانہ 'گلشن اقبال' کراچی	مکتبہ مدینہ بیرون مرکز رائے ونڈ
مکتبہ زکریا بنوری ٹاؤن کراچی	مدرسہ نصرت العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ
مکتبہ النور بیرون تبلیغی مسجد رائے ونڈ	مکتبہ رشیدیہ نزد جامعہ رشیدیہ ساہیوال
قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی	ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان
اسلامی کتب خانہ بنوری ٹاؤن کراچی	مکتبہ امدادیہ نزد خیر المدارس ملتان
دارالاشاعت اردو بازار کراچی	ادارہ اشاعت الخیر بوہڑ گیٹ ملتان
ادارۃ المعارف دار العلوم کراچی ۱۴	یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور
ملک سنز کارخانہ بازار فیصل آباد	مکتبہ حقانیہ نزد خیر المدارس ملتان
مکتبہ علمیہ سلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی	مکتبہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

اور ملک کے سب چھوٹے بڑے دینی کتب خانے

نام کتاب : دفاعِ اسلام (اسلام پر کفار کے اعتراضات کے جوابات)

تالیف : مفتی محمد امداد اللہ انور دامت برکاتہم
رئیس التحقیق والتصنیف دار المعارف ملتان
استاذ تخصص فی الفقہ جامعہ قاسم العلوم ملتان
سابق معین التحقیق، مفتی جمیل احمد تھانوی جامعہ اشرفیہ لاہور
خلیفہ مجاز حضرت سید نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ

حسب فرمائش فضیلۃ الشیخ حضرت مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
کاپی رائٹ رجسٹریشن نمبر

ناشر : مولانا امداد اللہ انور دار المعارف ملتان

فون نمبرز : 0300-6351350=061-4012566

اشاعت اول : جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ بمطابق اپریل ۲۰۱۳ء

صفحات : 976

ہدیہ : =/ روپے

فہرست عنوانات

ذات باری تعالیٰ کے متعلق اعتراضات کے جوابات

تخلیق کائنات
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

ملائکہ وشیاطین
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

انبیاء کرامؑ
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق اعتراضات کے جوابات

معجزات رسول اکرم ﷺ کے متعلق اعتراضات کے جوابات

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

قرآن پاک
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

حدیث شریف
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

مذہب اسلام
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

عبادات اسلامیہ
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

ذبائح اور قربانی کے متعلق اعتراضات کے جوابات

جہادِ اسلام کے متعلق اعتراضات کے جوابات

تعدد ازواج
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

خواتین کے حقوق
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

اسلامی سزاؤں کے متعلق اعتراضات کے جوابات

توبہ واستغفار کے متعلق اعتراضات کے جوابات

عالم برزخ (قبر) کے متعلق اعتراضات کے جوابات

قیامت
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

جنت۔ جہنم
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

متفرق مسائل کے متعلق اعتراضات کے جوابات

الحمد لله رب العالمين واشهد ان لا اله الا الله الملک الحق المبین واشهد ان سیدنا و مولانا محمدا عبده ورسوله سید الاولین والآخرین، اللهم فصل وسلم علیه وعلی سائر الانبیاء والمرسلین وعلی آلهم وصحبهم اجمعین، صلوة وسلامادائمین متلازمین ابدالآبدین آمین.

اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت اور عبادت کے لئے انسان و جنات کو پیدا کیا اور ان کی صحیح رہنمائی کیلئے انبیاء کرامؑ اور رسل عظام کا سلسلہ قائم کیا اور ان کو اتنی شان و عظمت عطاء کی کہ وہ وحی الٰہی جناب باری تعالیٰ سے حاصل کر کے اپنی اپنی امتوں کو پہنچا سکیں اس سلسلہ کی ابتداء سیدنا آدم علیہ السلام سے شروع ہوئی اور اختتام سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات گرامی پر ہوا۔

ان سب انبیاء و رسل نے تبلیغ و رسالت کے فرائض بخوبی مکمل طور پر ادا کئے کسی نے بھی اپنے فرض منصبی سے ذرا بھی کوتاہی نہیں فرمائی۔ یہ سب ایک سلسلہ ہدایت تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

کان الناس امة واحدة

ان کے عقائد توحید وصفات باری تعالیٰ وغیرہ میں کوئی فرق نہیں تھا سب اللہ کی تمام صفات کو اور اس کی توحید کو تسلیم کرتے تھے اور اسی کی طرف دعوت دیتے تھے، سب کا تمام انبیاءؑ اور تمام کتب آسمانی پر فرشتوں پر، قیامت پر، مرنے کے بعد دوبارہ

زندہ ہونے پر حساب و کتاب پر، جنت و جہنم وغیرہ کے حق ہونے پر سب پر ایمان و اعتقاد تھا اور انہی کی طرف اپنی امتوں کو دعوت دیتے رہے ان کی شریعتوں میں حسب زمانہ بعض مسائل میں اختلاف کے احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے تھے۔

فرقوں کی ابتداء

نہایت افسوس کا مقام یہ ہے کہ ان انبیاءؑ کے بعض پیروکار اپنے نبی کی شریعت و احکام کو ماننے کے بعد اگر ان کے پاس کوئی نیا سچا نبی مبعوث ہوا تو اس کا انکار کر دیا جیسے یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد کے بہت سے پیغمبروں کو مانتے ہیں۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو نہیں مانتے اور نہ ان کے شرعی احکام کو مانتے ہیں۔

اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک سب انبیاء و رسولوں کو مانتے ہیں مگر آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے۔

اس طرح سے ایک فرقہ یہودی بن گیا اور ایک عیسائی۔

اسی طرح سے ہندوستان اور چین کے علاقوں میں بھی اللہ کے پیغمبر آتے تھے **ان من قریة الا خلا فیها نذیر** مگر وہاں کے رہنے والوں نے بھی ان کی صحیح تعلیمات کو مسخ کر دیا، جس طرح سے یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو مسخ کر دیا۔

اسی طرح سے مسلمانوں کے سوا دنیا میں جتنے فرقے بھی آسمانی مذاہب کے قائل ہیں کوئی بھی صحیح مذہب پر قائم نہیں ہے اپنے اپنے مذاہب میں تحریف و تغیر کر کے صحیح طریقہ سے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور اس کو قبول ہے ہٹے ہوئے ہیں۔ خصوصاً ہندوؤں اور بدھوں نے جتنا اپنے مذاہب کو مسخ کیا ان کی کتابوں میں تلاش کرنے سے صحیح آسمانی تعلیمات کا اتہ پتہ نہیں سوائے بعض کھنڈرات کے جو صرف اتنا بتا رہے

ہیں کہ ان کی بعض باتیں درست ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ان کو اس کتاب میں ہندوؤں کے اعتراضات کے جوابات میں اسلامی مؤقف کی تائید میں پیش کیا ہے۔ ان منقولہ حوالوں میں اس کا بھی قوی امکان ہے کہ باتیں ان کی کتابوں سے مصنفین کی اپنی گھڑی ہوئی یا کسی آسمانی مذہب سے نقل کی گئی ہوں۔

لا مذہب لوگ

یہ تو مذہب کو ماننے والوں کی حالت ہے لوگوں کی ایک قسم یہ ہے کہ وہ کسی مذہب کو نہیں مانتے اور بے دینی کی زندگی گزار رہے ہیں ان کو کوئی علم نہیں کہ ان کو کوئی پیدا کرنے والی ہستی ہے، انہوں نے مرنے کے بعد جینا ہے، حساب وکتاب ہوگا سزا میں جہنم یا انعام میں جنت میں جانا ہوگا یہ جانوروں جیسی زندگی گزارتے ہیں اگر کبھی اسلام کی کوئی بات سن لیتے ہیں تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اعتراض کرتے ہیں۔

اور بعض لوگ مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں اس کے بعد ان کا انکار کر دیتے ہیں خدا کا بھی انکار مذہب کا بھی انکار ایسے لوگ دہریہ کہلاتے ہیں یہ ہر بات میں عقل کو مدار و معیار بناتے ہیں۔

ماڈریٹ طبقہ

اس جدید زمانہ میں مذہب کے ماننے والوں میں ایک قسم ان لوگوں کی موجود ہے جو اپنی جہالت سے اسلام کے مسائل پر اعتراض کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں جو مسئلہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا وہ علماء کی اختراع ہے قرآن وحدیث میں نہیں ہے۔

اور بعض ایسے جاہل بھی ہیں جو قرآن وحدیث کا مطالعہ کرتے ہیں اور جو باتیں ان کی عقل میں نہیں آتیں ان کی من مانی تشریحات وتحریفات کرتے ہیں اور اسلام کی مسلمہ تشریحات کا انکار کر دیتے ہیں۔ جیسے سرسید اور منکرین حدیث اور جاوید غامدی وغیرہ۔

اکابر کی تالیفات

اکابر علماء اسلام نے اسلام کے دفاع میں غیر مسلموں کے اعتراضات کے رد پر اپنے اپنے زمانہ میں خوب محنت کی ہے اور مسلمانوں کے ایمان کو سنبھالا ہے۔
مثلاً ان کے اعتراضات کے جوابات میں درج کتابیں تالیف کی گئیں۔

کتب رد اعتراضاتِ یہود و نصاریٰ

(۱) الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح (چار جلد عربی) علامہ ابن تیمیہ۔
(۲) ھدایۃ الحیاری فی اجوبۃ الیھود و النصاری عربی حافظ ابن القیم۔
(۳) الاجوبۃ الفاخرۃ فی الرد علی الاسئلۃ الفاجرۃ للملۃ الکافرۃ (عربی) مؤلفہ علامہ شہاب الدین احمد بن ادریس مالکی المعروف امام قرافی۔
(۴) الجواب الفسیح لما لفقہ عبدالمسیح مؤلفہ نعمان بن محمود (ابن الآلوسی) ۱۳۱۷ھ۔
(۵) ازالۃ الشکوک (اردو ۲ جلد) علامہ رحمت اللہ کیرانویؒ۔
(۶) ازالۃ الاوہام (فارسی) علامہ رحمت اللہ کیرانویؒ۔
(۷) جواب مسلم (اردو) مولانا بشیر احمد حسینی دامت برکاتہم۔

کتب رد اعتراضاتِ ہنود

(۱) انتصار الاسلام، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔
(۲) تقریر دل پذیر، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔
(۳) تحفہ لحمیہ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔
(۴) مباحثہ شاہ جہاں پور، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔
(۵) میلہ خدا شناسی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔
(۶) حجۃ الاسلام، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔

(۷) قبلہ نما، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔

(۸) سوط اللہ الجبار علی متن الکفار (جلد اول فارسی، جلد دوم وسوم قدیم اردو) مؤلفہ حضرت مولانا محمد علی بچھرایونیؒ) مطبوعہ ۱۲۸۵ھ۔

(۹) حق پرکاش در جواب ستیارتھ پرکاش، مولانا ثناء اللہ امرتسری۔

(۱۰) مقدس رسول، مولانا ثناء اللہ امرتسری۔

(۱۱) اشرف الجواب، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ (متفرق اعتراضات کے جواب میں)۔

کتاب ہذا ''دفاع اسلام'' کی اہمیت

اکابر اسلاف نے اپنے زمانہ میں تمام باطل فرقوں اور عقیدوں کا رد بھی کیا اور ان کی طرف سے اسلام پر کیئے گئے اعتراضات کے جواب بھی دیئے۔ زبانی بھی اور تالیفات کی شکل میں بھی، لیکن ان کا زیادہ تر رد کا مواد کسی نہ کسی ایک فرقہ کے اعتراضات کے جواب میں ہے۔

اس وقت چونکہ نشر واشاعت کے وسائل بھی عام ہیں اور پڑھنے والے بھی مختصر وقت میں زیادہ زیادہ فرقوں کے اعتراضات و جوابات پڑھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ناچیز نے زیادہ تر اکابر علماء اسلام کی متفرق کتب سے کفار وغیرہ کے اعتراضات و جوابات نقل کیئے ہیں اور تقریبا دنیا کے مشہور ادیاں یہودی، عیسائی، ہندو اور دہریوں، نیز منکرین حدیث، اور نیچری مذہب کے لوگوں کے اہم اہم اعتراضات، مختلف کتب سے اور خود ان کی اپنی کتب سے تحقیقی اور الزامی ہر طرح پر جمع کردیئے ہیں امید ہے کہ اب معترضین کے اہم اعتراضات کے جوابات مفصل اور مدلل صورت میں اس مجموعہ میں شامل ہیں زیادہ فرصت نہ ہونے کی وجہ سے انہیں اعتراضات و جوابات پر اکتفاء کیا ہے۔

اللہ کرے یہ کتاب مسلمانوں کیلئے ایمان کے اضافہ کا اور منکرین کیلئے ایمان قبول کرنے کا بہترین ذریعہ بنے، اور ناچیز مؤلف کیلئے قبولیت کا سبب ہو۔

انتساب

میں اس کتاب کا انتساب عالم اسلام کی بزرگ ہستی مدرس حرم بیت اللہ مکہ معظمہ حضرت العلام شیخ التفسیر والحدیث حضرت محمد مکی حجازی حفظہ اللہ ورعاہ کے نام کرتا ہوں۔ جن کی آواز حق کے زمزمے بیت اللہ شریف میں گونجتے ہیں اور دنیا کے اطراف واکناف سے مسلمان حج بیت اللہ اور عمرہ شریف کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے احقاق حق اور ابطال باطل کے مدلل اور مسکت طرز تبلیغ کو نہایت شیریں انداز سے سماعت فرماتے ہیں اور اپنے عقائد کی تصحیح اور اعتراضات و شبہات کے تسلی بخش جوابات سے اپنے دلوں کی تسکین حاصل کرتے ہیں۔

سبب تالیف

یہ کتاب ''دفاع اسلام'' درحقیقت انہی کے ارشاد کے مطابق تحریر کی گئی ہے حضرت اقدس دام مجدہم العالی نے ارشاد فرمایا ہے کہ

معترضین اسلام کے اعتراضات جمع کر کے ان کے جوابات تحریر کریں۔ تاکہ مسلمان مخالفین اسلام کے پیدا کردہ شکوک و شبہات سے بچ سکیں اور ان سے اسلام کا دفاع کر سکیں۔

حضرت مولانا محمد مکی حجازی اس کام کو اس دور کی اہم ترین ضرورت سمجھتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جب اسلام بڑی آسانی اور کثرت سے کفار کے گھروں میں داخل ہو رہا ہے اور ہر دن بے شمار کافر حلقہ بگوش اسلام ہو رہے ہیں تو اسلام کے بارہ میں پیدا کئے جانے والے شکوک و شبہات کا رد اور جواب بھی وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خدمت تمام امت مسلمہ کی طرف سے ترجمانی کر کے لکھی جا رہی ہے اس لئے ہم آج اس کتاب کی صورت میں امت کے اس مجموعی فرض سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔ اس لئے ہم اللہ تعالی سے سب مسلمانوں کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق اور کفار کیلئے اسلام قبول کرنے اور بہترین سبب بننے کی دعا کرتے ہیں۔

امداد اللہ انور

پہلا باب

ذات باری تعالیٰ کے متعلق اعتراضات کے جوابات
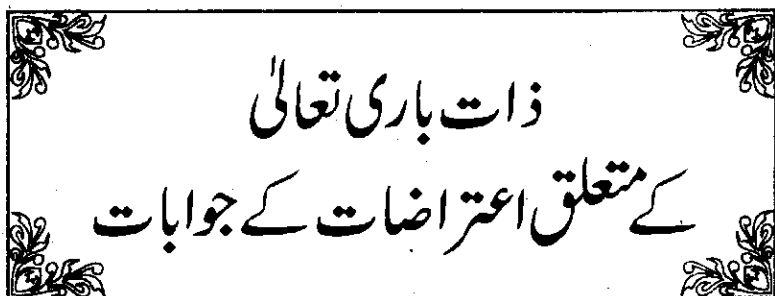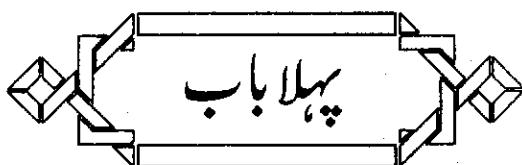
خالق کائنات کا ثبوت

اعتراض: (دہریوں کا اعتراض)

کائنات کے خالق کے وجود کی دلیل کیا ہے؟

جواب: حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

عقلی طریقہ پر وجود صانع کی دلیل یہ ہے کہ تمام عالم نو پیدا شدہ ہے کیونکہ بہت سی چیزوں کا ہمارے سامنے پیدا ہونا ہمیں نظر آتا ہے اور جن کا نظر نہیں آتا ان کے احوال کا تغیر و انقلاب بتلا رہا ہے کہ یہ نو پیدا شدہ ہیں۔

اخبار میں ایک امریکن ڈاکٹر یعنی ماہر سائنس کا قول چھپا ہے کہ آفتاب کی روشنی میں بہت کمی آ گئی ہے اور عنقریب اس کی روشنی زائل ہو کر یہ چراغ گل ہو جائے گا اور اس وقت دنیا میں اس قدر سردی پڑے گی کہ مخلوق کا زندہ رہنا محال ہے تمام عالم فنا ہو جائے گا۔

اس سے پہلے تو اہل سائنس کو قرآن سے قیامت کی خبر کا یقین نہیں ہوتا تھا اب سائنسی آلات سے یقین آنے لگا۔

بہر حال اشیاء عالم کا تغیر و انقلاب پتہ دے رہا ہے کہ یہ سب نو پیدا شدہ ہیں قدیم نہیں یعنی ان کا وجود دائمی اور ضروری نہیں اور نو پیدا شدہ چیز کے لئے ممکن ہونا لازم ہے اور ممکن کے لئے کسی مرجح کی ضرورت ہے کیونکہ ممکن وہ ہے جس کا وجود و عدم مساوی ہو یعنی نہ اس کے لئے موجود ہونا ضروری ہے اور نہ معدوم ہونا ضروری ہے اور جس کا وجود اور عدم وجود برابر ہو تو اس کے وجود کے لئے کوئی مرجح ہونا چاہئے ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی اور ترجیح بلا مرجح باطل ہے پھر اس مرجح میں گفتگو کی جائے گی کہ وہ ممکن ہے یا کچھ اور ہے اور اگر مرجح ممکن ہو تو اس کے لئے دوسرے

مرجح کی ضرورت ہوگی اور چونکہ تسلسل محال ہے اس لئے کہیں نہ کہیں سلسلہ ختم کرنا پڑے گا اور یہ ماننا پڑے گا کہ مرجح ایسی ذات ہے جو ممکن نہیں بلکہ واجب الوجود ہے اسی واجب الوجود کو ہم صانع اور خلاق عالم کہتے ہیں۔ (وعظ غایۃ النجاح ...... صفحہ ۲۰)

کیا خدا ہمہ دان نہیں

ترجمہ آیت: اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب سجدہ میں چلے گئے مگر شیطان اس نے نہ مانا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

(سورۂ بقرہ: آیت ۳۴)

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

اس سے ثابت ہوا کہ خدا ہمہ دان نہیں یعنی ماضی، حال، استقبال کی باتیں پورے طور پر نہیں جانتا۔ (پنڈت دیانند سرسوتی: ستیارتھ پرکاش)

جواب: مولانا ثناء اللہ امرتسری لکھتے ہیں:

پنڈت جی! کس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا کو علم نہیں اگر شیطان کے پیدا کرنے سے خدا بے علم ثابت ہوتا ہے تو پرمیشور نے جینیوں کو کیوں پیدا کیا جو بقول آپ کے بت پرستی کے بانی مبانی ہوئے جن کی بابت ستیارتھ پرکاش میں آپ لکھتے ہیں

مورتی پوجا کا جتنا جھگڑا چلا ہے وہ سب جینیوں کے گھر سے نکلا ہے اور پاکھنڈوں کی جڑ یہی جین مذہب ہے۔ (صفحہ ۵۸۴ سملاس ۱۲ نمبر ۱۱۹)

اور سنئے! خدا نے غازی محمود کو کیوں پیدا کیا جس نے آریہ ورت کی کایا پلٹ دی؟ اور بتلایئے ایشور نے پرانوں کے مصنفوں کو کیوں اپتن (پیدا) کیا جنہوں نے (بقول آپ کے) تمام پران گپوں سے بھر کر آریہ ورت کو گمراہ کر دیا؟

اور سنئے! خدا نے مسلمان کیوں بنائے کہ ویدک دھرم کا تمام تار پود ہی ٹوٹ گیا جب آپ ان سوالوں کا جواب دیں گے تو ہم بھی بتلا دیں گے کہ شیطان کو کیوں پیدا کیا؟

غور سے سنو!

مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ اِلَّا اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ.

﴿سورۃ ابراھیم:۲۲﴾

ترجمہ:- ''یعنی میرا تم پر زور نہ تھا میں نے صرف تم کو بلایا تھا تم نے قبول کر لیا۔''

جیسے دنیا میں اور بد صحبتیں ہوتی ہیں ایسی شیطان کی بھی ایک بد صحبت ہے اس سے زائد نہیں اس بد صحبت کے دفعیہ کے لئے خداوند تعالیٰ نے کئی ایک علاج بتلائے ہیں۔ بڑا مضبوط علاج جو واقعی مؤثر ہے ذکر الٰہی ہے چنانچہ قرآن شریف میں اس کا بھی ذکر ہے اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ. یعنی خدا کے نیک بندوں پر شیطان کا کوئی داؤ نہیں چل سکتا جو لوگ خدا تعالیٰ کے ذکر و شغل میں وقت گزارتے ہیں اور فضولیات سے پرہیز کرتے ہیں شیطان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہاں جو لوگ بیہودہ گوئی اور بد صحبتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں انہی پر شیطان بھی غلبہ پاتا ہے۔

(ستیارتھ صفحہ ۵۴۱ کو غور سے پڑھیں)

پس شیطان کی مثال بالکل زہر کی سی سمجھو۔ جیسا کہ خدا نے زہر پیدا کر کے اس کا علاج بھی بتا دیا ہے ایسا ہی شیطان پیدا کر کے اس کا اثر بتلا کر علاج (توبہ تائب اور اتباع انبیاء بھی) بتلا دیا۔

ہاں! یاد آیا کہ دنیا میں اس وقت کروڑوں مسلمان' کروڑوں عیسائی' بدھ' یہودی وغیرہ قومیں ایشور کے گیان (وید) کو نہیں مانتے بلکہ اس کو بت پرستی کا مخزن جانتے ہیں تو پرمیشور (خدا) کیسا عاجز ہے کہ ان کو سیدھا نہیں کر سکتا کیا اس کے جلال میں فرق تو نہیں آیا؟ (حق پرکاش صفحہ ۴۸، ۴۹)

اللہ کی بعض صفات جلالیہ پر اعتراض کا جواب

اعتراض: (عیسائیوں کی طرف سے)

''اللہ کے 99 نام اللہ کو **المتکبر** (غرور اور تکبر کرنے والا) **الجبار** (جبر کرنے والا) **القہار** (قہر کرنے والا) **الخافض** (نیچا دکھانے والا) **المذل** (ذلیل کرنے والا) **الممیت** (مارنے والا) **الموخر** (ہر ایک چیز کو دور رکھنے والا) **الضار** (دکھ اور مصیبت برپا کرنے والا) یہ نام ظاہر کرتے ہیں کہ اللہ کس طرح اس آسمانی خدا باپ سے مختلف ہے جو مسیح نے ظاہر کیا اور توریت میں خدا کو یوں ظاہر کیا گیا ہے کہ (خداوند' خداوند خدائے رحیم اور مہربان' قہر کرنے میں دھیما اور شفقت اور وفا میں غنی' ہزاروں پر فضل کرنے والا' گناہ اور تقصیر اور خطاء کا بخشنے والا لیکن وہ مجرم کو ہرگز بری نہ کرے گا''۔

جواب: مولانا بشیر احمد حسینی لکھتے ہیں:

اللہ رب العزت کے صفاتی اسماء مبارکہ کا صحیح مطلب ومفہوم

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان کے صحیح معنی یوں تحریر فرمائے ہیں:۔

''**المتکبر** 'اپنی بڑائی دکھانے والا' کبریائی والا' سخت سزا دینے والا''۔

(سیرت النبیؐ جلد چہارم تحت توحید صفحہ ۵۰۹)

''**الجبار** 'جبروت والا جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے''۔ (صفحہ ۵۰۹)

''**القہار** 'جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا' سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا'' (صفحہ ۵۰۹)

حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی بابت ارشاد فرمایا:

''**وَاَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ**'' (ال عمران: ۱۸۲)

(بے شک خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں)۔ نیز

''**اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ**'' (البقرۃ: ۱۴۳)

(بے شک اللہ لوگوں پر بہت شفیق نہایت مہربان ہے)۔

عیسائیوں کی الہامی کتاب بائبل میں بھی اللہ رب العزۃ کو قہار کہا گیا ہے۔ (ناحوم ۱:۲) اس سے یہ ظاہر ہوا کہ عیسائیوں کا اعتراض قرآن پاک پر نہیں بلکہ اپنی مذہبی کتاب پر ہے۔

''الخافض' نیچا کرنے والا۔ (صفحہ ۵۱۳) کفر اور اپنے باغی کو نیچا کرنے والا۔ ''المذل' ذلت دینے والا (صفحہ ۵۱۴) ''الممیت' مارنے والا (صفحہ ۵۱۳) ''المؤخر' جو سب سے پیچھے رہ جائے گا (صفحہ ۵۱۱) ''الضار' نقصان پہنچانے والا۔ (صفحہ ۵۱۳) معترض نے کچھ صفات الٰہیہ کے بارے میں لکھا ہے اس سے ان کا مطلب و مقصد یہ ہے کہ چونکہ ان صفات سے باری تعالیٰ کی طرف برائی کی نسبت پائی جاتی ہے اس لئے یہ صفات صحیح نہیں ہیں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ معترض صاحب اپنی بائبل سے بے خبر ہیں کیونکہ بائبل میں بھی یہ نسبتیں اللہ رب العزت کی طرف پائی جاتی ہیں چنانچہ ملاحظہ فرمایئے!

''تب خداوند نے اسے کہا کہ آدمی کا منہ کس نے بنایا ہے؟ اور کون گونگا یا بہرا یا بینا یا اندھا کرتا ہے؟ کیا میں ہی جو خداوند ہوں یہ نہیں کرتا؟'' (خروج ۴:۱۱)۔

اللہ پاک نے مندرجہ بالا تینوں کاموں کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے۔

''میں ہی روشنی کا موجد اور تاریکی کا خالق ہوں۔ میں سلامتی کا بانی اور بلا کو پیدا کرنے والا ہوں' میں ہی خداوند یہ سب کچھ کرنے والا ہوں''۔ (یسعیاہ ۴۵:۷)

''خداوند مارتا ہے اور جلاتا ہے وہی قبر میں اتارتا اور اس سے نکالتا ہے۔ خداوند مسکین کر دیتا ہے اور دولت مند بناتا ہے وہی پست کرتا اور سرفراز بھی کرتا ہے'' (اسموئیل ۲:۶'۷)

تینوں خط کشیدہ الفاظ میں انہی صفات الٰہیہ کا اظہار ہے جن پر اعتراض کیا گیا ہے۔

۱۔ ''الممیت'' ۲. المذل ۳. الخافض ''میں ہی مار ڈالتا اور میں ہی جلاتا ہوں۔ میں ہی زخمی کرتا اور میں ہی چنگا کرتا ہوں'' (استثنا ۳۲:۳۹)

''اور ان سب بلاؤں کے بارے میں جو خداوند نے اس پر نازل کی تھیں اسے

تسلی دی''۔(ایوب ۴۲:۱۱)

''اس نے عذاب کے فرشتوں کی فوج بھیج کر اپنے قہر کی شدت' غیض وغضب اور بلا کو ان پر نازل کیا''۔(زبور ۷۸:۴۹)

''کیونکہ میں بلا اور ہلاکت شدید کو شمال کی طرف سے لاتا ہوں''۔(یرمیاہ ۴:۶)

معترض نے اسی نسبت کی وجہ سے ہم اہل اسلام پر اعتراض کیا ہے جو خود بائبل میں برائی کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف نسبت پائی جاتی ہے۔

الغرض اسلامی صفات الٰہیہ پر اعتراض کرنا کسی مسیحی کو زیب نہیں دیتا۔

قرآن پاک اس بات کو یوں ارشاد فرماتا ہے کہ گو''حسنہ'' اور ''سیئہ'' دونوں باری تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔(النساء:۷۸) مگر جب انسان کو''حسنہ'' ملے تو اسے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے سمجھے اور جب اسے ''سیئہ'' ملے تو اسے اپنے نفس کی طرف سے جانے۔(النساء:۷۹)۔یہ مقام ادب ہے۔

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اسی بات کو یوں ظاہر فرمایا کہ: کھانے' پینے اور شفاء کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف اور بیماری کی نسبت اپنی طرف فرمائی (الشعراء:۷۹'۸۰)۔

سوال میں جو تورات سے صفات الٰہیہ تحریر کی گئی ہیں ان کا جواب یہ ہے کہ ہمارے قرآن سے شروع میں بسم اللہ شریف میں باری تعالیٰ کے دونوں صفاتی اسماء مبارکہ ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' موجود ہیں۔نیز حق سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ذات پاک کو''غفور رحیم'' قرار دیا اور اپنے عذاب کو اپنی ذات پاک نہیں فرمایا بلکہ عذاب کو اپنا فعل قرار دیا۔(الحجر ۴۹'۵۰) اس نرالے اور اچھوتے طرز بیان سے یہ ظاہر ہوا کہ اس کی ذات پاک ''غفور رحیم'' ہے۔عذاب اس کی ذات پاک نہیں بلکہ اس کا فعل ہے۔نیز باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس نے اپنی ذات پاک پر رحمت فرمانا فرض کر لیا ہے۔(الانعام ۱۲'۵۴) سارے قرآن مجید میں یہ کہیں نہیں فرمایا کہ ذات حق نے عذاب کرنا اپنے اوپر فرض کر لیا ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے ''غفور'' اور

''رحیم'' ہونے کا اس طرح بھی اظہار فرماتا ہے کہ:۔

"قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ط اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ." (زمر: ۵۳)

ترجمہ:۔ (اللہ کی طرف سے) کہہ دیجئے اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو بے شک اللہ سب گناہ بخش دے گا واقعی وہ گناہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔ (جواب مسلم ص ۱۲۸ تا ۱۳۱ ملخصاً)

کیا اللہ کو حضور ﷺ نے متعارف کروایا؟

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

''کیا واقعی محمد عربی ﷺ نے لفظ اللہ کو دنیا میں متعارف کروایا جبکہ محمد عربی کے اپنے والد کے نام (عبداللہ) میں اللہ کا نام تھا جس کا مطلب تھا کہ اللہ بت کا غلام''؟۔

جواب نمبر 1: ''واقعی نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو لفظ ''اللہ'' اور اللہ رب العزت کی ذات پاک کا صحیح معنوں میں تعارف کرایا چنانچہ جب مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی نسبت سوال کیا کہ وہ کیسا ہے؟ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی''۔

"قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ. اَللّٰهُ الصَّمَدُ. لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ. وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ." (سورۃ اخلاص)

(تفسیر) ''یعنی جو لوگ اللہ کی نسبت پوچھتے ہیں کہ وہ کیسا ہے؟ ان سے کہہ دیجئے وہ اللہ ایک ہے ﴿۱﴾ اللہ بے نیاز ہے ﴿۲﴾ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے ﴿۳﴾ اور اس کے برابر کا کوئی نہیں ﴿۴﴾

اس میں مجوس کے عقیدہ کا رد ہو گیا جو کہتے ہیں خالق دو ہیں۔ خیر کا خالق ''یزداں'' اور شر کا ''اہرمن''۔

نیز ہنود کی تردید ہوئی جو تینتیس کروڑ دیوتاؤں کو خدائی میں حصہ دار ٹھہراتے ہیں''۔

(فائدہ) یعنی نہ کوئی اس کی اولاد نہ وہ کسی کی اولاد اس میں ان لوگوں کا رد ہوا جو حضرت مسیح علیہ السلام کو یا حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا اور فرشتوں کو خدا مانتے ہیں ان کی تردید "لم یولد" میں کردی گئی یعنی خدا کی شان یہ ہے کہ اس کو کسی نے جنا نہ ہو اور ظاہر ہے حضرت مسیح ایک پاکباز عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے پھر وہ خدا کس طرح ہو سکتے ہیں؟" (تفسیر عثمانیؒ)

جواب (۲): عیسائی عبرانی بائبل میں الوہیم کا لفظ اڑھائی ہزار سے زیادہ مرتبہ آیا ہے جس کا ترجمہ عربی میں اللہ ہے اور اردو میں خدا۔ (امداد اللہ انور)

خود پادری برکت اللہ لکھتا ہے:

جو فیوض اہل عرب کو پہنچے وہ تاریخ کے ورقوں پر آب زر سے لکھے ہوئے ہیں۔ آپ نے عرب کے مختلف قبیلوں کو جو ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے ایک جماعت میں منظم کر دیا اور دشت عرب میں ایک ایسے مذہب کی بنیاد ڈالی جس نے عرب میں شرک اور کفر کا خاتمہ کر دیا اور میں مختلف ممالک میں پھیل گیا ہے اس مذہب کے پیروؤں کی تعداد کروڑوں پر مشتمل ہے پس ہر شخص کا فرض ہے کہ اس نامور ہستی کے سوانح حیات سے واقف ہو"۔ (محمد عربی صفحہ ۹)

مندرجہ بالا الفاظ کسی مسلمان کے نہیں بلکہ پادری برکت اللہ صاحب ایم۔ اے کے ہیں۔

قرآن سے خدا کا مجسم ہونا لازم آتا ہے

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

علی العرش استوی پر فرقۂ آریہ وغیرہا بہت کچھ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے خدا کا مجسم اور متمکن ہونا ثابت ہے جو اس کے تقدس کے خلاف ہے۔

جواب: مگراس گروہ نے اوران لوگوں نے کہ جن کی تقلید سے یہ اعتراض کیا ہے مفسرین کے اقوال پر نظر نہیں کی نہ علماء کی ان تحقیقات کو سنا جو اس مسئلہ کی بابت ہوئی ہے۔ قدماء کہتے ہیں کہ اس لفظ پر ہمارا ایمان ہے اور استویٰ سے وہی استویٰ مراد ہے جو اس کی شان کے لائق ہے نہ وہ اس کے خلاف ہے۔ متاخرین کہتے ہیں کہ عرش سے مراد کوئی لکڑی یا سونے چاندی کا تخت نہیں کہ خدا اس پر بیٹھا ہو وہ اس سے قطعاً پاک ہے بلکہ یہ کنایہ ہے جس سے مراد تخت حکومت ہے۔ استویٰ سے مراد اس پر اس کا متصرفانہ قادرانہ تسلط ہے مخلوق کو پیدا کیا آسمان وزمین سب کچھ بنایا پھر ان پر حکومت وتصرف اوران کی تدبیر وترتیب کی۔ اگر عرش سے مراد ایک ایسا آسمان لیا جائے جو سب کے اوپر ہے اور سب کو محیط ہے جس نے عالم ناسوت کا احاطہ کرلیا ہے پھر اس کے اوپر عالم ملکوت وناسوت اور لاہوت بھی ہے جہاں ملائکہ مقربین اور سب سے وراء الوراء ذات پاک ہے اس بات کو شرع نے بطور کنایہ کے بادشاہوں کے تخت پر بیٹھنے اور حضوری میں ملائکہ کے کھڑے رہنے سے اور تخت کو آٹھ فرشتوں کے سر پر اٹھائے رکھنے سے تعبیر کیا ہے اور ایسے باریک اسرار استعاروں اور کنایوں اور تشبیہوں سے بیان کئے جاتے ہیں پھر اس کو ظاہر پر محمول کر کے اعتراض کرنا معترض کے خود فہم کا قصور ہے اور سمجھا ہے تو اس کی بدنفسی ہے۔

(تفسیر حقانی جلد ۳/صفحہ ۲۵۸-۲۵۹)

اللہ تعالیٰ بغیر زبان کیسے کلام فرماتا ہے؟

اعتراض: (منکرین اسلام کا اعتراض)

آپ لوگ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام کہتے ہیں' حالانکہ کلام بے زبان کا نہیں ہوسکتا اور اللہ تعالیٰ کے زبان ہے نہیں پھر اس نے کلام کیسے کیا؟

جواب: حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

ہم کو کلام کے لئے زبان کی ضرورت ہے لیکن خود زبان کو کلام کرنے کے لئے زبان کی ضرورت نہیں' وہ خود اپنی ذات سے کلام کرتی ہے اسی طرح ہم کان سے سنتے ہیں لیکن خود کان اپنی ذات سے سنتا ہے اس کو کسی اور آلہ کی ضرورت نہیں' ہم کو دیکھنے کے لئے آنکھ کی حاجت ہے لیکن آنکھ کو کسی دوسری آنکھ کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات سے دیکھتی ہے تو جب زبان اس پر قادر ہے کہ بے زبان کلام کرے تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کو کلام کے لئے کسی آلہ کی ضرورت نہ ہو تو کیا تعجب ہے۔ صفت کلام خود اس کی ذات میں موجود ہے۔ کلام خود اس کی ذات سے بلا زبان صادر ہوتا ہے۔

(مجادلات معدلت ملحقہ دعوات عبدیت حصہ سوم ص ۳)

خدا قادر ہے تو اپنے آپ کو مار سکتا ہے؟ چوری کر سکتا ہے؟

اعتراض: (پنڈت سرسوتی کا اعتراض)

مسلمان کہتے ہیں کہ خدا قادر مطلق ہے لیکن خدا اپنے آپ کو مار نہیں سکتا' نہ چوری کر سکتا ہے اس لئے وہ قادر مطلق نہیں۔

قدرتِ مطلقہ پر اعتراض کا جواب:

اگر خدا تعالیٰ قادر مطلق نہیں تو قادرِ مقید ہوگا اور قادرِ مقید ہوگا تو اس کے اوپر ضرور قادرِ مطلق ہوگا کیونکہ اول تو باتفاقِ اہل معقول ہر مقید کے لئے ایک مطلق ضرور ہے۔ یعنی ہر مقید کے لئے بشہادتِ عقل اور نیز باتفاق اہل عقل مطلق ضرور ہے اس لئے اگر خدا قادرِ مطلق نہ ہوگا تو قادر مقید ہوگا اور اس سے اوپر کوئی اور قادر مطلق ماننا پڑے گا۔

اور چونکہ قادر مطلق کے لئے پنڈت جی کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ وہ اوروں کے مارنے پر بھی قادر ہو اور اپنے مارنے پر بھی قادر ہو' جیسا کہ اعتراض کے لفظ اس پر شاہد ہیں تو اس (قادر مقید سے اوپر والے قادر مطلق) کو خدا کے مارنے پر بھی قدرت ہوگی اور اپنے مارنے پر بھی۔

اور جب نعوذ باللہ خدا کے مارنے پر بھی اس کو قدرت ہوئی تو جلانے اور خدا کے مارنے پر بھی قادر ہوگا۔

بلکہ یوں کہیئے کہ خدا اسی کا پیدا کیا ہوا اور جلایا ہوا ہوگا۔

کیونکہ اپنی ہی دی ہوئی صفت کو کوئی چھین سکتا ہے' دوسری کی دی ہوئی صفت کو کون چھین سکے؟ آفتاب اگر زمین کو نور عنایت کرتا ہے تو وہی چھین سکتا ہے یعنی اپنی حرکت سے نور کو زمین سے لے سکتا ہے' قمر عطائے آفتاب کو نہیں چھین سکتا۔

اور ظاہر ہے کہ وجود اور حیات دونوں صفتیں ہیں جو ان کو کسی سے چھین لے تو یوں سمجھو کہ اسی نے دی ہوں گی اس صورت میں خدائی کیا ٹھہری بادشاہِ شطرنج کی بازی ہوئی۔

چوری کا جواب:

باقی رہا چوری والا اعتراض' اس کا جواب بھی اسی مذکورہ جواب سے نکل سکتا ہے۔

صورت اس کی یہ ہے کہ چوری کے لئے مال غیر چاہئے' وہ خدا کی نسبت مفقود ہے جو کچھ عالم میں ہے وہ خدا کی مِلک ہے۔

اور کیونکر نہ ہو' نوکری وغیرہ سے جو پیدا ہوتا ہے وہ برائے نام کمانے والوں کا پیدا کیا ہوا ہوتا ہے۔ اتنی بات پر یوں کہا کرتے ہیں کہ ان کا پیدا کیا ہوا ہے اور اس لئے یہ ان کی مِلک ہے۔ خدا تو خالق حقیقی ہے وہ مالک نہ ہو تو اور کون مالک ہو؟ تو جب خدا خود مالک حقیقی ہوا تو اس کی طرف چوری کی نسبت اور تصور ہی غلط ہوا۔

(انتصار الاسلام حضرت نانوتوی صفحہ ۲۴ تا ۴۴ ملخصا)

خدا قادر ہے تو اور خدا کو پیدا کر سکتا ہے

اعتراض: (پنڈت سرسوتی کا اعتراض)

اگر جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے تو دوسرے خدا کو بھی پیدا کر سکتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں کر سکتا تو مطلق قدرت کیا یہاں اٹک گئی؟

جواب : ٹھیک اسی طرح کسی بے سمجھ مورکھ نے پنڈت جی پر سوال کیا تھا اس کا غصہ ہم مسلمانوں پر نکالتے ہیں، ہم سوامی جی کے اس سوال کے جواب میں اس سوال و جواب کا نقل کرنا کافی جانتے ہیں۔ سنو!

سوال : ہم تو ایسا مانتے ہیں کہ ایشور جو چاہے سو کرے کیونکہ اسکے اوپر کوئی دوسرا نہیں ہے۔

جواب : وہ کیا چاہتا ہے اگر کہو کہ وہ سب کچھ چاہتا ہے اور کر سکتا ہے تو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا پرمیشور اپنے آپ کو مار سکتا ہے۔ بہت سے ایشور بنا سکتا ہے۔ خود بے علم ہو سکتا ہے۔ چوری، بدکاری وغیرہ پاپ کے کام کر سکتا ہے۔ اور دکھی بھی ہو سکتا ہے؟ یہ کام اگر ایشور کی صفات فعل اور عادات کے خلاف ہیں تو تمہارا یہ قول کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

> اس صورت میں لفظ ''سروشکتی مان (قادر مطلق) کے معنی جو ہم نے بیان کیے وہی ٹھیک ہیں۔ (وہ یہ ہیں) ایشور اپنے کام یعنی پیدائش پرورش، فنا وغیرہ کرنے اور تمام جیوں کے پن پاپ کے متعلق آئین کو واجب طور پر چلانے میں کسی کی ذرہ بھی امداد نہیں لیتا۔ یعنی اپنی غیر متناہی طاقت سے اپنے کل کام کو انجام دیتا ہے۔'' (ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۳۵، سملاس نمبر۱۲)

پنڈت جی نے تو اس بیان کو محض کہہ کر ہی چھوڑ دیا کہ یہ کام اس کی صفات کے خلاف ہیں۔ اس لئے نہیں کر سکتا جس پر کسی وید منتر کا حوالہ بھی نہیں دیا بلکہ محض من گھڑت بات بنائی ہے۔

حکایت:

ناظرین! پنڈت جی کے اس سوال سے ہمیں ایک حکایت یاد آئی ہے جس سے آپ لوگوں کو بھی دلچسپی ہوگی۔ ایک پنڈت جی شاید ہمارے (معترض) سوامی جی کے چیلے تھے کسی راجہ کے پاس مدت سے ملازم تھے۔ وطن مالوف میں جانے کا مدت

تک اتفاق نہ ہوا۔ آخر ان کی استری (بیوی) نے ایک تجویز ان کو بلانے کی سوچ کر خط لکھا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ مہاراج کی استری رانڈ ہوگئی۔ جس طرح ہو سکے جلدی تشریف لاکر گھر کا انتظام کیجئے پنڈت جی تو ایسے مبہوت ہوئے اور سر کے بال نوچتے ہوئے ڈیرے پر آئے۔ نہایت غم والم میں سر نیچے ڈالے بیٹھے ہوئے ہیں۔ سجن پرارتھنا کر رہے ہیں ماراج! کھیر (خیر) تو ہے؟ پنڈت جی نہایت برافروختہ ہوکر بولے۔ ہاں صاحب! جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔ تمہیں کیا؟ آخر مہاراج! کہئے تو سہی بات کیا ہے؟ پنڈت جی نے کہا نہایت غم کی بات ہے۔ آج گھر سے سما چار آدی لایا ہے کہ معرانی (پنڈت جی کی بیوی) رانڈ ہوگئی۔ دوستوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا کہ مہاراج! آپ کی زندگی میں وہ کیسے رانڈ ہوئی۔ اتنے پر پنڈت جی کو بھی ہوش آیا تو بولے ؎

تم بھی کہتے ہو سچ اے بھائی
پر گھر سے آیا ہے معتبر نائی

یہی حال ہمارے سوامی دیانند جی کا ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔ دوسرے خدا کو پیدا کر سکتا ہے؟ اور یہ نہیں جانتے کہ جس خدا کو خدا پیدا کرے گا وہ حادث ہوگا اور خدائی کے لئے تو قدیم ہونا ضروری ہے۔ مخلوق کبھی خالق کے درجہ پر پہنچ سکتی ہے؟

پنڈت جی! قرآن مشرکوں کا رد کرتے ہوئے کہتا ہے۔

لَا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا وَّهُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ ۔

ترجمہ:۔ ''یعنی تمہارے مصنوعی معبود کچھ بھی نہیں بنا سکتے بلکہ وہ خود بنے ہوئے ہیں''

جس سے اس نتیجہ پر پہنچانا منظور ہے۔ جس کا ہم نے ذکر کیا کہ مخلوق کبھی خدا نہیں ہو سکتی کیونکہ ہر مخلوق حادث اور خدا قدیم ہے۔ (حق پرکاش صفحہ ۲۳۳ تا ۲۳۷ ملخصا)

خدا کے مجسم ہونے کا اعتراض

آیت کا ترجمہ:

" کوئی نہیں جب زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کردی جائے گی ﴿۲۱﴾ اور آپ کا رب آئے گا اور فرشتے صف بستہ چلے آئیں گے ﴿۲۲﴾ (سورہ فجر: آیت ۲۱،۲۲)

اعتراض: (پنڈت دیانند کا اعتراض)

جیسے کوتوال وسپہ سالار اپنی فوج کو لے کر صف باندھ کر پھرا کرتے ہیں ویسا ہی ان کا خدا کرتا ہے؟ کیا دوزخ کو گھر کی مانند سمجھا ہے کہ جس کو اٹھا کر جہاں چاہیں وہاں لے جائیں اگر دوزخ اتنا چھوٹا ہے تو بیشمار قیدی اس میں کیونکر سما سکیں گے؟

جواب: خود پنڈت جی لکھتے ہیں: بھلے آدمی کا کام ہے کہ جس کلام کو نہ سمجھے وہ پوچھ لے۔ کیونکہ بہت سے کلام ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کا ظاہری ترجمہ سن کر معنی سمجھ لینے کافی نہیں ہوتے۔ (بھومکا صفحہ ۵۲)

پس آیت کے معنی ہیں کہ خدا کا حکم پہنچتے ہی تمام ملائکہ صف باندھے ہوئے کھڑے ہو جائیں گے کہ جو حکم ہو تعمیل ارشاد کی جائے اور دوزخ کو بھی خوب تپایا جائے گا گو مطلب صاف ہے۔ مگر

''ناپاک باطن والے جاہلوں کو علم کہاں؟'' (بھومکا صفحہ ۵۲)

خدا نے امیر و فقیر، نیک و بد کیوں بنائے

اعتراض: (بیس برن لالہ اندر من ہندو کا اعتراض)

خدا تعالی نے بعض کو فقیر اور بعض کو امیر اور بعض کو اندھا اور بعض کو دیکھنے والا بنایا ہے۔ انہوں نے کیا جرم کیا تھا کہ اس کی پاداش میں ان کو خدا تعالی نے اس طرح پیدا کیا اور دوسروں کو نیکوکار اور خوبصورت اور امیر پیدا کیا۔

جواب: مسلمانوں کے نزدیک موجودات ممکنہ کو ذات باری تعالی پر کوئی

استحقاق نہیں ہے نہ اپنے وجود کا اور نہ اپنے وجود کے بڑھنے کا ان سب چیزوں کا وجود محض خدا تعالیٰ کی مہربانی سے ہے۔ اگر کوئی خدائے تعالیٰ پر حق رکھتا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ بیان کرے۔ ہمارے جواب کی تفصیل دیکھنی ہو تو ہندوؤں کی ان کتابوں میں دیکھو۔ مہا بھارت، جوگ بشسٹ، گیتا سری کرشن جیو مہاراج، ویسے اس کی تفصیل منشی الکہداری نے اپنی کتاب بھاگ بھری میں وضاحت سے لکھی ہے اس کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک حوالہ ہم پیش کرتے ہیں امید ہے معترض کو تسلی ہو جائے گی۔ گر بھ اپنکھد صفحہ ۲۸۴ میں انسان کی پیدائش کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> یہ بات مخفی نہیں کہ موجودات خارجیہ ہندوؤں کے اعتقاد کے اعتبار سے چند قسم پر ہے۔ عناصر بسیطہ' اجرام فلکیہ اجسام نباتیہ' نوع انسانیہ اور دیگر اقسام حیوانیہ' اقسام دیوتا یا اور نوع دیوان وغیرہ ان بعض کو بعض پر واضح فضیلت ہے۔ (سوط اللہ الجبار ص ۶۵)

خدا مہربان ہے تو عورت درد سے بچہ کیوں جنتی ہے؟

اعتراض: (دہریہ کا اعتراض)

اگر خدا ہے تو کیا اس کی مہربانی ہے کہ عورت اس تکلیف سے بچہ جنتی ہے کہ الامان بغیر ایسے ملاپ کے کیوں توالد و تناسل نہیں ہوتا۔

جواب: پوری حکمت تو اس کی وہی جانتا ہے۔ مگر ہمیں یوں سمجھ میں آتا ہے کہ اگر بغیر ملاپ کے بچہ پیدا ہوتا تو اس کی پرورش کا کوئی ذمہ دار نہ ہوتا۔ کیونکہ اس سے کسی کو خاص محبت ہی نہ ہوتی۔

تکلیف سے بچہ جننے پر تو ماں کو اور بھی زیادہ محبت ہوتی ہے اور اللہ نے اس تکلیف کو ایک فطری طریقہ پر رکھا ہے پھر تکلیف نہ ہونے کا کیا معنی؟ (امداد اللہ انور)

جب خدا آزمائش کرتا ہے تو علیم وخبیر کہاں؟

ترجمہ آیت: ''آزمائے تم کو کون تم میں سے بہتر ہے عمل میں اور اگر کہے تو البتہ اٹھائے جاؤ گے پیچھے موت کے۔'' (سورۂ ہود: آیت ۔۷)

اعتراض: (ہندو دیانند سرسوتی کا اعتراض)

جب خدا اعمالوں کی آزمائش کرتا ہے تو وہ ہمہ دان نہیں ہے۔

جواب: خدا کے آزمانے کے معنی یہ ہیں کہ اس امر کو لوگوں پر ظاہر کر دیں۔ کیونکہ آزمائش جو بغرض تحصیل علم ہوتی ہے خدا کی نسبت ممکن نہیں۔ اس لئے قرآن شریف نے خدا کی نسبت صاف بتلایا ہے:

سَوَاءٌ مِّنْكُم مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ. ﴿سورة الرعد: ١٠﴾

ترجمہ: ''خدا کے نزدیک برابر ہے کوئی آہستہ بولے یا اونچا پکارے اور کوئی رات کو چھپ کر چلے یا دن میں ظاہر ہو کر چلے۔''

اور پنڈت جی خود لکھتے ہیں:

''جہاں معنی میں غیر امکان ہو وہاں مجاز ہوتا ہے۔'' (بھومکا صفحہ ۱۰)

خدا کو آزمائش وامتحان کی کیا ضرورت ہے

اعتراض: (چوبے بدر یداس ہندو کا اعتراض)

خدا کو آزمائش کرنے کی اور امتحان کی کیا ضرورت ہے ہندوؤں کی کتابوں میں کہیں نہیں لکھا کہ خدا تعالی نے فلاں کی آزمائش کی اور امتحان لیا۔

جواب: آپ نے اگر ہندوؤں کی کتابیں دیکھی ہوتیں تو ایسا نہ کہتے! مہاراجہ رامچندر نے سیتا کی عفت کا اور کرشن جی نے گوپیوں کا اور خود اسی نور پاک نے آگ وغیرہ عناصر کا امتحان لیا۔ یہ سب مضامین مہا بھارت، بھاگوت اور

اوپنکھدوں میں موجود ہیں۔(سوط اللہ صفحہ ۲۴ جلد ۳)

کیا خدا بادلوں کا علم نہیں جانتا

ترجمہ آیت: اتارا ہے اس نے آسمان سے پانی۔(سورۂ رعد)

اعتراض : (سرسوتی کا اعتراض)

اگر خدا بادلوں کا علم جانتا تو ''آسمان سے پانی اتارا'' اس کے ساتھ یہ کیوں نہ لکھتا کہ زمین سے پانی اس پر چڑھایا۔ اس سے تحقیق ہوا کہ قرآن کا مصنف بادلوں کے علم کو نہیں جانتا تھا۔

جواب : عربی میں آسمان کے معنی بلندی اور اوپر کی چیز کے آتے ہیں اس لئے کبھی تو یہ نیلگوں سقف چھت مراد ہوتی ہے اور کبھی بادل یا جو کچھ ہو سکے۔

پنڈت جی خود لکھتے ہیں:

ہمیشہ محل وموقع کے مناسب آگے اور پیچھے کے تعلق وربط کو دیکھ کر معنی کرنے چاہئیں۔(بھومکا صفحہ ۲۵)

قرآن شریف بارش کے نزول کی کیفیت خود بتلاتا ہے۔ سنو!

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَہٗ ثُمَّ یَجْعَلُہٗ رُکَامًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلَالِہٖ وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْھَا مِنْ بَرَدٍ فَیُصِیْبُ بِہٖ مَنْ یَّشَاءُ وَیَصْرِفُہٗ عَمَّنْ یَّشَآءُ. ﴿سورۃ النور: ۴۳﴾

ترجمہ: ''کیا تو (دیکھنے والے) نہیں دیکھتا کہ اللہ بادلوں کو چلاتا ہے پھر ان کو جوڑتا ہے پھر ایک تہ لگاتا ہے پھر تو بارش کو اس میں سے نکلتی دیکھتا ہے اور اوپر سے بڑے بڑے گپھے اتارتا ہے ان میں نہایت ٹھنڈک ہوتی ہے۔ پھر جس پر چاہتا ہے پہنچاتا ہے اور جس سے چاہتا ہے پھیر لیتا ہے۔''

ان آیتوں کا صرف ترجمہ سننے ہی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ صحیح ہے اور آسمان سے مراد اونچی چیز یعنی بادل ہیں۔

(حق پرکاش ۱۶۳ تا ۱۶۴ ملخصا)

خدا کو پیغمبر کی کیا ضرورت ہے

اعتراض: (پنڈت دیانند کا اعتراض)

پیغام پہنچانا ہرکارہ کا کام ہے اور ہرکارہ کی ضرورت اس کو ہوتی ہے جو مثل انسان محدود المکان ہو۔

جواب: سچ تو یہ ہے کہ پیغمبر ہرکارہ (حکم رساں) ہوتے ہیں مگر کس کے؟ سرب شکتی مان، نراکار، جگدیشور، وحدہ لاشریک کے لیکن دوسرا فقرہ غلط ہے ورنہ اگنی وایو وغیرہ ملہمان وید کی کیا ضرورت ورنہ ثابت ہوگا کہ پرمیشور محدود المکان ہے۔

(حق پرکاش صفحہ ۱۶۵ ملخصا)

اگر خدا قادر مطلق ہے تو پیغمبروں کے دشمنوں کو کیوں پیدا کیا

اعتراض: (بیں برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق خدا تعالی قادر مطلق ہوتا تو کافروں کو پیدا نہ کرتا تا کہ وہ پیغمبروں سے بے ادبانہ پیش نہ آتے اور خدا کے دوستوں کو قتل نہ کرتے۔

جواب: عالم اسباب میں اس طرح کے حالات کا ظاہر ہونا اللہ کی قدرت کاملہ کے منافی نہیں ہے۔اور اللہ کے دوستوں کا شہید ہونا اور ان کو تکلیفوں کا پہنچنا اللہ کی محبت کے حصول اور قرب کا ذریعہ ہے۔

مہابھارت پرب ۱۲ میں لکھا ہے کہ اندر (دیوتا) نے کہا کوئی طاعت اس سے بہتر نہیں کہ آدمی میدان میں مردانگی دکھائے اور میدان میں

قتل ہو جائے اور زندگی کے اخیر لمحہ میں اس دنیا سے جانا دو باتوں
کے علاوہ نہیں ہے ایک یہ کہ اس وقت وہ بھگوان کی زیارت کرے
دوسرا یہ کہ تلوار سے قتل ہوا ہو اور گناہوں سے پاک ہوا ہو۔

سری کرشن جیو مہراج کا شکاری کے نیزوں سے تکلیف اٹھانا اور راجہ رام چندر جیو مہراج کا اپنے بیٹے کے ہاتھ سے قتل ہونا اور سری کرشن کا ایسے لوگوں سے شدید زخمی ہونا اس طرح کے واقعات ہندوؤں کی کتابوں میں موجود ہیں۔

اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق خدا تعالیٰ قادر مطلق نہیں ہے اگر خدا تعالیٰ ہندوؤں کے نزدیک قادر مطلق ہے تو مذکورہ لوگوں کا قتل ہونا اور زخمی ہونا کیوں ہوا اور کشن جی کے ساتھ لوگ بے ادبی سے پیش آئے تھے اور انہوں نے زخم اٹھائے تھے۔

ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق یہ اوتار خود عین ذات باری تعالیٰ ہیں اور بری صفات سے بری ہیں اور گناہوں اور عیبوں سے بھی پاک شمار ہوتے ہیں لیکن یہ واقعات ہندوؤں کے مذہب کے بارے میں صریح طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ کرشن اور رام چندر نہ اوتار ہیں اور نہ گناہوں اور عیبوں سے پاک ہیں۔

ورنہ یہ معلوم ہوگا کہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق خدا تعالیٰ قدرت نہیں رکھتا کہ خود کو تو قتل ہونے سے زخمی ہونے سے ذلیل ہونے سے بچا سکے چہ جائیکہ وہ قادر مطلق ہو۔ (سوط اللہ الجبار فارسی جلد اول ص ۱۰،۹)

کیا خدا فرشتوں سے گفتگو کرنے سے قابل اعتراض ٹھہرتا ہے

اعتراض: (پنڈت دیانند کا اعتراض)

مسلمانوں کا خدا فرشتوں سے انسان کی مانند گفتگو کرنے سے مجسم محدود ناقص العقل بے انصاف ثابت ہوتا ہے۔

جواب : سوامی جی! سنئے! ایشور (خدا) فرماتا ہے:

''اے انسانو! جو شخص زمرہ انسانی میں بالاتر جاہ وجلال رکھتا ہو۔'' (اتھروید)

''اے ذی علم مدبران سلطنت واہل رعایا۔ الخ۔'' (یجروید)

اور سنئے! ایشور ہدایت فرماتا ہے کہ ''اے فرمانبردار لوگو! تمہارے اسلحہ آتشیں۔'' الخ (رگوید مندرجہ ستیارتھ پرکاش صفحہ ۱۸۱، سملاس ۶، نمبر ۵ تا ۷)

سوامی جی! یہاں پر پرمیشور اتنی باتیں بنانے سرکلر جاری کرنے سے بھی محدود العقل اور بے انصاف ثابت ہوا یا نہیں۔ (حق پرکاش صفحہ ۱۳۲)

چھ دن میں دنیا بنانا عرش پر آرام کرنا اور محیط کل ہونے اور خدا کی قدرت کے خلاف نہیں

ترجمہ آیت: ''تحقیق پروردگار تمہارا اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا چھ دن میں پھر قرار پکڑا اس نے اوپر عرش کے پکارو پروردگار اپنے کو عاجزی سے۔'' (سورۃ اعراف: آیت ۵۰، ۵۱)

اعتراض : (پنڈت دیانند کا اعتراض)

بھلا جو چھ دن میں دنیا کو بنائے، عرش میں تخت پر آرام کرے، وہ خدا قادر مطلق اور محیط کل بھی ہوسکتا ہے؟ ان صفات کے ہونے سے وہ خدا بھی نہیں کہلا سکتا۔ اگر چھ دن میں جہان بنایا اور ساتویں دن عرش پر آرام کیا تو تھک بھی گیا ہوگا اور اب سوتا یا جاگتا ہے اگر جاگتا ہے تو اب کچھ کام کرتا ہے یا......

جواب : سوامی جی! چھ مہینے میں کھیتی پکتی ہے نو مہینے میں بچہ پیٹ میں بنتا رہتا ہے تو سرب شکتی مان کبھی ہوسکتا ہے؟ کہئے ان صفات کے نہ ہونے سے وہ پرمیشور بھی کہلا سکتا ہے؟ ٹھیک اسی طرح خدا کے کام ہیں۔ افسوس کہ پنڈت جی اعتراض کرتے ہوئے نظام عالم پر غور نہیں کرتے۔

استوی علی العرش کالفظی ترجمہ بیشک یہی ہے۔جو پنڈت جی نے کیا ہے لیکن ''صرف آیت سن کر یا محض دلیل سے آیتوں کے معنی بیان کر دینا کافی نہیں ہے بلکہ

ہمیشہ محل وموقع کے مناسب آگے اور پیچھے کے تعلق کو دیکھ کر معنی کرنے چاہئیں۔(بھومکا صفحہ ۵۲)

اور سنئے!

جہاں معنی کا امکان نہ ہو وہاں مجازی معنی لئے جائیں گے۔'' (بھومکا صفحہ ۱۰)

پس اب سنئے قرآن بتلاتا ہے:

اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَلَمۡ یَعۡیَ بِخَلۡقِہِنَّ. ﴿سورۃ الاحقاف:۳۳﴾

ترجمہ:۔''کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے تھکا بھی نہیں وہ مردے زندہ نہیں کرسکتا؟''

اور سنئے! قرآن کہتا ہے۔:

لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ وَہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ. ﴿سورۃ الشوریٰ:۱۱﴾

ترجمہ:۔ ''اس خدا کی مثل کوئی چیز نہیں وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔''

اور سنئے! کتاب اللہ بتلاتی ہے:

لَاتَاۡخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَانَوۡمٌ...... وَلَایَئُوۡدُہٗ حِفۡظُہُمَاوَہُوَالۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ. ﴿سورۃ البقرہ:۲۵۵﴾

ترجمہ:۔ اللہ کو نہ اونگھ آسکتی ہے اور نہ نیند......اور نہ ہی اس پر آسمانوں اور زمین کی نگرانی گراں ہے اور وہ عالی شان ہے عظیم الشان ہے۔

(حق پرکاش ۱۳۲ تا ۱۳۴ ملخصا)

کُن سے پیدا کرنے والے نے دنیا چھ دن میں کیوں بنائی

اعتراض: (پنڈت دیانند کا اعتراض)

آسمان یعنی آکاش ایک غیر مرکب ازلی شئے ہے۔ اس کی پیدائش لکھنے سے تحقیق ہوا کہ مصنف قرآن علم طبعیات کو بھی نہیں جانتا تھا۔ کیا خدا کو دنیا چھ دن تک بنانی پڑتی ہے؟ قرآن میں جب لکھا ہے کہ ہو جا اور اتنا کہنے سے دنیا ہو گئی تو پھر چھ دن لگنا جھوٹ ہے۔

جواب: سماجیو! پرمیشور کی آگیا میں ہے۔

اس پرمیشور کے سن یعنی وچار یا غور و فکر کرنے والی قدرت سے چاند پیدا ہوا اور چکشو یعنی پرنور قدرت سے سورج ظاہر ہوا اور شروتر یعنی اکاش صورت قدرت سے اکاش (آسمان) پیدا ہوا۔" (یجر وید ادھیاء ۳۱، منتر ۱۲)

سوامی جی کا پرمان بھی سنو!

پرماتما نے پہلے اکاش (آسمان) کیا اس آکاش سے وایو۔ وایو سے اگنی۔ اگنی سے جل، جل سے پرتھوی، پرتھوی سے اناج، اناج سے ویرج، ویرج سے انسان پیدا کئے۔ (اُپدیش منجری صفحہ ۵۹)

اور سنو! "اکاش اور پرتما کا اوبار آدھیہ سمبندھ ہے۔ یعنی پرمیشر کے سہارے اکاش ہے۔" (ایضا صفحہ ۷۵)

پس ہم سوامی جی کے فقرے دہرا کر سماجیوں سے پوچھتے ہیں۔

اکاش ایک غیر مرکب ازلی شے ہے۔ اس کی پیدائش لکھنے سے تحقیق ہوا کہ وید کا مصنف اور مفسر (سوامی جی خود بدولت) علم طبعیات کو بھی نہیں جانتا تھا۔

سماجیو! اس کا جواب دے سکتے ہو؟

خدا کے کاموں میں آپ کو شبہ ہوتا ہے کیا چھ مہینوں میں کھیت پکتے ہیں۔ نو مہینوں میں آدم زاد اور گؤ ماتا بچہ دیتی ہے۔ خدا کو سال بھر تک بچہ بنانا پڑتا ہے۔

(توبہ توبہ) سوامی صاحب! قرآن میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ "ہوجا" کہنے سے دنیا ہوگئی وہ یوں ہے کہ جب خدا کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تو اس کو صرف "ہوجا" کہتا ہے تو وہ یوں ہو جاتی ہے۔

اس مقام کو چھ دن والے مقام سے کوئی اختلاف نہیں۔ دنیا کی مختلف کیفیتیں خدا نے پیدا کی ہیں۔ جب کسی کیفیت کو حسب اقتضاء حکمت پیدا کرنا چاہا "ہوجا" کہا وہ کیفیت پیدا ہوگئی۔ آپ نے اگر بچہ کی پیدائش پر غور کیا ہوتا تو آپ کو معلوم ہوتا کہ بظاہر تو بچہ کی پیدائش میں نو ماہ لگ جاتے ہیں۔ مگر حقیقت میں اس کی ان گنت کیفیات ہوتی ہیں کہ ہر آن بدلتی ہیں اور ہر آن خدا اپنے قانون قدرت سے "ہوجا" کہتا ہے اور وہ ہوتی جاتی ہیں۔ پس دونوں آیتوں کا مطلب بالکل متفق ہے فرق صرف آپ کی سمجھ یا تعصب کا ہے۔ (حق پرکاش ۱۵۶ تا ۱۵۷ ملخصا)

خدا اور فرشتے لوگوں سے اب کیوں کلام نہیں کرتے

ترجمہ آیت: پھر ان کو فرشتوں (جبرائیلؑ) نے آواز دی جبکہ وہ محراب میں نماز میں کھڑے تھے کہ اللہ آپؑ کو یحییٰؑ کی خوشخبری دیتا ہے جو کلمۃ اللہ (عیسیٰؑ) کی تصدیق کرے گا اور سردار ہوگا اور عورتوں کے پاس نہ جائے گا اور نیکوں میں سے نبی ہوگا۔ (سورۃ آل عمران: آیت ۳۹)

اعتراض: (پنڈت دیانند کا اعتراض)

بھلا آج کل خدا کے فرشتے اور خدا کسی سے باتیں کرنے کو نہیں آتے تو پہلے کیونکر آتے ہونگے؟

جواب: بھلا جب آج کل کسی کو الہام نہیں ہوتا تو پہلے وید کیونکر الہام ہوئے ہونگے؟

یا آج کل کوئی جوان آدمی پیدا نہیں ہوتا تو پہلے بھی کیونکر جوان پیدا ہوئے ہونگے؟ (دیکھو ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۹۴، سملاس ۸، نمبر ۴۲)

اگر کہئے کہ ان دنوں ضرورت تھی تو ٹھیک اسی طرح معجزہ کی ان دنوں ضرورت تھی اور یہ تو ظاہر ہے کہ ضرورت اور عدم ضرورت کا معلوم کرنا فاعل کا کام ہے۔ ہم بسا اوقات بارش کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ لیکن خدا کے نزدیک نہیں ہوتی تو بارش بھی نہیں ہوتی۔

(حق پرکاش صفحہ ۱۱۰)

کیا خدا صرف مسلمانوں کا ہے

ترجمہ آیت: پسندیدہ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔ (آل عمران: ۱۹)

اعتراض: (پنڈت سوامی سرسوتی کا اعتراض)

کیا اللہ مسلمانوں ہی کا ہے اوروں کا نہیں؟

جواب: ایک شخص نے ایک طوطے کی پرورش کی اور اسے ''دریں چہ شک'' کا لفظ ایسا ضبط کرایا کہ ہر ایک بات کے جواب میں طوطا ''دریں چہ شک'' بیساختہ کہہ دیتا۔ آخر ایک مرتبہ مالک اس کو بازار میں بیچنے کو لے گیا اور خریدار کے پوچھنے پر سو روپیہ مول کیا۔ خریدار کی تکرار پر مالک نے کہا کہ طوطا مہاراج سے پوچھ لو۔ طوطا رام جی جھٹ بول اٹھے کہ ''دریں چہ شک'' خریدار نے سمجھا کہ ایسا طوطا کہاں سے ملے گا؟ کہ فارسی میں ہر بات کا جواب دیتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح پنڈت جی کو یہ لفظ ضبط ہے کہ

''مسلمانوں ہی کا خدا ہے۔ اوروں کا نہیں۔''

مگر جب اپنے پر گزرتی ہے تو صاف کہہ جاتے ہیں کہ

''وید کا منکر ناستک (دہریہ ملحد) ہے۔''

(ستیارتھ صفحہ ۳۴۷) اور

''اگر کوئی کسی سے پوچھے کہ تمہارا کیا اعتقاد ہے تو یہی جواب دینا چاہئے کہ ہمارا اعتقاد وید ہے۔''

(ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۷۲، سملاس ۷، نمبر ۸۱)

نوٹ :- وید ہندوؤں کے مذہب کی بنیادی کتاب ہے۔

کیا اللہ گنہگاروں کو راہ نہیں دکھلاتا؟

ترجمہ آیت: اور اللہ کافر لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔ (البقرہ:۲۶۴)

''اللہ گنہگاروں کو راہ نہیں دکھلاتا۔''

اعتراض : (پنڈت دیانند سرسوتی کا اعتراض)

اگر گنہگاروں کو راہ نہیں بتلاتا تو پرہیز گاروں کے لئے بھی مسلمانوں کے خدا کی ضرورت نہیں کیونکہ دھرماتما (دیندار) تو دھرم (دین) کی راہ میں ہوتے ہی ہیں۔ جو گمراہ ہیں ان کو راستہ بتلانا چاہیے۔

جواب : سوامی جی! ہدایت دو قسم پر ہے۔ ایک ہدایت تو وہ ہے جسے راہ نمائی کہتے ہیں۔ یہ تو سب بندوں کو برابر ملتی ہے۔ ایک ہدایت وہ ہے جسے توفیق خیر کہتے ہیں۔ وہ خاص برگزیدوں کا حصہ ہے۔ اس مضمون کو آپ نے بھی ستیارتھ پرکاش کے کئی ایک مواقع میں ادا کیا ہے ایک موقع کے الفاظ یہ ہیں۔

جب آتما من (جی) کو اور من حواس کو کسی شئے محسوس میں لگاتا ہے یا جس لمحہ میں آتما چوری وغیرہ برے یا رفاہ عام وغیرہ اچھے کام کرنا شروع کرتا ہے تو جیو کی خواہش اور علم وغیرہ چونکہ اس وقت اسی خواہش کی ہوئی چیز کی طرف جھک جاتے ہیں۔ اس لئے اس لمحہ میں جو آتما کے اندر برے کام کے کرنے میں خوف، تامل اور شرم اور اچھے کاموں کے کرنے میں بے خوفی عدم تامل خوشی اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے وہ جیو آتما کی طرف سے نہیں بلکہ ''پرماتما (خدا) کی طرف سے ہے۔''

(ستیارتھ صفحہ ۵۵، سملاس ۷ نمبر ۱۱)

اور سنئے! ''پاپ کرنے کی خواہش کے وقت شک اور شرم پیدا ہوتی ہے وہ انتریامی پرماتما (خدا) کی طرف سے ہے۔'' (ستیارتھ صفحہ ۵۵)

پس ایک وقت انسان کی بدکاری کا وہ آتا ہے کہ یہ شک اور خوف گناہوں پر اس کو نہیں ہوتا اور وہ بے کھٹکے گناہ کرتا ہے، بلکہ اپنے افعال قبیحہ کو اچھا جانتا ہے اسی مضمون کو آپ نے بھی ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بودھوں کی گمراہی کے سبب بیان کرتے ہوئے یوں ادا کیا ہے۔

انہوں (بودھوں) نے کس درجہ اودیا (جہالت) میں ترقی کی ہے جس کی نظیر ان کے سوا دوسری ہو ہی نہیں سکتی۔ یقین تو یہی ہوتا ہے کہ وید اور ایشور سے مخالفت کرنے کا ان کو یہی نتیجہ ملا ہے۔"

(ستیارتھ صفحہ ۵۴۱، باب ۱۲ نمبر ۲۷)

سنو! قرآن انسان کی فطری حالت بتلاتا ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ. ﴿سورة............﴾

ترجمہ:- جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کی زوجہ کے درمیان حائل ہوتا ہے اور یہ لوگ کسی کو بھی اللہ کے حکم کے بغیر نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

(حق پرکاش صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۱)

خدا کو قرض لینے کی کیا ضرورت ہے

ترجمہ آیت: کون ہے وہ جو قرض دے اللہ کو اچھا۔ پس دگنا کرے اس کو واسطے اس کے۔ (آیت ۲۴۹)

اعتراض: (پنڈت سرسوتی کا اعتراض)

بھلا خدا کو قرض لینے سے کیا؟ کیا جس نے ساری خلقت کو بنایا۔ وہ انسان سے قرض لیتا ہے۔

جواب: پنڈت سوامی جی کا پربان بالکل سچ ہے:

"انسان کو کامل علم کے لئے اس طرح دلیل کرنی چاہئے کہ اس منتر (یا

آیت) کا مطلب کیا ہوگا؟ صرف منتر (یا آیت) سن کر محض دلیل (اپنی اٹکل) سے منتروں (یا آیتوں) کے معنی بیان کر دینا کافی نہیں۔ جب تک انسان مقدم ومؤخر کو سمجھنے کی لیاقت حاصل نہ کرلے اور منتروں (اور آیتوں) کے معنی کو اچھی طرح صاف نہ کرلے اور اپنے ہم جنسوں میں بلحاظ مہارت علوم قابل تعریف اور اعلیٰ درجہ کا عالم نہ ہو جائے۔ تب تک وہ اچھی طرح خوض وفکر کے ساتھ عمدہ دلیل سے وید (یا قرآن) کے معنی نہیں کرسکتا"۔ (بھومکا صفحہ ۵۲ ملخص)

یہ بھی سچ ہے:

بعض ضدی لوگ خلاف منشاء متکلم کے تاویل کرتے ہیں۔

(دیباچہ ستیارتھ پرکاش صفحہ ۷)

پس اگر متکلم کے منشاء کے مطابق آگے پیچھے کو ملا کر معنی کرنے صحیح ہیں تو سنئے! قرآن مجید بتاتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ. ﴿سورۃ الرعد:۲۶﴾

ترجمہ:۔ "خدا ہی جس کیلئے چاہے رزق فراخ کرتا ہے اور جس کیلئے چاہے تنگ کرتا ہے۔"

یہ آیت بتلا رہی ہے کہ آیت زیر بحث میں قرض سے وہ قرض مراد نہیں جو تنگدستی میں ایک دوسرے سے لیا کرتے ہیں، بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ خدا بندوں کو ترغیب دیتا ہے کہ تم نیکی کے کاموں میں اپنے خرچوں کو ضائع نہ سمجھو بلکہ یہ سمجھو کہ ہم اللہ کو قرض دیتے ہیں جو اس کا عوض کئی درجے بڑھا کر ہم کو عنایت کرے گا۔

جہاں معنی میں غیر امکان پایا جاتا ہے۔ وہاں استعارہ (مجاز) ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی راست گو عالم کسی سے یہ کہے کہ مچان (ہرن کا چمڑہ) بولتے ہیں۔ یہاں یہ مراد سمجھی جائے گی کہ مچان پر بیٹھے ہوئے انسان بولتے ہیں۔ (صفحہ ۱۰)

پس جب قرآن شریف نے خود ہی بتلا دیا کہ خدا سب کا داتا ہے وہی مالک ہے وہی خالق ہے۔ تو قرض کے اصلی معنی ممکن نہ رہے۔ پھر آپ کا ان پر اعتراض کرنا اپنے ہی قول کی تصدیق نہیں؟ کہ

''ناپاک باطن والے جاہلوں کو واقعی علم نہیں ہوتا۔'' (دیکھو بھومکا صفحہ ۵۲)۔ (حق پرکاش صفحہ ۹۴، ۹۶ ملخصا)

خدا کا خود اپنی تعریف کرنا

ترجمہ آیت: اے موسیٰؑ بات یہ ہے کہ میں ہی اللہ ہوں زبردست حکمت والا۔ (سورۃ نمل: ۹)

اعتراض: (سوامی دیانند کا اعتراض)

دیکھیے اپنے ہی منہ سے آپ اللہ بڑا زبردست بنتا ہے۔ اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنا جب شریف آدمی کا کام نہیں ہوسکتا تو خدا کا کیونکر ہوسکتا ہے۔

جواب: کیسا مورکھ ہے وہ شخص جو اپنا گھر شیشوں کا بنا کر دوسروں پر پتھر برسائے۔

سماجیو! پرمیشر (خدا) بندوں کو سکھاتا ہے:

''میں اس محافظ کائنات صاحب جاہ وجلال نہایت زور آور فاتح کل تمام کائنات کے راجا، قادر مطلق اور سب کو قوت عطا کرنے والے پرمیشور کو جس کے آگے تمام زبردست بہادر سر اطاعت خم کرتے ہیں اور جو انصاف سے مخلوقات کی حفاظت کرنے والا اندر قادر مطلق پرمیشور (خدا) ہے۔ ہر جنگ میں فتح پانے کے لئے مدعو کرتا ہوں اور پناہ لیتا ہوں۔''

(یجروید ادھیائے ۲۰، منتر ۵۰)

''پاک کرنے والے اعمال کو ظاہر کرنے والا جس میں قابل تعریف گیان

(علم) کا وصف ہے ایسے اعلیٰ جملہ علوم کے دینے والا جو وید کا کلام ہے وہ جملہ فنون کی ماہیت سے ہم کو باخبر کرتا ہے۔"

(رگوید مندرجہ آریہ مسافر صفحہ ۱۸ بابت ماہ ستمبر ۱۸۹۹ء)

اور سنئے!

"غلطی سے میرا جملہ علوم کا مخزن جو وید شاستر ہے غیر متناہی طاقت سے پرمیشور نے ظاہر کیا۔" (مندرجہ مہا یگیہ ودھی صفحہ ۱۱ مصنفہ سوامی جی)

سماجیو! دیکھا؟ اپنے ہی منہ سے آپ پرمیشور زبردست رلجہ بنتا ہے، اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنا جب شریف آدمی کا کام نہیں تو پرمیشور کا کیونکر ہوسکتا ہے؟ کہو جی کون دھرم ہے؟

سوامی جی کو خبر نہیں کہ خداوند تعالیٰ جب بندوں کی ہدایت کیلیۓ کتاب بھیجتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات کا ذکر بھی کرے تا کہ بندوں کو اس کی صفتیں معلوم ہوسکیں۔ پس آسمانی کتابوں میں جہاں جہاں صفات خداوندی کا ذکر آتا ہے اس سے یہی مراد ہوتی ہے کہ بندے ان صفات کے معتقد ہوں نہ یہ کہ خدا کوئی شیخی بگھارتا ہے، جیسے ہمارے سوامی جی ماراج سمجھے ہیں۔ (حق پرکاش صفحہ ۱۹۷ تا ۱۹۹ ملخصا)

کیا قرآن گمراہوں کو راہ نہیں دکھاتا

اعتراض: (پنڈت دیانند کا اعتراض)

جو پرہیزگار لوگ ہیں وہ تو خود راہ راست پر ہیں اور جو جھوٹی راہ پر ہیں ان کو یہ قرآن راہ ہی نہیں دکھلاسکتا۔ تو پھر کس کام کا رہا۔

جواب: سوامی جی! متقیوں کیلیۓ ہدایت ہونے کے وہی معنی ہیں جن معنی سے آپ ستیارتھ پرکاش سملاس نمبر ۱۰ میں لکھتے ہیں کہ ضدی اور نا انصاف کو جواب نہ دینا چاہیۓ۔

سنئے قرآن خود اپنی تفسیر کرتا ہے، خدا فرماتا ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَاهُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَايَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّاخَسَارًا. ﴿سورة بنی اسرائیل:۸۲﴾

ترجمہ: ''ہم (خدا) قرآن کو سب لوگوں کی بیماریوں کے لئے شفاء اور ایمانداروں کے لئے رحمت بنا کر نازل کرتے ہیں اور ظالموں (منکروں) کو بجز نقصان دہی کے کچھ فائدہ نہیں دیتا۔''

سوامی جی! اگر کوئی مریض حکیم کے نسخے اور بتلائے ہوئے پرہیز پر عمل نہ کرے تو قصور کس کا؟

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمہ آفتاب را چہ گناہ

سب کو وہ اپنے خزانہ سے محض اپنی مہربانی سے دیتا ہے بندوں کا اس پر کوئی حق نہیں۔ وہ حکیم بھی ہے جتنا مناسب سمجھتا ہے دیتا ہے۔ سنو!

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ. ﴿سورة الروم:۳۷﴾

ترجمہ:۔ ''کیا منکر نہیں سوچتے کہ خدا جس کو چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ بیشک اس میں ماننے والوں کیلئے اس کی قدرت کی بہت سی نشانیاں ہیں۔''

(حق پرکاش صفحہ ۴۰ تا ۴۲ ملخصا)

قرآن کو عربی میں اتار کر خدا طرف دار ٹھہرا

اعتراض: (پنڈت سوامی کا اعتراض)

مثلاً عربی زبان میں نازل کرنے سے عرب والوں کو اس کا پڑھنا سہل اور

دوسری زبان بولنے والوں کو مشکل ہو جاتا ہے اس سے خدا طرف دار ٹھہرتا ہے۔

جواب : بیشک جس کتاب میں طرفداری کی باتیں ہوں وہ خدا کی نہیں ہوتی۔ مگر یہ تو فرمایئے کہ شودر کے گھر کا پکا ہوا کھانے سے جو آپ منع کر آئے ہیں۔ خواہ کیسا ہی بھلا مانس کیوں نہ ہو۔ (ستیارتھ پرکاش سملاس نمبر۱۰)

یہ کس کتاب کا حکم ہے اور یہ آپ کی طرف داری تو نہیں۔

دیانند جی! عربی زبان میں قرآن کے نازل ہونے کی وجہ تو قرآن نے خود ہی بتلائی ہوئی ہے۔ سنو خدا فرماتا ہے

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيَاتُهٗ ءَ اَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ. (سورۃ حٰم السجدہ:۴۴)

ترجمہ:- ''اگر ہم قرآن کو عربی کے سوا کسی اور زبان میں اتارتے تو عربی لوگ کہتے کہ اس کے حکموں کو واضح کیوں نہیں کیا کلام عجمی اور مخاطب عربی۔''

چونکہ اول مخاطب اس کے عرب کے لوگ تھے۔ اس لئے اس زبان میں نازل ہوا انہوں نے اس کو سمجھ کر دوسرے لوگوں کو سمجھا دیا ہے۔ یہی عین انصاف ہے۔ فرق صرف آپ کی سمجھ کا ہے۔ (حق پرکاش صفحہ ۳۸ تا ۳۹ ملخصا)

خدا کی طرف مکر کی نسبت

ترجمہ آیت:- اور مکر کیا کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے اللہ بہت مکر کرنے والا ہے۔''

(آل عمران:۵۴)

اعتراض: (پنڈت سوامی کا اعتراض)

جو دھوکا کھاتا ہے یا مکر و فریب کرتا ہے وہ خدا ہرگز نہیں ہوسکتا۔

جواب: مکر کے معنی لغت میں خفیہ حکم یا خفیہ تدبیر ہے۔ پس آیت کے معنی یہ

ہوئے کہ کافروں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو تکلیف پہنچانے میں خفیہ تدابیر کیں اور خدائے اُس کے بچانے کے خفیہ احکام جاری کیے اور خدا کی تدبیر سب پر غالب ہوتی ہے چونکہ خدا کے سارے کام بندوں کی نظر سے غائب ہی ہوا کرتے ہیں ورنہ بتلا دیں کہ جان کنی کے وقت کیا خدا سامنے آ کر تھپڑ مارتا ہے؟ نہیں بلکہ ایسے خفیہ اسباب ہوتے ہیں جو اندر ہی اندر اپنا کام کر جاتے ہیں۔ اسی لئے کہا گیا مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ. یہی معنی ہیں اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (تیرا پروردگار گھات میں ہے) اور آیت زیر بحث کے۔

اصل یہ ہے کہ بعض الفاظ عربی کے عربی میں اُتنی سختی نہیں رکھتے جتنی اردو میں دکھاتے ہیں۔ مثلاً جاہل جس کا ترجمہ نادان ہے یا احمق جس کا ترجمہ بھی نادان ہے عربی میں بعینہ اُتنا ہی وزن رکھتے ہیں۔ جتنا اُردو میں نادان رکھتا ہے۔ یعنی ایک معمولی سا... اور اُردو میں یہ دونوں لفظ (جاہل اور احمق) جس قدر کراہت رکھتے ہیں اہل زبان سے مخفی نہیں یہی حال "مکر" کا ہے عربی میں خیر الماکرین گلیڈ سٹون اور مصطفیٰ کمال پاشا جیسے پولیٹشن اعیان کو کہا جاتا ہے۔ نہ کہ ہر کہ مہہ کو۔ مگر ہندی زبان میں یہ لفظ "مکر" برے مکروہ معنی میں بولا جاتا ہے۔ اس لئے آریوں کے گرو اور خود آریوں کو بھی مکروہ لگتا ہے۔ ورنہ اصل میں مکروہ نہیں۔ علاوہ اس کے سوامی جی کو بھی مسلم ہے کہ۔

"جہاں اصلی معنی نہ ہو سکیں وہاں استعارہ یا مجاز مُراد ہوتا ہے۔"

(بھومکا صفحہ ۱۰)

پھر کیا وجہ ہے کہ سوامی جی نے یہاں مجاز مراد نہ لی۔

کیونکہ دھوکا تو کمزور آدمی کیا کرتا ہے۔ خدا تو سب بندوں کا خالق و مالک داتا ہے۔ وہ خود کہتا ہے۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ. (سورۃ الانعام:۶۱)

سوامی جی صاف معنی کیوں کرتے جبکہ اپنے قول کی تصدیق منظور کی تھی کہ۔

''ناپاک باطن والے جاہلوں کو واقعی علم نہیں ہوتا۔'' (بھومکا صفحہ ۵۲)

کیا خدا تخلیق کائنات سے پہلے نکما تھا؟

اعتراض: (پنڈت دیانند کا اعتراض)

مسلمان لوگ دنیا کی پیدائش سات آٹھ ہزار برس سے بھی کم بتلاتے ہیں۔ کیا اس سے پیشتر خدا نکما بیٹھ رہا تھا؟ اور کیا قیامت کے پیچھے بھی نکما رہے گا۔

جواب: کل کائنات مرکب ہیں اور مرکب کبھی قدیم (انادی) نہیں ہو سکتا۔ اس تقریر کی وضاحت کیلئے آپ ہی کے کلام کو پیش کرنا مناسب ہے۔ آپ خود ناستکوں (دہریوں) کے جواب میں لکھتے ہیں۔

''بغیر فاعل کے کوئی بھی حرکت یا حرکت سے پیدا ہونے والی شے نہیں بن سکتی جو زمین وغیرہ اشیاء ترکیب خاص سے ملکر بنی ہوئی نظر آتی ہیں ویسے ازلی کبھی نہیں ہو سکتیں۔''

(ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۸۷ سملاس (۸) نمبر (۲۸))

نیز صفحہ ۵۵۷ پر لکھتے ہیں:

''جو اتصال سے پیدا ہوتا ہے وہ ازلی ابدی کبھی نہیں ہو سکتا۔''

(ستیارتھ پرکاش باب ۱۲)

پس فرمایئے کہ دنیا کی عمر چاہے آپ کتنی ہی لگالیں اور کتنے ہی اس کے کلپ (بار بار پیدائش) کہیں۔ مگر اس سے تو آپ انکار نہیں کر سکتے کہ دنیا مرکب ہے اور جو مرکب ہے حادث (نوین) ہے۔

نتیجہ صاف ہے کہ دنیا کے حدوث کی ابتدا ہے۔ جس سے پہلے وہ نہ تھی۔

چنانچہ آپ خود لکھتے ہیں:

''جو شے اتصال سے بنتی ہے۔ وہ اتصال سے پیشتر نہیں ہوتی۔ اور

انفعال کے اخیر پر بھی نہیں رہتی۔

(صفحہ ۸۸ مذکور سملاس (۸) بجز (۲۸)

پس آپ کے کلام سے بھی لازم آیا کہ خدا کسی وقت نکما بیٹھا ہوگا۔ ایسا ہی کسی وقت نکما بیٹھے گا۔

اگر آپ کہیں کہ گو موجودہ دنیا کی ابتداء وانتہاء ہے۔ مگر اس کا سلسلہ ازلی ہے ایک دنیا کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری علی ہذا القیاس۔

(ستیارتھ پرکاش باب (۸) نمبر ۴۳)

تو یہ آپ کے اصول مسلمہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ انادی پدارتھ (قدیمی اشیاء) آپ نے صرف تین ہی گنی ہیں۔

پرمیشور (خدا) جیو (روح) پرکرتی (مادہ عالم) ناقابل تقسیم اجزا۔

(ستیارتھ پرکاش باب ۸)

پس! اگر ان چیزوں کے سوا دنیا کے سلسلہ کو بھی آپ نے قدیم اور ازلی مانا تو چار چیزیں کیوں ازلی نہیں مانتے ہو۔ جس سے دہریہ پن کی بنیاد پختہ ہو۔ یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ اجزاء خارجیہ (اجزاء خارجیہ اُن کو کہتے ہیں جو دیکھنے میں آئیں جیسے دیوار کی اینٹیں۔) کو کل پر تقدم زمانی ہوتا ہے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ایک وقت ضرور ایسا ہوتا ہے کہ اجزاء ہوں مگر کل جو اُن سے بنا ہے نہ ہو۔

چنانچہ آپ بھی مانتے ہیں کہ

”جو شے اتصال سے بنتی ہے۔ وہ اتصال سے پیشتر نہیں ہوتی۔“ (حوالہ مذکور)

پس اس اصول کے مانتے ہوئے بھی دنیا کے سلسلہ کو قدیم کہنا متناقضین کا قائل ہونا ہے جو داناؤں سے بعید ہے۔

پس نتیجہ صاف ہے کہ دنیا کا سلسلہ کسی خاص وقت سے چلا ہے۔ جس کو خدا نے اس کیلئے مناسب سمجھا اس سے پہلے خدا بیکار رہو یا باکار۔ ہم دونوں کے سوچنے سے

باہر ہے۔ ہمارا تو صرف اتنا ہی قول ہے کہ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ''خدا نے سب چیزوں کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے''۔

جب کچھ نہ تھا تب نرا کار تھا
خلقت کا پیدا کرنا نہار تھا

(حق پرکاش صفحہ ۵۸، ۵۹)

کُنْ فَيَكُوْنُ پر اعتراض

ترجمہ آیت:- ''جو آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ جب وہ کچھ کرنا چاہتا ہے یہ نہیں کہ اُس کو کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ اُسے کہتا ہے کہ ہو جا پس ہو جاتا ہے۔''

(سورۃ آل عمران: ۴۷)

اعتراض: (پنڈت سرسوتی کا اعتراض)

بھلا جب خدا نے حکم دیا کہ ہو جا۔ تو یہ حکم کس نے سنا؟ اور کس کو سنایا گیا اور کون بن گیا؟ کس مادہ سے بنایا گیا؟

جواب: اس فقرہ میں سوامی نے مادہ کے متعلق سوال اُٹھایا ہے یعنی مسلمان جو آریوں کی طرح مادہ کے قائل نہیں تو دنیا کس چیز سے بنی ہے۔ اس لئے ہم بھی اس فقرہ میں کسی قدر تفصیل سے مادہ کے حالات بتلا دیں گے اور جہاں تک ہو سکے گا۔ سائنس کے مسلمہ اصول سے کام لیں گے اور ناظرین کو دکھا دیں گے کہ آریوں کا دعویٰ...

''جہاں سائنس کی روشنی پہنچے گی وہاں آریہ دھرم کا جھنڈا سب سے پہلے لہرائے گا''

کہاں تک ثبوت رکھتا ہے۔

مگر اس تقریر سے پہلے آیت موصوفہ کا مطلب بیان کرتے ہیں۔ آیت کا مطلب

یہ ہے کہ تمہارے نزدیک جلدی سے جلدی کسی کام کا ہو جانا اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ تم اُس کا تصور ذہن میں لاتے ہی اُس کو ہونے کا حکم کرو۔ اور وہ ہو جائے۔ مثلاً کسی مکان کا نقشہ ذہن میں سمایا اور تم نے اس کی تیاری کا حکم دیا۔ وہ فوراً ہو گیا۔ اسی طرح سمجھو کہ خدا کے کام جلدی ہوتے ہیں۔ اُن میں کسی چیز کی روک ٹوک نہیں کوئی اُن میں مانع آ سکتا ہے۔ جس کام کو جتنے وقت میں وہ کرنا چاہے اُتنے ہی وقت میں ہوتا ہے ناممکن ہے کہ تخلف ہو سکے یہ نہیں کہ خدا اُس کو کن کہتا ہے کن کہنے میں تو دو حرف بولنے کی دیر لگتی ہے۔ وہاں تو ارادہ ہی ہوا اور مفعول حاضر۔ (دیکھو تفسیر بیضاوی وغیرہ)

پس اس کے بعد ہم سوامی جی کی طرف روئے سخن پھیرتے اور سوال کرتے ہیں پنڈت جی نے مادہ کی کیفیت اور ماہیت جو بتلائی وہ یہ ہے۔

"سب سے لطیف جزو جو کاٹا نہیں جاتا۔ اُس کا نام پرمانو ہے۔ ساٹھ پرمانوؤں کے ملے ہوئے کا نام انو۔ دو انو کا ایک دونیک جو کثیف ہوا ہے۔ تین دونیک کی آگ چار دونیک کا پانی پانچ دونیک کی مٹی۔"

(ستیارتھ صفحہ ۲۹۸ سملاس ۸ نمبر ۵۰)

سوامی جی کے اس کہنے سے کہ وہ کاٹا نہیں جاتا۔ صاف سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنی عدم قابلیت سے نہیں کٹ سکتا یا کوئی آلہ اس کے کاٹنے کے مناسب نہیں ملتا جو اُس کو کاٹ سکے گو فی نفسہ اُس میں کٹنے کی قابلیت ہے۔ صورت ثانیہ یعنی وہ قابلیت تو کٹنے کی رکھتا ہے۔ مگر ایسا باریک آلہ کوئی نہیں مل سکتا۔ جس سے اُس کو کاٹا جائے۔ ثابت ہوا کہ پرمانو اپنے وجود میں تو مرکب ہیں۔ مگر بوجہ عدمِ آلہ تقسیم کے منقسم نہیں ہو سکتے پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔

"جو اتصال سے پیدا ہوتا ہے وہ ازلی ابدی کبھی نہیں ہو سکتا۔"

(ستیارتھ پرکاش صفحہ ۵۵۷ سملاس ۱۲ نمبر ۶۲)

نتیجہ یہ ہے کہ سوامی جی جس مادہ کو قدیم کہتے ہیں۔ وہ خود اُن کے قول سے حادث

(نویں) بن گیا۔

اور اگر صورتِ اول ہے یعنی اُن پر مانوؤں میں جن کو آپ دنیا کا مادہ مانتے ہیں تقسیم کی استعداد اور قابلیت ہی نہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسے پر مانوؤں کا وجود ہی نہیں ہو سکتا کیوں؟ غور سے سنئے!

اقلیدس کی بیسویں شکل کا دعویٰ ہے کہ ہر ایک مثلث کے دو ضلعے تیسرے سے ضرور بڑے ہونگے اور عروسی شکل کا دعویٰ ہے کہ مثلث قائم الزاویہ کے ضلع مقابل قائم الزاویہ پر جو مربع بنے گا وہ دوسرے دونوں کے مجموعہ کے برابر ہوگا۔ پس اسی اصول کو مدنظر رکھ کر ہم مادہ کے دس اجزاء کی لکیر اس طرح (..........) بنا کر دوسری لکیر اس طرح اس کے ساتھ لگا کر تیسرا ضلع ان دونوں پر اس طرح لگاتے ہیں اور بعد ازاں تینوں ضلعوں پر مربع اس طرح بنا کر پوچھتے ہیں کہ بتلایئے بحکم عروسی ضلع الف کا مربع ضلع ب اور ج دونوں کے مجموعہ کے مساوی ہوگا۔ اور اس میں تو شک نہیں کہ مربع ب اور ج ہر ایک سو سو اجزا کا ہے کیونکہ ہر ضلع دس دس اجزاء سے مرکب ہے۔ اور دس دہا کے سو۔ پس مربع الف کا بحکم عروسی دو سو اجزاء کا ہوا اور بوجہ صحیح نہ ہونے جذر دو سو کے ہر ایک ضلع میں کسر ہوگی۔ یعنی مربع کلاں کا جو مقابل زاویہ قائمہ کے بنا تھا کوئی ضلع بلا کسر سالم اجزاء سے مرکب نہ ہوگا۔ پس جن اجزاء کی کسر اُن میں ہوگی وہ تقسیم ہونگے۔ جس سے باقی اجزاء کا قابل تقسیم ہونا بھی ثابت ہو جائے گا۔ کیونکہ نوع سب کی ایک ہی ہے اور قابل تقسیم کا حادث ہونا تو بدیہی امر ہے جسے آپ بھی صفحہ ۵۷ پر مان چکے ہیں۔ پس مادہ کا حدوث اس دلیل سے بھی ثابت ہوا۔

اور سنئے! اس سے بھی آسان طریقہ لیجئے! دو پر مانو (جزو لا یتجزی) کو ہم اس طرح (..) (یہ دونوں جزوں کے درمیان فرق دیکھنے میں ہے۔ رکھتے ہوئے فرق نہ سمجھنا چاہیے)۔ ملا کر رکھیں گے۔ ان سے اوپر تیسرا پر مانو اس طرح (∴) رکھ کر پوچھیں گے کہ تیسرا پر مانو دونوں طرف ملتا ہے یا ایک طرف۔ ایک طرف ملنے

سے وسط میں نہ ہوگا۔ ہم نے تو وسط میں رکھا ہے اور اگر دونوں طرف ملتا ہے تو کچھ شک نہیں کہ اُس کی دو طرفیں ہوں گی۔ جن سے اُس اوپر والے کی تقسیم لازم آئے گی۔ چونکہ نوع سب کی ایک ہے اس لئے سب کی تقسیم اور ترتیب لازم آئے گی۔

اسی تقریر کو اور آسان لفظوں میں سنئے کہ ہم تین پرمانوؤں کو اس طرح (•••) اور سماجی دوستوں سے پوچھتے ہیں کہ درمیان کا پرمانو دونوں طرف ملے گا یا نہیں؟ اگر دونوں طرف ملے گا تو تقسیم اور ترکیب لازم آئی اور اگر باوجود درمیان ہونے کے دونوں طرف نہیں ملتا تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں کمیت (طول عرض) نہیں جب ایک میں نہیں تو باقی میں کہاں سے آئے گا کیونکہ نوع سب کی ایک ہے پس بتلایئے کہ جس کے اجسام میں (جو پرمانوؤں سے مرکب ہیں) کمیت (طول وعرض) کہاں سے آئی۔ کیا نیستی سے ہستی ہونا ناممکن ہے؟ (ستیارتھ پرکاش) صفحہ ۲۸۲، سملاس ۸، نمبر ۱۷) دیکھ کر جواب دینا۔

اور سنئے! ہم آپ سے یہ بھی نہیں پوچھتے کہ آپ کا مادہ قابل تقسیم ہے یا نہیں؟ کچھ بھی ہو ہمیں اس سے بحث نہیں۔ اتنا تو آپ بھی مانتے ہونگے کہ مادہ ابتدائی حالت میں بھی کسی نہ کسی شکل سے متشکل تھا اور یہ امر تو بالکل ظاہر ہے کہ جس شکل سے بھی وہ متشکل ہو وہ شکل حادث ہوگی۔ کیونکہ اگر حادث نہ ہوتی تو زائل بھی نہ ہوتی۔ کیونکہ قدیم کو زوال نہیں۔ چنانچہ آپ بھی مانتے ہیں کہ۔

"جو شے انادی (قدیم) ہے۔ وہ کبھی دُور نہیں ہوسکتی۔"

(ستیارتھ پرکاش صفحہ ۵۶۳ باب ۱۲)

حالانکہ ہم اُس کا زوال بدیہی دیکھ رہے ہیں کہ حالت ترکیب میں مادہ کی پہلی شکل نہیں رہتی اور بعد ازاں بھی ردوبدل ہوتا ہے۔ پس جب تمام اشکال حادثات ہیں اور یہ ضرور ہے کہ مادہ کسی نہ کسی شکل سے متشکل ہو۔ کیونکہ شکل نام ہے اُس کیفیت کا جو کسی چیز کو بوجہ محدود ہونے کے عارض ہوتی ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ مادہ کے اجزاء

اپنے وجود میں محدود ہیں ۔ غیر محدود نہیں ۔ پس نتیجہ صاف ہے ۔ کہ مادہ کے اجزاء کسی حالت میں ہوں جبکہ متشکل ہیں تو مادہ بھی حادث ہے کیونکہ مادہ بغیر کسی نہ کسی شکل کے ہو نہیں سکتا ۔ اور اشکال تو سب کی حادث ہیں کیونکہ زوال پذیر ہیں نتیجہ یہ ہے کہ مادہ کے اجزاء بھی جو کسی نہ کسی شکل کے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ ضرور حادث ہونگے پس بتلایئے کہ آپ کا مادہ کس مادہ سے پیدا ہوا تھا ۔ **وفیه ما فیه فافهم.**

سائنس سے پہلے جھنڈا اڑانے والو ! کہاں ہو ۔ ان دلائل کو سوچو اور شکستہ جھنڈے کی مرمت کراؤ ۔

پس جب تک آپ ان دلائل کا جواب نہ دیں ۔ آپ کا حق نہیں کہ سوال کریں کہ خدا نے دنیا کو کس چیز سے پیدا کیا ۔

ہاں بطور احسان ہم آپ کو آپ ہی کی کتاب سے استنباط کر کے بتلاتے ہیں ۔ سنئے !

پرمیشور کے ہاتھ نہیں ۔ لیکن اپنی طاقت کے ہاتھ سے سب کو بناتا اور قابو رکھتا ہے ۔ پاؤں نہیں ۔ لیکن محیط ہونے کے باعث سب سے زیادہ صاحب سرعت ہے ۔ آنکھ نہیں لیکن سب کو ٹھیک ٹھیک دیکھتا ہے ۔ کان نہیں پھر بھی سب کی باتیں سنتا ہے حواس باطنی نہیں ۔ مگر تمام دنیا کو جانتا ہے ۔ اور اس کو حد کے ساتھ جاننے والا کوئی بھی نہیں ہے ۔ ''

(ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۴۴ سملاس ۷ ، نمبر ۳۶)

اس سے بھی واضح ایشور کا پرمان سنو !

'' اس پرمیشور نے پرتھوی یعنی زمین کے بنانے کے لئے پانی سے رس کو لیکر مٹی بنایا ' اسی طرح اگنی کے رس سے پانی کو پیدا کیا اور آگ کو ہوا سے اور ہوا کو آکاش سے اور آکاش کو پرکرتی (مادہ) سے اور پرکرتی (مادہ) کو اپنی قدرت سے پیدا کیا ۔ ''

(یجر وید اکتیسواں ادھیائے مندرجہ بھومکا سوامی دیانند بیان پیدائش عالم)

اگر کفر اور گناہ مقدر میں لکھے گئے تو کیا سزا دینا ظلم نہیں ہے؟

اعتراض: (منکرین مذہب کا اعتراض)

اگر کفر اور گناہ مقدر میں لکھے گئے تو کیا سزا دینا ظلم نہیں ہے؟

جواب: انسان نہ تو خالق اور فاعل مستقل ہے اور نہ شجر اور حجر کی طرح مجبور محض ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نہ جبر محض ہے نہ قدر محض۔ انسان نہ فاعل مستقل ہے اور نہ شجر اور حجر کی طرح مجبور محض ہے ایک بین بین حالت میں ہے۔ بندہ اپنے افعال کا خالق اور فاعل مستقل نہیں۔ فاعل مستقل اور خالق تو ہر شئے کا خدا تعالی ہی ہے لیکن اس قادر مطلق اور مختار کل نے کچھ قدرت اور اختیار اور ارادہ بندہ کو بھی عطا کیا ہے کہ جس سے بندہ اپنے مولی کی اطاعت اور فرمانبرداری کر سکے۔ اسی وجہ سے بندہ کو کاسب کہا جاتا ہے۔ اور اس خدا داد قدرت اور اختیار سے بندہ جو فعل کرتا ہے اصطلاح شریعت میں اس کو کسب کہتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے بھلائی اور برائی اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اور اسی کسب پر مدح اور ذم کا مستحق ہوتا ہے۔ اور اسی پر جزاء وسزاء ثواب اور عذاب ملتا ہے

چلا عدم سے میں ہستی کو بول اٹھی تقدیر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا

لہذا برے افعال کے ارتکاب سے بندہ ہی کو برا کہا جائے گا خالق ہونے کی وجہ سے خدا تعالی کی طرف کوئی برائی منسوب نہیں کی جا سکتی۔ تلوار چلانے والے ہی کو قاتل کہا جاتا ہے۔ تلوار بنانے والے کو نہ کوئی قاتل کہتا ہے اور نہ کوئی برائی اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے تلوار کا بنانا تو کمال ہی کمال ہے لیکن اگر اس کا استعمال بے محل ہے تو وہ بلاشبہ معیوب اور مذموم ہے۔ رنگریز کو اسود یعنی سیاہ نہیں کہا جا سکتا جو کپڑا سیاہ رنگ میں رنگ گیا ہے اسی کو سیاہ کہا جائے گا۔ اسی طرح کافر اور گمراہ وہی کہلائے

گا جو کفر اور ضلالت کی سیاہی میں رنگین ہے۔ جس نے کفر اور ضلالت کی سیاہی کو پیدا کیا اس کی طرف کوئی برائی منسوب نہیں کی جاسکتی اس خلاق عالم نے تو سیاہ اور سفید کفر اور ایمان ہر قسم کے رنگ پیدا کیے اور تمہارے سامنے کر دیئے اور خوب اچھی طرح بتلا دیا کہ یہ رنگ اچھا ہے اور یہ برا بھلے اور برے میں امتیاز کے لئے تم کو عقل دی کرنے اور نہ کرنے کی تم کو قدرت دی۔ اس پر بھی اگر کوئی ایمان کے صاف اور سفید رنگ کو چھوڑ کر کفر کی سیاہی اپنے قلب کو لگا لے تو یہ اس کا قصور ہے۔

حکایت:

امام اعظم ابو حنیفہؒ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ امام موصوف نے امام جعفر صادقؒ سے یہ دریافت کیا کہ ''اے صاحبزادۂ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا حق تعالی نے کوئی امر بندوں کے سپرد فرمایا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے جو چاہیں کریں؟'' ارشاد فرمایا کہ اللہ عزوجل اس سے پاک اور منزہ ہے کہ اپنی ربوبیت بندوں کے سپرد فرمائے۔ امام ابو حنیفہ نے عرض کیا کہ کیا اللہ تعالی نے بندوں پر کوئی جبر کیا ہے اور کسی چیز کے کرنے پر ان کو مجبور کیا ہے؟ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالی کی شان عدل سے یہ بعید ہے کہ وہ بندوں کو کسی امر پر مجبور کرے اور پھر اس پر ان کو عذاب دے۔ امام ابو حنیفہؒ نے عرض کیا کہ پھر کیا صورت ہے۔ تو فرمایا کہ حالت بین بین ہے نہ جبر ہے اور نہ تفویض نہ اکراہ ہے اور نہ تسلیط۔ (مکتوبات مجدد الف ثانیؒ)

پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ بندہ شجر اور حجر کی طرح مجبور نہیں بلکہ خداوند ذوالجلال نے اس کو کچھ اختیار اور ارادہ عطا فرمایا ہے کہ جس سے وہ اپنے سخت سے سخت دنیوی کاروبار چلاتا ہے اور قوانین حکومت کا مکلّف اور پابند سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ خود بھی اپنے کو آئین اور دستور کا پابند سمجھتا ہے تو سمجھ لو کہ اسی طرح بندہ احکام الٰہیہ کا بھی مکلّف ہو سکتا ہے۔ اور اسی خداداد اختیار سے جو افعال اس سے صادر ہوں ان پر مدح و ذم ثواب اور عتاب جزاء اور سزا مرتب ہو سکتی ہے۔ اور اسی خداداد اختیار سے بندہ جو فعل

کرتا ہے اسی کا نام اصطلاح شریعت میں کسب ہے۔

لہٰذا یہ شبہ تو کافور (دور) ہوا کہ اگر خدا تعالیٰ ہی بندہ کے افعال کا خالق ہو تو ایسی صورت میں بندہ کا کیا قصور اور ایسی صورت میں بندہ کو سزا دینا ظلم ہے۔

یہ آدمی جھوٹ بولتا ہے خدا تعالیٰ نے کوئی ظلم نہیں کیا یہ خود ہی ظالم ہے کہ دیدہ و دانستہ اور بہزار رضاء و رغبت باوجود اس پر ممانعت کے معصیت کا مرتکب ہوا اور پھر اپنے کو مظلوم بتاتا ہے کیا یہ کھلی ہوئی بے حیائی نہیں کہ جرم خود کرتا ہے۔ اور اس کی ذمہ داری خداوند قدوس پر رکھنا چاہتا ہے۔

(علم الکلام مولانا محمد ادریس کاندھلوی صفحہ ۷۰ تا ۷۳)

کیا زنا کا موجد خدا ہے

اعتراض: (چوبے بدریداس ہندو کا اعتراض)

قرآن حدیث اور مشائخ کے اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر رات دن میں زنا ہوتے ہیں سب کا موجد مسلمانوں کا خدا ہے۔

جواب: جیسا قرآن وحدیث سے ثابت ہے ویسا ہی بیدوں اور مہابھارت اور پوران سے ثابت ہے (اور بائبل سے بھی ایسے ہی ثابت ہے) کہ جو کچھ ظہور میں آتا ہے اس کا خالق خدا تعالیٰ ہے وہی مسلمانوں اور ہندوؤں کا پیدا کرنے والا ایک خدا ہے مگر مسلمانوں کا یہ مذہب نہیں ہے کہ گناہ کا یہ کسب اور عمل خدا تعالیٰ کا کسب اور عمل ہے۔ عقل خود فیصلہ کر رہی ہے کہ کاسب اور خالق میں بڑا جلی اور واضح فرق ہے۔

آپ چونکہ بید کے دین کے محقق ہیں ہم اس مکان میں بید کے اعتقاد پر اصرار نہیں کرتے۔ شاید بید کا یہی اعتقاد ہو کہ جو موجد اور خالق افعال ہے وہی کاسب اور عامل ہے۔

اسلام پر اعتراض کرنے والا عقل کا دشمن اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لے

کہ جس صورت میں تیرا خدا ہی سارے زنا کرتا ہے اور تیری عقل کے نزدیک زنا کار نہیں پس تو کس کا زنا ثابت کرے گا۔

عقل کے دشمن تخلیق اور کسب میں جو واقعتاً دو الگ الگ چیزیں ہیں کچھ تمیز نہیں کرتے ہو اور خالق فعل کو زانی بتاتے ہو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اور پردۂ جہالت آنکھوں سے اٹھا کر دیکھئے کہ آپ کی یہ ساری بات آپ پر ہی صادق آگئی کیونکہ جب آپ کے نزدیک خیر اور شر کا فاعل خدا تعالیٰ ہی ہے اور کاسب اور فاعل میں آپ کچھ فرق نہیں کرتے تو لامحالہ آپ کو اپنا تھوکا چاٹنا پڑا۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ بندوں کے پہلے جنم کے نیک اور برے عمل کے موافق اس جنم میں خیر اور شر کو وجود بخشتا ہے۔ آپ کو کچھ مفید نہیں کیونکہ اس توجیہ سے زنا کے ارتکاب کا جرم ہندوؤں کے اعتقاد کے بموجب ذات منزہ باری تعالیٰ پر عائد ہوتا ہے دور نہیں ہوتا: نتیجہ یہ کہ بلا وجہ زنا نہیں کرتا باوجہ زنا کرتا ہے حالانکہ زنا خواہ باوجہ یا بے وجہ ہر حال میں مذموم اور معیوب ہے اور ذات منزہ باری تعالیٰ ہر حال میں اس سے پاک ہے۔ (سوط اللہ الجبار ۳/ ۴۹)

کیا شر اور برائی خدا کی مرضی سے واقع ہوتے ہیں؟

اعتراض: (منکرین مذہب کا اعتراض)

اب یہ شبہ باقی رہ گیا کہ شر اور برائی کا اس کی مشیت سے واقع ہونا اس کی شان تقدس کے خلاف ہے۔

جواب: خلق قبیح۔ قبیح نہیں۔ اور ایجاد شر۔ شر نہیں۔

پاخانہ (بیت الخلاء) فی حد ذاتہ بے شک ناپاک اور بہت بری چیز ہے مگر قصر شاہی کے لئے اس کا وجود ضروری ہے۔ قصر شاہی بغیر بیت الخلاء کے غیر مکمل اور ناتمام ہے سیاہ بال اور سیاہ خال اگرچہ فی حد ذاتہ بدنما اور برے ہیں۔ مگر آفتاب اور

ماہتاب جیسے چہرہ کی رونق اور دل آویزی کو جس حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ غالباً اس سے کوئی بے خبر نہیں۔ معدہ اور امعاء (آنتیں) اگرچہ سرتا پا نجاست ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ مدار حیات ہیں۔

بہر حال یہ چیزیں گو انفرادی طور پر بری ہیں مگر مجموعہ کے لحاظ سے خیر محض ہیں مجموعہ بغیر ان کے بے زیب رہتا ہے جس طرح ایک انسان میں بغیر خال اور سیاہ بالوں کے حسن نہیں پیدا ہوتا۔ اسی طرح مجموعہ عالم میں بدون کفر اور ضلالت کی سیاہی کے حسن نہیں پیدا ہوسکتا۔ مجموعہ عالم میں حسن جب ہی آ سکتا ہے کہ جب اس میں حسین چہرہ کی طرح ایمان وہدایت بھی ہو اور سیاہ بالوں اور نجاست معدہ کی طرح کفر وضلالت بھی ہو۔

ایمان وہدایت اپنی ذات سے حسین ہیں اور کفر وضلالت اپنی ذات سے قبیح۔ مگر ایجاد اور خلق دونوں کا حُسن اور خیر ہے۔ کیونکہ مجموعہ عالم کے لئے جیسے خیر کی ضررت ہے ویسے ہی شر کی بھی ضرورت ہے ورنہ مقصد ناقص اور ناتمام رہتا ہے۔

(علم الکلام صفحہ ۷۳، ۷۴)

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی طرف سے جواب:

اس لئے کہ ایجاد عالم سے مقصود حق تعالی کا کوئی اپنا ذاتی نفع اور نقصان نہیں بنانے سے اس کے کمالات میں کوئی اضافہ نہیں اور نہ بنانے سے کوئی کمی نہیں مقصد صرف اس قدر ہے کہ اپنے کمالات اور صفات کے مظاہر پیدا فرمائے اور اپنی خوبیوں کو ظاہر کرے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے کمالات کسی ایک دائرہ میں محدود نہیں۔ بلکہ مختلف قسم کے ہیں۔ اگر وہ رحم وکرم کا مالک ہے تو عقاب والم کا بھی مالک ہے۔ معز اور مذل ہے تو منعم اور منتقم بھی ہے۔ پس اگر بعض صفات کمالیہ کے مظاہر پیدا کئے جائیں اور بعض کے نہ پیدا کئے جائیں تو مقصد ناتمام رہتا ہے۔ اس لیئے ضروری ہوا کہ انعام اور انتقام اعزاز اور اکرام دونوں ہی کے مظاہر پیدا کئے جائیں۔ یعنی مؤمن بھی

ہوں اور کافر بھی۔ دار انعام بھی ہو اور دار انتقام بھی۔ ابوبکر اور عمر بھی ہوں ابوجہل اور ابولہب بھی ہوں۔

در کار خانہء عشق از کفر ناگزیرست
دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نہ باشد

(یعنی کارخانہ عشق میں کفر بھی ضروری ہے۔ اگر ابولہب نہ ہو تو دوزخ کس کو جلائیگی)۔

(امداد اللہ انور)

پس منکرین کو اس واسطے پیدا کیا تاکہ ان کو عذاب دے اور صفت قہر و غضب کا اظہار ہو۔ اور مؤمنین کو اس لئے پیدا کیا تاکہ ان کو مورد الطاف بنائے اور صفت ترحم کا اظہار ہو۔ اور گنہگاروں کو اس لیئے پیدا فرمایا تاکہ صفت عفو اور مغفرت کا اظہار ہو۔

جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَحِيْمًا"۔

(سورۃ الاحزاب: ۷۳)

(تاکہ حق تعالیٰ منافقین اور منافقات کو اور مشرکین اور مشرکات کو عذاب دیں اور مؤمنین اور مؤمنات پر توجہ فرمائیں اور بے شک حق تعالیٰ غفور و رحیم ہیں)۔

صراط مستقیم مصنفہ مولانا اسمٰعیل صاحب شہید رحمہ اللہ ص ۴۷۔

وتفسیر غرائب القرآن العلامۃ النیشابوری ج ا ص ۱۴۵ مطبوعہ برحاشیہ تفسیر ابن جریر طبریؒ ۱۲)

حضرت نانوتویؒ کی طرف سے جواب:

انسان دست قدرت پر ایسا ناچتا ہے جیسا کہ ایک پتلی، پتلی والے کے ہاتھ پر ناچتی ہے، پتلی والا کبھی پتلی سے بادشاہ اور وزیر کا کام لیتا ہے اور کبھی جاروب کش اور

بھنگی کا کام لیتا ہے جو چاہتا ہے اچھا اور برا کام اس سے لیتا ہے مگر پتلی کو انکار کی گنجائش نہیں اور نہ پتلی کو یہ حق ہے کہ پتلی والے سے یہ سوال کر سکے کہ مجھ سے جاروب کش کا کام کیوں لیا اور بادشاہ کا کام کیوں نہیں لیا۔ حالانکہ وہ پتلی بھی پتلی والے کی طرح خدا کی مخلوق ہے پس جبکہ ایک پتلی پتلی والے سے یہ سوال نہیں کر سکتی تو مخلوق کو خالق سے سوال اور محاسبہ کا کہاں حق ہو سکتا ہے کہ مجھ کو نالائق و ناہنجار یعنی کافر و بدکار کیوں بنایا اور فلاں کو صالح اور نیک اطوار یعنی مؤمن کیوں بنایا۔

(تقریر دلپذیر صفحہ ۹۰)

مالک کو اختیار ہے کہ جس تختہ کو چاہے شہ نشین میں لگائے اور جس تختہ کو چاہے بیت الخلاء کے قدمچہ میں لگائے اور جس تختہ سے چاہے قرآن رکھنے کی رحل بنائے' جس لکڑی کو چاہے چھت میں لگائے اور جس کو چاہے چولہے کا ایندھن بنائے۔ نہ یہ کوئی ظلم ہے نہ کسی کو مجال دم زدنی ہے اور نہ کسی تختہ کو کسی قسم کے سوال کا کوئی حق ہے مالک کو اختیار ہے کہ جس لوہے سے چاہے تلوار بنائے اور جس لوہے سے چاہے اپنے گھوڑے کے نعل بنوائے۔ (صراط مستقیم صفحہ ۴۷)

مکان میں راحت اور آرام کے لئے دالان اور قضائے حاجت کے لئے پاخانہ (بیت الخلاء) بناتے ہیں۔ اگر پاخانہ کی زبان ہو اور وہ یہ شکایت کرے کہ میرا کیا قصور ہے کہ ہر روز مجھ میں نجاست اور گندگی ڈالی جاتی ہے اور دالان نے کیا انعام کا کام کیا ہے کہ فرش اور قالینوں اور گلدستوں سے آراستہ ہے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ تو اسی لائق ہے اور ہم نے تجھ کو اسی لئے بنایا ہے اور وہ اسی قابل ہے اور اس کو اسی لئے بنایا ہے۔ (حجۃ الاسلام صفحہ ۲۷)

ایسا ہی بدوں اور گندوں (کافروں) کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ سوال کر سکیں کہ ہم کو ایسا کیوں بنایا اور ہم کو کیوں دوزخ میں ڈالا جاتا ہے اور اگر یہ سوال کریں تو یہی جواب ہے کہ تم اسی لائق ہو۔ ہم نے تم کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ تم ہماری جہنم کا ایندھن بنو۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ. (سورۃ الاعراف:۱۷۹)

ہر یکے را بہر کارے ساختند

میل او در دلش انداختند

ترجمہ: ہر ایک کو کسی کام کیلئے پیدا کیا ہے اس کے دل میں اسی کا میلان ڈال دیا ہے۔

کسی کوزہ کا بدنما ہونا کوزہ گر کے بدنما ہونے کو مستلزم نہیں۔ کسی حرف کا بدنما ہونا کاتب کے بدنما ہونے کی دلیل نہیں۔ اس لئے کہ کوزہ۔ کوزہ گر سے اور حرف کاتب سے ایک منفصل اور جدا چیز ہے۔ (علم الکلام صفحہ ۷۷ منتخبا)

حضرت تھانویؒ کی طرف سے جواب:

یہ مجبوری عمل کرنے کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ یعنی جب گناہ کر چکا اس وقت خبر ہوئی کہ یہ گناہ میری قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ اس کے قبل جب گناہ کیا ہے۔ اس کی خبر نہ تھی۔

اور اگر کہا جائے۔ کہ گو اس کو تقدیر کا علم نہ تھا۔ مگر واقع میں تو علم الٰہی اس کے متعلق تھا اور اس کے خلاف ہونا محال ہے۔ تو اس طرح وہ مجبور ہوا۔ تو جواب یہ ہے۔ کہ علم الٰہی اس طرح تھا کہ یہ شخص اپنے اختیار سے ایسا کرے گا۔ تو اختیار منفی ہوا۔ یا اور پختہ ہو گیا۔

حضرت تھانویؒ سے سوال کیا گیا کہ اگرچہ انسان کا مجبور ہونا لازم نہیں آتا۔ لیکن خدائے تعالیٰ رحیم ہیں۔ اس لئے اگر اپنی رحمت سے ہوائے نفسانی کو پیدا ہی نہ کرتے تو انسان کے لئے بہتر ہوتا۔

اس پر فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی متعدد صفات ہیں۔ ازاں جملہ ایک صفت حکیم ہونا بھی ہے اور ہر صفت کا ایک خاص ظہور ہے۔ پس جس طرح ہوائے نفسانی وغیرہ پیدا نہ ہونا مقتضائے رحمت ہے۔ اسی طرح اُن کا پیدا ہونا مقتضائے حکمت ہے۔

رہا یہ سوال کہ وہ حکمت کیا ہے؟

اس کا اصل جواب یہ ہے کہ ہم کو اس حکمت کی اطلاع نہیں ہے اور فرمایا کہ۔

یہ جواب کم فہموں کے نزدیک زبردستی کا جواب معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اصل جواب یہی ہے۔ البتہ اس جواب کی حقیقت سمجھنے کے لئے اس سے قبل چند مقامات سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جب تک وہ سمجھ میں نہ آئیں اس وقت تک اُس کی حقیقت سمجھنی مشکل ہے۔ اور اس وقت یہ زبردستی کا جواب نظر آتا ہے۔ پھر فرمایا کہ جب انسان کے ہر عمل میں اختیار کا سلسلہ امور غیر اختیاریہ تک پہنچتا ہے۔ جس سے اہل سائنس بھی انکار نہیں کرتے اور بنائے تقدیر یہی امر ہے۔ جیسا اوپر بیان ہوا۔ تو اہل طبیعات کو تقدیر کا ضرور ہی قائل ہونا چاہئے کیونکہ وہ لوگ تو اس مسئلہ انتہاء الاختیار الی غیر الاختیار کو اس حد تک مانتے ہیں کہ خدا تعالی کے افعال اختیاری کو بھی اس قاعدہ کا پابند کرتے ہیں۔ چنانچہ تخلیق اختیاری کو موقوف مانتے ہیں۔ وجود مادہ قدیمہ پر، جس کو اختیار خداوندی سے خارج کہتے ہیں۔ گو اہل حق اس کے قائل نہیں۔ پس اس تسلیم کردہ مسئلہ کی بنا پر ان طبیعیین کو تو ہم سے زیادہ قائل تقدیر ہونا چاہئے۔ (مجادلات معدلت دعوات عبدیت حصہ دوم ملفوظ نمبر۲۲)

جبر اور اختیار کی حقیقت

انسان سے افعال کا صدور دو طرح پر ہوتا ہے ایک یہ کہ انسان کسی شئے کا تصور کرے اگر وہ چیز اس کی طبیعت کے موافق ہوئی تو اس کے قلب میں اس کے کرنے کی خواہش اور رغبت پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر نہایت ذوق وشوق کے ساتھ اس کے حاصل کرنے کے لئے حرکت کرتا ہے۔ اور اگر وہ شے اس کی طبیعت اور منشاء کے خلاف ہوتی ہے تو قلب میں اس کی نفرت اور کراہت پیدا ہوتی ہے۔ اور بصد کراہت و ناگواری اور بہزار نفرت و بیزاری اس کے دفع کرنے کے لئے حرکت کرتا ہے۔ لہٰذا انسان سے جو حرکت شوق اور رغبت یا نفرت اور کراہت کی بناء پر ظہور میں آئے۔ اسی

کا نام فعل اختیاری ہے اور جو حرکت بغیر کسی شوق اور خواہش کے ظہور میں آئے۔ جیسے حرکت مرتعش (مرتعش وہ کہ جس کے ہاتھ اور بدن میں رعشہ ہوگیا ہو) تو وہ حرکت جبری اور اضطراری کہلائے گی۔ تمام عقلاء کے نزدیک پہلی حرکت اختیاری ہے اور بندہ سے اس اختیار کی نفی اور انکار ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی یہ کہے کہ انسان نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے پس جس طرح انسان سے سمع اور بصر کا انکار سراسر مشاہدہ کا انکار ہے۔ اسی طرح سے بندہ سے اختیار کی نفی سراسر محسوس اور مشاہد چیز کی نفی کرنا ہے۔ اور جس طرح دنیا میں اس اختیار پر جزاء وسزاء مرتب ہورہی ہے اس طرح آخرت میں بھی اسی اختیار پر ثواب اور عقاب مرتب ہوگا۔

الغرض انسان سے جو فعل اور جو حرکت ظہور میں آتی ہے عقلاء کے نزدیک اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اختیاری جو شوق اور رغبت سے ہو اور دوسری اضطراری جس میں انسان کی کسی قسم کی خواہش کو دخل نہ ہو۔ جیسے حرکت رعشہ۔

اور ظاہر ہے کہ حق جل وعلا کی قضاء وقدر اور حیطہ (احاطہ) علم سے کوئی حرکت بھی باہر نہیں۔ جس حرکت کے متعلق جس طرح خدا تعالی نے قضاء وقدر اور حیطہ (احاطہ) علم سے کوئی حرکت بھی باہر نہیں۔ جس حرکت کے متعلق جس طرح خدا تعالی نے قضاء و قدر میں لکھدیا ہے وہ حرکت اسی طرح ظہور میں آئے گی اور اگر اضطراری لکھدیا ہے تو بندہ سے اس فعل اور حرکت کا صدور بلا اختیار ہوگا۔ معلوم ہوا کہ قضا وقدر کے متعلق ہونے سے افعال عبد کی تقسیم پر (کہ بعض افعال اختیاری اور بعض اضطراری ہیں) کوئی اثر نہیں پڑتا۔

یہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے کلام کا خلاصہ اور توضیح ہے جو حضرت موصوف نے جبر و اختیار کے متعلق تکمیل الایمان ص ۳۳ پر تحریر فرمایا ہے۔

شبہ:

اس تقریر سے یہ شبہ بھی رفع ہوگیا کہ جب قضاء وقدر میں ابوجہل کا کفر مقدر ہو چکا

تھا کہ ابوجہل ایمان نہ لائے گا۔ تو پھر ابوجہل کا کفر ضروری اور ایمان لانا محال اور ممتنع ہوگا۔ اس لئے کہ علم الٰہی کا غلط ہونا ناممکن اور محال ہے اور جب کفر ضروری ہوا تو پھر بندہ کو ایمان کا کہاں اختیار باقی رہا لہٰذا جبر لازم آیا۔

جواب:

یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا کہ زید فلاں کام اپنے اختیار سے کرے گا اور فلاں کام اس سے بلا اختیار سرزد ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے علم سے اختیار زائل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ تو اختیاری اور اضطراری سب ہی امور کو جانتا ہے نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کے افعال بالاتفاق اختیاری ہیں۔ حالانکہ وہ ازل میں اپنے افعال کو بھی جانتا تھا کہ فلاں وقت فلاں کو یہ شئے عطا کروں گا۔ پس جس طرح علم ازلی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا اختیار نہیں جاتا رہا۔ اسی طرح علم ازلی سے بندوں کے اختیار اور ارادہ کا زائل ہونا لازم نہیں آتا۔

(علم الکلام صفحہ ۹۰ تا ۹۲)

کیا خدا کو دیکھنا ممکن ہے؟

اعتراض: (فلسفیوں اور معتزلیوں کا اعتراض)

کیا خدا کو دیکھنا ممکن ہے؟

جواب: قرآن اور حدیث اور اجماع صحابہ اور تابعین سے یہ امر ثابت ہے کہ اہل ایمان جنت میں دیدار خداوندی سے مشرف اور سرفراز ہوں گے۔ جس طرح وہ خداوند ذوالجلال بندوں کو دیکھتا ہے اور خود مکان اور جہت سے پاک اور منزہ ہے اور بندے مکان اور جہت میں ہیں اسی طرح عقلاً یہ بھی ممکن ہے کہ بندے اس خدائے ذوالجلال کو اس طرح دیکھیں کہ بندے تو کسی خاص سمت اور مکان میں ہوں اور خداوند قدوس سمت اور مکان سے پاک اور برتر ہو۔

رویت (دیکھنے) کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جس شئے کو دیکھا جائے وہ جسم ہی ہو

اور کسی خاص سمت اور مکان میں ہو یہ تمام باتیں رویت کی شروط عادیہ ہیں عقلاً جائز ہیں کہ رؤیت کی تمام شروط موجود ہوں لیکن اگر حق تعالیٰ شانہ نہ چاہیں تو رؤیت نہ ہو۔

بلی اندھیری رات میں چوہے کو دیکھتی ہے مگر ہم نہیں دیکھتے۔ آسیب والا جنات کو دیکھتا ہے اور ان سے باتیں کرتا ہے مگر ہم نہیں دیکھتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جبریل امین کو دیکھتے اور ان سے باتیں کرتے تھے مگر حاضرین مجلس جبریل امین کی دید سے محروم تھے۔

اسی طرح عقلاً یہ بھی جائز ہے کہ بغیر ان شروط مزعومہ کے رؤیت ہو سکے صورت اولی میں رؤیت کی شروط موجود تھیں مگر رؤیت منتفی تھی۔ صورت ثانیہ اس کا عکس ہے کہ شروط مزعومہ منتفی ہوں اور رؤیت متحقق ہو۔ آخر آج بھی تو حق تعالیٰ کو دل کی آنکھ سے بے کیف دیکھتے ہیں قیامت کے دن سر کی آنکھوں سے بے کیف دیکھیں گے۔

مکان کو بغیر مکان کے اور جہت کو بغیر جہت کے دیکھتے ہیں حالانکہ مکان کسی مکان میں نہیں اور جہت کسی جہت میں نہیں ورنہ تسلسل لازم آئے۔ اسی طرح اگر حق تعالیٰ شانہ بغیر مکان اور جہت کے نظر آئیں تو کیوں محال سمجھتے ہو۔ مکان اور جہت تو مخلوق خداوندی میں بھی شرط نہیں جب وہ جہت اور مکان سے منزہ ہو کر نظر آ سکتے ہیں تو خالق کون و مکان کے دیدار کے لیئے مکان اور جہت کی شرط کیوں ہے۔ اور علی ہذا رویت کے لئے مرئی کا احاطہ بھی شرط نہیں۔ ہم آسمان کو دیکھتے ہیں۔ مگر ہم آسمان کو محیط نہیں۔ نیز رؤیت، علم اور معرفت کی ایک خاص نوع ہے اور علم اور معرفت کے لیئے ان علوم کو کسی مکان اور جہت میں ہونا کسی عاقل کے نزدیک شرط ادراک نہیں بس جس طرح باری تعالیٰ کی معرفت بغیر کسی کیفیت اور صورت اور بغیر کسی مکان اور جہت کے ممکن ہے اسی طرح اس کی رؤیت بھی بغیر کسی مکان اور جہت کے ممکن ہے۔

قال الاستاذ ابو القاسم القشیری سمعت ابابکر ابن فورک یقول سئل الاستاذ ابو سهل عن جواز رؤیة الله تعالی من

طریق العقل فقال الدلیل علیه شوق المؤمنین إلی لقائه والشوق إرادة مفرطة والإرادة لا تتعلق بالمحال فقال السائل ومن الذی یشتاق إلی لقائه فقال الاستاذ إبو سهل یشتاق إلیه کل حر مؤمن فأما من کان مثلک فلا یشتاق.

طبقات الشافعیۃ الکبریٰ فی ترجمۃ محمد بن سلیمان ابی سہل ص ۱۶۳ ج ۲۔

ترجمہ:- استاذ ابو القاسم قشیریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوبکر بن فورک کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ایک مرتبہ استاذ ابوسہل سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا عقلاً اللہ تعالیٰ کی رؤیت ممکن ہے فرمایا کہ لقاء خداوندی اور دیدار الٰہی کی طرف اہل ایمان کا اشتیاق اس کے امکان کی دلیل ہے اس لیئے کہ شوق ارادۂ مفرطہ کا نام ہے اور ارادہ محال سے متعلق نہیں ہوتا۔ پھر سائل نے یہ دریافت کیا کہ وہ کون ہے جو اس کی لقاء کا مشتاق ہے فرمایا کہ ہر مخلص مسلمان لقاء خداوندی کا مشتاق ہے البتہ تجھ جیسا بے حس مشتاق نہیں۔

حق تو یہ ہے کہ اشتیاق خلاف عقل نہیں بلکہ عدم اشتیاق خلاف عقل ہے عقلاً یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنے مربی اور محسن کی لقاء اور دیدار کا مشتاق نہ ہو جب کبھی کوئی پریشانی پیش آتی ہے تو نظریں اس کی طرف اٹھتی ہیں اور دل اس کی طرف دوڑتا ہے۔ یہ اشتیاق نہیں تو اور کیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کا کلام سنا۔ کلام سے متکلم کا اشتیاق پیدا ہوا اور دیدار کی درخواست کی ”رَبِّ اَرِنِیۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ“ جواب ارشاد ہوا ”لَنۡ تَرٰىنِیۡ“ یعنی تم دیکھ نہ سکو گے اور میرے جمال بے مثال کی تاب نہ لاسکو گے۔ موسیٰ علیہ السلام کی یہ مشتاقانہ درخواست خود اس کے ممکن ہونے پر دلالت کرتی ہے اگر دیدار خداوندی کوئی محال چیز ہوتی تو خود موسیٰ علیہ السلام سوال نہ فرماتے اور یہ ناممکن ہے کہ اللہ کے نبی کو یہ علم نہ ہو کہ کونسی چیز بارگاہ خداوندی میں ممکن ہے اور کونسی محال۔ نیز حق جل وعلا کا جواب خود اس کے امکان پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے کہ جواب میں یہ

فرمایا "لَنۡ تَرَانِیۡ" "تم نہیں دیکھ سکو گے اور یہ نہیں فرمایا کہ "لَنۡ اُرٰی" کہ میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ یعنی میری رویت ممکن نہیں۔

اگر کوئی شخص کسی کے دامن یا برتن میں کھانے کی چیز سمجھ کر یہ کہے کہ "اَعۡطِنِیۡہِ لِاٰکُلَہٗ" یعنی یہ چیز مجھ کو کھانے کے لئے دیدیجئے اگر وہ چیز جنس غذا اور جنس طعام ہی سے نہ ہو تو یہ جواب دیں گے "انہ لا یوکل" یہ چیز کھانے کی نہیں ہے اور اگر وہ چیز جنس طعام سے ہو تو یہ جواب دیں گے "اِنک لن تأکلہ" یعنی تم نہیں کھا سکتے مطلب یہ ہے کہ چیز اگرچہ کھانے کی ہے مگر تمہارا معدہ اس کو برداشت نہ کر سکے گا۔

اسی طرح حق تعالیٰ شانہ کا جواب میں "لن ترانی" فرمانا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میں اس قابل ہوں کہ دیکھا جاؤں میری طرف سے کوئی حجاب نہیں مگر تم میں دیدار کے تحمل کی قوت نہیں اس لیئے تم مجھ کو اس وقت نہیں دیکھ سکتے۔ آخرت میں قوت تحمل عطا کر دی جائے گی اس لیئے وہاں دیکھ سکیں گے۔ دنیا دار فناء ہے اور آخرت دار بقاء ہے آخرت میں پہنچ جانے کے بعد نہ کسی کو موت آئے گی نہ کوئی بیمار ہوگا اور نہ کسی کو ضعف لاحق ہوگا۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کشمیر کی تعریف میں کہا ہے۔

برسوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید
گر مرغ کباب است بابال وپر آید

(جو سوختہ جان کشمیر میں آ جائے اگر مرغ کباب ہو چکا تب بھی بال و پر کیساتھ زندہ ہو جائے، (امداد اللہ انور))

ہر جگہ کی خاصیت جدا ہے بعض جگہوں کی آب و ہوا کمزور ہوتی اور بعض مقامات کی آب و ہوا قوی ہوتی ہے اسی طرح آخرت کو سمجھو کہ وہاں قوت ہی قوت ہو گی ضعف کا نام ونشان نہ ہوگا اس لئے وہاں پہنچ کر دیدار خداوندی کا تحمل ہو سکے گا علاوہ ازیں کلمہ "لن" کلام عرب میں نفی وجود کے لیئے مستعمل ہوتا ہے۔ نفی امکان کے لئے نہیں آتا۔

خلاصہ کلام:

یہ کہ دیدارِ خداوندی عقلاً ممکن ہے اور مخبرِ صادق نے اس کے وقوع کی خبر دی ہے لہٰذا اس پر ایمان لانا واجب اور ضروری ہے۔ ہاں اس کی حقیقت اور کیفیت سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں عوام مومنین کو ہر جمعہ کو دیدار ہوگا وار خواص کو روزانہ صبح اور شام ہوگا اور عورتوں کو عیدین کے موقعہ پر۔

آیات اور روایات حدیث کی تفصیل اگر درکار ہو تو حادی الارواح الی بلاد الافراح للحافظ ابن قیم۔ کی طرف مراجعت کریں۔ (علم الکلام صفحہ ۴۱۲ تا ۴۱۵)

اردو میں دلائل ملاحظہ کرنے کے لئے میری کتاب ''جنت کے حسین مناظر'' کی طرف رجوع فرمائیں۔ (امداد اللہ انور)

کیا خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کرے

اعتراض: (ہندوؤں اور عیسائیوں کا اعتراض)

کیا خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کرے

جواب: اسلام وہ چیز ہے کہ اس کے بغیر مغفرت ونجات ممکن نہیں یہ مطلب نہیں کہ خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کردے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ کافر کی مغفرت چاہے گا نہیں۔ گو قادر ضرور ہے۔ ورنہ تعذیب کافر پر خدا تعالیٰ کا مجبور ہونا لازم آئے گا اور اضطرار منافی وجوب ہے اور بغیر ایمان اسلام کے حق تعالیٰ کا کسی کافر کی مغفرت نہ چاہنا قرآن شریف میں جابجا مذکور ہے۔

چنانچہ ایک آیت تو وہی ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ.

مگر شاید کوئی اس پر شبہ کرے کہ یہاں تو صرف مشرک کا ذکر ہے کفر کا ذکر نہیں ہے۔ اور بعض کافر ایسے ہیں کہ جو مشرک بھی نہیں بلکہ موحد ہیں مگر اسلام سے انکار کرتے ہیں۔ ان کی مغفرت نہ ہونا اس آیت میں کہاں مذکورہ ہے۔

تو سنئے دوسری جگہ مذکور ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ

وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اُولٰئِکَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ. اس میں کافر کو اہل کتاب ومشرکین کا مقسم (قسم) قرار دیا گیا ہے اور دونوں کے لئے خلود فی نار جہنم (دائمی جہنم) مذکور ہے۔ جس سے کافر کی مغفرت نہ ہونا بھی معلوم ہو گیا۔

اور یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ یہاں تو صرف خلود کا ذکر ہے جس کے معنی طویل عرصہ کے ہیں اور اس کے لئے دوام لازم نہیں۔

جواب یہ ہے کہ دوام خلود کے منافی بھی نہیں۔ پس اگر کوئی قرینہ قائم ہو تو خلود سے دوام کا قصد ہوسکتا ہے اور یہاں خلود بمعنیٰ دوام ہونے پر قرینہ قائم ہے وہ یہ کہ مشرکین کے لئے خلود بمعنیٰ دوام ہوگا۔ اور یہاں کافر و مشرک دونوں کا حکم مذکور ہے جب مشرک کے لئے خلود بمعنیٰ دوام ہے تو کافر کے لئے بھی دوام ہی ہوگا۔ ورنہ کلام واحد میں ایک لفظ سے جدا جدا معنیٰ کا قصد لازم آئے گا۔ اور یہ درست نہیں ہے علاوہ ازیں یہ کہ بعض آیات میں کافر کے لئے خلود کو دوام سے بھی موصوف کیا گیا ہے۔

چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ الی قولہ تعالیٰ كُلَّمَا اَرَادُوْا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا.

اور ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ.

پس اب کافر کا بھی ہمیشہ کے لئے عذاب میں ہونا صاف طور پر معلوم ہو گیا جس سے اس کی عدم مغفرت نہ ہونا بھی سمجھ میں آگئی ہوگی۔

قرآن پاک نے ارشاد فرمایا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ. (زبردستی نہیں دین کے معاملہ میں)۔ (البقرۃ: ۲۵۶)

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی اس آیت کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

جب دلائل توحید بخوبی بیان فرمادی گئیں جس سے کافر کا کوئی عذر باقی نہیں رہا

تو اب زور سے کسی کو مسلمان کرنے کی کیا حاجت ہو سکتی ہے عقل والوں کو خود سمجھ لینا چاہئے اور نہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ زبردستی کسی کو مسلمان بناؤ۔ اَفَاَنۡتَ تُكۡرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ. خود نص موجود ہے۔ (تفسیر فوائد عثمانی)

مولانا بشیر احمد حسینی لکھتے ہیں:

ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کس نے تلوار اٹھائی، چلائی اور کون سا علاقہ میدان کارزار بنا؟ کیا ہندوستان میں اسلام بزورِ تلوار آیا تھا؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ حضرت مولانا شیخ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی محنت شاقہ اور آپؒ کی کرامات سے اسلام پھیلا تھا۔ کیا انڈونیشیا میں اسلام بزور شمشیر پھیلا تھا؟ نیز اخبارات میں یہ خبریں آتی رہتی ہیں کہ امریکہ، افریقہ، برطانیہ، فرانس، ڈنمارک اور ہالینڈ و دیگر ممالک میں اسلام بڑی جراءت وسرعت سے پھیل رہا ہے۔ ان ممالک میں اسلام کے پاس کون سے ہتھیار اور کون سا اسلحہ ہے؟ جس سے اسلام دن بدن ترقی کی راہ پر عمل پیرا اور گامزن ہے تو عقل سلیم کہتی ہے کہ یہ پروپیگنڈا سفید جھوٹ اور انسانوں کی آنکھوں میں خاک ڈالنے کے مترادف ہے کہ "اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے"۔

جبرائیلؑ کا فرعون کے ڈوبنے کے وقت اس کے منہ میں مٹی ٹھونس کر کلمہ ایمان سے باز رکھنے پر شبہ

اعتراض: (عام منکرین اسلام کا اعتراض)

جبرائیلؑ نے فرعون کے ڈوبنے کے وقت اس کے منہ میں مٹی ٹھونس کر کلمہ ایمان سے کیوں باز رکھا۔

جواب: حضرت جبرائیل علیہ السلام کو معلوم تھا کہ عذاب دیکھنے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی حق تعالیٰ فرماتے ہیں: فَلَمۡ يَكُ يَنۡفَعُهُمۡ اِيۡمَانُهُمۡ لَمَّا

رَاَوْا بَاْسَنَا تو وہ اسلام سے نہ روکتے تھے صورت اسلام سے روکتے تھے جس پر گو رحمت فی الآ خرۃ مرتب نہیں ہوتی مگر رحمت فی الدنیا متوجہ ہوسکتی ہے۔ جیسے منافقین صورت اسلام کے سبب قتل وقید سے محفوظ رہے اسی طرح احتمال تھا کہ وہ بھی غرق و ہلاک ہونے سے بچ جاتا۔

پھراس پر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس آیت میں بـاْسنـا سے مراد عذاب دنیا تو ہے نہیں کیونکہ عذابِ دنیا کی رُویت قبل انکشاف آخرت قبول ایمان سے مانع نہیں اورظاہراً یہاں عذاب آخرت کا انکشاف نہ ہوا تھا ورنہ دنیا کی طرف کا احساس بالکل باطل ہوجاتا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مسلم نہیں بلکہ انکشاف آخرت کے بعد بھی ادھر کا احساس باقی رہنا ممکن ہے چنانچہ بعض محتضرین (مرنے والوں) کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو بھی دیکھا۔ اوراس کے ساتھ اپنے گھر کی عورتوں کو بھی پہچانا چنانچہ گھروالوں سے کہا کہ فرشتے بیٹھے ہیں تم ان سے پردہ کرو تو ابتدائے انکشاف کے ساتھ ادھر کا ہوش رہ سکتا ہے۔

اورفرعون کے واقعہ سے ظاہراً بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جس وقت ایمان ظاہر کیا ہے اس وقت اس کوانکشاف آخرت کے ساتھ دنیا کے بھی ہوش تھے چنانچہ اس کا قول اٰمَـنْـتُ بِالَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآئِیْلَ بتلا رہا ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل کا حق پر ہونا اوران کا مومن ہونا اس کے خیال میں تھا اور یہ دنیا کا واقعہ ہے تو اس کو ادھر کے ہوش ضرور تھے۔ لیکن اوپر معلوم ہوچکا کہ یہ انکشاف عذاب آخرت کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے۔ بس اس دلیل سے انکشاف آخرت کی نفی نہیں ہوسکتی اور یہ انکشاف مانع ہے قبول ایمان سے۔ پس اشکال رفع ہوگیا۔

اب ایک سوال رہ گیا کہ جب یہ حالت مانع ہے قبول ایمان سے اورایمان نام ہے تصدیق کا۔ اوروہ بعد انکشاف آخرت کے مقبول نہ تھی۔ اگرچہ زبان سے تلفظ کیا جاوے

تو پھر تلفظ سے روکنے سے کیا فائدہ ہوا اور اگر زبان سے اقرار کرنا کسی درجہ میں مفید بھی مان لیا جاوے تو اقرار کا قصہ بھی کافی ہونا چاہئے اگر چہ کسی عذر سے عجز ہو گیا ہو اور یہاں عجز ہو گیا۔ کیچڑ کی وجہ سے تو وہ اقرار مفید مستحق ہو گیا پھر کیچڑ ٹھونسنے سے کیا فائدہ ہوا۔

سو اس کا جواب وہی ہے جو اوپر گزرا کہ جبرائیل علیہ السلام نے ظاہری رحمت کو بھی اس کے لئے گوارا نہیں کیا۔ اگر چہ رحمت ظاہری کا ایک گونہ ظہور نعش کو محفوظ رکھنے سے ہو گیا جیسا کہ ارشاد ہے: فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ الآیۃ مگر اس پر بھی ایک سوال ہے کہ اسی ظاہری رحمت میں ان کا کیا حرج تھا اس کا جواب وہی ہے جس کو میں ذکر کر رہا ہوں کہ اس فعل کا منشأ غلبہ بغض فی اللہ تھا اس میں یہ بھی گوارا نہ ہوا اور مبغوض حق سے ایسا بغض بغیر غلبہ عشق حق کے ہو نہیں سکتا (العید والوعید حضرت تھانوی ص ۱۰) "

کیا خدا بندوں میں حلول کر گیا ہے

اعتراض: (چوبے بدریداس ہندو کا اعتراض)

سورت حدید میں ہے: وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ یعنی تم جہاں کہیں بھی ہو خدا تمہارے ساتھ ہے اور سورت ق میں ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ یعنی ہم بندہ کی طرف رگِ گردن سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔ ان دونوں آیات سے ظاہر ہوا کہ خدا تعالیٰ بندوں کے جسم میں حلول کر کے رگ گردن سے بھی زیادہ نزدیک ہو گیا ہے۔

جواب: یہ بھی آپ کا محض افترٰی ہے۔ معیت اور قربت حلول کو مستلزم نہیں۔ اگر دلیل رکھتے ہو تو پیش کرو ہمارا مذہب یہ ہے کہ عالم اعراض اعتباری جو ہر واحد پر مجتمع ہیں تو اس معیت اور قربت کی حقیقت کو اس بنا پر ہر صاحب عقل بغیر شائبہ حلول کے اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

باب ۱۶، اشلوک ادھیائے ۱۳ کرشن گیتا کا اس طرح ہے کہ

اندر اور باہر تمام مساکن اور متحرک میں ہوں۔ کیونکہ حد سے زیادہ نزدیک ہوں بسبب فرط قربت دکھائی نہیں دیتا۔ انتہیٰ

آپ کی اپنی اس تقریر کی بناء پر آپ کا اعتراض آپ کی اپنی کتاب (گیتا) پر پڑتا ہے نہ کہ قرآن پاک کی آیات پر۔ (سوط اللہ الجبار ۳/۹۵)

عیسائیوں میں خدا کے مرجانے کا پروپیگنڈہ

عیسائی عوام الناس کو گرجے سے وابستہ رکھنے کی اگر ایک طرف اس قسم کی کوششیں جاری ہیں تو دوسری جانب یورپ اور امریکہ میں یہ نظریہ عام ہوتا جارہا ہے کہ "خدا مر گیا" اور خدا موجود نہیں ہے۔ ان میں نہ صرف عوام بلکہ خود پادری حضرات بھی شامل ہیں۔ اور انہوں نے اس موضوع پر نہ صرف مضامین بلکہ ضخیم کتابیں تک لکھی ہیں جن میں وہ برملا اظہار کرتے ہیں کہ خدا مر چکا ہے۔ اور اب ہمیں اُس کے بغیر ہی زندگی بسر کرنی چاہئے۔ میتھوڈسٹ فرقہ کے طلبہ کے رسالہ موٹیو Motive نے اخباری اسلوب (اسٹائل) کے طور پر خدا کے مرنے کی اطلاع اس انداز سے شائع کی:

> "اٹلانٹا ۹ نومبر۔ خدا کائنات کا خالق، دُنیا کے یہودیوں کا معبود عیسائیوں کی آخری حقیقت اور تمام خداؤں سے برتر خدا کا ایک بڑے آپریشن" کے دوران انتقال ہو گیا"............اس خبر کا دنیا کے بڑے اور چھوٹے لوگوں پر یکساں اثر ہوا۔

ایک انجمن کے سابق صدر نے جس کو یہ اطلاع ایک نائی کی دوکان میں ملی تھی۔ اپنے تأثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ مجھے ہمیشہ کسی کے انتقال کی خبر سنکر افسوس ہوتا ہے یہ افسوس ناک بات ہے۔ (Time: April8,1966, p.48)

کینیڈا کا ایک پادری ای ہیریسن لکھتا ہے:

"درنر پیلز نے اپنی کتاب کا نام رکھا "خدا کہیں نہیں" جب کہ وہ خود

چرچ آف انگلینڈ کا وکر Vicar پادری ہے۔"

فادر جیکسن کہتا ہے۔"اگر خدا موجود ہے تو ہم اس کے بارے میں ایک عظیم وجود کے طور پر گفتگو نہیں کر سکتے" جب کہ وہ خود ایک یونیورسٹی چیپلن ہے۔

تھامس الٹی زر نے ایک کتاب موسومہ "عیسائی الحاد کی بائبل" لکھی اور وہ ایک امریکن یونیورسٹی میں بائیبل اسٹڈیز کا معاون پروفیسر ہے۔

ہیریسن اپنے بارے میں لکھتا ہے"میں ٹورنٹو میں انجیلیکن کلیسائی حلقہ کا ایک اسٹاف ممبر ہوں میں عیسائی اور انجیلیکن ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ پھر بھی پوری متانت وسنجیدگی سے کہہ سکتا ہوں کہ" خدا موجود نہیں ہے"۔

(Is the bile really the word of god p.168)

"نیشنل ابزرور" میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے۔" خدا مر چکا ہے اس قسم کا رجحان ۴۰ سال سے کم عمر والے نوے فی صد پروٹسٹنٹ مذہبی عالموں میں سرایت کر گیا ہے۔"

(National Observer-January 31, 1966)

عام طور پر ان کو "دہریے عیسائی" کہا گیا ہے۔ صورت حال کچھ بھی ہو لیکن حقیقت بہر حال یہ ہے کہ مصلوب مسیح کو ابن خدا ماننے کے عقیدہ کا یہ لازمی نتیجہ اتنے وسیع پیمانہ پر ظاہر ہو رہا ہے۔ اس سائنسی دور میں جبکہ آج کا انسان اپنی سوچ وفکر میں آزاد ہے۔ یقیناً جب اُس کی خواہشات پوری نہ ہوتی ہوں۔ دعائیں قبول ہوتی نظر نہ آتی ہوں اور اس پر مستزاد یہ پس منظر کہ خدا کو یہودیوں نے پھانسی دے دی تھی جس پر وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ (یہ علیحدہ بات ہے کہ ان عقیدے کے مطابق ان کی نجات کے لیے ایسا ہوا تو مادی تہذیب کی پروردہ نسلیں اگر ایسا نہ سوچیں تو اور کیا کریں)۔

یونانی ورومی اپنے دیوتاؤں کے بتوں کو مسمار کر دیتے تھے ان کی قربان گاہوں پر پتھراؤ کرتے تھے .... موجودہ ترقی یافتہ نسل نے بانداز دیگر وہی کیا جو اس تہذیب کے بانی کیا کرتے تھے۔ (پاکستان میں مسیحیت صفحہ ۱۴۴ تا ۱۴۵)

دوسرا باب

تخلیق کائنات کے متعلق اعتراضات کے جوابات
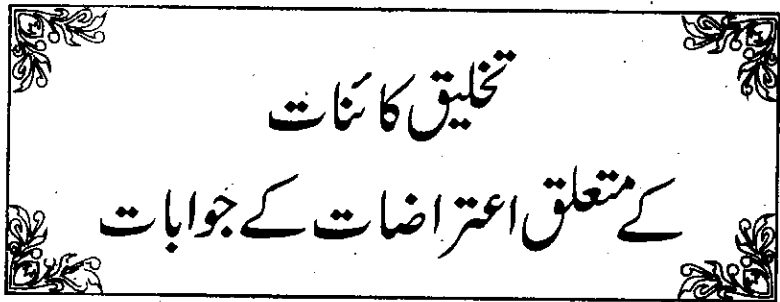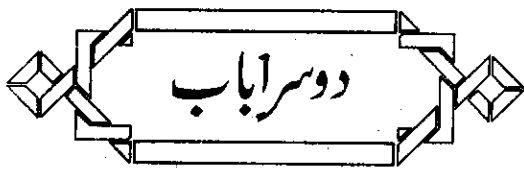
کچھ نہ ہونے کے بعد دنیا کیسے وجود میں آئی؟

اعتراض: (دہریوں کا اعتراض)

کچھ نہ ہونے کے بعد دنیا کیسے وجود میں آئی؟

جواب: علامہ احمد بن مسکویہ الفوز الاصغر فصل عاشر ص ۳۰ میں لکھتے ہیں:

جو لوگ نظر اور فکر کے عادی نہیں۔ اور ان ہی محسوسات کے دائرہ میں محدود ہیں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جس طرح ایک معمار بغیر اینٹ اور گارے کے کوئی مکان نہیں بنا سکتا اور کوئی نجار (بڑھئی) بغیر لکڑی اور تختوں کے کوئی تخت نہیں بنا سکتا اور ہر صانع اپنی صنعت میں مادہ کا محتاج ہے۔ اسی طرح (عیاذاباللہ) خدا تعالیٰ بھی اپنی ایجاد میں مادہ کا محتاج ہے۔ اور اس خیال کو اس قدر ترقی ہوئی کہ جالینوس بھی اسی کا قائل ہو گیا مگر حکیم اسکندر نے اس کے رد میں ایک مستقل کتاب لکھی جس میں یہ ثابت کیا کہ تمام کائنات کسی چیز سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ عدم محض سے وجود میں آئی ہے۔ ہم اس مضمون کو ذیل میں مختصر اور واضح طریقہ سے نقل کرتے ہیں۔

یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ جب مادہ کوئی جدید صورت اختیار کرتا ہے تو پہلی صورت بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ اگر بالفرض پہلی صورت معدوم نہ ہو تو صرف دو احتمال ہیں۔

ایک یہ کہ پہلی صورت جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد کسی دوسرے جسم کو لاحق ہو جائے لیکن یہ سراسر مشاہدہ کے خلاف ہے۔ خمیر یا موم کو ہم جب کسی دوسری شکل میں تبدیل کر دیتے ہیں تو پہلی شکل قطعاً کسی جسم کو جا کر نہیں لگ جاتی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس جسم میں جدید صورت کے ساتھ پہلی صورت اور پہلی شکل بھی باقی رہے سو یہ احتمال اس لئے باطل ہے کہ اس میں اجتماع ضدین لازم آتا

ہے مثلاً فرض کیجئے کہ پہلی صورت مستدیر (گول) تھی اور دوسری مستطیل (لمبی)۔ پس یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شئی ایک ہی حالت میں مستطیل بھی ہو اور مستدیر بھی۔ مسطح بھی ہو اور مدور بھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جسم میں متضاد شکلیں جمع ہو سکیں۔

غرض یہ کہ آپ کو طوعاً و کرہاً یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ پہلی صورت بالکل معدوم ہوگئی اور اس جدید صورت نے یقیناً عدم محض سے نکل کر عالم وجود میں قدم رکھا ہے۔

اس تقریر سے تمام صورتوں اور شکلوں اور تمام کیفیات اور اعراض کا حادث ہونا اوران کا عدم محض سے وجود میں آنا بخوبی ثابت ہوگیا۔ رہا مادہ تو وہ کسی حالت میں بھی صورت سے خالی ہو کر موجود نہیں ہوسکتا۔ مادہ جس حالت میں بھی ہوگا کوئی نہ کوئی صورت اس کے لئے ضرور ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ مادہ اور صورت دونوں متلازم ہیں۔

(علم الکلام صفحہ ۱۲۶-۱۲۷)

آسمان کا وجود کہاں ہے

اعتراض: (سائنسدانوں کا اعتراض)

آسمان کا وجود کہاں ہے؟ اہل سائنس کا دعویٰ ہے کہ آسمان کا وجود نہیں۔ ستارے سب فضا میں گھوم رہے ہیں۔

جواب: دیکھو یہ مسئلہ ظنی ہے یا یقینی۔ سائنس کی رُو سے آسمان کا عدم قطعی طور سے نہیں ہوسکتا۔ آج تک جتنی دلیلیں آسمان کی نفی پر قائم کی گئیں ان سب کا خلاصہ عدم علم ہے جو عدم وجود کو لازم نہیں اور وجود آسمان قطعی دلیل سے ثابت ہے کیونکہ آسمان کا وجود فی نفسہ ممکن ہے۔ یعنی آسمان کا وجود و عدم دونوں عقلاً برابر ہیں۔ اور یہ عقلی مقدمہ ہے کہ جس ممکن کے وجود کی خبر کوئی مخبر جو قطعاً سچا ہو۔ دیتا ہو۔ تو اس ممکن کا وجود قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے۔ اور اس کے وجود کی خبر ایک مخبر صادق یعنی قرآن شریف نے دی ہے پس ان تینوں مقدموں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوگئی کہ

آسمان موجود ہے۔ اور آسمان کے ممکن الوجود ہونے کی بناء پر جب یہ عقلاً ممکن ہے۔ یعنی نہ واجب ہے اور نہ ممتنع۔ پس نہ ضروری الوجود ہوا نہ ضروری العدم تو عقل اس کے وجود یا عدم کی بابت کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتی۔ زیادہ سے زیادہ اگر کہا جا سکتا ہے تو صرف اس قدر کہ ہم کو ازروئے عقل وجود کا پتہ نہیں چلا۔ اور معلوم ہے کہ عدم ثبوت اور ثبوت عدم میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ امریکہ کا وجود جس وقت تک ہم لوگوں کو ثابت نہ تھا۔ اس وقت بھی ہم یوں نہیں کہہ سکتے تھے کہ امریکہ موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہم کو وجود امریکہ کا علم نہیں ہے۔ پس اہل سائنس یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو آسمان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا اور یہ ہم کو مضر نہیں کیونکہ ہم سابقہ وضاحت سے ان کو وجودِ آسمان تسلیم کرادیں گے۔ (تقویم الزیغ وعظ حضرت تھانوی صفحہ ۱۱)

کیا آسمان کا جسم آنکھوں سے نظر آتا ہے

عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ نیلا رنگ جو ہمیں اوپر نظر آتا ہے آسمان کا رنگ ہے مگر فلاسفہ کہتے ہیں کہ یہ رنگ روشنی اور اندھیرے کی آمیزش سے محسوس ہوتا ہے کیونکہ نیچے ستاروں کی روشنی اور اس کے اوپر اندھیرا ہے تو باہر سے رنگ نیلا محسوس ہوتا ہے جیسے گہرے پانی پر روشنی پڑتی ہے تو وہ نیلا نظر آتا ہے' قرآن کریم کی چند آیات ایسی ہیں جن میں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے' جیسے اسی آیت مذکورہ میں اللہ الـذی رفـع الـسمٰوات بغیر عمد تـرونـهـا کے الفاظ ہیں۔ اور دوسری آیت میں اِلَى السَّمَـآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ کے الفاظ ہیں' فلاسفہ کی یہ تحقیق اول تو اس کے منافی نہیں' کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ آسمان کا رنگ بھی نیلگوں ہو۔ یا کوئی دوسرا رنگ ہو مگر درمیانی روشنی اور اندھیرے کے امتزاج سے نیلا نظر آتا ہو۔ اس سے انکار کی کوئی دلیل نہیں کہ اس فضاء کے رنگ میں آسمان کا رنگ بھی شامل ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن کریم میں جہاں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے وہ حکمی اور مجازی ہو کہ آسمان کا وجود ایسے یقینی

دلائل سے ثابت ہے کہ گویا دیکھ ہی لیا۔ (روح المعانی)

سات زمینیں کہاں کہاں کس صورت میں ہیں

سوال: اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ اس آیت سے اتنی بات تو واضح طور پر ثابت ہے کہ جس طرح آسمان سات ہیں ایسے ہی زمینیں بھی سات ہیں۔ پھر یہ سات زمینیں کہاں کہاں اور کس وضع وصورت میں ہیں' اوپر نیچے طبقات کی صورت میں تہہ بتہہ ہیں یا ہر ایک زمین کا مقام الگ الگ ہے اگر اوپر نیچے طبقات ہیں تو کیا جس طرح سات آسمانوں میں ہر دو آسمان کے درمیان بڑا فاصلہ ہے اور ہر آسمان میں الگ الگ فرشتے آباد ہیں اسی طرح ایک زمین اور دوسری زمین کے درمیان بھی فاصلہ اور ہوا فضا وغیرہ ہیں اور اُس میں کوئی مخلوق آباد ہے یا یہ طبقات زمین ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔

جواب: قرآن مجید اس سے ساکت ہے اور روایات حدیث جو اس بارے میں آئی ہیں ان میں اکثر احادیث میں ائمہ حدیث کا اختلاف ہے بعض نے ان کو صحیح و ثابت قرار دیا ہے بعض نے موضوع ومن گھڑت تک کہدیا ہے اور عقلاً یہ سب صورتیں ممکن ہیں۔ اور ہماری کوئی دینی یا دنیوی ضرورت اس کی تحقیق پر موقوف نہیں نہ ہم سے قبر میں یا حشر میں اس کا سوال ہوگا کہ ہم ان سات زمینوں کی وضع وصورت اور محل وقوع اور اُس میں بسنے والی مخلوقات کی تحقیق کریں' اس لئے بہتر صورت یہ ہے کہ بس اس پر ایمان لائیں اور یقین کریں کہ زمینیں بھی آسمانوں کی طرح سات ہی ہیں' اور سب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے پیدا فرمایا ہے۔ اتنی ہی بات قرآن نے بیان کی ہے جس کو قرآن نے بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا ہم بھی اُس کی فکر وتحقیق میں کیوں پڑیں؟ حضرات سلف صالحین کا ایسی صورتوں میں یہی طرز عمل رہا ہے اُنہوں نے فرمایا ہے ابھموا ما ابھمہ اللہ' یعنی جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے مبہم چھوڑا

ہے تم بھی اُسے مبہم رہنے دو جبکہ اس میں تمہارے لئے کوئی عملی حکم نہیں، اور تمہاری کوئی دینی یا دنیوی ضرورت اُس سے متعلق نہیں۔ (معارف القرآن جلد ۸ صفحہ ۴۹۴)

تخلیق زمین و آسمان اور سیارات سے پہلے دن رات کیسے پہچانے گئے

اعتراض: دن اور رات کا وجود تو آفتاب کی حرکت سے پہچانا جاتا ہے، آسمان اور زمین کی پیدائش سے پہلے جب نہ آفتاب تھا نہ ماہتاب، چھ دنوں کی تعداد کس حساب سے ہوئی۔

جواب: بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ مراد چھ دن سے اتنا وقت اور زمانہ ہے جس میں چھ دن رات اس دنیا میں ہوتے ہیں، لیکن صاف اور بے غبار بات یہ ہے کہ دن اور رات کی یہ اصطلاح کہ طلوع آفتاب سے غروب تک دن اور غروب سے طلوع تک رات، یہ تو اس دنیا کی اصطلاح ہے، پیدائش عالم سے پہلے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دن اور رات کی دوسری علامات مقرر فرما رکھی ہوں، جیسے جنت میں ہوگا کہ وہاں کا دن اور رات حرکتِ آفتاب کے تابع نہیں ہوگا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ ضروری نہیں کہ وہ چھ دن جن میں زمین و آسمان بنائے گئے وہ ہمارے چھ دن کے برابر ہوں بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس سے بڑے ہوں، جیسے آخرت کے دن کے بارے میں ارشاد قرآنی ہے کہ ایک ہزار سال کے برابر ایک دن ہوگا۔

ابوعبداللہ رازیؒ نے فرمایا کہ فلک اعظم کی حرکت اس دنیا کی حرکات کے مقابلہ میں اتنی تیز ہے کہ ایک دوڑنے والا انسان ایک قدم اٹھا کر زمین پر رکھنے نہیں پاتا کہ فلکِ اعظم تین ہزار میل کی مسافت طے کرلیتا ہے۔ (تفسیر بحر محیط)

امام احمد بن حنبلؒ اور مجاہدؒ کا قول یہی ہے کہ یہاں چھ دن سے آخرت کے چھ دن مراد ہیں، اور بروایت ضحاکؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی یہی منقول ہے۔

اور یہ چھ دن جن میں پیدائش عالم وجود میں آئی ہے صحیح روایات کے مطابق اتوار سے شروع ہو کر جمعہ پر ختم ہوتے ہیں' یوم السبت یعنی ہفتہ کے اندر تخلیق عالم کا کام نہیں ہوا' بعض علماء نے فرمایا کہ سبت کے معنی قطع کرنے کے ہیں' اس روز کا یوم السبت اسی لئے نام رکھا گیا کہ اس پر کام ختم ہو گیا۔ (تفسیر ابن کثیر)

قرآن میں زمین و آسمان کی تخلیق چھ روز میں مکمل ہونے کا ذکر ہے' اس کی تفصیل سورۂ حم سجدہ کی نویں اور دسویں آیات میں اس طرح آئی ہے کہ دو دن میں زمین بنائی گئی' پھر دو دن میں زمین کے اوپر پہاڑ' دریا' معادن' درخت' نباتات' اور انسان وحیوان کے کھانے پینے کی چیزیں بنائی گئیں' کل چار دن ہو گئے' ارشاد فرمایا: خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ اور پھر فرمایا: قَدَّرَ فِیْھَا اَقْوَاتَھَا فِیْ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ

پہلے دو دن جن میں زمین بنائی گئی' اتوار اور پیر ہیں' اور دوسرے دو دن جن میں زمین کی آبادی کا سامان پہاڑ' دریا بنائے گئے وہ منگل اور بدھ ہیں' اس کے بعد ارشاد فرمایا فَقَضٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ' یعنی پھر ساتوں آسمان بنائے دو دن میں' ظاہر ہے کہ یہ دو دن جمعرات اور جمعہ ہوں گے' اس طرح جمعہ تک چھ دن ہو گئے۔ (معارف القرآن جلد سوم صفحہ ۵۷۲-۵۷۳)

آسمان و زمین کی تخلیق میں چھ روز کی مدت کیوں ہوئی

اعتراض: اللہ جل شانہٗ تو اس پر قادر ہیں کہ یہ سارا جہان ایک آن میں پیدا فرما دیں' خود قرآن کریم میں مختلف عنوانات سے یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہیں ارشاد ہے: وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَةٌ کَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ یعنی آنکھ جھپکنے کی مقدار میں ہمارا حکم نافذ ہو جاتا ہے' کہیں فرمایا ہے: اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ' یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو پیدا فرمانا چاہتے ہیں تو فرما دیتے ہیں کہ ہو جا تو وہ پیدا ہو جاتی ہے' پھر پیدائش عالم کے لئے چھ روز صرف ہونے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: مفسر القرآن حضرت سعید بن جبیرؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ قدرت حق تعالیٰ تو بیشک اس پر حاوی ہے کہ یہ سب کچھ ایک آن میں پیدا کر دیں، لیکن بتقاضائے حکمت اس عالم کی تخلیق میں چھ دن لگائے گئے، تاکہ انسان کو نظامِ عالم کے چلانے میں تدریج اور پختہ کاری کی تعلیم دی جائے جیسا کہ حدیث میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ غور و فکر اور وقار و تدریج کے ساتھ کام کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے (مظہری بحوالہ شعب الایمان للبیہقی)

زمین و آسمان اور ان میں موجود تمام چیزوں کے تسبیح کرنے کا مطلب

اعتراض: (عام کفار کا اعتراض)

ان چیزوں میں فرشتے سب کے سب اور انسان و جن جو مومن ہیں ان کا اللہ کی تسبیح کرنا تو ظاہر ہے سبھی جانتے ہیں، کافر انسان اور جن جو بظاہر تسبیح نہیں کرتے اسی طرح عالم کی دوسری چیزیں جن کو کہا جاتا ہے کہ ان میں عقل و شعور نہیں ہے ان کے تسبیح پڑھنے کا مطلب کیا ہے؟

جواب: بعض علماء نے فرمایا کہ ان کی تسبیح سے مراد تسبیح حال یعنی ان کے حالات کی شہادت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کا مجموعی حال بتلا رہا ہے کہ وہ نہ اپنے وجود میں مستقل ہے نہ اپنے باقی رہنے میں وہ کسی بڑی قدرت کے تابع چل رہا ہے یہی شہادت حال اس کی تسبیح ہے۔

مگر دوسرے اہل تحقیق کا قول یہ ہے کہ تسبیح اختیاری تو صرف فرشتے اور مومن جن و انس کے لئے مخصوص ہے مگر تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ذرہ ذرہ کو اپنا تسبیح خواں بنا رکھا ہے کافر بھی اول تو عموماً خدا تعالیٰ کو مانتے اور اس کی عظمت کے قائل ہیں اور جو مادہ پرست دہریئے یا آج کل کے کمیونسٹ خدا کے وجود کے بظاہر قائل نہیں مگر ان کے وجود کا ہر جزء جزء جبری طور پر اللہ کی تسبیح کر رہا ہے جیسے درخت اور پتھر

مٹی وغیرہ سب چیزیں تسبیح حق میں مشغول ہیں مگر ان کی یہ تسبیح جو جبری اور تکوینی ہے یہ عام لوگ سنتے نہیں' قرآن کریم کا ارشاد وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ہر ذرہ ذرہ کی تسبیح تکوینی کوئی ایسی چیز ہے جس کو عام انسان سمجھ نہیں سکتے تسبیح حالی کو تو اہل عقل وفہم جان سکتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ تسبیح صرف حالی نہیں حقیقی ہے مگر ہمارے فہم وادراک سے بالاتر ہے۔ (تفسیر القرطبی)

حدیث میں جو آنحضرت ﷺ کا یہ معجزہ مذکور ہے کہ آپ کی مٹھی میں کنکروں کا تسبیح کرنا صحابہ کرامؓ نے کانوں سے سنا اس کا معجزہ ہونا تو ظاہر ہے مگر خصائص کبریٰ میں شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے فرمایا کہ کنکروں کا تسبیح پڑھنا حضور کا معجزہ نہیں وہ تو جہاں کہیں بھی ہیں تسبیح پڑھتی ہیں بلکہ معجزہ آپ کا یہ ہے کہ آپ کے دست مبارک میں آنے کے بعد ان کی وہ تسبیح کانوں سے سنی جانے لگی۔

امام قرطبی نے اسی تحقیق کو راجح قرار دیا ہے اور اس پر قرآن وسنت کے بہت دلائل پیش کئے ہیں مثلاً سورۂ ص میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ (یعنی ہم نے پہاڑوں کو مسخر کر دیا کہ وہ داؤد علیہ السلام کے ساتھ صبح وشام تسبیح کرتے ہیں) اور سورۂ بقرہ میں پہاڑوں کے پتھروں کے متعلق ارشاد ہے: اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (یعنی پہاڑ کے بعض پتھر اللہ کے خوف سے نیچے گر جاتے ہیں) جس سے پتھروں میں شعور وادراک اور خدا کا خوف ہونا ثابت ہوا اور سورۂ مریم میں نصاریٰ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنے کی تردید میں فرمایا وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا یعنی یہ لوگ اللہ کیلئے بیٹا تجویز کرتے ہیں ان کے اس کلمہ کفر سے پہاڑوں پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور وہ گرنے لگتے ہیں' اور ظاہر ہے کہ یہ خوف ان کے شعور وادراک کا پتہ دیتا ہے اور شعور وادراک کے بعد تسبیح کرنا کوئی امر مستبعد نہیں رہتا۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ سے کہتا ہے

کہ اے فلاں کیا تیرے اوپر کوئی ایسا آدمی گذرا ہے جو اللہ کو یاد کرنے والا ہوا گر وہ کہتا ہے کہ ہاں تو یہ پہاڑ اس سے خوش ہوتا ہے اس پر استدلال کے لئے حضرت عبداللہ بن مسعود نے یہ آیت پڑھی وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا اور پھر فرمایا کہ جب اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ پہاڑ کلمات کفر سننے سے متاثر ہوتے ہیں ان پر خوف طاری ہو جاتا ہے تو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ وہ باطل کلمات کو سنتے ہیں حق بات اور ذکر اللہ نہیں سنتے اور اس سے متاثر نہیں ہوتے۔ (قرطبی بحوالہ رقائق ابن مبارک)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی جن اور انسان اور درخت اور پتھر اور ڈھیلا ایسا نہیں جو مؤذن کی آواز سنتا ہے اور قیامت کے روز اس کے ایمان اور نیک ہونے کی شہادت دے۔ (مؤطا امام مالک وسنن ابن ماجہ بروایت ابی سعید خدریؓ)

امام بخاریؒ نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نقل کیا ہے کہ ہم کھانے کی تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے جبکہ وہ کھایا جارہا ہو۔

اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھاتے تو کھانے کی تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے۔

اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت جابر بن سمرہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں مکہ مکرمہ کے اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو بعثت ونبوت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا اور میں اب بھی اس کو پہچانتا ہوں بعض حضرات نے کہا کہ اس سے مراد حجر اسود ہے۔ واللہ اعلم

امام قرطبی نے فرمایا کہ روایات حدیث اس طرح کے معاملات میں بہت ہیں اور اسطوانہ حنانہ کی حکایت تو عام مسلمانوں کی زبان زد ہے جس کے رونے کی آواز صحابہ کرام نے سنی جبکہ رسول کریم ﷺ نے خطبہ کے وقت اس کو چھوڑ کر منبر پر خطبہ دینا شروع کیا۔

ان روایات کے بعد اس میں کیا بعد رہ جاتا ہے کہ زمین وآسمان کی ہر چیز میں

شعور و ادراک ہے اور ہر چیز حقیقی طور پر اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور ابراہیمؒ نے فرمایا کہ یہ تسبیح عام ہے ذی روح چیزوں میں بھی اور غیر ذی روح چیزوں میں بھی یہاں تک کہ دروازے کے کواڑوں کی آواز میں بھی تسبیح ہے۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ اگر تسبیح سے مراد تسبیح حالی ہوتی تو مذکورہ آیت میں حضرت داؤد کی کیا تخصیص رہتی تسبیح حالی تو ہر انسان ذی شعور ہر چیز سے معلوم کر سکتا ہے اس لئے ظاہر یہی ہے کہ یہ تسبیح قولی تھی، انتہی۔

(اور جیسا کہ بحوالہ خصائص کبریٰ اوپر نقل کیا ہے) کہ کنکروں کا تسبیح پڑھنا معجزہ نہیں وہ ہر جگہ ہر حال اور ہر وقت میں عام ہے آنحضرت ﷺ کا معجزہ یہ تھا کہ آپ کے دست مبارک میں آنے کے بعد ان کی تسبیح اس طرح ہوگئی کہ عام لوگوں نے کانوں سے سنا۔ اسی طرح پہاڑوں کی تسبیح بھی حضرت داؤد علیہ السلام کا معجزہ اسی حیثیت سے ہے کہ ان کے معجزہ سے وہ تسبیح کانوں سے سننے کے قابل ہوگئی۔

(معارف القرآن جلد ۵ صفحہ ۴۷۵-۴۷۷)

اور آج تو سائنس نے اس مسئلہ کو بخوبی سمجھا دیا ہے کہ بے جان چیزیں بول رہی ہیں آلات میں حرکت ہے ساری دنیا اس کے ذریعہ سے مربوط ہے کیا ان کی زبان نہ ہوگی یہ اپنے خالق کی تسبیح نہ کہتی ہوں گی۔ (امداد اللہ انور)

لوح محفوظ کی وسعت

اعتراض: (عام کفار کا اعتراض)

ایک دفعہ ایک منکر غیبیات نے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ لوح محفوظ کتنی بڑی مان لیجئے مگر کبھی تو ختم ہو جائے گی ہزاروں لاکھوں برس ہو چکے بے شمار چیزیں پیدا ہوئیں اور فنا ہوئیں کہاں تک لوح محفوظ میں لکھا گیا ہوگا؟

جواب: مولانا نے فرمایا کہ تمہارا ذہن ہے یہ کبھی ختم نہیں ہوتا اس میں تم

نے کتنی ہی چیزیں بھری ہوں گی مگر وہ ابھی تک خالی ہے تو لوح محفوظ تو ذہن سے بہت بڑی ہے ہاں واقعی اتنے سے ذہن میں کس قدر گنجائش ہے کہ دلی، کلکتہ، زمین و آسمان سب کچھ سمایا ہوا ہے۔ اگر حصول الاشیاء بانفسہا نہ مانتے۔ باشباہہا کے قائل ہو جاتے۔ تب بھی شبیہ دلی کی دلی کے برابر تو ہوگی۔ جیسا سوچنے سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ اجی ذہن پھٹا نہ سہی۔ کہ اشیاء یا اشباہ لطیف ہیں۔ تب بھی اتنا بڑا آسمان اتنی بڑی زمین اتنی بڑی دلی۔ ذہن اتنا بڑا کہاں سے ہوگیا۔ تو لوح محفوظ میں تمام چیزوں کا سما جانا کیا مشکل ہے۔ تو ذہن محض اس وسعت میں سب کا مشابہ لوح محفوظ کے ہے۔ مگر علم صحیح سے خاص باعتبار علوم عالیہ کے بھی بالکل سچا نمونہ لوح محفوظ کا ہو جاتا ہے۔

(روح الجوار وعظ حضرت تھانویؒ)

اور آج کل کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک میں حافظہ کی چپ کتنی چھوٹی سی ہوتی ہے اور اسی کے اندر کتنی وسیع وعریض چیزیں محفوظ ہوتی ہیں۔

علامہ سیوطیؒ نے **الحبائک فی اخبار الملائک** وغیرہ میں کئی روایات ایسی نقل فرمائی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوح محفوظ حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی ہی ہے اور حضرت اسرافیل کے قد کی لمبائی کے بارہ میں روایات میں آتا ہے کہ اللہ کے عرش کا ایک پایہ ان کے ایک کندھے پر ہے اور پاؤں ساتویں زمین سے نیچے چلے گئے ہیں اس سے لوح محفوظ کی حسی طور پر لمبائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔
تفصیل کیلئے ہماری کتاب ''فرشتوں کے عجیب حالات'' ملاحظہ فرمائیں۔

(امداد اللہ انور)

آفتاب عرش کے نیچے کیسے سجدہ کرتا ہے؟

اعتراض:

روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقر سے مراد مکانی مستقر ہے یعنی وہ

جگہ جہاں آفتاب کی حرکت کا ایک دورہ پورا ہو جائے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ جگہ تحت العرش ہے اس صورت میں مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ہر روز آفتاب ایک خاص مستقر کی طرف چلتا ہے' پھر وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرکے اگلے دورے کی اجازت مانگتا ہے' اجازت ملنے پر دوسرا دورہ شروع کرتا ہے۔

لیکن واقعات ومشاہدات اور ہیئت وفلکیات کے بیان کردہ اصول کی بناء پر اس میں متعدد قوی اشکالات ہیں۔

اول یہ کہ عرش رحمٰن کی جو کیفیت قرآن وسنت سے سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام زمینوں اور آسمانوں کے اوپر محیط ہے' یہ زمین اور سب آسمان مع سیارات ونجم سب کے سب عرش کے اندر محصور ہیں' اور عرش رحمٰن ان تمام کائنات سماویہ کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے' اس لحاظ سے آفتاب تو ہمیشہ ہر حال اور ہر وقت ہی زیر عرش ہے' پھر غروب کے بعد زیر عرش جانے کا کیا مطلب ہوگا؟

دوسرے یہ کہ مشاہدہ عام ہے کہ آفتاب جب کسی ایک جگہ سے غروب ہوتا ہے تو دوسری جگہ طلوع ہوتا ہے' اس لئے طلوع وغروب اس کا ہر وقت ہر حال میں جاری ہے' پھر بعد الغروب تحت العرش جانے اور سجدہ کرنے کے کیا معنی ہیں؟

تیسرے یہ کہ حدیث کے ظاہر سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب اپنے مستقر پر پہنچ کر وقفہ کرتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرکے اگلے دورے کی اجازت لیتا ہے' حالانکہ آفتاب کی حرکت میں کسی وقت بھی انقطاع نہ ہونا کھلا ہوا مشاہدہ ہے' اور پھر چونکہ طلوع وغروب آفتاب کا مختلف مقامات کے اعتبار سے ہر وقت ہی ہوتا رہتا ہے' تو یہ وقفہ اور سکون بھی ہر وقت ہونا چاہیے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ آفتاب کو کسی وقت بھی حرکت نہ ہو۔

یہ اشکالات صرف فنونِ ریاضی اور فلکیات ہی کے نہیں' مشاہدات اور واقعات کے ہیں جن سے صرفِ نظر نہیں ہو سکتا' اور فنی اعتبار سے فلک الافلاک کے تابع

آفتاب کی یومیہ حرکت اور آفتاب کا چوتھے آسمان میں مرکوز ہونا جو بطلیموسی نظریہ ہے جس کے خلاف اس سے پہلے بھی فیثا غورث نے اس نظریہ کی مخالفت کی تھی، اور آج کل کی نئی تحقیقات نے بطلیموسی نظریہ کی غلطی اور فیثا غورث کے نظریہ کی صحت کو قریب بہ یقین کر دیا ہے، اور حالیہ خلائی سفروں اور چاند تک انسان کی رسائی کے واقعات نے اتنی بات تو یقینی کر ہی دی ہے کہ تمام سیارات آسمان سے نیچے کی فضا میں ہیں، آسمانوں کے اندر مرکوز نہیں، قرآن کریم کی آیت وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ سے بھی اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس نظریہ میں یہ بھی ہے کہ یہ روزانہ کا طلوع و غروب آفتاب کی حرکت سے نہیں بلکہ زمین کی حرکت سے ہے، اس فنی نظریہ کے اعتبار سے حدیث مذکور میں ایک اور اشکال بڑھ جاتا ہے۔

جواب: اس کا جواب سمجھنے سے پہلے یہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ جہاں تک آیت مذکورہ کی تصریح ہے اس پر مذکورہ شبہات و اشکالات میں سے قرآن پر کوئی بھی اشکال نہیں ہوتا، اس کا مفہوم تو صرف اتنا ہے کہ آفتاب کو حق تعالیٰ نے ایک ایسی منظم اور مستحکم حرکت پر لگایا ہوا ہے کہ وہ اپنے مستقر کی طرف برابر ایک حالت پر چلتا رہتا ہے، اگر اس مستقر سے مراد تفسیر قتادہؒ کے مطابق مستقر زمانی لیا جائے یعنی روز قیامت، تو معنی اس کے یہ ہیں کہ آفتاب کی یہ حرکت قیامت تک دائمی ایک حال پر چلتی رہے گی پھر اُس روز ختم ہو جائے گی۔

اور اگر مستقر مکانی مراد لیں تو بھی اس کا مستقر مدار شمسی کے اس نقطہ کو کہا جاسکتا ہے جہاں سے اول تخلیق کے وقت آفتاب نے حرکت شروع کی اسی نقطہ پر پہنچ کر اس کا شبانہ روز کا ایک دورہ مکمل ہوتا ہے، کیونکہ یہی نقطہ اس کا انتہاء سفر ہے، اس پر پہنچ کر نئے دورہ کی ابتداء ہوتی ہے۔

رہا یہ کہ اس عظیم الشان دائرہ کا وہ نقطہ کہاں اور کونسا ہے جہاں سے آفتاب کی

حرکت ابتداء آفرینش میں شروع ہوئی' قرآن کریم اس قسم کی فضول بحثوں میں انسان کو نہیں اُلجھاتا جس کا تعلق اس کے کسی دینی یا دنیوی فائدے سے نہ ہو' یہ اسی قسم کی بحث ہے' اس لیئے اس کو چھوڑ کر قرآن کریم نے اصل مقصد کی طرف توجہ دلائی' اور وہ مقصد حق تعالیٰ کی قدرت و حکمت کاملہ کے خاص مظاہر کا بیان ہے' کہ اس جہان میں سب سے بڑا اور سب سے روشن ترین کرہ آفتاب کا ہے وہ بھی نہ خود بخود بن گیا ہے اور نہ خود بخود اس کی کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے نہ باقی رہ سکتی ہے' وہ اپنی اس شبانہ روز کی حرکت میں ہر وقت حق تعالیٰ کی اجازت و مشیت کے تابع چلتا ہے۔

جتنے اشکالات اوپر لکھے گئے ہیں سورہ یٰس کی آیات کے بیان پر ان میں سے کوئی بھی شبہ اور اشکال نہیں البتہ احادیث جن میں یہ آیا ہے کہ سورج غروب کے بعد زیر عرش پہنچ کر سجدہ کرتا ہے اور اگلے دَورے کی اجازت مانگتا ہے یہ سب اشکالات اس سے متعلق ہیں' اور آیت نمبر ۳۸ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا کے ذیل میں یہ بحث اسی لیئے چھڑی کہ حدیث کے بعض الفاظ میں اس آیت کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔

اس کے جوابات محدثین و مفسرین حضرات نے مختلف دیئے ہیں' ظاہر الفاظ کے اعتبار سے جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ آفتاب کا یہ سجدہ دن رات میں صرف ایک مرتبہ بعد الغروب ہوتا ہے' جن حضرات نے حدیث کو اسی ظاہری مفہوم پر محمول کیا ہے انہوں نے غروب کے متعلق تین احتمال بیان کیئے ہیں۔ ایک یہ کہ معظم معمورہ کا غروب مراد ہو یعنی اس مقام کا جہاں کے غروب پر اکثر دنیا کی آبادی میں غروب ہو جاتا ہے' یا خط استواء کا غروب' یا افق مدینہ کا غروب ہے۔ اس طرح یہ اشکال نہیں رہتا کہ آفتاب کا غروب و طلوع تو ہر وقت ہر آن ہوتا رہتا ہے' کیونکہ اس حدیث میں ایک خاص افق کے غروب پر کلام کیا گیا ہے۔

لیکن صاف و بے غبار جواب وہ معلوم ہوتا ہے جو حضرت استاذ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مقالے ''سجود الشمس'' میں اختیار فرمایا ہے' اور متعدد دائمہ

تفسیر کے کلام سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اس کے سمجھنے سے پہلے پیغمبرانہ تعلیمات وتعبیرات کے متعلق یہ اصولی بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ آسمانی کتابیں اور ان کے لانے والے انبیاء علیہم السلام خلقِ خدا کو آسمان وزمین کی مخلوقات میں غور وفکر اور تدبر کی طرف مسلسل دعوت دیتے ہیں' اور ان سے اللہ تعالی کے وجود' توحید' علم وقدرت پر استدلال کرتے ہیں' مگر ان چیزوں میں تدبر اُسی حد تک مطلوب شرعی ہے جس حد تک اس کا تعلق انسان کی دنیوی اور معاشرتی ضرورت ہے یا دینی اور اخروی ضرورت سے ہو' اس سے زائد نری فلسفیانہ تدقیق اور حقائق اشیاء کے کھوج لگانے کی فکر میں عام خلق اللہ کو نہیں ڈالا جاتا' کیونکہ اول تو حقائق اشیاء کا مکمل حقیقی علم خود حکماء وفلاسفہ کو بھی باوجود عمریں صرف کرنے کے نہیں ہو سکا' بیچارے عوام تو کس شمار میں ہیں' پھر اگر وہ حاصل بھی ہو جائے اور اس سے نہ ان کی کوئی دینی ضرورت پوری ہو اور نہ کوئی صحیح مقصد دنیوی اس سے حاصل ہو تو اس لا یعنی اور فضول بحث میں دخل دینا اضاعتِ عمر اور اضاعتِ مال کے سوا کیا ہے۔

قرآن اور انبیاء کا استدلال آسمان وزمین کی مخلوقات اور ان کے تغیرات و انقلابات سے صرف اس حد تک ہوتا ہے جو ہر انسان کو مشاہدہ اور ادنیٰ غور وفکر سے حاصل ہو سکے' فلسفہ اور ریاضی کی فنی تدقیقات جو صرف حکماء وعلماء ہی کر سکتے ہیں نہ اُن پر استدلال کا مدار رکھا جاتا ہے نہ ان میں غور وخوض کی ترغیب دی جاتی ہے' کیونکہ خدا تعالیٰ پر ایمان اور اس کے پیغام پر عمل ہر انسان کا فرض ہے' عالم ہو یا جاہل' مرد ہو یا عورت' شہری ہو یا دیہاتی' کسی پہاڑ اور جزیرہ میں رہتا ہو یا کسی متمدن شہر میں' اس لئے پیغمبرانہ تعلیمات عوام کی نظر اور ان کی عقل وفہم کے مطابق ہوتی ہیں جن میں کسی فنی مہارت کی ضرورت نہ ہو۔

نماز کے اوقات کی پہچان' سمتِ قبلہ کا متعین کرنا' مہینوں اور سالوں اور تاریخوں کا ادراک' ان سب چیزوں کا علم ریاضی کے حسابات کے ذریعہ بھی حاصل کیا جا سکتا

ہے' مگر شریعت اسلام نے ان میں سے کسی چیز کا مدار ریاضی کی فنی تحقیقات پر رکھنے کے بجائے عام مشاہدات پر رکھا ہے' مہینے اور سال اور ان کی تاریخیں قمری حساب سے رکھیں اور چاند کے ہونے نہ ہونے کا مدار صرف رویت ہلال اور مشاہدہ پر رکھا' روزے اور حج کے ایام اسی بنیاد سے متعین کیے گئے ہیں' چاند کے گھٹنے بڑھنے چھپنے اور پھر طلوع ہونے کا راز بعض لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا' تو اس کا جواب قرآن نے یہ دیا کہ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجّ۔ یعنی آپ کہہ دیں کہ چاند کے یہ سب تغیرات اس مقصد کے لئے ہیں کہ تم ان سے مہینے کا شروع اور ختم اور اس کی تاریخیں معلوم کر کے حج وغیرہ کے دن متعین کر سکو' اس جواب نے ان کو اس پر تنبیہ فرما دی کہ تمہارا سوال لایعنی اور فضول ہے' اس کی حقیقت معلوم کرنے پر تمہارا کوئی کام دین یا دنیا کا اٹکا ہوا نہیں' اس لئے سوال اس چیز کا کرو جس کا تعلق تمہاری دینی یا دنیوی ضرورت سے ہو۔

اس تمہید کے بعد اصل معاملہ پر غور کیجئے' کہ آیات مذکورہ میں حق تعالی نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے چند مظاہر کا ذکر کر کے انسان کو اللہ کی توحید اور علم و قدرت کاملہ پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اس میں سب سے پہلے زمین کا ذکر کیا' جو ہر وقت ہمارے سامنے ہے۔ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ' پھر اس پر پانی برسا کر درخت اور نباتات اُگانے کا ذکر کیا' جو ہر انسان دیکھتا اور جانتا ہے' اَحْيَيْنٰهَا...... الآية ' اس کے بعد آسمان اور فضائے آسمانی سے متعلق چیزوں کا ذکر شروع کر کے پہلے لیل و نہار کے روزانہ انقلاب کا ذکر فرمایا وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ...... الآية اس کے بعد سورج اور چاند جو سیارات و نجم میں سب سے بڑے ستارے ہیں ان کا ذکر فرمایا' ان میں پہلے آفتاب کے متعلق فرمایا۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ؕ اس میں غور کیجئے کہ مقصد اس کا یہ بتلاتا ہے کہ آفتاب خود بخود اپنے ارادے اور اپنی قدرت سے نہیں چل رہا بلکہ یہ ایک عزیز و علیم یعنی قدرت والے اور

جاننے والے کے مقرر کردہ نظم کے تابع چل رہا ہے' آنحضرت ﷺ نے غروب آفتاب کے قریب حضرت ابوذر غفاریؓ کو ایک سوال و جواب کے ذریعہ اسی حقیقت پر متنبہ ہونے کی ہدایت فرمائی' جس میں بتلایا کہ آفتاب غروب ہونے کے بعد عرش کے نیچے اللہ کو سجدہ کرتا ہے اور پھر اگلا دورہ شروع کرنے کی اجازت مانگتا ہے' جب اجازت مل جاتی ہے تو حسب دستور آگے چلتا ہے' اور صبح کو جانب مشرق سے طلوع ہو جاتا ہے' اس کا حاصل اس سے زائد نہیں کہ آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت عالم دنیا میں ایک نیا انقلاب آتا ہے' جس کا مدار آفتاب پر ہے رسول اللہ ﷺ نے اس انقلابی وقت کو انسانی تنبیہ کے لئے موزوں سمجھ کر یہ تلقین فرمائی کہ آفتاب کو خود مختار اپنی قدرت سے چلنے والا نہ سمجھو' یہ صرف اللہ تعالیٰ کی اذن و مشیت کے تابع چل رہا ہے' اس کا ہر طلوع و غروب اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوتا ہے' یہ اس کی اجازت کے تابع ہے' اس کے تابع فرمان حرکت کرنے ہی کو اس کا سجدہ قرار دیا گیا' کیونکہ سجدہ ہر چیز کا اس کے مناسب حال ہوتا ہے' جیسا کہ قرآن نے خود تصریح فرمادی ہے کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ یعنی ساری مخلوق اللہ کی عبادت اور تسبیح میں مشغول ہے' مگر ہر ایک کی عبادت و تسبیح کا طریقہ الگ الگ ہے' اور ہر مخلوق کو اس کی عبادت و تسبیح کا طریقہ سکھا دیا جاتا ہے' جیسے انسان کو اس کی نماز و تسبیح کا طریقہ بتلا دیا گیا ہے' اس لئے آفتاب کے سجدہ کے یہ معنی سمجھنا کہ وہ انسان کے سجدہ کی طرح زمین پر ماتھا ٹیکنے ہی سے ہوگا صحیح نہیں۔

اور جبکہ قرآن و سنت کی تصریحات کے مطابق عرش خداوندی تمام آسمانوں' سیاروں' زمینوں پر محیط ہے' تو یہ ظاہر ہے کہ آفتاب ہر وقت ہر جگہ زیر عرش ہی ہے' اور جبکہ تجربہ شاہد ہے کہ آفتاب جس وقت ایک جگہ غروب ہو رہا ہوتا ہے تو دوسری جگہ طلوع بھی ہو رہا ہوتا ہے' اس لئے اس کا ہر لمحہ طلوع و غروب سے خالی نہیں' تو آفتاب کا زیر عرش رہنا بھی دائمی ہر حال میں ہے' اور غروب و طلوع ہونا بھی ہر حال میں ہے' اس

لئے حاصل مضمون حدیث کا یہ ہوا کہ آفتاب اپنے پورے دورے میں زیر عرش اللہ کے سامنے سجدہ ریز رہتا ہے یعنی اس کی اجازت اور فرمان کے تابع حرکت کرتا ہے' اور یہ سلسلہ اسی طرح قریب قیامت تک چلتا رہے گا' یہاں تک کہ قیامت کی بالکل قریبی علامت ظاہر کرنے کا وقت آ جائے گا' تو آفتاب کو اپنے مدار پر اگلا دورہ شروع کرنے کے بجائے پیچھے لوٹ جانے کا حکم ہو جائیگا' اور وہ پھر مغرب کی طرف سے طلوع ہو جائے گا' اس وقت توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ کسی کا ایمان و توبہ اس وقت مقبول نہیں ہو گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ غروب آفتاب کی تخصیص اور اس کے بعد زیر عرش جانے اور وہاں سجدہ کرنے اور اگلے دورے کی اجازت مانگنے کے جو واقعات اس روایت میں بتلائے گئے ہیں وہ پیغمبرانہ مؤثر تعلیم کے مناسب بالکل عوامی نظر کے اعتبار سے ایک تمثیل ہے نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ انسان کی طرح زمین پر سجدہ کرے' اور نہ سجدہ کرنے کے وقت آفتاب کی حرکت میں کچھ وقفہ ہونا لازم آتا ہے' اور نہ یہ مراد ہے کہ وہ دن رات میں صرف ایک ہی سجدہ کسی خاص جگہ جا کر کرتا ہے' اور نہ یہ کہ وہ صرف غروب کے بعد تحت العرش جاتا ہے' مگر اس انقلابی وقت میں جبکہ سب عوام یہ دیکھ رہے ہیں کہ آفتاب ہم سے غائب ہو رہا ہے اس وقت بطور تمثیل ان کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ درحقیقت آفتاب کے زیر عرش تابع فرمان چلتے رہنے سے ہو رہا ہے' آفتاب خود کوئی قدرت و طاقت نہیں رکھتا' تو جس طرح اس وقت اہل مدینہ اپنی جگہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ اب آفتاب سجدہ کر کے اگلے دورے کی اجازت لے گا اس طرح جہاں جہاں وہ غروب ہوتا جائے گا سب کے لئے ہی سبق حاصل کرنے کی تلقین ہو گئی اور حقیقت معاملہ یہ نکلی کہ آفتاب اپنے مدار پر حرکت کے درمیان ہر لحمہ اللہ تعالی کو سجدہ بھی کرتا ہے اور آگے چلنے کی اجازت بھی مانگتا رہتا ہے' اور اس سجدہ اور اجازت کے لئے اس کو کسی سکون اور وقفہ کی

ضرورت نہیں ہوتی۔

اس تقریر پر حدیث مذکورہ میں نہ مشاہدات کی رُو سے کوئی شبہ ہوتا ہے نہ قواعد ہیئت وریاضی کے اعتبار سے اور نظام شمسی اور حرکت سیارات میں بطلیموسی تحقیق صحیح ہو یا فیثا غورث والی تحقیق جو آج کل نئی تحقیقات سے مؤید ہوگئی ہے' دونوں صورتوں میں حدیث مذکورہ پر کوئی شبہ اور اشکال باقی نہیں رہتا۔

رہا یہ سوال کہ حدیث مذکور میں جو آفتاب کا سجدہ کرنا اور اگلے دورے کی اجازت طلب کرنا مذکور ہے' یہ کام تو حیات اور علم و عقل کا ہے' آفتاب و ماہتاب بے جان بے شعور مخلوقات ہیں' ان سے یہ افعال کیسے صادر ہوئے تو اس کا جواب قرآن کی آیت وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ کے تحت میں آچکا ہے کہ ہم جن چیزوں کو بے جان اور بے عقل و بے شعور سمجھتے ہیں' وہ بھی درحقیقت رُوح اور جان اور عقل وشعور کا ایک خاص حصہ رکھتے ہیں' البتہ ان کی حیات اور عقل وشعور انسان و حیوان کے مقابلہ میں کم اور اتنی کم ہے کہ عام احساسات اس کا ادراک نہیں کر سکتے' مگر اس کی نفی پر بھی کوئی شرعی یا عقلی دلیل موجود نہیں اور قرآن کریم نے آیت مذکورہ میں ان کا ذی حیات اور ذی عقل وشعور ہونا ثابت کر دیا ہے' اور نئی تحقیقات نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالی اعلم.

(معارف القرآن جلد ۷ صفحہ ۳۸۷-۳۹۲)

کیا کرہ ارضی میں شب قدر ایک ہے یا کئی؟

معراج کے وقت آسمانوں میں رات تھی یا دن؟

اعتراض:

ایک عبادت رمضان میں قابل اہتمام یہ ہے کہ لیلۃ القدر کی تلاش کی جائے حدیث میں آتا ہے کہ عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں اس کو تلاش کرو۔ اگر کسی کو شب

میں جاگنے کی ہمت نہ ہو تو کم از کم ستائیسویں رات میں تو ضرور جاگ لے یعنی اور راتوں سے کچھ زیادہ جاگ لے۔ تمام رات جاگنا شرط نہیں اور اس میں جس قدر ہو سکے نمازیں پڑھتا رہے۔ جب اس سے تھک جائے تو تلاوت قرآن یا ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے ستائیسویں رات کے متعلق بہت سے حضرات صحابہؓ کا یقین ہے کہ لیلۃ القدر یہی ہے۔

مگر اس کے متعلق بعض لوگوں کو شاید ایک فلسفی شبہ پیدا ہوگا وہ یہ کہ چاند میں آجکل اختلاف ہے تو جو رات یہاں ستائیسویں ہوگی وہ بعض جگہ اٹھائیسویں ہوگی تو کیا لیلۃ القدر دو ہوں گی اور ایک ہوئی تو کس کی رویت کا اعتبار ہوگا۔

جواب: آپ کو خبر بھی ہے کہ وہاں رات دن نہیں ہے اور یہ تو خود سائنس والے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ لیل ونہار کرۃ النسیم سے نیچے ہی نیچے ہیں کرۃ النسیم کے اوپر رات دن نہیں بلکہ یکساں حالت ہے۔

یہ جواب جب میرے دل میں آیا بڑی خوشی ہوئی اور اس سے ایک بات ابھی اور دل میں آئی ہے وہ یہ کہ معراج کے ذکر میں اللہ تعالیٰ نے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر بیان فرمائی ہے۔ سیر سمٰوٰت کا ذکر نہیں فرمایا جس سے بعض اہل باطل نے سیر سمٰوٰت کی نفی پر استدلال کیا ہے تو وہاں سیر سمٰوٰت کا ذکر اس واسطے نہیں کیا گیا کہ وہاں لیلا کی قید بھی مذکور ہے۔ پس ضروری ہوا کہ اسی قدر سیر بیان کی جائے جو لیل کے اندر واقع ہوئی ہو اور ظاہر ہے کہ سیر سمٰوٰت لیل ونہار سے باہر ہوئی ہے۔ سمٰوٰت میں لیل ونہار کا تحقق ہی نہیں تو اس سے سیر سمٰوٰت کی نفی پر استدلال محض لغو ہے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیر سمٰوٰت رات میں نہیں ہوئی سو یہ مسلّم ہے بلکہ ہم تو یوں کہتے ہیں کہ وہ تو نہ دن میں ہوئی نہ رات میں وہ تو ایسے مقام پر ہوئی ہے جہاں رات ہے نہ دن۔ بہر حال وہاں لیل ونہار نہیں ہے۔ اس واسطے لیلۃ القدر کی جو شان و برکات ہیں وہ لیل ونہار کے ساتھ مقید نہیں بلکہ ارادۂ حق کے تابع ہیں تو اس کی مثال بارش کی

طرح ہے کہ یہاں کے کرۃ النسیم کے نیچے آج بارش ہے اور کلکتہ کے کرۃ النسیم کے نیچے کل بارش ہے۔ اگر شبِ قدر بھی ایسی ہو کہ یہاں آج ہے اور کلکتہ میں کل ہے تو اس میں اشکال کی کیا بات ہے۔ آخر بارش میں کیا ایسا اختلاف نہیں ہوتا۔ پھر معنوی بارش برکات میں ایسا اختلاف ہو تو کیا تعجب ہے۔ اللہ تعالیٰ تو سب کی نیتوں کو اور کام کو دیکھتے ہیں وہ سب کو ان کے حساب کے موافق لیلۃ القدر کی برکات عطا فرمادیں گے۔ (اکمال العدۃ ص ۲۷ تا ۲۹، التبلیغ نمبر ۹۲)

تناسخ (آواگون) کیوں درست نہیں ہے

اعتراض: (ہندوؤں اعتراض)

ہندوؤں کے نزدیک عموماً جزا اور سزا کا طریقہ یہی ہے کہ روح بار بار اسی عالم حسی میں جون اور جنم بدلتی رہے۔ اثبات قیامت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

جواب:

پہلی دلیل: جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تمام عالم حادث ہیں، مادہ ہو یا روح ہو صفت قدم اور وجوب میں کوئی خدا کا شریک نہیں۔

تو اب ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ جب پہلی مرتبہ روح کا جسم سے تعلق قائم ہوا اور مثلاً اس کو دولت یا ثروت ملی تو یہ کس عمل کا ثمرہ اور پھل ہے۔ کیونکہ جسم کے ساتھ روح کا یہ پہلا تعلق ہے، جسم نے اس سے پہلے کوئی عمل ہی نہیں کیا۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ارواح قدیمہ میں تو مرکبات بلا کلام سب کے نزدیک حادث ہیں۔ اور حادث کے لئے ابتدا کا ہونا ضروری ہے۔ لہذا سوال یہ ہے کہ روح کا جب اس پیکر جسمانی کے ساتھ پہلی مرتبہ تعلق قائم ہوا اور اس کو جو کچھ رنج و غم اور راحت و آرام پیش کیا وہ کس عمل کا ثمرہ تھا۔

دوسری دلیل: عقل کا مقتضا یہ ہے کہ دار عمل اور دار جزا الگ الگ ہونے چاہئیں

پس اگر مرنے کے بعد جزا وسزا پانے کے لئے روح پھر اسی دنیا میں واپس آتی ہے جو کہ دار العمل ہے' تو دار العمل کا دار الجزاء ہونا لازم آئے گا۔ اور دنیا عمل کا مقام نہ رہے گی بلکہ جزاء وسزا کا مقام ہو جائے گی۔

تیسری دلیل: ایک روح کا غیر متناہی جون (زمانہ رجنم) طے کرنے کے بعد اس کو یہ بھی یاد نہ رہنا کہ میں فلاں فلاں جون میں رہی ہوں سراسر محال ہے۔

کوئی شخص کتنا ہی ضعیف الحافظہ کیوں نہ ہو' لیکن اس حالت کو کہ جو اس پر سالہا سال طاری رہی ہو کبھی نہیں بھول سکتا۔

لازم تو یہ تھا کہ روح کو اپنے گذشتہ افعال بالتفصیل یاد ہوتے۔ لیکن خیر اگر بالتفصیل یاد نہ ہوں تو کم از کم بالاجمال تو یاد ہوتے۔ خصوصاً جبکہ روح واجب بالذات اور غیر فانی ہے تو اس کا علم اور دیگر صفات ضرور غیر فانی ہونے چاہئیں۔ اس لئے کہ غیر فانی کے صفات بھی غیر فانی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ستیارتھ پرکاش کے ص۔ ۲۱۳' باب۔ ۷' بجواب سوال ۷۹' سے واضح ہے۔

ہاں جو واقعہ ایک لحہ یا دولحہ کے لئے پیش آیا ہو وہ اگر امتداد زمانہ کے باعث یاد نہ رہے جیسا کہ عہد الست تو کوئی مستبعد نہیں۔

بخلاف اس واقعہ کے کہ جو ہزارہا مرتبہ پیش آیا ہو' اس کا یاد نہ رہنا سراسر خلاف عقل ہے۔ بلکہ اگر کسی گذشتہ واقعہ سے ذہول بھی ہو جاتا ہے تو جب کبھی اس قسم کا واقعہ پیش آتا ہے تو فوراً یاد آجاتا ہے۔

علاوہ ازیں عہد الست از قبیل تعلیم سے ہے۔۔۔۔۔۔۔ اور تعلیم سے علم مقصود ہوتا ہے کیفیات تعلیم اور اس کے زمان و مکان کا استحضار ضروری نہیں۔ لڑکپن کے زمانہ میں جو علم حاصل کیا جاتا ہے وہ اخیر عمر تک باقی رہتا ہے۔ لیکن اس کی کیفیات یاد نہیں رہتیں۔ اسی طرح عہد الست سے مقصود علم ربوبیت تھا سو وہ حاصل ہے۔ ہر شخص کی طبیعت میں علم طبعی طور پر مرموز ہے کہ خدا ہمارا رب اور مالک اور خالق ہے۔ بخلاف

جزاء وسزا کے کہ وہاں ان افعال کا یاد رہنا ضروری ہے کہ جن کی یہ سزا ہے۔

چوتھی دلیل: جزاء وسزا سے دو مقصد ہوتے ہیں۔ (۱) مجرم کو تنبیہ ہو جائے۔ (۲) دوسروں کو عبرت ہو' تا کہ وہ اس قسم کے جرم کا ارتکاب نہ کریں۔

تناسخ کی صورت میں دونوں مقصد فوت ہیں۔ مجرم کو تنبیہ تو اس لئے حاصل نہیں کہ جب یہی معلوم نہیں کہ یہ کس جرم کی پاداش ہے تو پھر تنبیہ کس طرح حاصل ہو۔ جرم کا علم تو درکنار اس کو تو سابق جنم کے وجود کا تصور بھی نہیں۔

اور علیٰ ہذا دوسری غرض بھی مفقود ہے' جب خود اسی کو اپنے عمل کا علم نہیں کہ جس کی یہ سزا ہے تو دوسروں کو کہاں سے علم ہو کہ جس سے عبرت حاصل کریں۔

انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے' صاحب فہم وفراست ہے' جب اسی کے حق میں سزا و جزا کی دونوں غرضیں یعنی تنبیہ مجرم اور عبرت (اس جنم میں) مفقود ہے تو حیوانات کا ذکر ہی کیا۔ جن میں نہ عقل ہے اور نہ گویائی' نہ قوت دراکہ ہے اور نہ قوت ممیّزہ۔

بفرض محال اگر انسان کو کسی درجہ میں تنبیہ یا عبرت حاصل ہو بھی جائے تو حیوانات میں جزاء وسزا کا کوئی مقصد کسی طرح متصور نہیں ہو سکتا۔

جب انسان ہی کو علم نہ حاصل ہو سکا کہ میں کس عمل کی وجہ سے اس جون میں ہوں تو ایک گدھے یا کتے کو کیسے علم ہو سکتا ہے کہ میں فلاں عمل بد کی وجہ سے اس قالب حیوانی میں آیا ہوں۔

پانچویں دلیل: اگر دوسرا جنم گذشتہ جنم کے اعمال کے جزاء وسزا کے لئے ہے تو پھر اس جنم میں اس کے کسی عمل پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہئیے۔ اور نہ اس کی کسی بدکاری اور شہوت رانی بلکہ برے سے برے عمل پر بھی کوئی گرفت ہونی چاہئیے۔ اس لئے کہ اس کی یہی بہشت اور جنت ہے۔

چھٹی دلیل: بعض امراض اور تکالیف ایسی پیش آتی ہیں کہ جن کا سبب ہم کو معلوم ہو جاتا ہے مثلاً غذا کے ثقیل اور ناملائم ہونے سے بدہضمی ہو جانا' یا آب وہوا کے غلیظ

ہونے سے مزاج کا متغیر ہو جانا' مچھلی اور دودھ کے ساتھ ساتھ استعمال سے برص کا ہو جانا' شیرینی کے زیادہ استعمال سے صفراء کا پیدا ہونا وغیرہ وغیرہ۔

اور جن امراض کا سبب نہیں معلوم ہوتا تو ان کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب اسباب کا علم ہو جاتا ہے تو اس کے ازالہ اور انسداد کی تدبیریں کرتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ یہ مرض سابق جنم کے گناہوں کا نتیجہ ہے۔

بلکہ یہ کہتے ہیں کہ مثلاً فلاں مکان کی آب وہوا کے خراب ہونے کی وجہ سے یہ مرض پیش آیا۔ اور جب اس مکان کو بدل دیا جاتا ہے اور کسی ایسے مقام کو اختیار کر لیا جاتا ہے جہاں کی آب وہوا صاف وشفاف ہوتی ہے تو وہ مرض جاتا رہتا ہے۔

عقیدۂ تناسخ کی بناء پر تو کبھی اس مرض کا علاج نہ کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ یہ مرض جب کسی عمل سابق کی سزا ہے تو جب تک سزا پوری نہ ہو جائے گی اس وقت تک علاج بالکل عبث اور بے سود ہے۔ اس سے علم طب کا یکلخت بیکار ہونا لازم آتا ہے۔ نہ معلوم پھر وید کیوں علاج کی ترغیب دیتا ہے۔

ساتویں دلیل: والدین کا اپنی اولاد کو مارنا یا اساتذہ کا اپنے شاگردوں کو زدوکوب کرنا ساری دنیا کے نزدیک داخل تربیت وتعلیم سمجھا جاتا ہے۔ کسی عمل سابق کی جزاوسزا نہیں سمجھی جاتی۔

اسی طرح اگر حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے جو امراض اور تکالیف پیش آتی ہیں' اگر وہ بھی کسی تربیت اور اصلاح کے لئے ہوں تو کیا مستبعد ہے۔

آٹھویں دلیل: اس عالم کی ہر تکلیف اور آرام کو گذشتہ اعمال کی سزا وجزاء قرار دینا بداہت اور مشاہدہ کے خلاف ہے۔ سنکھیا کھا کر مر جانا' اور تریاق کے استعمال سے اچھا ہو جانا' کسی بادشاہ اور امیر کی خدمت کر کے انعام پانا سب جانتے ہیں کہ یہ سب موجودہ عمل کی جزاء ہے۔ کسی پہلے جون کے عمل کی جزاء نہیں۔ لہٰذا ممکن ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ راحت وآرام یا تکلیف ومصیبت پیش آتی ہے وہ اسی دنیا کے کسی عمل کی

جزاء ہو۔ نتیجہ یہ کہ ہم یہ نہ بتلا سکیں کہ یہ کون سے عمل کی جزاء ہے تو قائلین تناسخ کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں۔ ان کے نزدیک ان افعال کا یاد رہنا ضروری نہیں کہ جن پر جزاء وسزا مرتب ہو۔ کسی شخص کے دنبل نکلتا ہے تو یہی کہا جاتا ہے کہ گذشتہ غذاؤں کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ بالتفصیل یہ نہ معلوم ہو سکے کہ کس وقت کی غذا کا ثمرہ ہے۔

بہر حال ہے اس دنیا کے عمل کا ثمرہ اور نتیجہ' گذشتہ جون میں کھانے کی وجہ سے دنبل نہیں نکلا۔

نویں دلیل: تناسخ کے صحیح ماننے سے حق تعالی شانہ کی قدرت ومشیت اور ارادۂ ازلیہ کی تعطیل لازم آتی ہے۔

اس لئے کہ حیوانات اور اختلاف ایک مومن کے نزدیک حق تعالی شانہ کی قدرت کے کرشمے ہیں۔ اور سب ان کے ارادہ ازلیہ کے تابع ہے۔

مگر ایک سماجی کے نزدیک یہ تمام تر اختلاف جرائم ومعاصی کی وجہ سے ہے نہ اس میں خدا کی قدرت ومشیت کو دخل ہے اور نہ اس کے ارادہ اور علم وحکمت کو۔

(علم الکلام صفحہ ۳۴۹ تا ۳۵۳)

تناسخ کا رد

اعتراض: (بیس برن لالہ اندر من ہندو کا اعتراض)

جزا وسزا کا طریقہ تناسخ کے طور پر ہے نہ کہ سب لوگ مر جائیں اور عالم برزخ میں چلے جائیں اور بیک وقت قیامت قائم ہو اور سب کا حساب ہو' بعض کو جنت میں داخل کیا جائے اور بعض کو دوزخ میں۔

جواب: ہندوؤں نے تناسخ کا یہ طریقہ اپنے وہم وقیاس سے اختیار کیا ہے تحقیقی بات اس بارے میں یہ ہے کہ قدیم ہندوؤں نے زرتشت کی تقلید کر کے اس مذہب کو اختیار کیا ہے الہام کے طریقے سے ہندو مذہب میں تناسخ نہیں آیا۔

کھٹولی اپنکھد اتھربن بید میں لکھا ہے کہ
نجکیتا نے ملک الموت سے پوچھا کہ مردوں کے حق میں روایات مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ جو تھا جسم تھا جب مریگا کچھ نہ رہا۔ جو آتما کوئی شئے نہیں ہے جسم کے ہمراہ مثل اور قوت فانی ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ جیو آتما عقل اور بدن اور حواس اور دل سے جدا ہے۔ بعد مفارقت کے جسم نے جیسے عمل کئے ہوتے ہیں ویسے مکان میں جاتا ہے تم کہو اصل اس کی کیا ہے؟ ملک الموت نے جواب دیا کہ اس کی کیفیت واجبی برہما اور بشن اور مہیش بھی نہیں جانتے اور ان کو بھی باوجود اس فضل وکمال کے کہ عقل کل ہیں نوع بنوع کے اپنے وہم وقیاس سے شک میں ہیں۔ نجکیتا نے کہا جب کسی کو اس کا علم نہیں ہے تو بہتر ہے کہ اپنی رائے کے موافق فرماؤ۔ ملک الموت نے جواب دیا کہ اور جو کچھ تجھ کو درکار ہو طلب کر اس کی حقیقت استفسار نہ کر کہ بعد مرنے کے کیا ہوتا ہے کہ اس کا کہنا مشکل اور اس کا سمجھنا مشکل تر۔ اگر کوئی مر کر زندہ ہوتا تو بواجبی کہتا جو معلوم ہی نہیں وہ کیا کہوں؟ (انتہی مختصراً)

واضح ہے کہ اکابر ہنود نے ان حالات کو جو مرنے کے بعد طاری ہوتے ہیں تناسخ وغیرہ سے تعبیر کیا ہے یہ سب وہم وقیاس ہے۔ کسی کو علم اور یقین حاصل نہیں ہے برہما اور بشن اور مہیش بھی اس میں وہم وقیاس سے خود شک میں پڑے ہوتے ہیں ان کو الہام سے ثابت نہیں ہوا کہ روح انسانی ایک قوت ہے قوائے جسمانیہ سے یا محض ایک جوہر ہے جو قوائے حیوانیہ کے فنا ہو جانے کے بعد باقی رہتی ہے۔ پس برہما اور بشن اور مہیش ملک الموت کی گواہی کی بنیاد پر روح کی حقیقت میں وہم اور خیال میں گرفتار ہیں۔ الہام کے طور پر ان کو کچھ معلوم نہیں ہوا۔ (سوط اللہ الجبار صفحہ ۸۸۔۸۹)

مسئلہ ارواح پر اعتراض

اعتراض: (پنڈت دیانند سرسوتی کا اعتراض)

یہ مسئلہ اہل اسلام کا ہے کہ ارواح خدا کے یہاں پہلے سے موجود ہیں۔ جب کسی کو حکم دیتا ہے تو وہ حکم کے موافق دنیا میں آجاتی ہیں۔ نہیں بلکہ خدا کو ہر وقت قدرت ہے جب چاہے پیدا کر کے بھیج دیتا ہے اور ارواح کُل ساڑھے چار ارب ہیں۔ اور جزاء و سزا بطور تناسخ ہوتی ہے۔

جواب:

اعتراض کا تجزیہ: حاصل اس اعتراض کا تین باتیں ہیں۔

اول تو یہ کہ خدا کو ہر دم ارواح کے پیدا کرنے کی قدرت ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ پہلے سے اُن کو موجود مانئے۔

دوسرے یہ کہ مقدار ارواح ساڑھے چار ارب ہے۔ اس سے غرض معترض کی یہ ہوگی کہ اہل اسلام کے طور پر مقدار ارواح زیادہ ہونی چاہئے۔ کیونکہ وہ آواگون کے قائل نہیں۔ اس صورت میں جو ارواح ایک بار دنیا میں آئیں وہ پھر دوبارہ نہیں آتیں۔ مگر یہ ہے تو پھر بلحاظ کثرت بنی آدم و دیگر ذی ارواح ساڑھے چار ارب سے کہیں زیادہ تو ایک ہی آن میں موجود رہتی ہیں۔

تیسری بات آواگون ہے جس کی نسبت دوسری بات کو بمنزلۂ تمہید کہیے۔ اور آواگون صحیح ہوا تو پھر شورِ قیامت ایک غلط افسانہ ہوگا۔

بالجملہ اعتراض کی باتیں تو دو ہی ہیں۔ پر دوسری بات بمنزلۂ تمہید امر ثالث ہے۔ یا تیسری بات بمنزلۂ تفریع امر ثانی ہے۔ اور اس لئے ہم کو بالاستقلال تینوں باتوں کا جواب دینا لازم ہوا۔ تاکہ ہر احتمال پر جواب منطبق ہو جائے۔

جوابات:

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ اگر خدا کا ہر دم قادر ہونا اس بات کو مقتضی ہے کہ وقت ضرورت سے پہلے کوئی چیز پیدا نہ ہوا کرے تو نعوذ باللہ خدا تعالیٰ حسب اعتقاد پنڈت صاحب کے بالکل خلاف عقل کرتا ہے۔ جو فصل میں غلہ اور میوہ پیدا کر دیا ہے

اور سال کے سال حسب ضرورت صرف ہوتا ہی رہا۔ یوں مناسب تھا کہ جب کسی کو ضرورت ہوا کرتی' اُسی وقت خدا تعالی پیدا کر دیا کرتا۔ علی ہذا القیاس زمین سے لے کر آسمان تک کوئی چیز ایسی نہیں جو ضروری نہیں۔ پھر ہر قسم پر نظر ڈال کر دیکھ لیجئے کہ مقدار ضرورت سے کہیں زیادہ اور وقت ضرورت سے پہلے موجود ہے۔ زمین' پانی' ہوا غرض سب چیزیں ایسی ہی ہیں کہ ضرورت سے زیادہ ہیں اور پہلے سے موجود ہیں اور پھر کہیں نہ کہیں مقدار زائد ہی بوقت ضرورت کام آ جاتی ہے۔

باقی رہا دوسرا اعتراض' اس کا جواب یہ ہے کہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے مچھر یا بھنگے ساڑھے چار ارب سے تو زیادہ ہونگے۔ اگر اعتبار نہ آئے تو پنڈت جی اور اُن کے مرید، گن کر دیکھ لیں۔ جب مقدار ارواح کل ساڑھے چار ارب ہے اور ہر قسم کے جسم حیوانی سے وہی ارواح متعلق ہوتی رہتی ہیں تو یہ تعداد ہرگز کسی عاقل کے نزدیک قابل قبول نہیں مگر ہاں عقل کو طاق میں رکھ دیجئے تو پھر سب کچھ مسلم ہو سکتا ہے۔

اور تیسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ آواگون اگر بغرض جزاء و سزا ہے جیسا عبارت اعتراض سے ظاہر ہے اور حضرات ہنود فرماتے ہیں تو پھر یہ عجب طرح کی جزاء و سزا ہے کہ نہ انعام والے کو یہ خبر کہ یہ کاہے کا انعام ہے اور نہ سزایاب کو یہ اطلاع کہ یہ کاہے کی سزا ہے۔

اگر پنڈت جی کو یاد ہوتا کہ میں پہلے فلاں جُون (شکل) میں تھا اور اب فلاں کاموں کی جزاء و سزا میں مرنے جینے' امراض اور تکالیف کی مصیبت میں پھر یہاں آیا ہوں۔ جب بھی یہ بات علی العموم قابل تسلیم نہ تھی۔ اگر مسلم ہوتی تو فقط پنڈت جی ہی کے حق میں دربارہ جزاء و سزا تسلیم کی جاتی مگر۔ افسوس تو یہ ہے کہ جزاء و سزا تو ایسی عام' اور پھر ایک فرد بشر کو بھی یاد نہیں۔ اگر سلسلہء آفرینش بطور آواگون ہوتا اور آواگون بغرض جزاء و سزا تو یہ ضرور تھا کہ ہر فرد بشر کو یہ یاد ہوتا کہ میں پہلے فلاں جون میں تھا اور فلاں کردار کی پاداش میں گرفتار ہو کر پھر یہاں آیا ہوں۔

یہ بھی اطلاع ہو کہ یہ سزائیں کس کام کی ہیں۔ مگر جزاء وسزا جب ہی دے سکتے ہیں جب کہ یہ اطلاع ہو کہ فلاں کام کیا تھا تو یہ سزا ملی اور نجات سے محروم رہا۔ اب بھی اگر یہی کرونگا تو پھر وہی محرومی ہے۔

روحیں حادث ہیں قدیم نہیں

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

تمام ارواح قدیم ہیں اور پیدا ہونے سے منزہ ہیں' ایسا نہیں جیسا کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ خدا تعالی خود روحوں کو پیدا کرتا ہے۔

جواب: اگر ہندو بید میں غور کرتے تو معلوم ہوتا کہ روح پیدا شدہ ہے قدیم نہیں ہے۔ بقول بید اصل تمام ارواح کی ہندوؤں کے نزدیک ہرن کر بھ ہے چنانچہ اسراپنکھد ججر بید میں لکھا ہے تمام عالم کا مبدا اور تمام عالم سے مقدم ہرن کر بھ ہے اور یہی عقل کل کہلاتا ہے۔ انتہی

اور خود ہرن کر بھ حادث اور فانی ہے چنانچہ

برکھ سوکت میں تصریح ہے کہ جب وہ عالم پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے پہلے ہرن کر بھ کو پیدا کرتا ہے۔ انتہی

پس معلوم ہوا کہ روح نو پیدا شدہ ہیں اور ان کو اللہ تعالی پیدا کرتا ہے' ورنہ ہندوؤں کی بات سراسر خلاف ہے۔ (سوط اللہ الجبار ص ۴۷)

عہد ازل کے متعلق چند سوال وجواب

اس عہد ازل کے متعلق چند چیزیں اور قابل غور ہیں۔

اول یہ کہ عہد واقرار کس جگہ اور کس وقت لیا گیا؟

دوسرے یہ کہ جب اقرار اس حال میں لیا گیا کہ آدم علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا انسان پیدا بھی نہ ہوا تھا تو ان کو یہ عقل وعلم کیسے حاصل ہوا کہ وہ اللہ تعالی کو

پہچانیں اور اس کے رب ہونے کا اقرار کریں' کیونکہ ربوبیت کا اقرار وہ کر سکتا ہے جس نے شان تربیت کا مشاہدہ کیا ہو اور یہ مشاہدہ اس دنیا میں پیدا ہونیکے بعد ہی ہوسکتا ہے؟

پہلا سوال کہ یہ عہد و اقرار کس جگہ اور کس وقت لیا گیا' اس کے متعلق مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جو روایت بسند قوی امام احمد' نسائی اور حاکم نے نقل کی ہے' وہ یہ ہے کہ یہ عہد و اقرار اس وقت لیا گیا جب آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارا گیا' اور مقام اس اقرار کا وادیٔ نعمان ہے جو میدان عرفات کے نام سے معروف و مشہور ہے' (تفسیر مظہری)

رہا دوسرا سوال کہ یہ نئی مخلوق جس کو ابھی وجود عنصری بھی پوری طرح عطا نہیں ہوا وہ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارا کوئی پیدا کرنے والا اور پروردگار ہے' ایسی حالت میں ان سے سوال کرنا بھی ایک قسم کی ناقابل برداشت تکلیف ہے' اور وہ جواب بھی کیا دے سکتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خالق کائنات جس کی قدرت کاملہ نے تمام انسانوں کو ایک ذرہ کی صورت میں پیدا فرمایا اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ اس نے ان کو عقل و فہم اور شعور و ادراک بھی اس وقت بقدر ضرورت دے دیا ہو' اور یہی حقیقت ہے کہ اللہ جل شانہ نے اس مختصر وجود میں انسان کے تمام قویٰ کو جمع فرما دیا تھا جن میں سب سے بڑی قوت عقل و شعور کی ہے۔

انسان کے اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ شانہ کی عظمت و قدرت کی وہ بے شمار نشانیاں ہیں جن پر ذرا بھی غور کرنے والا اللہ تعالیٰ کی معرفت سے غافل نہیں رہ سکتا' قرآن کریم کا ارشاد ہے' وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ' وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ یعنی زمین میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لئے' اور خود تمہارے وجود میں بھی' کیا پھر بھی تم نہیں دیکھتے۔

عہد الست کے یاد نہ رہنے پر سوال

اعتراض:

یہاں ایک تیسرا سوال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ازلی عہد و پیمان کتنا ہی یقینی اور صحیح کیوں نہ ہو مگر کم از کم یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اس دنیا میں آنے کے بعد یہ عہد کسی کو یاد نہیں رہا تو پھر عہد کا فائدہ کیا ہوا؟

جواب: اول تو اسی نوع بنی آدم میں بہت سے ایسے افراد بھی ہیں جنہوں نے یہ اقرار کیا ہے کہ ہمیں یہ عہد پوری طرح یاد ہے' حضرت ذوالنون مصری نے فرمایا کہ یہ عہد و میثاق مجھے ایسا یاد ہے گویا میں اس وقت بھی سن رہا ہوں' اور بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جس وقت یہ اقرار لیا گیا میرے آس پاس میں کون کون لوگ موجود تھے' ہاں یہ ظاہر ہے کہ ایسے افراد شاذ و نادر کے درجہ میں ہیں۔

اس لئے عام لوگوں کے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو بالخاصہ اثر رکھتے ہیں' چاہے وہ کام کسی کو یاد رہیں یا نہ رہیں بلکہ اس کی خبر بھی نہ ہو مگر وہ اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ عہد و اقرار بھی ایسی ہی حیثیت رکھتا ہے کہ دراصل اس اقرار نے ہر انسان کے دل میں معرفت حق کا ایک بیج ڈال دیا جو پرورش پا رہا ہے چاہے اس کو خبر ہو یا نہ ہو' اور اسی بیج کے پھل پھول ہیں کہ ہر انسان کی فطرت میں حق تعالیٰ کی محبت و عظمت پائی جاتی ہے خواہ اس کا ظہور بت پرستی اور مخلوق پرستی کے کسی غلط پیرایہ میں ہو' وہ چند بدنصیب لوگ جن کی فطرت ہی مسخ ہو کر ان کا عقلی ذائقہ خراب ہو گیا اور میٹھے کڑوے کی پہچان جاتی رہی ان کے علاوہ باقی ساری دنیا کے اربوں انسان اللہ تعالیٰ کی دُھن اور خیال اور عظمت سے خالی نہیں' پھر چاہے مادی خواہشات میں مبتلا ہو کر یا کسی گمراہ سوسائٹی میں پڑ کر وہ اس کو بھلا دیں' رسول کریم

ﷺ کا ارشاد ہے کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ وفی بعض الروایات علی ھٰذِہِ الْمِلَّۃِ۔ (اخرجہ البخاری ۲/۱۲۵) یعنی ہر پیدا ہونے اولاد دین فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو دوسرے خیالات میں مبتلا کر دیتے ہیں' اور صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندوں کو حنیف یعنی ایک خدا کا ماننے والا پیدا کیا ہے پھر شیاطین ان کے پیچھے لگ گئے اور ان کو اس صحیح راستہ سے دُور لے گئے۔

اسی طرح بالخاصہ اثر رکھنے والے بہت سے اعمال واقوال ہیں جو اس دنیا میں بھی انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے جاری ہیں جن کا اثر یہ ہے کہ ان کو کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اور یاد رکھے یا نہ رکھے وہ بہرحال اپنا کام کرتے اور اپنا اثر دکھلاتے ہیں۔

مثلاً بچہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت وتکبیر کہنے کی جو سنت' ہر مسلمان جانتا ہے اور بحمد اللہ پورے عالم اسلام میں جاری ہے' اگرچہ بچہ نہ کلمات کے معنی سمجھتا ہے نہ اس کو بڑا ہونے کے بعد یاد رہتا ہے کہ میرے کان میں کیا الفاظ کہے گئے تھے' اس کی حکمت یہی تو ہے کہ اس کے ذریعہ اس اقرار ازلی کو قوت پہنچا کر کانوں کی راہ سے دل میں ایمان کی تخم ریزی کی جاتی ہے' اور اسی کا یہ اثر مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ بڑا ہونے کے بعد اگرچہ یہ اسلام اور اسلامیات سے کتنا ہی دور ہو جائے مگر اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اور مسلمانوں کی فہرست سے الگ ہونے کو انتہائی بُرا سمجھتا ہے' اسی طرح جو لوگ قرآن کی زبان نہیں جانتے ان کو بھی تلاوت قرآن کا حکم شاید اسی حکمت پر مبنی ہے کہ اس سے بھی کم از کم یہ مخفی فائدہ ضرور پہنچ جاتا ہے کہ انسان کے قلب میں نور ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

اسی لئے آخر آیت میں ارشاد فرمایا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِیْنَ یعنی یہ اقرار ہم نے اس لئے لیا ہے کہ تم قیامت کے دن یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس سے غافل تھے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس ازلی سوال و جواب سے

تمہارے دلوں میں ایمان کی بنیاد ایسی قائم ہوگئی کہ ذرا بھی غور وفکر سے کام لوتو اللہ جل شانہ کی ربوبیت کے اعتراف کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ارشاد فرمایا' اَوْ تَقُوْلُوْا اِنَّمَآ اَشْرَکَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ کُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِکُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ' یعنی یہ اقرار ہم نے اس لئے بھی لیا ہے کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ عذر نہ کرنے لگو کہ شرک و بت برستی تو دراصل ہمارے بڑوں نے اختیار کر لی تھی اور ہم تو ان کے بعد ان کی اولاد تھے' کھرے کھوٹے اور صحیح غلط کو نہیں پہچانتے تھے اس لئے بڑوں نے جو کچھ کیا ہم نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تو بڑوں کے جرم کی سزا ہمیں کیوں دی جائے۔ حق تعالیٰ نے بتلا دیا کہ دوسروں کے فعل کی سزا تم کو نہیں دی گئی بلکہ خود تمہاری غفلت کی سزا ہے کیونکہ اس اقرار ازلی نے انسان میں ایک ایسی عقل وبصیرت کا تخم ڈال دیا تھا کہ ذرا بھی غور و فکر سے کام لیتا تو اتنی بات سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں تھا کہ یہ پتھر کے بت جن کو ہم نے اپنے ہاتھوں تراشا ہے' یا آگ اور پانی' اور درخت یا کوئی انسان' ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو کوئی انسان اپنا پیدا کرنے والا اور پروردگار یا حاجت روا اور مشکل کشا یقین کر سکے۔

تیسری آیت میں اسی مضمون کا بیان اس طرح آیا ہے" وَکَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَلَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ' یعنی ہم اسی طرح اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کیا کرتے ہیں تاکہ لوگ غفلت اور کج روی لوٹ آئیں، مراد یہ ہے کہ آیات الٰہیہ میں ذرا غور کریں تو وہ اس عہد و میثاق کی طرف لوٹ آئیں جو ازل میں کیا گیا تھا یعنی اللہ جلّ شانہ کی ربوبیت کا اعتراف کرنے لگیں اور اس کے نتیجہ میں اس کی اطاعت کو لازم سمجھیں۔

عہد الست پر اعتراض کا جواب ہندو کتابوں سے

مولانا ثناء اللہ امرتسری دیانند سرسوتی کے اعتراض و جواب کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اعتراض: (پنڈت دیانند کا اعتراض)

اگر جنم بہت ہیں تو پہلے جنم اور موت کی باتیں کیوں یاد نہیں رہتیں؟

جواب: جیو محدود العلم ہے۔ ہر سہ زمانے کو مشاہدہ میں لانے والا نہیں اس لئے یاد نہیں رہتا۔ اور جس من کے ذریعے علم حاصل ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک وقت میں دو علم حاصل نہیں کرسکتا۔ بھلا پہلے جنم کی بات تو دور رہنے دیجئے۔ اس جسم میں جیو جب حمل میں ہوتا ہے، جہاں جسم تیار ہوا اور پھر متولد ہوا۔ نیز پانچ سال کی عمر سے پہلے جو جو باتیں ہوئی ہیں۔ ان کو کیوں یاد نہیں کرسکتا۔ علی ہذا القیاس بحالت بیداری یا خواب بہت سا کاروبار بدیہی طور پر کر کے سشپتی یعنی گہری نیند کی حالت میں اس عالم بیداری وغیرہ کے کاروبار کیوں یاد نہیں کرسکتا اور تم سے کوئی پوچھے کہ بارہ برس سے پہلے تیرہویں برس کے پانچویں مہینے کے نویں دن دس بجے پر پہلے منٹ میں تم نے کیا کیا تھا۔ تمہارا منہ، ہاتھ، کان، آنکھ، جسم کس طرف اور کس قسم کا تھا اور من میں کیا سوچ تھی۔ جب اس جسم میں یہ حال ہے تو پچھلے جنم کے یاد رہنے کے متعلق شکوک پیدا کرنا محض لڑکپن کی بات ہے۔ نیز کوئی شخص پچھلے اور اگلے جنم کے حالات کو جاننا چاہے تو جان بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ جیو کا علم اور وجود محدود ہے۔ یہ بات ایشور کے جاننے کی ہے۔ نہ کہ جیو کی (ستیارتھ پرکاش سملاس ۹، نمبر ۳۱، صفحہ ۳۲۹)

حوالہ مذکور سے صاف ثابت ہے کہ پچھلے جنموں کا حال کسی کو معلوم نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ خاصہ خداوندی ہے جس میں کوئی روح شریک نہیں ہوسکتی، بہت خوب آگے

چلئے۔ سوامی جی کی سوانح عمری میں ان کا قول یوں نقل ہے:

''پنڈت کمل نین جی کا قول ہے کہ جودھپور جاتے وقت سوامی جی فرماتے تھے کہ شریر (جسم) کا اب کچھ بھروسہ نہیں۔ نہ جانے کس وقت چھوٹ جائے اور میں اس کام (تفسیر وید) کے لئے پھر دوبارہ جنم لونگا اور اس وقت جو میرے درودھ (مخالف) ہوئے ہیں، وہ سب شانت (موافق) ہو جائیں گے۔ آریہ سماجوں کی ترقی سے بھی بڑی بھاری مدد ملے گی۔ میں اس وقت وید کا بقیہ بھاش (ترجمہ) کردونگا۔''

(سوانح عمری کلاں صفحہ ۸۶۷)

اس حوالہ سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ سوامی جی کی روح کو آئندہ جنم کا علم ہوا تھا۔ دوم اس آئندہ وقت میں آپ کو گذشتہ جنم کا علم ہوگا۔ تب ہی تو آپ اپنے ناتمام کام (تفسیر وید) کو تمام کریں گے۔ یہ دونوں علوم عام قانون قدرت کے برخلاف ہیں۔

ایک اور شہادت سنئے پنڈت لیکھرام مقتول آریہ مسافر لکھتا ہے:

مسمی پیارے لال ساکن موئی ضلع بریلی جس کا چچا ۱۸۵۷ء میں مارا گیا۔ جب چند روز گذرے تو اس نے طوطے کا جنم لیا اور شیوہ اختیار کیا کہ ہر شام کو اپنے گھر آتا اور ایک پنجرہ آہنی میں جو اس کے گھر رکھا ہوا تھا۔ بسیرا لیتا اور صبح کو اڑ جاتا۔ چندے یہی کیفیت رہی غرض ایک دن جو وہ طوطا گیا تو پھر نہ آیا۔ لوگوں کو اس کا بڑا خیال رہا۔ ان دنوں کا ذکر سنئے ایک گوسائیں کی عورت ساکن موضع سدھوں اپنے کام کو کسی گاؤں میں جاتی تھی۔ راستے میں بوجہ غلبہ تشنگی اپنے کسی جان پہچان کے گھر آئی اس کا طفل نو سالہ پوتے رام کے گھر آیا اور مستورات سے کہا کہ فلاں فلاں کہاں ہیں۔ کہا کہ فلاں مر گئے اور فلاں کام کو فلاں جگہ گئے ہیں۔ پھر

لڑکے نے بیان کیا کہ پہلا میرا نام پیارے لال ہے اور یہ گھر میرا ہے۔ یہاں ایک نیب کا درخت تھا وہ کیا ہوا۔ انہوں نے کہا۔ کہ ہم نے کاٹ ڈالا۔ پھر اس لڑکے نے اپنے مارے جانے اور مر کر طوطا بننے اور پھر اس صیاد کے پنجے میں پھنس کر مرنے اور پھر گوسائیں کے گھر میں پیدا ہونے کا ماجرا بیان کیا اور اپنے ماں باپ، نانی، چچی کو پہچان کر اپنی ٹوپی اور کتابیں مانگی۔ اس کی والدہ سابقہ نے عذر کیا کہ یہ اشیاء تمہارے بھتیجے کے استعمال میں آگئیں ہم تم کو اور دیں گے۔ حاضرین کو اس لڑکے کی ایسی باتوں پر کمال تعجب رہا۔ بعد وہ اپنی والدہ جدیدہ کے ساتھ چلا گیا۔" (کلیات آریہ مسافر صفحہ ۹۷)

اس حوالہ سے جو کچھ مصنف مذکور نے ثابت کیا ہے وہی ہمارا مدعا ہے۔ یعنی پیارے لال کو طوطا بننے کی حالت میں پہلا علم رہا۔ پھر پوتارام بن کر طوطا کی جون بلکہ اس سے پہلی جون کا علم بھی حاصل رہا۔ حالانکہ عام قانون قدرت یہی ہے کہ کسی سابقہ جنم کا علم نہ ہو۔ مگر اس طوطا رام کو ہوا۔

ان دونوں شہادتوں سے صاف ثابت ہے کہ یہ واقعات قانون قدرت کے برخلاف ہیں جس کی بابت سوامی دیانند نے اظہار کیا تھا کہ یہ خاصہ خداوندی ہے۔ بس اب مطلع صاف ہے کہ جس طرح یہ دونوں واقعات خلاف قانون قدرت کے ہوئے ہیں اسی طرح معجزات انبیاء بھی بظاہر خلاف عامہ قانون قدرت کے ہوتے ہیں۔ درحقیقت انکے لئے بھی قانون ہوتا ہے۔ پس اتنے ہی سے معجزہ کی حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے۔ (حق برکاش صفحہ ۶۹ تا ۷۲)

اعتراض:

اسلام کی یہ بات غلط ہے کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا بلکہ انسان پہلے بندر تھا پھر ترقی کر کے انسان بن گیا۔

کیا انسان پہلے بندر تھا؟

جواب: کتنے افسوس کی بات ہے کہ محمد ﷺ تو فرمائیں کہ انسان کی اصل انسان ہے اور ڈارون جو ایک ملحد ہے وہ کہے کہ سب سے پہلے ایک مطلق مادہ موجود تھا اور پھر حرکت سے اس میں حرارت پیدا ہوئی۔ اور سورج وغیرہ بنا۔ اور اس کے بعد پھر نباتات بنے۔ پھر حیوانات بنے۔ ان میں بندر بنا۔ اور پھر یکا یک جست کر کے انسان بن گیا۔ اسی طور پر وہ تمام حیوانات و نباتات میں اسی کا قائل ہے کہ ایک دوسرے سے نکلتے چلے آئے ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کے فرمانے پر تو شبہ کیا جاتا ہے۔ اور ڈارون کے کہنے پر یقین کر لیا جاتا ہے۔ یہی ایمان ہے؟ ڈارون تو خدا کا قائل نہیں تھا۔ اس لئے ایسی بعید اور بیہودہ تاویلیں کرتا تھا۔ مگر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ خدا کو مانتے ہیں اور پھر ایسی مہمل تاویلوں سے قرآن پر شبہ کرتے ہیں۔

شاید کوئی یہاں یہ کہے کہ ہم کو تحقیقات جدیدہ سے قرآن پر شبہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ حکماء کا تو مشاہدہ ہے اور اسی بنا پر ہم کو قرآن پر شبہ ہے کہ مشاہدہ کے خلاف کیوں ہے یہ پہلے سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات ہے میں کہتا ہوں کہ آپ مشاہدہ کی حقیقت کو ہی نہیں جانتے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ مادہ خود بخود متحرک ہو کر اس سے ایک صورت پیدا ہو گئی۔ پھر شمس و کواکب ہوئے۔ نباتات ہو گئی اور نباتات سے حیوانات اور حیوانات میں ایک خاص نوع بندر بھی تھی۔ پھر بندر یکا یک جست کر کے انسان ہو گیا۔ یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ خود ان بندر کا اقرار کرنے والوں کو بھی بندر نہ بننے دیں۔ آدمی ہی بنائیں۔ (الوقت صفحہ ۱۲۷)

کیا ہر انسان کے خمیر میں نطفہ کے ساتھ اس جگہ کی مٹی بھی شامل ہوتی ہے جہاں وہ دفن ہوگا

اعتراض:

مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ، منھا کی ضمیر زمین کی طرف راجع ہے اور معنی یہ ہے کہ ہم نے تم کو زمین کی مٹی سے پیدا کیا مخاطب اسکے سب انسان ہیں حالانکہ عام انسانوں کی پیدائش مٹی سے نہیں بلکہ نطفہ سے ہوئی بجز آدم علیہ السلام کے کہ ان کی پیدائش براہ راست مٹی سے ہوئی۔

جواب: یہ خطاب یا تو اس بناء پر ہوسکتا ہے کہ انسان کی اصل اور سب کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ہیں ان کے واسطے سے سب کی تخلیق مٹی کیطرف منسوب کر دینا کچھ بعید نہیں۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر نطفہ مٹی ہی کی پیداوار ہوتا ہے اس لئے نطفہ سے تخلیق در حقیقت مٹی ہی سے تخلیق ہوگئی۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ الفاظ قرآن کا ظاہر یہی ہے کہ ہر انسان مٹی سے ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر انسان کی تخلیق میں حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے مٹی شامل فرماتے ہیں اسلئے ہر ایک انسان کی تخلیق کو براہ راست مٹی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ الفاظ قرآن کا ظاہر یہی ہے کہ ہر انسان کی تخلیق مٹی سے عمل میں آئی ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث اس پر شاہد ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ ہر پیدا ہونے والے انسان پر رحم مادر میں اس جگہ کی مٹی کا کچھ جزء ڈالا جاتا ہے جس جگہ اس کا دفن ہونا اللہ کے علم میں مقدر ہے۔ یہ

حدیث ابونعیم نے ابن سیرین کے تذکرہ میں روایت کر کے فرمایا ہے **هٰذا حديث غريب من حديث عون لم نكتبه الامن حديث ابى عاصم انبيل وهو احد الثقات الاعلام من اهل البصرة**۔

اوراسی مضمون کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی منقول ہے۔

اور عطاء خراسانی نے فرمایا کہ جب رحم میں نطفہ قرار پاتا ہے تو جو فرشتہ اسکی تخلیق پر مامور ہے وہ جا کر اس جگہ کی مٹی لاتا ہے جس جگہ اسکا دفن ہونا مقرر ہے اور یہ مٹی اس نطفہ میں شامل کر دیتا ہے اس لئے تخلیق نطفہ اور مٹی دونوں سے ہوتی ہے اور اسی آیت سے استدلال کیا، **مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ** (قرطبی)۔

تفسیر مظہری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر پیدا ہونیوالے بچے کی ناف میں ایک جزء مٹی کا ڈالا جاتا ہے اور جب مرتا ہے تو اسی زمین میں دفن ہوتا ہے جہاں کی مٹی اسکے خمیر میں شامل کی گئی تھی۔

بغیر مرد کے تنہا عورت سے بچہ پیدا ہو جانا خلافِ عقل نہیں:

اعتراض: حضرت مریمؑ سے بغیر خاوند کے بچہ کیسے پیدا ہوا؟

جواب: حمل و تولد بلا توسط مرد کے خلاف عادت (معجزہ) ہے اور خوارق میں کتنا ہی عقلی بعد ہو مضائقہ نہیں بلکہ وصفِ اعجاز کا اور زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔

لیکن اس میں اس وجہ سے زیادہ عقلی بعد بھی نہیں کہ حسب تصریح کتب طب عورت کی منی میں قوتِ منعقدہ کے ساتھ قوتِ عاقدہ بھی ہے اس لئے مرض رَجا میں اعضاء کی کچھ نا تمام صورت بھی بن جاتی ہے جیسا کہ فن طب کی مرکزی کتاب ''القانون'' میں موجود ہے۔ پس اگر یہی قوتِ عاقدہ اور بڑھ جائے تو زیادہ مستبعد نہیں ہے۔ (بیان القرآن)

تیسرا باب

ملائکہ وشیاطین کے متعلق اعتراضات کے جوابات
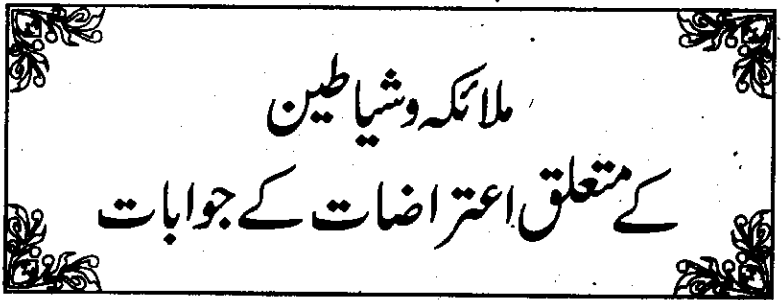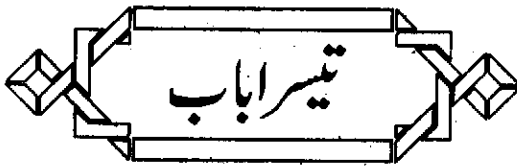
ملائکہ اور شیاطین کے وجود اور ان کی طاقت کا ثبوت

اعتراض: (منکرین حدیث وغیرہ کا اعتراض)

جب فرشتے اور شیاطین نظر نہیں آتے تو ان کا قائل ہونا اور ان کی عجیب وغریب قوت کو تسلیم کرنا کیسے درست ہے

جواب: امرت اور اکسیر کا ایجاد کرنا جیسا ڈاکٹر کا کمال ہے اسی طرح کسی زہر اور سم قاتل کا ایجاد کرنا بھی ڈاکٹر کا کمال ہے۔ زہر گو قاتل ومہلک ہے، مگر ڈاکٹر اس ایجاد کی وجہ سے قابل تحسین ہے۔ پس ٹھیک اسی طرح ملائکہ اور شیاطین کے ایجاد کو بھی سمجھئے۔ ملائکہ کا پیدا کرنا کمال ہے تو شیاطین اور جنات کا پیدا کرنا بھی یقیناً کمال ہے۔

ملائکہ اور شیاطین کا وجود فرضی اور اختراعی نہیں ہے کہ جس کو حقیقت اور واقعیت سے کوئی تعلق نہیں ہے انسان میں حرارت و برودت رطوبت و یبوست کے آثار ظاہر ہونے سے پتہ چلتا ہے کہ جسم انسانی مختلف اور متضاد عناصر سے مرکب ہے ورنہ ایک شئے سے دو مختلف کیفیتوں کا ظاہر ہونا محال ہے۔ پس ضروری ہے کہ ہر ایک کے لئے جدا جدا مخزن اور علیحدہ علیحدہ معدن ہوں۔ اس لئے حکماء نے غور کرنے کے بعد اس کا سراغ لگایا کہ حرارت کا مخزن کرّہ نار ہے اور رطوبت کا معدن کرّہ آب اور یبوست و برودت کا منبع کرّہ زمین اور طبقہ ہوا ہے۔

اسی طرح انسان کا کبھی طاعت اور کبھی معصیت کی طرف مائل ہونا اس کی خبر دیتا ہے کہ روح انسانی کی ترکیب ایسی دو چیزوں سے ہے۔ جو باہم مختلف اور متضاد ہیں۔ ورنہ ایک شئے سے طاعت اور معصیت کا پیدا ہونا ایسا محال ہے جیسا کہ ایک عنصر سے حرارت اور برودت کا پیدا ہونا۔ اہل اسلام منبع معصیت اور منبع کفر کو شیاطین کہتے ہیں اور مخزن طاعت کو ملائکہ۔ ملائکہ کا اقتضائے طبعی طاعت الٰہی ہے اور یہ مخلوق

اپنی شدید لطافت کی وجہ سے ہماری نگاہوں سے مستور ہے اور حق تعالیٰ نے ہر قسم کی شکل اختیار کرنے کی ان کو قوت عطا فرمائی ہے۔ نیز اس پر بھی قدرت عطا فرمائی ہے کہ وہ بہت ہی قلیل مدت میں زمین و آسمان کی مسافت طے کر لیتے ہیں فرق اتنا ہے کہ ملائکہ نوری ہیں اور جن اور شیاطین ناری ہیں۔ اس قسم کی مخلوق سے اگر فقط غیر مبصر ہونے کی وجہ سے انکار کر دینا جائز ہے تو خدا اور روح اور مادۂ اثیریہ جس کو ایتھر کہتے ہیں ان سب سے غیر مبصر ہونے کی وجہ سے انکار کر دینا جائز ہونا چاہئے اور جس طرح مادۂ اثیریہ (ایتھر) مختلف شکلوں اور صورتوں کے ساتھ منتقل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ملائکہ اور جنات بھی مختلف شکلوں اور قالبوں میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ اللہ تعالیٰ نے ایک عاجز اور ناتواں انسان کو کیمیاوی عمل سے لطیف کو کثیف اور کثیف کو لطیف بنانے پر قدرت عطا فرمائی ہے تو وہ قادر مطلق اگر اپنی کسی اور مخلوق یعنی ملائکہ اور جنات کو مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے کی قدرت عطا فرمائے تو کیا تعجب ہے اور علی ہذا ملائکہ اور جنات سے ایسے افعال کا صادر ہونا جن سے انسانی قویٰ عاجز ہوں کوئی مستبعد نہیں۔ ہوا ہی کو دیکھ لیجئے کہ ایک منٹ میں بڑی بڑی عمارتوں اور بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیتی ہے۔ برقی قوت کے کرشموں کا مشاہدہ دنیا کر رہی ہے بڑے بڑے جہاز جن کو ہزاروں انسان مل کر بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکیں۔ وہ اسی برقی اور کہربائی قوت سے بسہولت اوپر اٹھا لئے جاتے ہیں یہ تو بندے کی قدرت کا نمونہ ہے خدائے قادر و برتر کی قدرت کی تو کوئی حد نہیں ہے۔

رہا یہ امر کہ وہ ایک قلیل مدت میں ایک بعید مسافت کو کس طرح طے کر لیتے ہیں تو یہ کوئی خلاف عقل نہیں۔ ہوا کی سرعت اور اس کی تیزی ایسی ظاہر چیز ہے جس کی وضاحت کرنے کی حاجت نہیں۔

حکماء جدید کی تحقیق ہے کہ بجلی ایک منٹ میں پانچ سو مرتبہ زمین کے گرد گھوم سکتی ہے اور بعض ستارے ایک ساعت میں آٹھ لاکھ اسی ہزار میل کی حرکت کر لیتے ہیں نیز

جس وقت انسان نظر اٹھا کر دیکھتا ہے تو حرکت نظر اتنی تیز ہوتی ہے کہ ایک ہی لمحہ میں آسمان تک پہنچ جاتی ہے اور اگر یہ آسمان حائل نہ ہوتا تو اور دور تک وصول ممکن تھا ملائکہ اور جن کا وجود اور ان کا قلیل مدت میں بعید مسافت کو طے کر لینا تمام ادیان سماوی میں مسلم رہا ہے۔ اس تقریر سے یہ فائدہ بھی نکل آیا کہ آصف بن برخیا کا ایک لمحہ میں یمن سے شام میں بلقیس کا تخت لے آنا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اس جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر اٹھ جانا اور نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے لیے سات آسمانوں تک عروج کرنا کوئی خلاف عقل نہیں۔ البتہ خلاف عادت ہے اس لئے معجزہ ہے۔

(علم الکلام صفحہ ۳۳۷ تا ۳۳۹ مع التفسیر)

سرسید کے انکار ملائکہ کا رد

اقسام ملائکہ:

(اول) حاملانِ عرش جن کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ. اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَیَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّکَ فَوْقَھُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمَانِیَةٌ.

(دوم) عرش کے اردگرد طواف کرنے والے جن کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

وَتَرَی الْمَلٰٓئِکَةَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ.

(سوم) اکابر ملائکہ ہیں منجملہ ان کے جبرائیلؑ ومیکائیلؑ ہیں کہ جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے قال تعالیٰ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْکٰلَ فَاِنَّ اللّٰہَ عَدُوٌّ لِّلْکٰفِرِیْنَ. حضرت جبرائیل کے قرآن مجید میں چند اوصاف مذکور ہیں۔ ازاں جملہ یہ کہ وہ انبیاء اور خدا تعالیٰ کے درمیان واسطہ ہے اس کے ذریعے سے وحی آتی ہے۔ کما قال تعالیٰ: عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی. وقال تعالیٰ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ.

از ان جملہ یہ ہے کہ ان کو خدا تعالیٰ نے روح القدس فرمایا ہے کما قال اِذْ اَیَّدْتُکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ.

منجملہ ان کے نام اسرافیلؑ ہیں جن کا نام احادیث صحیحہ میں بکثرت وارد ہے اور جن کا فعل صور پھونکنا ہے۔ وقال تعالیٰ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ منجملہ ان کے عزرائیلؑ ہیں جن کا نام احادیث صحیحہ میں بکثرت ہے اور قرآن مجید میں ان کو ملک الموت کہا ہے۔ قال تعالیٰ قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ.

(چہارم) وہ ملائکہ ہیں جو ارواح قبض کرتے ہیں قال تعالیٰ حَتّٰی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا. وقال تعالیٰ وَلَوْ تَرٰی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا الْمَلٰٓئِکَةُ اس جماعت کے سردار عزرائیلؑ ہیں۔

(پنجم) ملائکہ جنت ہیں قال تعالیٰ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ کُلِّ بَابٍ سَلَامٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ.

(ششم) ملائکہ جہنم ہیں اہل دوزخ کو عذاب انہی کے ہاتھ سے ہوتا ہے۔ قال تعالیٰ عَلَیْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ. وَمَا جَعَلْنَا اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِکَةً اور اس فریق کے سردار مالک ہیں قال تعالیٰ وَنَادَوْا یٰمٰلِکُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّکَ. اور اس کل فریق کا نام زبانیہ ہے۔ قال تعالیٰ فَلْیَدْعُ نَادِیَهٗ سَنَدْعُ الزَّبَانِیَةَ.

(ہفتم) وہ ملائکہ ہیں کہ جو کہ بنی آدم پر موکل و محافظ ہیں۔ قال تعالیٰ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ. وقولہ تعالیٰ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ. وقولہ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ یَحْفَظُوْنَهٗ. وقولہ وَیُرْسِلُ عَلَیْکُمْ حَفَظَةً (ہشتم) وہ ملائکہ ہیں جو آدمی کے اعمال لکھتے ہیں۔ قال تعالیٰ وَاِنَّ عَلَیْکُمْ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ.

(نہم) وہ ملائکہ ہیں کہ جو اس عالم کے احوال پر موکل ہیں خدائے پاک کے اس قول میں یہی لوگ مراد ہیں۔ وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا اِلٰی قولہ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا.

وقوله وَالنَّازِعَاتِ غَرْقًا.

اسی طرح قرآن مجید واحادیث صحیحہ میں ملائکہ کے اوصاف مختلف مذکور ہیں۔
منجملہ ان کے یہ ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام اور خدا تعالیٰ کے درمیان واسطہ اور رسول ہیں۔ قال تعالیٰ جَاعِلُ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا. وَقَالَ تعالیٰ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا.

منجملہ ان کے یہ کہ وہ عابدین وساجدین ہیں۔ قال تعالیٰ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ. وقال تعالیٰ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ. منجملہ ان کے یہ کہ وہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ قال اللہ تعالیٰ لَايَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ.

منجملہ ان کے یہ کہ وہ نہایت خائف اور ترساں خدا تعالیٰ سے رہتے ہیں۔ قال اللہ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَقَالَ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُوْنَ.

منجملہ ان کے یہ کہ وہ خدا تعالیٰ کے دوستوں کی مدد کرتے اور مسلح ہو کر لڑتے ہیں جیسا کہ جنگ بدر میں واقع ہوا۔ قال تعالیٰ يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ.

منجملہ ان کے یہ ہے کہ ان کے لئے بازو اور پر ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ.

علاوہ ان آیات کے اور بہت سی آیات فرشتوں کے ایسے حالات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ کوئی ایسی مخلوق الٰہی اور قسم کی ہے کہ جو جسم اور افعال میں ہم لوگوں سے بالکل مغائر (مختلف) ہے۔

اب سید احمد خان صاحب ان آیات کی کہاں تک توجیہ کریں گے اور کہاں تک تاویل کر کے اصلی کے معنی بدل کر ان کو قوی بتلائیں گے۔ قرآن (بلکہ تورات وانجیل ووید ودساتیر) کے ماننے والے سے یہ امر ناممکن ہے کہ وہ فرشتوں کا انکار کرے اور

ان کو قوی بتلائے۔ ہاں جو شخص ان کتابوں میں سے کسی کا بھی قائل نہ ہو اور حکماءِ قدیم وحال کے بھی برخلاف ہو تو وہ جو چاہے سو کرے۔ سید صاحب! یا قرآن کا انکار کیجئے یا فرشتوں کے قائل ہو جائیے۔

سرمد گلہ اختصارے باید کرد
یک کار ازیں دو کار مے باید کرد

یا تن برضائے دوست می باید داد
یا قطع نظر ز یار می باید کد

(مقدمہ تفسیر حقانی ۱/۲۶)

منشی چراغ علی اور سرسید کے انکار جنات کا رد

قوم جن کا ثبوت بھی

قرآن مجید کی آیات سے اس صفت کے ساتھ ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوئے ہیں...... اور جو آسمانوں میں اڑ کر پہنچتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن شریف میں ہے: وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا یعنی جن کہتے ہیں کہ ہم نے آسمان جا چھوا تو اس کو بڑے بڑے سخت پاسبانوں سے بھرے ہوئے پایا یعنی ملائکہ سے۔

اور کفار ان کے عجائب حرکات سے ان کی عبادت کرتے تھے جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا: يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ.

اور مشرکین جنات کے نام کی دُہائی دیا کرتے تھے جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا:

وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ.

اور جن آسمانوں کے قریب جا کر فرشتوں کی باتیں سن آیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا: وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا یعنی جن کہتے ہیں کہ ہم پہلے آسمانوں کے پاس خبر سننے کے

مواضع میں جا بیٹھا کرتے تھے اور اب جو کوئی وہاں جاتا ہے تو اس کے لئے شعلہ آگ کا (جس کو ستارا ٹوٹا کہتے ہیں) گھات لگائے ہوئے ہیں۔ (یعنی اب آسمانی خبریں نہیں لا سکتے اور جو کوئی وہاں جاتا ہے تو اس پر فرشتے انگارے برساتے ہیں)۔

پس اب جو کوئی محض لغوی معنی جن پر (کہ جو پوشیدہ ہوتا ہے) خیال کر کے جن کی نوع کا انکار کرے اور کسی پہاڑی قوم جنگل باش کو جو لوگوں سے پوشیدہ رہتی ہوگی (بقول منشی چراغ علی صاحب) نوع جن کا مصداق بنا دے تو وہ ان آیات کا صریح منکر ہے کیونکہ اگر ہم کوئی ایسی قوم بھی فرض کر لیں جو بقول منشی صاحب وسید صاحب لوگوں سے پوشیدہ رہتی تھی تو عرب کا اس کی عبادت کرنا اور اس سے عقلاء کا دُہائی دے کر مدد مانگنا اور پھر اس قوم کا اڑ کر آسمانوں تک جانا اور ان کا برخلاف انسان کے مادۂ آتشی سے پیدا ہونا جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا: وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ اور قرآن میں اس قوم سے ہر جگہ انسانوں کے مقابلہ میں خطاب کرنا جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا: مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اور جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا: يَامَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ اور ان کے لئے کوئلہ اور ہڈی کا غذا ہونا (جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت نبی علیہ السلام کے پاس ایک قوم جن کی اسلام لانے اور مسائل سیکھنے آئی اور آنحضرت ﷺ رات کو عبداللہ بن مسعودؓ کو ساتھ لے کر جنگل میں گئے اور کہہ دیا یہیں بیٹھے رہنا اور عبداللہ بن مسعودؓ کو سوائے آوازوں کے اور کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا اور جنوں نے کہا کہ اپنی امت کو ارشاد فرما دیجئے کہ ہڈی اور کوئلہ سے استنجاء نہ کریں کیونکہ یہ ہماری غذاء ہے) انسان کی کسی قوم پر صادق نہیں آ سکتا کما یشہد بہ العقل والنقل اور اسی طرح انجیل متی ولوقا وغیرہما میں بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کئی آدمیوں میں سے جن نکالا اور اس جن نے نکلتے وقت کلام کیا اور اب بھی ایسے واقعات اکثر مشاہدہ میں آتے ہیں بلکہ ایک شخص جنوں کے بڑے عامل تھے، بہت سے لوگوں کے روبرو انہوں نے عجائب غرائب باتیں دکھائیں کہ جو شعبدہ اور نیر

نجات سے غیر تھیں اور میرے ایک دوست کے ساتھ جن کا عجیب ماجرا گزرا ہے کہ جس کے سننے سے حیرت ہوتی ہے۔ (مقدمہ تفسیر حقانی ۳/۱)

مولانا عبدالحق حقانی مزید لکھتے ہیں:

وجود جن میں اکثر اختلاف رہا ہے اکثر فلاسفہ انکار کرتے ہیں ان کے نزدیک خداوند تعالیٰ کی مخلوقات کا کارخانہ محسوسات میں ہی تمام ہے جس چیز کو وہ حواس خمسہ سے دریافت نہیں کر سکتے ان کے نزدیک محض خیالی چیز ہے اس کا وجود خارج میں نہیں۔ آج کل کا فلسفۂ یورپ بھی اسی کا قائل ہے اور ان کے بعض مقلد مسلمان بھی اسی کے قائل ہیں اور اس قسم کی آیات کی تاویلات کرتے ہیں اور اس کا نام ان کے نزدیک تفسیر دانی اور قرآن فہمی ہے، مگر یہ بہت کوتاہ خیال ہے اس لئے کہ ان فلاسفہ کا ایک بڑا گروہ طبعی اور مادی ہے جو خدا تعالیٰ کا قائل نہیں اور عالم کے تمام کائنات کواکب و آفتاب نباتات وحیوانات کو مادہ اور اس کی حرکت کے آثار بتلاتے ہیں۔ مذہب آریہ آخر کار اسی طرف بہہ کر آجاتا ہے لیکن ان سے جب مادہ کی حقیقت دریافت کی جاتی ہے تو وہ ایسے اجزاء صغار بتلاتے ہیں جو آج تک نہ کسی کہربائی آلہ سے دریافت ہوئے نہ کسی خوردبین سے دیکھے گئے۔ پھر یہ مادہ جو ان کے نزدیک خالق ہے کس حواس خمسہ سے محسوس ہوا ہے یا ہوسکتا ہے۔

بعض حکماء غیر محسوس موجودات کے قائل ہوئے ہیں اور قدماء کا ایک گروہِ عظیم وجودِ جن کا قائل ہوا ہے یہ اور اصحاب روحانیات جن کو ارواح سفلیہ کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ارواح سفلیہ جلد قبول کرتی ہیں مگر ضعیف ہیں برخلاف ارواح فلکیہ کے کہ وہ دیر میں قبول کرتی ہیں مگر قوی ہیں اسی طرح کل اہل مذاہب اور حضرات انبیاء علیہم السلام کے ماننے والے اہل اسلام وعیسائی و یہودی بلکہ ہندو وغیرہ جن کے قائل ہیں ہر ایک کی زبان میں جن کا ایک نام ہے۔ انجیل موجود ہے حضرت مسیح علیہ السلام کا جنوں کا

مریض میں سے نکلنا مذکور ہے۔

پھر جو وجودِ جن کے قائل ہیں ان کے دو قول ہیں:

(۱) یہ کہتے ہیں کہ جن اور ملائکہ نہ اجسام ہیں نہ اجسام میں حلول کئے ہوئے ہیں بلکہ جواہر ہیں جو بذاتِ خود موجود ہیں پھر ان کے مختلف انواع و اقسام ہیں بعض رذیل خسیس شر و آفات کو پسند کرنے والے ہیں ان کی بہت اقسام ہیں جن کو اللہ تعالی کے سوا اور کوئی جان نہیں سکتا وہ افعال قویہ کر سکتے ہیں علم رکھتے ہیں دیکھتے سنتے ہیں۔

(۲) جن بھی اجسام ہیں مگر اجسام لطیفہ ہیں لطافت کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتے مگر وہ خود جس شکل میں چاہیں ظاہر ہو سکتے ہیں پھر بعض کا مادہ اجزاء ہوائیہ ہے بعض کا ناریہ۔ پھر اس مادہ کے لحاظ سے بعض اقسام بالذات نیک اور عابد ہیں کہ جن پر فرشتہ یا ملک کا بھی اطلاق ہوتا ہے اور بعض گندے اور سرکش اور ناپاک ہوتے ہیں جن پر شیطان کا بھی اطلاق ہوتا ہے اور بعض میں خیر و شر دونوں کی صلاحیت ہے اور وہ بعض اوقات نبی انسان سے مجامعت و مجالست بھی کرتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ بنی آدم کی ارواح مرنے کے بعد جو کثافت کی وجہ سے عالم قدس تک نہیں پہنچتیں وہ جنوں میں مل جاتی ہیں۔ ایسی ہی ناپاک روحیں لوگوں کے سروں پر آتی ہیں اور ادھر ادھر کی خبریں بھی اپنے نذر و نیاز کرنے والوں کو دیا کرتی ہیں۔ (تفسیر حقانی ۹۴/۵، ۹۵)

سرسید کے انکار شیطان کا رد

جس پر یہ لفظ ابلیس اور شیطان قرآن میں جا بجا بولا گیا ہے آیا وہ کوئی آدمی ہے یا آدمی کی قوت بہیمیہ اور نفس امارہ ہے یا کوئی اور شخص مخالف الحقیقت ہے؟

جمہور اہل اسلام اس کے قائل ہیں کہ وہ ایک شخص خاص از قسم جن ہے کہ جس نے حضرت آدمؑ کے بارے میں نافرمانی کی اور راندہ گیا۔

اہل کتاب یہود و عیسائی بلکہ مجوسی اس کا ایک وجود جداگانہ مانتے ہیں چنانچہ انجیل متی کے چوتھے باب میں حضرت عیسیٰؑ کو شیطان سے آزمایا جانا لکھا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نہ تو عیسائی لوگ اس شیطان سے کوئی آدمی مراد رکھتے ہیں نہ خود حضرت عیسیٰؑ کی قوت بہیمیہ یا نفس امارہ۔

اور اسی طرح تورات سفر خلیقہ (یعنی کتاب پیدائش) میں بھی ہے کہ سانپ نے حوا کو بہکا کر وہ درخت کھلوا دیا اور یہ ظاہر ہے کہ وہ شیطان ہی تھا کہ جو سانپ کی صورت میں ظاہر ہوا تھا ورنہ سانپ کیا بہکاتا؟

اور اسی طرح دساتیر میں ہر جملہ کے اول اعوذ باللہ کا ترجمہ (یعنی پناہ مانگتے ہیں ہم دیو گمراہ کرنے والے سے) لکھ رکھا ہے کہ جس سے یہی مدعا سمجھا جاتا ہے اور قرآن مجید کی تو بہت سی آیات سے ثابت ہے کہ وہ نہ آدمی ہے نہ آدمی کی قوت بہیمیہ یا نفس امارہ بلکہ وہ ایک چیز جداگانہ مخلوق مادہ ناری سے ہے کہ جس کا نام مشہور عزازیل ہے۔

ازانجملہ یہ آیت ہے: ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ. لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ○ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ. قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ.

ترجمہ: جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدۂ تعظیم کرو تو سب نے کیا مگر ایک ابلیس نے نہ کیا' خدا تعالیٰ نے اس سے کہا کہ جب ہم نے تجھ کو حکم کیا تو تو نے کیوں سجدہ نہ کیا؟ بولا میں آدمؑ سے کہیں بہتر ہوں تو نے اس کو خاک سے اور مجھ کو آگ سے بنایا۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہوا کہ اس کا مادہ ناری ہے اور نار چونکہ لطیف ہے اس لئے وہ محسوس بحس بصر نہیں ہو سکتا جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا: اِنَّهٗ يَرٰكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ وَلَا تَرَوْنَهُمْ لا. یہ کہ وہ شیطان اور اس کی ذریت تم کو دیکھتی ہے اور تم کو وہ نظر نہیں آتے۔

اور اسی لئے پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جب تم بیت الخلاء میں جایا کرو تو یہ کہہ لیا کرو اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ کیونکہ شیاطین بنی آدم کو ننگا دیکھتے ہیں رواہ الترمذی۔

ازانجملہ یہ آیت ہے کَانَ مِنَ الْجِنِّ الآیہ کہ شیطان قوم جن سے تھا اور جن کی پیدائش آگ سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ O

سید صاحب کہتے ہیں کہ ان کے اس خیال کے غلط کرنے کے لئے تو یہی آیات کافی ہیں کیونکہ قوت بہیمیہ آدمی کی ایک صفت ہے اس کا سجدہ سے انکار کرنا اور مادہ آتشی سے پیدا ہونا اور اس کا جن کی قوم سے ہونا اور اس کا اور اس کی ذریت کا بنی آدم کو دیکھنا پھر اس کا سوال و جواب کرنا اور اپنے آپ کو آدمؑ سے بہتر بتانا اور وجہ امتیاز کی یہ بیان کرنا کہ میرا مادہ آتش اور آدمؑ کا مادہ خاک ہے اور پھر اس کا جنت سے نکالا جانا اور اپنے لئے دعا کرنا کہ مجھ کو حشر تک زندہ رکھ کہ آدمؑ کی اولاد کو بہکا کر اپنا دل ٹھنڈا کروں اور پھر خدا تعالیٰ کا اس کو اور اس کے متبعین کو جہنم میں ڈالنا قوت بہیمیہ پر ہرگز صادق نہیں آتا اور کوئی تاویل ہو نہیں سکتی ہاں اگر ہنود کے طرز کو اختیار کر لے اور جس طرح وہ برہما بشن مہادیو کو خدا تعالیٰ کی تین صفات کہتے ہیں اور پھر ان کو مجسم ہو کر جداگانہ متحیز بالذات اور کھاتا پیتا جماع کرتا بھی مانتے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ گنگا جمنا کو عورت بھی کہتے ہیں اور دیبی بتلاتے ہیں پھر دریا بھی سمجھتے ہیں یا عیسائی طور کو پسند کر لے کہ باپ خدا' بیٹا خدا' روح القدس خدا پھر ایک خدا' الغرض جو ایسے ایسے محالات عقلیہ کا قائل ہو جائے تو پھر اس سے ہمارا کلام نہیں وہ جو دل چاہے سو کہے)

ازانجملہ یہ آیت ہے قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ. یعنی اتر جنت سے تجھ کو یہاں رہ کر تکبر کرنا شایان نہیں' نکل یہاں سے او ذلیل و خوار۔

ازانجملہ یہ ہے قَالَ اَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ O شیطان نے عرض کی کہ الٰہی

مجھ کو قیامت تک زندہ رکھ' جواب آیا کہ جا تجھ کو ایک وقت معین تک مہلت ہے قَالَ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ یعنی شیطان نے کہا کہ تو نے مجھ کو گمراہ تو کیا ہی ہے میں بھی آدمؑ کی اولاد کو تیری سیدھی راہ سے بہکاؤں گا۔

ازانجملہ یہ ہے لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِیْنَ کہ میں بھی تجھ سے اور تیرے سب پیرووں سے جہنم ہی بھر دوں گا۔

سید صاحب! فرمایئے اگر شیطان آدمؑ کی قوت بہیمیہ تھی تو وہ آدمؑ کا وصف تھا پھر اس نے کیا سمجھ کر کہہ دیا کہ میرا مادہ آتش ہے؟ اچھا اس نے کہا تھا خدا پاک نے کیوں اس کو جن کہا اور مادۂ آتشی اس کی اصل قرار دیا؟

پھر آپ فرماتے ہیں کہ "فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ کرنا اور شیطان کا نہ کرنا ایک معما ہے کہ جس کے یہ معنی کہ قویٰ ملکیہ نے آدم کی اطاعت کی اور بہیمیہ نے نہ کی الخ"۔

اے جناب! یہ اجتماع ضدین نہیں تو اور کیا ہے کیونکہ جب آپ نے ملائکہ سے مراد قویٰ ملکیہ لی اور ان کو آدمؑ کے لئے مسخر بنایا تو اب آدمؑ کی قوت بہیمیہ کیا سرکشی کر سکتی ہے؟ اور اگر قوت بہیمیہ نے سرکشی کی کہ جس کو آپ شیطان کہتے ہیں (حالانکہ یہ خلاف ہے اس آیت کے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ کیونکہ اس آیت کے حسب قرارداد آپ کے یہ معنی ہوئے کہ خدا تعالیٰ کے بندوں پر قوت بہیمیہ غالب نہیں آتی) تو پھر قوت ملکیہ کی اطاعت چہ معنی دارد۔

شعر:

خرابی میں پڑا ہے سینے والا جیب وداماں کا
جو یہ ٹانکا تو وہ ادھڑا جو وہ ادھڑا تو یہ ٹانکا

پھر وہ قوت بہیمیہ جہنم میں کیونکر جائے گی اور وہ جنت سے کیونکر نکالی گئی؟ الغرض قافیہ تنگ ہے۔ (تفسیر حقانی ۱/۳۲)

کیا فرشتوں کے نام دراصل صفات خداوندی ہیں؟

جبرائیلؑ ومیکائیلؑ یہودیوں نے فرشتوں کے لئے نام مقرر کئے تھے اور ان کے ہاں سات فرشتے نہایت مشہور فرشتوں میں ہیں مگر اس کا ثبوت نہیں ہے کہ کسی نبی نے ان کو بتایا تھا کہ یہ فرشتوں کے نام ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحفِ انبیاء میں کوئی صفت صفاتِ باری تعالیٰ میں سے کسی خاص لفظ کے ساتھ تعبیر کی گئی تھی پھر رفتہ رفتہ وہ لفظ فرشتہ کا نام متصور ہونے لگا الخ"۔

جواب: دیکھئے کتاب دانیال 8 باب میں یوں ہے۔ایک آواز آئی کہ اے جبرائیلؑ! اس شخص کو اس رویاء کا مطلب سمجھا دے انتہیٰ۔ اگر دانیال آپ کے نزدیک نبی نہیں ہیں تو یہ اور بات ہے ورنہ دانیال پیغمبر علیہ السلام کی زبان سے جبرائیلؑ کا نام صاف معلوم ہوتا ہے، اسی طرح انجیل لوقا باب 1 میں یوں ہے۔فرشتے نے جواب میں اس سے کہا میں جبرائیلؑ ہوں جو خدا تعالیٰ کے حضور حاضر رہتا ہوں انتہیٰ۔

دوم آپ کا یہ فرمانا کہ صحف انبیاء الخ دعویٰ بلا دلیل ہے وہ کونسا صحیفہ ہے کہ جس میں جبرائیلؑ ومیکائیلؑ کو صفت باری تعالیٰ لکھا ہے ذرا اس کا تو حوالہ دیجئے۔

سوم یہ قول آپ کا کہ رفتہ رفتہ وہ لفظ فرشتہ کا نام متصور ہونے لگا۔ آپ کے ہی لئے مضر ہے کیونکہ جب بقول آپ کے فرشتہ کوئی جداگانہ وجود ہی نہیں رکھتا تو پھر ان اہل کتاب یہود نے کس شے کا نام فرشتہ رکھا تھا؟

چہارم اگر بالفرض اس صفت کو فرشتے کا نام مقرر کر لیا تھا تو اس سے فرشتے کے وجود جداگانہ کی نفی کیونکر سمجھی گئی؟ غایۃ الامر یہ بات کہ وہ نام منقول ہوگا کسائر الاسماء المنقولۃ. (جیسا کہ باقی منقول ناموں کا حال ہے)

مثلاً ریل کسی شخص کا نام رکھا جائے تو یہ نہ لازم آئے گا کہ سوائے اس کے ریل

گاڑی کا وجود نہ ہو تو لہ قرآن مجید میں اس کا استعمال اسی طرح پر ہوا ہے کہ جس طرح یہودی خیال کرتے تھے۔

اقول پس جب قرآن مجید میں لفظ ملائکہ کا انہیں معنی میں استعمال ہوا کہ جن معنی میں یہودی استعمال کرتے تھے تو الحمدللہ آپ ہی کے اقرار سے فرشتوں کا وجود جداگانہ قرآن سے ثابت ہو گیا کیونکہ بقول آپ کے یہودی فرشتوں کا جداگانہ وجود اہل اسلام کے عقیدہ کے موافق سمجھتے تھے اب آپ کا اس معنی سے انکار کرنا قرآن کا انکار ہے ہمارے لئے تو اسی قدر کافی ہے کہ قرآن میں لفظ ملائکہ انہیں معنی پر وارد ہے کہ جس کو اہل اسلام اور یہود تسلیم کرتے ہیں اب یہ آپ کو اختیار ہے کہ آپ قرآن کو صحیح مانیں یا یہود کی تقلید کریں جیسا کہ آپ اس قول میں فرماتے ہیں۔

(مقدمہ تفسیر حقانی ۱/۳۶)

جبرائیل انبیاء کرام سے افضل کیوں نہیں

اعتراض: (بیس برن لالہ اندر من ہندو کا اعتراض)

مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی شان کے بعد جبرائیل کا درجہ پہچانیں اور اس کے بعد پیغمبروں کا' پیغمبروں کو جبرائیل کے درجے سے کم جانیں' کیونکہ جبرائیل پر بغیر کسی واسطے کے خدا کی وحی اترتی تھی اور جبرائیل پیغمبروں پر وحی لاتے تھے اور پیغمبر آگے امت تک وحی کو پہنچاتے تھے۔

جواب: یہ معترض کا ہذیان ہے اور حماقت کی دلیل ہے جس کو نہ تو وحی کی حقیقت کا پتہ ہے اور نہ رسالت کو جانتا ہے اور جو کچھ زبان پر آتا ہے کہہ جاتا ہے سفیر کا درجہ مرسل الیہ سے بڑا نہیں ہوتا اس سے لازم آتا ہے کہ راجہ اپر چرنے (باز کے ذریعہ) جو اپنی بیوی کی طرف اپنی منی کا قطرہ بھیجا تھا تا کہ اس کو وہ اپنے رحم میں رکھ کر اولاد پیدا کرے یہ (باز) اُس کی بیوی سے افضل ہو۔

اور اعتراض میں یہ کہنا کہ پہلے جبرائیل پر وحی ہوئی تھی پھر وہ انبیاء پر وحی لے آئے تھے تو یہ حماقت ہے جبرائیل تو محض سفیر کی حیثیت رکھتے تھے نہ کہ دراصل ان پر وحی اترتی تھی۔ (سوط اللہ الجبار صفحہ ۱۲۸)

کیا جبرائیلؑ انسانی خواہشات سے بری نہیں

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

جبرائیل انسانی خواہشات اور وساوس سے بری نہیں ہے کیونکہ یہ حضرت مریم عفیفہ کے پاس غسل کے وقت خوبصورت نوجوان کی شکل میں گئے اور پھونک ماری۔

جواب: حضرت جبرائیل پر یہ الزام لگانا عین حماقت ہے' یہ الزام اس وقت صحیح ہوتا جب کہ ان میں ذکورت اور انوثت کا فرق ہوتا اور وہ مذکر ہوتے' فرشتے نہ مذکر ہیں اور نہ مؤنث ہیں بلکہ وہ ان دونوں صفتوں سے بری ہیں اور ان میں قوت بہیمیہ بھی نہیں ہے جس سے شہوت حیوانی پیدا ہو یہ اس سے مبرا ہیں۔ ان کے نزدیک چاہے کسی نے کپڑے پہنے ہوئے ہوں یا نہ پہنے ہوئے ہوں دونوں حالتیں برابر ہیں جس طرح سے بالکل چھوٹا بچہ جب وہ ماں کے پاس ہوتا ہے یا دوسری عورتوں کے پاس اور ان عورتوں کی برہنگی دیکھے تو اس میں کسی قسم کی شہوت پیدا نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کو علم ہوتا ہے باوجود اس کے کہ بچے شہوت انسانی سے بری نہیں ہوتے۔ باقی حضرت جبرائیل کا حضرت مریم کے پاس جانا یہ قرآنی حکم کے مطابق تھا۔ شہوت حیوان کے طور پر نہیں تھا جیسا کہ اللہ نے فرمایا: فَاَرْسَلْنَا اِلَیْھَا رُوْحَنَا تو حضرت جبرائیلؑ محض حکم الٰہی سے ان کے پاس گئے تھے نہ کہ اپنی خواہش کے طور پر چنانچہ فَتَمَثَّلَ لَھَا بَشَرًا سَوِیًّا قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْکَ اِنْ کُنْتَ تَقِیًّا" جب مریمؑ نے ان کو دیکھا تو ان سے اپنی عفت وعصمت کے مطابق پناہ مانگی تو جبرائیلؑ نے اس وہم کو دور کرنے کے لئے فرمایا: "اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَھَبَ

لَکِ غلماً زَکِیًّا“ میں آپ کے رب کا رسول ہوں میں آپ کو ایک پاکیزہ لڑکا اللہ کی طرف سے دینے آیا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ میں صرف آپ کو اللہ کے حکم سے بیٹا دینے آیا ہوں۔ وہ بات نہیں جس کا اے مریم آپ نے گمان کیا ہے میں اس سے بری ہوں تو اس کے جواب میں حضرت مریم نے فرمایا: ”اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلَامٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَلَمْ اَکُ بَغِیًّا قَالَ کَذٰلِکِ قَالَ رَبُّکِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ“ یعنی جب حضرت مریم نے پہچان لیا کہ یہ خدا کا امین فرشتہ ہے اور جو مجھے اس سے خوف آیا ہے اس سے میں محفوظ ہوں اس وقت اس نے بچے کے پیدا ہونے پر بنظر تعجب اور عفت حال و مآل خود حیران ہوئیں اور اس حیرت کو دور کرنے کے لئے جبرائیل سے کہا کہ مجھے بیٹا کیسے ہوگا؟ جب کہ مجھے کسی انسان نے ہاتھ تک نہیں لگایا اور نہ میں دوسری قسم کی عورت ہوں تو اس پر حضرت جبرائیل نے فرمایا اسی طرح سے ہوگا آپ کے رب پر یہ آسان ہے تو ان آیات سے واضح ہوا کہ حضرت جبرائیل صرف سفیرِ محض تھے اور ان کے درمیان کی گفتگو صرف قاصد اور پیغام رساں کے درجے میں تھی۔

ہندوؤں کی کتابوں سے دیوتاؤں کے گندے واقعات کی حکایات

یہ ہے وہ حقیقت جو حضرت جبرائیل اور حضرت مریمؑ کے واقعہ میں ہے اس کے بالمقابل ہم ہندوؤں کی کتابوں سے خود ہندو دیوتاؤں کے قابل اعتراض کچھ واقعات نقل کرتے ہیں جن کو دیکھ کر حیاء بھی شرما کر کنارہ کر جاتی ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں۔

حکایت (۱): ایک مرتبہ دھرم راج برہمن کی شکل میں سودرسن کی بیوی کے پاس گیا۔ یہ سودرسن کی بیوی برہمن کی خدمت میں اور عزت میں بہت مبالغہ کرتی تھی یہ دھرم راج اس سے مجامعت کا خواہش مند ہوا یہ عورت سادہ لوح تھی اس کو علم نہیں تھا

کہ پروردگار کی نافرمانی کے مقابلے میں کسی برہمن کی یا چھتری کی بات کو ماننا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اس دھرم راج کو اپنے بستر پر لے گئی قریب تھا کہ اس برہمن کا مدعیٰ حاصل ہوا چانک سودرسن گھر میں آ گیا اس نے ان دونوں کو ایک جگہ اکٹھے دیکھا تو سودرسن نے برہمن کے شرف کی رعایت کرتے ہوئے کچھ نہ کیا اور برہمن کے عیش اور کامرانی میں کوئی خلل نہ ڈالا۔ اور اپنی بیوی کو امن کے ساتھ خلوت میں چھوڑ دیا جب برہمن نے اس عورت کے شوہر کا یہ خلوص دیکھا تو اس کی مروت کی تعریف کی اور برہمن نوازی کی تعریف کی۔

اس واقعہ کو برہمن نوازی کے امتحان کے طور پر نقل کیا جاتا ہے اور یہ ہندوؤں کی کتاب مہابھارت سانک پرب میں لکھا ہے۔

یہ قصہ دھرم راج کا ہے اور یہ ہندوؤں کا ایک دیوتا ہے جس کو دھرم کے نام سے پکارتے ہیں اور دھرم کا معنی دین اور دیندار ہے اور یہ وہ دیندار ہے جو اجنبی عورت کے پاس تنہائی میں جاتا ہے اور مجامعت کی خواہش کرتا ہے۔ تو جو دیوتا دھرم نام نہیں رکھتے ان کا کیا حال ہوگا وہ جو کچھ کریں گے کیا کچھ بعید ہے

اگر کہا جائے کہ یہ برہمن کا اس عورت کے شوہر کے لئے امتحان تھا تو ہم کہیں گے یہ محض بناوٹی بات ہے۔ بداعمالی میں کیا امتحان ہوتا ہے یہ تو بے غیرتی کی تعلیم ہے کہ اپنی بیوی کو برہمنوں کے سپرد کر دیا جائے ایسا امتحان تو کسی مذہب اور ملت میں ہرگز جائز نہیں۔

بلکہ اس قصے میں راجہ اندر کی اقتداء ظاہر ہو رہی ہے جس کی حکایتیں بہت ہیں یہ راجہ اندر دیوتاؤں کا سردار ہے اور برہمنوں کی بیویوں کے ساتھ اور اپنے مرشد کی بیوی کے ساتھ خود اس نے زنا کیا تھا جو محتاج بیان نہیں ہے اور ہندوؤں کی معتبر کتابوں میں واضح طور پر لکھا ہے۔

حکایت (۲): اور ہندوؤں کے اعتقاد میں یہ بھی ہے کہ ہندوؤں کی کنواری لڑکیاں

پہلے خود دیوتا استعمال کرتے ہیں اور اس کے بعد ان کے شوہروں کے لئے ان کو چھوڑ دیتے ہیں چنانچہ اسگند پوران ادھیائے ۴۰ میں لکھا ہے کہ

از زنان اول دیوتا ہا عیش می نمایند باز نوبت انسان میرسد و ہر گاہ دختر بحیض گردید آتش دیوتا و ہر گاہ بفرج اد موئے نمودار شد ماہتاب و ہر گاہ پستان ظاہر شدند کنند ہر پان عیش میکنند۔ انتہی

(ترجمہ) کہ عورتوں سے سب سے پہلے دیوتا عیش کرتے ہیں اس کے بعد انسان کی نوبت آتی ہے۔ اور جب کسی لڑکی کو حیض آتا ہے تو یہ دیوتا کے آلہء تناسل کے داخل کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے اور جب شرمگاہ پر بال ظاہر ہوتے ہیں تو اس میں سورج دیوتا کا استعمال ہوتا ہے اور جب پستان ظاہر ہوتے ہیں تو کندر ہر پان عیش کرتے ہیں۔

غور فرمائیں کتنی گندی عبادت ہے اور کتنا گندا عقیدہ ہے جس نے بے حیائی کو بھی مات کر دیا ہے مہابھارت میں دھرم پرب میں لکھا ہے کہ ماہ مہدر اپنی بیٹی کو خود برہمن کو دے آیا تھا برہمن دیوتا جو اس پر عاشق تھا وہ اس کو غسل کرنے کی حالت میں دریا سے اٹھا کر لے گیا تھا۔

حکایت (۲): ایک اور قصہ بھی پڑھ لیں جو مہابھارت میں آدپرب میں لکھا ہے کہ

جب سند اور اسند دونوں بھائی ریاضت اور عبادت بہت کر چکے اور دیوتاؤں کے گمراہ کرنے سے بھی عبادت سے نہ ہٹے تو یہ دیوتا برہما کے پاس گئے۔ برہمانے اس تدبیر سے ان کو عبادت اور ریاضت سے الگ کیا کہ ان دیوتاؤں سے کہا کہ تم جو چاہو گے حاصل ہوگا۔ برہمانے ان کو خراب کرنے کے لئے ایک عورت بسوکرما کے واسطے سے پیدا کی اور یہ عورت انتہائی حسینہ اور جمیلہ تھی۔ برہمانے کہا کہ اب تو سند اور اسند کے پاس جا اور یہ کام کر کہ دونوں تجھ پر فریفتہ ہو جائیں اس عورت نے برہما کا

حکم مانا اور چلی گئی اسی وقت مہادیو نے اپنے پانچ منہ پیدا کیے تا کہ وہ عورت جس طرف جائے وہ اس کو دیکھ سکے اور اندر دیوتا نے ایک ہزار آنکھیں اس عورت کے نظارہ جمال کے لئے؟ پیدا کیں چنانچہ جب یہ عورت ان دونوں کے پاس گئی تو دونوں اس پر فریفتہ ہو گئے اور ایک دوسرے کے ساتھ جنگ شروع کر دی اور دونوں نے ایک دوسرے کو قتل کر دیا۔ (مختصراً)

اگر اندر دیوتا نے ہزار آنکھیں لگا کر اجنبی عورت کا نظارہ کیا تو یہ اس کی طرف سے کوئی عجیب بات نہیں ہے اس نے خود اپنے مرشد کی بیوی کو بھی نہ چھوڑا تھا۔ خود جناب مہادیو صاحب پر ہنسی آتی ہے کہ اجنبی عورت کے دیکھنے کے لئے اس نے اپنے پانچ منہ پیدا کیے کہ جس طرف عورت جائے گی وہ اس کو دیکھ سکے۔

ایک اور واقعہ سنیں مہابھارت میں پرب بن میں لکھا ہے۔

حکایت (۴): جب دمنی نل کی طرف میل رکھتی تھی اور اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی تو دمنی کے باپ نے ایک مجلس منعقد کی تا کہ دمنی اپنے شوہر کو پسند کرے تو اس مجلس میں کئی دیوتا مثلاً اندر دیوتا اور جم دیوتا اور برن دیوتا اور کبیر دیوتا وغیرہ بھی آ گئے جب ان سب کو معلوم ہوا کہ دمنی کا میلان نل کی طرف ہے تو سب نے اپنی صورت کو نل کی صورت میں بدل دیا۔ انتہی مختصراً

اس قصے سے ان دیوتاؤں کے بددیانتی اور فسق ظاہر ہوتا ہے۔

مہابھارت میں مذکورہ پرب میں لکھا ہے کہ

حکایت (۵): اسنی دیوتا اور کمار دیوتا دونوں راجہ سرجات کی بیٹی سے جو جمن رکھشیر کی بیوی تھی کہنے لگے کہ تو کس وجہ سے اس بوڑھے کمزور پر جان دیتی ہے آ ؤ ہم دونوں کو اپنی شوہری میں قبول کر لو جب عورت نے سخت انکار کیا تو انہوں نے کہا کہ ہم تجھے آزمانا چاہتے ہیں پھر اس سے کہنے لگے کہ تیرا خاوند نابینا ہے اور کمزور ہے ہم تجھے

اس شرط پر نجات دیتے ہیں کہ ہم دونوں اور تیرا شوہر سب پانی میں جاتے ہیں تو اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ لینا غرض یہ کہ تینوں پانی میں چلے گئے اور جب باہر نکلے تو تینوں کی شکل ایک جیسی تھی۔ انتہیٰ مختصراً

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ دونوں دیوتا دیگر دیوتاؤں میں تقویٰ اور حکمت کے ساتھ علانیۃً موصوف تھے۔ انہوں نے کس طرح حیلے سے غیر کی منکوحہ کو طلب کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہندوؤں کے دیوتاؤں میں چاہے وہ بڑے ہوں یا چھوٹے کوئی ایک ایسا نہیں ہے کہ شہوت پرستی اور زنا کاری اور فسق و فجور سے پاک ہو چنانچہ ہم نے بعض کا حال اوپر نقل کر دیا ہے۔

معترض صاحب معصوم فرشتوں کو اپنے دیوتاؤں پر قیاس کرتے ہیں کہ جیسے دیوتا فسق اور نافرمانی میں آلودہ ہیں تو اللہ کے فرشتے بھی ایسے ہی ہوں گے۔ اور اس لئے بھی تاکہ ہندوؤں کے اکابر جو خود ایسی گندگیوں میں مبتلا ہیں ان سے عار کو دفع کرنا چاہتے ہیں۔

حکایت (٦): سری کرشن صاحب کی حکایات میں سے ایک حکایت ادھیائے ۲۳ اسکند دہم بھاگوت میں لکھا ہے۔

جب برج کی عورتیں کنارے پر جمنا کی ندی میں آئیں اور اپنے لباس اتار کر جمنا کے کنارے پر رکھے اور ننگی ہو کر پانی میں نہانے لگیں اور گانے لگیں۔ سری کرشن نے ان کی آواز سنی اور وہاں آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے پہنچ گیا اور خفیہ خفیہ ان ننگی عورتوں کو دیکھنے لگا اس نے اتنا نہ کیا بلکہ ان سب عورتوں کے کپڑے اٹھا کر ایک اونچے درخت پر رکھ دیئے جب ان عورتوں نے اپنے کپڑے ندی کے کنارے پر نہ پائے تو اپنے کپڑوں کو تلاش کرنے لگیں جب ان کو کپڑے نہ ملے بہت تلاش کے بعد تو ان عورتوں میں سے ایک عورت نے دیکھا کہ تمام عورتوں کے کپڑے ایک

اونچے درخت پر رکھے ہوئے ہیں اور سری کشن جی ننگی عورتوں کا نظارہ فرما رہے ہیں جب انہوں نے اپنا لباس اس سے طلب کیا تو ان کو یہ جواب ملا جو بے شرمی اور کمال شہوت پرستی پر دلالت کرتا ہے' جو شرم وحیاء کے پردے کو چاک کر دیتا ہے اس نے کہا کہ ہر ایک ننگی ہو کر میرے سامنے آئے اور اپنا لباس لے کر جائے چونکہ ان عورتوں کو کوئی چارہ کار نہیں تھا سوائے اس کی فرمائش کو پورا کرنے کے چنانچہ کرشن صاحب کے سامنے اس حالت میں آنے لگیں کہ اپنا ہاتھ اپنی شرمگاہ پر رکھا ہوا تھا۔ ہزار حیف کہ کرشن صاحب کا نفس امارہ اسی حالت تک کفایت نہیں کرتا تھا بلکہ جب تک کرشن جی نے ان سب عورتوں کی اندام نہانی کو نہ دیکھا ان کے کپڑے واپس نہ کیے چونکہ یہ عورتیں اپنے ہاتھوں سے اپنی شرمگاہوں کو چھپا رہی تھیں کرشن جی نے کہا کہ اپنے مواقع مخصوصہ سے اپنے ہاتھوں کو ہٹا دو اور بالکل الف ہو کر سامنے آؤ اور اپنے کپڑے طلب کرو۔ ناچار بے چاری عورتیں مجبور ہو کر اس طرح آئیں کہ اپنے ہاتھ باندھے ہوئے تھے اور تمام جسم اور شرمگاہ کو کرشن صاحب دیکھ رہے تھے تب کرشن جی نے ان کو ان کے کپڑے واپس کیے۔

معترض صاحب اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ یہ کرشن جی نے عورتوں کو تنبیہ کے لئے کیا تھا تاکہ وہ ننگی ہو کر دریائے جمنا میں نہ نہائیں اور دوبارہ ایسا نہ کریں۔ لیکن افسوس کا مقام ہے بلکہ گناہ پر گناہ کی بات ہے کہ بید کی شریعت کی رو سے دریا میں اور ندی میں ننگا نہانا ممنوع ہے لیکن ندی سے عریانی کی حالت میں اور اندام نہانی کو ظاہر کر کے باہر لانا کب درست ہے؟ اس کیفیت کے ساتھ جو بے حیائی اور بے شرمی پر پوری طرح مشتمل ہے کیا ایسا نہیں ہے کہ بید کی شریعت کا مدار شہوت پرستی پر ہے اور یہ بے حیائی اور بے شرمی عین ان کی شریعت کے مطابق ہے۔

تعجب ہے کہ معترض صاحب نے حضرت خضرؑ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ خضرؑ نے کشتی کا تختہ اور پھٹا کیوں توڑا تھا؟ بہتر تو یہ تھا کہ جو بادشاہ کشتیاں چھین رہا تھا اس کو زجر و توبیخ اور تنبیہ کرتے۔

یہاں دو طرفہ تماشہ یہ ہے کہ سری کرشن جی کی اس حرکت پر معترض صاحب کو کسی قسم کی شرمندگی نہیں ہے۔

بلکہ ہندوؤں کی عورتیں اس حرکت کے خلاف بید کی اس بات سے کوئی تنبیہ حاصل نہیں کرتیں بلکہ اس قدیم رسم کو جاری وساری رکھے ہوئے ہیں اور وہ اس ندی میں ننگی ہو کر غسل کرتی ہیں تاکہ سری کرشن جی کی اتباع کا تقاضا پورا ہو۔

(سوط اللہ الجبار ص ۲۲۹ تا ۲۳۳)

جبرائیلؑ، مریمؑ کے پاس نوجوان کی شکل میں کیوں آئے

اعتراض : (چوبے بدریداس ہندو کا اعتراض)

اگر جبرائیل کا ارادہ فاسد نہیں تھا تو وہ خوبصورت نوجوان کی شکل بنا کر حضرت مریمؑ کے پاس کیوں آئے تھے اور بوڑھے نیک آدمی کی شکل میں کیوں نہیں آئے تھے۔

جواب: معترض صاحب حضرت جبرائیل کے خوبصورت شکل میں آنے کو عیاشانہ اور بدمعاشانہ وضع قرار دیتے ہیں تو اس کا ترکی بہ ترکی جواب بھی سن لیں!

خود لالہ جی تحفۃ الاسلام صفحہ ۱۱ پر لکھتے ہیں:

آدھی رات کے وقت وہ مرد جو کئی صفت سے موصوف تھا مانند ماہ شب چہاردہم دیوکی (دیوی) کے پاس ظاہر ہوا۔ انتھیٰ

مہاراج وہ مرد بقول آپ کے بڑا ہی بدمعاش اور عیاش تھا کہ اپنے لحاظ سے خود کو خوبصورت بنا کر آدھی رات کو دیوی کے گھر پہنچا۔ اگر کسی اور صحیح غرض کی نیت سے جاتا تو آپ کے بقول بوڑھے مرد کی شکل بنا کر جاتا تاکہ عیاشانہ، بدمعاشانہ وضع

کے ساتھ اگر اس کے دل میں چوری نہیں تھی تو آدھی رات کے وقت میں جب کہ سب مخلوق سو رہی تھی اور غافل ہوگئی تھی سب سے چھپ کر داؤ بچا کر کیوں گیا تھا ایسا جاتا تھا تو دن کو جاتا۔

اب سنئے کہ جب ہم نے یہ عقلاً و نقلاً ثابت کر دیا ہے کہ فرشتے کھانے پینے' سونے اور جماع کی خواہشات سے مبرا اور منزہ ہیں اگر وہ خوبصورت یا بدصورت شکل میں کسی حال میں بھی متمثل ہوئے ان پر فاسد گمان نہیں ہوسکتا اور ان کا مختلف شکلوں میں اپنی شکل اختیار کرنا کسی مخفی حکمت کی رعایت سے ہوتا ہے اور جس مدعا کے حصول کے لئے جو شکل مصلحت کے مقتضی ہوتی ہے نہایت مؤثر ہوتی ہے۔

جناب بیس برن لالہ اندرمن اور بید بیاس کے خصائص کے جامع چوبے بدریداس کی خدمت میں عرض ہے کہ تمہارے عقیدے میں سری بشنو تمام اشیاء کو گھیرے ہوئے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندوؤں کی عورتیں بسا اوقات ضرورت کے اوقات میں ننگی ہوتی ہیں اور اکثر دیوتا آپ کے عقیدے کے مطابق ہر وقت ہر آدمی کے ساتھ موجود رہتے ہیں پس اگر آپ تنہائی کی حالت میں دیوتاؤں کے موجود ہونے کو تہمت سمجھتے ہیں تو ان کے موجود ہونے اور احاطہ کرنے سے دست بردار ہو جایئے ورنہ ایسی باتوں سے اپنی زبان کو روک لیجئے آپ بھی نارائن جیو کو ان کے اتہام کا باعث نہیں سمجھتے اور جب تک کہ ان کا ایسا ارادہ ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ جالندھر کی بیوی کے ساتھ واقع ہوا تھا تب تک آپ محض موجودگی اور خلوت کا ان پر الزام نہیں لگا سکتے۔

تو کیا وجہ ہے کہ جو چیز اپنے حق میں روا نہیں سمجھتے اس کی بناء پر دوسروں پر الزام عائد کرتے ہو کچھ تو انصاف کو دخل دو۔

اور اس پر بھی غور کرو کہ ایک قسم کے فرد کا دوسرے قسم کے فرد کے ساتھ تخلیے میں ہونا اور ایک نوع کے فرد کا دوسری نوع کے فرد کے سامنے عریانی اور پردہ اگر باعث اتہام ہوگا تو مہاراجہ صاحب آپ کو بڑی مشکل آپڑے گی۔ کہ جتنی گائیں' بچھیاں'

گھوڑیاں' جناب گرامی کی ملکیت اور دولت سرا میں رہتی ہیں سب کو لہنگے پہنانے پڑیں گے ورنہ آپ فاسدارادے کے ساتھ متہم ہوں گے۔

(سوط اللہ الجبار ج ۳ ص ۱۷۔۱۸)

فرشتے شہوانی خواہشات سے مبرا ہیں جب وہ قوائے بہیمیہ رکھتے ہی نہیں تو ان پر کسی حال میں گمان فاسد کی گنجائش ہی نہیں اور اسی حالت میں عریانی اور پردہ اور گریبان میں پھونک مارنا فرشتوں کے اعتبار سے یکساں ہے کیونکہ جو بات گمان فاسد کا سبب ہے ان میں اس کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے تو جو چیز اس پر متفرع ہو سکتی ہے وہ بطریق اولیٰ معدوم ہے۔ (سوط اللہ الجبار بحوالہ اعجاز محمدیہ)

اس جواب کی تشریح یہ ہے کہ جب ہندوؤں کے مذہب میں دیوتا حواس اور دیوتا آگ اور پانی اور ہوا اور اکاس (خلا) اور تمام اشیاء پر سری بشنو کا محیط ہونا ہندوؤں کا مذہب ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کی عورتیں اکثر اوقات ضرورت کے سبب برہنہ ہوتی ہیں اور اکاس اور ہوا اور پانی ان کے ہر عضو کو مس بھی کرتا ہے اور جب دریا میں برہنہ ہوتی ہیں یا کپڑوں کے ساتھ داخل ہوتی ہیں تو برن دیوتا جو پانی کے عنصر کو محیط ہے ان کے بدن کے کون سے عضو کو مس نہیں کرتا۔

پس اپنے دیوتاؤں کو تو باوجود جانوروں کی شہوات کے پائے جانے پر مہتم نہ کرنا اور فرشتوں کو جو جانوروں کی شہوات سے منزہ ہیں الزام دینا نہایت بے شرمی کی بات ہے۔

بھاگوت کے شروع میں لکھا ہے کہ نارائن کی مایا نے بلرام کا نطفہ دیوکی کے رحم سے نکال کر جسودھا کے بچہ دان میں رکھ دیا۔ الخ

ہندوؤں کے اعتقاد کے بموجب مایا نارائن اور نارائن ایک ہے۔

بڑا تعجب ہے کہ نارائن جیوایسی ایسی دست درازیوں سے بھی متہم نہ ہوں۔

علی ہذا القیاس مہاراجہ سری کرشن جی ننگی کھلی گوپیوں کو دریا کے کنارے چھپ چھپ کر گوپیوں کی عورتوں کا نظارہ اڑائیں' اور داؤ پا کر ان کے کپڑے اٹھا کر لے

جائیں اور درخت پر چڑھ کر ان کو بالکل عریاں اپنے سامنے بلائیں جب وہ اپنا آ گا پیچھا ہاتھوں سے چھپا کر بالکل ننگی ہو کر مہاراج کے سامنے آئیں پھر بھی جب تک ان کی شرمگاہوں کو بلا حجاب نہ دیکھ لیں ان کے کپڑے واپس نہ فرمائیں تب بھی وہ کچھ متہم نہ ہوں۔

اسی طرح پر سری نارائن جی جالندھر کی زوجہ سے عیش و کامرانی میں مصروف ہوں اور ان کے دامن عصمت پر کچھ داغ نہ لگے۔

اور جبرائیلؑ شہوات سے مبرا ہونے کے باوجود ایک بے اصل بنیاد پر متہم قرار دیئے جائیں کچھ تو انصاف کیجئے۔

اور تماشہ یہ ہے کہ اسکند پران کاشی کھنڈ اور ادھیائے ۴۰ میں لکھا ہے کہ جب ہندوؤں کی عورتیں بالغ ہوتی ہیں اور ان کے پستان نوکیں ابھارتے ہیں سب سے پہلے ان کے ساتھ دیوتا مباشرت کرتے ہیں اور پھر کندھرپ وغیرہ۔ الخ

غور کا مقام ہے کہ باوجود اس قدر شہوت پرستی کے اور ہندوؤں کی ہتک عزت کے ہندو دیوتاؤں پر صدق دل سے ایمان لائیں اور وہ ان کی عورتوں کے ساتھ جو کچھ فعل بد چاہیں کر جائیں ان پر کسی طرح کا الزام نہ لگائیں بلکہ ان کے فعل کو عین سرفرازی تصور فرمائیں۔ اور ایسی ارواح پر جو حیوانی شہوات کے شائبہ سے بھی خالی ہیں محض توہم اور تعصب کی بناء پر اعتراض سے پیش آئیں۔

(سوط اللہ الجبار ج ۳ ص ۲۰۔۲۱)

فرشتوں کے آدمؑ کو سجدہ کرنے پر اعتراض

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

قرآن پاک میں کئی جگہ لکھا ہے کہ فرشتوں نے خدا کے حکم سے آدمؑ کو سجدہ کیا یہ کھلا شرک ہے۔

جواب: فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ کرنا عبادت کی قسم کا سجدہ نہیں تھا بلکہ درحقیقت سجدہ ہی نہیں تھا جھکنے کو اور جھک کر سلام کہنے کو مجازاً سجدہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے یا یہ ہے کہ انہوں نے زمین پر جو پیشانی کو ٹیکا تھا وہ عبادت کی نیت سے نہیں تھی بلکہ تحیہ کے طور پر تھی۔ جو سابقہ امتوں میں جائز تھا اور ہماری شریعت میں اس کو منع کر دیا گیا۔

مگر معترض صاحب اپنے مذہب کی طرف جھانک کر دیکھیں ان کی کتاب مہا بھارت فصل موچھا دھرم میں ہے کہ اندر اور نارو طلوع آفتاب کے وقت اس کو سجدہ کرتے ہیں اور اسی کتاب میں اور دیگر ہندوؤں کی معتبر کتابوں میں ہندوؤں کے اکابر کا آفتاب اور دیگر مخلوق کو سجدہ کرنا مروی ہے اس کا کیا جواب ہے؟

(سوط اللہ الجبار ص ۲۷۸)

کیا فرشتوں نے داؤدؑ کے سامنے جھوٹ اور فریب سے کام لیا

اعتراض: (چوبے بدریداس ہندو کا اعتراض)

اگر تسلیم کر لیا جائے کہ فرشتوں نے (حضرت داؤد کے سامنے) جھوٹ اور فریب سے کام نہیں لیا بلکہ فرضی مسئلہ دریافت کیا تو لازم آتا ہے کہ فرشتے یوں نہ کہتے کہ ہم تو جھگڑنے والے ہیں بلکہ داؤد کے سامنے تمثیلاً مجہول الاشخاص نام ذکر کرتے کہ زید اور بکر دو بھائی تھے۔

جواب: اکثر علماء یہ کہتے ہیں کہ یہ معاملہ اصلی تھا دو آدمی ہی اپنا معاملہ داؤدؑ کے سامنے لائے تھے چنانچہ ابن حزم ظاہری اسی پر اصرار کرتے ہیں اور دوسرے قول کو یہودیوں کی گھڑت قرار دیتے ہیں اور اگر بالفرض فرشتوں کی طرف سے فرضی معاملہ پیش ہوا تھا تو کیا ضروری ہے کہ وہ معترض کی بات کی پابندی کرتے۔

فصل موچھا دھرم سانت پرب مہابھارت دیکھئے کہ

راجہ اندر گیدڑ کی صورت میں اس رکھشیر کے سامنے آئے جو ایک بنئے کی

گاڑی کے سامنے کے پہیہ سے خستہ ہو کر زندگی سے تنگ ہو کر یاس کے کلمات کہہ رہا تھا راجہ صاحب نے گیدڑ کی شکل بنا کر اس سے یہ کہا کہ باوجود یہ کہ گیدڑ ہوں دم بدم خدا کا شکر کرتا ہوں پہلے جنم میں میں برہمن تھا بیدوں کی اور علوم کی اہانت کرتا تھا اس سبب سے گیدڑ ہو گیا ہوں۔......الخ

مہاراجہ سری کرشن راجہ مورالدج کے گھر برہمن کی شکل بنا کر گئے اور اس سے کہا کہ میں بھی برہمن ہوں میرے بیٹے کو شیر لے گیا ہے اور اگر راجہ اپنے بیٹے کا آدھا جسم مجھے دے دے تو میرا کام ہو جائے گا۔

اب بتایئے کہ اس اعتراض کی کیا حقیقت ہے فرشتوں نے فریب کیا ہے یا ہندو مذہب کے اوتاروں نے۔ اس کا نام فریب نہیں بلکہ فریب اس کا نام ہے۔

جیسا کہ راجہ اندر نے اپنے آپ کو برہمن ظاہر کر کے گوتم کی زوجہ کے ساتھ شہوت رانی کی برہما جی نے برہمن بن کر دیوداس اور اس کی رعایا کو دھوکہ دیا۔

سری نارائن جی نے سیوڑہ کی صورت بن کر کاشی کے رہنے والوں کو دیوداس کے نکالنے کے لئے ماں اور بہن کے ساتھ زنا کاری اور جماع کیلئے آمادہ کیا۔

(سوط اللہ الجبار ص ۲۵)

عزرائیلؑ کا کسی جگہ روح قبض کرنا

اعتراض: (چوبے بدریداس ہندو کا اعتراض)

حضرت عزرائیل کی پیرانہ سالی کی عمر میں اب وہ طاقت کہاں کہ وہ مشرق سے مغرب میں پلک جھپکتے ہوئے جائے اور دونوں جگہ روح قبض کرے۔

جواب: ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق کوئی مشکل بات نہیں ان کی کتابوں میں بہت سے واقعات لکھے ہیں مثلاً ایک مدت تک مخلوق کے ہلاک کرنے سے جم

دست کش رہا۔'' قبض ارواح کا مسدود رہنا ان کے مذہب کے مطابق ممکن بلکہ واقعی بات ہے۔

پھر قبض ارواح کے مسدود رہنے کو بڑھاپے کے جسم کی وجہ بنانا بھی غلط ہے کیونکہ فرشتوں کا تعلق مثالی جسم کے ساتھ معین جگہ میں ان کے تصرف کو نہیں روکتا اور بغیر تمثیل یا تمثیل کے ساتھ ممکن ہے کہ خدا تعالی اس جگہ مرنے والوں کی نظر میں اس شکل میں نمودار ہو اسی زمانہ اور اسی جگہ کسی اور شکل میں دوسرے کو نظر آئے یا بغیر تمثل کے عزرائیل اپنے کام میں مصروف ہو۔

انسانی روح پر ان ارواح کو قیاس کرنا سراسر بے جا ہے جب کہ کامل انسانی نفوس کا یہ حال ہے کہ ایک خاص جسم کے ساتھ تعلق کے باوجود جو ایک معین جگہ پر موجود ہوتے ہوئے متعدد بعید مقامات پر تصرف کر سکتے ہیں تو فرشتوں کے نفوس کے ایسے تصرف کا انکار عین جہالت ہے۔

خود ہندوؤں کی معتبر کتابوں سے ایک زمانہ میں خاص ایک جسم کا متعدد مقامات پر مختلف شکلوں میں موجود ہونا ممتنع نہیں۔

ادھیائے ۷۰ اسکندھ دہم بھاگوت کی ملاحظہ کریں اس سے صاف واضح ہے کہ ایک معین زمانہ میں ناروجی نے کرشن جی کے جسم کو جو بقول مہاراجہ اندرمن حادث وفانی اور بشری خصوصیات رکھتا ہے سولہ ہزار ایک سو آٹھ جگہوں میں کہیں کھڑے کہیں بیٹھے کہیں نہاتے کہیں تیل ابٹن ملتے کہیں پانسے کھیلتے کہیں برہمنوں کے کھانے کا اہتمام کرتے کہیں عیش فرماتے کہیں کھانا کھاتے غرض بہت سی مختلف صورتوں اور شکلوں میں دیکھا اور جب تعجب کیا تو سری مہاراج نے فرمایا ہے نارو تو اپنے دل میں کوئی شک نہ کر کہ میری مایا ات پربل ہے سارے جہان میں پھیل رہی ہے یہ مجھے ہی موہتی ہے دوسرے کی کیا طاقت ہے جو اس کے ہاتھ سے بچے۔

(سوط اللہ الجبار ص ۲۸)

شیطان کو کیوں پیدا کیا؟

اعتراض: (سوامی دیانند کا اعتراض)

سب کو برائی کرانے والا ہر ایک انسان کا دشمن شیطان ہے اس کو خدا نے پیدا ہی کیوں کیا؟ کیا خدا آئندہ کی بات نہیں جانتا تھا؟

جواب: پنڈت جی! جب خدا کو یہ بھی معلوم تھا کہ غازی محمود غزنوی اور محمد غوری ہندوستان ہاں (آریہ ورت) کی پاک سرزمین کو ڈشٹوں (مسلمانوں) سے خراب کر دیں گے۔ پر ان کو پیدا ہی کیوں کیا اگر کہو کہ یہ جنم (تناسخ: یعنی اپنے اپنے اعمال کے اعتبار سے بار بار مختلف جنم لینے) کے مسئلہ سے ان کو ایسا ہی جسم اور حکومت ملنی ضروری تھی۔ تو سوال یہ ہے کہ حکومت اور بادشاہی تو کسی نیک کام پر ملتی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کو پہلے نیک کرموں کا انعام ملتا ہے۔ پھر کیا خدا کو معلوم نہ تھا کہ یہ دونوں بادشاہ اس انعام کو ایسی طرز سے برتیں گے کہ بہت سے پوتر آریوں کو اور ان کی پاک سرزمین کو تباہ کر دیں گے اور آریہ ورت میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دیں گے۔ اس سے بڑھ کر دیکھئے کہ بدھ کو بھی پیدا کیا۔ "یک نہ شد دو شد" جس نے کروڑہا آریاؤں کو ناستک (دہریہ) بنا دیا۔ کہو جی کون دھرم ہے؟

(دیکھو ستیارتھ پرکاش صفحہ ۵۴۱ باب ۱۲ نمبر ۴۱)

سوامی جی سنئے! خدا نے جو کچھ پیدا کیا۔ اس کی حکمت تو وہی جانتا ہے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اس نے ہر ذی عقل کو فاعل خود مختار بنایا ہے گو وہ بھی جانتا ہے کہ یہ شخص اپنی فاعل مختاری کو ضائع کر کے مستوجب سزا ہوگا۔ تاہم اپنے فضل و کرم سے اس کو مطلع کر دیتا ہے۔ پھر جو کچھ اس کو کرنا ہوتا ہے کرتا ہے۔ اور اپنے اعمال کا نتیجہ پاتا ہے۔ اس جواب کے مطابق آپ (اپنی کتاب) ستیارتھ پرکاش میں دستخط کر چکے ہیں۔

سنئے!

جس طرح جیو خود مختاری سے کام کرتا ہے اسی طرح علیم کل ہونے سے

ایشور جانتا ہے۔اسی طرح جیو کام کرتا رہتا ہے۔یعنی ایشور ماضی، مستقبل اور حال کے علم میں اور نتیجہ دینے میں خود مختار ہے اور جیو کس قدر زمانہ حال کے علم میں اور کام کرنے میں خود مختار ہے۔ایشور کا علم ازلی ہونے کے باعث فعل کے علم کی طرح سزا دینے کا علم بھی ازل سے ہے اس کے یہ دونوں علم سچے ہیں کیا فعل کا علم سچا اور سزا دینے کا علم کبھی جھوٹا ہو سکتا ہے؟ پس اس میں کوئی بھی نقص نہیں۔(صفحہ ۲۵۳، سملاس، نمبر ۵۲)

پس! خدا نے شیطان کو پیدا کیا اور وہ جانتا تھا کہ بندوں کو ورغلائے گا۔ تاہم اس نے محض اپنی مہربانی سے اعلان کر دیا۔"فَمَنْ تَبِعَکَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَاؤُکُمْ جَزَاءً مَوْفُوْرًا (سورۃ بنی اسرائیل:۶۳)
اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ"(سورۃ بنی اسرائیل:۶۵)

ترجمہ:- اے شیطان جو تیرے تابع ہونگے۔تم سب کا ٹھکانہ جہنم ہوگا میرے نیک بندوں پر تیرا تصرف ہرگز نہ ہوگا۔"

یاد رہے کہ شیطان کسی کو ہاتھ سے پکڑ کر گمراہ نہیں کرتا۔بلکہ محض بدراہی سجھا دیتا ہے چنانچہ وہ خود قیامت کے روز گمراہوں کو جب وہ اسے الزام دیں گے بطور جواب کہے گا۔

"مَا کَانَ لِیَ عَلَیْکُمْ مِنْ سُلْطَانٍ اِلَّا اَنْ دَعَوْتُکُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْا اَنْفُسَکُمْ"۔(سورۃ ابراہیم:۲۲)

ترجمہ:- میرا تم پر زور نہ تھا میں نے تو تم کو بلایا تھا تم نے میری بات کو قبول کیا۔پس اب مجھے ملامت نہ کرو۔بلکہ اپنے آپ کو کرو۔

لوگ خود بخود بدراہی اختیار کرتے ہیں۔ہاں اس کی شیطنت کو اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا کہ کسی بد صحبتی کا اثر ہو سکتا ہے۔جس سے بجز آپ کے شائد کوئی بھی منکر نہ ہو تاہم یاد رہے کہ یہ اغوائے شیطانی بھی اسی وقت ہوتا ہے۔جب آدمی خدا سے تعلق

نیاز توڑ لیتا ہے اور اپنی مستی اور جہالت میں پھنس کر تباہ ہو جاتا ہے۔

سنو! قرآن کہتا ہے:

لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (سورۃ الحشر:۱۹)

ترجمہ:- تم مسلمانو! ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جو خدا کو بھول گئے تو خدا نے ان کی جانوں کی فکر بھی ان کو بھلا دی وہی بدکار ہیں۔

اس مضمون پر ستیارتھ پرکاش وغیرہ میں خود پنڈت جی بھی دستخط کر چکے ہیں۔ جہاں بودھوں کی گمراہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

انہوں نے کس درجہ اپنی اودیا (جہالت) کی ترقی کی جس کی نظیر ان کے سوا دوسری ہو ہی نہیں سکتی۔ یقین تو یہی ہوتا ہے کہ وید اور ایشور کی مخالفت کرنے کا ان کو یہی نتیجہ ملا ہے۔ (صفحہ ۵۴۱، سملاس ۱۲ نمبر ۲۷)

کیا یہ مضمون "اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ" کا مطلب نہیں دیتا؟ پس آپ کا فرمانا کہ شیطان کو کس نے بہکا دیا وغیرہ بالکل شیطانی حمایت ہے۔

ابلیس کو کیوں پیدا کیا؟
اور قیامت تک کیوں مہلت دی

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

اگر فرض کیا جائے کہ باری تعالیٰ نے ابلیس کو پیدا کیا ہے اور اس کو قیامت تک مہلت دی ہے کہ لوگوں کو گمراہ کرے یہ بات عقل کے نزدیک خدا تعالیٰ کی قدوسیت اور الوہیت سے انتہائی بعید ہے۔

جواب: ابلیس کے پیدا کرنے میں بہت سی حکمتیں ہیں کیونکہ اس جہان کے قائم رہنے میں متضاد امور کا اجتماع ہے چیزوں کے ہر جزو میں متضاد اجزاء موجود

ہیں۔ ہدایت کنندگان اور گمراہ کنندگان، عقل اور نفس، اور اچھے اور برے، خیر و شر وغیرہ شیطان کو پیدا کرنا اور اس کو باقی رکھنا اس عالم کے باقی رہنے کے اسباب اور نفوس قدسیہ کی تکمیل کی اس کے وجود کے ساتھ وابستگی ہے بمقتضائے عقل تقدس والوہیت باری تعالیٰ کے ہرگز منافی نہیں ہے۔

لو لا ميادين النفوس ما تحقق سير السائرين لا مسافة بينك وبينه حتى تطويها رحلتك ولا قطعة بينك وبينه حتى تمحوها وصلتك.

معترض صاحب شیطان کے پیدا کرنے پر حیران ہے کہ دنیا میں شرور کے ظاہر ہونے کا باعث ہونا خدا کے تقدس کے منافی سمجھنے پر حیف ہے۔

بید میں جو لکھا ہے اس کو تقدس اور الوہیت کے منافی کیوں نہیں سمجھا گیا چنانچہ بید میں ہے کہ

بے علم بھی تم ہو تمام نیکی اور بدی تم ہو چور اور رہزنوں کے صاحب ٹھگ اور ٹھگوں کے صاحب ہوست رودری اپنکھد رات بھی وہی ہے، دروغ بھی وہی ہے، انند بلی اپنکھد ججر بیدست اور ررج اور تم یہ تینوں صفتیں اس کو ہر وقت اور ہر آن مثل رسی کے جکڑے رہتی ہیں اور ہر عضو کو پکڑے رہتی ہیں مگر جہل اور نادانی ہے اس کو ان کی کیفیت نہیں معلوم ہوتی اور یہ عالم جو دکھلائی دیتا ہے وہی ہے۔

(سوط اللہ الجبار ج ۲ ص ۹۱۔۲۰)

شیطان لوگوں کو بہکاتا ہے تو شیطان کو کس نے بہکایا

اعتراض: (منکرین مذہب کا اعتراض)

مسلمان کہتے ہیں کہ شیطان بہکا کر انسان سے برے کام کراتا ہے۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ شیطان کو کس نے بہکایا۔ حاصل یہ ہے کہ یہ مسئلہ غلط ہے (شیطان کوئی چیز نہیں) انسان خود بُرے کام کرتا ہے۔

جواب: اس وجہ سے کہ شیطان کا بہکانے والا کوئی نہیں ملتا۔ شیطان کے وجود اور اس کے بہکانے کا منکر ہونا ایسا ہے جیسے آگ کا گرم کرنے والا کوئی نہیں اور آفتاب کا روشن کرنے والا کوئی نہیں آگ کی نسبت گرم پانی کے گرم کرنے میں اور آفتاب کے زمین کے روشن کرنے کا منکر ہونا۔ اگر یہی وجہ ہے تو آگ کے وجود سے بھی انکار لازمی ہے اور آفتاب کے وجود سے بھی انکار ضروری ہے اور گرم پانی کے آگ سے گرم ہونے کو اور زمین وغیرہ کے آفتاب سے روشن ہونے کو غلط کہنا چاہئے بلکہ اس اعتبار سے خدا کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں۔ خدا کے وجود کا انکار کر دیں۔ اور عالَم کے مخلوقِ خدا ہونے کو غلط کہنا بھی لازم ہے۔ یہاں بھی یہی کہنا چاہئے کہ جیسے انسان اپنے آپ برے کام کرتا ہے، مخلوقات بھی اپنے آپ ہی پیدا ہو جاتی ہیں، کوئی خالق نہیں۔

(جواب حضرت تھانویؒ)

شیطان نے بارگاہِ عزت وجلال میں بیباکانہ گفتگو کیسے کی

اعتراض:

ربّ العزت جل شانہ کی بارگاہِ اقدس میں فرشتوں اور رسولوں کو بھی ہیبت وجلال کی بناء پر مجالِ دم زدنی نہیں تھی، ابلیس کو ایسی جرأت کیسے ہو گئی،

جواب: علماء نے فرمایا کہ یہ قہرالٰہی کا انتہائی سخت مظہر ہے کہ ابلیس کے مردود ہو جانے کے باعث ایک ایسا حجاب حائل ہو گیا جس نے اس پر حق تعالیٰ کی عظمت و جلال کو مستور کر دیا اور بے حیائی مسلّط کر دی (بیان القرآن ملخصاً وموضحاً) یہاں مومنین کو جنت کی بشارت دینے کے لئے ایمان کے ساتھ عمل صالح کی بھی قید لگائی ہے۔ (معارف القرآن جلد۳ صفحہ ۵۲۸)

چوتھا باب

انبیاء کرامؑ
کے متعلق اعتراضات کے جوابات
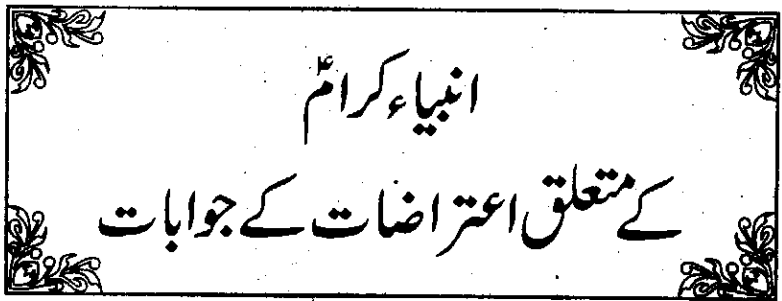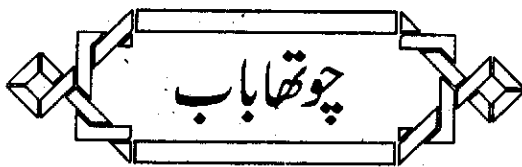
کیا انبیاءؑ فرشتوں سے افضل نہیں

اعتراض : (چوبے بدریداس ہندو کا اعتراض)

انبیاء فرشتوں سے افضل نہیں ہوسکتے انبیاء خاکی ہیں اور فرشتے نورانی۔

جواب: اس بات سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کے اجسام کو فضیلت نہیں ہے مگر اس سے بخوبی ثابت ہوا کہ اوتاروں کے اجسام کو بھی دیوتاؤں پر کچھ فضیلت نہیں کیونکہ وہ خاکی ہیں اور دیوتا نورانی۔

معترض کو کسی طرح اس کا انکار کرنا درست نہیں کہ خاص بشر خاص فرشتوں سے فضیلت رکھتے ہیں کیونکہ بیدوں اور معتبر کتابوں سے ثابت ہے کہ گیانی آدمی کا مرتبہ ہرن کربہ سے زیادہ ہے۔(سوط اللہ الجبار ص ۲۹)

کیا انبیاء کرامؑ سے گناہ سرزد ہوتے ہیں

اعتراض:

و لا تقربا هذه الشجرة کیا انبیاء کرام سے گناہ سرزد ہوتے ہیں؟

جواب: انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کا مقتدا بنا کر بھیجا جاتا ہے، اگر ان سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف خواہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ صادر ہوسکے تو انبیاء کے اقوال و افعال سے اطمینان اٹھ جائے گا، اور وہ قابلِ اعتماد نہیں رہیں گے، جب انبیاء ہی پر اعتماد و اطمینان نہ رہے تو دین کا کہاں ٹھکانا ہے۔

قرآن کریم کی بہت سی آیات میں متعدد انبیاء کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عتاب بھی ہوا، ایسے واقعات کا حاصل باتفاق امت یہ ہے کہ کسی غلط فہمی یا خطاء و نسیان

کی وجہ سے ان کا صدور ہو جاتا ہے، کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا، غلطی اجتہادی ہوتی ہے، یا خطاء ونسیان کے سبب قابلِ معافی ہوتی ہے، جس کو اصطلاح شرع میں گناہ نہیں کہا جاسکتا، اور یہ کہ سہو ونسیان کے سبب قابلِ معافی ہوتی ہے، جس کو اصطلاح شرع میں گناہ نہیں کہا جاسکتا، اور یہ کہ سہو ونسیان کی غلطی ان سے ایسے کاموں میں نہیں ہوسکتی جن کا تعلق تبلیغ وتعلیم اور تشریع سے ہو، بلکہ ان سے ذاتی افعال اور اعمال میں ایسا سہو ونسیان ہوسکتا ہے (تفسیر بحر المحیط) مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے اور بڑوں سے چھوٹی سی غلطی بھی ہو جائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے، اس لئے قرآن حکیم میں ایسے واقعات کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس پر عتاب بھی کیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ گناہ ہی نہیں۔

(معارف القرآن جلد اصفحہ ۱۹۵، ۱۹۶)

اور تاکہ امت گناہ کے ارتکاب سے ڈرے کہ جب ایسے حالات میں انبیاء پر گرفت ہوسکتی ہے تو عام مسلمان کی کیا حیثیت ہے؟ (امداد اللہ انور)

آدمؑ کا داوٗدؑ کو ساٹھ سال عمر دینے کے بعد انکار

اعتراض: (چوبے بدریداس ہندو کا اعتراض)

داوٗدؑ کی عمر چالیس برس مقرر کی گئی تھی حضرت آدمؑ نے اپنی عمر سے ساٹھ برس ان کو دے دیئے جب حضرت آدم کی عمر ۹۴۰ برس ہوتی تو ملک الموت ان کی روح قبض کرنے گیا تو آدم نے اس کو دیکھ کر کہا کہ تم نے جلدی کی کیونکہ میری عمر ہزار برس لکھی جاچکی ہے فرشتے نے کہا کہ تو نے اپنی عمر کے ساٹھ برس داوٗدؑ کو دے دیئے ہیں تو آدم نے انکار کیا تو اس کی اولاد بھی انکار کرتی رہی۔

جواب: آدمؑ کا انکار جان بوجھ کر نہیں تھا بلکہ نسیان کے طور پر تھا اور نسیان پر

کوئی مواخذہ اور الزام نہیں ورنہ معترض صاحب اپنے برہماجی کی رسالت کے باطل ہونے کو نہیں روک سکتے ان سے بھی خطا اور نسیان ظاہر ہوئے تھے۔

چنانچہ ادھیائے ۱۴۱، اسکند ۱۰ بھاگوت میں لکھا ہے۔

برہما بال بچوں کو لے جا کر ایک پہاڑ کی غار میں بند کر کے اس کے منہ پر پتھر رکھ کر بھول گیا جب ایک سال گزر گیا تو برہما کو یاد آیا اور دل میں کہنے لگا کہ میرا تو ایک پل بھی نہیں گزرا مگر زمانے کا ایک برس گزر گیا چل کر دیکھنا چاہیے کہ بال بچوں پر کیا گزری۔

اس سے لازم آتا ہے کہ برہما مسلوب الحواس تھا لازمی طر پر رسالت کے کاموں کو درہم برہم کرتا ہوگا۔

اگر آپ کی بید کی رو سے نسیان پر گوش مالی واجب ہے تو ہم کچھ اعتراض نہیں کریں گے برہماجی کے کان ان لڑکوں سے خوب کھنچوانے پڑیں گے جن کو وہ غار میں بند کر کے سال بھر بھول گئے تھے۔ (سوط اللہ الجبار ۳/۳۳ ملخصاً)

حضرت ابراہیمؑ پر آگ کا ٹھنڈا ہونا

اعتراض:

آگ کا خاصہ جلانا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ آگ ٹھنڈی ہوگئی اور ابراہیمؑ اس میں محفوظ رہے۔

جواب: جو لوگ معجزات اور خوارق عادات کے منکر ہیں انھوں نے اس میں عجیب وغریب تحریفات کی ہیں۔

بات یہ ہے کہ فلسفہ کا یہ ضابطہ کہ جو چیز کسی چیز کے لئے لازم ذات ہو وہ اس سے کسی وقت جدا نہیں ہوسکتی خود ایک باطل اور بے دلیل ضابطہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں اور تمام مخلوقات میں کوئی چیز کسی کے لازم ذات نہیں بلکہ صرف عادۃ اللہ یہ جاری ہے کہ آگ کے لئے حرارت اور جلانا لازم ہے، پانی

کے لئے ٹھنڈا کرنا اور بجھانا لازم ہے مگر یہ لازم صرف عادی ہے عقلی نہیں کیونکہ فلاسفہ بھی اسکے عقلی ہونیکی کوئی معقول دلیل نہیں پیش کر سکے اور جب یہ لازم عادی ہوا تو جب اللہ تعالیٰ کسی خاص حکمت سے کسی عادت کو بدلنا چاہتے ہیں بدل دیتے ہیں اسکے بدلنے میں کوئی عقلی محال لازم نہیں آتا جب اللہ تعالیٰ چاہے تو آگ بجھانے اور ٹھنڈا کرنے کا کام کرنے لگتی ہے اور پانی جلانے کا، حالانکہ آگ اپنی حقیقت میں آگ ہی ہوتی ہے اور پانی بھی پانی ہی ہوتا ہے مگر کسی خاص فرد یا جماعت کے حق میں بحکمِ خداوندی وہ اپنی خاصیت چھوڑ دیتی ہے، انبیاء علیہم السلام کی نبّوت کے ثبوت میں جو معجزات حق تعالیٰ ظاہر فرماتے ہیں ان سب کا حاصل یہی ہوتا ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو حکم دیدیا کہ ٹھنڈی ہو جاوہ ٹھنڈی ہوگئی اور اگر بوڈا کے ساتھ وَسَلاماً کا لفظ نہ ہوتا تو آگ برف کی طرح ٹھنڈی ہو کر سبب ایذا بن جاتی، اور قوم نوحؑ جو پانی میں ڈوبی تھی ان کے بارے میں قرآن نے فرمایا: أُغْرِقُوْا فَأُدْخِلُوْا نَارًا یعنی یہ لوگ پانی میں غرق ہو کر آگ میں داخل ہو گئے، حَرِّقُوْهُ، یعنی پوری برادری اور نمرود نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ان کو آگ میں جلا دیا جائے، تاریخی روایات میں ہے کہ ایک مہینہ تک سارے شہر کے لوگ اس کام کے لئے لکڑی وغیرہ سوختہ کا سامان جمع کرتے رہے پھر اس میں آگ لگا کر سات دن تک اس کو دھونکتے اور بھڑکاتے رہے یہاں تک کہ اس کے شعلے فضائی آسمان میں اتنے اونچے ہو گئے کہ اگر کوئی پرندہ اس پر گزرے تو جل جائے، اس وقت ارادہ کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو اس میں ڈالا جائے تو فکر ہوئی کہ ڈالیں کیسے اس کے پاس تک جانا کسی کے بس میں نہیں تھا شیطان نے ان کو منجنیق (گوپیا) میں رکھ کر پھینکنے کی ترکیب بتلائی، جس وقت اللہ کے خلیل منجنیق کے ذریعہ اس آگ کے سمندر میں پھینکے جا رہے تھے تو سب فرشتے بلکہ زمین و آسمان اور ان کی مخلوقات سب چیخ اٹھے کہ یارب آپ کے خلیل پر کیا گزر رہی ہے حق تعالیٰ نے ان سب کو ابراہیم کی مدد کرنے کی اجازت دیدی، فرشتوں نے مدد کرنے کے لئے

حضرت ابراہیم سے دریافت کیا تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کافی ہے وہ میرا حال دیکھ رہا ہے۔ جبرئیل امین نے عرض کیا کہ آپؑ کو میری کسی مدد کی ضرورت ہے تو میں خدمت انجا دوں، جواب دیا کہ ضرورت تو ہے مگر آپ کی طرف نہیں بلکہ اپنے رب کی طرف۔ (مظہری)

"قُلْنَا یَانَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ" اوپر گزر چکا ہے کہ آگ کے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر برد و سلام ہونے کی یہ صورت بھی ممکن ہے کہ آگ آگ ہی نہ رہی ہو بلکہ ہوا میں تبدیل ہو گئی ہو مگر ظاہر یہ ہے کہ آگ اپنی حقیقت میں آگ ہی رہی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آس پاس کے علاوہ دوسری چیزوں کو جلاتی رہی بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جن رسیوں میں باندھ کر آگ میں ڈالا گیا تھا ان رسیوں کو بھی آگ ہی نے جلا کر ختم کیا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بدن مبارک تک کوئی آنچ نہیں آئی۔ تاریخی روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس آگ میں سات روز رہے اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے عمر میں کبھی ایسی راحت نہیں ملی جتنی ان سات دنوں میں حاصل تھی۔ (مظہری)

(معارف القرآن جلد ۸ صفحہ ۲۰۱ تا ۲۰۲)

ابراہیمؑ باپ کے سچے وارث ہوتے تو دین آباء سے بیزار نہ ہوتے

اعتراض: (چوبے بدریداس ہندو کا اعتراض)

حضرت ابراہیم اگر اپنے باپ کے سچے وارث ہوتے تو بلا شک اپنے آباء و اجداد کے دین سے بیزار نہ ہوئے۔

جواب: اسی عقیدہ کے سبب ہندی نژاد لوگ تمام اقالیم میں بوزینہ سیرت مشہور ہیں کہ باوجود عقائد فاسدہ کے بطلان کے ظاہر ہونے کے اپنے آباء واجداد کی تقلید کر کے ہدایت کے راستے پر نہیں آتے۔ پرانی جہالت کی لکیر پیٹے چلے جاتے

ہیں۔مہابھارت میں لکھا ہے کہ ایک راجہ نے بت پرستی کا آئین جاری کیا تھا اس کے بیٹے راجہ بھرت نے سب بتوں کو چکنا چور کر کے ان کا چونا بنوایا۔

یہ راجہ بھرت جناب مہاراجہ رام چندر صاحب کے اجداد میں سے ہیں کیا آپ کے عقیدے کے مطابق ان کے خلف الصدق نہیں تھے جو باپ کے آئین سے پھر گئے اور دین حق جاری کیا۔(سوط اللہ الجبار ۳/ ۶۵)

قرآن پاک کے نزدیک اسماعیلؑ نبی اور رسول تھے

اعتراض: (عیسائی پادری کا اعتراض)

قرآن میں سورۃ العنکبوت کی 27 آیت کے مطابق اسماعیلؑ کو ہر طرح کی نبوت اور ہر طرح کی الہامی کتاب سے محروم رکھا گیا ہے۔

جواب: قرآن پاک میں ہے:

"وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ اِسْمَاعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا." (سورۃ مریم:۵۴)

(اور اس کتاب میں اسماعیلؑ کا بھی ذکر کیجئے وہ وعدہ کے سچے تھے اور رسول بھی تھے اور نبی بھی تھے۔

سیّدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں بھی دو لفظ ہیں: "رَسُوْلًا نَّبِيًّا" سیدنا حضرت اسحٰق علیہ السلام کے حق میں یہی ایک ہی لفظ ہے۔ "نَبِيًّا" (مریم:۴۹)

سیدنا حضرت ہارونؑ علیہ السلام کی بابت صرف ایک لفظ ہے۔ "نَبِيًّا" (مریم:۵۳)

قرآن پاک کے مندرجہ بالا مقامات سے یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارونؑ علیہ السلام کے مقام و مرتبہ میں جو فرق ہے وہی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت اسحٰق علیہ السلام میں بھی ہے۔

اور یہ ترجیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے حق میں تورات سے بھی ثابت ہے۔

چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحق علیہ السلام کی بشارت دی گئی تو آپ نے باری تعالیٰ کے دربار عالیہ میں یوں عرض کی کہ

"کاش اسماعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے۔" (پیدائش ۱۷:۱۸)

اس کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو پا لینے کے بعد اولاد کی دعا بھی نہیں کی۔ پس اس سے یہ حقیقت روشن ہوئی کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام پر ترجیح ہے۔ پس ان تمام باتوں سے یہ بات خوب کھل کر منظر عام پہ آ گئی کہ حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے روحانی بیٹے، شرعی فرزند اور نبی و رسول ہیں۔

کتنے ناداں ہیں تیری بستی کے لوگ
پھول سے خوشبو کو جدا کرتے ہیں

پس مسیحی مبشر (معترض) صاحب کے مندرجہ ذیل الفاظ "اور قرآن میں سورۃ العنکبوت کی ۲۷ آیت کے مطابق اسمٰعیل علیہ السلام کو ہر طرح کی نبوت اور ہر طرح کے کتاب سے محروم رکھا گیا ہے۔" (جواب مسلم صفحہ ۶۹ تا ۷۳ مختصراً)

حضرت یوسف پر بہتان

اعتراض: (چوبے بدر یداس ہندو کا اعتراض)

یوسف نے اپنے بڑے بھائیوں کو دھوکا دے کر چھوٹے بھائی پر چوری کا بہتان لگایا اور اس کو اپنا غلام بنایا۔

جواب: معترض صاحب اگر دھوکے کے معنی سے آگاہ ہوتے تو یہ کلمہ زبان پر نہ لاتے۔ یوسف نے چھوٹے بھائی کو پہلے اپنی طرف بلایا تھا اپنی شفقت اور رحمت سے آگاہ کر دیا تھا کہ اب تم کچھ غم نہ کرو اور صاف سمجھا دیا تھا کہ میں تمہارا سگا بھائی ہوں چنانچہ قرآن مجید کی یہ آیت صاف بتا رہی ہے۔ "اِنِّی اَنَا اَخُوکَ

فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ." اور معترض صاحب جو لفظ غلام بنانے کا لے
آتے ہیں صاف غلط ہے یوسفؑ نے چھوٹے بھائی کو شفقت اور اعزاز سے اپنے پاس
رکھا تھا جیسے بھائی بھائی کو اپنے پاس رکھتا ہے چنانچہ آیت کریمہ "اٰوٰى اِلَيْهِ اَخَاهُ"
اس کی صاف دلیل ہے اگر اس معاملہ میں یوسفؑ کسی طرح کا کسی کو نقصان پہنچاتے
تو معترض کو اعتراض کی گنجائش تھی جس طرح مہاراجہ سری کرشن نے درونہ چارج سے
فریب کیا کہ اول تو ظاہر کیا کہ استون ہامان تیرا بیٹا مارا گیا جب اس نے اس کے قول
پر اس کی بے اعتمادی کی بنیاد پر اعتماد نہ کیا جدھشٹر کو جھوٹ بولنے کی ترغیب دی جب
اس نے بھی نہ مانا تو ایک ہاتھی کا نام استون ہامان رکھ کر اس کو مار ڈالا پھر جدھشٹر سے
کہا کہ اب تو یہ کہہ دے کہ استون ہامان مارا گیا اس پر بھی اس نے تسلیم نہ کیا اور کہا کہ
البتہ یہ کہہ دوں گا کہ فلاں ہاتھی موسوم بہ استون ہامان مارا گیا غرض یہ کہ جب اس نے
درونہ سے یہ کہا کہ استون ہامان مارا گیا اور چاہتا تھا کہ وہ یہ کہے کہ وہ ہاتھی تھا۔ مہاراجہ
سری کرشن نے ایسی بلند آواز سے سنکھ بجایا کہ وہ آواز جدھشٹر کی درونہ کے کان تک
نہ پہنچنے دی۔

علی ہذا القیاس راجہ مور الدھج کے سامنے گھوڑی کے حاصل کرنے کے لیے
اپنے آپ کو برہمن ظاہر کر کے جھوٹا قصہ بنایا اور اس کو دھوکہ دیا۔

اسی طرح پر جراسندھ کے پاس برہمن کی شکل بنا کر گئے اور اس کو دھوکہ دیا
فریب ان واقعات کا نام ہے۔

لالہ جی مہاراجہ سری کرشن کی برأت کے لیے اس طرح تقریر فرماتے ہیں کہ
ہندو کرشن کی الوہیت کے قائل ہیں کرشن جو چاہیں سو کریں کیونکہ ان کا کوئی کام اسرار
سے خالی نہیں۔ انتہیٰ

لالہ جی کا یہ مقولہ غلط ہے خود لالہ جی کرشن کو تمام وجوہ سے الٰہ نہیں سمجھتے بلکہ
صاف اقرار کرتے ہیں کہ وہ ایک وجہ سے اِلٰہ ہیں اور ایک وجہ سے بندہ۔

پس اب ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ سونا' کھانا اور جماع وغیرہ حرکات الوہیت کے متعلق ہیں یا عبودیت کے متعلق اگر الوہیت کے متعلق ہیں تو لازم آتا ہے کہ بید میں اللہ کی صفات کے بارے میں جو تنزیہات لکھی ہیں وہ سب غلط ہیں اور چاروں بید جھوٹی کتابیں ہیں اور اگران کی یہ حرکات عبودیت کے متعلق ہیں تو ان میں اور دوسرے بندوں میں کیا فرق ہے جو کام شریعت کے خلاف ہیں وہ ہر شخص کے حق میں برے ہیں خواہ نیک ہو خواہ بد بلکہ نیک وہی شخص کہلاتا ہے جو ان بری حرکات سے بچتا ہے اور جو شخص ہمیشہ ان کا مرتکب رہے وہ اشرار میں داخل ہے نہ کہ اچھے لوگوں کی جماعت میں۔

پس ظاہر ہوا کہ مہاراجہ سری کرشن' چندر' عبودیت کے اعتبار سے اشرار (برے لوگوں) میں داخل تھے۔ پھر ایسے شخص کو خدا کا اوتار کہنا عقل کے گریبان کو تار تار کرنا ہے۔

بلکہ جب خود لالہ جی اور ہندو اس بات پر متفق ہیں کہ کرشن جی نکاح اور کھانے پینے اور پیشاب وغیرہ کی قیود میں انسانی خصوصیات سے منزہ اور مبرا نہیں تھے۔ پس وہ ان اشخاص کے زمرے میں بھی نہیں ہیں جو فرشتوں کے طور پر احکام قضاؤ وقدر کے بجا آوری اور نافذ کرنے کے لئے عالم اسباب میں مامور ہوں پس ان کو خارج از احکام شرعیہ قرار دینا کسی صورت درست نہیں۔ (سوط اللہ الجبار ۳/ ۵۹-۶۰)

حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے ہوا کی تسخیر

اعتراض: (منکرین اسلام کا اعتراض)

• ہوا ایک بے جان چیز ہے وہ بھلا کب کسی کی بات سمجھ سکتی ہے اور تابع فرمان ہو سکتی ہے تو یہ حضرت سلیمان کیلئے ہوا کا مسخر ہونا من گھڑت بات ہے؟

جواب: حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کا یہ واقعہ پیش آیا کہ لشکری گھوڑوں کے معائنہ میں مشغول ہو کر عصر کی نماز فوت ہوگئی تو اپنی

اس غفلت پر افسوس ہوا اور یہ گھوڑے جو اس غفلت کا سبب بنے تھے ان کو بیکار کر کے چھوڑ دیا، چونکہ ان کا یہ عمل اللہ کی رضا جوئی کیلیے ہوا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے انکو گھوڑوں سے بہتر اور تیز رفتار سواری ہوا کی عطا فرمادی۔

تفسیر ابن کثیر میں تخت سلیمان علیہ السلام جو ہوا پر چلتا تھا اس کی کیفیت یہ بیان کی ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے لکڑی کا ایک بہت بڑا وسیع تخت بنوایا تھا جس پر خود مع اعیان سلطنت اور مع لشکر اور آلات حرب کے سب سوار ہو جاتے پھر ہوا کو حکم دیتے وہ اس عظیم الشان وسیع وعریض تخت کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر جہاں کا حکم ہوتا وہاں جا کر اتار دیتی تھی۔ یہ ہوائی تخت صبح سے دوپہر تک ایک مہینہ کی مسافت طے کرتا تھا اور دوپہر سے شام تک ایک مہینہ کی یعنی ایک دن میں دو مہینوں کی مسافت ہوا کے ذریعہ طے ہو جاتی تھی۔

ابن ابی حاتم نے حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ اس تخت سلیمانی پر چھ لاکھ کرسیاں رکھی جاتی تھیں جسمیں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اہل ایمان انسان سوار ہوتے تھے اور ان کے پیچھے اہل ایمان جن بیٹھے ہوتے تھے پھر پرندوں کو حکم ہوتا کہ وہ اس پورے تخت پر سایہ کر لیں تا کہ آفتاب کی تپش سے تکلیف نہ ہو پھر ہوا کو حکم دیا جاتا تھا وہ اس عظیم الشان مجمع کو اٹھا کر جہاں کا حکم ہوتا پہنچا دیتی تھی۔ اور روایات میں ہے کہ اس ہوائی سفر کے وقت پورے راستہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام سر جھکائے ہوئے اللہ کے ذکر وشکر میں مشغول رہتے تھے دائیں بائیں کچھ نہ دیکھتے تھے اور اپنے عمل سے تواضع کا اظہار فرماتے تھے۔ (ابن کثیر)، (معارف القرآن جلد ۶ ص ۲۱۲)

سلیمانؑ کے ہدہد پر اعتراض

سلیمانؑ کی اتنی بڑی حکومت تھی تو بلقیس کی حکومت کا علم کیوں نہ ہوا

کیا ایک لمحہ میں تخت کا منگانا ناممکن ہے

اعتراض (۱): یہ کہ اگر ہدہد جانور ہے تو اول اس کی رفتار میں ایسی سرعت کہاں کہ تھوڑی دیر میں شام کے ملک سے اڑ کر یمن میں پہنچ جائے اور وہاں سے لوٹ کر آئے دوم اس جانور کو خدا پرستی اور آفتاب پرستی میں کیا فرق؟ اور پھر اس نے اس قدر لمبی چوڑی گفتگو سلیمان سے کیوں کر کی؟ یہ باتیں بعید از قیاس ہیں۔

اعتراض (۲): سلیمان شام کے بادشاہ تھے کیا ان کو بلقیس کا حال معلوم نہ ہوا ہوگا؟ جو وہ بھی ایک بڑی سلطنت کی مالک تھی۔ باوجود کہ تم کہتے ہو جن وشیاطین ان کے تابع تھے، پھر صرف ہدہد وغیرہ نے خبر دی؟

اعتراض (۳): سینکڑوں کوس کے فاصلہ سے بلقیس کا تخت پلک جھپکنے سے پہلے سلیمان کے پاس کیوں کر آ گیا اور علم بالکتاب سے یہ قدرت کب حاصل ہو سکتی ہے کیا اب ایسے لوگ نہیں کہ ایک کتاب تو کیا سینکڑوں کتابوں کو دھوئے بیٹھے ہیں وہ تو دو کوس سے بھی اتنی جلدی تخت تو کیا کوئی تختہ بھی نہیں لا سکتے۔ یہ باتیں پرانے افسانے ہیں۔

جواب: ان کے جواب معتزلہ اور ان کے پیروان و مریدان نے بذریعہ تاویل کے یوں دیئے ہیں کہ الطیر جمع طائر پرند کو بھی کہتے ہیں اور تیز گھوڑے کے سوار کو بھی جیسا کہ کسی حدیث میں آیا ہے کہ بہتر وہ شخص ہے کہ جو گھوڑے کی لگام کو اللہ کی راہ میں تھامے ہوئے ہو۔ یطیر جہاں کھٹکا پائے اڑ جائے۔ الغرض کلام عرب میں طائر تیز گھوڑے کے سوار کو بھی کہتے ہیں۔

تفقد الطیر جمع طائر یعنی سواروں کی فوج کو دیکھا ان میں ہدہد کو نہ پایا جو ان کا سپہ سالار تھا اور ہدہد کا سپہ سالار ہونا کتاب السلاطین سے ثابت ہے وہ نمک حلال سلطنت تھا، بغیر اطلاع یمن کی طرف بلقیس کے حالات دریافت کرنے چلا گیا اور سلیمان کو آ کر خبر دی۔

فمکث غیر بعید کے یہ معنی نہیں کہ اسی وقت آ موجود ہوا بلکہ بہت زمانہ نہیں گزرا معمولی زمانہ سفر سے بہت جلد آ گیا۔ لوگوں نے ہدہد کو سچ مچ کا ہدہد جانور سمجھ لیا اور تفصیلی خبر سلیمان کو معلوم نہ تھی اور یہ ممکن ہے کیونکہ اس عہد میں تار اور ریل نہ ہونے کی وجہ سے غیر مملکتوں کے حال تفصیل سے بمشکل معلوم ہوتے تھے۔ اب رہا تخت کا طرفۃ العین میں حاضر ہونا۔ سو یہ قرآن مجید سے ثابت نہیں۔ جو ثابت ہے وہ صرف یہ ہے کہ جب سلیمانؑ نے اس کو اپنے روبرو دیکھا تو شکر کیا کہ ایک بادشاہ کا تخت میرے روبرو خدا کی عنایت سے موجود ہے۔ ہاں ایک عفریت بمعنی قوی جن یعنی عمالیقی آدمی نے یہ کہا تھا۔ اور قوی اور سخت آدمیوں کو جن سے تعبیر کیا کرتے ہیں جس طرح نیک کو فرشتہ سے اور خوبصورت کو پری سے۔ اور ایک اہل علم نے بھی کہا تھا کہ میں طرفۃ العین میں لا حاضر کرتا ہوں۔ اب یا تو وہ ان کی زیادہ گوئی تھی یا ایک محاورہ کی بات ہے جلدی کام کرنے کو کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ کام طرفۃ العین میں یا پلک جھپکنے میں ہو گیا یا کر دوں گا لیکن خدا تعالیٰ نے نہیں فرمایا کہ پلک جھپکنے میں تخت آ گیا یہاں تک کہ اس کے لانے والے کا نام بھی نہیں بتلایا بلکہ یہ کہا ہے فلما راٰہ مستقرا عندہ ممکن ہے یہ اہل علم کسی حکمتِ عملیہ سے تخت کو لایا ہو اور جلد لایا ہو۔

منکروں کے اعتراضات کا جواب

صحیح جواب یہ ہے کہ جانوروں کا خط لے جانا کچھ مشکل بات نہیں۔ طوطے اور مینا کی گفتگو اور مالک کو باتوں پر مطلع کر دینا بارہا مشاہدہ میں آیا ہے پھر ہدہد نے ایسا کیا ہو تو کیا محال بات ہے؟ اور جب ہم یہ بات ثابت کر چکے ہیں کہ جن ایک

جداگانہ مخلوق ہے اس کے افعال وقویٰ انسانی افعال وقویٰ سے کہیں زیادہ قوی ہیں۔ تو پھر اس سے ایسی بات کیا بعید ہے۔ اسی طرح اسماء الٰہی اور روحانیات کی طاقتیں حد سے باہر ہیں جو اس زمانہ میں مفقود ہیں۔ پھر سلیمان علیہ السلام کے پاس اگر کوئی ایسا شخص ہو تو کیا بعید ہے۔ انسان کی عادت ہے جس بات کو آنکھ سے نہیں دیکھتا اور وہ اس کے نزدیک محال معلوم ہوتی ہے تو انکار کر دیتا ہے۔ تار برقی اور ریل کے جاری ہونے سے پیشتر جو کوئی ان کے حالات بیان کرتا تو مجنون شمار کیا جاتا۔ تمام عالم خدا کے عجائب اسرار کا مجموعہ ہے۔

اس وقت کے تعلیم یافتوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہم نے سب کا احاطہ کر لیا ہے۔ حالانکہ اسرار روحانیات اور ان کی تاثیرات اور نفوس قدسیہ کی قوتیں جو کرامت یا معجزہ کہلاتی ہیں ابھی تک ان کے ذہن بلید تک بھی نہیں پہنچیں۔ ان فنون سے ناآشنائے محض ہیں۔ اس لئے انکار کرتے ہیں تمسخر سے پیش آتے ہیں۔ واللہ اعلم

(تفسیر حقانی جلد ۳/صفحہ ۴۶۶-۴۶۷)

تمام انبیاء سے ایمان کے مطالبے کا فائدہ

اعتراض:

شبہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو علیم وخبیر ہیں ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ محمد ﷺ کسی نبی کی موجودگی میں تشریف نہیں لائیں گے تو پھر انبیاء کے ایمان لانے کا کیا فائدہ؟

جواب: ذرا غور کیا جائے تو فائدہ بالکل ظاہر معلوم ہوگا کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر محمد ﷺ کی ذات والا صفات پر ایمان قبول کرنے کا پختہ ارادہ کریں گے تو اسی سے ثواب پائیں گے۔ (صاوی بحوالہ جلالین)

اس مطالبہ میں تمام انبیاءؑ پر حضور ﷺ کی فضیلت کو اجاگر کرنا ہے اور ان کے

مرتبہ سے سب انبیاءؑ اور امتوں کو آگاہ کرنا ہے۔ (امداد اللہ انور)

نوح علیہ السلام کی ہزار سال عمر پر اعتراض

ترجمہ آیت: اور ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا پھر وہ ان میں پچاس سال کم ہزار سال رہے۔ (سورۃ عنکبوت: ۱۴)

اعتراض: (پنڈت سوامی دیانند کا اعتراض)

اگر پہلے آدمیوں کی عمر ہزار برس کی ہوتی تھی تو اب کیوں نہیں ہوتی اس لئے یہ بات صحیح نہیں؟

جواب: عمر کی بابت تو اب بھی کوئی قاعدہ مقرر نہیں جب تک آپ کوئی حد مقرر نہ کریں ہم جواب نہیں دیں گے۔

ہاں پرمیشور کی آگیا بھی سنئے جو بندوں کو ہدایت کرتا ہے کہ

''اے جگدیشو آپ کی عنایت سے ہماری آنکھوں اور پران کی تگنی یعنی سو برس کی عمر ہو۔

جس پر آپ سوامی جی ما خود بدولت نے ایزاد کیا ہے۔

اس منتر سے ایک اور اپدیش (حاصل) ہوتا ہے یعنی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر برہم چرج وغیرہ عمدہ اصول کی پابندی کی جائے تو انسان کی عمر سو برس سے تگنی تک بڑھ سکتی ہے'' بھومکا صفحہ ۵۶۔

پس حضرت نوح علیہ السلام نے اس آپ کی تگنی کو تگنی کر کے ہزار سال عمر پائی ہو تو آپ کا اس پر سوال کیا ہے۔ (حق پرکاش صفحہ ۲۰۲ تا ۲۰۳ مختصرا)

حضرت ابرہیمؑ کا اسماعیلؑ سے بوقت ذبح رائے پوچھنے پر شبہ

اعتراض:

رائے دریافت کرنے کیلئے ابراہیم علیہ السلام نے اسمٰعیل علیہ السلام سے کیوں

پوچھا کہ تمہیں ذبح کروں یا نہ کروں تو انہوں نے کہا یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤمَرُ کہ اے باپ آپ وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم ہوا ہے کیا ابراہیم علیہ السلام کو اللہ کے حکم میں تردد تھا۔

جواب: ابراہیم علیہ السلام کو تردد نہ تھا کہ انبیاء میں اس کا احتمال ہی نہیں۔
بعض اہل ظاہر اس کے قائل ہوئے ہیں کہ گو تردد نہ تھا مگر اس وقت بیٹے میں باپ سے زیادہ استقلال تھا جیسا کہ ان کے سوال مَاذَا تَرىٰ میں اور ان کے جواب اِفْعَلْ مَا تُؤمَرُ میں موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔

پھر اس فرق کا ایک نکتہ بیان کیا جو عوام کو پسند بھی آئیگا۔ مگر ابراہیم علیہ السلام کی اس میں صریح تنقیص ہے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں۔

کہ نور محمدی ﷺ پہلے ابراہیم علیہ السلام کے بدن میں تھا اس کی وہ برکت تھی۔ کہ ابراہیم علیہ السلام کو کس قدر استقلال تھا کہ آگ میں ڈالے گئے اور مضطرب نہ ہوئے۔ جب اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو وہ نور ان میں منتقل ہو گیا اس واسطے وہ اس درجہ میں مستقل المزاج ہو گئے تھے۔

مگر اس جواب میں اتنے بڑے پیغمبر کی جناب میں گستاخی ہے۔ شعر ؎

زعشق نا تمام ما جمال یار مستغنی است
بآب ورنگ وخال وخط چہ حاجت زیبا روئے

ابراہیم علیہ السلام کا نوری محمدی کے جدا ہونیکے بعد غیر مستقل ہو جانا محض جزاف اور رجم بالغیب ہے۔ غور کرو تو اس میں حضور ﷺ کی بھی گستاخی ہے۔ کیونکہ آپ کا وہ نور ایسا نہیں جس کا اثر زائل ہو جاوے۔ آگ تنور کے اندر جلائی جاتی ہے تو ایک گھنٹہ تک تنور اسکے اثر سے گرم رہتا ہے۔ تو کیا وہ نور اتنا بھی نہ ہوگا کہ اسکے منتقل ہونے کے بعد ابدالاباد تک اس کا اثر رہے۔ یہ جواب ہی نہیں جو ان خرافات کے ماننے کی ضرورت پڑے۔

اصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اسمٰعیل علیہ السلام کے صرف پدر مشفق اور مربی

ہی نہ تھے بلکہ وہ شیخ بھی تھے۔ سنو شیخ ہونے کی حیثیت سے ان کو ان کے استقلال کا امتحان مقصود تھا۔ اس واسطے فرمایا فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی۔ مگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے کہ فرماتے ہیں یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ مِنَ الصَّابِرِیْنَ اور کیا ٹھکانہ انکے عرفان کا اتنا بڑا توکل کہ اپنی قوت پر نظر نہیں یہاں بھی کہتے ہیں۔ ان شاء اللہ کہ اگر خدا کو منظور ہوا پس یہی تو کمال ہے۔

ایسے ہی بیٹے کی نسبت کہتے ہیں۔ شعر

شاباش آں صدف کہ چناں پر درد گہر
آباء ازو مکرم و ابنا عزیز تر

تو یہ تھی اصل اسکی چنانچہ اسمٰعیل علیہ السلام راضی ہو گئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے چھری ہاتھ میں لے کر ذبح کیلئے لٹایا۔ اسمٰعیل علیہ السلام کا یہ استقلال کمال میں ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ نہیں۔ بڑا کمال تو ابراہیم علیہ السلام کا ہے کیونکہ خود کشی کرتے تو بہتوں کو دیکھا ہوگا۔ یا کم از کم سنا ہوگا مگر فرزند کشی کون کر سکتا ہے۔ بھلا باپ سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے گلے پر چھری چلائے۔ وَالنَّادِرُ کَالْمَعْدُوْمِ۔
(وعظ روح الحج والثج حضرت تھانوی صفحہ ۱۸)

کیا یہودی عزیر کو خدا کا بیٹا نہیں کہتے

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

سورت توبہ میں ہے کہ یہودی عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور عیسائی عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں عیسائیوں کے بارے میں تو یہ نسبت درست ہے مگر یہودیوں نے کبھی نہیں کہا کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے۔

جواب: معترض صاحب کا یہ انکار محض بلا دلیل ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں قرآن پاک میں سے ہم اس کے بارے میں عقلی اور نقلی دلیل پیش کرتے ہیں۔

عقلی دلیل تو یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور یہودیوں کے سامنے مجمع عام میں پڑھی گئی تھی ۔ اس زمانے کے یہودیوں میں سے کسی نے بھی قرآن کی اس آیت کی تکذیب نہیں کی تھی اس سے ثابت ہوا کہ قرآن پاک کی یہ بات بالکل صحیح ہے ورنہ ممکن نہیں تھا کہ یہودیوں کی شدید عداوت کے باوجود یہودی قرآن کی تکذیب نہ کرتے۔

اس پر نقلی دلیل یہ ہے کہ ہماری کتابوں میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں:

جاء رسول الله ﷺ سلام بن مشکم و نعمان بن اوفی و شاس بن قیس ومالک بن صیف فقالوا ذلک.

(ترجمہ) کہ حضور علیہ السلام کے پاس یہودیوں میں سے سلام بن مشکم اور نعمان بن اوفی اور شاس بن قیس اور مالک بن صیف آئے اور انہوں نے یہی بات کہی تھی (کہ حضرت عزیر خدا کے بیٹے ہیں)۔

آج سے تقریباً ہزار سال پہلے ابن حزمؒ اپنی معروف کتاب ''الفصل بین اہل الملل والاھواء والنحل'' میں یہودیوں کے فرقوں کے بیان کے بعد میں لکھا ہے:

فاما الیھود فانھم افترقوا علی خمس فرق وھی السامریة یقولون ان مدینة القدس ھی نابلس من بیت المقدس علی ثمانیة عشر میلاً ولا یعظمون البیت المقدس ولھم توراة غیر توراة التی بایدی سائر الیھود وھم بالشام لا یستحلون الخروج منھا والصدوقیة نسبوالی رجل یقال له الصدق وھم یقولون ان عزیراً ھو ابن الله وھم بجھة الیمن والعازانیة وھم اصحاب العازان الداودی وھذه الفرقة بالعراق ومصر-وھم من الاندلس بطبطلة والربانیة وھم

جمهور اليهود والعيسوية وهم اصحاب ابى عيسى الاصبهانى يقرون بنبوة عيسىٰ ابن مريم عليهما السلام و محمد عليهم السلام ويقولون ان عيسىٰ بعثه الله الى بنى اسرائيل على ما جاء فى الإنجيل و محمد ﷺ نبى ارسله الله بشرائع القرآن الى بنى اسمعيل و سائر العرب .

(ترجمہ) یہودیوں کے پانچ فرقے ہیں:

(۱) ایک سامریہ ہے جو کہتے ہیں کہ مقدس شہر نابلس کا شہر ہے جو بیت المقدس سے اٹھارہ میل دور ہے یہ لوگ بیت المقدس کی تعظیم نہیں کرتے ان کی تورات اس تورات کے علاوہ ہے جو اکثر عام یہودیوں کے پاس ہے اور یہ شام میں رہتے ہیں اور شام سے نکلنے کو حلال قرار نہیں دیتے۔

(۲) دوسرے فرقے کا نام صدوقیہ ہے یہ ایک آدمی کی طرف منسوب ہے جس کا نام صدق تھا اور یہ کہتے ہیں کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور یہ یمن کی طرف رہتے ہیں۔

(۳) تیسرے فرقے کا نام عاذانیہ ہے اور یہ عاذان داؤدی کے پیروکار ہیں اور یہ فرقہ عراق اور مصر میں رہتا ہے اور اندلس میں طبطلہ کے علاقے میں قیام پذیر ہیں۔

(۴) چوتھے فرقے کا نام ربانیہ ہے اور اکثر یہودی اسی سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۵) پانچویں فرقے کا نام عیسویہ ہے اور یہ ابوعیسیٰ اصبہانی کے ماننے والے ہیں یہ حضرت عیسیٰ بن مریم کی اور محمد ﷺ کی نبوت کے قائل ہیں یہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ کو اللہ نے بنی اسرائیل کی طرف بھیجا تھا جیسا کہ انجیل میں آیا ہے اور محمد ﷺ کو اللہ تعالی نے قرآن کے احکام دے کر نبی بنایا تھا اور ان کو بنی اسماعیل اور تمام عرب کے لوگوں کی طرف بھیجا تھا۔

مذکورہ عبارت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ فرقہ صدوقیہ جو حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا مانتے تھے یہ چوتھی صدی میں یمن کے اطراف میں موجود تھے۔(سوط اللہ الجبار ص ۲۶۷)

بعض پیغمبروں کی بیویاں کیوں کافر تھیں

اعتراض: (چوبے بدر یداس ہندو کا اعتراض)

نوحؑ 'لوطؑ مسلمانوں کے نزدیک پیغمبر خدا تھے تو ان کی بیویاں کافر کیوں تھیں؟

جواب:

یہ مسلمہ کلیہ آپ ہی کے مذہب کا ہے کہ بیوی کی وجہ سے خاوند کا مذہب جاتا رہتا ہے کیونکہ آپ کی بیدوں کی رو سے خاوند فی المعنی زوجہ کا بیٹا ہوتا ہے۔

چنانچہ اسرپ اپنکھد رکھ بید میں لکھا ہے کہ

شوہر نطفہ کی صورت بن کر جورو (بیوی) کے رحم میں آتا ہے اور حمل کی مدت میں جورو خصم (شوہر) کی محافظ رہتی ہے اور شوہر اس وجہ سے کہ ایک دوسرے کے اجسام کے جوہر کے ملنے سے وہ حمل ہوتا ہے الفت اور حفاظت کرتا ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے سمجھنا چاہئے کہ شوہر خود بمرتبہء ثانی پیدا ہوتا ہے۔

غرضیکہ اس اپنکھد کی بناء پر تو آپ کی تقریر بجا ہے مگر زمانہ بھر کے عقل منداس واہیات بات کو دیوانوں کی سی بڑ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک آپ کی یہ دلیل ہیچ اور پوچ ہے۔ (سوط اللہ الجبار ۶۲/۳)

پانچواں باب

معجزات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

نجات کیلئے صرف خدا پر ایمان لانا کافی ہے،
تصدیق رسالت کی کیا ضرورت ہے؟

اعتراض: (منکرین رسالت کا اعتراض)

حضور ﷺ صرف توحید کی تعلیم کے لئے آئے تھے جو شخص توحید کا اقرار کر لے وہ نجات پالے گا گو حضور ﷺ کی رسالت کا اقرار نہ کرے۔ ان لوگوں نے اس آیت سے دھوکا دینا چاہا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالنَّصَارٰی وَالصَّابِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ الخ.

ترجمہ:- جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہیں اور نصرانی ہیں اور جو صابی ہیں (ان میں سے) جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئے اور اچھے کام کرے (قانون شریعت کے موافق) ایسوں کے لئے ان کے پروردگار کے پاس حق الخدمت بھی ہے اور وہاں ان پر کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

اس آیت میں تصدیق رسالت کا ذکر (ظاہراً) نہیں ہے۔ بلکہ سب فرقوں کی نجات کا مدار صرف ایمان باللہ و ایمان بالآخرت کو قرار دیا گیا ہے۔

جواب: یمان باللہ و ایمان بالآخرت بغیر تصدیق رسالت محمدیہ کے متحقق ہی نہیں ہو سکتا۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ یہاں تصدیق رسالت کا ذکر نہیں ایمان باللہ کے صرف یہی معنیٰ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو موجود مان لے کیونکہ وجود کا انکار مشرکین بھی نہیں کرتے۔ بلکہ ایمان باللہ کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو صفات کمال سے متصف اور

صفات نقص سے منزہ سمجھے، صفاتِ کمال میں سے ایک صفت صدق بھی ہے جس کے ساتھ خدا تعالیٰ کو موصوف ماننا توحید کے لئے ضروری ہے اور صفات نقص میں سے ایک صفت کذب بھی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کو منزہ سمجھنا لازم ہے ایک بات تو یہ ہوئی، اور دوسری یہ کہ حق تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ (حضرت محمد اللہ کے رسول ہیں) اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا دلائل عقلیہ سے ثابت ہے تو اس خبر کو بھی سچا سمجھنا واجب ہے، پس جو آپ کو رسول نہیں مانتا وہ خدا تعالیٰ کو کاذب (جھوٹا) کہتا ہے، جب کاذب کہا تو پھر اللہ تعالیٰ پر کہاں ایمان لایا۔ پس ثابت ہو گیا کہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانا بغیر تصدیق رسالت کے ممکن نہیں، (وعظ الرفع والوضع ص ۲۹)

حضرت محمد ﷺ کے نبی اور رسول ہونے کی کیا دلیل ہے؟

جواب: اس علیم و حکیم کا یہ طریقہ ہے کہ انبیاء و مرسلین کی تائید و رسالت اور اثبات نبوت کے لئے کچھ حسی اور کچھ عقلی آیات و براہین عطا فرماتا ہے کہ جن کے مشاہدہ کے بعد ہر اس شخص کو جس کا دل زیغ اور عناد اور غرور و استکبار، شرادت اور کج فہمی سے پاک ہو۔ بالبداہت یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ حضرات اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ انہیں کی تائید اور تصدیق کے لئے اور انہیں کے اعزاز اور اکرام کے لئے اور انہیں کے دشمنوں کی تحقیر اور تذلیل کے لئے یہ کرشمہ ہائے قدرت ظاہر کئے جارہے ہیں سارا عالم مل کر بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

چوں شود از رنج و علت سلیم
طعم صدق و کذب را باشد علیم

اور جس کا قلب کج فہمی اور زیغ و عناد کے مرض میں مبتلا ہو اس پر انبیاء کرام کی تعلیم کا اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی حق بات کا بھی اس پر اثر نہیں ہوتا۔

ومن یک ذا فم مر مریض
یجد مرا بہ الماء الزلالا

کہ جس کے منہ کا مزہ تلخ ہو اس کو آب زلال (صاف میٹھا پانی) بھی تلخ معلوم ہوتا ہے۔

عقلی نشانی:

ان کے پاکیزہ اصول اور ان کے قاہر و باہر معارف وعلوم مبین اور ان کے مبارک چہروں کا انوار نبوت و رسالت سے درخشاں و تاباں ہونا ہے جس کا ادراک اور احساس ارباب بصیرت اور اصحاب عقول کو پہلی ہی نظر میں ہو جاتا ہے۔

حسی نشانی:

اور حسی نشانی جیسے ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کا بردوسلام ہو جانا اور موسیٰ علیہ السلام کے لیے دریا کا پھٹ جانا اور دھوپ کے وقت وادی تیہ میں ابر کا سایہ کرنا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے مردوں کا زندہ کرنا، کوڑی اور برص زدہ کو درست کرنا۔ اس قسم کی آیات بینات (معجزات) کا ظاہر ہونا جس سے ان کا مؤید من اللہ ہونا صاف ظاہر ہوتا ہے اور دیکھنے والوں پر یہ بات بخوبی منکشف ہو جاتی ہے کہ اس قسم کے عجیب و غریب خوارق اور معجزات کا صدور وظہور بغیر تائید الٰہی اور امداد غیبی وسماوی کے ناممکن اور محال ہے

اسی طریقہ کے مطابق حق تعالیٰ شانہ نے نبی اکرم محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت و رسالت کی تصدیق کے لئے دونوں قسم کی آیات و معجزات ظاہر فرمائے۔

معجزات عقلیہ:

(۱) آپؐ کے اخلاق و اعمال شمائل واحوال آپ کے علوم و معارف آپ کے جوامع الکلم اور محاسن اشارات کہ جن کے دقائق و اسرار کے ادراک سے اذکیائے عالم قاصر و عاجز ہیں۔

آپ کی کامل و مکمل شریعت آپ کی ملت حنیفیہ سمحہ وبیضاء جس کی شان یہ ہے لیلھا ونھارھا سواء (رات دن میں یکساں اجالا ہے) جن حضرات نے

آنحضرت ﷺ کے اخلاق اور شمائل و احوال کا مشاہدہ کیا اور آپ کے خطبات اور کلمات طیبات کو گوش ہوش سے سنا ان کو سنتے ہی اس کا کامل یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اکتسابی شئے نہیں بلکہ تعلیم الٰہی اور تائید سمائی ہے۔

اس لئے کہ ایک شخص جس نے ایک حرف پڑھا نہ لکھا نہ کسی سے تعلیم پائی اور نہ طلب علم کے لئے کبھی کوئی سفر کیا۔ اور ایسے قبیلہ اور ایسے شہر اور ایسے زمانہ میں ظاہر ہوا کہ جہاں علم کا نام ونشاں بھی نہ تھا۔ ملک کا ملک جہالت اور رذائل اخلاق اور فواحش کا معدن ومنبع بنا ہوا تھا۔ ایسی قوم میں رہ کر ایک یتیم اور امی کا تمام رذائل سے پاک اور منزہ رہنا اور مکارم اخلاق اور محاسن آداب صدق وامانت۔ صبر وشکر زہد وعدل عفت و عصمت۔ تواضع وشجاعت حیاء ومروت۔ جود وکرم۔ غرض یہ کہ تمام مکارم ومحاسن اور شمائل وآداب کا منبع وسرچشمہ ہو جانا۔ اور ایسے علوم ومعارف کا بیان کرنا کہ اولین و آخرین میں کہیں اس کی نظیر نہ ہو۔ اگر یہ تعلیم ربانی اور موہبت رحمانی نہیں تو بتلاؤ یہ کیا ہے۔ "ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ." اور حق تعالیٰ شانہ کے اس مبارک ارشاد میں اسی طرف اشارہ ہے۔ اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَھُمْ فَھُمْ لَہٗ مُنْکِرُوْنَ." (کیا یہ لوگ اپنے رسول سے ناواقف ہیں جو اس کے منکر ہو رہے ہیں۔) اور فرماتے ہیں: "وَمَا کُنْتَ تَتْلُوْ مِنْ قَبْلِہٖ مِنْ کِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّہٗ بِیَمِیْنِکَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ". (آپ اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے اگر بالفرض ایسا ہوتا تو ممکن تھا کہ یہ باطل پرست آپ کی نبوت میں کوئی شبہ نکال لیتے۔) اور فرمایا:"

فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِہٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. (آپ کہہ دیجئے کہ میں تو اس سے پہلے عمر کا ایک حصہ تم میں گذار چکا ہوں کیا پھر بھی نہیں سمجھتے ہو)۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست
کتب خانہ چند ملت بشست

نہ از لات و عزیٰ بر آورد گرد
کہ توریت و انجیل منسوخ کرد

قرآن اور حدیث پر ایک اجمالی نظر ڈال لیجئے خود معلوم ہو جائے گا کہ علوم و معارف کا دریائے ذخار ہے کوئی خیر ایسی نہیں جس کا حکم نہ دیا گیا ہو اور کوئی شر ایسا نہیں جس سے منع نہ کیا گیا ہو زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے احکام نہ بتلائے گئے ہوں وغیرہ وغیرہ۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو میں بھی آپ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا۔

"فلما استبنت وجهه عرفت ان وجهه ليس بوجه الكذاب".

(جب میں نے آپ کا روئے مبارک دیکھا تو پہچان لیا کہ آپ کا چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے)۔

مولائے رومی قدس سرہ السامی فرماتے ہیں۔ ؎

دردل ہر امتی کز حق مزہ است
روئے و آواز پیمبر معجزہ است

چوں پیمبر از برون بانگے زند
جان امت در درون سجدہ کند

اور عبداللہ بن رواحہؓ فرماتے ہیں۔ ؎

لو لم تكن فيه آيات مبينة
لكان منظره ينبئك بالخير

(ترجمہ) اگر آپ میں بالفرض نبوت و رسالت کی کھلی نشانیاں نہ بھی ہوتیں تب بھی آپ کا چہرہ مبارک ہی نبوت و رسالت کی خبر دیدیتا۔

(۲) ادائے رسالت میں طرح طرح کی مشقتیں برداشت کرنا اور کبھی بھی مال و جاہ کی طرف ذرہ برابر التفات نہ ہونا اور دشمنوں کی شدید سے شدید تکالیف اور اذیتوں پر فقط صبر ہی نہیں بلکہ دعاء ہدایت فرمانا۔ "**اللّٰھم اھد قومی فانھم لایعلمون**" یہی آپ ﷺ کے برگزیدہ ہونے کی روشن دلیل ہے۔ خدا کا برگزیدہ بندہ ہی ایسا صبر کرسکتا ہے۔ دعوائے نبوت کے بعد کفار مکہ نے اموال کثیرہ اور حسین سے حسین عورتیں آپؐ کے سامنے پیش کیں مگر اس نبی امی فداہ نفسی وابی وامی نے جس کو خدا نے مجسم زہد وعفت بنا کر بھیجا تھا ذرہ برابر اس کی طرف التفات نہ کیا اور دشمنوں پر فتح پالینے کے بعد بھی اسی طرح دنیا سے بے التفاتی اور توجہ الی اللہ باقی رہی یہ کیا آپؐ کے نبی برحق اور رسول صادق ہونے کی صریح دلیل نہیں۔

اور اللہ نے فرمایا:

وَجَاءَ مِنْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔

(ایک شخص شہر سے دور گیا ہوا آیا اور اپنی قوم سے یہ کہنے لگا کہ اے قوم! خدا کے فرستادوں کا اتباع کرو ایسے لوگوں کی راہ پر چلو جو تم سے کسی قسم کے معاوضہ کے طلب گار نہیں، اور خود راہ راست پر ہیں)۔

(۳) آپ کا مستجاب الدعوات ہونا بھی آپ کے نبی برحق ہونے کی صریح دلیل ہے آپ نے جو دعا فرمائی وہ بارگاہ الٰہی میں قبول ہوئی۔

ہجرت کے وقت جب سراقہ بن مالک نے انعام قریش کی طمع میں آپ کا تعاقب کیا اور مسلح گھوڑے پر سوار ہو کر آپ کے قریب پہنچا تو آپ نے بددعا کی یکا یک گھوڑے کا نصف حصہ زمین میں دھنس گیا۔ سراقہ نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کی بددعا سے میرا گھوڑا زمین میں دھنسا ہے۔ آپ مجھ کو اس بلا سے رہائی دیجئے میں آپ سے پختہ عہد کرتا ہوں کہ جو آپ کی تلاش میں پھرتا ہوگا اس کو واپس کردوں گا

۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے دعا فرمائی اسی وقت زمین نے اس کے گھوڑے کو چھوڑ دیا۔ سراقہ مشرف با اسلام ہو گئے اور یہ شعر کہے ۔

ابا حکم لو کنت واللہ شاھداً

لامر جوادی حین ساخت قوائمہ

اے ابوجہل خدا کی قسم اگر تو اس وقت موجود ہوتا جس وقت میرے گھوڑے کے پیر زمین میں دھنسے تھے،

علمت و لم تشکک بان محمدا

رسول ببرھان فمن ذا یقاومہ

تو تو یقین کرتا اور ذرہ برابر تجھ کو شک نہ رہتا کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں دلائل اور براہین کے ساتھ کون ان کا مقابلہ کرسکتا ہے۔

عتبہ بن ابی لہب نے جب آپ کی شان میں گستاخی کی تو آپ نے یہ بددعا فرمائی۔

"اللّٰھم سلط علیه کلبا من کلابک"

(اے اللہ اس پر کوئی کتا یعنی کوئی درندہ اپنے درندوں میں سے مسلط فرما)۔

چنانچہ ابولہب اپنی اولاد اور خدام کے ساتھ ایک بار شام کو تجارت کے لئے روانہ ہوئے جن میں عتبہ بھی تھا جس کے لئے آپ نے بددعا فرمائی تھی۔ ایک منزل میں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ یہاں شیر رہتا ہے۔ عتبہ کے باپ ابولہب نے کہا۔

"ان ابنی اخاف علیه دعوۃ محمد فتعاھدوہ"۔

(میں اپنے اس بیٹے پر محمد ﷺ کی بددعا کا خوف کرتا ہوں۔ اس کی خبر گیری کرنا۔)

قافلہ والوں نے سامان جمع کر کے ایک ٹیلہ بنایا اور عتبہ کو اس پر لٹایا۔ جب رات ہوئی تو شیر آیا تمام قافلہ والوں میں تلاش کر کے صرف عتبہ پر حملہ کیا اور اس کا سر چبا گیا۔ شیر جب عتبہ کے قریب پہنچا تو عتبہ یہ کہتا تھا۔

یا ویل امی ہو واللہ آکل کما دعا محمد علي قتلني محمد و ھو بمکة و انا بالشام فا قبل الاسد یتخطا ھم حتی اخذ برأس عتبة ففد غه. (خصائص کبریٰ ص ۱۴۷ ج ۱)

ہائے میری ماں خدا کی قسم یہ مجھ کو کھائے گا جیسا کہ محمد نے مجھ پر بددعا کی محمد نے مجھ کو مار ڈالا حالانکہ وہ مکہ میں ہیں اور میں ملک شام میں ہوں۔

شیر لوگوں کو پھاندتا ہوا اس تک پہنچا، یہاں تک کہ عتبہ کا سر چبا ڈالا۔

شیر کا سب کو چھوڑ کر صرف عتبہ کی طرف متوجہ ہونا اس امر کی صریح دلیل ہے کہ یہ من جانب اللہ محمد رسول اللہ کی قبولیت دعا ہے جس کا عتبہ نے بھی زبان اور قلب سے اقرار کیا۔ بدنصیب کافروں کا عجب حال تھا آپ کا مستجاب الدعوات ہونا ان کے دلوں پر نقش تھا مگر اپنی شقاوت اور بدبختی سے ایمان نہ لاتے تھے۔

دعاء کے متعلق جس قدر معجزات ظاہر ہوئے ہیں ان کی تفصیل خصائص کبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۲ تا ۱۷۰ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) توریت وانجیل اور تمام صحف سماویہ میں آپ کی بشارتوں کا موجود ہونا اور اسی بنا پر علماء بنی اسرائیل کا ایمان لانا اور آپ کی نبوت کی تصدیق کرنا۔ یہ بھی آپ کی نبوت ورسالت کی عقلی دلیل ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

"اَوَلَمْ یَکُن لَّھُمْ آیَةً اَنْ یَّعْلَمَہٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ".

(کیا ان لوگوں کے لئے آپ کی نبوت کی یہ کھلی دلیل نہیں کہ علماء بنی اسرائیل آپ کو جانتے ہیں کہ یہ وہی نبی ہیں جن کی کتب سابقہ میں خبر دی گئی ہے)۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا

"اَلَّذِیْنَ آتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ وَاِنَّ

فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ "۔

(جن لوگوں کو ہم نے توریت و انجیل دی ہے وہ آپ کو ایسا ہی پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو اور ایک فریق ان میں سے جان بوجھ کر حق کو چھپاتا ہے)۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ "۔

(جو لوگ ایسے رسول اور نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جس کو وہ اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں)۔

الحاصل علماء یہود و نصاریٰ کا یہ اعترف کہ آنحضرت ﷺ وہی نبی ہیں جن کی توریت و انجیل میں بشارت دی گئی ہے یہ آپ کے نبی برحق ہونے کی قطعی دلیل ہے اور اس قسم کے واقعات کتب سیر مثلاً شرح مواہب اور شفائے قاضی عیاض اور اس کی شرح نسیم الریاض اور طبقات ابن سعد میں بالتفصیل مذکور ہیں۔

اور ہرقل شہنشاہ روم کا واقعہ مشہور ہے اس لئے ہم نے اسی پر اکتفاء کیا ہے۔

(۵) آپ کا غیب کی خبریں دینا اور ذرہ برابر اس کے خلاف نہ ہونا یہ بھی آپ کے صادق مصدوق اور مرسل من اللہ ہونے کی صریح دلیل ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء و مرسلین کی کوئی پیشین گوئی کبھی غلط نہیں ہوئی اور کاہنوں اور جھوٹے مدعیان نبوت کی بالفرض اگر ایک بات صحیح نکلتی ہے تو سو غلط ہوتی ہیں۔

اس وقت بطور نمونہ صادق و مصدوق محمد رسول اللہ ﷺ کی چند پیش گوئیاں بیان کرتے ہیں جس سے آپ کا صادق و مصدوق اور مرسل من اللہ ہونا خوب ظاہر ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ اس قسم کی غیبی خبریں سوائے اللہ کے نبی اور رسول کے کوئی نہیں بیان کر سکتا، جو خبر بھی آپ نے دی "کالشمس فی نصفِ النہار" ہو

کرظاہر ہوئی سر مو بھی کوئی فرق نہ نکلا۔

(۱) غلبۂ روم کی پیشین گوئی فرمانا جس کا سورہ روم میں تذکرہ ہے پھر کفار مکہ کی تکذیب اور صدیق اکبرؓ کی تصدیق کرنا اور اس پر سوسو اونٹ کی شرط کرنا اور پھر اس پیشین گوئی کے سچ ظاہر ہونے پر صدیق اکبرؓ کا کفار مکہ سے سو اونٹ وصول کرنا کتب سیر میں مسطور اور لوگوں میں معروف ہے۔

(۲) قیام مکہ کے زمانہ میں جب آپ کا ظاہر اسباب میں کوئی یار و مددگار نہ تھا ہر شخص خون کا پیاسا تھا گھر سے باہر نکلنا بھی دشوار تھا اس وقت اپنی فتح و نصرت اور کفار کی شکست اور ہزیمت کی خبر دینا اگر وعدۂ الٰہی اور تائید غیبی کے سہارے اور بھروسہ پر نہ تھا تو منکرین و مکذبین بتلائیں کہ کس بھروسہ پر علی الاعلان بابانگ دہل یہ پیشین گوئی "سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُر" کی جارہی تھی جس کی تصدیق کفار کو بدر کے میدان میں ہوگئی چنانچہ حق جل شانہ ارشاد فرماتے ہیں۔

قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمِهَادِ قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَافِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاءُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ".

(ترجمہ) آپ کافروں سے کہہ دیجئے کہ تم عن قریب ضرور مغلوب ہو گے اور جہنم کی طرف تمہارا حشر ہوگا اور جہنم برا ٹھکانا ہے۔ اور تمہارے لئے ان دو جماعتوں میں ایک روشن نشانی ہے جو (بدر) کے میدان میں سے ایک دوسرے سے مقابل ہوئیں ایک گروہ یعنی مسلمانوں کا گروہ تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتا تھا اور دوسرا گروہ کافروں کا تھا (جس کا خدا تو کیا متعین ہوتا اس کی تو غرض بھی متعین نہ تھی۔) وہ کافر مسلمانوں کو اپنے سے دگنا دیکھ رہے تھے (جس طرح خدا بھینگے کو ایک کے دو دکھلاتا ہے)

اور اللہ تعالیٰ اپنی مدد سے جس کو چاہتا ہے قوت دیتا ہے اس واقعہ میں آنکھ والوں کے لئے بڑی عبرت ونصیحت ہے۔

"واخرج مسلم و ابوداود و البیھقی عن انس ان النبی ﷺ قال لیلة بدر ھذا مصرع فلان ان شاء اللہ تعالیٰ غداً و وضع یدہ علی الارض وھذا مصرع فلان ان شاء اللہ تعالیٰ غداًووضع یدہ علی الارض فوالذی بعثه بالحق ما اخطاء و تلک الحدود جعلوا یصرعون علیھا"۔

(خصائص کبریٰ ص ۱۹۹ ج ۱)

ترجمہ: مسلم اور ابوداؤد اور بیہقی میں انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے شب بدر میں اس میدان کا چکر لگایا اور زمین پر نشان لگا لگا کر اور ہاتھ رکھ کر بتلاتے جاتے تھے کہ یہ جگہ کل کوفلانے کے قتل کی ہے۔ اور انشاء اللہ یہ جگہ کل فلاں کے قتل ہونے کی ہے۔پس قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا یہ مقتولین اپنے حدود قتل سے ذرہ برابر متجاوز نہ تھے جس جگہ آپ نے نشان لگادیا اسی جگہ پچھڑے ہوئے تھے)۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے آپ سے آپ کے مومنین صالحین کے لئے زمین میں حکومت اور نفاذ دین کا وعدہ فرمایا۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ وعدۂ الٰہی کس طرح پورا ہوا دنیا کی تاریخیں اس کی شاہد ہیں۔

(۴) شام اور بیت المقدس اور مصر اور فارس اور روم وغیرہ وغیرہ کی فتح کی پیشین گوئی فرمائی چند سال گذرنے نہ پائے کہ یہ تمام ممالک آپ کے غلاموں کے زیرنگیں آگئے۔

(۵) اللہ نے آپ سے یہ وعدہ فرمایا کہ اگر جن اور انس سب مل کر بھی یہ چاہیں کہ

قرآن کے مثل ایک سورت بنا لائیں تو ہرگز نہ بنا سکیں گے۔

اللہ نے فرمایا:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔

(آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمام انسان اور جنات متفق ہو کر یہ کوشش کریں کہ اس قرآن کے مثل اور کوئی دوسری کتاب بنا کر لے آئیں تو نہ لا سکیں گے اگرچہ ایک دوسرے کے اس معاملہ میں کیسے ہی مددگار بنیں)۔

چودہ سو تیس برس گزر گئے مگر کوئی متنفس قرآن کریم کے مثل ایک سطر بھی لکھ کر پیش نہ کر سکا اور نہ تا قیام قیامت پیش سکے گا۔ (امداد اللہ انور)

(۶) اللہ جل جلالہ نے آنحضرت ﷺ سے قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ فرمایا

"اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ"۔

(ہم نے قرآن کریم کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں)۔

صدیاں گزر گئیں مگر اس کے ایک نقطہ اور ایک شوشہ میں بھی فرق نہیں آیا۔

یہ جو کچھ ذکر کیا گیا بطور اشارہ تھا اگر غیب کی خبروں کے متعلق تفصیلی طور پر معجزات کا مطالعہ مطلوب ہو تو خصائص کبری للحافظ السیوطی ص ۹۹ ج ۲ تا ص ۱۶۰ اور الجواب لصحیح لمن بدل دین المسیح للحافظ ابن تیمیہ ص ۱۲۶ ج ۴ تا ص ۱۵۷ ج ۴ اور شرح مواہب کا مطالعہ کریں۔

(علم الکلام صفحہ ۲۶۳ تا ۲۷۳ مختصرا)

حضرت محمدؐ کے بعد نبی کیوں نہیں آسکتے

اعتراض:

آپ کو خاتم النبیین کیوں بنایا گیا، آپ کے بعد نبی کیوں نہیں آسکتے؟

جواب: خاتم النبیین پر دلیل عقلی:

اور دلیل عقلی اس پر یہ ہے کہ آپؐ سے پہلے سینکڑوں انبیاء دنیا میں آئے اور گمراہی کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ طرح بطرح احکام کے تبدیل و تغیر کرنے سے اصلاحیں ہوتی رہیں آخر جو کچھ کسر باقی رہ گئی تھی وہ آپؐ کے عہد میں پوری کر دی گئی۔ رہیں نئی پیش آنے والی ضرورتیں ان کی تدبیر بھی کتاب و سنت میں رکھ دی گئی ہے۔ وقتاً فوقتاً مجدد یا مجتہد یا حکیم امت کتاب و سنت سے وہ حاجت برآری کر سکتے ہیں۔ نئے نبی بھیجنے میں سیاست ملیہ میں بڑا انقلاب واقع ہوتا ہے جس میں ہزاروں گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس مشقت اور زحمت کو اپنے بندوں سے دور کر دیا جس کی طرف و کان اللہ بکل شیء علیما۔ میں اشارہ ہے کہ عواقبِ امور اللہ کی نظر میں ہیں اس کی مصلحت وہ خوب جانتا ہے اور نیز آئندہ آیات میں اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اگر کوئی کہے کہ حضرتؐ کے بعد قربِ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی آئیں گے جیسا کہ اہل اسلام بلکہ عیسائیوں کا بھی عقیدہ ہے۔ پھر آپؐ خاتم کیوں کر ہو گئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ نئے نبی نہیں ہیں بلکہ وہ آپؐ سے پہلے ہو چکے ہیں اور زمین پر آ کر حضرتؐ کے دین کی اشاعت کریں گے آپؐ کے نائب ہو کر۔

(تفسیر حقانی ۱۶/۴)

کیا حضور ﷺ خدا تعالیٰ کے معشوق ہیں

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

مسلمانوں کے عجیب عقیدوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ محمد ﷺ کو خدا تعالیٰ کا معشوق جانتے ہیں۔

جواب: معترض صاحب لغت عرب سے بالکل ناواقف ہیں عشق کا لفظ عربی زبان میں شدت محبت کے معنی میں آتا ہے۔ والناس فیما یعشقون مذاہب یعنی

لوگ جن چیزوں سے محبت کرتے ہیں ان میں ان کی اپنی اپنی راہیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ خدا تعالی کا مخلوقات میں سے مختلف چیزوں سے محبت رکھنا اس کے تقدس کے منافی نہیں ہے۔ (سوط اللہ الجبار ج ا ص ۳۰)

کالکی اوتار

کائنات کے سب سے بڑے رہنما
حضرت محمد ﷺ کا ہندوؤں کے ویدوں سے ثبوت

حال ہی میں بھارت میں شائع کی جانے والی کتاب "کالکی اوتار" نے ملک بھر میں ہلچل مچادی ہے۔ اس کتاب میں یہ کہا گیا ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں جس کالکی اوتار کا تذکرہ ہے وہ آخری رسول محمد رسول اللہ ﷺ بن عبداللہ ہیں۔

اس کتاب کا مصنف اگر کوئی مسلمان ہوتا تو وہ اب تک جیل میں ہوتا اور اس کتاب پر پابندی لگ چکی ہوتی مگر پنڈت وید پرکاش برہمن ہندو ہیں اور الہٰ آباد یونیورسٹی کے ایک شعبے سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے اپنی تحقیق کا نام "کالکی اوتار" یعنی "تمام کائنات کے سب سے بڑے رہنما" رکھا ہے۔

پنڈت وید پرکاش سنسکرت کے معروف محقق اور اسکالر ہیں۔ انہوں نے اپنی اس تحقیق کو ملک کے آٹھ مشہور معروف محققین و پنڈتوں کو پیش کیا ہے جو کہ اپنے شعبے میں مستند گردانے جاتے ہیں ان پنڈتوں نے کتاب کے بغور مطالعے اور تحقیق کے بعد یہ تسلیم کیا ہے کہ کتاب میں پیش کیے گئے حوالہ جات مستند اور درست ہیں۔

ہندوستان کی اہم مذہبی کتب میں ایک عظیم رہنما کا ذکر ہے جسے "کالکی اوتار" کا نام دیا گیا ہے اور اس سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں جو مکہ میں پیدا ہوئے۔ چنانچہ تمام ہندو جہاں کہیں بھی ہیں ان کو مزید کسی کالکی اوتار کا انتظار نہیں کرنا ہے بلکہ محض اسلام قبول کرنا ہے اور آخری رسول ﷺ کے نقش قدم پر چلنا ہے جو بہت پہلے اپنے

مشن کی تکمیل کے بعد اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

اپنے اس دعوے کی دلیل میں پنڈت وید پرکاش نے ہندوؤں کی مقدس کتاب ''وید'' سے مندرجہ ذیل حوالے دلیل کے ساتھ پیش کیے ہیں:

(۱) وید میں لکھا ہے کہ ''کالکی اوتار'' بھگوان کا آخری اوتار ہوگا جو پوری دنیا کو راستہ دکھائے گا۔

ان کلمات کا حوالہ دینے کے بعد پنڈت وید پرکاش یہ کہتے ہیں کہ یہ صرف محمد ﷺ کے معاملہ میں درست ہوسکتا ہے۔

(۲) ''ہندوستان'' کی پیش گوئی کے مطابق ''کالکی اوتار'' جزیرہ میں پیدا ہوں گے اور یہ عرب کا علاقہ ہے جسے جزیرۃ العرب بھی کہا جاتا ہے۔

(۳) ہندوؤں کی مقدس کتاب میں لکھا ہے کہ ''کالکی اوتار'' کے والد کا نام ''وشنو بھگت'' اور والدہ کا نام ''سومانب'' ہوگا۔

سنسکرت زبان میں ''وشنو'' اللہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور بھگت کے معنی غلام اور بندے کے ہیں۔

چنانچہ عربی زبان میں ''وشنو بھگت'' کا مطلب اللہ کا بندہ ہے۔ سنسکرت میں ''سومانب'' کا مطلب امن ہے جو کہ عربی زبان میں آمنہ ہوگا۔ اور آخری رسول ﷺ کے والد کا نام عبداللہ اور والدہ کا نام آمنہ ہے۔

(۴) ہندوؤں کی بڑی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ ''کالکی اوتار'' زیتون اور کھجور استعمال کرے گا۔ اپنے قول میں سچا اور دیانتدار ہوگا۔

مکہ میں محمد ﷺ کیلئے یہ دونوں نام ''صادق وامین'' استعمال کیے جاتے تھے۔

(۵) وید میں لکھا ہے کہ ''کالکی اوتار'' اپنی سرزمین کے معزز خاندان میں سے ہوگا۔

اور یہ بھی محمد ﷺ کے بارے میں سچ ثابت ہوتا ہے کہ آپ قریش کے معزز قبیلے میں سے تھے جس کی مکہ میں بے حد عزت تھی۔

(۶) یہ بھی لکھا ہے کہ بھگوان ''کالکی اوتار'' کو اپنے خصوصی قاصد کے ذریعے ایک غار میں پڑھائے گا۔

اس معاملہ میں یہ بھی درست ہے کہ محمد ﷺ مکہ کی وہ واحد شخصیت تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے غارِ حرا میں جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے تعلیم دی۔

(۷) کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ ہندو اس پر یقین رکھتے ہیں کہ بھگوان ''کالکی اوتار'' کو ایک تیز ترین گھوڑا عطا فرمائے گا جس پر سوار ہو کر وہ زمین اور سات آسمانوں کی سیر کرے گا۔

محمد ﷺ کا براق پر معراج کا سفر کرنا یہ ثابت نہیں کرتا ہے؟

(۸) یہ بھی لکھا ہے کہ بھگوان ''کالکی اوتار'' کی بہت مدد کرے گا اور اسے بہت قوت عطا فرمائے گا۔

ہم جانتے ہیں کہ جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کی فرشتوں سے مدد فرمائی۔

(۹) ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں یہ بھی ذکر ہے کہ کالکی اوتار گھڑ سواری، تیر اندازی اور تلوار زنی میں ماہر ہوگا۔

پنڈت وید پرکاش نے اس پر جو تبصرہ کیا ہے وہ اہم اور قابل غور ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ

گھوڑوں، تلواروں اور نیزوں کا زمانہ بہت پہلے گزر چکا ہے۔ اب ٹینک، توپیں اور میزائل جیسے ہتھیار استعمال میں ہیں لہذا یہ عقلمندی نہیں ہے کہ ہم تلواروں، تیروں اور برچھوں سے مسلح ''کالکی اوتار'' کا انتظار کرتے رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری مقدس کتابوں میں ''کالکی اوتار'' کے واضح اشارے حضرت محمد ﷺ کے بارے میں ہیں۔

پنڈت وید پرکاش نے اپنی تحقیق میں جن نکات پر بحث کی ہے اس پر ہندوستان

کے مذہبی رہنما اور پنڈت سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ ان کا اگر اپنی مذہبی کتابوں پر یقین ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ ان میں دی گئی پیشین گوئیوں کو جھٹلائیں مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جس مذہب کو انہوں نے صدیوں سے گلے لگایا ہوا ہے اسے چھوڑ نے کے لئے جس ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے وہ درکار ہے کیونکہ جس وقت حضرت محمد ﷺ نے قریش کو دعوت اسلام دی تو بہت سے ایسے بھی تھے جو یہ جانتے تھے کہ یہ حق ہے مگر ان کے دل حضرت محمد ﷺ کی اتباع کرنے کو تیار نہ تھے اور انہوں نے اپنے باپ دادا کے دین کو ہی پکڑے رکھا اور اسی کو حضرت محمد ﷺ کی دعوت کے انکار اور اختلاف میں استعمال کیا۔

(ماخوذ از ماہنامہ نور علی نور، ذی قعد ۱۴۲۰ھ)

اشاعت اسلام سے حضورؐ کا مقصد کیا تھا

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

کیا اشاعت اسلام سے حضورؐ کی تعظیم کرانا مقصود تھا؟

رسول اللہ ﷺ کا اشاعت اسلام سے مقصود اپنی تعظیم کرانا ہے؟

جواب:

رسول اللہ ﷺ کا مقصود اشاعت اسلام سے اپنی تعظیم کرانا نہ تھا کیونکہ جو شخص بڑا بننا چاہتا ہے وہ تو خود اسکی کوشش کرتا ہے کہ لوگ میرے سامنے جھکیں مگر حضور ﷺ کی یہ حالت ہے کہ لوگ از خود آپ کو سجدہ کرنا چاہتے تھے اور آپ نے ان کو اس سے منع کیا اور صرف منع ہی نہیں کیا بلکہ اپنا فانی ہونا ان پر ظاہر کر دیا مگر پھر بھی بعض جہلاءِ کفر کا حضور ﷺ پر یہ اعتراض ہے کہ آپ نعوذ باللہ بڑا بننا چاہتے تھے۔ اگر حضور ﷺ میں ذرہ برابر بھی بڑائی و تکبر کا خیال ہوتا تو آپ عمدہ لباس پہنتے، عمدہ مکان بناتے نفیس نفیس کھانا کھایا کرتے، آپ کے پاس خزانہ جمع ہوتا مگر تاریخ شاہد ہے اور

احادیث میں صحیح سندوں سے ثابت ہے کہ حضورﷺ کا لباس موٹا اور چھوٹا ہوتا تھا، آپ کے مکانات سب کچے تھے آپ اپنے پاس کچھ نہ رکھتے تھے، یہ نہیں کہ آپ کے پاس مال نہ آتا تھا۔ نہیں بعضے جنگوں میں اتنا مال آیا کہ اس کی شمار نہیں ہو سکتی تھی، بکریوں سے جنگل کے جنگل بھر گئے اور آپ نے سب بکریاں ایک اعرابی (دیہاتی) کو اس کے سوال پر عطا فرمادیں اور اونٹ اس قدر تھے کہ آپ نے کسی کو سو اور کسی کو دو سو عنایت فرمائے، جب بحرین کا جزیہ آیا تو اتنا روپیہ تھا کہ مسجد کے اندر سونے کا ڈھیر لگ گیا۔ مگر آپ نے تھوڑی دیر میں سب کا سب صحابہ کرامؓ میں تقسیم کر دیا۔ اور اپنے واسطے ایک درہم بھی نہ رکھا تو کیا بڑائی چاہنے والا یہ گوارا کر سکتا ہے کہ خود تو خالی ہاتھ رہے اور مخلوق کو مالا مال کر دے، پھر آپ کی حالت یہ تھی کہ راستہ میں جب چلتے تو صحابہ کرامؓ کو اپنے سے آگے چلنے کا حکم فرماتے اور خود پیچھے چلتے، بعض دفعہ کوئی صحابیؓ سوار ہوتے اور آپ اس کے ساتھ پیدل چلتے وہ اترنا چاہتے اور آپ منع فرماتے، اکثر آپ اپنا سودا بازار سے خود لے آیا کرتے تھے، اگر کوئی شخص کسی کام میں آپ سے امداد لینا چاہتا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتا لیجاتا۔ اور آپ اس کا کام کر دیتے تھے گھر میں آکر آپ اپنے گھر کے کام بھی کرتے تھے، کبھی بکری کا دودھ خود نکال لیا کبھی جوتا اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیا، کبھی آٹا گوندھ دیا۔ آپ بعض دفعہ زمین پر بیٹھ جاتے، بوریہ پر لیٹ جاتے تھے جس سے آپ کے پہلو پر نشان ہو جاتے، بعض دفعہ کسی یہودی کا آپ پر قرض ہوتا اور وہ تقاضا کرنے میں سختی کرتا برا بھلا کہتا اور حضرات صحابہ کرامؓ کو یہودی پر غصہ آتا اور وہ اس کو دھمکانا چاہتے تو آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کو منع فرماتے اور یہ ارشاد فرماتے کہ صاحب حق کو کہنے سننے کا حق ہے۔

اس جاہل معترض سے کوئی پوچھے کہ کیا بڑائی اور عظمت چاہنے والوں کے یہی حالات ہوا کرتے ہیں۔ (اشرف الجواب صفحہ ۴۳)

کیا حضور ﷺ سب کے نبی ہیں

اعتراض: (بعض کفار کا اعتراض)

جناب رسول کریم ﷺ کی بعثت عام ہے۔ لیکن یہ خلجان ہوتا ہے کہ امریکہ میں نہ تو خود حضور ﷺ تشریف لے گئے اور نہ صحابہ کرام ؓ میں سے کسی کو حضور ﷺ نے وہاں بھیجا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ضرور کہیں منقول ہوتا۔ حالانکہ منقول نہیں نیز امریکہ کا حال بہت بعد میں معلوم ہوا ہے۔ کہ ایک جہاز غلط راستے پر ہولیا تھا اور وہاں پہنچ گیا۔ اور اس کو معلوم ہوا کہ یہاں بھی کچھ لوگ رہتے ہیں۔

جب وہاں آپ کی دعوت نہیں پہنچی تو نبوت عام کیسے ہوئی۔

جواب: بعثت عامہ کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ بعثت کے عام ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جب کبھی جس کسی کو حضور ﷺ کی بعثت کی خبر پہنچی اور وہ آپ پر ایمان نہ لائے اور احکام قبول نہ کرے تو وہ کافر ہے یہ معنی نہیں کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں حضور ﷺ کی بعثت کی خبر ساری دنیا کو ہوگئی تھی اس وضاحت کے بعد اب کوئی شبہ نہیں ہے۔ پس امریکہ میں جس وقت خبر پہنچی اسی وقت سے وہاں کے لوگ مکلّف ہوں گے۔

(مجادلات معدلت ودعوات عبدیت حصہ پنجم ملفوظ نمبر ۴)

مسلمان رسول اللہ ﷺ کو خدا کے برابر کا سمجھتے ہیں

اعتراض: (بعض کفار کا اعتراض)

مسلمانوں کے نزدیک رسول اللہ ﷺ خدا تعالیٰ کے برابر ہیں؟

جواب: عبادت میں مسلمانوں کے نزدیک خدا کا کوئی شریک نہیں حضور بھی اس میں شریک نہیں ہیں اس لئے حضور ؐ کو سجدہ کرنا نہ زندگی میں جائز تھا نہ اب آپ ؐ

کی قبر کو سجدہ کرنا جائز ہے مگر اطاعت میں حضورؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے اس لئے کہ آپ شریک فی الاطاعت ہیں بلکہ اس لئے کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب خدا کی طرف سے پیغام ہوتا ہے تو آپ کا حکم درحقیقت آپ کا حکم نہیں بلکہ پیغمبر ہونے کی وجہ سے وہ خدا ہی کا حکم ہے اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کے احکام کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے "مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ اور اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ"۔ اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ بادشاہ وزیر کو حکم دیتا ہے کہ رعایا میں یہ قانون شائع کردو پس اس وقت وزیر کی زبان سے جو قانون شائع ہو رہا ہے وہ درحقیقت بادشاہ کا حکم ہے اس لئے وزیر کی اطاعت بعینہ بادشاہ کی اطاعت ہے مگر اس سے ہرگز کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ وزیر بادشاہ کے برابر ہو گیا۔ اور اگر کوئی جاہل ایسا سمجھنے لگے اور آئندہ سے بجائے بادشاہ کے تخت کے بوسہ دینے کے وزیر کی کرسی کو بوسہ دینے لگے تو یقیناً وہ معتوب ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ کسی مقدمہ میں ایک شخص کو وکیل کردیں تو جو کچھ وہ کہتا ہے سب آپ کی طرف سے منسوب ہوتا ہے کہ گویا تم خود کہہ رہے ہو مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وکیل تمہارے برابر ہو گیا۔ کہ تمہاری جائیداد کا مالک ہو جائے اس میں جو چاہے تصرف کردے۔ ہرگز نہیں، پس مسلمان رسولؐ کی اطاعت کو خدا کی اطاعت اسی معنیٰ میں کہتے ہیں، جیسے وزیر کی اطاعت بادشاہ کی اطاعت ہوتی اور وکیل کا قول مؤکل کا قول ہوتا ہے۔ اس سے شرکت و مساوات ہرگز لازم نہیں آتی۔ (محاسن الاسلام ص ۱۴)

کیا حضورؐ کا مزاح خلاف وقار تھا؟

اعتراض: (بعض کفار کا اعتراض)

کیا حضورؐ کا مزاح خلاف وقار تھا؟

جواب: حضور ﷺ مزاح فرماتے تھے اس میں بھی حکمت تھی۔ ایک حکمت

تو تطیبِ قلوب اصحاب تھی۔ اور دوستوں کا دل خوش کرنا بھی عبادت ہے۔ میں نے اپنے استاد مولانا فتح محمد صاحب سے سنا ہے کہ ایک دفعہ وہ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرّہ کی خدمت میں دیر تک بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ جب اُٹھنے لگے تو حضرت سے عرض کیا کہ آج میں نے حضرت کا وقت بہت ضائع کیا حضرت کی عبادت میں خلل ڈالا۔ حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ نفلیں پڑھنا ہی عبادت ہے دوستوں سے باتیں کرنا عبادت نہیں؟ یہ تم نے کیا کہا کہ وقت ضائع کیا۔ نہیں بلکہ یہ سارا وقت عبادت ہی میں گذرا۔

اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ صبح کی نماز کے بعد بعض دفعہ مصلے پر بیٹھے رہتے تھے اور اشراق کے وقت تک دوستوں سے باتیں کرتے تھے۔ عامی تو یہ سمجھتا ہوگا کہ یہ وقت عبادت سے خالی گذرا مگر اس کو بھی عبادت میں مشغولیت سمجھتے تھے۔ کیونکہ تطییبِ قلب مؤمن بھی عبادت ہے، پس ایک حکمت تو حضورؐ کے مزاح میں یہ تھی۔

دوسری حکمت وہ تھی جو مجھے خواب میں بتلائی گئی، میں نے شباب میں خواب دیکھا تھا کہ ملکہ وکٹوریہ ایک ایسی سواری میں سوار ہے جس میں نہ انجن ہے نہ گھوڑا نہ بیل۔ اس وقت تو میں اس سواری کی حقیقت کو نہ سمجھا تھا، مگر اب موٹر دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ وہ سواری لاری موٹر کی شکل تھی۔ اور میں نے دیکھا کہ ملکہ کی سواری تھانہ بھون کی گلیوں سڑکوں میں پھر رہی ہے، پھر تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنے کو بھی اس سواری پر سوار دیکھا اس وقت ملکہ نے مجھ سے کہا کہ مجھے حقانیتِ اسلام میں اور کوئی شبہ نہیں صرف ایک بات کھٹکتی ہے اگر وہ حل ہو جائے تو پھر اسلام کے حق ہونے میں مجھے کوئی اشکال نہ رہے گا۔ میں نے کہا کہ آپ بیان کیجئے وہ شبہ کیا ہے۔

کہا کہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مزاح بھی فرماتے تھے اور مزاح وقار کے خلاف ہے اور نبی کے لیئے وقار کا ہونا ضروری ہے۔ یہ اشکال سلاطین ہی کے

مذاق کے مناسب ہے کیونکہ وقار وخودداری کا سب سے زیادہ اہتمام انہی کو ہوتا ہے) میں نے جواب دیا کہ رسول اللہؐ کے مزاح میں ایک بڑی حکمت تھی وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رعب وجلال اس درجہ عطا فرمایا تھا کہ ہرقل وکسریٰ جیسے بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے آپ کے نام سے تھرّاتے تھے (حدیث میں ہے کہ نُصِرْتُ بِالرّعْب مسیرة شھر کہ اللہ تعالیٰ نے میری مدد رعب سے بھی کی ہے جو ایک ماہ کی مسافت تک پہنچا ہوا تھا۔ یعنی اس مخلوق پر بھی آپ کا رعب طاری تھا جو بقدر ایک مہینے کی مسافت کے آپ سے دور تھے، پاس والوں کا تو کیا ذکر، اور حضورؐ تو بڑی چیز ہیں حضورؐ کے غلامان غلام کے نام سے بھی سلاطین کانپتے تھے جیسے حضرت عمرؓ وحضرت خالدؓ وغیرہ) اور یہ معلوم ہے کہ حضور ﷺ صرف سلطان ہی نہ تھے بلکہ رسول بھی تھے۔ اور رسول کا کام یہ ہے کہ امت کی ظاہری و باطنی اصلاح کرے، جس کے لئے افادہ و استفادہ کی ضرورت ہے۔ اور افادہ کی شرط یہ ہے کہ مستفیدین کا دل مربی سے کھلا ہوا ہوتا کہ وہ بے تکلف اپنی حالت کو ظاہر کر کے اصلاح کر سکیں۔ اور جس قدر رعب وجلال خدا تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا وہ صحابہؓ کو استفادہ سے مانع ہوتا تھا اس لئے حضور کبھی کبھی اس مصلحت سے مزاح فرماتے تھے کہ صحابہؓ کے دل کھل جائیں اور وہ ہر وقت مرعوب رہ کر اپنے دل کی باتوں کے بیان کرنے سے نہ رکیں۔

اور یہ مُسلّم نہیں کہ ہر مزاح خلاف وقار ہے۔ خلاف وقار صرف وہ مزاح ہے جس میں کوئی مصلحت وحکمت نہ ہو اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضورؐ کے مزاح سے آپ کے وقار وعظمت میں کمی نہ آتی تھی۔ بلکہ اس کا اثر صرف یہ تھا کہ صحابہؓ کے دلوں میں انشراح پیدا ہوتا تھا۔ اور وہ انقباض جاتا رہتا تھا جو زیادہ رعب کی وجہ سے قلوب میں عادۃً پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کا ثمرہ یہ تھا کہ قلوب میں آپ کی محبت جاگزیں ہوتی تھی۔ اگر آپ مزاح نہ فرماتے تو صحابہ کے اوپر آپ کا خوف ہی غالب ہوتا محبت غالب نہ ہوتی۔ اور جب مزاح سے آپ کی محبت غالب ہوتی تو آپؐ کے وقار و

عظمت میں کچھ بھی کمی نہ ہوئی۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادتی ہوگئی۔ کیونکہ پہلے تو وقار و عظمت کا منشاء صرف خوف تھا اب محبت وخوف دونوں مل کر کام کرنے لگے۔

اگر کوئی یوں کہے کہ مزاح سے تو خوف زائل ہو جاتا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وہاں ہوتا ہے جہاں مزاح کرنے والے میں شان رعب کم ہو اور وہ مزاح بکثرت کرے۔ اور اگر شان رعب بہت زیادہ ہو جیسا کہ احادیث میں حضورؐ کی بابت وارد ہے اور مزاح بھی کثرت سے نہ ہو تو اس صورت میں مخاطب بے خوف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مشاہدہ اس کی دلیل ہے۔ اور احادیث سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرات صحابہ کے قلوب میں حضور ﷺ کی عظمت کس درجہ تھی۔

(اور جب کبھی کسی بات میں آپؐ کو غصہ آ گیا ہے تو صحابہ کی کیا حالت ہوتی تھی۔ کہ حضرت عمرؓ جیسے قوی القلب شجاع بھی تھرا جاتے تھے اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عاجزانہ التجا کرنے لگتے تھے)۔

اس جواب کے بعد ملکہ نے کہا کہ اب میرا اطمینان ہو گیا اور اب مجھے حقانیت اسلام میں کوئی شبہ نہیں رہا۔ (الحدود والقیود ص ۹)

آپؐ کے گناہ

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

محمد ﷺ خود نعوذ باللہ گنہگار اور عاصی ہیں، اور کسی گنہگار کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دوسرے گنہگاروں کی سفارش کرے، اور حضورؐ سے گناہوں کے سرزد ہونے کی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ سورۂ مومن میں کہا گیا ہے کہ

"فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ.

ترجمہ: پس آپ صبر کیجئے، بلا شبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور آپؐ اپنے گناہ کی

مغفرت طلب کیجئے اور صبح وشام اپنے پروردگار کی حمد اور پاکی بیان کیجئے۔

اسی طرح سورہ محمدؐ میں ہے:

"فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ"

ترجمہ: پس جان لیجئے کہ واقعہ یہی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے اور مسلمان مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی مغفرت طلب کیجئے۔

اور سورہ فتح میں ہے:

" اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ، لِّیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ"۔

ترجمہ: بلاشبہ ہم نے آپ کو فتح مبین عطا کی ہے، تاکہ آپؐ کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کردے۔

اور حدیث میں آنحضرت ﷺ کی یہ دعاء منقول ہے کہ:

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ مَاقَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ ، اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَ اَنْتَ الْمُؤَخِّرُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ"۔

ترجمہ: اے اللہ! میرے اگلے اور پچھلے، پوشیدہ اور علانیہ تمام گناہ معاف فرمادیجئے، نیز وہ گناہ جو مجھ سے زیادہ آپ کو معلوم ہیں، آپ ہی آگے کرنے والے ہیں اور آپ ہی پیچھے کرنے والے، آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

جواب: ان آیات وغیرہ سے حضورؐ کے گناہگار ہونے کا استدلال غلط ہے ہم بطور تمہید کے پانچ باتیں عرض کرتے ہیں۔

پہلی بات:

یہ بات ذہن نشین کرنے کے لائق ہے کہ خدا تعالیٰ رب اور خالق ہے، اور مخلوق سب کی اس کے زیر تربیت اور اسکی پیدا کردہ ہے، اس لئے وہ تمام چیزیں جو رب و

خالق کی طرف سے بندۂ مربوب ومخلوق کے حق میں صادر ہوں، خواہ خطاب ہو یا عتاب، یا طلب برتری وغیرہ سب اپنے موقع اور محل کے مطابق ہیں، اور اس کی مالکیت اور خالقیت کا اقتضاء ہیں، اسی طرح وہ تمام چیزیں جو بندوں کی جانب سے صادر ہوں، خواہ وہ دعائیں ہوں، التجائیں ہوں، رونا گڑگڑانا ہو وہ ٹھیک اپنے موقع اور محل پر ہیں، اور اس کی مخلوقیت اور بندگی کا مقتضے ہیں، اور انبیاء اور پیغمبر بھی خدا کے بندے اور اس کے مخلص ہیں، اس لئے وہ بھی ان کاموں کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، اور اس قسم کے تمام مواقع پر اللہ کے کلام کو معنی حقیقی پر محمول کرنا یا انبیاء وپیغمبروں کی دعاؤں میں اس کے حقیقی معنی مراد لینا خطا اور گمراہی ہے، جس کے شواہد دونوں عہد کی کتابوں میں بالخصوص زبور میں بے شمار ہیں، نمونے کے طور پر ہم ان میں سے کچھ نقل کرتے ہیں:

پہلی مثال:

انجیل مرقس کے باب ۱۰ اور انجیل لوقا کے باب ۱۸ آیت ۱۷ میں ہے:

پھر کسی سردار نے اس سے یہ سوال کیا کہ اے نیک استاد! میں کیا کروں، تاکہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں؟ یسوع نے اس سے کہا، تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں، مگر ایک یعنی خدا۔"

عیسائیوں کے نزدیک ان آیات کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہے اور یہ کلام کرنے والے خود حضرت عیسیٰ ہیں۔

دوسری مثال:

انجیل متیٰ باب ۲۷ آیت ۴۶ میں ہے:

اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا، ایلی ایلی، لما شبقتنی؟ یعنی اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟" آیت ۱۲ و ۱۳

اب ہمارا سوال یہ ہے کہ پھر عیسیٰ علیہ السلام کے مندرجہ ذیل جملے بائبل میں منقول ہیں کہ:

ا۔تو مجھ کو نیک کیوں کہتا ہے؟

۲۔اے میرے معبود! تو نے مجھ کو کیوں چھوڑ دیا؟

عیسائی حضرات ان جملوں کو حقیقی معنی پر کسی طرح بھی محمول نہیں کر سکتے، ورنہ لازم آئے گا کہ وہی نہ نیک تھے اور نہ مقبول، بلکہ اللہ کے متروک اور نادانی کی باتوں کی وجہ سے رہائی سے دور تھے ان کی دعاء قبول نہیں ہوتی تھی مجرم اور گنہگار تھے۔

لامحالہ یہی کہنا پڑے گا کہ یہ عاجزی اور گڑگڑانا ناسوتی لحاظ سے مخلوقیت اور بندگی کا تقاضا تھا۔

زبور نمبر۵۳ آیت۲ میں ہے:

''خدا نے آسمان پر سے بنی آدم پر نگاہ کی تا کہ دیکھے کہ کوئی دانشمند، کوئی خدا کا طالب ہے یا نہیں؟ وہ سب کے سب پھر گئے ہیں، وہ باہم نجس ہو گئے، کوئی نیکوکار نہیں، ایک بھی نہیں۔''

اور یسعیاہ ب۶۴ آیت ۶ میں ہے اور ہم تو سب کے سب ایسے ہیں جیسے ناپاک چیز اور ہماری تمام راست بازی (ناپاک باس) کی مانند ہے اور ہم سب پتے کی طرح کملا جاتے ہیں، اور ہماری بدکرداری آندھی کی مانند ہم کو اڑا لے جاتی ہے، اور کوئی نہیں جو تیرا نام لے، جو اپنے آپ کو آمادہ کرلے کہ تجھ سے لپٹا رہے، کیونکہ ہماری بدکرداری کے سبب سے تو ہم سے روپوش ہوا، اور ہم کو پگھلا ڈالا۔'' (آیت ۶ و ۷)

اس میں کوئی بھی شک نہیں کہ داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں بکثرت نیک لوگ موجود تھے، مثلاً ناتن پیغمبر وغیرہ، اور اگر ہم یہ تسلیم بھی کرلیں کہ پیغمبر حضرات عیسائیوں کے نزدیک معصوم نہیں ہوتے، مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ زبور مذکور کی آیت

نمبر۴ کے کسی طرح بھی مصداق نہیں ہو سکتے۔(یعنی ان الفاظ کے کہ وہ باہم نجس ہو گئے کوئی نیکوکار نہیں، ایک بھی نہیں۔" (زبور۵۳:۳))

دوسری بات:

انبیاء علیہم السلام کے بہت سے افعال محض امت کی تعلیم وارشاد کے لئے ہوتے ہیں، تاکہ ان کی پیروی کی جائے ورنہ یہ حضرات اپنی ذات کے لئے ان کاموں کے قطعی محتاج نہیں ہوتے۔

چنانچہ انجیل متیٰ باب۴، میں ہے کہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن رات روزے رکھے۔اور چالیس دن اور چالیس رات فاقہ کرکے آخر کو اسے بھوک لگی۔" (متیٰ ۴:۲)

اور انجیل مرقس باب اوّل آیت ۳۵ میں ہے:

اور صبح ہی دن نکلنے سے بہت پہلے وہ اٹھ کر نکلا اور ایک ویران جگہ میں آگیا، اور وہاں دعاء کی۔"

انجیل لوقا باب۵ آیت ۱۶ میں ہے: مگر وہ جنگلوں میں الگ جا کر دعا کیا کرتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ جب عیسیٰؑ مسیحی حضرات کے نزدیک ذاتِ خداوندی کے ساتھ متحد ہیں، تو آپ کو یہ شدید تکالیف برداشت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ماننا پڑے گا کہ یہ سب کام امت کی تعلیم کے لئے کئے جاتے تھے۔

تیسری بات:

جو الفاظ کتب شرعیہ میں استعمال کئے جاتے ہیں، مثلاً نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، نکاح، طلاق، وغیرہ وغیرہ ان کو جب تک کوئی مانع موجود نہ ہو ان کے شرعی معانی پر محمول کرنا ضروری ہے، اس قانون کے تحت جب لفظ گناہ جو ایک شرعی اصطلاح ہے انبیاء علیہم السلام کے حق میں استعمال کیا جائے گا، تو اس کے معانی صرف لغزش کے

ہوں گے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی معصوم ہستی کسی عبادت یا جائز کام کا ارادہ کرے مگر بلا قصد و ارادہ اور بے شعوری سے محض اس بناء پر گناہ میں ملوث ہو جائے کہ وہ عبادت یا جائز فعل کسی گناہ کے ساتھ قریب اور متصل تھا، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک گذرنے والا جس کا مقصود راستہ کو قطع کرنا ہوتا ہے مگر بلا قصد و ارادہ اس کا پاؤں ٹھیک چلتے چلتے کسی کیچڑ یا دلدل میں پھسل جائے، یا کسی ایسے پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر پڑے جو سرِ راہ پڑا ہوا ہو، یا پھر ان بزرگوں کے حق میں گناہ سے مراد یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک ایسا کام کیا جو ان کے شایانِ شان نہ تھا۔

چوتھی بات:

مجاز کا استعمال باری تعالیٰ کے اور انبیاء علیہم السلام کے کلام میں بے شمار ہے۔

نیز کتب مقدسہ میں جابجا کثرت سے مضاف محذوف ہوتا ہے۔

مثلاً زبور ۸۷ آیت ۲۲، یسعیاہ ۱۷:۴ وغیرہ میں مضاف محذوف نہ مانا جائے تو حضرت یعقوب کی توہین لازم آتی ہے۔

پانچویں بات:

دعاء کا مقصد کبھی کچھ مانگنے کی بجائے محض اظہار بندگی ہوتا ہے، مثلاً باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ.

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ہمیں وہ چیزیں عطا کیجئے جن کا آپ نے اپنے رسولوں کی زبانی ہم سے وعدہ فرمایا ہے۔

اس لئے کہ خدا نے جن چیزوں کے دینے کا وعدہ فرما لیا ان کا دینا واجب اور ضروری ہے، لیکن اس کے باوجود ہم کو اس کے مانگنے کا حکم دیا جا رہا ہے یا جس طرح اس آیت میں ہے کہ:

رَبِّ احْکُمْ بِالْحَقِّ.

ترجمہ: اے پروردگار حق کا فیصلہ کیجئے۔
حالانکہ ہم کو یقینی طور پر معلوم ہے کہ باری تعالیٰ ہمیشہ حق کے مطابق ہی فیصلہ اور حکم کرتے ہیں۔

اب جبکہ یہ پانچوں باتیں سمجھ گئے تو سنئے کہ استغفار کے معنی ہیں ''مغفرت طلب کرنا۔'' اور مغفرت کا مطلب ہے کسی قبیح فعل پر پردہ ڈال دینا، اس پردہ کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ اس فعل قبیح سے بچایا جائے، اس لئے کہ جو شخص معصوم ہو گیا یقیناً اس کی قبیح خواہشات پر پردہ پڑ گیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس فعل قبیح کے موجود ہونے کے بعد اس پر پردہ ڈالا جائے۔ لہٰذا اعتراض مذکور پہلی دو آیتوں میں حضور ﷺ کے حق میں مغفرت پہلی صورت کے مطابق ہے۔ (یعنی آپ کی مغفرت کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو گناہوں سے محفوظ رکھا جائے یہ مطلب نہیں کہ پہلے آپ سے گناہ سرزد ہوں اور پھر اسے معاف کیا جائے)۔

اور دوسری آیت میں مؤمنین کے بارے میں دوسری قسم کی مغفرت مراد ہے، دوسری آیت کی تفسیر کے ذیل میں امام فخر الدین رازیؒ فرماتے ہیں کہ:

وفی هذه الآیة لطیفة وهی انّ النبیّ ﷺ له احوال ثلاثة، حال مع الله و حال مع نفسه وحال مع غیره، فامّا مع الله فوحده و امّا مع نفسک فاستغفر لذنبک واطلب العصمة من الله، وامّا مع المؤمنین فاستغفر لهم واطلب الغفران لهم من الله.

ترجمہ: اس آیت میں ایک لطیف بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے تین احوال ہیں، ایک اللہ کے ساتھ دوسرے اپنے نفس کے ساتھ، تیسرے دوسروں کے ساتھ، جہاں تک اللہ کے ساتھ والی حیثیت کا تعلق ہے اس

کے بارے میں اس آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی یکتائی بیان کیجئے، اور اپنے نفس کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ اپنی مغفرت طلب کیجئے، اور اللہ سے اپنے لئے عصمت مانگئے، اور مؤمنین کے لئے ارشاد ہے کہ اللہ سے مغفرت طلب کیجئے۔

اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ دونوں آیتوں میں استغفار کا حکم دینے سے مقصود محض اظہار بندگی اور عبدیت ہے، جیسا کہ آیت رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ اور ربّ احکُمْ بِالْحَقِّ میں ابھی پانچویں بات میں معلوم ہو چکا ہے، یا اس حکم دینے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کی امت میں استغفار کی سنت جاری ہو، لہذا حضور ﷺ کا استغفار محض امت کی تعلیم کے لئے تھا۔

تفسیر جلالین میں دوسری آیت کی تفسیر کے ذیل میں لکھا ہے کہ: قیل له ذلک مع عصمته لیستنّ به امته آپ کے معصوم ہونے کے باوجود آپ سے یہ بات اس لئے کہی گئی ہے کہ امت آپکی اتباع کرے۔

یا یہ کہا جائے کہ دونوں آیتوں میں مضاف محذوف ہے اور پہلی آیت کی تقدیر یہ ہے فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَاللّٰہِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِ اُمَّتِکَ یعنی آپ صبر کیجئے بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور آپؐ اپنی امت کے گناہ کی مغفرت طلب کیجئے، اور دوسری آیت کی تقدیر یوں ہوگی کہ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِ اَهْلِ بَیْتِکَ وَلِذَنْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ الَّذِیْنَ لَیْسُوْا مِنْ اَهْلِ بَیْتِکَ، یعنی جان لیجئے کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور آپؐ اپنے گھر والوں کے گناہ کی مغفرت طلب کیجئے، اور ان مسلمان مردوں اور عورتوں کی مغفرت طلب کیجئے جو آپؐ کے اہل بیت میں سے نہیں ہیں"۔

لہذا مؤمنین و مومنات کا ذکر بھی کچھ مستعبد نہیں ہوگا۔

اور امر چہارم میں یہ بات آپ کو معلوم ہو چکی ہے کہ مضاف کا حذف ہونا

عیسائیوں کی کتابوں میں بکثرت موجود ہے۔

یا دونوں آیتوں میں ذنب سے مراد لغزش یا ترک افضل ہے۔

اعتراض: ہم نے بعض دوستوں سے یہ واقعہ سنا کہ فرقہ پروٹسٹنٹ کے ایک بوڑھے پادری نے اس توجیہہ پر اپنی ایک جدید تالیف میں اعتراض کیا اور کہا کہ ہم مان لیتے ہیں کہ محمد ﷺ سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوا، سوائے ترک اولیٰ کے مگر ترک اولیٰ بھی کلام اللہ کے فیصلہ کے بموجب یعنی توریت وانجیل کے حکم کی بناء پر گناہ ہے اس لئے محمد ﷺ نعوذ باللہ گنہگار ہوئے یعقوبؑ نے اپنے خط کے باب ۴ آیت ۱۷ میں فرمایا ہے کہ:

”پس جو کوئی بھلائی کرنا جانتا ہے اور نہیں کرتا، یہ اس کے لئے گناہ ہے۔“

جواب: اس کے جواب میں سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ یہ اعتراض درحقیقت حد سے زیادہ گذری ہوئی عمر کا تقاضا ہے، اس لئے کہ یہ ایک موٹی سی بات ہے کہ شراب نہ پینا ایک نیک عمل ہے، چنانچہ یحییٰ علیہ السلام نے اس سلسلہ میں جو کچھ فرمایا ہے وہ سب کو معلوم ہے، اسی طرح اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ایک فاحشہ زانیہ رنڈی کو بھرے مجمع میں پاؤں دھونے اور ان کو اپنے سر کے بالوں سے صاف کرنے کی اجازت نہ دینا ایک اچھا فعل تھا، اسی طرح اجنبی اور بیگانی نوجوان عورتوں سے حد سے زیادہ بے تکلفی اور خلاملا نہ رکھنا اور مشرقی شہروں میں ان کو ساتھ ساتھ لئے ہوئے نہ گھومنا ایک نیک عمل تھا، بالخصوص جبکہ بے تکلفی برتنے والا شخص خود بھی ان کی طرح نوجوان اور کنوارا ہو، لیکن اس کے باوجود عیسیٰ علیہ السلام نے یہ نیک عمل نہیں کئے،۔۔۔ یہاں تک کہ مخالفین نے بھی اس سلسلہ میں ان پر طعن کیا۔ لہٰذا ان بوڑھے پادری صاحب کے قول کے بموجب لازم آتا ہے کہ ان کا خدا بھی گنہگار تھا۔

رہی تیسری آیت تو اس میں یا تو مضاف محذوف ہے، یا گناہ سے مراد ترک افضل ہے یا غفران سے مراد عصمت ہے۔

امام سبکیؒ اور ابن عطیہؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مقصد صرف حضور ﷺ کا اعزاز واکرام ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کے شروع میں آپ کی عظمت واحسان کا اظہار فرمایا، چنانچہ پہلے فتح کی بشارت دی، پھر اس فتح کا مقصد اور تکمیل نعمت، صراطِ مستقیم کی ہدایت اور نصر عزیز کو قرار دیا، پھر اگر ایسے موقع پر کسی گناہ کا آپ سے صادر ہونا مان لیا جائے تو یقیناً کلام کی بلاغت میں مخل ہوگا، کیونکہ اس کا مقتضا تکریم و تعظیم ہے، جس طرح ایک آقا جب اپنے کسی خادم سے راضی اور خوش ہوتا ہے تو کبھی اس کے اکرام اور اپنی خوشنودی کے اظہار کے لئے کہا کرتا ہے کہ دیکھو میں نے تمہاری سب اگلی پچھلی خطاؤں کو معاف کیا، میں ان پر کوئی مواخذہ نہیں کروں گا، حالانکہ اس خادم سے کبھی کوئی خطا صادر نہیں ہوئی۔

رہی وہ دعا جو حدیث میں مذکور ہے سو اس کی توجیہ یہ ہے کہ چونکہ حضرت ﷺ خدا کے یہاں ساری مخلوق سے زیادہ بلند مرتبہ تھے، اور خدا کی معرفت میں سب سے زیادہ کامل تھے، اور غیر اللہ کے تصور سے خالی الذہن ہونے کی صورت میں آپ کی حالت پورے طور پر اپنے خدا کی جانب متوجہ ہونے کی تھی جو بمقابلہ دوسرے احوال کے آپ کی بلند ترین حالت ہے، اس لئے آپؐ غیر اللہ کی طرف توجہ کرنے کو خواہ وہ کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہو اپنے لئے نقص اور انحطاط خیال فرماتے تھے، اس لئے آپؐ اس نقص سے مغفرت کے طلبگار رہتے تھے، تاکہ بلند مقام حاصل ہو سکے، لہذا آپؐ کے نزدیک غیر اللہ کے ساتھ یہ ضروری مشغولیت بھی بمنزلہ اس گناہ کے تھی جس سے استغفار کرنا اپنے بلند مرتبہ کے پیشِ نظر ضروری تھا۔

یا پھر یہ بات تھی کہ آپؐ سے اس قسم کی دعاؤں کا صدور محض اظہارِ بندگی، اور عبودیت کے طور پر تھا، بالکل اسی طرح جس طرح عیسیٰ علیہ السلام نے اسی غرض سے اپنی ذات سے نیکی کی نفی کی، اور خطاؤں کا اعتراف فرمایا، اور بارہا ان الفاظ اور عنوان سے دعا مانگی کہ "ہمارے گناہ معاف فرما" اور یہ جملے زبان پر لائے کہ:

ا۔اے میرے معبود! تو نے مجھ کو کیوں چھوڑ دیا؟ (متی ۲۷:۴۶، زبور۲۲:۱)
۲۔تو میری مدد اور نالہ و فریاد سے کیوں دور رہتا ہے؟
۳۔اے میرے خدا! میں دن میں آپ کو پکارتا ہوں پر تو جواب نہیں دیتا، (زبور۲۲:۲)
یا یہ دعاء محض اظہار بندگی کیلئے تھی جیسا کہ پانچویں بات میں معلوم ہو چکا ہے۔
یا پھر تعلیم امت کے لئے تھی۔

یا گناہ سے مراد لغزش اور ترک اولیٰ ہے، جیسا کہ امر سوم میں معلوم ہو چکا، پس بہر صورت یہ اعتراض واقع نہیں ہوسکتا، یہ پانچوں توجیہات سب کی سب یا ان میں کوئی ایک ان تمام احادیث میں بھی جاری ہوسکتی ہیں، جو حدیث مذکور کی طرح ہیں۔

اس تیسری آیت میں جس کو عیسائیوں نے اپنے خیالِ فاسد میں گناہ کے اثبات کے لئے پیش کیا ہے تصریح موجود ہے، یعنی فرمایا: لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ"۔ ترجمہ: تاکہ اللہ آپؐ کے اگلے اور پچھلے (سب) گناہ معاف کردے۔'' پھر اگر محمد ﷺ کے تمام اگلے پچھلے گناہ اس دنیا ہی میں بخش دیئے گئے تو اب کوئی ایسی بات تو باقی نہیں رہی جو دارِ آخرت میں دوسروں کی سفارش کرنے سے مانع ہو، اور اگر تیسری صورت ہے تو یقیناً غلط ہے، اس لئے کہ یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے جب بچھڑے کی پوجا کی تو خدا کا ارادہ ہوا کہ سب کو ہلاک کردے، مگر موسیٰ علیہ السلام نے ان کی سفارش کی، خدا نے اس سفارش کو قبول فرمایا، اور سب کو ہلاک نہیں کیا، جس کی تصریح کتاب خروج باب ۳۲ میں ہے۔

خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ بنی اسرائیل کو لے کر ملک کنعان جائیں، مگر میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا، پھر موسیٰ علیہ السلام نے سفارش کی، اور اللہ نے ان کی سفارش قبول فرمالی۔ اور کہا کہ میں تمہارے ہمراہ جاؤں گا، جس کی تصریح کتاب خروج باب ۳۳ میں ہے، پھر جب بنی اسرائیل نے نافرمانی کی، تو خدا نے دوبارہ ان کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا، تو موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں نے سفارش کی،

خدانے پھران دونوں کی سفارش کوقبول فرمایا، پھر جب انھوں نے دوبارہ نافرمانی کی، تو خدانے ان پر سانپ چھوڑ دیئے جو ان کو کاٹتے اور ڈستے تھے، پھر وہ لوگ موسیٰ کے پاس سفارش کی درخواست لیکر آئے، چنانچہ انھوں نے پھر سفارش کی، اور خدانے ان کی سفارش قبول کی، چنانچہ اس کی تصریح کتاب عدل باب ۲۱ اور باب ۱۶ میں موجود ہے۔

اب کسی قسم کا کوئی استحالہ حضورﷺ کی نسبت شفیع المذنبین ہونے میں باقی نہیں رہا۔ (ترجمہ اظہار الحق جلد ۳ صفحہ ۵۷۲ تا ۵۹۰ ملخصاً)

وَوَجَدَکَ ضَالًّا پر اعتراض

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمدﷺ پہلے گمراہ تھے اور ایمان نہیں رکھتے تھے چنانچہ سورت ضحیٰ میں موجود ہے۔ وَوَجَدَکَ ضَالًّا فَھَدٰی. اور سورت شوریٰ میں ہے۔ مَاکُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا.

جواب: اگر معترض صاحب کوخود اپنی تصوف کی کتابوں سے واقفیت ہوتی تو یہ اعتراض زبان پر نہ لاتے کیونکہ سالکان طریقت کوشروع عمل میں مشکل وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے پھر اللہ کے الطاف اس کوحاصل ہوتے ہیں اسی کوراہ گم کرنے سے قرآن پاک میں تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ فرمایا: وَوَجَدَکَ ضَالًّا فَھَدٰی

اس کی مثال معترض کے مذہب کے تصوف اور حکمت کے بارے میں جوگ بشسٹ کے نام سے مشہور ہے اس کوملاحظہ فرمائیں:

کہ خود راجہ رام چندر نے تاوقتیکہ بشسٹ اور بسوامتر کی شاگردی حاصل نہ کی درجہ کمال کوفائز نہ ہوئے۔ اس راہ میں ان کوکتنی مشکلات پیش آئیں اور وہ ہر طرف دوڑتے تھے اور راہ نہیں پاتے تھے چنانچہ جوگ بسسٹ کے شروع میں یہ حال مفصل لکھا ہوا ہے۔ ہم اس کومختصر طور پر قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں:

راجہ وسرتھ نے رام چندر سے پوچھا کہ پرمیشر کی کرپا سے تم کو عقل سلیم اور علم حکمت میسر ہے اور اس کا نتیجہ سرور بے اندوہ ہے حیف کہ تم کو ان سے غم اور اندوہ جو جاہلوں کو چاہئے عائد حال ہو بشسٹ نے رام چندر سے کہا کہ تم نے اپنے دشمنوں کو اسیر اور فرماں بردار کر لیا ہے پھر کس واسطے غم وفکر کے دریا میں غوطے کھاتے رہو۔ رام چندر بعد تشریح شعاب وصعو بات کہ جس میں اس نے اپنی راہ کو گم کیا ہوا تھا بیان کیا کہ میں اس کے خیالات سے حیران ہوں اور متردد ہوں کہ کیا کروں یہ ہوائیں اڑا دیں گی یا زمین میں گاڑ دیں گی' یا آگ میں جلا دیں گے یا پانی میں ڈبا دیں گے اور جیسے ہوا درخت کے پتوں کو ہلا دیتی ہے ویسے توہمات ہمیشہ ڈراتے ہیں اور جیسے دیوار کا سایہ جہلاء اور اطفال کی کمان میں بھوت اور دیو ہو جاتا ہے بیم اور رجاء اس دل کو پیدا ہو جاتی ہے آپ صاحب کشف وکمال ہیں اور معقول کی منقول سے خبر رکھتے ہیں اور عالم باعمل ہیں ہدایت کرو کہ متقدمین کس طرح سے اپنے مطلب کو پہنچے ہیں کس طرح توہمات کے دریا سے پار ہوئے ہیں تا کہ میں بھی اسی راہ کو تلاش کروں کہ جب تک وہ راہ مجھے نہیں ملتی ہے کوئی کام مجھے اچھا نہیں لگتا۔ انتہیٰ

اگر کوئی شخص راہ گم کرنے اور ہدایت کے چاہنے کے مضامین کا رام چندر پر اعتراض کرے تو اس کی عقل پر اہل عقل کو افسوس ہوگا تو اس طرح سے اگر کوئی حضور علیہ السلام کے بارے میں ان آیات سے استدلال کرے تو وہ اس کی کج فہمی اور شقاوت ہی ہوگی بلکہ یہ راہ گم کرنا جس کا نتیجہ ہدایت عظمیٰ ہو سعادت ہی سعادت ہے خاص انسان اس کی آرزو میں رہتے ہیں۔ شعر:

زلف ہاتھ میں آوے تو پریشانی بھی اچھی
دل آئینہ ہو جاوے تو حیرانی بھی اچھی

اشلوک ۳۸۲ اور ۳۸۳ گیتا سری کرشن کو ملاحظہ کریں لکھا ہے

وہ جو مجھ سے واصل ہے اور صدق دل سے پرستش کرتا ہے اس کے ذہن کو میں رسائی دیتا ہوں جب ذہن کی رسائی سے میری حقیقت کو جان لیتا ہے تب اس کے حال پر رحم کرتا ہوں اور جہل کی ظلمت جو اس کے دل پر ہوتی ہے اس کے دور کرنے کو عقل کا چراغ روشن کرتا ہوں۔ پھر وہ جواں مرد اور ثابت قدم ہو جاتا ہے اور جوہر ذاتی پیدا کرتا ہے۔ انتہیٰ

یہاں مولانا عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تفسیر کو اس آیت کے تحت نقل کرنا بہت مناسب ہے۔ فرماتے ہیں: وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ اور پایا تجھ کو راہ بھولا ہوا پھر راہ بتائی۔

اس ہدایت اور ضلال کا بیان وہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو کمال عقل اور دانائی کے سبب سے معلوم ہوا کہ بتوں کی پوجا اور کفر اور جاہلیت کی رسمیں سب بے اصل ہیں۔ تو دین حق کی تلاش اور کھوج کے درپے ہوئے اور یہ تدبیر سوچی کہ دین ابراہیم کی طرف پورا پورا رجوع کروں لیکن چونکہ دین ابراہیم پر اس وقت کوئی نہ تھا اور نہ کسی کتاب میں یہ دین لکھا ہوا تھا اور نہ آنحضرت ﷺ کتاب پڑھ سکتے تھے۔ لازمی طور پر اس دین کے احکام کے کھوج اور تلاش کرنے میں بے قرار ہو کر تسبیح، تہلیل، تکبیر، اعتکاف وغیرہ ادا کرتے تھے۔ اس وقت اللہ نے ان کو وحی سے پاک دین کی طرف مطلع فرمایا۔ اس وقت ان کی بے قراری جو دین حق کو پانے کے لئے رہتی تھی جاتی رہی گویا اپنی کھوئی ہوئی چیز پالی اور جس راہ پر چلنا چاہتے تھے وہ راہ مل گئی اس سبب سے اس راہ کے پانے کی بے قراری یا بھولنے سے نسبت دی۔ یعنی ضَالًّا فَهَدَىٰ فرمایا۔

(سوط اللہ الجبار ص ۱۷۸ تا ۱۷۹)

حضورؐ کے جنت مانگنے پر شبہ کا جواب

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْجَنَّۃَ وَمَا قَرَّبَ اِلَیْھَا مِنْ قَوْلٍ اَوْعَمَلٍ.

(ترجمہ) اے اللہ میں آپ سے جنت مانگتا ہوں۔ اور پھر وہ چیز مانگتا ہوں جو جنت سے نزدیک کرنے والی ہو۔

قول ہو یا عمل اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی رغبت سے عمل کرنا سب سے ارفع حالت ہے۔ کیونکہ حضور کی یہی حالت تھی۔ تو سمجھ لیجئے کہ ارفع تو وہی حالت ہے کہ محض رضائے محبوب کے لئے عمل کیا جائے۔ رہا حضور کا جنت مانگنا۔ سو اس کے متعلق وہ بات یاد کر لیجئے کہ عاشق کو محبوب کی چیزوں سے بھی محبت ہوا کرتی ہے۔ پس آپ کا جنت مانگنا ویسا نہیں ہے جیسا ہمارا مانگنا ہے۔ ہم تو جنت اس لئے مانگتے ہیں کہ وہاں ہم کو آرام ملے گا۔ حوریں ملیں گی خوب مزے اڑیں گے غرض ہم کو لذت نفس مطلوب ہے۔ اور حضور ﷺ کا جنت مانگنا اس بناء پر تھا۔ کہ وہ خدا کی چیز ہے۔ اور خداتعالیٰ نے آپ کو مانگنے کا امر فرمایا ہے۔ جب محبوب خود چاہے۔ کہ مجھ سے میری چیزیں بھی مانگو تو اس وقت مانگنا ہی موجب رضا ہے۔ اس وقت استغنا مناسب نہیں۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین
خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

اس لئے آپ نے جنت مانگی اور اس سے استغنا نہیں برتا۔ عارف کامل خدا کی ادنیٰ نعمت سے بھی استغنا ظاہر نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ جنت سے جو کہ اصل النعم ہے۔ وہاں کوئی ابن العارض جیسا صاحب حال ہو۔ تو وہ اس سے استغنا ظاہر کر دے اور ایسے لوگ غلبہ حال سے معذور ہوں گے۔ ورنہ معرفت کا مقتضا یہی ہے۔ کہ جیسے محبوب سے رضائے محبوب طلب کی جاتی ہے۔ اس طرح اور جس چیز کا اسے مانگنا پسند ہو۔ وہ بھی مانگے۔ اور یہ بھی درحقیقت طلب رضا ہی ہے۔ کسی دوسری چیز کی طلب نہیں۔

دوسرے حضور ﷺ جنت کا سوال اس بناء پر بھی کرتے تھے۔ کہ وہ محل دیدار ہے۔ تو درحقیقت یہ جنت کا سوال نہ تھا۔ بلکہ محبوب کا سوال تھا۔ اسی کو کہتے ہیں۔

؎ عاشقاں جنت برائے دوست میدارند دوست

اور ایک بات اس سے بھی باریک ہے، وہ یہ کہ بعض دفعہ جنت کی طلب اس نیت سے بھی نہیں ہوئی کہ وہاں محبوب کا دیدار ہوگا۔ بلکہ محض اس خیال سے تمنا کی جاتی ہے۔ کہ ہماری شان تو کہاں جو دیدار کی تمنا کریں۔ تو اگر جائے دیدار ہی کو دیکھ لیں تو بڑی قسمت ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: کہ وہ لوگ بڑے حوصلے کے ہیں جو حضور ﷺ کو خواب میں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں ہم تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ قبۂ خضراء ہی ہمیں نظر آئے۔

مرا از زلف تو موئے بشد است
ہوس را رہ مدہ بوئے بسند است

تو بعض دفعہ غلبہ تواضع طلب جنت کا منشا ہوتا ہے۔ کہ عاشق اپنے کو وصال محبوب کے قابل نہیں سمجھتا۔ اس لئے تمنا کرتا ہے کہ میں اس کو دیکھنے کے تو لائق نہیں کاش اس کے شہر ہی میں جا رہوں۔

اور کبھی اپنی احتیاج و افتقار ظاہر کرنے کے لئے جنت کی طلب کی جاتی ہے کہ اے اللہ میں آپ کی رضا کا محتاج تو کیوں نہ ہوں گا۔ میں تو جنت تک کا بھی محتاج ہوں۔ اس لئے بطور احتیاج کے دعا کی جاتی ہے کہ اے اللہ جنت دے دے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو یہ حال پیش نظر ہوتا تو آپ کھانا کھا کر فرمایا کرتے تھے۔ "الحمد لله الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین غیر مودع ولا مکفور ولا مستغنیٰ عنه ربنا"۔ یعنی اے اللہ اس وقت پیٹ بھر گیا ہے اس لئے کھانے کو اٹھا دیا ہے، ہم اس کو ہمیشہ کیلئے وداع نہیں کرتے۔ نہ اس کی ناقدری کرتے ہیں اور نہ اے اللہ ہمیں اس سے استغناء ہے۔

حقیقت میں آپ کی اداؤں کی یہ حالت ہے کہ

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشید کہ جا اینجاست

آپ کی جس ادا کو بھی دیکھو۔ اس میں غضب کی دلربائی ہے۔ پھر کمال یہ کہ اس میں نہ تصنع نہ تکلف بلکہ ایک ایسا بے ساختہ حال ہے

دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند
دلبر ماست کہ باحسن خداداد آمد

مخالفین نے بھی ان باتوں کو دیکھ کر آپ کی سچائی کی شہادت دی۔ اور ان کو ماننا پڑا کہ حضور میں جس قدر کمالات تھے وہ اصلی تھے۔ تصنع اور بناوٹ کا وہاں نام نہ تھا۔ غرض ایک مبنیٰ طلب جنت کا یہ بھی ہوتا ہے یعنی اظہار احتیاج بس حضور ﷺ کا جنت مانگنا اور ہمارا جنت مانگنا برابر نہیں (اور آپؐ کے سوال کا یہ مطلب نہیں کہ عمل جنت کے واسطے کرنا چاہئے۔ بلکہ اس کا جو منشاء آپ کی شان کے مناسب تھا وہ اپنے علم کے موافق عرض کر دیا) لیکن اگر کوئی شخص جنت ملنے ہی کی نیت سے عمل کرے۔ تو وہ بھی راہِ ثواب پر ہے۔ غلط راستے پر نہیں۔ خدا تعالیٰ سے محبت ہونی چاہئے۔ خواہ بلا واسطہ براہ راست ہو۔ یا جنت کے واسطے سے ہو۔ سب ٹھیک ہے

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف
گر بکشد زہے شرف ور بکشم زہے طرف

یعنی مقصود قرب ہے بس قرب ہونا چاہئے۔ خواہ میں انہیں کھینچ لوں یا وہ مجھے کھینچ لیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ مقصود تو کام چلنا ہے کہ بندہ کو خدا کی اطاعت و ذکر کی توفیق ہو جاوے۔ اب وہ خدا کی براہ راست محبت سے ہوا تو کیا۔ اور جنت کی رغبت سے ہوا تو کیا۔ دونوں راستے ٹھیک ہیں (اور دونوں بڑھیا ہیں گو ایک رفیع ہے، اور ایک ارفع۔ (ذم النسیان ص ۴۸)

حضورؐ کے رحمت کی بنا پر جنت جانے پر شبہ

اعتراض: (بعض کفار کا اعتراض)

کوئی یہ سن کر کہ اعمال کی وجہ سے حضور ﷺ جنت میں نہ جائیں گے یہ نہ سمجھ لے کہ حضورؐ کے اعمال میں کچھ نقصان تھا۔

جواب: بات یہ ہے کہ عمل کی وجہ سے جنت میں جانا یہ اعلیٰ درجہ نہیں ہے بلکہ رحمت کی وجہ سے جانا یہی اعلیٰ درجہ ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ ثمرہ تابع سبب کے ہوتا ہے اگر سبب ناقص ہے تو ثمرہ بھی ناقص ہوگا۔ اگر سبب کامل ہے تو ثمرہ بھی کامل ہوگا ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ خدا کی رحمت کا کتنا ہی حصہ لے لیا جاوے وہ غیر محدود ہی ہوگا۔ غیر متناہی کا نصف بھی غیر محدود ہی ہوگا رحمت حق کا اول تو تجزیہ نہیں ہوسکتا لیکن اگر بالفرض کسی درجہ میں کسی نسبت سے تجزیہ ہو بھی تو وہ بھی غیر متناہی ہوگا۔ کیونکہ اگر اس کو متناہی مانا جائے تو اس سے مجموعہ کا متناہی ہونا لازم آئیگا۔ کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ مرکب متناہی سے بمرات متناہیہ متناہی ہوتا ہے۔ بہرحال نصف وغیرہ بھی غیر متناہی کا غیر متناہی ہوتا ہے۔ اور پہلے میں مقدمہ عرض کر چکا ہوں کہ سبب مسبب کے تابع ہوتا ہے۔ یعنی سبب ناقص تو ثمرہ بھی ناقص اور سبب کامل تو ثمرہ بھی کامل۔

سو حضور ﷺ کا درجہ جنت میں اگر آپؐ کے عمل کی وجہ سے ہوگا تو متناہی ہوگا کیونکہ عمل متناہی ہے۔ اور اگر رحمت کی وجہ سے ہوگا تو غیر متناہی ہوگا۔ کیونکہ رحمت غیر متناہی ہے اس لئے رحمت کیوجہ سے جانا یہی اعلیٰ درجہ ہے۔ غرض آپکا عمل محدود تو ہوگا مگر نعوذ باللہ ناقص نہیں پس عمل کیوجہ سے جنت میں نہ جانے سے لازم نہیں آتا کہ حضور ﷺ کے عمل میں کوئی نقصان ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ آپ سے بڑھ کر کسی کا بھی عمل نہیں حضورؐ کے ہر اعمال ہر طرح کامل ہیں۔ مگر چونکہ رحمت حق کی وجہ سے جنت میں جانا اعلیٰ درجہ ہے اس لئے آپ کے اعمال کو سبب نہیں بنایا گیا دخول جنت کا بلکہ

اعمال تو کسی حال میں بھی دخول جنت کا سبب نہیں ہو سکتے چاہے کیسے ہی کامل ہوں کیونکہ خود اعمال کا کمال بھی تو رحمت حق ہی پر مرتب ہے۔ پس جب اعمال کا کمال بھی اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت کا ثمرہ ہوا تو بندہ کا پھر کیا کمال ہوا جس کی وجہ سے وہ جنت میں داخل کیا جاوے۔ پس کسی کو کیا حق ہے کہ اپنے اعمال پر ناز کرے، خیال تو فرمائیے کہ رسول اللہ ﷺ کا کتنا بڑا درجہ ہے مگر پھر بھی آپؐ یوں فرما رہے ہیں کہ میں بھی جنت میں اپنے اعمال سے نہ جاؤں گا۔ تو پھر ہمارا کیا منہ ہے۔ (وعظ الحیاۃ ص ۱۸)

انبیاء کرام پر موت کی شدت کیوں؟

اعتراض: (بعض کفار کا اعتراض)

حضور ﷺ کو بھی نزع میں بہت شدت ہوئی۔ حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور کی شدت نزع دیکھ کر میں کسی کی سہولت نزع دیکھ کر اس کی تمنا نہیں کرتی۔ اسی طرح بعض اولیاء کو بھی نزع شدید ہوتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اللہ والوں کو حقیقی تعلق تو سوائے ذات حق تعالیٰ کے کسی سے نہیں ہوتا۔ اور اس کا مقتضا یہی ہے کہ سہولت سے جان نکلے۔ مگر بعض حضرات کو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد خلق و تربیت طالبین کی خدمت سپرد ہوتی ہے۔ اور یہ بغیر توجہ الی الخلق کے نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ان کو امر حق سے مخلوق کی طرف توجہ کرنا پڑتی ہے۔ اور اصلاح و ارشاد کے لئے ان سے ایک گونہ تعلق ہو جاتا ہے۔ اور یہ تعلق چونکہ اللہ کے حکم سے ہے اس لئے آخرت سے مانع نہیں ہوتا۔ بلکہ موجب اجر اور سبب ترقی ہے جس سے جس قدر اصلاح و ارشاد کا فیض ہو گا اسی قدر اس کے درجات میں اضافہ ہو گا۔ چونکہ یہ خدمت سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے سپرد کی گئی ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کو مخلوق کے ساتھ یہ تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ اور انبیاء میں بھی ہمارے حضور ﷺ کے سپرد سب سے زیادہ یہ خدمت تھی۔ کیونکہ قیامت تک آنے والی مخلوق کے لئے آپ ہی رسول ہیں آپ کے بعد کوئی دوسرا رسول آنے والا نہیں۔ تو آپ کو سب

سے زیادہ ارشاد واصلاح کی فکر واہتمام تھا۔ اس لئے آپ کو نزع میں شدت زیادہ ہوئی۔ کیونکہ روح کو امت کے ساتھ تعلق تھا۔ اور وصال کے وقت بھی آپ کو ان کا اہتمام تھا۔ مگر یہ تعلق لذیذ اور یہ فکر خوشگوار تھا۔ آپ کے لئے اس میں اجر اور ترقی درجات تھی۔ اس لئے شدت نزع سے جسم کو تو تکلیف ہوئی۔ مگر روح کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ انبیاء کے بعد بعض اولیاء ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے سپرد خدمت ارشاد وتبلیغ ہوتی ہے۔ ان کو بھی نزع میں بوجہ طالبین کی فکر کے شدت ہوتی ہے۔ مگر ان کو انبیاء کے برابر شدت نہیں ہوتی۔ اُلٹی راحت ہوتی ہے۔ (وعظ الظاہرہ صفحہ ۲۲)

کیا عیسیٰ علیہ السلام حضور ﷺ سے افضل تھے

اعتراض: (پادریوں کا اعتراض)

حضور ﷺ کو جب اہل مکہ نے تنگ کیا تو آپ کو مکہ سے مدینہ ہجرت کرنیکا حکم ہوا مگر آسمان پہ نہیں اٹھایا گیا مگر جب عیسیٰ علیہ السلام کو پریشان کیا گیا تو آپ کو آسمان پر اٹھالیا گیا اس سے معلوم ہوا عیسیٰ علیہ السلام آپؐ سے افضل تھے۔

جواب: (الف) ہم اہل اسلام کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے اس فعل میں یہ حکمت تھی کہ آنحضرت ﷺ کو کفار ومشرکین پر غلبہ عطا فرمانا تھا۔ اس غلبہ کی تیاری کیلئے مدینہ منورہ ہجرت کرنیکا حکم ہوا۔ چنانچہ فتح مکہ کے مبارک دن اس غلبہ کا اظہار ہو گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھانے کی یہ حکمت بھی تھی کہ آنحضرت ﷺ کے بعد آپ کو اسلامی غلبہ عطا فرمانا تھا جیسا کہ قرآن مجید کی (سورہ النساء آیت ۱۵۹) سے ظاہر ہوتا ہے۔ نیز آپ کے ہاتھوں دجال کو قتل کرانا بھی مقصود تھا۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت مسیح علیہ السلام کی ہجرت آسمان پر ہوئی۔ پس رب کائنات کی حکمتوں پر اعتراض کرنا کہ فلاں نبی کے ساتھ ایسا کیوں ہوا اور فلاں پیغمبر کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ سراسر جہالت ہے۔

(ب): عیسائیوں کی الہامی اور مذہبی کتابوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یوں مرقوم ہے۔

یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کیا، آپکے ساتھ ٹھٹھے اور مذاق کیئے۔ آپ پر تھوکا، آپ کے سر پر سرکنڈا مارا گیا، آپ کو بہت پریشان کیا آپ کے سر پر کانٹوں کا تاج پہنایا اور آپ کو سولی پر چڑھایا حتیٰ کہ آپ سولی پر وفات پا گئے اس کے بعد قبر میں دفن کیئے گئے، تیسرے دن قبر سے زندہ ہوئے، چالیس دن تک شاگردوں کو نظر آتے اور دکھائی دیتے رہے۔ اور اس کے بعد آسمان پر اٹھائے گئے۔ (دیکھو انجیل متی ابواب ۲۷، ۲۸ انجیل مرقس ابواب ۱۵، ۱۶ انجیل لوقا ابواب ۲۳، ۲۴ انجیل یوحنا ابواب ۱۹، ۲۰ و ۲۱۔ اور رسولوں کے اعمال باب اول آیت ۳)۔

(ج): ہماری کسی کتاب میں یہ مرقوم نہیں کہ جو آسمان پر ہے وہ افضل ہوتا ہے اس سے جو زمین پر یا زمین میں سکونت رکھتا ہو۔ جبکہ ہم اس بات کے قائل ہی نہیں تو معترض کی یہ بات ہمارے نزدیک سوال از آسمان اور جواب از ریسماں کی مصداق ہے۔

عقلمندوں اور دانشوروں کی دنیا میں کسی انسان کا اونچی یا نیچی جگہ پر سکونت اختیار کرنا اسکے افضل یا غیر افضل ہونے کی دلیل نہیں ہوتا بلکہ افضلیت کا دارومدار اور انحصار انسان کے کردار و عمل اور خصلت و عادت پر ہوتا ہے۔ ایسے میں دنیا اس حقیقت کو بخوبی جانتی اور مانتی ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے دشمنوں پر غالب آئے اور بقول مسیحی مذہب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے دشمنوں کے ہاتھوں سولی پر چڑھائے گئے۔ نتیجہ یہ کہ آپ مغلوب ہوئے۔ اب کسی عقلمند سے معترض پوچھ سکتا ہے کہ ان دونوں میں کون افضل ہے؟

بقول مسیحی مذہب سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام وفات پانے اور موت کا مزہ چکھنے کے بعد آسمان پر اٹھائے گئے مگر سیدنا حضرت حنوک علیہ السلام جیتے جی آسمان پر

اٹھائے گئے۔ چنانچہ بائبل کی پہلی کتاب پیدائش باب ۵ آیت ۲۴ میں ان کے متعلق یوں مرقوم ہے۔

''اور حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور وہ غائب ہو گیا کیونکہ خدا نے اسے اٹھالیا''۔

حضرت ایلیاہ علیہ السلام بھی جیتے جی آسمان پر اٹھائے گئے چنانچہ ان کے متعلق اصل الفاظ یہ ہیں کہ

''اور ایلیاہ بگولے میں آسمان پر چلا گیا'' (دیکھو ۲ سلاطین باب ۲ آیت ۱۱)

کوئی عیسائی ان دونوں حضرات انبیاءؑ کے رفع جسمانی اور صعود آسمانی کا انکار نہیں کرسکتا کیونکہ عیسائیوں کی مستند اور معتبر کتاب ''قاموس الکتاب لغات بائبل'' میں بھی یہ اقرار موجود ہے۔

''ایلیاہ نبی بھی زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا۔ (۲ سلاطین ۲-۱۱)

چونکہ حنوک زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا''۔ (تحت ج ۳۳۹)

یہ دونوں نبی حضرت مسیح علیہ السلام سے سینکڑوں سال قبل آسمان پر زندہ موجود تھے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر تھے۔ مسیحی سائل کے قول کے مطابق نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں حضرات انبیاءؑ سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام سے ''افضل'' تھے۔ مگر مسیحی معترض اس بات کو کسی قیمت پر ماننے کے لئے تیار نہیں گویا وہ خود ہی اپنے قول سے منحرف ہو گئے اور اپنے اصول کو پامال کر ڈالا۔ تو ہم اس کچے اعتراض کو کیونکر تسلیم کر لیں؟

تبسم کی سزا کتنی کڑی ہے
غنچوں کو کھل کر مرجھانا پڑا ہے

انجیل لوقا کے پہلے باب کی انیسویں آیت کے بعض الفاظ یوں ہیں:

''فرشتہ نے جواب میں اس سے کہا میں جبرائیل ہوں جو خدا کے حضور

کھڑا رہتا ہوں''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام اللہ رب العزت کے مقرب فرشتہ ہیں اور یہ بات بالکل صحیح اور مسیحی علماء بھی اس بات کے معترف ہیں چنانچہ پادری ایف، ایس خیر اللہ صاحب لکھتے ہیں۔ ''جبرائیل فرشتہ: ایک مقرب فرشتہ''۔

(قاموس الکتاب تحت ج ص ۲۸۹)

اور یہ بات دلیل کی محتاج نہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مسکن آسمان پر ہے۔ جبکہ سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام زمین پر سکونت رکھتے تھے تو اس وقت دونوں میں افضل کون تھا؟

جبکہ موتی پانی کے نیچے اور بلبلا پانی کے اوپر ہوتا ہے، تو دونوں میں افضل کون ہے؟

بقول مسیحی مذہب جبکہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی حیات مبارکہ اور عمر مقدسہ کے ۳۳ سال زمین پر گزارے اور بسر فرمائے تھے اور اس عرصہ میں پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں اونچی اونچی جگہ پر رہتے تھے تو افضل کون تھا؟

اہل عقل اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ ''مکیں کی وجہ سے ''مکان'' کو شرف حاصل ہوتا ہے، نہ کہ ''مکاں'' کی وجہ سے ''مکیں'' کو۔ (مولانا بشیر احمد حسینی)

جب انبیاء غیب دان نہیں تو امت کو کیا دے سکتے ہیں

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

اور جب محمد کے پاس اللہ کے خزانے اور غیب کا علم ہی نہیں، تو محمد عربی انسانیت کو کیا اللہ کا کلام یا خزانہ دے سکتا تھا؟

جواب: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مقدس شاگردوں کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:۔

الف:

''اس نے ان سے کہا ان وقتوں اور میعادوں کا جاننا جنہیں باپ نے

اپنے ہی اختیار میں رکھا ہے تمھارا کام نہیں''۔(اعمال ۱:۷)

ب:

''لیکن اس دن اوراس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر صرف باپ۔'' (متی ۲۴:۳۶)

ان دونوں مقامات سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عالم الغیب نہ تھے کیونکہ آپؑ نے علم قیامت کو صرف باری تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا۔اگر آپؑ عالم الغیب ہوتے تو آپؑ اپنے آپ سے علم قیامت کی نفی نہ فرماتے۔

''یسوع نے اس سے کہا کہ لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے مگرابن آدم کے لیے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں''۔

(متی ۸:۲۰، لوقا۹:۵۸)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس ''اللہ کے خزانے'' تو درکنار بلکہ ''مکان'' بھی نہ تھا اور آپؑ عالم الغیب بھی نہ تھے۔تو اس سے معلوم ہوا کہ معترض نے جو اعتراض آنحضرت ﷺ پر کیا ہے وہی اعتراض حضرت مسیح علیہ السلام پر وارد ہوتا ہے۔(جواب مسلم صفحہ ۱۴۲)

کیا حضورؐ نے چودھویں صدی ہجری میں قیامت آنے کی پیش گوئی کی ہے؟

اعتراض: (عیسائی پادری کا اعتراض)

محمد کی چودھویں صدی میں قیامت کے آنیکی پیش گوئی کیوں پوری نہ ہو سکی۔

جواب: یہ بات جھوٹ، فریب اور بہتان ہے کیونکہ یہ بات قرآن وحدیث میں ہرگز ہرگز اور یقیناً موجود نہیں اگر قرآن وحدیث میں موجود ہے تو پیش کیجئے؟

مسیحؑ کا نزول آسمانی کا وعدہ پورا نہیں ہوا:

البتہ یہ بات یقیناً سچی اور صحیح ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی آمد ثانی کی پیش گوئی یا

جو وعدہ فرمایا تھا وہ پورا نہیں ہوا ملاحظہ کیجئے اور کف افسوس ملیئے:۔

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو یہاں کھڑے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ جب تک ابن آدم کو اس کی بادشاہی میں آتے ہوئے نہ دیکھ لیں گے موت کا مزہ ہرگز نہ چکھیں گے۔'' (متی ۱۶:۲۸، مرقس ۸:۳۸، ۱:۹)

مسیحی کلیسیا کے مایہ ناز رسول پولس آپؑ کے اس فرمان کی بابت لکھتے ہیں :۔''چنانچہ ہم تم سے خداوند کے کلام کے مطابق کہتے ہیں کہ ہم جو زندہ ہیں اور خداوند کے آنے تک باقی رہیں گے سوئے ہوؤں سے ہرگز آگے نہ بڑھیں گے کیونکہ خداوند خود آسمان سے للکار اور مقرب فرشتہ کی آواز اور خدا کے نرسنگے کے ساتھ اتر آئے گا اور پہلے تو وہ مسیح میں موئے جی اٹھیں گے پھر ہم جو زندہ باقی ہونگے ان کے ساتھ بادلوں پر اٹھائے جائیں گے تاکہ ہوا میں خداوند کا استقبال کریں اور اس طرح ہمیشہ خداوند کے ساتھ رہیں گے۔ پس تم ان باتوں سے ایک دوسرے کو تسلی دیا کرو''۔

(ا۔تھسلنیکیوں ۴:۱۵تا۱۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور جناب پولوس کے الفاظ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جب آپؑ دوبارہ دنیا میں نازل ہونگے تو اس وقت آپؑ کے بعض مقدس شاگرد اور جناب پولوس زندہ ہوں گے اور آپؑ کا ہوا میں استقبال کریں گے، مگر آپؑ کا یہ وعدہ یا پیشگوئی پوری نہیں ہوئی۔ کیونکہ آپؑ کے بعض مقدس شاگرد تو درکنار بلکہ تمام مقدس شاگرد اللہ کو پیارے ہو چکے اور جناب پولوس بھی دنیا سے چل بسے ہیں مگر آپؑ اپنی مقرر فرمائی ہوئی مدت میں ابھی تک آسمان سے نازل نہیں ہوئے۔

اگر یہ بات فرض کرلی جائے کہ آپؑ نے یہ پیش گوئی ۳۳ء میں ارشاد فرمائی تھی تو ۲۰۰۰ء ہے مگر یہ پیشین گوئی پوری نہیں ہوئی۔ (جواب مسلم صفحہ ۲۰۵)

(۵)
معجزات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

معجزہ کی تعریف

معجزہ اس امر خارق عادت کو کہتے ہیں کہ جو مدعی نبوت سے سرزد ہو اور خارق عادت وہ فعل ہے کہ جو اسباب پر مبنی نہ ہو اور عادتاً وقوع میں نہ آتا ہو خواہ یہ فعل ہوا پر اڑنا ہو خواہ سیر آدھ سیر پانی سے لشکر کو سیراب کر دینا خواہ درختوں سے کلام کرنا اور ان کو بلانا خواہ مردے کو زندہ کرنا خواہ کوئی کلام ہو۔

اگر چہ آنحضرت ﷺ کے بے شمار معجزات ہیں جن کو ان معتبر لوگوں نے روایت کیا ہے جو تورات و اناجیل کے راویوں سے ہزار درجہ قوی ہیں اور معجزات خود قرآن میں بھی مذکور ہیں پس بعض ناسمجھوں کا یہ کہنا (کہ ہم حدیث کو نہیں مانتے قرآن میں کل معجزات کیوں مذکور نہیں) اور جس طرح ہم عیسائی اناجیل میں معجزات مسیحؑ دکھاتے ہیں تم قرآن میں دکھاؤ) محض دھوکا ہے کیونکہ اول تو قرآن مجید آنحضرت ﷺ کے وقائع عمری کی کوئی تاریخ نہیں کہ اس میں بضمن احوال آنحضرت ﷺ معجزات کا مذکور ہونا بھی ضرورت ہوتا دوم بااین ہمہ بطریق امتنان پھر بھی قرآن میں معجزات مذکور ہیں کما سیظہر لک۔

اور یہ توراۃ و اناجیل اربعہ اصل انجیل و توراۃ موسیٰؑ و عیسیٰؑ پر نازل نہیں بلکہ حسب اقرار علماء اہل کتاب تاریخ اور روز نامچہ ہیں کہ جن میں بہت عرصہ بعد انبیاءؑ اور حضرت مسیحؑ کے احوال کو ابتداء سے انتہاء تک معتبر اور غیر معتبر راویوں نے بلا سند متصل مجہول لوگوں نے نقل کیا ہے بخلاف احادیث صحیحہ کے کہ ان کو نہایت احتیاط اور سند متصل سے جمع کیا ہے پھر ان احادیث کو غیر معتبر اور ان کتب تاریخ کو معتبر کہنا اگر اس لئے ہے کہ ان کتب کو مجازاً توراۃ و انجیل کہتے ہیں کتب احادیث کو قرآن نہیں کہتے تو یہ بچوں کی سی باتیں ہیں۔ لیکن قرآن مجید کا معجزہ تمام معجزات سے افضل ہے۔

(۱) اس لئے کہ اور معجزات ایک لمحہ میں واقع ہوکر پھر محض حکایات ہی حکایات رہ جاتے ہیں پس ان سے جو تصدیق کامل حاصل ہوگی تو خاص ان کو جنہوں نے ان کا مشاہدہ کیا ہے اور باقی سننے والے کی نسبت تو بحکم شنیدہ کے بود مانند دیہ، اویسا اثر نہیں بخشا بلکہ بسا اوقات راویں کا لحاظ کر کے دل میں کچھ اور ہی خیال آجاتا ہے بخلاف قرآن مجید کے کہ یہ معجزہ وقت نزول سے قیامت تک باقی ہے جو ذوق سلیم بھی نہیں رکھتا اور عبارت عربیہ کے لطف سے بھی واقف نہیں وہ بھی مضامین کی خوبی پر عش عش کر جاتا ہے۔ اور جو ایسا ہی کوئی کوڑ مغز اور بھدی سمجھ کا ہو تو اس کا کیا ذکر ہے۔

(۲) اور معجزات سے محض تصدیق نبی کا فائدہ ہوتا ہے بخلاف قرآن کے کہ اس میں دونوں باتیں ہیں تصدیق نبوت اور قانون ہدایت۔

(۳) ہر نبی کو اکثر وہ معجزات عطا ہوتے ہیں کہ جن کا اس زمانہ میں چرچا ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ ؑ کے عہد میں سحر (جادو) کا زور تھا ان کو ید بیضاء۔ اور عصاء ملا کہ جس سے تمام جادوگروں کا ناطقہ بند ہوگیا۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام کے عہد میں جالینوس کی طب کا بڑا چرچا تھا ان کو مردہ زندہ کرنے اور بیمار کو تندرست کرنے کا معجزہ ملا کہ جس سے اطباء عاجز آگئے۔ اور آنحضرت ﷺ کے عہد میں عرب کے لوگ فصاحت و بلاغت اور شعر گوئی میں عجب ید طولیٰ رکھتے تھے اچھے فقروں پر عرب کو وجد آتا تھا پس اس لئے آپ ﷺ کو وہ کتاب ملی کہ جس سے تمام عرب حیرت میں آگئے اور سحر مبین کہنے لگے پس جس طرح بلاغت کو عموماً عرب جانتے تھے اسی طرح اعجاز قرآن بھی عموماً متحقق ہوا بخلاف مریض کو اچھا کرنے اور مردوں کو جلانے کے کیونکہ تحقیقاً اس پر طبیب وغیرہ حذاق ایمان لاسکتے ہیں ورنہ عموماً جہلاء کے پاس کوئی فرق کرنے والی دلیل معجزہ اور نظر بندی میں بجز اپنے اعتقاد کے اور کچھ نہیں۔

(تفسیر حقانی ۱/۱۴۱، ۱۴۲)

کیا آنحضرتؐ کے پاس معجزے نہ تھے

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

عیسائیوں کا ایک اعتراض یہ ہے کہ نبوت کے شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ مدعی نبوت کے ہاتھوں معجزات ظاہر ہوں، حالانکہ محمد ﷺ کے ہاتھ سے کوئی معجزہ ظاہر نہیں ہوا۔

جیسا کہ سورۂ انعام کی مندرجہ ذیل آیت سے معلوم ہوتا ہے: "مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ".
ترجمہ: میرے پاس وہ چیز نہیں ہے جس کی تم جلدی کر رہے ہو فیصلہ تو اللہ ہی کا ہے وہ حق بات بیان کرتا ہے، اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"۔

نیز اسی سورت میں ایک اور آیت بھی اس پر دلالت کرتی ہے:

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا، قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَا اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔

ترجمہ: اور یہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں پختہ قسمیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آ گئی، تو یہ ضرور اس پر ایمان لے آئینگے آپ کہہ دیجئے کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں، اور تمہیں کیا خبر کہ اگر نشانیاں آ گئیں تو (بھی) یہ ایمان نہ لائیں گے"۔

اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا. اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ

بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلاً . اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِى السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلاً.

ترجمہ: اور یہ کہتے ہیں کہ ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے، یہاں تک کہ آپ ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نکال دیں، یا آپ کا کوئی کھجور یا انگور کا باغ ہو، پھر آپ اس کے درمیان سے خوب نہریں نکالیں، یا آپ ہم پر اپنے زعم کے مطابق آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرادیں، یا آپ اللہ اور سارے فرشتوں کو لے آئیں، یا آپ کا ایک سونے کا گھر ہو یا آپ آسمان میں چڑھ جائیں، اور ہم آپ کے چڑھنے پر ایمان نہ لائیں گے تاوقتیکہ آپ ہم پر ایک کتاب نازل نہ کریں، جسے ہم پڑھیں، آپ فرمادیجئے میرا پروردگار پاک ہے میں تو صرف ایک بشر پیغمبر ہوں"۔

پہلا جواب:

یہ تینوں چیزیں جو معترض نے پیش کی ہیں دھوکہ میں ڈالنے والی ہیں، پہلی بات تو اس لئے کہ معجزہ کا صدور ہرگز ہرگز انجیل متعارف کے فیصلہ کے بموجب نبوت کے شرائط میں سے نہیں ہے، اس لئے اس کا صادر نہ ہونا نبی نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتا، انجیل یوحنا باب ۱۰ آیت ۴۱ میں ہے کہ:

"اور بہتیرے اس کے پاس آئے اور کہتے تھے کہ یوحنا (یعنی حضرت یحییٰ) نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا"۔

اور انجیل متی باب ۲۱ آیت ۲۶ میں ہے:

"سب یوحنا کو نبی جانتے ہیں"۔

عربی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۲۵ء میں یہ الفاظ ہیں:

"سب کا گمان یحییٰ کے بارے میں نبی ہونے کا ہے"۔

اور انجیل متیٰ باب ۱۱ میں حضرت یحییٰؑ کے متعلق حضرت مسیحؑ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ وہ نبی سے بھی افضل ہیں۔ کیا ایک نبی دیکھنے کو؟ ہاں میں تم سے کہتا ہوں بلکہ نبی سے بڑے کو"۔ (متیٰ ۱۱:۱) ، حالانکہ یہ انبیاء سے افضل قرار پانے والے یحییٰ علیہ السلام وہ ہیں جن سے عمر بھر کبھی کسی قسم کا معجزہ صادر نہیں ہوا، جس کی بے شمار شہادتیں موجود ہیں، حالانکہ ان کا نبی ہونا عیسائیوں کے یہاں مسلّم ہے۔

دوسری بات بھی قطعی غلط ہے، چنانچہ اس کتاب میں اثبات رسالت محمدیہ میں آپ کے کئی معجزات کا ذکر آچکا ہے، یا ان کی غلط فہمی ہے، یا وہ دوسروں کو دھوکہ میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ پہلی آیت میں اللہ کے قول مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ (جس کی تم جلدی کررہے ہو) سے مراد وہ عذاب ہے جس کا تقاضہ کفار اپنے اس کلام سے کیا کرتے تھے کہ:

فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ .

ترجمہ :- پس تم ہم پر آسمان سے پتھر برساؤ یا (اور) کوئی دردناک عذاب لے کر آؤ"۔

معنی آیت کے یہ ہوئے کہ جس عذاب کا تقاضا اور عجلت مجھ سے چاہتے ہو، اس کا واقع کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے، یقیناً حکم تو صرف خدا کے ساتھ مخصوص ہے، جلد عذاب واقع کرنے یا تاخیر کرنے میں وہ ٹھیک فیصلہ کرتا ہے، تعجیل کا ہو یا تاخیر کا۔

اب حاصل آیت کا یہ ہوا کہ تم پر عذاب ٹھیک اس وقت نازل ہوگا جس وقت خدا کی مرضی اور ارادہ ہوگا، مجھ کو خود کوئی اختیار اس کے جلد یا بدیر نازل کرنے کا نہیں ہے، چنانچہ وہ عذاب (جنگ بدر) میں اور اس کے بعد نازل ہوا، اس آیت سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ آپؐ سے کوئی معجزہ صادر نہیں ہوا۔

دوسری آیت کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے بڑی زوردار قسمیں کھائی تھیں کہ اگر ان کا کوئی فرمائشی اور مطلوبہ معجزہ صادر ہوجائے تو اس پر ضرور ایمان لائیں گے آپ کہ

دیں کہ معجزات تو خدا کے اختیار وقدرت میں ہیں، ان میں سے جو معجزہ چاہتے ہیں اس کو ظاہر کرتے ہیں، اور یہ تم کو معلوم نہیں کہ جب فرمائشی اور مطلوبہ معجزہ صادر ہو جائے گا تب بھی تم ایمان نہیں لاؤ گے، یہ قول اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس معجزے کو اس لئے ظاہر نہیں کیا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے ظاہر ہونے پر بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔

تیسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم آپ کی بات اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک آپ مکہ کی سرزمین سے ایک چشمہ نہ جاری کردیں ،جس کا پانی کبھی خشک نہ ہو، یا آپ کا کوئی ایسا باغ معرضِ وجود میں آجائے جس میں کھجور یا انگور ہوں ، یا آپ اپنے قول کے مطابق آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نازل کردیں، اس سے ان کا اشارہ باری تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف تھا، جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

إِنْ نَشَأْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِنَ السَّمَاءِ.

ترجمہ:- اگر ہم چاہیں تو ان کو زمین میں دھنسا دیں یا ان پر آسمان سے ٹکڑے برسائیں۔"

مزید وہ یہ کہتے تھے کہ آپ اپنے دعوے کی سچائی پر شہادت دینے کیلئے خود اللہ تعالیٰ یا فرشتوں کا ایک لشکر لے آیئے، یا اپنا گھر سونے کا بنا ڈالئے، یا آسمان پر چڑھ کر دکھلایئے، اور ہم محض آپ کے کہنے سے آپ کے آسمان میں جانے کو تسلیم نہ کریں گے، بلکہ ہم پر ایک تحریر نازل ہونی چاہیے، جس میں آپ کی تصدیق کی گئی ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ عبداللہ بن امیہ نے کہا تھا کہ ہم آپ کی بات اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک آپ آسمان تک جانے کے لئے ایک سیڑھی نہ بنائیں، پھر اس پر چڑھیں اور ہم واپسی تک آپ کو دیکھتے رہیں پھر آپ

اس طرح واپس ہوں کہ آپؐ کے پاس ایک کھلا ہوا رقعہ ہو اور ساتھ میں چار فرشتے بھی اتر کر شہادت دیں کہ آپؐ جیسا کہتے ہیں ویسا ہی ہے،

غرض کفار کا مقصد اس مطالبے سے محض اپنے عناد اور ہٹ دھرمی کا اظہار ہے، ورنہ اگر یہ مطلوبہ معجزہ صادر بھی ہو جاتا تو وہ اپنی عادت کے مطابق اس کو بھی جادو کہہ کر انکار کر دیتے، جیسا کہ "وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَاباً فِي قِرْطَاسٍ...... الخ اور وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَاباً مِّنَ السَّمَآءِ...... الخ میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اسی طرح اور بعض آیات سے بھی بظاہر معجزات کی نفی معلوم ہوتی ہے، مگر مقصود سب جگہ مطلوبہ اور فرمائشی معجزات کی نفی ہے، اس نفی سے مطلقاً معجزات کا انکار لازم نہیں آتا (دیکھئے تفسیر ابن کثیر، ص ۶۲ تا ۶۴، جلد ۳ مطبوعہ مصر ۱۳۵۶ھ) کیونکہ انبیاء علیہم السلام پر ہرگز یہ لازم نہیں کہ جس معجزہ کا بھی منکرین مطالبہ کریں وہ ان کو دکھلائیں، بلکہ یہ حضرات ایسی حالت میں جبکہ منکرین کا مطالبہ محض عناد یا امتحان یا استہزاء کے طور پر ہو، ہرگز وہ معجزہ نہیں دکھایا کرتے۔

(ورنہ جہاں تک دوسرے معجزات کا تعلق ہے ان میں سے بعض کا ذکر خود قرآن کریم میں موجود ہے مثلاً: سورۂ قمر میں معجزہ شق قمر کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے قرآن کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگ جب کھلے کھلے معجزات اور واضح دلائل کا مشاہدہ کرنے کے باوجود ایمان نہیں لائے تو اب ان کے معاندانہ مطالبات کو پورا کرنے کا کوئی سوال نہیں، اگر اس طرح کے ہر بیہودہ مطالبہ پر معجزات دکھلائے جاتے رہیں اور یہ ہر مرتبہ انکار کر کے ایک نئے معجزے کا مطالبہ کر دیا کریں تو اسکا نتیجہ سوائے اسکے اور کیا ہوگا کہ پیغمبر کے قیمتی اوقات ضائع ہوں، اور اللہ کے معجزات ایک تماشا بن کر رہ جائیں، کافروں کی پرانی روش کا طویل تجربہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ اگر انکے مطالبات پورے کر دیئے گئے تب بھی وہ یہ کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کریں گے کہ یہ تو جادو ہے چنانچہ پچھلے معجزات کو وہ جادو ہی قرار دیتے رہے جس کا ذکر قرآن کریم

نے کئی جگہ کیا ہے)۔

اس دعوے پر عہد جدید میں بہت سے شواہد اور نظیریں موجود ہیں۔

عہد جدید سے مطلوبہ معجزہ پیش نہ کرنے کے شواہد:

پہلا شاہد:

انجیل مرقس باب ۸ آیت ۱۱ میں ہے:

”پھر فریسی نکل کر اس سے بحث کرنے لگے، اور اسے آزمانے کیلئے اس سے کوئی آسمانی نشان طلب کیا، اس نے اپنی روح میں آہ کھینچ کر کہا اس زمانے کے لوگ کیوں نشان طلب کرتے ہیں؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس زمانے کے لوگوں کو کوئی نشان نہ دیا جائے گا“۔ (آیات ۱۱و۱۲)

ملاحظہ کیجئے کہ فریسیوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے بطور امتحان معجزہ طلب کیا ہے، پھر عیسیٰ نے نہ تو کوئی معجزہ دکھایا، نہ اس وقت کسی سابقہ معجزہ کا حوالہ دیا جو اس سے قبل ان سے صادر ہو چکے تھے، نہ آئندہ دکھانے کا وعدہ کیا، بلکہ ان کا یہ قول کہ ”اس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان نہیں دیا جائے گا۔“ صاف اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ ان سے اس کے بعد کبھی کوئی معجزہ صادر نہیں ہوگا، کیونکہ انکے قول میں اس زمانے کے تمام موجود انسان مراد ہیں۔

دوسرا شاہد:

انجیل لوقا باب ۲۳ آیت ۸ میں ہے:

”ہیرودیس یسوع کو دیکھ بہت خوش ہوا کیونکہ وہ مدت سے اسے دیکھنے کا مشتاق تھا، اس لئے کہ اس نے اس کا حال سنا تھا اور اس کا کوئی معجزہ دیکھنے کا امیدوار تھا، اور وہ اس سے بہتیری باتیں پوچھتا رہا، مگر اس نے اسے کچھ جواب نہ دیا، اور سردار کاہن اور فقیہ کھڑے ہوئے زور شور سے

اس پر الزام لگاتے رہے، پھر ہیرودیس نے اپنے سپاہیوں سمیت اسے ذلیل کیا، اور ٹھٹھوں میں اڑایا، اور چمک دار پوشاک پہنا کر اس کو پیلاطس کے پاس واپس بھیجا۔" (آیات ۸تا۱۱)

دیکھئے! عیسیٰ علیہ السلام نے اس وقت کوئی معجزہ نہیں دکھایا، حالانکہ بادشاہ ہیرودیس یہ امید لے کر آیا تھا کہ ان کا کوئی معجزہ دیکھے، اور غالب یہی ہے کہ اگر وہ کوئی معجزہ دیکھ لیتا تو یہودیوں کی شکایت کے خلاف ان کولا جواب اور ساکت کر دیتا اور نہ خود ان کی تحقیر کرتا، نہ اس کا لشکر یہ حرکت کرتا۔

تیسرا شاہد:

انجیل لوقا باب ۲۲ آیت ۲۳ میں ہے:

"اور جو آدمی یسوع کو پکڑے ہوئے تھے، اس کو ٹھٹھوں میں اڑاتے اور مارتے تھے اور اس کی آنکھیں بند کر کے اس سے پوچھتے تھے کہ نبوت سے بتا تجھے کس نے مارا؟ اور انھوں نے طعنہ سے اور بھی بہت سی باتیں اس کے خلاف کہیں"۔

ظاہر ہے کہ چونکہ ان کا سوال محض استہزاء کے طور پر ہوتا تھا، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

بالکل اسی طرح ہمارے نزدیک بعض ان آیات قرآنیہ سے استدلال کرتے ہوئے جن کے مطالب ہم واضح کر چکے ہیں، پادریوں کا اعتراض انصاف کے خلاف اور ظلم پر محمول ہوگا، اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ میں جا بجا محمد ﷺ کے معجزات کی تصریح موجود ہے، جیسا کہ فصل اوّل میں معلوم ہو چکا ہے، اور قرآن کریم میں بھی بعض مقامات پر اجمالاً ذکر کیا گیا ہے جو درج ذیل ہیں:

قرآنی آیات سے معجزات کا ثبوت

پہلا شاہد:

سورۃ صافات میں ارشاد ہے "وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ" یعنی جب کبھی اللہ کی واضح نشانیوں میں سے جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں جیسے شق القمر وغیرہ، تو یہ لوگ مذاق اڑانے میں مبالغہ کرتے ہیں یا ان میں سے ایک دوسرے سے مذاق اڑانے کا مطالبہ کرتا ہے۔

نیز جلالین میں ہے کہ: "جب وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں جیسے چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، تو مذاق اڑاتے ہیں، اور اس معجزے کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ واضح جادو ہے"۔

دوسرا شاہد:

سورۃ آل عمران میں ہے: كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ. (ترجمہ) اللہ ان لوگوں کو کیسے ہدایت دے جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا، حالانکہ وہ شہادت دے چکے تھے کہ رسول حق ہے اور ان کے پاس بینات آچکی تھیں"۔

تفسیر کشاف میں البینات کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: "اس سے مراد قرآن کریم کے تمام شواہد اور وہ تمام معجزات ہیں جن سے نبوت کا اثبات ہوتا ہے"۔

اور قرآن میں لفظ بینات کا جب موصوف محذوف ہوتا ہے تو یہ عموماً معجزات کے معنی میں ہوتا ہے، اس صورت میں کسی دوسرے معنی میں اس کا استعمال بہت قلیل ہے، اس لئے بغیر کسی قوی قرینہ کے اس معنی پر محمول نہیں کیا جائے گا، چنانچہ سورہ بقرہ میں: وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ، اور سورۃ نساء میں: ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۔ اور سورۃ مائدہ میں: اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ، پھر اسی

سورۃ میں دوسرے مقام پر۔ فَجَآءُوۡهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ اور سورۂ نحل میں: بِالۡبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ اور سورۂ طٰہٰ میں: لَنۡ نُّؤۡثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ اور سورۂ مؤمن میں: وَقَدۡ جَآءَكُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ مِنۡ رَّبِّكُمۡ، اور سورۂ حدید میں: لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ اور سورۂ تغابن میں: ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتۡ تَّاۡتِیۡهِمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ اور اسی طرح بہت سے مواقع پر معجزات ہی کے معنی مراد ہیں۔

تیسرا شاہد:

سورۂ انعام میں ہے کہ: وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوۡ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ۔ (ترجمہ) اور ان لوگوں سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ اور بہتان باندھیں، یا اس کی نشانیوں کی تکذیب کریں، بلاشبہ ظالم لوگ فلاح نہ پائیں گے۔"

تفسیر بیضاوی میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:

(اللہ پر جھوٹ بہتان باندھیں) مثلاً وہ یہ کہتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں یا بتوں کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ خدا کے سامنے ہماری سفارش کریں گے۔

(یا اس کی نشانیوں کی تکذیب کریں) مثلاً وہ قرآن کی تکذیب کرتے تھے اور معجزات کو جھٹلا کر انھیں جادو قرار دیتے تھے، اور اگر چہ وہ جھوٹ بہتان باندھنے اور نشانیوں کی تکذیب دونوں باتوں کے مرتکب تھے، لیکن لفظ "اَوْ" (بمعنی "یا") اس بات پر تنبیہ کرنے کیلئے استعمال کیا گیا ہے کہ ان میں ہر بات انتہائی ظلم ہے۔ (تفسیر البیضاوی ص ۲۵۷ ج اوّل، مطبوعہ مصر ۱۳۵۸ھ)۔

اور کشاف میں ہے کہ: انہوں نے دو متناقض چیزوں کو جمع کیا، ایک طرف خدا کی تکذیب کی، دوسری طرف اس چیز کی تکذیب کی جو حجت و دلیل اور برہان صحیح سے ثابت تھی، کیونکہ ان کا قول تھا کہ اگر خدا کی مرضی ہوتی تو ہم شرک نہ کرتے، اور نہ ہمارے بڑے شرک کے مرتکب ہوتے اور یہ بھی کہتے کہ خدا نے ہم کو شرک کا حکم دیا

ہے، اور کہتے تھے کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں، اور یہ بت خدا کے یہاں ہماری سفارش کریں گے، اور خدا کی طرف بحیرہ

(بحیرہ، مشرکین اس اونٹنی کو کہتے تھے جو پانچ دفعہ بچے جن چکی ہو اور آخری بار اس کے ہاں نر بچہ ہوا ہو، یہ لوگ اس کا کان چیر کر اسے آزاد چھوڑ دیتے تھے اور اس پر سواری کرنے، اس کا دودھ پینے، اسے ذبح کرنے اور اس کا۔۔۔ اون اتار کر استعمال کرنے کو حرام سمجھتے تھے اور سائبہ اس اونٹ کو یا اونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی مَنّت کے پورا ہونے پر پُن کر دیا گیا ہو، اسے بھی حرام سمجھا جاتا تھا، قرآن نے ان سب صورتوں کی تردید کی ہے۔ (مائدہ آیت نمبر ۱۰۳)

اور سائبہ کی حرمت منسوب کرتے، پھر قرآن کو اور معجزات کو جھٹلایا اور ان کا نام سحر اور جادو رکھا، اور رسول پر ایمان نہ لائے۔" (تفسیر الکشاف ص ۱۲ جلد دوم)

اور تفسیر کبیر میں ہے کہ: ان کے خسارے اور نقصان کی دوسری قسم یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کی نشانیوں کو جھٹلایا، یعنی حضور ﷺ کے معجزات میں عیب جوئی اور نکتہ چینی کی، اور قرآن کو واضح معجزہ ماننے سے انکار کیا۔"

(تفسیر کبیر، ص ۲۴ ج ۴)

دوسرا جواب:

عملی معجزات: آنحضرت ﷺ سے جو معجزات صادر ہوئے ان کی تعداد ایک ہزار سے بھی زیادہ ہے، ان میں سے ایک معجزہ معراج بھی ہے۔

(ذیل میں ہم معراج اور چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے دو ایسے معجزات کا ثبوت بیان کر رہے ہیں جن پر کفار کو اکثر بیشتر اعتراض ہوتا رہتا ہے۔ اور ان کے ممکن ہونے کا ثبوت خود ان ہی کی کتابوں سے پیش کر رہے ہیں۔ امداد اللہ)

سر سید کے انکار معجزات کا رد

قرآن مجید میں خود بہت سی جگہ ایسی ہیں کہ جہاں معجزہ کو آیت کے ساتھ تعبیر کیا ہے اس مقام پر آیت قرآنی مراد نہیں ہوسکتی۔

ازانجملہ یہ ہے کہ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً.

ترجمہ: یہ خدا کی اونٹنی تمہارے لئے نشانی (معجزہ) ہے۔

دیکھئے یہاں صاف طور پر فرما دیا کہ یہ اونٹنی آیت ہے اس مقام پر جب سید صاحب سے کچھ بن نہ آیا تو غلط توجیہ کی کہ "قوم ثمود کو جو احکام حضرت صالحؑ نے نسبت ناقہ کے بتائے اس سبب سے (اس پر بھی آیت کا لفظ اطلاق ہوا" انتہیٰ۔ کسی سبب سے ہو مگر یہ تو آپ نے بھی لاچار ہو کر تسلیم کر ہی لیا کہ یہاں آیت کا لفظ ناقہ پر بولا گیا کہ جو نہ آیت قرآنی تھی نہ کوئی حکم رحمانی اور آپ کا یہ قول (کیونکہ وہ اونٹنی فی نفسہ کوئی معجزہ نہ تھی) بالکل غلط ہے کیونکہ وہ اونٹنی بڑا معجزہ حضرت صالحؑ کا تھا کہ جو ان کی دعا سے خود بخود پیدا ہوگئی تھی چنانچہ اس کا بھی ذکر آئے گا۔

ازان جملہ یہ ہے وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ.

ترجمہ: ہم اس لئے نشانیاں نہیں بھیجتے کہ ان کو پہلی امتوں نے جھٹلا دیا تھا۔

دیکھئے اس مقام پر آیات سے قرآن کی یا کسی اور کتاب کی آیتیں مراد ہو نہیں سکتیں چند وجہ سے اول یہ کہ اگر آیات سے معجزات مراد نہ ہوں بلکہ آیات قرآنیہ یا اور احکام جیسا کہ سید صاحب فرماتے ہیں تو لازم آئے کہ خدا تو نے حضرت محمد ﷺ پر نہ کوئی آیتِ قرآنیہ نازل فرمائی نہ کوئی حکم بھیجا اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے۔

(تفسیر حقانی صفحہ ۱۵)

ازان جملہ یہ ہے کہ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ الآیۃ کہ ہم نے موسیٰؑ کو 9 نشانیاں عصاء ید بیضا وغیرہ دیں۔

یہاں بھی احکام مراد نہیں ہو سکتے بلکہ یہاں تو صفت بینات بھی معجزات کی ظاہر کر دی۔

ازانجملہ یہ ہے ذٰلِکَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ. (سورۂ کہف)۔ دیکھئے یہاں اصحابِ کہف کو آیت اللہ کہا ہے۔

ازانجملہ یہ ہے قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْ اٰیَۃً قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ۔ الآ یہ یہاں بھی لفظ آیت زکریا علیہ السلام کے کلام نہ کرنے پر بولا گیا۔ علاوہ اس کے اور بہت سے ایسے مواقع ہیں کہ جہاں لفظ آیت بلکہ بصفتِ بینات معجزات پر بولا گیا ہے۔ سید صاحب اگر آپ کو قرآن پر آگاہی نہ تھی تو کیوں اتنا بڑا دعویٰ کر بیٹھے کہ قرآن میں لفظ آیت کا سوائے احکام یا آیات قرآنیہ کے اور کسی پر اطلاق نہیں ہوا ہے۔ افسوس آپ کو یہ خیال نہ آیا کہ اہل علم میری بے اصل باتوں پر ہنسیں گے؟ اب یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ آیات کا اطلاق معجزہ پر بھی ہوتا ہے اور جو اس کا انکار کرتا ہے وہ محض جاہل ہے۔ (مقدمہ تفسیر حقانی ۱/۱۷)

معجزہ نمبر ا۔ معراج

سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیَاتِنَا.

(ترجمہ) پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجد اقصیٰ لے گئی جس کے ارد گرد ہم نے برکتیں نازل کی ہیں، تا کہ ہم اسے اپنی نشانیوں میں سے کچھ دکھائیں"۔

یہ آیت اور دوسری صحیح احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ حضور ﷺ کو بحالت بیداری معراج جسمانی ہوئی، حدیثوں سے تو بہت ہی واضح طور پر دلالت

ہوتی ہے، نیز آیت شریفہ میں لفظ "عبد" ایسا لفظ ہے جو قطعی طور پر معراج کے جسمانی ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ اس کا استعمال جسم وروح کے مجموعے کے لئے ہوتا ہے، جیسا کہ آیت ذیل میں ہے:

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی.

(ترجمہ) کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندے کو نماز پڑھتے وقت روکتا ہے۔

نیز سورۂ جن میں فرمایا:

وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ کَادُوْا یَکُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا.

(ترجمہ) اور یہ جب کھڑا ہوا اللہ کا بندہ کہ اس کو پکارے، لوگوں کو بندھنے لگتا ہے اس پر ٹھٹھا۔ (سورۂ جن)

بلاشبہ دونوں آیتوں میں عبد (بندہ) کا مصداق جسم اور روح دونوں کا مجموعہ ہے اس طرح یہاں بھی یہی مراد ہوگا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ کافروں نے اس واقعے کو مستبعد قرار دیا اور انکار کیا، اور بعض کمزور عقیدے کے مسلمان بھی اس کو سن کر مرتد ہو گئے، اب اگر یہ معراج جسمانی نہ تھی، اور بیداری میں بھی نہیں ہوئی تھی، تو ان کے مستبعد قرار دینے اور انکار کرنے کی کوئی وجہ اور کمزور اعتقاد والے مسلمانوں کے مرتد ہونے اور فتنے میں پڑنے کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا، کیونکہ خواب میں اس قسم کے واقعات کا دیکھنا کسی کے نزدیک بھی محال نہیں ہے، اور نہ ایسے خوابوں کو کوئی مستبعد سمجھتا ہے، نہ انکار کرتا ہے، مثلاً کوئی شخص دعویٰ کرے کہ میں نے خواب میں اپنی جگہ لیٹے لیٹے ایک بار مشرق کا اور دوبارہ مغرب کا چکر لگایا ہے، اور میری کسی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، تو اس خواب کو نہ کوئی مستبعد قرار دے گا، اور نہ انکار کرے گا، نہ اس میں عقلی یا نقلی طور پر کوئی استحالہ پایا جاتا ہے۔

عقلاً تو اس لئے کہ عالم کا پیدا کرنے والا ہر ممکن شے پر قادر ہے، اور حضور ﷺ کے جسم مبارک میں اتنی تیز حرکت کا پیدا ہو جانا ممکن ہے۔ جوں جوں سائنس ترقی کرتی جاتی ہے اس حقیقت کا مزید انکشاف ہوتا جاتا ہے حال ہی میں ایک خلائی مسافر مصنوعی سیارے کے ذریعے خلا میں پہنچا تھا تو اس نے خلا کے سہارے صرف بیس منٹ میں پوری دنیا کا چکر لگایا تھا اور جدید سائنس دانوں کا تو یہ کہنا ہے کہ تیز رفتاری ایک ایسی صفت ہے جس کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ لہٰذا اس پر خدا کا قادر ہونا ممکن ہوا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسا ہونا خلافِ عادت ہے، مگر یہ ہمارے حق میں مفید ہوگا، کیونکہ معجزات انہی کاموں کو کہا جاتا ہے جو عادت کے خلاف صادر ہوں۔

اور نقلی طور پر اس لئے کہ جسم عنصری کا آسمانوں تک چڑھ جانا اہل کتاب کے نزدیک محال نہیں ہے۔

معراج جسمانی کے بارے میں ولیم اسمتھ کی رائے:

پادری ولیم اسمتھ اپنی کتاب طریق الاولیاء میں حضرت حنوک علیہ السلام کے حالات بیان کرتے ہوئے جو مسیح علیہ السلام کی ولادت سے تین ہزار تین سو بیاسی سال قبل گذرے ہیں، یہ کہتا ہے:

> ''اللہ نے ان کو آسمان پر زندہ اٹھالیا، تاکہ وہ موت کو نہ دیکھیں، جیسا کہ لکھا ہے کہ وہ گم ہو گئے، کیونکہ ان کو خدا نے زمین سے آسمان کی طرف منتقل کر دیا، پس انہوں نے دنیا کو بغیر بیماری یا درد و تکلیف اور موت کے چھوڑ دیا، اور جسم سمیت آسمانی بادشاہت میں داخل ہو گئے۔''

عروج آسمانی بائبل کی نظر میں:

اور کتاب سلاطین ثانی باب ۲ آیت ا میں ہے:

''اور جب خداوند ایلیاہ کو بگولے میں آسمان پر اٹھا لینے کو تھا تو ایسا ہوا کہ ایلیاہ الیشع کو ساتھ لیکر جلجال سے چلا (آیت ۱۱)
اور وہ آگے چلتے اور باتیں کرتے جاتے تھے، کہ دیکھو ایک آتشی رتھ اور آتشی گھوڑوں نے ان دونوں کو جدا کر دیا، اور ایلیاہ بگولے میں آسمان پر چلا گیا''۔
مشہور مفسّرِ بائبل آدم کلارک اس مقام کی شرح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:
''بلاشبہ ایلیاہ زندہ آسمان پر چڑھائے گئے''۔
اور انجیل مرقس باب ۱۶ آیت ۱۹ میں ہے:
''غرض خداوند یسوع ان سے ۔۔۔کلام کرنے کے بعد آسمان پر اٹھا لیا گیا، اور خدا کی داہنی جانب بٹھایا گیا''۔

یہ تمام چیزیں عیسائیوں کو تسلیم ہیں، اس لئے عیسائیوں کی مجال نہیں ہے کہ وہ عقلاً یا نقلاً کسی طریقے سے حضور ﷺ کی معراج پر لب کشائی یا اعتراض کر سکیں۔

البتہ خود عیسائیوں پر یہ سخت اعتراض واقع ہوگا کہ جدید ہیئت کے فیصلے کے مطابق آسمانوں کا کوئی وجود ثابت نہیں ہے، پھر یہ بات کیسے صحیح اور درست مانی جا سکتی ہے کہ ایلیاہؑ اور حنوکؑ یا مسیح علیہ السلام آسمان پر چڑھائے گئے؟ اور مسیحؑ خدا کے دائیں جانب بیٹھے، اور ان کا مقدس تیسرے آسمان اور فردوس کی طرف اُچک لیا گیا۔

بعض دوستوں نے بیان کیا کہ بنارس کے ایک پادری نے کسی مجمع میں مسلمان دیہاتیوں کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگ معراج کے کیونکر معتقد ہو جبکہ یہ بات مستبعد ہے، جس کا جواب ایک ہندوستانی مجوسی نے یہ دیا کہ معراج کا معاملہ اس قدر مستبعد نہیں ہے جس قدر ایک کنواری لڑکی کا بغیر شوہر کے حاملہ ہو جانا مستبعد ہے، اب اگر کسی فعل کا مستبعد ہونا، اس کے غلط اور کاذب ہونے کو مستلزم ہے تو یہ بھی جھوٹ اور غلط ہوگا، پھر ایسی صورت میں عیسائی اس کے کس طرح معتقد ہیں؟ اس جواب پر پادری حیران اور لاجواب ہوگیا۔ (اظہار الحق ترجمہ جلد ۳ صفحہ ۱۱۵ تا ۱۲۱ مختصراً)

کیا کوئی آسمان پر جا سکتا ہے

اعتراض: (بیں برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

افسانۂ معراج محالات عقلی میں سے ہے۔

جواب: استحالۂ عقلی پر برہان عقلی قائم کرنا واجب ہے۔ ورنہ معترض کا یہ مقالہ کمال بے عقلی ہے۔

(۱) ارجن جی کا اوپر کو آسمان پر جانا اور پھر جنت میں اسلحہ کے ساتھ جانا اور بھاری چیزیں ساتھ لے جانا بن پرب سوم مہابھارت میں موجود ہے۔

(۲) اور مہابھارت فصل موچھادھرم میں لکھا ہے کہ برہمن نے تھوڑے سے وقت میں تمام ملک اور جہان کی سیر کی اور ایک دفعہ خود سورج میں اپنا وطن بنایا۔

(۳) اور ایک فصل میں مہابھارت میں لکھا ہے کہ سکھ دیومن نے آکاس کی سیر کرتے ہوئے چشمہ گنگ جو ہوا میں جاری ہے، طے کرتے ہوئے خالق کائنات کے پاس پہنچ گیا۔

(۴) اور آدپرب میں لکھا ہے ایک برہمن تھا جس کا نام کیکم تھا اگر وہ آسمان پر جانے کا ارادہ کرتا تو چلا جاتا تھا۔

(۵) اور دھرم پرب میں لکھا ہے کہ اندر دیوتا نے گوتم بدھ کو ہاتھی سمیت آسمان پر اٹھالیا تھا۔ انتہی

یہ ساری باتیں محالات عقلی میں سے ہیں یا نہیں ہیں ان کے سامنے معراج کا قصہ کیوں محال ہے؟ (سوط اللہ الجبار ص ۲۲۱)

حضورؐ نے ایک رات میں سب آسمانوں کی سیر کیسے کرلی تھی؟

اعتراض: (عیسائیوں اور ہندوؤں کا اعتراض)

جو لوگ حضور ﷺ کے معراج صوری یعنی عروج آسمانی کا انکار کرتے ہیں

اور اس معراج کو منامی یا کشفی بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ اتنی جلدی سیر سمٰوٰت سے فارغ ہو کر واپس آگئے کہ صبح بھی نہ ہونے پائی تھی یہ محالات سے ہے کہ مکہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے ساتوں آسمان تک آپ سیر کر آئیں۔ اور یہ سارا قصہ ایک رات کے تھوڑے سے حصہ میں ہو جائے۔

پہلا جواب:

ہم کہتے ہیں کہ اس میں استحالہ کی کیا بات ہے ہاں استبعاد ہو سکتا ہے۔ سو وہ بھی بطور الزام کے اس طرح مدفوع ہے کہ تمہارے نزدیک زمانہ حرکت فلک الافلاک کا نام ہے چنانچہ رات اور دن کا آنا، طلوع وغروب کا ہونا یہ سب حرکت فلک سے مرتبط ہے۔ اگر حرکت فلک موقوف ہو جائے تو جو وقت موجود ہوگا وہی رہے گا۔ اگر رات موجود ہوگی تو رات ہی رہے گی، دن موجود ہوگا، دن ہی رہے گا تو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے اس رات حرکت فلک کو تھوڑی دیر کیلئے موقوف کر دیا ہو اور اس میں کچھ تعجب ہی نہیں، معزز مہمان کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے دنیا میں بھی یہ قاعدہ ہے جب بادشاہ کی سواری نکلتی ہے تو سڑک پر دوسروں کا چلنا بند کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے اگر آسمان اور چاند و سورج سب کی حرکت کو اس رات کچھ دیر کے لئے بند کر دیا ہو کہ جو چیز جہاں ہے وہیں رہے کوئی بھی اپنی جگہ سے ملنے نہ پایا، اس میں کیا استبعاد ہے، جب حضور ﷺ معراج سے فارغ ہو گئے تو فلک کو حرکت کی اجازت ہوگئی۔ تو اب ظاہر ہے کہ حرکت فلک جس جگہ سے موقوف ہوئی تھی وہیں سے شروع ہوگی، تو آپ کی سیر میں چاہے کتنا ہی وقت صرف ہوا ہو مگر دنیا والوں کے اعتبار سے سارا قصہ ایک ہی رات میں ہوا، کیونکہ حرکت زمانہ اس وقت موقوف ہو چکی تھی۔ اب اگر کوئی دوام حرکت فلک کا دعویٰ کرے تو وہ اس کے لازم ہونے کو ثابت کرے۔ انشاء اللہ ایک دلیل بھی قائم نہ کر سکے گا۔

دوسرا جواب:

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خیال انسانی ذرا سی دیر میں بہت دور پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ آپ اسی وقت عرش کا تصور کیجئے تو ایک منٹ سے بھی کم میں عرش پر خیال پہنچ جائے گا۔ خیال کی حرکت بہت سریع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خیال روح کی ایک قوت ہے۔ اور روح نہایت لطیف چیز ہے وہ مادیات کی طرح کثیف نہیں ہے۔ اس لئے اس کی سیر میں کوئی مانع نہیں ہوتا۔ تو مولانا نظامی فرماتے ہیں۔

تن اوصافی تراز جان ما است
اگر آمدو شد بیک دم رواست

حضور ﷺ کا بدن مبارک تو ہمارے خیال سے بھی پاکیزہ تر ہے۔ جب خیال ذرا سی دیر میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے تو آپ کا جسم اطہر زمین سے آسمان تک اور وہاں سے عرش تک ذرا سی دیر میں ہو آئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

اشکال

ایک دلیل عقلی فلاسفہ پیش کیا کرتے ہیں کہ ہوا کے طبقہ سے اوپر جو خلا ہے اس میں ہوا نہ ہونے کے سبب کوئی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا۔ تو آپ اس میں سے گذرتے تو زندہ کیسے رہتے۔

جواب

مگر انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ بعد تسلیم اس استلزام کے یہ اس وقت ہے جب متنفس کو اس میں کچھ مکث بھی ہو۔ چنانچہ آگ کے اندر سے اگر جلدی جلدی ہاتھ نکالا جائے تو آگ کا اثر نہیں ہوتا پس آپ اگر نہایت سرعت کے ساتھ اس خلا میں سے گذر جائیں تو وہ عدم تنفس میں مؤثر نہ ہوگا۔

دوسرا اشکال

اور دلیل نقلی ان منکرین کے پاس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول

ہے واللہ مافقد جسد محمد ﷺ فی لیلۃ الاسراء کہ بخدا شب معراج میں حضور ﷺ کا جسم مفقود یعنی غائب نہیں ہوا۔

جواب

اس کا جواب بعض لوگوں نے تو یہ دیا ہے کہ بخدا حضرت عائشہؓ اس وقت حضور ﷺ کے گھر میں کہاں تھیں (نیز ان کی عمر اس وقت بہت ہی کم تھی شاید چار پانچ سال کی ہوں۔ اور اگر معراج ۵ھ نبوت میں ہوئی ہو جیسا کہ زہری کا قول ہے تو وہ اسی سال پیدا ہوئی ہوں گی، جامع)۔

اس لئے اکابر صحابہ کی روایت اس واقعہ میں ان کی روایت سے مقدم ہے۔

اشکال

مگر اس کا حاصل بظاہر یہ ہوا کہ حضرت عائشہؓ نے بے تحقیق ایک بات فرمادی۔ ہم حضرت صدیقہؓ پر یہ گمان نہیں کرسکتے نہ کسی صاحب ادب کو ایسی جرأت ہوسکتی ہے۔ یہ مانا کہ اس وقت وہ حضورؐ کے گھر میں موجود نہ تھیں اور کمسن بھی تھیں، مگر جو بات وہ فرمارہی ہیں وہ تو عقل و بلوغ کے زمانہ میں ان سے صادر ہوئی ہے۔ اور وہ ایسے وقت میں بغیر تحقیق کے کوئی بات نہیں فرماسکتیں یقیناً تحقیق کے بعد فرمارہی ہیں۔

جواب:

ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے واقعہ کی نسبت فرماتی ہوں۔ کیونکہ معراج کئی دفعہ ہوئی تو پھر کچھ بھی مضر نہیں۔ میرے ذہن میں اس کا جو جواب آیا ہے وہ بہت لطیف ہے۔ وہ یہ کہ فقدان کے دو معنیٰ ہیں ایک تو چیز کا اپنی جگہ سے گم ہوجانا، ہٹ جانا۔ دوسرے تلاش کرنا چنانچہ دوسرے معنیٰ میں فقدان کا استعمال قرآن میں بھی آیا ہے۔

قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَیْهِمْ مَّا ذَا تَفْقِدُوْنَ: یعنی برادران یوسف علیہ السلام نے متوجہ ہوکر ندا کرنے والوں سے کہا کہ تم کس چیز کو تلاش کرتے ہو، یہاں فقدان کے معنیٰ طلب ہی کے ساتھ زیادہ ظاہر ہیں۔ پس حضرت عائشہؓ کے اس اشارہ کا مطلب

صاف ہے کہ حضور ﷺ اتنی دیر تک گھر سے غائب نہیں رہے کہ آپ کی تلاش کی جاتی۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ساری رات اپنے گھر سے جدا ہی نہیں ہوئے وہیں رہے تاکہ اس سے منامی معراج یا کشفی پر استدلال کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ گھر سے جدا تو ہوئے مگر زیادہ دیر نہیں لگی جس سے گھر والوں کو پریشانی ہوئی ہو اور تلاش کی نوبت آئی ہو۔

(اور اگر فقدان کے وہی معنٰی لئے جائیں جو متبادر ہیں کہ حضور ﷺ کا جسم شب معراج میں گم نہیں ہوا تب بھی اس سے معراج کا روحانی یا منامی ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضورؐ اپنے گھر سے اس رات جدا ہی نہیں ہوئے کیونکہ فقدان فعل متعدی ہے نہ کہ لازم اس کے معنٰی غیبت اور انفصال کے نہیں بلکہ گم کرنے کے ہیں جس کے لئے ایک کا فاقد اور دوسرے کا مفقود ہونا ضروری ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ حضور ﷺ کو اس رات کسی نے گھر سے غائب اور گم نہیں پایا اور یہ درست ہے کیونکہ آپ سب گھر والوں کے ساتھ گھر میں سوئے تھے۔ اور معراج ایسے وقت ہوئی جو کہ عادتاً لوگوں کے گہری نیند سونے کا وقت ہے، پھر جاگنے کے وقت سے پہلے آپ واپس تشریف لے آئے۔ بلکہ خود آکر اپنے گھر والوں کو جگایا نمازِ صبح کے لئے، تو ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے رات کو جاگ کر حضور ﷺ کو گھر میں نہ دیکھا ہو۔ اور اتنی بات مفقود ہونے کے لئے ضروری ہے۔

غرضُ اس میں شک نہیں کہ حضور ﷺ کو معراج جسمانی ہوئی اور آپ اس جسم سے آسمانوں پر تشریف لے گئے اس کا انکار ہرگز نہیں ہو سکتا اور یقیناً یہ صورت عروج حضورؐ کا بہت بڑا کمال ہے (وعظ الرفع والوضع ص ۳۴)

واقعہ معراج کے متعلق ایک غیر مسلم عیسائی عالم کی شہادت:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حافظ ابو نعیم اصبہانی نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں محمد

ابن عمر واقدی کی سند سے بروایت محمد بن کعب قرظی یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شاہ روم قیصر کے پاس اپنا نامہ مبارک دیکر حضرت دحیہ ابن خلیفہؓ کو بھیجا اس کے بعد حضرت دحیہؓ کے خط پہنچانے اور شاہ روم تک پہنچنے اور اس کے صاحب عقل وفراست ہونے کا تفصیلی واقعہ بیان کیا۔ جو صحیح بخاری اور حدیث کی سب معتبر کتب میں موجود ہے جس کے آخر میں ہے کہ شاہِ روم ہرقل نے نامہ مبارک پڑھنے کے بعد آنحضرت ﷺ کے حالات کی تحقیق کرنے کے لئے عرب کے ان لوگوں کو جمع کیا جو اس وقت ان کے ملک میں بغرض تجارت آئے ہوئے تھے شاہی حکم کے مطابق ابوسفیان ابن حرب اور ان کے رفقاء جو اس وقت مشہور تجارتی قافلہ لے کر شام میں آئے ہوئے تھے وہ حاضر کئے گئے شاہ ہرقل نے ان سے وہ سوالات کئے جن کی تفصیل صحیح بخاری ومسلم وغیرہ میں موجود ہے ابوسفیان کی دلی خواہش یہ تھی کہ وہ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے متعلق کچھ ایسی باتیں بیان کرے جن سے آپ کی حقارت اور بے حیثیت ہونا ظاہر ہو مگر ابوسفیان کہتے ہیں کہ مجھے اپنے اس ارادے سے کوئی چیز اس کے سوا منع نہیں تھی کہ مبادا میری زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس کا جھوٹ ہونا کھل جائے اور میں بادشاہ کی نظر سے گر جاؤں اور میرے ساتھی بھی ہمیشہ مجھے جھوٹا ہونے کا طعنہ دیا کریں، البتہ مجھے اس وقت خیال آیا کہ اس کے سامنے واقعہ معراج بیان کروں جس کا جھوٹ ہونا بادشاہ خود سمجھ لے گا۔ تو میں نے کہا کہ میں ان کا ایک معاملہ آپ سے بیان کرتا ہوں جس کے متعلق آپ خود معلوم کرلیں گے کہ وہ جھوٹ ہے۔ ہرقل نے پوچھا کہ وہ کیا واقعہ ہے ابوسفیان نے کہا کہ مدعی نبوت یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک رات میں مکہ مکرمہ سے نکلے اور آپ کی اس مسجد بیت المقدس میں پہنچے اور پھر اسی رات میں صبح سے پہلے مکہ مکرمہ میں ہمارے پاس پہنچ گئے۔

ایلیاء (بیت المقدس) کا سب سے بڑا عالم اس وقت شاہ روم ہرقل کے سرہانے کے قریب کھڑا ہوا تھا اس نے بیان کیا کہ میں اس رات سے واقف ہوں۔

شاہ روم اس کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ آپ کو اس کا علم کیسے اور کیوں کر ہوا اس نے عرض کیا کہ میری عادت تھی کہ میں رات کو اس وقت تک سوتا نہیں تھا۔ جب تک بیت المقدس کے تمام دروازے بند نہ کردوں۔ اس رات میں نے حسب عادت تمام دروازے بند کردئے مگر ایک دروازہ مجھ سے بند نہ ہوسکا تو میں نے اپنے عملہ کے لوگوں کو بلایا انھوں نے مل کر کوشش کی مگر وہ ان سے بھی بند نہ ہوسکا دروازے کے کواڑ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرسکے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہم کسی پہاڑ کو ہلا رہے ہیں میں نے عاجز ہوکر کاریگروں اور نجاروں کو بلوایا، انھوں نے دیکھ کر کہا کہ ان کواڑوں کے اوپر دروازے کی عمارت کا بوجھ پڑگیا ہے اب صبح سے پہلے اس کے بند ہونیکی کوئی تدبیر نہیں صبح کو ہم دیکھیں گے کہ کس طرح کیا جائے۔ میں مجبور ہوکر لوٹ آیا اور دونوں کواڑ اس دروازے کے کھلے رہے صبح ہوتے ہی میں پھر اس دروازے پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ دروازہ مسجد کے پاس ایک پتھر کی چٹان میں روزن کیا ہوا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کوئی جانور باندھ دیا گیا ہے اس وقت میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ آج اس دروازہ کو اللہ تعالیٰ نے شاید اس لئے بند ہونے سے روکا ہے کہ کوئی نبی یہاں آنے والے تھے اور پھر بیان کیا کہ اس رات آپ نے ہماری مسجد میں نماز بھی پڑھی ہے اس کے بعد اور تفصیلات بیان کی ہیں۔ (ابن کثیر ص ۲۴ ج ۳)

کیا انسان کا عروج آسمان کی طرف ممکن ہے

اعتراض: جسم عنصری کا تھوڑی سی دیر میں مسجد اقصیٰ پہنچنا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آسمانوں پر جانا اور آسمانوں سے گزرنا عرش تک جانا اور وہاں باوجود اس جسم عنصری کے روحانیات محضہ سے ملنا جنت و دوزخ کو دیکھنا عقلاً ممنوع ہے حکماء نے اس کے محال ہونے پر اور آسمان کے خرق والتیام کے محال ہونے پر دلائل قائم کئے ہیں اور نیز کوئی اہل ادیان حقہ یعنی عیسائی ایسی باتوں کا قائل نہیں اسی لئے آج کل

کے فلسفی مسلمان بلکہ کچھ اگلے زمانہ کے بھی جن کو معتزلہ کہتے تھے اس معراج کو خواب پر محمول کرتے ہیں عائشہؓ اور معاویہؓ کے قول سے ان اعتراضات کے بچنے کے لئے۔

جواب : جسم عنصری کا ایسی حرکت سریع کرنا۔ جبکہ اس کی عنصریت روحانیت سے بھی لطافت میں بڑھ جائے کچھ بھی محال نہیں آج کل ریل اور تار برقی کی حرکت کو ملاحظہ کر لیجئے اور اسی طرح آسمانوں کا خرق والتیام جن خیالات فاسدہ سے محال ثابت کیا تھا ان کی پوری پوری حکماء اسلام نے علم کلام میں قلعی کھول دی ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ وہ حکماء یونان اپنے عقلی ڈھکوسلوں سے زمین و آسمان کے قلابے ملایا کرتے تھے جن کے مسائل طبیعیات و ہیئت کی آج کل حکماء یورپ کیسی خاک اڑا رہے ہیں اور جو کوئی ملحد عیسائی ایسی باتوں کا قائل نہیں تو کیا ہوا پر جو انا جیل اور بائبل کو مانتے ہیں ان پر ان باتوں کا تسلیم کرنا ضروری ہے۔ دیکھے انجیل مرقس کے سولہویں باب انیسویں ورس میں یہ ہے یعنی مسیح خداوند لوگوں سے کلام کرنے کے بعد آسمان کی طرف چڑھ گیا اور خدا تعالیٰ کے داہنے ہاتھ پر جا بیٹھا۔ یعنی حضرت عیسیٰؑ آسمان پر چلے گئے اور اسی طرح دوسری کتاب السلاطین کے دوسرے باب میں مذکور ہے کہ ایلیاء (یعنی حضرت الیاس علیہ السلام اور الیسعؑ باتیں کرتے جاتے تھے کہ ایک آگ کی گاڑی اور آگ کے گھوڑے نمودار ہوئے اس میں چڑھ کر ایلیاء آسمان پر چلا گیا۔

اور اسی طرح قسیس ولیم اسمٹ اپنی کتاب طریق الاولیاء میں حضرت اخنوخ (ادریس) علیہ السلام کا زندہ آسمان پر جانا بیان کرتا ہے اور اہل اسلام تو قاطبۃً اس پر متفق ہیں دس، بیس ملحدوں کا کیا ذکر ہے۔ اور عائشہؓ اور معاویہؓ کی حدیث دوسری معراج کے بارے میں ہے جو حضرت کو اس سے پیشتر خواب میں ہوئی تھی (جیسا کہ معالم میں ہے)۔

(۳) یہ معراج روحانیت کا کامل غلبہ ہے عبادت و تسبیح کے سبب جس سے روح جسم پر غالب آ گئی اور جسمانیت میں سرایت کر گئی اور جسم بھی بمنزلہ روح کے لطیف ہو

گیا تھا اور یہ بات اہل کمال پر مخفی نہیں۔ (تفسیر حقانی ۳)

کیا حضور کی معراج کے وقت مسجد اقصیٰ موجود نہیں تھی؟

اعتراض: (بیس برن لالہ اندر من ہندو کا اعتراض)

سورت بنی اسرائیل میں "سبحن الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی" کی آیت وارد ہے حالانکہ حضرت محمد ﷺ کے ظاہر ہونے سے پہلے طرطوس رومی نے بیت المقدس کو نیست و نابود کر دیا تھا۔

جواب: یہ لالہ صاحب نے پادری فانڈر کی کاسہ لیسی کی ہے۔ اس نے بھی اپنی کتاب میں یہی ہرزہ سرائی کی تھی حالانکہ قدمائے تاریخ مسٹر ولیم بیل نے پوری تصریح کر دی ہے کہ سنہ ۷۰ مسیحی میں مسجد مقدس کو ایک قیصر نے مسمار کر دیا تھا اس کے تین سو سال کے بعد قیصر روم نے اس کو پھر سے تعمیر کروا دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مسجد اقصیٰ حضور علیہ السلام کے معراج سے تین سو سال پہلے دوبارہ تعمیر ہو گئی تھی۔

(سوط اللہ الجبار ج ۱ ص ۲۷)

معجزہ ۲، شق القمر (چاند کا دو ٹکڑے ہونا)

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ، وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ.

(ترجمہ) پاس آ لگی قیامت، اور پھٹ گیا چاند اور وہ دیکھیں کوئی نشانی تو ٹلا جائیں اور کہیں یہ جادو ہے پہلے سے چلا آتا۔"

منکرین کے اعتراضات:

بڑا معرکۃ الآراء اعتراض منکرین کا یہ ہے کہ اجرام علویہ میں پھٹنا اور جڑنا ممکن نہیں۔ (یہ قدیم یونانی فلاسفہ کا نظریہ تھا کہ آسمان کا پھٹنا اور پھر جڑنا محال ہے اس

نظریئے کی بنیاد پر معراج اور معجزہ شق قمر پر اعتراضات کئے جاتے تھے، کہ آسمان کے پھٹے اور جڑے بغیر نہ تو معراج ہو سکتی ہے، اور نہ شق قمر اس لئے کہ یونانی فلاسفہ کا نظریہ یہ تھا کہ چاند آسمان میں جڑا ہوا ہے۔

مسلمان فلاسفہ نے ناقابل انکار دلائل سے اس نظریئے کو یکسر باطل قرار دیا ہے، اور اس سلسلے میں فلاسفہ یونان کے تمام اعتراضات کا منہ توڑ جواب دیا ہے، علم کلام کی کتابیں اس بحث سے بھری پڑی ہیں،) دوسرے اگر ایسا واقعہ پیش آیا ہوتا تو روئے زمین کے رہنے والے تمام انسانوں سے اس کا پوشیدہ ہونا غیر ممکن تھا، اور ایسے عظیم الشان واقعہ کو دنیا کے مؤرخین ضرور نقل کرتے۔

معترضین کے اعتراض کا جواب:

یہ اعتراض عقلی اور نقلی دونوں حیثیت سے بہت ہی کمزور ہے، نقلی حیثیت سے سات وجوہ کی بناء پر ضعیف ہے۔

پہلی وجہ:

اوّل اس لئے کہ طوفان نوحؑ کا عظیم الشان حادثہ پورے ایک سال تک جاری اور واقع ہوتا رہا، جس میں ہر جاندار خواہ پرندے ہوں یا چوپائے، خواہ حشرات الارض ہوں یا انسان، غرض تمام مخلوق سوائے کشتی نشین لوگوں کے فنا ہو گئی، اور سوائے آٹھ انسانوں کے کوئی بھی نہیں بچ سکا۔

جیسا کہ کتاب پیدائش باب ۷ و نمبر ۸ میں تصریح ہے، اور پطرس کے پہلے خط باب ۳ آیت ۲۰ میں ہے:

> ''جب خدا نوح کے وقت میں تحمل کر کے ٹھہر رہا تھا، اور وہ کشتی تیار ہو رہی تھی، جس پر سوار ہو کر تھوڑے سے آدمی یعنی آٹھ جانیں پانی کے وسیلے سے بچیں''۔

اور دوسرے خط کے باب ۲ آیت ۵ میں ہے:

”نہ پہلی دنیا کو چھوڑا، بلکہ بے دین دنیا پر طوفان بھیج کر راستبازی کے منادی کرنے والے نوح کو مع اور سات آدمیوں کے بچالیا“۔

اس حادثے کو آج تک اہل کتاب کے نظریئے کیمطابق چار ہزار دو سو بارہ سال شمسی گزرے ہیں، مگر اس واقعہ کا کوئی ذکر تذکرہ مشرکین ہندوستان کی کتابوں اور تاریخوں میں موجود نہیں ہے، وہ لوگ اس واقعہ کا نہ صرف یہ کہ شدت سے انکار کرتے ہیں، بلکہ ان کے تمام علماء اس کا مذاق اڑاتے ہیں، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر گزشتہ دور سے قطع نظر بھی کرلی جائے اور کرشن اوتار کے زمانے کو جو اس دن سے ان کی کتابوں کی شہادت کے مطابق چار ہزار نو سو ساٹھ سال مقدم ہے، پیش نظر رکھا جائے تو بھی اس عمومی حادثے کی صحت کی کوئی ممکن صورت نہیں، کیونکہ بڑی بڑی عظیم الشان بارشیں اس عہد سے لے کر اس زمانے تک جو ہوئی ہیں تاریخیں ان کے ذکر سے بھری پڑی ہیں، ان کی تواریخ کی شہادت سے یہ بات ثابت ہے کہ عہد کرشن سے اس بیان کردہ طوفان کے زمانے تک صرف ہندوستان کے ملک میں ہر زمانے میں بے شمار ملین بارشیں ہوتی رہیں، اس کا دعویٰ ہے کہ کرشن کے زمانے کا حال تواریخ کی کثرت کی بناء پر ایسا ہے کہ گویا کل گزشتہ کی بات ہے۔

خود پادریوں کے ہم قوم حضرات اس طوفان کے منکر ہیں، اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں، ہم جان کلارک ملحد کا قول اس کے رسالے نمبر ۳ سے جو اس کی کتاب مطبوعہ ۱۸۳۹ء میں شامل ہے، نقل کرتے ہیں، وہ صفحہ ۵۴ پر کہتا ہے:

”یہ یعنی طوفان والی بات فلاسفہ کی شہادت کی بناء پر درست نہیں ہو سکتی ہ، اور مجھ کو تعجب ہے کہ کیا اس طوفان کے پانی میں مچھلیاں بھی ...... مرگئی تھیں؟ اور جب کہ سفر تکوین باب ۶ آیت ۵ کے فیصلے کے مطابق انسان کے دلوں کے خیالات خراب اور گندے ہو چکے تھے، پھر خدا نے کس لئے

آٹھ افراد کو باقی رکھا؟ اور کیوں نہ سب کو ہلاک کرنے کے بعد انسان کو دوبارہ پیدا کیا؟ اور کیوں گذشتہ سرمایہ اور ذخیرے کو جس کے سبب سے گندے اور خراب افکار و خیالات باقی رہیں باقی رہنے دیا؟ کیوں کہ یہ بات واضح ہے کہ خراب درخت سے عمدہ پھل کبھی بھی پیدا نہیں ہوسکتا؟ جیسا کہ انجیل متیٰ باب ۷ آیت ۱۶ میں کہا گیا کہ ''جھاڑیوں سے انگور۔۔۔ یا اونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں۔'' اور نوح علیہ السلام (نعوذ باللہ منہ) خود شرابی اور چوپائے اور ظالم تھے، جیسا کہ کتاب پیدائش کے باب ۹ آیت ۲۱ و ۲۵ سے ثابت ہے۔ تو پھر ان سے یہ کیوں کر امید کی جاسکتی ہے کہ ان کی نسل صالح اور نیک ہوگی، چنانچہ ملاحظہ کیجئے کہ ایسا نہیں ہوا، اور صالح اولاد نہ ہوئی، جیسا کہ افسیوں کے نام پولس کے خط کے باب ۲ آیت ۲ سے اور ططس کے نام خط کے باب ۳ آیت ۳ سے اور پطرس کے خط نمبر ا باب ۴ آیت ۳ سے اور زبور نمبر ۵۱ کی آیت نمبر ۵ سے ثابت ہے''۔

پھر جان کلارک نے صفحہ ۹۳ پر بے شمار مذاق اڑایا ہے، جو بے ادبی کا شاہکار ہے۔ اس لئے ہم ایسے قبیح کلام کے نقل کرنے کی جسارت نہیں کرتے۔

اس جواب کا حاصل یہ ہوا کہ مؤرخین کا کسی واقعہ کو نقل کرنا اس کے حقیقتاً نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے، ورنہ طوفانِ نوح جو مسلمان اور عیسائیوں میں متفقہ طور پر مسلّم ہے کہ اس کا مؤرخین کے یہاں تذکرہ نہیں ملتا، اور دنیا کی بہت سی قومیں اس کا انکار کرتی ہیں۔

دوسری وجہ:

کتاب یشوع (ترجمہ عربی مطبوعہ ۱۸۴۴ء کے مطابق) کے باب نمبر ۱۰ آیت ۱۲ میں ہے:

''اور اس دن جب خداوند نے اموریوں کو بنی اسرائیل کے قابو میں کر دیا، یشوع نے خداوند کے حضور بنی اسرائیل کے سامنے یہ کہا کہ اے سورج! تو جبعون پر اور اے چاند! تو وادیِ ایالون پر ٹھہرا رہ، اور سورج ٹھہر گیا، اور چاند تھما رہا، جب تک قوم نے اپنے دشمنوں سے اپنا انتقام نہ لے لیا، کیا یہ آشر کی کتاب میں نہیں لکھا ہے؟ (اظہار الحق میں اس جگہ ''سفر الابرار'' کا لفظ ہے) اور سورج آسمانوں کے بیچوں بیچ ٹھہرا رہا، اور تقریباً سارے دن ڈوبنے میں جلدی نہ کی''۔ (آیات ۱۲ و ۱۳)

ظاہر ہے کہ یہ حادثہ بڑا عظیم الشان تھا، اور عیسائی نظریئے کے مطابق مسیحؑ کی پیدائش سے ایک ہزار چار سو سال قبل پیش آیا، اگر یہ واقعہ صحیح ہوتا تو اس کا علم روئے زمین کے تمام انسانوں کو ہونا ضروری تھا، بڑے سے بڑا بادل بھی اس کے علم سے مانع نہیں ہوسکتا تھا، اور نہ افق کا اختلاف اس میں مزاحم، اس لئے اگر ہم یہ بھی تسلیم کرلیں کہ بعض مقامات پر اس وقت رات تھی تب بھی اس کا ظاہر ہونا اس لئے ضروری تھا کہ ان کی رات اس دن چوبیس گھنٹے رہی ہو، نیز یہ زبردست حادثہ نہ تو ہندوستان کی تواریخ میں کہیں موجود ہے، نہ اہل چین، اہل فارس کی کتابوں میں کہیں اس کا تذکرہ ہے ہم نے خود مشرکین ہندوستان کے علماء سے اس کی تکذیب سنی ہے، اور ان کو اس کے غلط ہونے کا یقین کامل ہے۔ خود عیسائیوں کے ہم قوم اس کی تکذیب کرتے ہیں، اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

دوسرا اعتراض:

یہ کہ یہ کہنا کہ ''سورج آسمان کے بیچ میں کھڑا ہوگیا''، بتا رہا ہے کہ وہ ٹھیک دوپہر کا وقت تھا، یہ بات بھی چند وجوہ سے کمزور اور بودی ہے:

اوّل تو اس لئے کہ بنی اسرائیل اپنے ہزاروں مخالفین کو قتل کرچکے تھے، اور پوری شکست دے چکے تھے، اور پھر جب وہ لوگ بھاگنے لگے تو خدا نے مزید آسمان سے

بڑے بڑے پتھر برسا کر ان کو ڈھیر کر دیا، چنانچہ ان پتھروں سے مقتول ہونے والوں کی تعداد بنی اسرائیل کے ہاتھوں مارے جانے والوں سے بہت زیادہ تھی، اور یہ سب کام نصف النہار سے پہلے انجام پا چکا تھا، جیسا کہ اس باب میں اس کی تصریح موجود ہے، ایسی صورت میں پھر یوشعؑ کے اس قدر اضطراب کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ فاتح بنی اسرائیل بہت زیادہ اور باقی رہ جانے والے مخالفین بہت قلیل التعداد تھے، اور ابھی آدھا دن باقی تھا جس میں بڑی آسانی سے ان کا قتل کیا جانا ممکن تھا۔

دوسرے اس لئے کہ جب وہ وقت دوپہر کا تھا تو اس وقت ان لوگوں نے چاند کو کیسے دیکھ لیا؟ پھر اس کا ٹھیرنا بھی فلسفہ کے قواعد کے بموجب غلط ہے۔

تیسری وجہ:

کتاب اشعیاء باب ۳۸ آیت ۸ میں حضرت اشعیاء کے معجزے رجوع شمس کے سلسلہ میں یوں کہا گیا ہے کہ:

''چنانچہ آسمان جن درجوں سے ڈھل گیا تھا، ان میں کے دس درجے پھر لوٹ گیا۔''

یہ حادثہ بھی بڑا عظیم الشان ہے، اور چونکہ دن میں پیش آیا تھا اس لئے ضروری ہے کہ دنیا کے اکثر انسانوں کو اس کا علم، مسیح کی ولادت سے سات سو تیرہ سال شمسی قبل واقع ہوا مگر نہ تو اس کا کوئی تذکرہ ہندوستانیوں کی تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ اور نہ اہل چین اور اہل فارس کی کتابوں میں اس کا کوئی نشان ملتا ہے، نیز اس سے سورج کا حرکت کرنا اور زمین کا ساکن ہونا مفہوم ہو رہا ہے، جو جدید ہیئت کے فیصلے کی بناء پر بالکل غلط ہے۔

یہ تینوں مشہور حادثے یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کے نزدیک مسلم ہیں اور باقی حوادث جن کو ہم ذکر کرنے والے ہیں وہ عیسائیوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

چوتھی وجہ:

انجیل متّیٰ باب ۲۷ آیت ۵۱ میں ہے:

''اور مقدس کا پردہ اوپر سے نیچے تک پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا، اور زمین لرزی اور چٹانیں تڑک گئیں، اور قبریں کھل گئیں، اور بہت سے جسم ان مقدسوں کے جو سو گئے تھے جی اٹھے اور اس کے جی اٹھنے کے بعد قبروں سے نکل کر مقدس شہر میں گئے، اور بہتوں کو دکھائی دیئے''۔ (آیات ۵۱ تا ۵۳)

یہ واقعہ یقیناً جھوٹا اور من گھڑت ہے جیسا کہ آپ کو بلب ۱، فصل نمبر ۳ سے معلوم ہو چکا ہے، نیز مخالفین یعنی رومانیوں اور یہودیوں کی قدیم کتابوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا، اور نہ مرقس یا لوقا نے پتھروں کا پھٹنا اور قبروں کا کھلنا، اور بہت سے قدیس لوگوں کے اجسام کا قبروں سے برآمد ہو کر شہر میں داخل ہونا بیان کیا ہے، حالانکہ ان واقعات کا ذکر عیسیٰؑ کی چیخ پکار کے ذکر سے زیادہ ضروری تھا، جو مرتے وقت انھوں نے کی تھی، اور جس کے ذکر پر سب کا اتفاق ہے، اور پھر پتھروں کا پھٹ جانا تو اس قسم کا واقعہ ہے کہ جس کا اثر ونشان وقوع کے بعد بھی رہتا ہے،

تعجب یہ ہے کہ متّیٰ نے یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ مردے زندہ ہونے کے بعد کن لوگوں کو نظر آئے تھے؟ مناسب تو یہ تھا کہ یہودیوں کو نظر آتے، اور پیلاطس کو دکھائی دیتے، تا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتے، جیسا کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے بھی یہی مناسب تھا کہ وہ مردوں کے درمیان سے کھڑے ہونے کے بعد ان مخالفین کو نظر آتے تا کہ اشتباہ دور ہو جاتا، اور یہودیوں کو یہ کہنے کی مجال نہ ہوتی، کہ ان کے شاگردرات کی تاریکی میں آئے اور ان کی نعش چرا کر لے گئے،

اسی طرح اس نے یہ بھی ذکر نہ کیا کہ جو مردے زندہ ہو گئے تھے پھر واپس اپنی قبروں میں چلے گئے، یا زندہ باقی رہے؟

کسی ظریف نے خوب کہا ہے کہ ''شاید متّیٰ نے یہ تمام باتیں خواب میں دیکھی

ہوں گی۔‘‘

اس کے علاوہ لوقا کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ ہیکل کے پردے کا پھٹنا عیسیٰ کی وفات سے قبل پیش آیا ہے جو متی اور مرقس کے بیان کے قطعی خلاف ہے۔

پانچویں وجہ:

انجیل متی اور مرقس ولوقا میں مسیح کے سولی دیئے جانے کے بیان میں لکھا ہے کہ چھ بجے سے نو بجے تک پورے چار گھنٹے کامل تمام روئے زمین پر اس واقعے سے تاریکی اور اندھیری مسلّط رہی، چونکہ یہ حادثہ دن میں پیش آیا اور ساری روئے زمین تک پھیلا رہا، اور تھوڑی دیر بھی نہیں بلکہ پورے چار گھنٹے، اس لئے یہ ناممکن ہے کہ دنیا کے اکثر لوگ اس سے واقف نہ ہوں، حالانکہ اس کا کوئی ذکر اہل ہندو فارس وچین کی تواریخ میں نہیں ملتا۔

چھٹی وجہ:

انجیل متی نے بچوں کے قتل کا واقعہ باب ۲ میں ذکر کیا ہے، مگر کسی دوسری انجیل یا تاریخ میں اس کا کوئی نام ونشان نہیں ملتا۔

> ’’انجیل متی میں ہے کہ جب ہیرودیس کو حضرت مسیح کی ولادت کی خبر ہوئی تو اس نے: ’’بیت لحم اور اس کی سب سرحدوں کے اندر کے ان لڑکوں کو قتل کروادیا جو دو دو برس کے یا اس سے چھوٹے تھے‘‘۔ (متی ۲:۱۶)

لیکن اس واقعہ کا تذکرہ کہیں اور نہیں ملتا، چنانچہ آر، اے ناکس تفسیر عہد نامہ جدید میں لکھتا ہے: معصوم بچوں کے قتل کا واقعہ کسی غیر عیسائی مصنف کی تحریر میں نہیں ملتا‘‘۔ (ص ۳۰۴ ج اوّل)

ساتویں وجہ:

انجیل متی اور لوقا کے باب ۳ اور انجیل مرقس کے باب ’۱‘ میں یوں لکھا ہے کہ:

> ’’اور جب وہ پانی سے نکل کر اوپر آیا تو فی الفور اس نے آسمان کو پھٹتے......

اور روح کو کبوتر کی مانند اپنے اوپر اترتے دیکھا، اور آسمان سے آواز آئی
کہ تو میرا پیارا بیٹا ہے، تجھ سے میں خوش ہوں۔"

یہ مرقس کے الفاظ ہیں، چونکہ آسمانوں کا پھٹنا دن میں واقع ہوا تو ضروری ہے کہ دنیا کے رہنے والے بیشتر انسانوں سے مخفی نہ ہو، اسی طرح کبوتر کا نظر آنا اور آسمانوں سے اس آواز کا سنا جانا، حاضرین میں سے کسی ایک فرد کیساتھ مخصوص نہ ہونا چاہیے، حالانکہ اس...... واقعہ کو انجیل والوں کے سوا اور کوئی بھی ذکر نہیں کرتا۔

جان کلارک اس قصہ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"متی نے ہم کو اس عظیم الشان اطلاع سے محروم بنا دیا اور صاف طور پر نہیں بتایا کہ آسمان کے کون سے دروازے کھلے تھے؟ بڑے دروازے؟ یا متوسط دروازے؟ یا چھوٹے؟ اور کیا یہ دروازے سورج کی اس جانب میں تھے یا دوسری سمت میں؟ اس بڑی بھول کی وجہ سے ہمارے غریب پادری سمت کی تعیین میں حیرانی کے ساتھ سر پھوڑتے ہیں، اور نہ یہ اطلاع دی کہ اس منزل من اللہ کبوتری کا۔۔۔ کیا حشر ہوا؟ کیا اس کو کسی نے پکڑ کر پنجرے میں بند کیا؟ یا آسمان کی طرف واپس ہوتی ہوئی دیکھی گئی؟ اور اگر لوٹتی ہوئی دیکھی تو ضروری ہے کہ اتنی دیر تک آسمانوں کے دروازے کھلے رہے ہوں؟ اور سب لوگوں نے آسمانوں کے اندرونی احوال کا اچھی طرح مشاہدہ کر لیا ہوگا، کیونکہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ پطرس کے اس مقام پر پہنچنے تک ان دروازوں پر کوئی سنتری یا سپاہی موجود ہو، شاید یہ کبوتری کوئی جن ہو"؟

اس اعتراض کے عقلی جوابات:

اس اعتراض کا عقلی طور پر باطل ہونا آٹھ وجوہات کی بنا پر ثابت ہے:

پہلی وجہ:

شق قمر کا واقعہ رات کے وقت پیش آیا جو غفلت اور نیند کا وقت ہوتا ہے راستوں اور سڑکوں پر سکون اور آمد و رفت بند ہو جاتی ہے، بالخصوص سردی کے زمانے میں لوگ گھروں اور کمروں کے اندر دروازے بند کر کے سوتے ہیں اور آرام کرتے ہیں، ایسی صورت میں آسمان سے تعلق رکھنے والی کسی جدید بات کا علم و اطلاع سوائے ان لوگوں کے کسی کو نہیں ہوتی جو پہلے سے اس کے منتظر ہوں، اور چاند گرہن اس کی واضح مثال موجود ہے، کہ وہ اکثر پیش آتا ہے، مگر بہت سے لوگوں کو اس کا علم صبح ہونے اور دوسروں کے اطلاع دینے پر ہوتا ہے، سوتے ہوئے لوگوں کو گرہن کی اطلاع نہیں ہوتی۔

دوسری وجہ:

یہ حادثہ زیادہ دیر تک ممتد اور مسلسل نہیں رہا، دیکھنے والوں کے لئے بھی اس کے امکانات کم تھے کہ جو لوگ اس مقام سے کافی دور ہیں، ان کو اسکی اطلاع کریں، یا سونے والوں کو جگائیں اور دکھائیں۔

تیسری وجہ:

پہلے سے اس قسم کا کوئی پروگرام نہ تھا کہ لوگوں کو اس کی اطلاع ہوتی اور وہ دیکھنے کا اہتمام کرتے جس قسم کا اہتمام وقت معینہ پر رمضان وعیدین ---اور سورج گرہن یا چاند گرہن دیکھنے کا لوگ کیا کرتے ہیں، محض اس لئے کہ اس کے دیکھے جانے کے قوی امکان ہوتے ہیں پھر ہر شخص کی نگاہ ہر وقت آسمان کی جانب تو دن کے اوقات میں بھی لگی نہیں رہتی، چہ جائے کہ رات کے وقت، اس لئے صرف ان لوگوں نے دیکھا جو معجزے کے طالب تھے، یا جن لوگوں کی نگاہ اتفاقیہ اس وقت آسمان کی طرف اٹھ گئی، جیسا کہ صحیح حدیثوں میں آتا ہے، کہ جب کفار مکہ نے اس واقعہ کو دیکھا تو کہنے لگے غالباً ابن ابی کبشہ (ابن ابی کبشہ آنحضرت ﷺ کی کنیت ہے، آپؐ کے

جدامجد وہب بن عبد مناف کا اور آپ ﷺ کے رضاعی والد یعنی حضرت حلیمہؓ کے شوہر کا لقب ابو کبشہ بھی تھا، اسی مناسبت سے آپ کو ابن ابی کبشہ کہا جاتا ہے) نے تمھاری نظر بندی کردی ہے۔ابو جہل نے بھی یہی بات کہی، کہ یہ محض جادو اور نظر بندی ہے، اس لئے لوگوں کو تحقیق کے لئے مختلف اطراف وجوانب میں بھیجو کہ وہ معلوم کریں کہ وہاں کے لوگوں نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا یا نہیں؟ سب نے بالاتفاق تصدیق کی کہ ہم نے اسی حالت میں دیکھا ہے (رواہ الترمذیؒ عن جبیر بن مطعمؓ (جمع الفوائد، ص ۲۰۰ ج ۲) کیونکہ اہل عرب عموماً رات میں سفر اور دن کو قیام کرتے ہیں ۔ پھر کفار نے مل کر کہا کہ یہ جادو ہے، جو مٹنے والا ہے۔

نیز تاریخ فرشتہ کے مقالہ نمبر ۱۱ میں لکھا ہے کہ ملیبار کے لوگوں نے بھی۔۔۔ جو ہندوستان کا علاقہ ہے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا ہے، اور اس علاقے کا راجہ جو بت پرست تھا، اس معجزے کو دیکھ کر مسلمان ہوگیا، (اظہار الحق کے گجراتی مترجم جناب غلام محمد صاحب بن حاجی حافظ صادق صاحب نے اس جگہ حاشیے پر لکھا ہے کہ "ہندوؤں کی مشہور کتاب مہابھارت میں بھی چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے"، غلام محمد صاحب کا یہ ذیلی حاشیہ اظہار الحق کے انگریزی ترجمے کے حاشیے پر نقل کیا گیا ہے، دیکھئے اظہار الحق انگریزی ترجمہ ۱۴۵ ج ۲)۔

حافظ مزیؒ نے ابن تیمیہؒ سے نقل کیا ہے کہ ایک مسافر کا بیان ہے کہ میں نے ہندوستان کے ایک مشہور شہر میں ایک پرانی عمارت دیکھی، جس پر عمارت کی تاریخ تعمیر کے سلسلے میں لکھا تھا کہ "یہ عمارت شق قمر والی رات میں بنائی گئی"۔

چوتھی وجہ:

کبھی کبھی بعض مقامات اور بعض اوقات میں دیکھنے والے اور چاند کے درمیان ایک گہرا اور غلیظ بادل یا پہاڑ حائل ہو جاتا ہے، بعض اوقات تو ان علاقوں میں جن میں کثرت سے بارشیں ہوتی ہیں اتنا زبردست تفاوت پایا جاتا ہے کہ ایک جگہ بادل

بھی بہت گہرا اور بارش بھی کافی زوردار ہو رہی ہے کہ دیکھنے والوں کو دن میں سورج اور نیلگوں آسمان کا اصلی رنگ مسلسل گھنٹوں تک دکھائی نہیں دیتا، اسی طرح رات کے وقت چاند اور ستاروں کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی، مگر دوسرے مقام پر نہ کسی بادل کا پتہ ہے نہ بارش کا کوئی اثر، حالانکہ دونوں مقامات میں کچھ زیادہ قابلِ ذکر فاصلہ بھی نہیں ہوتا، شمالی علاقوں کے باشندے روم اور یورپ کے لوگ برف باری اور بارش کے دنوں میں مسلسل کئی کئی دن تک سورج کے دیکھنے کو ترستے رہتے ہیں، چہ جائیکہ چاند کو۔

پانچویں وجہ:

چاند اپنے مطالع کے اختلاف کی وجہ سے تمام روئے زمین والوں کے لئے کسی ایک حد پر نہیں ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آج جن لوگوں پر طلوع ہوتا ہے دوسرے ملک یا علاقے کے باشندے اس وقت اسکی جھلک دیکھنے سے محروم ہوتے ہیں، کسی ایک افق اور منزل پر نمایاں ہونے پر بعض ملکوں کے لوگ اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس وقت دوسرے مقام کے لوگ اسکی جھلک سے قطعی محروم رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ چاند گرہن عام نہیں ہوتا، بعض علاقوں میں کامل ہوتا ہے، بعض میں بالکل نہیں ہوتا، یا ناقص طور پر ہوتا ہے، اور بعض مقامات پر اس کی پہچان وشناخت صرف ان لوگوں کو ہوتی ہے جو علم نجوم کے ماہر ہیں۔

اکثر قابل اعتماد علماء ہیئت ایسے عجائبات بیان کرتے ہیں جن کا مشاہدہ ان کو بڑے بڑے ستاروں اور ان کی روشنیوں سے ہوتا ہے، جو رات کے کسی حصے میں ظاہر ہوتے ہیں، ان کے سوا دوسرے لوگوں کو ان کا قطعی کوئی علم نہیں ہوتا۔

چھٹی وجہ:

اس قسم کے نادر الوقوع واقعات دیکھنے والوں کی تعداد عام طور پر اس قدر نہیں ہوتی جو یقین کے لئے مفید ہو، ادھر مؤرخین کے یہاں بڑے اور اہم واقعات کے بارے میں بعض عوام کی بیان کردہ خبریں قابل اعتماد نہیں ہوتیں، البتہ ایسے واقعات

کی نسبت ان کے بیانات مان لئے جاتے ہیں کہ جن کے وقوع کے بعد ان کے آثار اور نشانیاں باقی رہ جائیں، جیسے سخت آندھی، بے شمار برف باری، یا ژالہ باری اور سخت سردی وغیرہ، اس لئے عین ممکن ہے، اور بعید از قیاس نہیں ہے کہ کسی ملک کے مؤرخین نے اس حادثے کی نسبت بعض عوام کی بیان کردہ روایت پر وثوق نہ کرتے ہوئے اس کو دیکھنے والوں کی نگاہ کا قصور قرار دیا ہو، اور اس واقعہ کو چاند گرہن کی قسم کا سمجھ کر نظر انداز کردیا ہو۔

ساتویں وجہ:

مؤرخین بالعموم زمینی حوادث کو تاریخ کے اوراق میں جگہ دیتے ہیں، اور آسمانی واقعات وحوادث سے شاذ ونادر ہی تعرض کرتے ہیں خاص کر قدیم مؤرخین کا تو یہ عام شیوہ ہے، پھر یہ چیز بھی قابل لحاظ ہونا چاہیے کہ حضور ﷺ کے عہد مبارک میں انگلستان وفرانس میں جہالت عروج پر تھی، اور علوم وفنون کی جو کچھ داغ بیل اور بنیاد یورپ کے ملکوں میں پڑی اور اشاعت ہوئی، وہ حضور ﷺ کے دور مسعود کے کافی طویل عرصے کے بعد ہوئی ہے، ان حالات میں ان کے یہاں تاریخ نویسی کا کوئی اہتمام اور اس جانب التفات ہی کب ہوسکتا تھا؟

آٹھویں وجہ:

منکر کو جب یہ بات معلوم ہوجائے کہ فلاں معجزہ یا کرامت اس شخص کی ہے جس کا وہ منکر ہے، تو وہ ضرور اس کے اخفاء اور چھپانے کی کوشش کیا کرتا ہے، اور کبھی بھی اس کے ذکر یا کہے جانے پر راضی نہیں ہوتا، جیسا کہ انجیل یوحنا کے باب ۱۱، اور کتاب الاعمال کے باب ۴ و ۵ کے مطالعہ کرنے والوں سے یہ چیز مخفی نہیں ہوسکتی ان وجوہات کی بناء پر ثابت ہوا کہ ''معجزۂ شق القمر'' پر عقلی یا نقلی غرض کسی طور سے اعتراض درست نہیں ہوسکتا۔ (انتہیٰ کلام اظہار الحق ترجمہ ۱۲۷ تا ۱۲۸ ملخصا)

موجودہ دور کی شہادت ملاحظہ فرمایئے۔ جو خلاباز چاند پر سب سے پہلے پہنچے

تھے۔تو انھوں نے واپس آ کر یہ بیان دیا تھا کہ ''چاند کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایک لکیر موجود ہے''۔اوران کا یہ بیان اخبارات میں شائع بھی ہوا تھا۔تو علماء اسلام نے اس وقت اس لکیر کی بابت یہ بیان دیا تھا کہ ''یہ شق القمر کے معجزہ کی وجہ سے ہے''پس خلابازوں کا یہ بیان شق القمر کے معجزہ کی صداقت پر شہادت ہے۔

معجزہ شق القمر پر ہندوؤں کا اعتراض اور جواب

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

اگر معجزۂ شق القمر درست ہوتا تو مختلف فرقوں کی کتابوں میں مثلاً عیسائیوں کی کتابوں میں، یہودیوں کی کتابوں میں ذرتشتیوں کی کتابوں میں لکھا ہوتا فقط مسلمانوں کی کتابوں میں مرقوم نہ ہوتا۔

جواب: معترض بے خبر ہے اگر وہ اپنی کتاب مہابھارت فصل موچھا دھرم میں دیکھ لیتا تو اس کی تصریح مل جاتی جس میں لکھا ہے:

ایک وقت میں چاند کا ایک حصہ گر گیا پھر اس کے بعد دوبارہ اس کے ساتھ جڑ گیا۔

مگر اس چاند کے ٹکڑے کے گرنے اور ملنے کو ہندو بسوامتر کی دعا قرار دیتے ہیں۔پس چاند کا دوٹکڑے ہونا متنازع فیہ ہو گیا کیا چاند کا دوٹکڑے ہونا جناب رسالت مآب ﷺ کے معجزات میں سے ہے یا بسوامتر کی کرامات میں سے ہے۔ہمارے اور ہندوؤں کے ذمہ ہے کہ ہر ایک اپنے مدعیٰ کے مطابق اس کو متواتر خبروں سے اور دیکھنے والوں کے بیان سے ثابت کرے چونکہ ہمارے پاس متواتر اخبار اور دیکھنے والوں کی شہادت اس درجے کو پہنچ چکی ہے پس تاوقتیکہ ہندو اپنے قول کی سند ہماری طرح پیش نہیں کرتے۔ہندوؤں کا دعویٰ شق قمر کی نسبت بسوامیتر کی طرف بالکل لائق التفات نہیں ہے۔

حالانکہ ہندوؤں کا دعویٰ محض زبانی ہے۔اس پر کوئی سند نہیں پیش کرتے اور خود

مہابھارت کی سند مجروح ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

علاوہ ازیں بسوامیتر مہابھارت کے مؤلف کا معاصر ہے۔ اور مہابھارت میں اس شق قمر کی نسبت بسوامیتر کی طرف نہیں کی گئی اور شق قمر کی نسبت بسوامیتر کی طرف سلسلہء روایت کے اعتبار سے قطعاً معدوم اور مفقود ہے پس ہمارے دعوے کے مقابلے میں شق قمر کی نسبت بسوامیتر کی طرف کرنا بالکل قابل لحاظ نہیں بلکہ محض بے دلیل بات ہے بقول بشسٹ اگرچہ قول برہما بھی ہو ہرگز توجہ کے لائق نہیں۔

درحقیقت معجزہ شق قمر جو جناب رسالت مابﷺ سے ظاہر ہوا ہے ہندوستان میں بھی دیکھا گیا تھا اور مشہور ہوا تھا چنانچہ تاریخ فرشتہ اور بعض دوسری تواریخ میں موجود ہے تھوڑے سے زمانے کے گزرنے کے بعد بھی ہندوستان کے جاہل لوگ اپنے آباءواجداد سے بغیر دلیل و برہان کے اس واقعہ کو سنتے چلے آرہے تھے اور اس کو ہندوستان کے جاہل بسوامیتر کی طرف منسوب کرتے ہیں چنانچہ ان کی عادت سے ہے کہ چاند میں جو داغ دیکھا جاتا ہے یہ چاند میں گوتم بدھ کی بددعا سے ظاہر ہوا ہے۔ اور کبھی کہتے ہیں کہ چاند کو یہ بیماری وجہ کی بددعا سے لاحق ہوئی ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ اندر دیوتا نے چاند کے پرکتر دیئے تھے اور چوئے گنگ کہتے ہیں کہ راجہ بھرت آسمان سے چاند کو لایا تھا اور جوئے چنبل کہتے ہیں کہ راجہ رنگ لوست چاند کو آب دیگ شوئی سے گھسیٹ کر لایا تھا چنانچہ درونہ پرب میں ایسے ہی لکھا ہے۔ اور کبھی کہتے ہیں کہ راجہ انت دیو نے اپنے جگ میں گاؤ کو ذبح کیا تھا اور اس گائے کے جرم سے دریائے چنبل جاری ہوا تھا چنانچہ دھرم پرب مہابھارت میں ایسے ہی لکھا ہے اور اس طرح کی بہت سی حکایات ہیں جس کی تفصیل طوالت کا سبب ہے۔ اگر کہیں کہ مہابھارت کی تالیف جناب نبی آخر الزمانﷺ کے زمانہ سے پہلے کی ہے اور اس میں چاند کے ٹکڑے ہونے کا قصہ لکھا ہے اور وہ شق قمر جناب نبی کریمﷺ کے معجزہ شق قمر کے علاوہ ہے۔

تو ہم کہیں گے کہ یہ متواتر روایات کتب ہنود سے ثابت شدہ نہیں ہے کہ مہا

بھارت کس سنہ میں تالیف ہوئی تھی بلکہ آد پرب سے ظاہر ہے کہ مہا بھارت کی تالیف راجہ جنمیجھ کے بھی کافی عرصہ بعد ہوئی ہے۔ جس نے ماران کو جگ میں جلایا تھا چنانچہ آر برہمن پرب میں یہ حکایت مذکور ہے کہ آر برہمن ہر چند کے برہمنوں میں سے تھا جلانے کا قصہ راجہ جنمیجھ ماران سے پوچھا کسی نے ذکر نہ کیا آخر کار اس کے باپ نے اس سے کہا کہ یہ قصہ مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ انتہیٰ

ظاہر ہے کہ اس زمانے میں مہا بھارت تالیف ہوئی تھی چونکہ ماران کے جلانے کا قصہ اس میں تفصیل سے لکھا ہوا ہے۔ ممکن نہیں تھا کہ برہمن لوگ اس سے آگاہ نہ ہوتے سوائے ایک برہمن کے کوئی اور اس کی خبر نہیں رکھتا تھا۔

ان دلائل سے صاف ظاہر ہوا کہ مہا بھارت کی تالیف راجہ جنمیجھ کے عہد سے کچھ زمانہ بعد ہوئی تھی۔

نیز ہندو اس پر متفق ہیں کہ بید اور سب اپنکھد ہندوؤں کی تمام کتابیں پرانی ہیں اور اپنکھد میں شنکر اچارج کا قصہ اس کی تغیر اور بید کے اقوال لکھے ہوئے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ بید او راپنکھد شنکر اچارج کے زمانے کے بعد تالیف ہوئے ہیں' اور شنکر اچارج کا ظہور صرف پانچ سو سال یا زیادہ سے زیادہ چھ سو سال پہلے ہوا ہے۔

پس ثابت ہوا کہ بید اور اپنکھد کی تالیف چھ سو یا سات سو سال حضور علیہ السلام کے ظہور کے بعد ہوئی۔

پس مہا بھارت کی تالیف بید اور اپنکھد کے لازماً بعد میں ہوئی پس مہا بھارت کی تالیف کا دعویٰ حضور علیہ السلام کے زمانے سے پہلے کا کرنا بے دلیل اور سراسر باطل ہے۔

اور اگر فرض کیا جائے کہ چاند کا ٹکڑے ہونا بسوامیتر کی بد دعا سے ہے تو یہ حضور علیہ السلام کے ہاتھ سے ظاہر ہونے والے شق قمر کے معجزہ کے علاوہ ہے۔

لالہ صاحب کا اعتراض کہ فارسیوں کی اور رومیوں اور یونانیوں کی کتابوں میں اور ہندوؤں کی نامعتبر کتابوں کے علاوہ کہیں بھی بسوامیتر کے چاند کے ٹکڑے کرنے کی خبر موجود نہیں ۔ تو معترض صاحب خود بسوامیتر کے اس واقعہ کے دیگر فرقوں کی کتابوں سے ثبوت نہ پیش کر سکنے پر کیوں خاموش ہیں۔

حالانکہ اہل ہند بسوامیتر کے معتقدوں میں سے ہیں۔ اگر یہ بڑی نشانی اس سے ظاہر ہوتی تو اس کے معتقد جن کی تعداد بہت تھی اس کو متواتر طور پر نقل کیوں نہ کیا اور یہ خبر دنیا کے کونوں میں کیوں نہ پہنچی۔

عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں سوائے سلسلہء سوت پورانک کے دیگر کسی بھی طریق سے یہ مروی نہیں اور سوت پورانک کا طریقہ محض غلط ہے۔

اور اہل ہند لازماً اس کو اپنی جنتریوں میں ذکر کرتے ۔ حالانکہ کتابوں میں اور جنتریوں میں اور ہندوستان کے نقشوں میں بھی بسوامیتر کی اس کرامت کا اصلاً مطلقاً کوئی ذکر نہیں۔

علاوہ ازیں نبی کریم کے ہاتھ سے شق قمر کے واقع ہونے کی خبر کا فارسیوں کی اور ہندوؤں کی اور زرتشتوں کی کتابوں میں مذکور نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ یہ معجزہ ظاہر ہی نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ واقعہ رات کے وقت واقع ہوا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ چاند جڑ گیا تھا اور آفاق کے اور احوال کے اختلاف کے سبب سے اور بعض دور دراز کے علاقوں میں اور بعض جگہ گھنے اور محیط بادلوں کی وجہ سے اور بعض جگہ دھند کے چھا جانے کی وجہ سے' اور بعض جگہ مطالع ابر آلود ہونے کی وجہ سے' چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا لوگوں کو علم نہ ہوا۔ سوائے حاضرین کے کوئی اس واقعے کا منتظر بھی نہیں تھا اور اس وقت بہت سے عوام اور خواص نیند میں تھے اگر اتفاقی طور پر مسافروں میں سے یا مقیم گھروں میں رہنے والوں نے مشاہدہ کیا ہو اور اپنے احساس کی غلطی پر اس کو محمول کیا ہو اور دوسرے لوگوں کے سامنے اس کو بیان نہ کیا ہو اور اگر بیان کیا ہو تو سامعین نے

اس کو دیکھنے والے کی حسی غلطی قرار دی ہو اور اس کو کتابوں میں لکھنے کو بے جا سمجھا ہو۔

اور یہ وجہ بھی ہے کہ یہودی اور آگ پرست حضور علیہ السلام کے زمانہ بعثت کے وقت سے آپ کے بارے میں سخت دشمنی رکھتے تھے اور آپ کے معجزات کو جھٹلاتے تھے۔ اور آپ کے معجزات سے منہ موڑتے تھے۔ اگر انہوں نے جان کر آپ کے اس معجزے کا تذکرہ نہ کیا ہو اور اپنی کتابوں میں اس کو نہ لکھا ہو۔

چونکہ یہود ونصاریٰ شواہد اور دلائل نبوت نبی آخر الزمان ﷺ کو جو ان کی کتابوں میں موجود ہیں اپنی کتابوں سے خارج کرتے تھے یا اس مقام اور محل کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بدل دیتے تھے۔ یا بالفاظ دیگر تراجم میں تحریف کرتے تھے۔ پس بہت مستبعد ہے ان سے کہ اس طرح کے لوگ دلیل نبوت کو خود اپنی کتابوں میں مضبوط کرتے۔

اور زرتشت کی قدیم کتابیں اور دیگر پرانے مذہبوں کی کتابیں گم ہو چکی ہیں۔ اور اسی طرح سے نہایت پرانی کتابیں دیگر اکثر اقوام کی ضائع ہو چکی ہیں۔ پس یہ دعویٰ کرنا کہ یہ خبر دیگر لوگوں کی کتابوں میں لکھی ہوئی کیوں نہیں ہے محض دعویٰ ہے اس کا ثبوت نہیں ہے۔

ہندوؤں کی خلاف عقل کہانیاں

البتہ یہ اعتراض معترض صاحب کا خود ہندوؤں کی بناوٹی کہانیوں پر وارد ہوتا ہے جو بھاگوت اور مہابھارت میں مذکور ہیں جن کا ہندوؤں کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

کہانی (۱): ان جھوٹی حکایات میں سے ایک یہ ہے جو بھاگوت میں لکھی ہے کہ جس رات کرشن نے برج کی عورتوں کے ساتھ معاشرت کی اس کا زمانہ چھ ماہ تک لمبا ہو گیا تھا۔

اگر ایسا ہی ہوا تھا تو خود ہندوستان کے علماء نجوم نے جو کرشن کے معتقدین میں سے تھے وہ اس کا خیال رکھتے اور اس کو اپنی کتابوں میں لکھتے کہ فلاں زمانے میں آفتاب فلاں منزل میں اور چاند فلاں منزل میں اور دیگر سیارے فلاں فلاں منزل

میں تھے اور تمام سیارے حرکت کرنے سے رک گئے تھے اور اتنا طویل زمانہ ساکن ہوگیا تھا اور آسمان اپنی گردش سے باز آ گیا تھا اور اس طرح کے واقعات نجومی محاسبات میں قوی اثر رکھتے ہیں ان کے سبب سے اکثر نجومیوں کے مسائل میں عظیم خلل واقع ہوتا اور اجرام فلکیہ کی حرکات پر بھی اثر پڑتا اور روئے زمین کے تمام نجومی اور مؤرخین پر واجب تھا کہ وہ اس کا تذکرہ کرتے لیکن ان کا نجومیوں کی کتابوں میں علم نجوم کی کتابوں میں اس کا تذکرہ نہ آنا پختہ دلیل ہے کہ یہ حکایت ہندوؤں کی کتابوں میں دیگر حکایات کی طرح محض جھوٹی ہے۔

کہانی (۲): انہی میں سے ایک حکایت یہ بھی ہے جو جوگ بشسٹ میں لکھی ہے:

کہ ایک وقت ہلاک کرنے مخلوقات سے ملول ہوا اور اس وقت کوئی جاندار نہ مرا پس زمین آدمیوں اور جانوروں سے گراں بار ہوئی۔ حکمت الٰہی سے ظاہر ہونا ایک اوتار کا ضرور ہوا کہ زمین کو سبک کریں پس دو صورت بشن کی نمایاں ہوئیں ایک پانڈ کے گھر اس کا نام ارجن ہوا دوسری بسدیو کے گھر اس کا نام کرشن ہوا۔ الخ

حالانکہ باتفاق مؤرخین اور تمام اہل ملت یہ معنی غلط محض ہے۔ دنیا بھر کی کتابوں میں سے کسی کتاب میں یہ لکھا ہوا نہیں کہ زمانوں میں سے کوئی زمانہ اس طرح کا تھا کہ مدت دراز تک اس میں جانداروں میں سے کوئی ایک جاندار بھی نہ مرا تھا۔

کہانی (۳): اور انہی حکایات میں سے ایک حکایت آفتاب کا زمین پر کنتی کے ساتھ جماع کرنے کے لئے اترنا اور راجہ کرن کا اس سے پیدا ہونا ہے۔ جو مہابھارت اور ہندوؤں کی دیگر کتابوں میں لکھا ہے۔

قطع نظر اس کے کہ یہ بڑا واقعہ کتابوں میں لکھنے کے قابل ہو اس کا واضح البطلان ہونا خود ظاہر ہے۔

کہانی (۴): اور انہی حکایات میں سے چاند کا گوتم کی زوجہ کے ساتھ زنا کرنے کے لئے زمین پر اندر دیوتا کے ساتھ اترنا بھی آفتاب اور کنتی کے قصے کی طرح ہے۔

اور اسی طرح کے قصوں میں سے بندا چل کو کہ جس کا ذکر پوران میں ہے کہ یہ پہاڑ ایک عرصہ دراز تک اتنا بلند ہو گیا تھا کہ آفتاب بھی اس کے اوپر سے نہ گزر سکا تھا اور اس طویل زمانے میں جہاں دن تھا دن رہتا اور جہاں رات تھی رات رہتی اور یہ بھی ایسا عظیم واقعہ ہے جس کا ذکر دنیا کی تاریخ کی کتابوں میں کہیں لکھا ہوا نہیں ہے۔

منجملہ ان قصوں میں سے ایک اسگند پوران میں لکھا ہے:

کہ آفتاب کاشی کے اوپر سے جب گزرتا ہے تو اس کی رفتار بہت سست ہو جاتی ہے۔

اگرچہ اس قسم کی حکایات بے حد و بے شمار ہندوؤں کی معتبر کتابوں میں موجود ہیں مگر ہم نے نمونے کے طور پر انہی حکایات پر اکتفاء کیا ہے۔

علاوہ ازیں اہل ہند کی تاریخ کے ضبط نہ ہونے اور ہندوؤں کی نالائقی کی وجہ سے بڑے بڑے واقعات ہندوؤں کی تاریخ میں لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ چنانچہ اسکندر رومی کا حملہ ہندوستان پر واقعات عظمیٰ میں سے ہے لیکن اہل ہند کی تاریخ میں مذکور نہیں ہے۔ پس کسی ایک واقعہ کا اہل ہند کی تاریخ میں مذکور نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ معجزہ شق قمر جناب نبی کریم ﷺ کا بے اصل ہے اور ظہور پذیر نہیں ہوا۔

(سوط اللہ الجبار ص ۲۱۷ تا ۲۳۰)

ثبوت معجزات پر اعتراض کا جواب

ترجمہ آیت:

"جب موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے پانی مانگا۔ ہم نے کہا کہ اپنا عصا پتھر پر مار اس میں سے بارہ چشمے بہ نکلے"۔ (سورۃ البقرۃ: ۶۰)

اعتراض: (پنڈت سرسوتی کا اعتراض)

دیکھئے ان ناممکن باتوں کے برابر کوئی دوسرا شخص کیا کہے گا؟ ایک پتھر پر عصا مارنے سے بارہ چشموں کا نکلنا بالکل ناممکن ہے۔ ہاں اس پتھر کو اندر سے پولا کر کے

اس میں پانی بھرنے اور بارہ سوراخ کرنے سے ایسا ہونا ممکن ہے اور کسی طرح نہیں۔

جواب: معجزہ غیر ممکن نہیں بلکہ اس کا نبوت کے ساتھ ایک ایسا مجہول الکیفیت تعلق ہے۔ جیسا کہ انسان کی روح اور عقل کا جسم کے ساتھ۔ پس جہاں نبوت ہوگی وہاں معجزہ کا ہونا قانون قدرت ہے۔ بلا نبوت معجزہ نہیں۔ پنڈت جی کے اس قول سے تو سب سے زیادہ حیرانی ہے کیونکہ فقرہ ۳۷ میں خود ہی فرماتے ہیں کہ۔

''جس مذہب کو ہزاروں کروڑوں آدمی مانتے ہوں اس کو جھوٹا کہنے والے سے بڑھ کر جھوٹا کون ہے۔'' (ستیارتھ صفحہ ۲۹۷، سملاس ۱۴، نمبر ۳۷)

لیکن یہاں پر یہ قاعدہ بھول گئے اور یہ خیال نہ فرمایا کہ معجزہ کو سوا آپکی ذات خاص یا آپ کے چیلوں کے (جن کا شمار ہاتھوں کی انگلیوں پر ہوسکتا ہے) سب اہل مذاہب (مسلمان، یہودی، عیسائی، ہندو، بدھ وغیرہ) مانتے ہیں۔ اور اپنے اپنے بزرگوں کی نسبت بہت سے معجزات اور کرامات کا اپنے لفظوں میں اظہار کرتے ہیں۔ پس آپ خود ہی فیصلہ دیں کہ آپ جو ایسی بات کو جسے قریب قریب کل دنیا کے لوگ مانتے ہیں کھنڈن (رد) کرتے ہیں۔ آپ سے بڑھ کر...... کون ہے؟

معجزہ کی حقیقت صرف یہ ہے کہ عام مروجہ طریق کے خلاف واقعہ ہوتا ہے۔ جس کو سپر نیچرل (خلاف قانون قدرت) کہتے ہیں۔ بس اس امر کی تحقیق پر سارا مدار ہے۔ اگر اس کا ثبوت ہو جائے کہ مروجہ عادت کے خلاف بھی ہوا یا ہوسکتا ہے اور کم سے کم فریقین (اہل اسلام اور آریہ) میں مسلم ہو جائے تو دونوں میں سے کسی کا حق نہیں کہ معجزہ پر اعتراض کرے پس آیئے ہم اسی اصولی مسئلہ کی وضاحت کرتے ہیں۔

ناظرین! یہ تو آپ لوگوں کو معلوم ہوگا۔ جس کی آپ شہادت دے سکتے ہیں کہ عام مروجہ طریق یہ ہے کہ انسان کو پیدائش سے پہلے کے حالات معلوم نہیں ہیں۔ نہ آئندہ بعد موت کے واقعات بتا سکتا ہے۔ گو آریہ سماجی موجودہ زندگی سے پہلی زندگی کے قائل ہیں لیکن اتنا وہ بھی مانتے ہیں کہ گذشتہ اور آئندہ واقعات کا علم کسی کو نہیں

ہوسکتا۔ہم اس کے متعلق سوامی دیانند جی کی ہدایت سناتے ہیں۔آپ سوال و جواب کی صورت میں لکھتے ہیں۔

کیا معجزات نہ دیکھنے والوں کی روایت معتبر نہیں

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

راویان احادیث جیسے ابن شہاب زہری اور کلینی وغیرہ جنہوں نے محمد ﷺ کے معجزات نقل کیے ہیں خود آنکھوں سے نہیں دیکھے تھے اور نہ محمد ﷺ کی زبان سے سنے تھے بلکہ ان کی وفات کے دوسوسال بعد ان کو یہ روایات پہنچی تھیں۔

جواب: معترض صاحب سے ہم پوچھتے ہیں کہ بھاگوت کتاب کو سکھدیو نے نہیں لکھا تھا بلکہ اس کو بطور افسانے کے زمانہ تنگ اور فرصت قلیل میں راجہ پرتچھت کے سامنے سنایا تھا اور یہ زمانہ ایک ہفتے پر محیط تھا۔

معترض کے ذمہ ہے کہ وہ اپنی معتبر کتابوں سے اس کتاب کے جامع اور مدون کا نام ثابت کریں۔

اور مہابھارت کتاب کو ضبط تحریر کرنے والے شخص کا اپنی معتبر کتابوں سے ثبوت پیش کریں جو بطور افسانے کے سوت رکھشیر کی بیان کردہ ہے۔

اور ان دونوں کتابوں کو یکے بعد دیگرے مسلسل روایت کے ساتھ جن لوگوں نے بیان کیا ہو ان کے نام بیان کیے جائیں۔

نیز بید کے راویوں کے نام ونشان پیش کیے جائیں جس طرح سے آئمہ احادیث نے احادیث کو روایت کیا ہے۔اس طرز سے ان کی سندیں سنائی جائیں۔

ورنہ اپنی ان کتابوں کا کلیلہ دمنہ اور مثنوی میر حسن کی طرح کی افسانہ کی کتابوں میں شمار کرو جن کا کوئی سلسلہ سند نہیں ہے اور قصہ گوئی پر مشتمل ہیں۔

ہماری کتب احادیث کی تدوین سندوں پر مشتمل ہے اور محدثین نے سندوں کے

ساتھ احادیث کی کتابوں کو مرتب کیا ہے۔ جیسے صحیح بخاری شریف، صحیح مسلم شریف وغیرہ ہم واقعہ معراج کی بعض حدیثوں کی سندیں بیان کرتے ہیں جو مصنفین کتب حدیث سے اوپر حضور علیہ السلام تک مسلسل اسناد کے ساتھ ثابت ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں:

حدثنا عمرو الناقد وزبیر بن حرب قالا ثنا سفیان بن عیینة عن ابی نجیح عن مجاهد عن ابی معمر عن عبداللّٰه قال انشق القمر علی عهد رسول اللّٰه ﷺ بشقتین فقال رسول اللّٰه ﷺ اشهدوا.

(بخاری ۴/۲۵۱ مسلم فی صفات المنافقین ۴۳،۴۴)

حدثنی زبیر بن حرب و عبدبن حمید قال حدثنا یونس بن محمد حدثنا شیبان حدثنا قتادة عن انس ان اُهل مکة یسألوا رسول اللّٰه ﷺ ان یریهم آیة فاراهم انشقاق القمر.

پہلی حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ

ہمیں عمرو الناقد نے اور زبیر بن حرب نے بیان کیا وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہمیں حضرت سفیان بن عیینہ نے حضرت ابونجیح سے انہوں نے حضرت مجاہد سے انہوں نے ابومعمر سے انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بیان کیا فرمایا کہ حضور علیہ السلام کے زمانے میں چاند دو ٹکڑے ہوا تھا اور حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ تم آنکھوں سے دیکھ لو۔

اور دوسری حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ

مجھے زبیر بن حوب اجور عبد بن حمید نے بیان کیا وہ دونوں فرماتے ہیں ہمیں یونس بن محمد نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں ہمیں شیبان نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں ہمیں قتادہ نے حضرت انس سے بیان کیا کہ اہل مکہ نے حضور علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ آپ ان کو کوئی معجزہ دکھائیں تو آپ

نے ان کو شق قمر کا معجزہ دکھایا تھا۔

یہ شق قمر کا معجزہ اور بھی کئی صحابہ کرامؓ کی سند سے اور صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین اور بعد کے حضرات سے زمانہ درزمانہ بہت سے لوگوں کا بیان کردہ موجود ہے۔

اب ہندوؤں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی کتابوں کو اس طرح کی سندوں سے ثابت کر کے دکھادیں ورنہ عقل اور حیا کا تقاضہ یہی ہے کہ مستند کتابوں کے مقابلے میں اپنی باطل اور من گھڑت کتابوں کو اپنی زبان پر نہ لائیں۔

ہندوؤں کی اور ترسائیوں کی اور یہودیوں کی کتابیں بلا لحاظ رواۃ و اتصال روایت کے محض بے سروپا مدون شدہ ہیں۔ دیکھو سلسلہ روایت مہابھارت بید بیاس تک بروایت سوت منتہی ہوا ہے حالانکہ سوت کو رایلرام نے نیمکھار میں مہابھارت کے واقعہ سے پہلے ذبح کردیا تھا۔ جیسا کہ بھاگوت اور اسکندوہم میں مفصلاً لکھا ہوا ہے پس اس واقعہ سے ظاہر ہوا کہ مہابھارت ایک جھوٹا قصہ ہے جو کسی جھوٹے نے گھڑ دیا ہے۔ (سوط اللہ الجبار ص ۲۲۹ تا ۲۳۰)

کیا دریائے قلزم کا عبور معجزہ نہ تھا

اعتراض: (ملحدوں کا اعتراض)

بعض ملحدوں نے جس طرح اور معجزات کا انکار کیا ہے، اسی طرح بنی اسرائیل کے عبور قلزم کا بھی انکار کیا ہے اور یہ توجیہ کی ہے کہ جزرومد تھا۔ یعنی جب سمندر کا پانی اتر ہوا تھا اس وقت بنی اسرائیل کا گزر ہوا اور ان کے پیچھے فرعون اور اس کا لشکر آیا تو اس وقت دریا کا چڑھاؤ تھا وہ لوگ سب ڈوب مرے نہ یہ کہ موسیٰؑ کی عصازنی سے سمندر کے دو ٹکڑے ہوئے تھے جیسا کہ اہل کتاب اور اہل اسلام کا عقیدہ ہے اور اپنے اس دعوے پر اس نے ایک دلیل عقلی اور ایک نقلی پیش کی ہے۔

دوسری دلیل نقلی وہ یہ ہے کہ گلاڈیس ٹالمی جس کو حکیم بطلیموس کہتے ہیں جو سنہ

عیسوی کی دوسری صدی میں تھا اور مصر میں رہا کرتا تھا اس لئے وہ بحر احمر کے حال سے زیادہ واقف تھا اس نے بحر احمر کا نقشہ لکھا تھا۔ اصل زبان یونانی ہے مگر اس کا ترجمہ لیٹن، جو ۱۶۱۸ء میں لوئیس سیزدہم شاہِ فرانس کے زمانہ میں چھاپا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے ہمارے پاس موجود ہے۔ اس میں تیس جزیرے بحر احمر میں مع نام بتلائے ہیں اور اب وہ جزائر نہیں (کیونکہ علم جیولوجی سے یہ بات ثابت ہے کہ جزائر بعض اسباب سے غرقاب ہو جایا کرتے ہیں اور کبھی دفعۃً نکل آتے ہیں) اس سے ثابت ہوا کہ بحر احمر کا اس زمانہ میں یہ زور شور نہ تھا کہ جو اہل اسلام کے زمانہ میں بارہ سو برس سے ہے۔ اس سے یہ یقین کامل ہو جاتا ہے کہ وہ مقام جہاں سے بنی اسرائیل اترے بلاشبہ جوار بھاٹے کے سبب رات کو پایاب اور دن کو عمیق ہو جاتا ہوگا اور موسیٰؑ کو پایاب اتر جانے کا رستہ معلوم تھا۔ پس حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل سمیت بحر احمر کی بڑی شاخ کی نوک میں سے جہاں ہم نے نقطوں کا نشان دیا ہے پار اتر گئے۔ صبح ہوتے جو فرعون نے دیکھا کہ بنی اسرائیل پار اتر گئے اس نے بھی ان کا تعاقب کیا اور لشکر کو غلط راستے سے دریا میں ڈال دیا، پانی بڑھ گیا۔ جس سے وہ سب ڈوب مرے۔ یہودیوں کی تقلید سے مفسرین نے ایک سیدھی سی بات کو ایک معجزہ خارج از قانون قدرت بنا دیا، حالانکہ قرآن سے ایسا ثابت نہیں۔

جواب: (اول) تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ نقشہ بطلیموس کے نقشہ کے موافق اور مطابق ہے۔

(دوم) یہ کیا ضروری ہے کہ بطلیموس کے زمانہ میں جو موسیٰؑ علیہ السلام کے سینکڑوں برس بعد کا ہے، بحر قلزم بدستور ہو ممکن ہے کہ بقواعدِ جیولوجی اس وقت یہ نئی حالت پیدا ہوئی ہو جو حضرت موسیٰؑ کے عہد میں نہ تھی اور اب پھر ویسی ہی ہو گئی۔

(سوم) اب بھی بحر احمر میں جزائر موجود ہیں۔ اس تقدیر پر زمانۂ بطلیموس میں اور زمانۂ حال میں فرق ثابت کرنا مدعی کے ذمہ ہے۔

(چہارم) یہ سب کچھ تسلیم بھی کیا جائے تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ بنی اسرائیل بحر قلزم کی نوک پر سے گزرے تھے جہاں کہ ایسا کنارہ تھا کہ پانی خشک ہو جاتا تھا۔ جہاں کہ مدعی نے نقطے لگائے ہیں۔

(پنجم) اگر یہ تھا تو کیا فرعون کو اس کنارہ کا علم نہ تھا اور جب کہ اس کے ساتھ سینکڑوں اس ملک کے واقف تھے تو مقتضائے قانون فطرت یہ تھا کہ وہ کنارے سے بھی دو چار کوس ہٹ کر گاڑیوں کو خشک زمین سے لے کر نکلتا۔

(ششم) اگر کنارہ پاس تھا تو سینکڑوں بنی اسرائیل پر کیا مصیبت پڑی تھی کہ وہ اس مقام سے گزرتے کہ جہاں پانی پایاب ہوگیا تھا اس لئے کہ گارا اور کیچڑ تو پھر بھی باقی رہتا ہے کہ جس میں چلنا بالخصوص بھاگنے اور خوف کے وقت مشکل ہوتا ہے بلکہ مقتضائے عقل یہ تھا کہ اس نوک سے دو ایک کوس کے فاصلے سے خشک زمین سے گزرتے۔ مدعی کہاں تک تاویل کرے گا۔

علاوہ اس کے قرآن مجید کے الفاظ سے پانی کا پھٹنا ثابت ہے۔

آیت اول: **فاوحینا الی موسیٰ ان اضرب بعصاک البحر. فانفلق فکان کلُّ فرق کالطّودِ العظیم. وازلفنا ثم الاٰخرین.**

ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے عصاء کو دریا پر مارے۔ اس نے مارا، پس دریا پھٹ گیا، اور ہر ٹکڑا بڑے پہاڑ کی مانند ہوگیا، اور لائے ہم اس جگہ دوسروں کو (شعراء) یہاں ضرب کے معنی چلنے کے کہنا اور فِــیْ مقدر ماننا اور اضــرب **بعصــاک فی البحر** عبارت بنانا نہایت نہایت نادانی ہے۔ اول تو بحر مفعول بہٖ ہے اس کو مفعول فیہ کہنا پڑے گا۔ دوم پھر بھی اقرار لازم آئے گا کہ موسیٰ عصاء کے ذریعہ سے دریا میں سے گزرے۔ سو یہ بھی خلافِ قانونِ قدرت ہے۔ تیسرے **فانفلق الخ** کے کیا معنی ہوں گے؟

(آیت دوم) **فاضرب لھم طریقاً فی البحر یبساً لا تخاف درکاً وّ لا**

تخشی. اے موسیٰ! بنی اسرائیل کے لئے دریا کے بیچ میں سے خشک راستہ نکال۔ (طٰہٰ)

(آیت سوم) واترک البحرر ھوا.

کہ دریا کو خشک چھوڑ دو۔ (دخان)

(آیت چہارم) واذ فرقنا بکم البحر.

اور ہم نے تمہارے لئے دریا کو پھاڑ دیا۔ (بقرہ)

اسی طرح تمام کتب تاریخیہ بالخصوص توراۃ سفر خروج کے ۱۴ باب میں ہے۔

(۲۲) اور بنی اسرائیل دریا کے بیچ میں سے سوکھی زمین پر ہو کر گزرے اور پانی کی ان کے دائیں اور بائیں دیوار تھی (۱۶) تو اپنا عصا اٹھا دریا پر مار اور اسے دو حصے کر۔ بنی اسرائیل دریا کے بیچوں بیچ میں سے سوکھی زمین پر ہو کے گزر جائیں گے۔ تعجب ہے کہ مدعی کے نزدیک توریت میں تحریف نہیں ہوئی۔ وہ تو معتبر نہ ہو اور لیٹن کا نقشہ معتبر مانا جائے۔ (تفسیر حقانی ۱/۱۹۸)

معجزے پہلے ظاہر ہوتے تھے تو اب کیوں نہیں

ترجمہ آیت:

ہم نے موسیٰ کو کتاب اور معجزے دیئے۔

اعتراض: (پنڈت دیانند کا اعتراض)

اگر موسیٰ کو کتاب دی تھی تو قرآن کا ہونا فضول ہے۔ یہ بات جو بائیبل اور قرآن میں لکھی ہے کہ اس کو معجزے کرنے کی طاقت دی تھی قابل تسلیم نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوا تھا تو اب بھی ہوتا۔ اگر اب نہیں ہوتا تو پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ خدا اور اس کی پرستش کرنے والے اب بھی موجود ہیں تو بھی اس وقت خدا معجزے کرنے کی طاقت کیوں نہیں دیتا؟ اور نہ وہ معجزے کر سکتے ہیں۔

جواب: معجزوں کی بابت خوب پرشن (سوال) کیا سوامی جی! بقول آپ

کے ابتداء دنیا میں اگر آدمی جوان جوان پیدا ہوئے تھے (ستیارتھ پرکاش سملاس) تو اب کیوں جوان جوان پیدا نہیں ہوتے اگر کہو کہ وہ بچے پیدا ہوتے تو ان کی پرورش کیلئے دوسرے انسان درکار ہوتے (حوالہ مذکور) جس سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ اب جوان جوان پیدا ہونے کی ضرورت نہیں تو ٹھیک اسی طرح چونکہ پیغمبر کوئی نہیں۔ اس لئے معجزہ نمائی کی بھی حاجت نہیں۔ آپ نے سوال تو کیا کہ معجزہ نمائی کی اب طاقت کیوں نہیں مگر یہ نہ سوچا کہ پہلے جو طاقت تھی وہ کن کو تھی؟ آج پنڈت جی ہوتے تو ہم ان سے پوچھتے کہ بتلایئے آپ کی زندگی میں تو آریہ سماج کو ویدوں کی تفسیر لکھنے کی طاقت تھی اب کیوں نہیں۔ کیوں آپ ہی کی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں کیوں آپ کے پونے دو ویدوں کی ٹیکہ (تفسیر) کو پورے دو بھی نہیں کر دکھاتے۔

لالہ صاحب ؎

کلاہ خسروی و تاج شاہی
بہر کل کے رسد حاشا وکلا

(حق پرکاش)

رحمۃ للعالمین ﷺ کیلئے تعدد ازدواج

اعتراض: (عام کفار کا اعتراض)

حضورؐ پاک کا ایک سے زیادہ شادیاں کرنا نفسانی خواہشات کی بنیاد پر تھا جبکہ اپنی امت کے مردوں کو چار چار شادیوں کی اجازت دی اور خود زیادہ شادیاں رچائیں۔

جواب: حضور اقدس ﷺ کی ذات والا صفات سراپا رحمت و برکت ہے۔ تبلیغ احکام اور تزکیہ نفوس اور ابلاغ قرآن آپ ﷺ کا سب سے بڑا مقصد بعثت تھا۔ آپ ﷺ نے اسلام کی تعلیمات کو قولاً و عملاً دنیا میں پھیلا دیا۔ یعنی آپ ﷺ بتاتے بھی تھے اور کرتے بھی تھے۔ پھر چونکہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے

جس میں نبیؐ کی رہبری کی ضرورت نہ ہو۔ نماز باجماعت سے لے کر بیویوں کے تعلقات، آل و اولاد کی پرورش اور پاخانہ پیشاب اور طہارت تک کے بارے میں آپ ﷺ کی قولی (زبانی) اور فعلی ہدایات سے کتبِ حدیث بھرپور ہیں۔ اندرونِ خانہ کیا کیا کام کیا۔ بیویوں سے کیسے میل جول رکھا۔ اور گھر میں آکر مسائل پوچھنے والی خواتین کو کیا کیا جواب دیا۔ اس طرح کے سینکڑوں (بلکہ ہزاروں) مسائل ہیں جن سے ازواج مطہرات کے ذریعہ ہی امت کو رہنمائی ملی ہے۔ تعلیم و تبلیغ کی دینی ضرورت کے پیش نظر حضور اقدس ﷺ کے لئے کثرت ازواج ایک ضروری امر تھا۔ صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے احکام و مسائل، اخلاق و آداب اور سیرت نبوی ﷺ سے متعلق دو ہزار دو سو دس روایات مروی ہیں جو کتب حدیث میں پائی جاتی ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی مرویات کی تعداد تین سو اٹھتر تک پہنچی ہوئی ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین (ص ۹ ج ۱) میں لکھا ہے کہ اگر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ جمع کیے جائیں جو انہوں نے حضور اقدس ﷺ کی وفات کے بعد دیئے ہیں، تو ایک رسالہ مرتب ہو سکتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کا روایت و درایت اور فقہ و فتاویٰ میں جو مرتبہ ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہے۔ حضور اقدس ﷺ کی وفات کے بعد حضرت عائشہؓ نے مسلسل اڑتالیس سال تک علم دین پھیلایا۔

بطور مثال دو مقدس بیویوں کا مجمل حال لکھ دیا ہے۔ دیگر ازواج مطہراتؓ کی روایات بھی مجموعی حیثیت سے کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تعلیم و تبلیغ کا نفع صرف ازواج مطہراتؓ کے ذریعہ سے پہنچا۔

انبیاءؑ کے مقاصد بلند اور پورے عالم کی انفرادی و اجتماعی، خانگی اور ملکی اصلاحات کی فکروں کو دنیا کے شہوت پرست انسان کیا جانیں۔ وہ تو سب کو اپنے اوپر قیاس کر سکتے ہیں۔ اسی کے نتیجے میں کئی صدی سے یورپ کے ملحدین اور مستشرقین

نے اپنی ہٹ دھرمی سے فخر عالم ﷺ کے تعدد ازدواج کو ایک خالص جنسی اور نفسانی خواہش کی پیداوار قرار دیا ہے اور اگر حضور اقدس ﷺ کی سیرت پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو ایک ہوش مند منصف مزاج کبھی بھی آپ ﷺ کی کثرت ازدواج کو اس پر محمول نہیں کر سکتا۔

آپ ﷺ کی معصوم زندگی قریش مکہ کے سامنے اس طرح گذری کہ پچیس سال کی عمر میں ایک سن رسیدہ صاحب اولاد بیوہ (جس کے دو شوہر فوت ہو چکے تھے) سے عقد کر کے عمر کے پچیس سال تک انہی کے ساتھ گزارہ کیا۔ وہ بھی اس طرح کہ مہینہ مہینہ گھر چھوڑ کر غار حرا میں مشغول عبادت رہتے تھے۔ دوسرے نکاح جتنے ہوئے پچاس سالہ عمر شریف کے بعد ہوئے۔ یہ پچاس سالہ زندگی اور عنفوان شباب کا سارا وقت اہل مکہ کی نظروں کے سامنے تھا۔ کبھی کسی دشمن کو بھی آنحضرت ﷺ کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب کرنے کا موقع نہیں ملا جو تقویٰ و طہارت کو مشکوک کر سکے۔ آپ ﷺ کے دشمنوں نے آپ ﷺ پر ساحر، شاعر، مجنون، کذاب، مفتری جیسے الزامات میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ لیکن آپ ﷺ کی معصوم زندگی پر کوئی ایسا حرف کہنے کی جرأت نہیں ہوئی جس کا تعلق جنسی اور نفسانی جذبات کی بے راہ روی سے ہو۔

ان حالات میں کیا یہ بات غور طلب نہیں ہے کہ جوانی کے پچاس سال اس زہد و تقویٰ اور لذائذ دنیا سے یک سوئی میں گذارنے کے بعد وہ کیا داعیہ تھا جس نے آخر عمر میں آپ ﷺ کو متعدد نکاحوں پر مجبور کیا۔ اگر دل میں ذرا سا بھی انصاف ہو تو ان متعدد نکاحوں کی وجہ سے اس کے سوا نہیں بتلائی جا سکتی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس کثرت ازدواج کی حقیقت کو بھی سن لیجئے کہ کس طرح وجود میں آئی۔

پچیس سال کی عمر سے لے کر پچاس سال کی عمر شریف ہونے تک تنہا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی زوجہ رہیں۔ ان کی وفات کے بعد حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ سے نکاح ہوا۔ مگر حضرت سودہؓ تو آپ ﷺ کے گھر تشریف لے

آئیں اور حضرت عائشہؓ صغرسنی کی وجہ سے اپنے والد کے گھر ہی رہیں۔ پھر چند سال کے بعد ۲ھ میں مدینہ منورہ میں حضرت عائشہؓ کی رخصتی عمل میں آئی۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر چون سال ہو چکی ہے اور دو بیویاں اس عمر میں آ کر جمع ہوئی ہیں۔ یہاں سے تعدد ازدواج کا معاملہ شروع ہوا۔ اس کے ایک سال بعد حضرت حفصہ رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا۔ پھر کچھ ماہ بعد حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا اور صرف اٹھارہ ماہ آپ ﷺ کے نکاح میں رہ کر وفات پائی۔ ایک قول کے مطابق تین ماہ آپ ﷺ کے نکاح میں زندہ رہیں۔ پھر ۱۲ھ میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔ پھر ۵ھ میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر شریف اٹھاون سال ہو چکی تھی۔ اور اتنی بڑی عمر میں آ کر چار بیویاں جمع ہوئیں۔ حالانکہ امت کو جس وقت چار بیویوں کی اجازت ملی تھی اس وقت ہی آپ ﷺ کم از کم چار نکاح کر سکتے تھے لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے بعد ۶ھ میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے۔ اور ۷ھ میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے اور پھر ۷ھ میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے پھر اسی سال حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔

خلاصہ: یہ کہ چون (۵۴) سال کی عمر تک آپ ﷺ نے صرف ایک بیوی کے ساتھ گزارہ کیا۔ یعنی پچیس سال حضرت خدیجہؓ کے ساتھ اور چار پانچ سال حضرت سودہؓ کے ساتھ گزارے۔ پھر اٹھاون (۵۸) سال کی عمر میں چار بیویاں جمع ہوئیں۔ اور باقی ازواج مطہراتؓ دو تین سال کے اندر حرم نبوی میں آئیں۔

اور یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ان سب بیویوں میں صرف ایک ہی عورت ایسی تھیں جن سے کنوارے پن میں نکاح ہوا۔ یعنی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ان کے علاوہ باقی سب ازواج مطہراتؓ بیوہ تھیں۔ جن میں بعض کے دو دو شوہر پہلے گزر چکے تھے۔ اور یہ تعداد بھی آخر عمر میں آ کر جمع ہوئی ہے۔

حضرات صحابہؓ مرد اور عورت سب آپ پر جاں نثار تھے۔ اگر آپ چاہتے تو سب بیویاں کنواریاں جمع کر لیتے۔ بلکہ ہر ایک ایک دو دو مہینہ کے بعد بدلنے کا بھی موقع تھا، لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔

نیز یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ اللہ تعالیٰ کے برحق نبی تھے۔ نبی صاحب ہوا و ہوس نہیں ہوتا۔ جو کچھ کرتا ہے اجازت خداوندی سے کرتا ہے۔ نبی ماننے کے بعد ہر اعتراض ختم ہو جاتا ہے اور اگر کوئی شخص آپ کو نبی ہی نہ مانے اور یہ الزام لگائے کہ آپ ﷺ نے محض شہوت پرستی کی وجہ سے اپنے لئے کثرت ازدواج کو جائز رکھا تھا تو اس شخص کو کہا جائے گا کہ اگر ایسا ہوتا تو آپ اپنے حق میں کثرت ازدواج کے معاملہ میں اس پابندی کا اعلان کیوں فرماتے جس کا ذکر قرآن کریم کی آیت: لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ. میں موجود ہے۔ اپنے حق میں اس پابندی کا اعلان اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے جو کچھ کیا اپنے رب کے اذن (اجازت) سے کیا۔

تعدد ازواج کی وجہ سے تعلیمی اور تبلیغی فوائد جو امت کو حاصل ہوئے۔ اور جو احکام امت تک پہنچے اس کی جزئیات اس قدر کثیر تعداد میں ہیں کہ ان کا احصاء دشوار ہے۔ کتبِ احادیث اس پر شاہد ہیں، البتہ بعض دیگر فوائد کی طرف یہاں ہم اشارہ کرتے ہیں۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت ابوسلمہؓ کی وفات کے بعد آپ نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ وہ اپنے سابق شوہر کے بچوں کے ساتھ آپ ﷺ کے گھر تشریف لائیں۔ ان کے بچوں کی آپ ﷺ نے پرورش کی۔ اور اپنے عمل سے بتا دیا کہ کس پیار و محبت سے سوتیلی اولاد کی پرورش کرنی چاہیے۔ آپ ﷺ کی بیویوں میں صرف یہی ایک بیوی ہیں جو بچوں کے ساتھ آئیں۔ اگر کوئی بھی بیوی اس طرح کی نہ ہوتی تو عملی طور پر سوتیلی اولاد کی پرورش کا خانہ خالی رہ جاتا اور امت کو اس

سلسلے میں کوئی ہدایت نہ ملتی۔ان کے بیٹے حضرت عمر بن ابی سلمہؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی گود میں پرورش پاتا تھا۔ایک بار آپ ﷺ کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے پیالے میں ہر جگہ ہاتھ ڈالتا تھا۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

سَمِّ اللّٰہَ وَکُلْ بِیَمِیْنِکَ وَکُلْ مِمَّا یَلِیْکَ.

اللہ کا نام لے کر کھا، داہنے ہاتھ سے کھا اور سامنے سے کھا۔

(بخاری، مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص ۳۶۳)

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ایک جہاد میں قید ہو کر آئی تھیں۔دوسرے قیدیوں کی طرح یہ بھی تقسیم میں آ گئیں۔اور ثابت بن قیس یا ان کے چچازاد بھائی کے حصہ میں ان کو لگا دیا گیا۔لیکن انہوں نے اپنے آقا سے اس طرح معاملہ کر لیا کہ اتنا اتنا مال تم کو دیدوں گی مجھے آزاد کر دو۔یہ معاملہ کر کے حضور ﷺ کے پاس آئیں اور مالی امداد چاہی۔آپ ﷺ نے فرمایا اس سے بہتر بات نہ بتادوں؟ وہ یہ کہ میں تمہاری طرف سے مال ادا کر دوں اور تم سے نکاح کر لوں۔انہوں نے بخوشی منظور کر لیا۔تب آپ ﷺ نے ان کی طرف سے مال ادا کر کے نکاح فرما لیا۔ان کی قوم کے سینکڑوں افراد حضرات صحابہؓ کی ملکیت میں آ چکے تھے۔کیونکہ وہ سب لوگ قیدی ہو کر آئے تھے۔جب صحابہؓ کو پتہ چلا کہ آپؐ کے نکاح میں آ گئی ہیں تو آنحضرت ﷺ کے احترام کے پیش نظر سب نے اپنے اپنے غلام باندی آزاد کر دیئے۔سبحان اللہ، حضرات صحابہ کرامؓ کے ادب کی کیا شان تھی۔اس جذبے کے پیش نظر کہ یہ لوگ سرکار دو عالم ﷺ کے سسرال والے ہو گئے ان کو غلام بنا کر کیسے رکھیں۔سب کو آزاد کر دیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس واقعہ کے متعلق فرماتی ہیں:

فلقد اعتق بتزویجه ایّاها مائة اهل بیت من بنی المصطلق فما اعلم امراة اعظم برکة علٰی قومها منها۔

ترجمہ: آنحضرت ﷺ کے جویریہؓ سے نکاح کر لینے سے بنوالمصطلق کے سو گھرانے آزاد ہوئے۔ میں نے کوئی عورت ایسی نہیں دیکھی جو جویریہؓ سے بڑھ کر اپنی قوم کے لئے بڑی برکت والی ثابت ہوئی ہو۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کے ساتھ ابتداء اسلام ہی میں مکہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ اور پھر دونوں میاں بیوی ہجرت کر کے قافلہ کے دوسرے افراد کے ساتھ حبشہ چلے گئے تھے۔ وہاں ان کا شوہر نصرانی ہو گیا۔ اور چند دن کے بعد مر گیا۔ آنحضرت ﷺ نے نجاشی کے واسطہ سے ان کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا۔ جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ اور وہیں حبشہ میں نجاشی ہی نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔ اور حضرت ابوسفیان اس وقت اس گروہ کے سرخیل تھے۔ جس نے اسلام دشمنی کو اپنا سب سے بڑا مقصد قرار دیا تھا۔ اور وہ مسلمانوں کو اور پیغمبر خدا ﷺ کو اذیت دینے اور انہیں فنا کے گھاٹ اتار دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ جب ان کو اس نکاح کی اطلاع ہوئی تو بلا اختیار ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: هُوَ الْفَحلُ لَا يُجدَعُ اَنفُهٗ. (یعنی محمد ﷺ جواں مرد ہیں۔ ان کی ناک نہیں کاٹی جا سکتی) مطلب یہ کہ وہ بلند ناک والے معزز انسان ہیں ان کو ذلیل کرنا آسان نہیں ہے۔ ادھر تو ہم ان کو ذلیل کرنے کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں اور ادھر ہماری لڑکی ان کے نکاح میں چلی گئی۔

غرض اس نکاح نے ایک نفسیاتی جنگ کا اثر کیا۔ اور اسلام کے مقابلہ میں کفر کے قائد کے حوصلے پست ہو گئے۔ اس نکاح کی وجہ سے جو سیاسی فائدہ اسلام اور مسلمانوں کو پہنچا اس کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے مدبر اور حکیم رسول ﷺ نے اس فائدہ کو ضرور پیش نظر رکھا ہوگا۔ یہ چند باتیں لکھی گئی ہیں ان کے علاوہ سیرت پر عبور رکھنے والے حضرات کو

بہت کچھ حکمتیں آپ ﷺ کے تعدد ازدواج میں مل سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں سیدی حکیم الامت قدس سرہٗ کے رسالے ''کثرت ازواج لصاحب المعراج'' کا دیکھنا بھی مفید ہوگا۔

یہ تفصیل ہم نے ملحدین و مستشرقین کے پھیلائے ہوئے پُرفریب جال کو کاٹنے کے لئے لکھی ہے۔ کیونکہ ان کے اس دام تزویر میں بہت سے وہ تعلیم یافتہ اور ناواقف مسلمان بھی پھنس جاتے ہیں جو سیرت نبوی اور تاریخ اسلام سے بے خبر ہیں اور اسلامیات کا علم مستشرقین ہی کی کتابوں سے حاصل کرتے ہیں۔

(معارف القرآن ۲:۲۸۹)

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

(۱) جیسا کہ آپ بنی آدم کے مردوں کے لئے رسول تھے ایسے ہی عورتوں کے بھی رسول تھے لہذا ضروری تھا کہ کچھ عورتیں آنحضرت ﷺ کی دائمی صحبت میں رہ کر آنحضرت ﷺ سے تعلیم پا کر دوسری عورتوں کو تعلیم و تبلیغ اسلام کریں سو اسی غرض کے لئے آنحضرت ﷺ نے بہ نسبت اپنی امت کے زیادہ بیویاں کی ہیں۔

آپ کی جسمانی و روحانی قوت بہ نسبت اوروں کے بہت بڑھی ہوئی تھی۔ آپ صوم وصال یعنی روزہ پر روزہ رکھ لیا کرتے تھے مگر امت کو اس سے منع فرمایا۔ لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں تو فرمایا تم میں مجھ سا کون آدمی ہے: ابیت عند ربی ھو یطعمنی ویسقینی. ترجمہ: یعنی میں اپنے پروردگار کے پاس شب باش ہوتا ہوں وہ مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔

(۳) آنحضرت ﷺ کے نکاحوں کے متعلق بڑی غلط فہمی عیسائیوں وغیرہ میں ہے کیونکہ آپ کے نکاحوں کی اصلی غرض یا تو محض ہمدردی و ترحم تھا یا مختلف قوموں کو ایک کرنا اور ان کے علاوہ بھی متعدد ملکی مصالح اور دینی اغراض تھیں مگر ہمارے مخالفین ان کی بنا نفسانی خواہشیں بتاتے ہیں۔ (نعوذ باللہ) ۔

تاریخ شاہد ہے کہ جس وقت آنحضرت ﷺ نے ۲۵ برس کی عمر میں نکاح کیا تو آپ عفت اور پرہیز گاری میں تمام عرب میں مشہور تھے۔ پھر اس کے بعد ۲۵ سال تک یعنی جب تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں۔ آپ نے دوسری بیوی سے نکاح نہیں کیا۔ حالانکہ عرب میں تعدد ازواج کی رسم بلا قید کسی شرط کے مروج تھی۔ پس ان لوگوں کا جو کہ ناحق نیک افعال میں بداغراض تلاش کرتے ہیں۔ یہ فرض ہے کہ وہ اس کا سبب بھی تلاش کریں کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ۵۴ سال کی عمر تک جب آپ بوڑھے ہو چکے تھے ایک سے زیادہ بیوی سے نکاح نہیں کیا اگر نفسانی خواہش کسی وقت ایک شخص کے دل میں غلبہ پا سکتی ہے تو وہ جوانی کا وقت ہوتا ہے جبکہ جذبات جوش میں ہوتے ہیں۔ مگر اس جوانی کے وقت آپ نے ایک بیوی پر ایسا اکتفاء کیا کہ جس وقت قریش نے جمع ہو کر آپ کو یہ کہا کہ آپ بت پرستی کو برا کہنا چھوڑ دیں تو ہم آپ کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں اور خوبصورت سے خوبصورت عورتیں آپ سے نکاح کرنے کے لئے حاضر کرتے ہیں تو آپ نے کچھ بھی پرواہ نہ کی۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ نفسانی خواہشوں کے غلبہ کا وقت جوانی کا وقت ہے اور چونکہ آپ کے اس زمانہ کی نسبت آپ کے سخت ترین دشمنوں کو بھی اقرار ہے کہ آپ اس وقت طہارت، پاکیزگی، عفت کا نمونہ تھے اس لئے یہ الزام کہ نفسانی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے آپ نے شادیاں کیں آپ کی ذات عصمت مآب پر سخت بہتان ہے۔

(۴) آنحضرت ﷺ کے ابتدائی زمانہ اور آخری زمانہ میں بڑا بھاری تغیر واقع ہو چکا تھا ابتدائی سالوں میں جب مکہ میں آپ نے تبلیغ شروع کی تو اگرچہ کفار کی طرف سے مسلمانوں کو طرح طرح کے دکھ اور اذیتیں پہنچتی تھیں مگر رشتہ داری کے تعلق منقطع نہیں ہو چکے تھے خصوصاً ایسے لوگ جو ذی عزت و وجاہت تھے وہ نسبتاً کفار کے حملوں سے محفوظ تھے اور ان سے تعلقات بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کی ایک

لڑکی ایک کافر سے بیاہی ہوئی تھی اور حضرت ابوبکرؓ کی لڑکی عائشہؓ کی منگنی بھی ایک کافر کے لڑکے جبیر بن مطعم سے ہوئی تھی۔ مگر مطعم نے بدیں وجہ انکار کر دیا کہ اس تعلق سے خوف ہے کہ لڑکا نئے دین میں چلا جائے گا۔اس کے بعد ہی حضرت عائشہؓ کا نکاح آنحضرت ﷺ سے ہوا۔اگر چہ ابتداء میں ایسے تعلقات تھے مگر آہستہ آہستہ یہ تعلقات منقطع ہو چکے تھے اور کسی مسلمان عورت کا کفار کے ہاتھ پڑ جانا اس کے لئے ہلاکت کا موجب تھا۔ پھر آپ کی ہجرت سے رہے سہے تعلقات بھی کٹ گئے۔ پس مسلمان لڑکیوں یا بیوہ عورتوں کے لئے ضروری تھا کہ مسلمان ہی ان کے خاوند ہوں۔

ان واقعات کو مدنظر رکھ کر ہم کو آنحضرت ﷺ کے نکاحوں کو دیکھنا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں کہ سوائے حضرت عائشہؓ کے آپ کی ساری بیویاں بیوہ عورتیں تھیں ان کو ہم الگ الگ جماعتوں پر تقسیم کرتے ہیں۔

اول وہ عورتیں جنہوں نے اپنے خاوندوں کے ساتھ حبش یا مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی اور دوسری وہ عورتیں جو کسی قوم کے سردار کی لڑکیاں یا بیوہ تھیں اور جن کے خاوند لڑائیوں میں مارے گئے۔ان کا ذکر ہم اسی ترتیب سے کرتے ہیں جس ترتیب سے ان کے نکاح ہوئے۔ام المومنین خدیجہؓ کی وفات کے بعد سب سے پہلے آپ نے ام المومنین [illegible]دہؓ سے نکاح کیا۔سودہؓ اور اس کا خاوند ابتداء ہی میں ہجرت کر کے حبش کو چلے گئے تھے اور اس جگہ وہ بیوہ ہو گئیں۔واپس آنے پر آنحضرت ﷺ نے آپ سے نکاح کیا۔

اس کے بعد ام المومنین حفصہؓ سے آپ کا نکاح ہوا یہ حضرت عمرؓ کی لڑکی تھیں۔ انہوں نے بھی اپنے خاوند کے ساتھ ہجرت کی تھی۔ جب آپ بیوہ ہو گئیں تو حضرت عمرؓ نے پہلے عثمانؓ کو اور پھر حضرت ابوبکرؓ کو حضرت حفصہ سے نکاح کرنے کے لئے کہا۔مگر ان دونوں نے انکار کیا۔اس کے بعد آپ کا نکاح رسول کریم ﷺ سے ہوا۔حضرت عمرؓ کا خود عثمانؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو کہنا بتاتا ہے کہ مسلمانوں کو کس قدر مشکلات تھیں۔

اس کے بعد ام المومنین ام سلمہؓ ہیں وہ بھی اپنے خاوند کے ساتھ اس پہلے گروہ میں شامل تھیں جو سب سے اول کفار کے ظلم سے تنگ آ کر حبش کو ہجرت کر گیا۔ ام سلمہ کے خاوند کی موت کا موجب ایک زخم ہوا جو ان کو ایک لڑائی میں لگا تھا۔

ام سلمہ کے بعد ام حبیبہؓ سے آپ نے نکاح کیا یہ قریش کے مشہور سردار ابوسفیان کی لڑکی تھیں۔ آپ مع اپنے خاوند کے اس دوسرے گروہ میں شامل تھیں جو ہجرت کر کے حبش کو چلا گیا تھا۔ وہاں ان کا خاوند عیسائی ہو گیا اور تھوڑے روز بعد مر گیا لیکن وہ اسلام پر قائم رہیں اور آنحضرت ﷺ کے نکاح میں آئیں۔

اس کے بعد آپ کا نکاح ام المومنین زینب بنت جحش سے ہوا ان کو زید بن حارث نے بوجہ نا اتفاقی طلاق دیدی تھی اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے نکاح میں آئیں۔

ام المومنین زینب بنت خزیمہ سے نکاح ہوا جو ام المساکین کے نام سے مشہور تھیں آپ کا خاوند احد کی جنگ میں شہید ہو گیا تھا۔ آپ خود بھی نکاح سے دو تین ماہ بعد ہی حضور ﷺ کے روبرو فوت ہو گئیں۔

ام المومنین میمونہؓ بھی مہاجرات میں سے تھیں اور بیوہ ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ کے نکاح میں آئیں۔

اب اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جس قدر عورتیں آپ کی ازواج مطہرات میں شامل ہوئی وہ سب کی سب ایسی تھیں جو ابتداء ہی میں مسلمان ہوئی تھیں اور آخر کفار کے ہاتھ سے طرح طرح کے دکھ اٹھا کر جلا وطنی اختیار کر کے دوسرے ملک میں انہوں نے پناہ لی اور وہ سب کی سب قریش کے شریف خاندانوں سے تھیں۔ ایک طرف تو وہ اپنے گھر بار کو چھوڑ چکی تھیں۔ اور اپنی جائیداد اور آسائش کو قربان کر کے صرف دین کی خاطر جلا وطنی قبول کی تھی۔ اب دوسری مصیبت یہ آ پڑی کہ ان کے خاوند جو محنت و مشقت کر کے ان کو کھلاتے تھے وہ بھی مر گئے یا جنگوں میں

شہید ہو گئے۔ اس بے کسی کی حالت میں ان کی تکالیف کا اندازہ کون کر سکتا ہے کیا جائز تھا کہ ان عورتوں کو کفار کی طرف واپس بھیج دیا جاتا تا کہ وہ طرح طرح کے دکھ دے کر ان کو مار ڈالتے یا کیا درست تھا کہ ان کو بغیر خبر گیری کے چھوڑ دیا جاتا تا کہ وہ خستہ حال ہو کر تباہ ہو جائیں۔ نہیں نہیں، اسلام یہ نہیں چاہتا کہ ان لوگوں کو جنہوں نے مذہب اور دین کی خاطر طرح طرح کے دکھ اٹھائے تھے یوں ذلت اور کسمپرسی کی حالت میں تباہ ہونے کے لئے چھوڑ دیا جاتا۔ یا خود اپنے ہاتھوں سے دشمنوں کے حوالہ کر دیا جاتا تا کہ جو ظلم چاہیں ان پر کریں۔ اس بے کسی کی حالت پر رحم کھا کر ہی رسول کریم ﷺ نے ان کو اپنی ازواج مطہرات ہونے کا شرف بخشا تا کہ جس عزت کو انہوں نے گھر بار چھوڑ کر دین کی خاطر چھوڑا تھا اس سے بھی دو چند عزت ان کو اس دنیا میں دی جائے۔

ام المؤمنین جویریہ اور ام المؤمنین صفیہؓ ان عورتوں میں سے تھیں جو قوم کے سرداروں کی لڑکیاں تھیں اور جنگوں میں گرفتار ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں۔

ان میں سے سابق الذکر یعنی حضرت جویریہؓ ایک کافر کی بیوی تھیں جو لڑائی میں مارا گیا۔ مال غنیمت میں وہ ثابت بن قیس کے حصہ میں آئیں ثابت نے بہت سا روپیہ رہا کرنے کے معاوضہ میں ان سے مانگا۔ جسے دے نہ سکتی تھی۔ چنانچہ آپ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور سارا قصہ آنحضرت ﷺ کے روبرو بیان کیا اور یہ بھی بیان کیا کہ میں اپنے قوم کے سردار کی لڑکی ہوں۔ پس آنحضرت ﷺ نے مناسب نہ سمجھا کہ وہ اپنی قوم میں واپس جائے تا کہ کوئی اور فساد نہ ہو اور خود روپیہ دے کر آپ نے ان سے نکاح کر لیا کیوں کہ عربوں کی غیرت یہ برداشت نہ کر سکتی تھی کہ ایک رئیس کی لڑکی ہو کر کسی کم درجہ کے آدمی کے نکاح میں جائے۔

ام المؤمنین صفیہ خیبر کی لڑائی میں ہاتھ آئی تھیں۔ پہلے دحیہ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ قیدی عورتوں میں سے ایک مجھے دی جائے جس پر آپ ﷺ نے اس

سے کہا جسے چاہے لے لو۔ انہوں نے صفیہ کو چنا۔ مگر لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ وہ ایک سردار کی لڑکی ہے۔ اور مناسب نہیں کہ آپ کے سواوہ کسی دوسرے کے قبضہ میں آئے یا نکاح کرے۔ اس بنیاد پر آپ ﷺ نے ان سے نکاح کیا۔

ان آخری دونوں نکاحوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان میں آنحضرت ﷺ کی غرض یہ تھی کہ ایک تعلق سے وہ کل کی کل قوم فساد سے رک جائے اور اسی طرح پروہ قومیں جن کی عمریں جنگوں میں گزرتی ہیں ایک ہو جائیں۔ یہ امر کہ اس ذریعہ سے آپ نے پوری پوری کامیابی حاصل کی ایسا صاف ہے کہ جس کے بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ (المصالح العقلیہ)

کیا حضورؐ کا تعدد ازواج زہد کیخلاف تھا؟

اعتراض: (بعض کفار کا اعتراض)

آج عیسائی فخر کرتے ہیں کہ ہمارے نبی تارک لذات تھے اور مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارے نبی تارک لذات نہ تھے متبع شہوات تھے کہ نو نکاح کیے۔

جواب: نصوص سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ تمام کمالات میں انبیاء علیہ السلام سے اکمل ہیں اس لئے یہ شبہ نہیں ہوسکتا۔ ترک لذات لازم زہد نہیں ورنہ حضور ﷺ نکاح نہ کرتے۔ بلکہ تقلیل لذات زہد کے لئے کافی ہے۔ سو حضور ﷺ نے جتنے نکاح کیے ہیں آپ کی اصلی قوت کے اعتبار سے وہ تقلیل لذات ہی میں داخل ہیں کیونکہ احادیث میں وارد ہے کہ صحابہ آپ ﷺ کے اندر تیس مردوں اور بعض روایات میں ہے کہ چالیس مردوں کی قوت کا اندازہ کرتے تھے اور ایک مرد کی قوت چار عورتوں کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے شریعت نے چار نکاح تک کی اجازت دی ہے اس اعتبار سے حضور ﷺ میں اتنی قوت تھی جو ایک سو بیس (۱۲۰) عورتوں کو اور دوسری روایت کے موافق ایک سو ساٹھ (۱۶۰) عورتوں کے لئے کافی تھی بلکہ شرح شفا

میں ابونعیم سے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ یہ چالیس مرد جنت کے مردوں میں سے ہیں اور ان میں ہر مرد کی قوت حسبِ روایت ترمذی ستر مردوں کے برابر ہوگی اور ایک روایت میں سو (۱۰۰) مردوں کے برابر آیا ہے تو ایک حساب سے آپ میں قریب تین ہزار مرد کے برابر اور ایک حساب سے چار ہزار مرد کے برابر قوت ہوئی پس حضور ﷺ کا نو بیویوں پر صبر کرنا یہ کمال زہد تھا۔ اور آپ اس پر بھی قادر تھے کہ بالکل صبر کر لیتے چنانچہ جوانی میں آپ ﷺ نے پورا صبر کیا کہ پچیس سال کی عمر میں چالیس سال کی بیوہ عورت سے نکاح کیا بھلا کنوارا مرد ایسی عورت سے نکاح کر سکتا ہے جو اس کی ماں بن سکے۔ ہرگز نہیں پس جوانی میں آپ کا چالیس سالہ عورت سے نکاح کرنا اور ساری جوانی اسی کے ساتھ بسر کر دینا اس کی کافی دلیل ہے کہ حضور ﷺ متبع شہوات ہرگز نہ تھے بلکہ آپ اعلیٰ درجہ کے زاہد تھے مگر بڑھاپے میں آپ ﷺ نے نو نکاح کیے تو ضرور آپ ﷺ کے ان نکاحوں میں کوئی حکمت تھی۔

(۱) چنانچہ ایک حکمت تو یہ تھی جو بعض عارفین نے بیان کی ہے کہ منشاء تکوین (تخلیق) عالم محبت ہے جیسا کہ **کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق.** سے معلوم ہوتا ہے کہ گو یہ حدیث ان الفاظ سے محدثین کے نزدیک ثابت نہیں مگر مضمون صحیح ہے جو حدیث **ان اللہ جمیل یحب الجمال** (مسلم ۱۴۷) سے ثابت ہے جس کی تقریر نکت دقیقہ کے مضمون ہشتم میں اور کلید مثنوی دفتر اول قبول کردن خلیفہ ہدیہ را تحت شعر گنج مخفی بدز پیری جوش کرد میں احقر نے کی ہے۔ دلیل کا ایک جز تو یہ ہوا، دوسرا جز یہ ہے کہ اس محبت تکوین کا مظہر سب سے زیادہ وقاع ہے کہ اس میں بھی محض محبت بواسطہ وقاع کے سبب ہو جاتا ہے تکون (پیدائش) ولد کا بغیر کسی تدبیر خاص کے جیسے تکوین عالم میں محض محبت بواسطہ کلمہ کن کے سبب ہو گیا تکون عالم بغیر کسی خاص تدبیر کے پس عارف کو عورت کے تلبس میں یعنی جماع میں محبت تکوین کی تجلی کا مشاہدہ ہوتا ہے اس لئے وہ نکاح کرتا ہے اور اسی

لئے جماع کی اس کو دوسروں سے زیادہ رغبت ہوتی ہے اور حدیث حُبّبَ الی من دنیاکم النساء. کا مبنی اسی راز کو بعض عارفین نے فرمایا ہے۔

(۲) دوسری حکمت حضور علیہ السلام کے نکاحوں میں یہ تھی کہ امت کو عورتوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کا طریقہ معلوم ہو۔ اگر آپ نکاح نہ کرتے اور عورتوں کے حقوق کی تعلیم دیتے تو اس کا زیادہ اثر نہ ہوتا کسی کو شبہ ہو سکتا تھا کہ حضور علیہ السلام نے خود تو نکاح کیا نہیں اس لئے بلا تامل عورتوں کے اتنے حقوق بیان فرما دیئے۔ نکاح کرتے تو شاید ان کو ان حقوق کا ادا کرنا مشکل معلوم ہوتا اور اب کسی کو یہ کہنے کا منہ نہیں کیونکہ حضور علیہ السلام نے امت سے زیادہ نکاح کر کے کھلا دیئے اور سب کے حقوق اس خوبی سے ادا فرمائے کہ اس کی نظیر کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ حقیقت میں بیویوں کے حقوق ادا کرنا بڑے عقل مند کا کام ہے۔ کیونکہ بی بی سے دو قسم کے تعلق ہوتے ہیں ایک علاقہ حاکمیت و محکومیت کا کہ مرد حاکم ہوتا ہے اور عورت محکوم دوسرا علاقہ محبیت و محبوبیت کا کہ مرد محب اور عورت محبوب ہوتی ہے۔ علاقہ (تعلق) حکومت کے ساتھ علاقہ محبت کی رعایت کرنا بڑا دشوار ہے اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر محبت کے حقوق ادا کرتے ہیں تو حکومت کے حقوق فوت ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ بیویوں کے عاشق مشہور ہیں وہ اکثر ان کی غلامی ہی کرنے لگتے ہیں۔ ان کی خاک حکومت نہیں ہوتی بیوی پر نہ کچھ رعب ہوتا ہے اور جو لوگ حکومت کے حقوق ادا کرتے ہیں ان سے محبت کے حقوق فوت ہو جاتے ہیں۔ دونوں کو جمع کرنا اور ہر ایک کے پورے پورے حقوق ادا کرنا کہ بی بی پر رعب بھی ہو حکومت بھی ہو اس کے ساتھ اس کا دل بھی شوہر سے کھلا ہوا ہو کہ بے تکلف ہنس بھی لے بول بھی لے مذاق بھی کر لے اور اس پر ناز بھی کر لے یہ انسان کامل کا کام ہے یہ حضور علیہ السلام ہی کر سکتے تھے یا وہ شخص کر سکتا ہے جو آپ علیہ السلام کا کامل متبع ہو۔ چنانچہ احادیث میں وارد ہے کہ ایک بار حضور اقدس علیہ السلام نے حضرت خدیجہؓ کو یاد فرمایا تو حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ آپ ان بڑھیا کو یاد فرمایا

کرتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اچھی آپ کو دے دی۔ حدیث میں ہے
فغضب حتی قلت والذی بعثک بالحق لا اذکرھا بعد ھذا الابخیر.
یعنی آپ کو غصہ آ گیا جس سے حضرت عائشہؓ ڈر گئیں اور بقسم عرض کیا کہ اب سے جب کبھی ان کا ذکر کروں گی بھلائی سے کروں گی۔ یہ حالت رعب کی حضرت عائشہؓ پر تھی جن کو سب سے زیادہ ناز تھا۔ تو دوسری ازواج کی تو کیا حالت ہوگی؟ تو ناز برداری کے ساتھ رعب کا جمع کرنا سرسری بات نہیں۔

(۳) تیسرے حضور ﷺ نے چند نکاح کر کے یہ بھی بتلا دیا کہ جس کی چند بیبیاں ہوں اسے سب کے ساتھ کس طرح عدل کرنا چاہئے۔ خصوصاً اگر ایک کے ساتھ محبت زیادہ ہو اور دوسریوں سے کم ہو تو اس وقت اپنی طرف سے کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے ایک کی ترجیح ظاہر ہو بلکہ امور اختیاریہ میں برابری کا پورا خیال رکھے چنانچہ آپ ﷺ نے یہ بھی کر کے دکھا دیا کہ باوجودیکہ آپ ﷺ کو حضرت عائشہؓ سے سب سے زیادہ محبت تھی مگر عدل میں کبھی آپ ﷺ نے فرق نہیں کیا۔ ان میں اور دوسری بیویوں میں بلکہ ہمیشہ سب میں عدل کی پوری رعایت فرماتے تھے۔ باقی دل کا ایک طرف زیادہ مائل ہونا یہ آپ ﷺ کے اختیار سے باہر تھا اس میں برابری کیسے کرتے۔

اسی لئے آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰھم ھٰذا قسمی فی ما املک فلا تلمنی فیما تملک ولا املک. (ابوداود ۲۱۳۴)

ترجمہ: اے اللہ یہ میری برابری ہے اس چیز میں جس پر مجھے قدرت ہے پس مجھ سے اس بات میں مواخذہ نہ کیجئے جس پر مجھے قدرت نہیں۔

اس میں میلان قلب ہی کی طرف اشارہ ہے جو حضرت عائشہؓ کی طرف زیادہ تھا۔ اور یہ بات آپ کی طرف سے نہ تھی بلکہ غیب سے ایسے سامان کئے گئے کہ خوانخواہ آپ ﷺ کے دل کو حضرت عائشہؓ کی طرف زیادہ میلان ہو۔ چنانچہ نکاح

سے پہلے حق تعالیٰ نے خود ایک حریر کے کپڑے میں فرشتہ کے ذریعہ سے حضرت عائشہؓ کی تصویر بھیجی تھی کہ یہ آپ ﷺ کی بیوی ہیں۔ جب آپ ﷺ نے اس کو کھولا تو حضرت عائشہؓ کی تصویر پر نظر پڑی اور وہاں یعنی عالم آخرت میں تصویر جائز ہے اگر تم وہاں اپنا فوٹو کھچواؤ گے تو ہم منع نہ کریں گے یہ معاملہ حق تعالیٰ نے کسی اور بیوی کے ساتھ نہیں کیا۔

دوسرے وحی میں یہ معاملہ تھا کہ کسی بیوی کے لحاف میں آپ پر وحی نہ آتی تھی سوائے حضرت عائشہؓ کے کہ ان کے لحاف میں بھی آپ ہوتے تو بے تکلف وحی آتی تھی۔

تو یہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے حضور ﷺ کو حق تعالیٰ ہی نے حضرت عائشہؓ کی جانب زیادہ مائل فرما دیا۔

پھر اس پر ان کی قدرتی ذہانت وفقاہت اور حسن سیرت سونے پر سہاگہ تھا اصل وجوہ آپ کی محبت کے وہی تھے جو پہلے مذکور ہوئے کہ حق تعالیٰ کو بھی حضرت عائشہؓ کے ساتھ سب بیبیوں سے زیادہ محبت تھی تو حضور ﷺ کو پھر کیوں محبت نہ ہوتی مگر بایں ہمہ سوائے محبت قلبی کے ظاہری برتاؤ آپ کا سب کے ساتھ برابر تھا۔ پھر آپ ﷺ نے جس وقت حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا ہے اس وقت حضور ﷺ کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی اور حضرت عائشہؓ کی نو سال کی تھی وہ بالکل بچی تھیں اور سوائے ان کے کوئی بی بی آپ کی کنواری نہ تھیں اس میں حکمت یہ تھی کہ آپ ﷺ کو امت کو یہ دکھلانا تھا کہ جس شخص کی عمر زیادہ ہو اس کو کنواری بچی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہئے۔ عموماً عادت یہ ہے ایسی صورت میں مرد کا برتاؤ اپنی عمر کے تقاضے کے موافق ہوا کرتا ہے۔ مگر حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو ان کی بچپن کی عمر کا تقاضا تھا۔ ان کے بچپن کی آپ پوری رعایت فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مسجد کے قریب میں حبشی لڑکے عید کے دن کھیل کود کر رہے تھے تو حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ حبشیوں کا کھیل کود دیکھو گی انہوں نے خواہش ظاہر کی تو حضور

ﷺ نے پردہ کر کے دیر تک ان کو کھیل دکھلایا۔ اور جب تک وہ خود ہی نہ ہٹ گئیں اس وقت تک آپ ﷺ برابر کھڑے ہو کر ان کو کھیل دکھلاتے رہے۔

حضرت عائشہؓ کو بچپن کی وجہ سے گڑیوں کے کھیل کا بہت شوق تھا اور محلہ کی لڑکیاں بھی ان کے پاس کھیلنے کے لئے آتی تھیں۔ جب حضور ﷺ گھر میں تشریف لاتے تو وہ لڑکیاں متفرق ہو جاتیں تو حضور ﷺ ان کو جمع کر کے پھر لاتے کہ آؤ بھاگتی کیوں ہو جس طرح کھیلتی تھیں کھیلتی رہو۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ میں مقابلہ بھی کیا کہ دیکھیں کون آگے نکلتا ہے اس وقت حضرت عائشہؓ ہلکی پھلکی تھیں وہ آگے نکل گئیں کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ آپ نے پھر مسابقت کی اس وقت حضرت عائشہؓ کا بدن بھاری ہو چلا تھا اس مرتبہ آپ آگے نکل گئے تو آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ اس کا بدلہ ہے۔

بتلایئے کنواری بچی کی دلجوئی اور دلداری اور اس کے جذبات عمر کی رعایت بڑھاپے میں کوئی مرد اس طرح کر سکتا ہے جس طرح حضور ﷺ نے کی حاشا وکلا، بوڑھوں سے یہ بہت دشوار ہے مگر ہمارے حضور ﷺ نے اپنے بڑھاپے میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو جوان شوہر کو جوان بی بی کے ساتھ کرنا چاہئے بلکہ کوئی جوان بھی اتنا نہیں کر سکتا جتنا حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ کیا۔

(وعظ تقلیل الکلام صفحہ ۳۲)

حضرتؐ کے کثرت ازدواج پر اعتراض اور اس کا جواب

اعتراض: آنحضرت ﷺ پر اس موقع میں مخالفین اسلام یہ اعتراض کیا کرتے ہیں اور حضرت ﷺ کی سیرت پاک پر دھبہ لگایا کرتے ہیں۔

قولہم، محمدؐ باوجود اس دعوے کے کہ میں خاتم المرسلین ہوں عورتوں کی طرف بڑے حریص تھے۔ قانون قدرت کے مطابق ہر مرد کو ایک عورت کافی ہے جو علاوہ

حاجت انسانی پورا کرنے کے اس کی ضروریات خانہ داری کو بھی بخوبی انجام دے سکتی ہے پھر متعدد عورتیں رکھنا ایک قسم کی شہوت پرستی ہے جو اولوالعزم لوگوں کی شان کے بالکل مخالف ہے۔ محمدؐ نے اور مسلمانوں کے لئے تو چار عورتوں کی حد لگا دی اور اپنے لئے کوئی حد ہی نہیں رکھی اور ایک وقت نو بیویاں اور کئی ایک حرمیں موجود تھیں۔ اوروں کے لئے تو نکاح کرنے کی بھی قید تھی اور اپنے لئے تو یہ بھی قید نہ رکھی بلکہ جیسا کہ اگلی آیتوں میں آتا ہے جو کوئی عورت نبی کو اپنا نفس بخش دے تو وہ نبی کو حلال ہے وامرة مؤمنة ان وهبت نفسها للنبی اور خود زید کی بیوی کو بغیر نکاح کے رکھ لیا اور کہہ دیا کہ میرا نکاح آسمان پر فرشتوں نے پڑھا دیا ہے۔ اور بھی ایسے واقعات گزرے ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے ایک عورت کا شہرہ حسن سن کر کسی کو بھیج کر اس کو بلایا اور عائشہ کے ڈر سے اس کو باہر باغ میں اتارا اور جب آپ ﷺ نے اس پر ہاتھ دراز کیا تو اس نے کہا میں اللہ کی پناہ مانگتی ہوں یعنی آپ ﷺ کو پسند نہیں کیا پھر آپ ﷺ کو برا معلوم ہوا جس لئے اس سے صحبت نہ کی۔

اس کے علاوہ اور مسلمانوں کو تو عورتوں میں عدل و انصاف کرنے کا حکم دیا کہ باری سے ہر ایک کے پاس رہا کریں اور اپنے لئے یہ بھی فرض نہ تھا جیسا کہ اگلی آیت میں آتا ہے۔ ترجی من تشاء منهن وتؤوی الیک من تشاء۔ اسی لئے عائشہ جل کر کہتی ہیں کہ کیا کوئی عورت اپنا نفس بھی ہبہ کرتی ہے اور جب یہ آیت ترجی اتری تو کہا کہ اے محمدؐ اللہ تیری خواہشوں کو بہت جلد پوری کرتا ہے (بخاری و مسلم) اس لئے محمد کی بیویوں میں بڑا جھگڑا رہا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک بار سب عورتیں آپ سے چمٹ گئیں ایک کہتی تھی مجھ سے صحبت کر، دوسری کہتی تھی مجھ سے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور حجروں کے باہر ابوبکرؓ نے یہ بے ہودہ باتیں سن کر کہا کہ اے محمد نماز کو آیئے اور ان کے منہ میں خاک ڈالیے۔ اس بات کو بھی بخاری نے نقل کیا ہے تو بہ تو بہ یہ شہوت پرستی اور یہ دعویٰ، اور لطف یہ کہ اتنی تو بیویاں کیں اور اس قدر ان پر سخت احکام

مقرر کیئے اس پر روٹی کپڑا مانگنے سے منع کر دیا۔ پہلے انبیاء نے ایسا نہیں کیا۔ حضرت مسیح نے تو سرے سے کوئی بھی عورت نہیں کی اور دنیا میں جس قدر با کمال لوگ آئے ہیں وہ عورتوں سے نفرت ہی کرتے آئے ہیں ان کو شہوت پرستی سے کیا علاقہ؟

جواب تحقیقی:

اگر منصف مزاج ذرا بھی انصاف کرے تو سب اعتراض اٹھ جائیں۔ یہ بات تمام اہل تاریخ کے نزدیک مسلم ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مکہ میں عین جوش جوانی کے وقت جو انسانی قویٰ کے موجیں مارنے کا زمانہ ہوتا ہے ایک بڑھیا عورت سے نکاح کیا۔ یعنی خدیجۃ الکبریٰ ؓ سے جو حضرتؐ سے عمر میں بہت زیادہ تھیں۔ وہی پاک باز عورت آپ کو غار حرا کے خلوت خانہ میں دو چار روز کا کھانا پانی دے کر آیا کرتی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد ایک اور عورت عمر رسیدہ سیاہ فام سے نکاح کیا جن کا نام حضرت سودہؓ تھا باون برس کی عمر تک جو انتہاء جوش جوانی کا موقع تھا یکے بعد دیگر انہیں بیویوں کے ساتھ زندگانی بسر کی باوجودیکہ آپؐ خاندانی تھے نہایت خوبصورت بھی تھے اور قریش آپ کو حسین مہ جبین عورتوں کا لالچ بھی دیتے تھے اور عرب کے دستور کے موافق مکہ جو آپ کا وطن تھا متعدد حسین نوجوان عورتوں کا میسر آ جانا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ کم مرتبہ کے آدمیوں کے پاس مکہ میں متعدد عورتیں رہتی تھیں اور یہ بات عرب کے نزدیک کچھ معیوب بھی نہ تھی مگر آپؐ نے مطلق توجہ بھی نہ فرمائی۔

ہجرت کے کچھ دنوں بعد صدیق اکبرؓ نے بڑی التجا کے ساتھ اپنی دختر نیک اختر عائشہؓ سے جو چھے برس کی لڑکی تھیں صرف نکاح کر دیا تھا جو بمنزلہ منگنی کے تھا۔ رخصت نہ کی تھی اور کرتے بھی تو یہ نہایت صغیر سن تھیں مدینہ میں آ کر جہاں ہر طرف سے مصیبت کے دروازے کھل گئے اور تمام عرب دشمن ہو گیا۔ ادھر مہاجروں کی فکر بھی آپؐ ہی کے سر پر پڑ گئی تھی حضرت عائشہؓ کو جوان ہونے پر رخصت کیا۔ اب اس

پردیس میں اور اس مصیبت کے زمانے میں اور اس تنگ دستی میں کہ ہفتے کے ہفتے بے روٹی کے گزر جاتے تھے کھجور کے چند دانوں اور پانی پر بسر اوقات ہوتی تھی اور اس عمر میں کہ پچاس سے تجاوز ہوگئی جوانی کے زور جاتے رہے بڑھاپا آ گیا کون دانشمند کہہ سکتا ہے کہ آپؐ نے اتنی بیویاں شہوت پرستی کے لئے کی تھیں اور معاشرت کا طریقہ نفرت انگیز اختیار کیا تھا؟ پردیس میں تو اپنی عزت بڑھانے کے لئے خصوصاً اس قوم میں جا کر جو مددگار اور خاص مرید ہوں کوئی نفرت کی بات ہو تو لوگ چھوڑ دیا کرتے ہیں کہ مبادا لوگ بداعتقاد ہو جائیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ آپؐ سے کوئی انصار و مہاجر بد اعتقاد نہ ہوئے۔ پس عقل سلیم تاریخی واقعات پر نظر کر کے صاف صاف کہہ دے گی کہ اتنی بیویاں اور ان کے ساتھ یہ برتاؤ شہوت پر مبنی نہ تھا اور جو ہوتا بھی تو یہاں آ کر اس قدر عورتوں نے کیوں ازواج مطہرات میں داخل ہونے کی رغبت کی مکہ میں جوانی کے وقت نہ کی؟

معلوم ہوا کہ یہ اور بات تھی وہ یہ کہ حضرتؐ جس طرح خاتم المرسلین بنائے گئے تھے اسی طرح آپؐ کے دین میں حلت و حرمت، طہارت و نجاست مرد و عورت کے سب احکام تھے۔ مردوں میں سے تو علم دین سیکھنے کے لئے ایک جماعت اس کام کی ہو کر درِ دولت پر آ پڑی تھی جن کو اصحاب الصفہ کہتے تھے۔ اسی طرح عورتوں کی جماعت بھی اس کام کے لئے پر زور تھی کہ وہ عورتوں کو تعلیم دیا کریں۔ خصوصاً وہ مسائل جو عورتوں سے متعلق ہیں اور جن کا ذکر غیر مرد سے سننا شرم کی بات ہے اب یہ جماعت نساء اگر محض شاگردوں کے سلسلہ میں ہوتی اول تو آپؐ ان اجنبی عورتوں سے وہ شرم کے متعلق مسائل حیض و نفاس غسل و جنابت بیان کرتے شرم کرتے اور وہ بھی ان کے دریافت کرنے سے شرم کرتیں مقصود فوت ہو جاتا۔ دوم شاگردوں کا خلوت و جلوت میں رہنا ضروری بات ہے جو قولاً و فعلاً ہر قسم کی تعلیم پا سکیں اور اگر ایسا ہوتا تو لوگوں کو اجنبی عورتوں کے ساتھ رہنے سے بدگمانی ہوتی۔ سوم مردوں کی جماعت تعلیم

پانے کے وقت صبر اور محنت کشی سے اپنے رزق کا فی الجملہ آپ بندوبست کر سکتے ہیں اور کچھ نہیں تو لکڑیوں کا گٹھا لا کر بیچ سکتے ہیں بخلاف عورتوں ضعیف البنیان کے، اس لئے ان کا بندوبستِ رزق وحاجات بھی حضرتؐ ہی کے ذمہ ٹھہرا اس لئے ان تلامذہ کو سلسلۂ نکاح میں داخل کرنا پڑا۔ اگر غیر کی بیویاں ہوتیں تو ان کے خاوند ان کو اس قدر مہلت کیوں دیتے۔

اور نیز اس میں یہ بھی مقصود تھا کہ آپ لوگوں کو صفتِ توکل تعلیم کریں کہ عورتوں کی کج خلقی برداشت کرنے کے عرب عادی ہو جائیں جو بے رحمانہ برتاؤ کیا کرتے تھے اور لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ آنحضرت ﷺ اس عیال داری پر کسی کی بھی پروانہ کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک بیوی کر کے سو کا غلام بننا پڑتا ہے اور بہت سی باتوں میں حق سے چشم پوشی کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا اس لئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان نیک بیویوں کو جو دینی مدرسہ کی طالب علم تھیں اور وجوہِ مذکورہ سے بضرورت ان کو سلسلۂ زوجیت میں لایا گیا تھا۔ یہ سنا دیا یٰنساء النبی لستن کاحد من النساء کہ تم اور عورتوں جیسی عورتیں نہیں ہو تم خاص دین کے لئے اس بیت العلوم میں داخل کی گئی ہو اور اسی لئے وہ زوجیتِ معمولی سمجھ کر اور عورتوں کی طرح آرائش وتجمل کے سوالات کر کے حضرتؐ کو تکلیف دیتی تھیں ان کو اختیار دیا گیا جس پر وہ سمجھ گئیں جب یہ بات تھی تو پھر آپؐ کے اس مدرسہ یا بیت العلم میں داخل ہونے کے لئے کس لئے تعداد مقرر ہوتی؟ پھر کسی قدر کیوں نہ آئیں۔ بشرطِ صلاحیت لینا ہی پڑتا تھا اور اسی لئے اس داخلہ کے لئے نکاح کا لفظ خاص نہ ہوا نفس کے بخشنے اور دیگر امورِ مقررہ ان کی توسیع کے لئے جائز قرار پانے ضرور ہوئے اور اسی لئے پھر اور گواہوں کی بھی وہبت نفسی میں ضرورت نہ ہوئی۔ اور اس لئے بیویوں کی طرح باری کے ساتھ ان کے پاس رہنا ضروری نہ ہوا گو آپؐ اس پر بھی باری سے رہتے تھے اور ان کی اطمینان قلبی کی باتیں ملحوظ رکھتے تھے۔

اور اگر کوئی عورت دور سے آئی ہو اور پھر اس کو مصائبِ دنیا دیکھ کر اس بیت العلم میں داخل ہونا منظور نہ ہوا تو آپؐ نے داخل نہ کیا اور باغ میں اتارنا کوئی عیب کی بات نہیں۔

رہا عورتوں کا باہمی جھگڑا سو یہ ان کی جبلی بات ہے اور معاذ اللہ اس شب میں وہ پاک باز بیویاں امر خاص کے لئے آپؐ سے خواستگار نہ تھیں۔ بات یہ تھی کہ آپؐ ایک کے گھر تشریف لے گئے۔ حضرتؐ کے انفاس متبرکہ کو ہر ایک غنیمت جانتی تھیں اور بھی آ گئیں اس گھر والی کو ناگوار گزرا جو ایک طبعی بات ہے اس پر باہم کچھ قیل وقال تھی جس کو سن کر صدیق اکبرؓ اس وجہ سے کہ ان کی صاحبزادی بھی ان میں شامل تھیں۔ عورتوں پر بزرگانہ طور پر خفاء ہوئے۔ اصل بات یہ تھی اب مخالف اس کو جس پیرایہ میں چاہے ڈھالے۔

جواب الزامی:

حضرت سلیمان اور داؤد علیہما السلام کی بیویاں اور حرمیں تو سینکڑوں تھیں پھر عیسائی اور یہودی ان کی کتابوں کو الہامی مانتے ہیں۔ اسی طرح ہنود کے ہاں کرشن جی کی چودہ سو گوپیاں ناچا گایا کرتی تھیں اب خواہ اس کو آریا لوگ بھجن کہیں یا کچھ اور ہم کچھ نہیں کہتے۔ رہا تعددِ ازواج کا اعتراض سو اس کا جواب کئی بار ہو چکا کہ انسانی ضرورتیں بعض اوقات ایک بیوی سے پوری نہیں ہوسکتیں۔ اور پہلی کا بغیر قصور چھوڑ دینا انسانی مروت کے خلاف ہے اور فرض کرو مرض یا کسی وجہ سے اولاد جننے کی اس میں صلاحیت نہیں پس اسلام نے بضرورت تعددِ ازواج کی اجازت اور وہ بھی مشروط دی کہ عدل پورا ہو۔ (تفسیر حقانی ۴/۳ تا ۶)

امتیوں کو چار اور حضورؐ کو زیادہ بیویوں کی اجازت کیوں؟

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

عام مسلمانوں کی بہ نسبت حضور پاک کو زیادہ بیویوں کی اجازت کیوں ملی؟

جواب: عام مسلمانوں کو ایک وقت میں چار شادیوں کی اجازت ہے حضور کی ایک وقت میں نو بیویاں تھیں اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ تمام مسلمانوں کی بیویوں کی تعداد چار ہے اور حضور کی زیادہ ہے بلکہ اگر اس نسبت سے دیکھا جائے کہ حضور علیہ السلام نے اپنی بیویوں کو طلاق بھی نہیں دی اور ایک وقت میں نو سے زیادہ آپ نے نکاح بھی نہیں کیے اور عام مسلمانوں کو دیکھا جائے کہ وہ ایک وقت میں چار بیویاں کر سکتے ہیں اگر وہ کسی کو طلاق دے دیں اور اس کی جگہ اور نکاح کرنا چاہیں تو اس طرح سے ان کے لئے کوئی حد بندی نہیں ہے تو وہ نو سے بھی زیادہ نکاح کر سکتے ہیں اس طرح عام مسلمانوں کو حضور علیہ السلام سے بھی زیادہ بیویوں کی اجازت ظاہر ہوئی۔ (سوط اللہ الجبار ص ۱۸۱)

حضورؐ اپنی بیویوں کو اپنی امت کی مائیں قرار دیتے ہیں

اور امت کے مردوں کی بیویوں سے نکاح کو جائز قرار دیتے ہیں

اعتراض: (بیس برن لالہ اندر من ہندو کا اعتراض)

حضور علیہ السلام اپنی بیویوں کے بارے میں اور حکم رکھتے ہیں کہ ان کی بیویاں دوسرے کے نکاح میں نہیں آسکتیں اگر یوں کیا جائے کہ محمد کی ازواج دیگر مسلمانوں کے حق میں ماں کا درجہ رکھتی ہیں اور مسلمانوں کی بیویاں حضور کے حق میں بیٹوں کی بیویوں کا حکم رکھتی ہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ محمد کے فرمانبردار حضور کی بیویوں کو ماں کا درجہ دیں اور حضور ان کی بیویوں کو اپنے نکاح میں داخل کریں۔ انتھی

جواب: تمام مذہبوں میں حکمی اور حقیقی امور میں احکام ایک طرح سے نہیں ہوتے معترض نے یہ نہ دیکھا کہ جب گنگا پانی سے باہر آئی اور راجہ برنب کی زانوں پر بیٹھ گئی اور اس سے شادی کا تقاضا کیا تو راجہ برنب نے دائیں زانوں پر بیٹھنے کی وجہ سے اس کو اپنی بیٹیوں میں شمار کیا اور اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا لیکن اپنے

بیٹے یعنی راجہ سنتین کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا۔ اسی طرح سے کنتی کا بیٹا ارجن مہا بھارت اور جوگ بشسٹ کی تشریحات کے مطابق اوتاروں میں سے ہے۔

جب راجہ بیراٹ نے اپنی بیٹی کا نکاح ارجن کے ساتھ کرنا چاہا جس نے اس کی بیٹی کو ناچنے اور گانے کی تربیت دی تھی راجہ جدہشٹر نے ارجن کی طرف دیکھا تو ارجن نے کہا یہ لڑکی میرے باپ کی بیٹی کے حکم میں ہے جدہشٹر نے راجہ بیراٹ سے کہا کہ بیٹی کو میرے سامنے پیش کرو تمہاری بیٹی ہماری بیٹی کے حکم میں ہے مگر اس کا نکاح بھمن کے ساتھ کر دو جو ارجن کا بیٹا ہے انتہیٰ

غور کیجئے یہ معاملہ سری کرشن کے سامنے واقع ہوا اگر حقیقی اور حکمی امور میں فرق نہیں ہے تو ان لڑکیوں کے نکاح جو حکمی باپ کے بیٹوں کے ساتھ ہوئے یہ منعقد نہ ہوتے' اور اس قصے کی تفصیل د پرب اور بیراٹ پرب مہا بھارت میں موجود ہے۔

معترض جو خود اپنے مذہب کے اصول اور فروع سے جاہل ہے وہ نہایت تعصب سے یہ اعتراض کرتا ہے خود اس کے مذاہب پر لوٹتا ہے۔

(سوط اللہ الجبار ص ۱۸۲)

حضرت عائشہؓ سے کم عمری میں نکاح

اعتراض:

حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے نو سال کی کم عمری میں شادی کر کے شہوت رانی کا کام کیا ہے۔

جواب (۱): اہل اسلام اس بات کے قائل ہیں کہ جب رسول اکرم ﷺ سے امی جان حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نکاح ہوا تو اس وقت آپؓ ضرور نابالغہ تھیں اور یہ نکاح مکہ معظمہ میں ہجرت سے قبل ہوا تھا۔ مگر جب آپؓ کی رخصتی ہوئی تو اس وقت آپؓ بالکل عاقلہ اور بالغہ تھیں۔ چنانچہ ہمارے بزرگان دین اور علماء راسخین نے اس

بات کی تصریح فرمائی ہے۔ (دیکھو۔ نَوَوِی شرح مسلم صفحہ ۴۵۶)

اور یہ رخصتی ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں ہوئی تھی۔ یہ بات دلیل کی محتاج نہیں کہ مشرکین مکہ نبی اکرم ﷺ کے خون کے پیاسے اور آپ ﷺ کے خلاف پَر کا کبوتر بنانے میں یدِ طولیٰ رکھتے اور منافقین مدینہ بھی آپؐ کے جانی دشمن اور آپؐ کے خلاف پَر کی اڑانے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ مگر مشرکین مکہ اور منافقین مدینہ میں سے کسی نے بھی ان دونوں موقعوں (نکاح اور رخصتی) پر سرکار دو عالم ﷺ کے خلاف منہ کھولا نہیں اور زبان ہلائی نہیں اگر آپؐ کا یہ فعل مبارک ان کی نگاہوں میں برا، معیوب اور جرم ہوتا تو وہ لوگ ہرگز ہرگز معاف کرنے والے نہ تھے بلکہ وہ لوگ اس موقع پر ضرور فائدہ اٹھاتے اور آسمان سر پر اٹھا لیتے اور خوب دل کھول کر لیل و نہار، شب و روز اور رات دن آپؐ کے خلاف پروپیگنڈا کرتے۔ مگر ان کا ایسا نہ کرنا اس بات کا ٹھوس ثبوت اور بین دلیل ہے کہ یہ نکاح مبارک ان کی نظروں میں قابل اعتراض نہ تھا۔

اسی سن ۲۰۰۲ء میں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ امریکہ میں ایک آٹھ سال کی بچی کو لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اب کیا کہو گے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے اسے روکنے والا کوئی نہیں۔ اللہ رب العزت کی قدرت کاملہ کو ملاحظہ فرمائیے! کہ حضرت مریم صدیقہؑ کو عام عورتوں کے طریق کار سے علیحدہ یعنی بغیر خاوند لڑکا پیدا ہوا۔ تو یہودی اس مقام پر حضرت مریم صدیقہؑ کی شان اقدس میں نہایت گستاخانہ اور غیر شریفانہ الفاظ کہتے ہیں مگر یہودی تعصب و ضد میں گرفتار ہیں۔ گو بغیر خاوند حضرت مریم صدیقہؑ کے نور نظر پیدا ہوا ہے مگر عقل حیران اور بہت حیران ہے کیونکہ عام عورتوں کے خلاف ہوا ہے۔ تو بھی مسیحی دنیا اسے حق جانتی اور سچ مانتی ہے۔ تو بالکل اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہؓ عام بچیوں سے جلدی عاقلہ اور بالغہ ہو گئیں تو اس میں اس قدر حیرانی اور اس پر اعتراض کیوں ہے؟

اور اللہ حضرت حوا کو حضرت آدمؑ سے پیدا کر کے فوراً جوان کر سکتا ہے اور حضرت عیسٰی کے لئے حضرت مریمؑ کو بغیر خاوند کے ماں بنا سکتا ہے تو حضور ﷺ کے لئے نو سال کی عمر میں کھاتے پیتے ہونہار گھر میں اپنے ایک نبی کے لئے جلدی جوان نہیں کر سکتا۔ (جواب مسلم صفحہ ۲۳۷)

چیلنج کا جواب: پنڈت کالی چرن نے اپنے رسالہ 'وچتر جیون' کے صفحہ ۱۴۸ پر مسلمانوں کو چیلنج دیا ہے کہ ۶ سالہ لڑکی سے ترپن (۵۳) سالہ مرد کی صحبت کو طبی اصول پر صحیح کر دکھائیں۔ غالباً ان کا خیال ہے کہ اتنی عمر کی لڑکی نابالغہ ہوتی ہے۔ اس لئے عائشہ صدیقہ بھی نابالغہ ہو گی۔ ہم اصولاً ان سے متفق ہیں کہ نابالغہ لڑکی سے ملاپ صحیح نہیں مگر (۹۔۱۰) سالہ لڑکی اگر نابالغہ ہو تو آٹھ سالہ کیسے بالغہ ہو گی۔ جس کو ۲۴ سالہ نوجوان طاقتور کے حوالہ کیا جاتا پس اگر آٹھ سالہ ہے آریوں کے سلسلہ پیشوا منوجی اس بارے میں ہدایت فرماتے ہیں تیس برس کی عمر کا لڑکا اور بارہ سال کی دختر کا وادہ کرے یا چوبیس برس کا لڑکا اور آٹھ برس کی لڑکی کا وادہ کرے۔

(منوسمرتی باب ۹ شلوک ۹۴)

لڑکی کا چوبیس سالہ جوان سے ملاپ درست ہے تو دس سالہ لڑکی کا ترپن (۵۳) سالہ بوڑھے سے ملنا کیوں نادرست ہے؟ خاص کر اس حال میں کہ دس سالہ لڑکی بالغہ ہو اور ترپن سالہ طاقتور پیر نوجوان۔

سماجیو! شیشہ کا گھر بنا کر دوسروں پر پتھر برسانا
کہو جی کون دھرم ہے؟

نوٹ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے زفاف کے متعلق بعض علماء (مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹی وغیرہ) کی تحقیق یہ ہے کہ ممدوحہ کی بابت جو (۹۔۱۰) سال میں حضور کے گھر میں آنے کا ذکر آیا ہے اس سے مراد خاوند سے ملاپ نہیں بلکہ محض رخصتی ہے اس دعوے پر انہوں نے بہت سے حوالہ جات لغوی اور کتابی پیش کئے ہیں۔

مطلب ان کا یہ ہے کہ حضور ﷺ کی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد حضرت سودہ خانہ داری کی ذمہ دار تھیں جو بہت بوڑھی اور لحیم شحیم ہونے کی وجہ سے انتظام نہیں کرسکتی تھیں اس لئے آنحضرت ﷺ کی بہت سی ضروریات نامکمل رہ جاتیں اس لئے حضرت ابوبکر نے حضرت عائشہؓ کو رخصت کیا تاکہ حضور ﷺ کو خانگی امور میں تکلیف نہ ہو ملاپ کی عمر وہی ہے جو عموماً بالغہ لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ (مقدس رسول ۷۹)

مولانا محمد علی پھرایونیؒ تحریر فرماتے ہیں:

حضور علیہ السلام جب حضرت عائشہؓ کو نکاح میں لائے اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی اور جب آپ کی رخصتی ہوئی تو عمر نو سال تھی۔

نابالغ لڑکی کا نکاح ممنوع نہیں ہے اور ہندوؤں کا اس پر اعتراض کرنا ایسا کنواں کھودنا ہے جس میں وہ خود گرتے ہیں۔

چنانچہ اسکند پوران ادھیائے ۴۰ میں لکھا ہے۔

وہ گھر جس میں کوئی لڑکی بارہ سال کی بغیر خاوند کے ہو اس کا گناہ ایسے ہے جیسے اس نے اسقاط حمل کرایا ہو وہ لڑکی اگرچہ برہمن کے گھر پیدا ہوئی ہو شوذر (سب سے نچلی ذات) کے درجے میں ہے اور وہ شخص جو ایسی لڑکی سے نکاح کرے گا وہ بھی شودر کے حکم میں ہوگا۔ اپنی قوم سے نکل جائے گا اور اپنی بیوی سے مباشرت بالغ ہونے کے بعد کی جائے لڑکی کے بلوغ کا وقت نو سال ہے' اس عمر میں اس سے مباشرت ممنوع نہیں ہے۔ (سوط اللہ الجبار ص ۲۴۲)

حضور اور ان کی بیوی کا آپس میں دوڑنے پر اعتراض

اعتراض: (بیس برن لالہ اندر من ہندو کا اعتراض)

حضرت محمد ﷺ اور حضرت عائشہؓ نے آپس میں ایک مرتبہ دوڑ کا مقابلہ کیا تو

حضرت عائشہؓ آگے نکل گئیں دوبارہ ایک مرتبہ دوڑ کا مقابلہ کیا تو حضور پاک آگے نکل گئے اور فرمایا کہ اب ہم دنوں برابر ہو گئے۔

جواب: ابوداؤد شریف میں یہ حدیث حضرت عائشہؓ سے اس مضمون کی مروی ہے کہ ایک دن مَیں اور جناب رسالت مآب ﷺ سفر پر تھے۔ اور تیز چلے تھے تو میں آگے نکل گئی تھی بعد میں جب میں جسیم ہو گئی میرا جسم بھاری ہو گیا اسی طرح پھر تیز چلے تھے تو حضور ﷺ آگے نکل گئے تھے۔ (الحدیث)

اس قصے میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس میں عقلاً یا نقلاً کوئی برائی ہو۔ ان دنوں میں جب جنگیں خوب ہو رہی تھیں اور دشمنوں سے آمنا سامنا ہوتا رہتا تھا تو عورتوں پر تیز چلنے کی عادت ڈالنا لازم ہو گئی تھی اور یہ مصلحتوں سے خالی نہیں ہے۔

لیکن معترض صاحب اس قصے پر اعتراض کرتے ہیں مگر سری کرشن صاحب کے رقص کی حکایات پر اعتراض نہیں کرتے جو گوپیوں کی عورتوں کے ساتھ معاشرت اور ملاعبت اور رقص کی موجود ہیں وہ معترض کی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں۔ اگرچہ اس قصے کی تشریح طویل ہے لیکن اس مقام کا تقاضا ہے کہ اس کو ہندوؤں کی معتبر کتابوں سے مسلم الثبوت کے طور پر نقل کیا جائے چنانچہ سریمت بھاگوت میں لکھا ہے جس کا ترجم ہم سری للوجی لال کب برہمن گجراتی سے نقل کرتے ہیں:

سریکرشن چندر کارتک پونو کی رات کو نکل گھر سے باہر آئے دیکھیں تو نرمل اکاس مین تاری چھلک رہے ہیں اور چاندنی دسودسا مین پھیل رہی ہے سیتل سکند سہت مندگت پون بہہ رہی ہے اور ایک اور سگھن بن کی چھب ادبک ہی سو بھادے رہی ہے ایسا سماد یکھتے ہی ان کے من میں آیا کہ ہم نے گوپیوں کو یہ بچن دیا ہے کہ سردرت میں تمہارے ساتھ راس کریں گے سو پورا کیا چاہیے یہ بچار بن میں جائے کرشن نے بانسری بجائی بنسی کی دھن سنتے ہی سب برحناری برہ کی ماری کا ماتر ہوئے اَت

گھبرائیں ندان کوٹمب کی مایا چھوڑ کُل کان ٹیک گرہ کاج تج ہر بڑ ائے
اولٹا پلٹا سنگار کر اوٹھ دہائیں ایک گوپی جو اپنی پت کے پاس سے اوٹھ چلی
تو اس کے پت نی باٹ میں جاروکا اور پھیر کر گھرے لے آیا جانے نہ دیا
تب تو وہ ہر کا دھیان کر دیہہ چھوڑ سب سے پہلے جاملی اس کے چیت کی
پریت دیکھ کرشن چندر نے ترت مکت گت دی اتنی کتھا سن سریشکدیو جی
سے راجہ پریچھت نے پوچھا کہ کرپانا تھ گوپی نے سریکرشن جی کو ایشر جان
کے نہیں مانا کیول مکھی کی باسنا کر بھجا وہ مکت کیسی ہوئی سو سمجھا کے کہو
جو میرے من کا سندیہہ جائے سریکشدیو من بولے دہرما وتار جو جن
کرشن کی بن مہمان جانی بہی گن گاتے ہیں وے بھی نرسندیہ بھگت مکت
پاتے ہیں جیسے کوئی بن جانے امرت پئے گا وہ بھی اَمر ہو جائے گا اور جو
جان کر پئے گا اسے بھی وہی گن ہوگا یہ سب جانتے ہیں کہ پدارتھ کا گن
پھل بن ہوئے رہتا نہیں ایسے ہر بھجن کا پرتاب ہے کہ کوئی کسی بہاؤ سے
بھجی مکت ہوگی۔

دوہا جب مالا چھاپا تلک سری نہ ایکو کام
من کاجی ناچی برتھا ساجی راجے رام

اور سنجو جن نے جیسی بھواو سے کرشن کو مانکے مکت پائی سو کہتا ہوں کہ نند
جسووا نے تو پتر کر سمجھا گوپیون نے پت کر پوجا کنس نے یہی کر بیجا گوال
بالو نے متر کو جپا پانڈوں نے پرتیم کر جانا سسپال نے ستر کر مانا جد
بنسیون نے اپنا کرتھانا اور جوگی جتی منوں نے ایشر کر دھیایا پرانت میں
مکت پدراتھ سب ہی نے پایا جو ایک گوپی پربھو کا دھیان کر کے تری تو
کیا اچرج ہوا سری کرشن چندر نے مسکرائے گوپیونکو بولا کہا کہ
جو تم راجی ہو اس رنگ تو کھیلو راس ہمارے سنگ یہ بچن سن گوپی دکھ تج

پر سنتا سے چار اور گھر آئیں اور ہر مکھہ نر کہہ نر کہہ لوچن سپھل کرنے لگیں۔

دوہا ٹھاڑی بیچ جو سیام گھن یہہ چھب کا من کیل
متو تیل گر تری تین او بچے کنچن تیل

آ کی سری کرشن جی نے اپنی مایا کو آ گیا کی کہ ہم راس کرینگے اس کے لئے تو اچھا استھان رج اور یہان کھڑی رہو جو جو جس بست کی اگیا کری سو سولا ویجو اوس نے سنتے ہی جمنا تیر جائے ایک کنچن کا منڈلا کار بڑا چوتر ابنائے موتی ہیرے جڑ ادکی چارو اور پلو سہت کیلی کی کنہٹی لگائے تمین بند نوار بہانت بہانت کے پھلولون کے لا باندھ آسری کرشن چندر سے کہائی سنتے ہی پرسن ہو سب برج ناریوں کو ساتھ لے جمنا تیر کو چلے وہاں جای دیکھیں تو چندر منڈل سے راس منڈل کی چوتری چمک چوگنی سو بہادے رہی ہے اوس کے چارو اور ریتی چاندنی سے پھیل رہی ہے پون سکند ہت سیتل میٹھی میٹھی چل رہی ہے اور ایک اور سگھن بن کر ہریالی او جیالی رات میں ادبک چھب لے رہی ہے اس سمے کو دیکھتے ہی سب گوپی مگن ہو اوسی استھان کے نکٹ مان سرودر نام جو ایک تال تہال تسکے تیر جائے من مانی سہری بسترا بہو کہن پر نکہہ سکہہ نو سر نکار کر اچھی با جی بین پکھاوج آدہ سراندھ لے آئیں اور پریم مد مانی ہو سوچ سکوچ تج سری کرشن کے ساتھ مل لگیں بجانے گانے ناچنے اوس سمے سری گوبند گوپیونکی منڈلی کے بیچ ایسی سہاونی لگتے تھے جیسے تارا منڈل مین چندر مان۔

(سریمت بہا گوت ادھیائے ۳۰ راس لیلا کی برنن میں)

اس عبارت کا ترجمہ خلاصے کی صورت مین ہم سری للو جی لال کب برہمن گجراتی سے نقل کرتے ہیں۔ ذیل مین ملاحظہ فرمائیں۔

کاتک پونو (ہندی مہینوں کے نام، جیسے ستمبر اکتوبر کا موسم) کی رات

کرشن جیو گھر سے نکلے جب دیکھا کہ آسمان میں تارے چھٹک رہے ہیں اور سب طرف چاندنی پھیل رہی ہے اور ہوا خوشبودار چل رہی ہے اور فضاء صحرا کی عجب سماں دکھارہی ہے یہ سماں دیکھ کر مہاراج کے دل میں آیا کہ ہم نے گوپیوں سے اقرار کیا ہے کہ سرد موسم میں تمہارے ساتھ راس کریں گے اس وقت اس کو پورا کیا (جانا) چاہیے یہ دل میں ٹھان کر کرشن نے بانسلی بجائی بانسلی کی دھن سنتے ہی سب برج کی عورتیں عشق کی ماری ہوئی شہوت میں بھر کر بہت گھبرائیں غرض کہ خاندان کی شرم اور محبت ترک کر کے سب کو چھوڑ کر گھبرا کر اولٹا پلٹا سنگار کر (کے) اٹھ (کر) بھاگیں ایک گوپی جو اپنے شوہر کے پاس سے اٹھ کر چلی تو اس کے شوہر نے راہ میں جارو کا اور گھر کو پھر (کر) لایا اس نے ہر (سب) کا دھیان کر بدن چھوڑ کر سب سے پہلے جا ملی اس کے دل کی محبت دیکھ کر کرشن چندر نے اس کو فوراً نجات اخروی دی یہ کتھا سن کر پریچیت نے سکھدیو سے پوچھا کہ گوپی نے کرشن کو خدا جان کر نہیں مانا بلکہ ایک خوبصورت سمجھ کر اس کا شوق کیا اس کی اخروی نجات کیونکر ہوئی سکھدیو بولے کہ جو شخص کرشن کی حقیقت نہ جان کر ان کی تعریف کرتا ہے وہ بھی نجات پاتا ہے جیسے کوئی بغیر جانے ہوئے آب حیات پیئے وہ بھی نہ مرے گا اور جو جان کر پیئے گا وہ بھی وہی فائدہ اٹھائے گا ایسے ہی ہر تعریف کا خاصہ ہے کوئی کسی سمجھ سے کرے نجات ہوگی سنو جس نے جس عقیدے سے کرشن کو طلب کیا نجات پائی نند جسودا نے تو بیٹا سمجھا گوپیوں نے آشنا کر کے بوجا کنس نے ڈر سے یاد کیا گوال بالوں نے ساتھی کر کے یاد کیا پانڈون نے رفیق کر کے مانا سسپال نے دشمن کر کے مانا جدبنیوں نے اپنے خاندان کا کر کے ٹھانا جوگی جتی منوں نے خدا کر کے تصور کیا نجات سب

ہی کی ہوئی جو ایک عورت پر بہو کے دھیان میں نجات پا گئی۔ سری کرشن نے مسکرا (کر) سب گوپیوں کو پاس بلا (کر) یہ کہا کہ

جو تم راضی ہو اس رنگ میں کھیلو
ہمارے سنگ میں کھیلو

یہ سن کر گوپیاں رنج سے آزاد ہو کر خوشی سے اس کے ارد گرد ہر چہار طرف گھیرا ڈال کر کرشن چندر برج کی سب عورتوں کو ساتھ لئے جمنہ کے کنارے چلے وہاں دیکھا کہ پانی اور پھولوں اور چاندنی کا کچھ عجب سماں بندھ رہا ہے اس سماں کو دیکھ کر برج کی گوپیاں دل میں مگن ہو کر مان سرور تالاب کے کنارے جا کر اچھے اچھے لباس پہن کر بہت نک سک سے درست ہو کر اچھا سنگار کر کے اچھے باجے بین پکھاوج آدسر باندھ کر آئیں اور خاندان اور شوہروں کی غیرت اور شرم چھوڑ کر سری کرشن کے ساتھ مل کر گانے بجانے ناچنے لگیں اس وقت سری گوبند گوپیوں کی منڈلی میں ایسے خوشنما تھے جیسے ہالے میں چاند خوشنما ہوتا ہے۔ (سوط اللہ الجبار ص ۱۹۲ تا ۱۹۴)

حضورؐ کا اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی حضرت زینبؓ سے نکاح پر اعتراض

جواب: صحیح واقعہ حضرت زینبؓ کا یہ ہے کہ وہ حضور ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ اور آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہؓ کے نکاح میں تھیں۔ پھر زیدؓ نے ان کو طلاق دیدی۔ اور عدت گزرنے پر حضور ﷺ نے ان سے نکاح فرمایا۔ ہم اس سلسلہ میں سورۂ احزاب کی وہ آیتیں جو اس قصہ سے متعلق ہیں مع تفسیر کبیر کی عبارت کے ترجمہ کے نقل کرتے ہیں:

ترجمہ:- اور جب آپ ﷺ اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ

نے انعام فرمایا تھا۔ یعنی زیدؓ سے جن کو اللہ نے اسلام کی نعمت دی تھی اور خود آپ ﷺ نے اس پر انعام کیا تھا۔ یعنی آزاد کر دیا تھا کہ تم اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تھا۔ تو آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا تھا کہ روکے رکھو۔ یعنی طلاق نہ دو، اور اللہ سے ڈرو، بعض نے کہا کہ طلاق دینے کے سلسلے میں اللہ سے ڈرنا مراد ہے۔ اور بعض نے کہا کہ حضرت زیدؓ اکثر حضرت زینبؓ کی شکایتیں کیا کرتے تھے کہ وہ اپنی عالی نسبی کی بناء پر تکبر کیا کرتی ہے۔ اس آیت میں انہیں اس شکایت کے سلسلے میں خدا سے ڈرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اور آپ ﷺ چھپاتے تھے اپنے دل میں وہ بات جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا یعنی زینبؓ سے شادی کا ارادہ، اور آپ لوگوں سے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ یہ نہ کہنے لگیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دوسرے کی بیوی لے لی ہے یا یوں کہنے لگیں کہ بیٹے کی بیوی سے شادی کر لی ہے۔ اور اللہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ آپؐ اس سے ڈریں، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ لوگوں سے ڈرتے تھے، اور اللہ سے نہیں ڈرتے تھے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈرانے کا تنہا مستحق ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دوسری جگہ باری تعالیٰ نے فرمایا: وہ لوگ جو اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں۔ اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ اس کے بعد باری تعالیٰ فرماتے ہیں: پس جب زید نے اس (زینب) سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے اس کی شادی آپؐ سے کر دی۔ حاجت پوری کرنے سے مراد یہ ہے کہ جب انہوں نے اسے طلاق دیدی، اور عدت گذر گئی۔ اس لئے کہ جب تک کوئی بیوی کسی کے نکاح میں رہتی ہے تو وہ مرد کی

حاجت رفع کرتی رہتی ہے۔ اور شوہر اس کا ہر وقت محتاج ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں مرد عورت سے اپنی حاجت 'پوری' نہیں کر چکا ہوتا ہے اور نہ اس سے مستغنی ہوتا ہے، اسی طرح جب تک عورت عدت میں ہو تو مرد کو اس کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق رہتا ہے۔ اس لئے کہ ممکن ہے عورت کا رحم اس کے حمل سے مشغول ہو۔ لہذا عدت کے دوران بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مرد اس سے اپنی ضرورت 'پوری' کر چکا ہے۔ اس کے برعکس جب مرد اسے طلاق دیدے اور عدت بھی گذر جائے تو وہ اس سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ اس وقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی ضرورت 'پوری' کر لی۔ اور یہ بات شریعت کے بالکل موافق ہے، اس لئے کہ دوسرے کی بیوی یا اس مطلقہ سے جو عدت گزار رہی ہو نکاح جائز نہیں۔ اسی طرح باری تعالیٰ کا ارشاد: تا کہ مسلمانوں کے لئے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی باقی نہ رہے، جبکہ وہ (منہ بولے بیٹے) ان (بیویوں) سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں۔ یعنی جب وہ انہیں طلاق دے چکے ہوں اور عدت بھی گذر گئی ہو اور اس آیت میں یہ بتلا دیا گیا کہ حضرت زینب ؓ کی شادی آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس لئے نہیں کرائی گئی کہ آپ ﷺ کی کسی نفسانی خواہش کو پورا کرنا مقصود تھا۔ بلکہ اس لئے کرائی گئی کہ ایک شرعی حکم کو آپ ﷺ کے عمل سے واضح کروایا جائے۔ (۲) اس لئے کہ شریعت کے احکام آپ ﷺ کے افعال سے مستنبط ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہونے والا تھا۔ یعنی مقدر تھا اور جو بات مقدر ہو وہ ہو کر ہی رہتی ہے ساتھ ہی یہ بھی بیان کر دیا گیا کہ زینب ؓ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا نکاح ایک حکم شرعی بیان کرنے کے علاوہ ایک اور فائدے پر

مشتمل تھا اور اس میں کوئی خرابی نہ تھی۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت زینبؓ خود کو نسب کی بناء پر اور کفو نہ ہونے کی وجہ سے زیدؓ سے افضل سمجھتی تھیں۔ اور اسی وجہ سے آپس میں دونوں کی محبت والفت نہ ہوسکی۔ اور زیدؓ نے ان کو طلاق دینے کا قصد کیا۔ حضور ﷺ نے ان کو اس سے منع کیا۔ مگر آخر کار انہوں نے طلاق دیدی۔ پھر جب عدت گذر گئی تو حضور ﷺ نے ان سے نکاح کر لیا۔ محض اس لئے کہ ایک شرعی حکم کو اپنے فعل سے واضح کیا جائے نہ کہ قضاء شہوت کی غرض سے (۳) اور اسی بات کو اللہ کا حکم نازل ہونے سے قبل لوگوں کی عادت کے پیش نظر، آپ ﷺ اپنے دل میں مخفی رکھتے تھے اور اس میں کوئی بھی مضائقہ نہیں ہے۔

حاشیہ

(۱) خط کشیدہ الفاظ قرآن کریم کا ترجمہ اور اس کے آگے امام رازیؒ کی وہ تشریحات ہیں جو انہوں نے تفسیر کبیر میں فرمائی ہیں۔

(۲) واضح رہے کہ حضرت زیدؓ کو آنحضرت ﷺ نے اپنا منہ بولا بیٹا بنایا ہوا تھا۔ اور زمانہ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ منہ بولے بیٹے کی بیوی کو سگے بیٹے کی بیوی کی طرح حرام سمجھا جاتا تھا۔

(۳) مولانا تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں: ہر معمولی سمجھ بوجھ والا انسان سمجھ سکتا ہے کہ شریعت کا جو حکم عام پھیلے ہوئے تصورات کے خلاف ہو اسے صرف زبان سے کہہ دینا کافی نہیں ہوا کرتا۔ اگر لوگوں کے ذہن میں کسی فعل کی برائی خواہ مخواہ جم کر بیٹھ گئی ہے تو اس کا ذہن سے نکلنا اس وقت تک بہت مشکل ہے جب تک کہ کوئی ایسا شخص اس فعل کو کر کے نہ دکھائے جسے وہ ہر لحاظ سے قابل اتباع سمجھتے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال یہ واقعہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب مشرکین مکہ سے صلح ہوئی تو عام مسلمانوں کے دل اس پر مطمئن نہ تھے۔ وہ جوش جہاد اور عمرہ کے شوق سے سرشار

ہونے کے باعث کسی طرح اس بات پر آمادہ نہ ہوتے تھے کہ عمرہ کئے بغیر واپس چلے جائیں۔ یہاں تک کہ جب آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کو یہ حکم دیا کہ وہ سب اپنا سر منڈوا کر احرام کھول دیں تو سب نے یہ حکم سنا۔ لیکن کوئی شخص احرام کھولنے کے لئے آگے نہ بڑھا۔ اس وقت آپ ﷺ تشویش کے عالم میں حضرت ام سلمہؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ اور جا کر انہیں واقعہ بتلایا تو حضرت ام سلمہؓ نے آپ ﷺ کو بڑا نفسیاتی مشورہ دیا اور کہا کہ آپ ﷺ ایسا کیجئے کہ کسی سے کچھ کہنے کی بجائے کسی نمایاں جگہ بیٹھ کر خود حلق فرمایئے اور احرام کھول دیجئے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔ اور آپ ﷺ کا احرام کھولنا تھا کہ تمام صحابہؓ نے یکے بعد دیگرے اپنے احرام کھول ڈالے۔ (حاشیہ ترجمہ اظہار الحق)

عیسائی کتب کی روشنی میں جواب کی وضاحت

شرعی امور کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ تمام شریعتوں میں یکساں ہوں۔ یا تمام قوموں کی عادات اور ان کی مرضی کے مطابق ہوں۔ پہلی بات تو اس لئے کہ بائبل میں موجود ہے کہ حضرت سارہؓ ابراہیمؑ کی علاتی بہن تھیں۔ اور یعقوب علیہ السلام نے اپنی زوجیت میں دو حقیقی بہنوں کو جمع رکھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے والد عمران نے اپنی پھوپھی سے نکاح کیا۔ حالانکہ یہ تینوں قسم کی بیویاں شریعت موسوی و عیسوی ومحمدیؐ میں حرام ہیں اور ان سے تعلق رکھنا زنا کی طرح ناجائز ہے۔ بالخصوص علاتی بہن اور پھوپھی سے نکاح کرنا۔ اور ہندوستان کے مشرکین کے نزدیک اس قسم کی شادی بدترین فعل سے بھی بدتر ہے۔ جس کی وجہ سے وہ لوگ ایسے نکاح کرنے والوں پر بے انتہا ملامت کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کی اولاد کو زنا کی شدید قسم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ انجیل لوقا باب ۵ آیت ۲۹ میں ہے:

اور محصول لینے والوں اور اوروں کا جوان کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھے

تھے بڑا مجمع تھا۔ اور فریسی اور ان کے فقیہ اس کے شاگردوں سے یہ کہہ کر بڑبڑانے لگے کہ تم کیوں محصول لینے والوں اور گنہگاروں کے ساتھ کھاتے پیتے ہو؟

اور انجیل مرقس باب ۶ آیت ایک میں:

پھر فریسی اور بعض فقیہ اس کے پاس جمع ہوئے وہ یروشلیم سے آئے تھے ۔اور انہوں نے دیکھا کہ اس کے بعض شاگرد ناپاک یعنی بن دھوئے ہاتھوں سے کھانا کھاتے ہیں۔ کیونکہ فریسی اور سب یہودی بزرگوں کی روایت پر قائم رہنے کے سبب جب تک اپنے ہاتھ خوب دھو نہ لیں نہیں کھاتے اور بازار سے آکر جب تک غسل نہ کرلیں نہیں کھاتے۔ اور بہت سی باتیں ہیں جو قائم رکھنے کیلئے بزرگوں سے ان کو پہنچی ہیں۔ جیسے پیالوں اور لوٹوں اور تانبے کے برتنوں کو دھونا۔ پس فریسیوں اور فقیہوں نے اس سے پوچھا کیا سبب ہے کہ تیرے شاگرد بزرگوں کی روایت پر نہیں چلتے بلکہ ناپاک ہاتھوں سے کھانا کھاتے ہیں۔ (آیات ۱-۶)

حالانکہ ہندوستان کے مشرک برہموں کے یہاں اس معاملہ میں بڑی سختیاں ہیں۔ ان کے نزدیک تو اگر کوئی ہندو کسی مسلمان یا یہودی یا عیسائی کے ساتھ کھانا کھالے تو اپنے مذہب سے خارج ہو جاتا ہے۔

اور منہ بولے بیٹے کی بیوی سے طلاق کے بعد نکاح کرنا مشرکین عرب کے نزدیک بہت ہی قبیح اور برا تھا۔ اور چونکہ زید بن حارثہؓ حضور ﷺ کے منہ بول بیٹے تھے اس لئے حضور ﷺ کو زینبؓ سے نکاح کرنے میں ابتداءً مشرکین عوام کے طعن کا اندیشہ تھا۔ مگر جب خدا نے آپ ﷺ کو اس کا حکم دیا تو آپ ﷺ نے شریعت کے بیان اور توضیح کے لئے حضرت زینبؓ سے نکاح فرمالیا اور پھر مشرکین کے طعن و تشنیع کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری جواب میں لکھتے ہیں:

زید کا قصہ جو اس آیت میں مذکور ہے۔ ایسا نہیں کہ کسی کو معلوم نہ ہو۔ عیسائیوں نے تو اس کے متعلق بہت سے ورق سیاہ کیے ہیں۔ اس لئے ہم بھی اس کا بیان کرتے ہوئے دونوں قوموں (عیسائیوں اور آریوں) کو جو در حقیقت اس فن میں استاد شاگرد ہیں مدنظر رکھیں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ زینب ایک عورت حضرت ﷺ کے قبیلہ میں رشتہ دار تھی۔ شریف النسب، صاحب جمال، آنحضرت ﷺ نے اس کا نکاح زید بن حارثہ سے کرا دیا تھا۔ جو کسی زمانہ میں غلام تھا۔ پھر آنحضرت ﷺ ہی نے خرید کر اسے آزاد کیا تھا اور اپنے پاس ہی مثل بیٹوں کے رکھا۔ یہاں تک کہ لوگ اس کو زید بن محمد بھی کہتے تھے۔ یعنی زید محمد کا لے پالک بیٹا ہے۔ صاحب خصائل پسندیدہ تھا مگر خوبرو نہ تھا۔ اسی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے (میاں بیوی) میں کھٹا پٹی رہا کرتی تھی۔ آخر نوبت بانیجا رسید کہ زید اس کو چھوڑنے پر آمادہ ہوا۔ چونکہ پیغمبر خدا نے خود یہ رشتہ زور دے کر کرایا تھا اور مشہور بھی تھا کہ زید حضرت کا لے پاک بیٹا ہے۔ اس لئے آپ ﷺ نے اسے بھی سمجھایا کہ تو زینب کو چھوڑ نہیں۔ اس معاملہ میں خدا سے ڈر۔ کسی شریف عورت کو معمولی سی خفگی پر طلاق دے کر رسوا کرنا اچھا نہیں۔ آخر جب وہ چھوڑنے پر ہی بضد ہوا۔ تو آپ نے زینبؓ کے اس زخم کا علاج بجز اس کے نہ سوچا کہ اسے حرم محترم بنایا جائے۔ کیونکہ اس وقت کسی مسلمان عورت کو عزت اس سے زیادہ نہ تھی کہ وہ پیغمبر کی بیوی ہو۔ مگر ملک کی رسم تھی کہ لے پاک کی بیوی مثل صلبی (سگے) بیٹوں کے سمجھی جاتی تھی۔ لیکن شریعت اسلام میں یہ حکم اس طرح نہیں تھا۔ اسلام میں صلبی بیٹوں کی بیوی حرام تھی۔ لے پالک کی نہیں۔ بلکہ لے پالک وارث بھی نہیں ہے۔ کیونکہ نطفہ کا تعلق اس میں نہیں۔ اس لئے پیغمبر صاحب دو تین طرح کی کشمکش میں آ گئے۔ زینب کی خاطر داری اور دلجوئی کا تقاضا۔ ملک کی رسم کا خیال، اس ناجائز رسم کو بحال رکھنے میں

خدا کا خوف۔ اس لئے آپ نے جہاں ملک کی اور رسموں کو تیاگ (چھوڑ) دیا تھا۔ مستقل ریفارمروں کی طرح اس کی بھی کوئی پرواہ نہ کی اور زینبؓ کو بعد چھوڑ نے زید کے حرم محترم بنالیا۔ (جس کی تفصیل آپ سابقہ صفحات میں پڑھ آئے ہیں)

اس کے بعد ہمارا حق ہے کہ ہم اپنے مخاطبوں سے کچھ پوچھیں:

عیسائیو اور دیانندیو! بائبل کا کوئی ورس یا وید کا کوئی منتر اس کے منع کا دکھا سکتے ہو؟ جس کا مطلب یہ ہو کہ لے پالک بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنا منع ہے۔ دکھاؤ تو ہم تم کو منہ مانگا انعام دیں۔

عیسائیو! تمہیں تو خاص طور سے شرم چاہئے کہ تم رومیوں کے نام خط کے ۴ باب کی آیت ۱۵ کو بھی نہیں دیکھتے سنو!

''جہاں شریعت نہیں وہاں نافرمانی بھی نہیں''

جہاں قانون نہیں وہاں مواخذہ اور جرم کیسا۔ یا تو کوئی آیت قرآن کی (تمہاری رعایت سے ہم یہ بھی کہتے ہیں) بائبل کی بتلاؤ یا اس افترا پردازی اور بہتان بازی کو واپس لو۔

دیانندیو! اپنے استاد عیسائیوں کی طرح ہوا کے پیچھے نہ پڑو۔ کوئی وید منتر ہی اس مضمون کا بتلاؤ۔ ورنہ وید کی اطاعت کا نام لینے سے شرم کرو۔

اگر کسی دوسرے دھرم شاستر سے بتلاؤ تو پہلے یہ کہہ لو کہ وید اس بیان میں قاصر ہے ورنہ وید کو سب سچائیوں کی کان اور سب علوم کا خزانہ کہہ کر یہ کہنا محال ہے۔

(حق پرکاش ۲۱۷)

کیا حضورؐ اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی پر عاشق تھے

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

حضرت محمد ﷺ اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی زینب پر عاشق تھے جب اس نے

طلاق دے دی تو انہوں نے نکاح کر لیا۔

جواب: عاشق ہونے کی بات کا رد تو اس کتاب میں حضرت زینب اور حضور ﷺ کے متعلق سوال و جواب میں ترتیب سے لکھا گیا ہے۔

یہاں خود معترض صاحب کو اپنے گھر کی خبر لینی چاہیئے۔ حضرت زینب کے ساتھ حضور کے نکاح کو عشق نہیں کہہ سکتے۔

عشق تو یہ ہے جو سری کرشن صاحب کی طرف سے ادھیائے ۵۳ بھاگوت میں لکھا ہے۔

جیں نارومن سے سری کرشن نے تعریف رکمنی سنی، تبھی سے رات دن اپنا من اس پر لگا دیا۔

ادھیائے ۵۹ بھاگوت میں لکھا ہے کہ جناب سری کرشن صاحب نے اپنی پھوپھی کی بیٹی ''مترابندا'' کا ہاتھ پکڑا اور یکا یک مجمع عام سے اس کو بھگا کر لے گیا اور اس کے ساتھ شادی کر لی اور ان دونوں واقعے (یعنی بھگانے اور شادی کرنے) میں قتل قتال اور جنگ وجدال کے معرکے پیش آئے کہ ہزاروں لوگ قتل ہو گئے۔

جناب سری کرشن صاحب کے ایسے اوصاف حمیدہ کی تفصیل ہندوؤں کی کتابوں میں موجود ہیں۔ (سوط اللہ الجبار ص ۱۸۳۔۱۸۴)

سوال: زیدؓ کس کا بیٹا تھا؟

جواب: حارثہ کا بیٹا تھا۔ چنانچہ جب قرآن میں لے پالکوں کی بابت حکم آیا کہ اُدْعُوْهُمْ لِآبَاءِ هِمْ. تو زید بن محمد کی بجائے زید بن حارثہ اس کو کہا کرتے تھے۔

پنڈت کالی چرن کا ''قصہ تحریم'' پر اعتراض

اعتراض: (پنڈت کالی چرن کا اعتراض)

حدیثوں کی روایت یہ ہے کہ

ایک دن جب حفصہ کی باری تھی۔ حفصہ محمد سے چھٹی لے کر میکے چلی گئی۔ اور اس کے گھر کو محمد نے ماریہ سے بسا لیا اتنے میں حفصہ آگئی وہ دیکھ کر جل بھن گئی کہ اس کی آرامگاہ آج ایک غیر منکوحہ لونڈی کی خواب گاہ بنی ہوئی ہے اس غصہ کو محمد تاڑ گیا اور کہا بھاگوان! اگر ماریہ کے اس ماجرے کا ذکر کسی سے نہ کرو تو میں نے یہ عہد کیا کہ آئندہ ماریہ سے صحبت نہ ہوگی اور میرے بعد خلافت کا حق تمہارے باپ کا ہوگا۔

(رنگیلا رسول ص ۴۳)

بیشک قرآن مجید میں یہ آیت ہے:

یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ.

ترجمہ: اے نبی! جو خدا نے تمہارے لئے حلال کیا ہے تم اس کو حرام کیوں کرتے ہو کیا بیویوں کو راضی کرنے کے لئے ایسا کرتے ہو۔

جواب: اس آیت کے متعلق متعدد روایات آئی ہیں کہ کونسی چیز حضور نے اپنے حق میں حرام کی تھی جس کا ذکر اس آیت میں بصورت ناپسندیدگی آیا ہے۔ ایک روایت ہے کہ ماریہ لونڈی کو حرام کر دیا تھا۔ دوسری اور بھی ہے مگر زیادہ صحیح روایت یہ ہے کہ حضور ﷺ شہد کا شربت پیا کرتے تھے کسی نے غلط کہہ دیا کہ آپ کے منہ سے موم کی بو آتی ہے، آپ کو بدبو سے بہت نفرت تھی۔ آپ نے فرمایا میں شہد کبھی نہ پیوں گا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا کہنے والی بیویاں تھیں۔ یہ روایت صحیح تر ہے۔ چنانچہ بڑے پایہ کے محدث مفسر حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

والصحیح ان ذلک کان فی تحریمه العسل کما قال البخاری عند هذه الآیة......الخ

ترجمہ:- یعنی صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت شہد نوشی پر اتری ہے جیسا کہ امام بخاری نے روایت کیا ہے۔

بس اصل جواب تو آگیا، رہا یہ سوال کہ جن بیویوں نے ایسی غلط گوئی کی ان کی

بابت کیا سزا ہے؟۔ جواب یہ ہے کہ وہی سزا جو قرآن مجید میں مذکور ہے:

اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا.

ترجمہ:- اگر تم دونوں اللہ کے سامنے توبہ کرتی ہو تو تمہارے دل (توبہ کیلئے) جھک رہے ہیں۔ (مقدس رسول صفحہ ۱۱۱)

حضرت ماریہؓ کے لونڈی ہونے پر اعتراض

حضرت ماریہ حضور علیہ السلام کی لونڈی (باندی) تھی۔ بیویوں کے علاوہ باندیاں رکھنے پر مہاشہ کو اعتراض ہے۔ چنانچہ اس کے چبھتے ہوئے الفاظ یہ ہیں:

اعتراض: ماریہ کے متعلق محمد پر ایک تہمت لگائی جاتی ہے۔ لونڈیاں رکھنا قرآن کریم کی رو سے جائز ہے۔ محمد کے گھر میں لونڈیاں تھی۔ ان پر نہ محمد کی بیویوں نے اعتراض کیا نہ محمد کے پیرووں نے۔ (۴۱)

جواب: بیشک آپ نے سچ کہا قرآن کی رو سے جائز اس زمانہ کے قانون ملکی کے رو سے جائز۔ ہاں ایک لفظ آپ چھوڑ گئے وہ یہ کہ دھرم شاستر کی رو سے بھی جائز ہے اعتبار نہ ہو تو سنو! ویدوں کے استاد اول ویدک دھرم کے مسلمہ رشی منوجی فرماتے ہیں:

رتھ، گھوڑا، چارپایہ عورت وغیرہ ان سب کو جو فتح کرے وہی اس کا مالک ہوتا ہے۔ (باب ۷۔ فقرہ ۹۶)

غلاموں کو یہاں تک بے حس کیا گیا ہے کہ ان کی کمائی پر بھی ان کو اختیار نہیں۔

سنو! اپنی عورت کے لڑکے و غلام یہ سب جس دولت کو جمع کریں وہ سب دولت ان کے مالک کی ہے۔ یہ اس کے حقدار مالک کی زندگی میں نہیں۔

اور سنو!

راجہ برہمن، غلام اور شودر سے دولت لے لیوے اس میں کچھ بچار نہ کرے

کیونکہ وہ دولت کچھ اس کی ملکیت نہیں۔ وہ بے زر ہے۔
(منوسمرتی باب ۸ فقرہ نمبر ۴۱۶-۴۱۷)

پس جو کام قرآن کی رو سے، جو کام دھرم شاستر کی رو سے جائز ہو اس پر اعتراض کرنا ناستک (دہریہ) کا کام ہے کسی آستک (دیندار) کا نہیں۔ (مقدس رسول ۱۰۷)

حضرت مریمؑ کو بچہ کی امید کس راستہ سے ہوئی

اعتراض: (چوبے بدریداس ہندو کا اعتراض)

بچہ دان کی راہ سوائے جائے مخصوص کے کسی طرف ممکن نہیں یعنی حضرت جبریلؑ نے حضرت مریمؑ میں اس جگہ پھونک ماری تھی جو کہ قابل اعتراض عمل ہے)

جواب: کیا رحم جسم ہے یا نہیں اور اگر جسم ہے تو اس کا اکاس بھی جزر ہے یا نہیں؟ یہ تو ظاہر ہے کہ رحم ایک جسم ہے پھر اگر اکاس (یعنی خلا) اس کا جزر نہیں تو سب بید جھوٹا ہے۔ بید میں بہت وضاحت کے ساتھ اکاس کو عناصر میں سے گنا ہے اور صاف لکھا ہے کہ اکاس سے کوئی جسم خالی نہیں وہ ہر چیز میں موجود ہے۔ پھر جب وہاں اور سب جسم میں اکاس موجود ہے تو ممکن ہے کہ روح کا پھونکنا گریبان اور منہ میں ہوا ہوا اور اکاس کے ذریعہ سے رحم تک پہنچا ہو اور ظاہر ہے کہ داخل و خارج رحم تک غذا پہنچتی ہے' اگر کسی چیز کے رحم تک پہنچنے کا راستہ راہ مخصوص کے علاوہ نہیں ہے تو لالہ جی بتائیں کہ ان کی شرمگاہوں میں غذا کا راستہ داخل رحم میں کیا یہی مخصوص راستہ ہے اور غذا کے اجزاء کو داخل رحم پہنچنے کیلیئے کیا اس مخصوص راہ سے کچھ عمل کیا جاتا ہے' لالہ صاحب! وہ طب جو بید کی رو سے ہے کیا اس میں یہی لکھا ہے کہ داخل رحم میں کوئی شے خواہ کسی قسم کی ہو اس مخصوص راستہ کے علاوہ اور کسی طرح پر سرایت نہیں کر سکتی' ذرا ہوش میں آیئے آپ نے تو بید کو بھی نہایت بدنام کر دیا ہے۔

ہاں یہ تو فرمایئے کہ سری کرشن جی جب دیوکی کے رحم میں متحرک تھے اور غذا

پاتے تھے تو چونکہ آپ کے اعتقاد کے مطابق حس و حرکت کرنے والی چیز حیوانی یا انسانی روح نہیں بلکہ وہ خود نارائن جی ہیں اور یہ بھی آپ کو تسلیم ہے کہ مقام مخصوص کے علاقہ رحم میں اور کوئی راستہ نہیں کیا سری نارائن جی نے دیوی کے مقام مخصوص کے راستہ سے اس کے کربہ (......) میں دخول کیا تھا۔

اور ہاں آپ خود ہی تحفۃ الاسلام میں صراحۃ لکھتے ہیں کہ

اول تجلی نامتناہی بذات شے شخص جلوہ ظہور میدید پس ازاں ہماں تجلی بذات بی بی مطہرہ آں شخص بروز میکند

ترجمہ: سب سے پہلے تجلی لامتناہی بذات شے شخصی ذاتی طور پر ظاہر ہوتی ہے اس کے بعد وہی تجلی مطہرہ بی بی کی ذات میں اس شخص کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

اور مرد کے نطفہ کا عورت کے رحم میں منتقل ہونے کا راستہ وہی مخصوص راہ ہے پس صاف ظاہر ہے کہ جناب بشنو اسی مخصوص مقام کے راستہ سے دیوی کے رحم میں جلوہ ظہور فرما کر جنین کیلئے حس و حرکت اور غذا کا سبب بنے تھے' جس کو کنس نے دیکھ کر کہا تھا کہ اسی جرم کو پھا میں میرا کال ہے۔

شروع اسکند دہم بھاگوت دیکھ لیجئے۔

اچھا اس پر بھی غور کریں!

راجہ اپر چھر کا نطفہ جو پانی میں مچھلی نگل گئی تھی اور وہ نطفہ کہ مچھلی کے رحم میں بھر کر اس سے کچھ دری ما بیاس جی پیدا ہوئے ہیں۔

اور اسی طرح ایک ہرنی جو پانی میں ایک رکھ کا نطفہ پی گئی تھی جس سے رمک سرمک رکھ پیدا ہوئے جس کا قصہ مہا بھارت بن پرب میں ہے۔

چونکہ دخول ان نطفوں کا رحم میں مخصوص راستہ سے نہیں تھا تو یہ پیدائش لالہ جی کی مقرر کردہ اصل کے مطابق کیوں کر صحیح سمجھ لی گئی۔

ایک طوطا بیاس کی زوجہ کے منہ میں گھس کر سکھ دیومن کے قالب میں رحم میں

مستقر ہوا۔

یہ سب دخول کے معاملات مخصوص راستہ سے نہیں تھے' یہاں اس بیدی طب کو مقام مخصوص میں کیوں چھوڑ دیا یہاں بھی تو اس کو ظاہر کیجئے۔

(سوط اللہ الجبار صفحہ ۲۲' ۲۳ جلد ۳)

کیا حضورؐ نے اپنے خسروں کو لونڈیاں تقسیم کیں؟

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

ایک دفعہ کہیں سے تین لونڈیاں آئیں تو محمد نے وہ ایک ایک کر کے خسروں ابوبکر اور عثمان اور اپنے علی داماد کو بطور پیش کش عطا کیں۔ آج دنیا اسے شرمناک ڈھٹائی کہے گی کہ اپنے داماد اور خسروں کے ساتھ یہ یاران مجلس کا سا سلوک۔

(رنگیلا رسول صفحہ ۴۱)

جواب: ہم تو ابتداء سے کہتے آئے ہیں کہ رنگیلہ رسالہ کی مصنف پارٹی اسلامی تاریخ سے براہ راست واقف نہیں۔ ان کے معلومات مخالفان اسلام کی کتابیں تواریخ محمدی، تکذیب براہین تاریخ ولیم میور وغیرہ ہے وہ بھی ناقص۔

رنگیلا پارٹی کے مصنف نے صفحہ ۴۴ وغیرہ پر حضرت عثمانؓ کو حضور ﷺ کے خسروں میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ تاریخ اسلام میں حضرت عثمان حضور ﷺ کے داماد تو ہیں خسر نہیں۔

سماجیو! انصاف سے کہنا اپنے چوتھے اصول کو سامنے رکھ کر کہنا اس دعوے کے ثبوت میں (کہ حضور نے ابوبکر اور عثمان کو لونڈیاں دیں) تمہارے رنگیلے مہاشہ نے کوئی حوالہ دیا؟

بتاؤ! اگر تم کسی مجلس کی گفتگو میں یہ پیش کرو اور مسلمان تم سے ثبوت مانگیں اور تم نہ دکھا سکو تو تمہیں کتنی ندامت ہوگی۔

اگر کوئی شخص (تمہارے ہندوؤں کے مذہب کے مطابق (بغرض حصول اولاد بحکم سوای جی اپنی استری کا کسی جوان آدمی سے نیوگ کرائے وہ بیچاری حسب تعلیم سوای جی سال دو سال تک اس جوان کی خدمت میں رہے مگر پرماتما کے حکم سے اولاد نہ ہوتو وہ بے چارہ اور بیچاری کس قدر شرمندہ ہوں گے۔

سچ کہنا

تم مخالف کے سامنے حوالہ پیش نہ کر سکنے پر اس سے زیادہ شرمندہ ہو گے یا نہیں؟ پھر کیوں ایسے مصنفوں کو تم لوگ مجبور نہیں کرتے کہ ہر دعوے کا ثبوت دیا کریں کیا تم لوگوں نے استاد الاخلاق شیخ سعدی کا قول نہیں سنا ؎

نہ گفتہ ندارد کسے باتو کار
ولیکن چو گفتی دلیلش بیار

لو ہم مان لیتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے خسروں کو لونڈیاں دیں تو کیا جرم کیا۔ تم سمجھتے ہو کہ لونڈیوں سے صرف بیوی کا کام لیا جاتا ہے۔ حالانکہ لونڈی گھر کی خادمہ بھی ہوتی ہے۔

اچھا سنو! منو جی نے جو کہا کہ لوٹ میں عورت کو جو لوٹے راجہ اسی کو دیدے۔ بھلا لوٹنے والا کوئی راجہ کا خسر ہو یا داماد بلکہ باپ بھی ہو تو اسے بھی وہ عورت دیدے؟

ہے رام! اتنا پاپ؟

آریہ سجنو! ؎

سنبھل کے رکھنا قدم دشت خار میں مجنوں کہ
اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

(مقدس رسول صفحہ ۱۰۸)

رنگیلے مہاشہ کا تعدد ازواج رسولؐ پر اعتراض و جواب

اعتراض : (پنڈت کالی چرن کا اعتراض)

رنگیلے مہاشہ نے آخر اپنا دلی غبار اخیر کتاب میں نکالا کہ سارا غم و غصہ اس کو حضور ﷺ کے تعدد ازواج پر ہے۔ یعنی اس نے جو نتیجہ نکالا اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو نہ بوڑھی بیوی کا رنج ہے، نہ جوان کا صدمہ۔ بلکہ رنج ہے تو تعدد ازواج کا ہے۔ اسی لئے وہ اپنا دلی غبار ان لفظوں میں نکالتا ہے۔

محمد کو ایسا کونسا نام دوں جس سے محمد کی زندگی کا فوٹو آنکھوں میں اتر آئے۔ پچاس سال کا تھا جب خدیجہ نے انتقال کیا۔ باسٹھ سال کا تھا۔ (مہاشہ کی تاریخی واقفیت ہے کہ تریسٹھ سال کو باسٹھ سال میں ختم کرتا ہے) جب خود انتقال کیا۔ اس بارہ (۱۲) سال کے عرصہ میں دس عورتیں کیں یعنی سوا سال میں ایک۔ ان حالات میں اگر میں اپنے رنگیلے رسول کو بیویوں والا کہہ دوں تو کیا موزوں نہ ہوگا۔ بیویوں والا کہا اور محمد کو پالیا محمد کے دل کو پالیا، محمد کی روح کو پالیا۔ (ص ۴۸۔۴۹۔۵۰)

جواب:

۱۔ آریوں اور ہندوؤں میں منوجی ایک ایسے بزرگ مذہبی پیشوا گزرے ہیں جن کی خدمت میں اس زمانہ کے بڑے بڑے رشیوں نے حاضر ہو کر درخواست کی تھی۔

۲۔ اے بھگوان سب ورنوں (ذاتوں) اور ورن سنکروں کا دھرم ٹھیک ٹھیک ہم سے کہئے کیونکہ

۳۔ اے پربھو! خیال سے باہر اور لامحدود اور قدیم وید میں بیان کئے ہوئے جو بہت طرح کے کرم ہیں ان کے اصل مطلب کے جاننے والے ایک آپ ہی ہیں۔

(منوسمرتی باب اول فقرہ ۱-۲-۳)

آریوں میں منوسمرتی کی اتنی قدر ہے کہ سوامی دیانند کی ستیارتھ پرکاش اسی کے

حوالہ جات سے بھری پڑی ہے۔ اگر منوسمرتی کے حوالہ جات کو الگ کر دیا جائے تو ستیارتھ کے اوراق بمشکل اتنے رہ جائیں گے کہ چند پتنگیں بن سکیں۔

منوجی کی سنو!

یہی منو بھگوان تعدد ازواج کو ایسی خوبی سے حل فرماتے ہیں کہ باید وشاید، راجہ کی بابت ہدایت ہے کہ

(راجہ) کھانا کھا کر عورتوں کے ساتھ محل میں بہار کرے۔ (باب ۷ فقرہ ۲۲۱)

اور سنو!

ایک کی دو زوجہ ہیں اور چھوٹی زوجہ سے لڑکا پہلے پیدا ہوا اور بڑی زوجہ سے پیچھے ہوا پس اس مقام پر تقسیم حصہ کس طرح کرنا چاہئے، اشلوک آئندہ بھی لکھیں گے۔
(باب ۹، فقرہ ۱۲۲)

اور سنو!

پہلی عورت موجود ہو اور بھکشا سے دولت فراہم کر کے اس روپیہ سے دوسری شادی کرے تو اس کو صرف جماع کا لطف ملتا ہے اور اولاد اسی کی ہے جس نے دولت دی۔ (باب ۱۱، فقرہ ۵۰)

ان سب سے واضح سنو!

اگر ایک آدمی کی چار پانچ عورتیں ہوں اور ان میں سے ایک صاحب اولاد ہو تو باقی بھی صاحب اولاد ہوتی ہیں یہ منوجی کا حکم ہے۔ (باب ۹ فقرہ ۱۸۳)

مہاشے سجنو! دھرم شاستر کو ماننے والا اس حکم کے ماتحت تعدد ازواج پر اگر عمل کرے تو تم اس کو بھی وہی نصیحت کرو گے جو رنگیلے مہاشہ نے کی ہے جس کے تلخ ترین الفاظ یہ ہیں۔

> بہت بیویاں کرنے والو! دیکھو پیغمبروں کی زندگیاں مرقع عبرت ہیں اگر اس عظمت کے لوگ اپنی غلط کاریوں کے برے انجاموں سے نہیں بچے تو

تم اپنے کرتوت کے کڑوے پھلوں سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہو۔
وشرتھ کا گھر برباد ہوا۔ محمد کا دین برباد ہوا۔ کیوں! اسی لئے بوڑھے ہو کر
نوخیزدں سے شادیاں کیں۔ (رنگیلا صفحہ ۲۴)

کس قدر خبط الحواسی ہے۔ اللہ کی شان! ایسے لوگ بھی مصنف بن جاتے ہیں جو موضوع بیان بھی نہیں جانتے۔ شروع بیان میں خرابی کی وجہ تعدد ازواج کو بتایا ہے۔ اخیر میں نوخیز سے شادی کو سبب بنایا ہے۔ پہلے بیان کے مطابق اگر بوڑھی عورتیں بھی متعدد ہوتیں تو مضر تھا۔ آخری بیان کے مطابق ایک نوخیز بیوی بھی مضر ہے۔ کیا اتنی سی عبارت میں اتنا بڑا اصولی اختلاف کسی صحیح دماغ کا کام ہے؟

آہ! کیسا کل جگ ہے کہ ہندو رکشک کہلا کر دھرم شاستر کی ایسی ہتک کرتے ہیں کہ گئو بھشک بھی نہ کرے۔ منوجی مہاراج تو چار پانچ عورتوں کا ذکر بھی بطور مثال بتاتے ہیں ورنہ ان کے ہاں تو کوئی تعداد مخصوص نہیں۔ مگر آریہ مہاشہ ہیں کہ تعدد ازواج سے ڈراتے ہیں۔ آہ! ان حمایتیوں کی حمایت سے ہندو دھرم ایسا دکھیا ہو رہا ہے کہ اس کی زبان حال سے یہ شعر نکل رہا ہے۔

دوست ہی دشمنِ جاں ہوگیا اپنا حافظ
نوشدارو نے کیا اثرِ سم پیدا

ہماری دریا دلی:

مہاشے سجنو! ہماری دریا دلی دیکھو کہ ہم تمہارے اصل دعوے کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہمارے حضور پرنور علیہ السلام بڑے مرد تھے۔ مردانگی کے کام کرتے تھے۔ چونکہ آپ کامل مرد تھے اس لئے واقعی بیویوں والے تھے۔ خود قرآن مجید نہ صرف حضور کو بیویوں والا بلکہ کل انبیاء کو بیویوں والا کہتا ہے۔ غور سے سنو!

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً.

ترجمہ: ہم (خدا) نے (اے نبی) تم سے پہلے کئی رسول بھیجے اور ان کو بیویاں اور اولادیں دیں۔ (پ۱۳، ع۱۲)

اس لئے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام بنی نوع انسان کے لئے نمونہ بن کر آتے ہیں وہ اگر بیویاں نہ کریں تو ساری امت نہ کرے گی جس سے نسل انسانی کا انقطاع ہو جائے گا پس بیویوں والا ہونا نبی کے لئے ضروری ہے ورنہ دنیا کی تباہی و بربادی ہے۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(مقدس رسول صفحہ۱۱۴)

چھٹا باب

صحابہ کرام رضی اللہ عنہ وغیرہ
کے متعلق اعتراضات کے جوابات
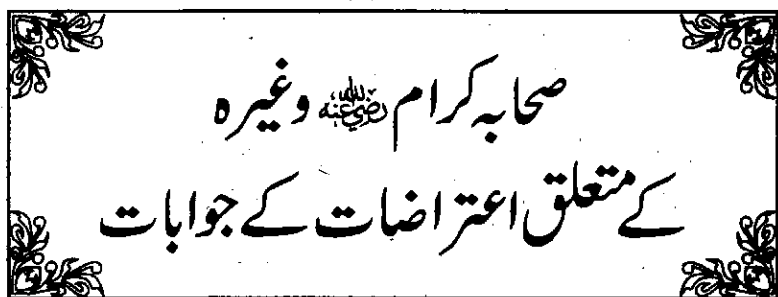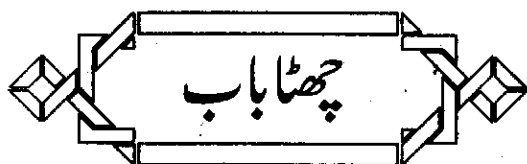
حضرت ابوبکرؓ اپنے نفاق کے اقرار کی وجہ سے قابل خلافت نہیں تھے

اعتراض: (بعض شیعہ کا اعتراض)

ابوبکرؓ نے اپنے نفاق کا خود اقرار کیا ہے اور ایسا شخص قابلِ خلافت نہیں ہوسکتا۔

جواب: ہم اس اعتراض کے جواب سے پہلے اصل حقیقت کو بے نقاب کرنا ضروری سمجھتے ہیں تا کہ ناظرین کو معلوم ہو کہ معترض اس طعن میں کہاں تک حق بجانب ہے۔ ترمذی میں ایک حدیث یوں لکھی ہے۔

عَنْ حَنْظَلَةَ الْاَسدِی وَکَانَ مِنْ کُتَّابِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ مَرَّبِاَبِیْ بَکْرٍ وَهُوَیَبْکِیْ فَقَالَ مَالَکَ یَا حَنْظَلَةُ قَالَ نَافَقَ حَنْظَلَةُ یَا اَبَابَکْرٍ نَکُوْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُذَکِّرُنَا بِالنَّارِ وَالْجَنَّةِ کَاَنَّا رَأْیَ عَینٍ فَاِذَا رَجَعْنَا عَافَسْنَا الْاَزوَاجَ والضَّیْعَةَ وَنَسِینَا کَثِیراً قَالَ فَوَاللهِ اِنَّا کَذٰلِکَ اِنْطَلِقْ بِنَا اِلٰی رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَانْطَلَقْنَا فَلَمَّا رَآهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَالَکَ یَا حَنْظَلَةُ قَالَ نَافَقَ حَنْظَلَةُ یَارَسُوْلَ اللهِ نَکُوْنُ عِندکَ تُذَکِّرنَا بِالنَّارِ وَالْجَنَّةِ حَتّٰی کَاَنَّا رَأْیَ عَینٍ فَاِذَا رَجَعْنَا عَافَسْنَا الْاَزْوَاجَ والضَّیْعَةَ وَنَسِینَا کَثِیراً قَالَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهِ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَوْتَدُوْمُوْنَ عَلَی الْحَالِ الَّتِیْ تَدُوْمُوْنَ بِهَا مِنْ عِنْدِیْ لَصَافَحَتْکُمُ الْمَلَائِکَةُ فِیْ مَجَالِسِکُمْ وَعَلٰی فُرُشِکُمْ وَفِیْ طُرُقِکُمْ وَلٰکِنْ یَا حَنْظَلَةُ سَاعَةً وَّسَاعَةً. (جامع ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ باب نمبر۵۴ حدیث نمبر۲۵۱۴)

حضرت حنظلہ اسدیؓ سے مروی ہے جو حضور علیہ السلام کے کاتبوں میں سے تھے وہ ابوبکرؓ کے پاس سے گزرے جبکہ وہ رو رہے تھے حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کیا ہوا۔ کہا حنظلہ منافق ہو گیا ہے۔ اے ابوبکرؓ ہم رسولؐ خدا کے پاس ہوتے ہیں جب آپ ہمیں

دوزخ و بہشت کی یاد دلاتے ہیں گویا ہم دوزخ و جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پھر جب گھروں میں آتے ہیں عورتوں اور کام کاج کے شغل میں ہو جاتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں ابوبکرؓ نے کہا بخدا میرا بھی یہی حال ہے۔ چلو رسول اللہ ﷺ کے پاس چلیں۔ ہم دونوں رسول ﷺ کے پاس گئے۔ آپ ﷺ نے دریافت کیا۔ حنظلہ کیا بات ہے۔ میں نے کہا حضور! حنظلہ منافق ہو گیا ہے۔ ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں۔ آپ ہمیں دوزخ و بہشت کی یاد دلاتے ہیں۔ گویا ہم آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ پھر جب ہم گھر جاتے ہیں بال بچوں اور کام کاج میں مصروف ہو کر بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ حضور نے فرمایا۔ اگر تم اسی حال پر رہو جو میرے پاس تمہاری حالت ہو جاتی ہے تو فرشتے تم سے تمہاری مجلسوں میں آ کر اور تمہارے بستروں پر آ کر اور راستوں میں آ کر مصافحہ کریں لیکن اے حنظلہؓ ساعت بساعت حالت بدلتی رہتی ہے۔

اب اہل انصاف غور کریں کہ اس واقعہ سے حنظلہؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے نفاق کا ثبوت ملتا ہے یا ان کا کمال ایمان اور خوف و خشیت الٰہی ثابت ہوتی ہے کہ باوجود ان انوار و برکات کے لوٹنے کے جو حضور علیہ السلام کی پاک صحبت سے انہیں میسر تھے۔ خوف خدا کی یہ حالت تھی کہ صرف اس بات پر وہ کانپ رہے تھے کہ جب حضور انور کی مجلس سے اُٹھ کر اپنے گھروں میں آتے ہیں تو دنیا کے کام دھندوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ڈر ہے کہ اس کا مؤاخذہ نہ ہو۔ (آفتاب ہدایت صفحہ ۲۵۵، ۲۵۶)

کیا حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ کی بے ادبی کی تھی؟

اعتراض: (بعض شیعہ کا اعتراض)

بخاری کی حدیث میں ہے:

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَوْمَ الْخَمِيسِ مَا يَوْمُ الْخَمِيسِ اشْتَدَّ بِهٖ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَجْعُهٗ فَقَالَ ائْتُوْنِيْ اَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اَبَدًا فَتَنَازَعُوْا

وَلَا يَنْبَغِي عِنْدَ نَبِيٍّ تَنَازُعٌ فَقَالُوْا مَا شَانُهُ اَهَجَرَ اِسْتَفْهِمُوْا فَذَهَبُوْا يُرَدُّوْنَ عَنْدَهُ فَقَالَ دَعُوْنِي فَالَّذِي اَنَا فِيهِ خَيْرٌ مِمَّا تَدْعُوْنِي اِلَيْهِ وَاَوْصَاهُمْ بِثَلْثٍ قَالَ اَخْرِجُوْا الْمُشْرِكِيْنَ مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ اَجِيْزُ وَالْمَوْفَدَ بِنَحْوِمَا كُنْتُ اُجِيْزُهُمْ وَسَكَتَ عَنِ الثَّالِثَةِ اَوْ قَالَ نَسِيْتُهَا.

ابن عباس نے کہا' جمعرات کا دن اور وہ کیسا دن تھا جس میں آنحضرت ﷺ کو درد کی شدت تھی۔ آپ نے فرمایا لاؤ میرے پاس تمہیں ایک تحریر لکھ دوں کہ تم کبھی اس کے بعد گمراہ نہ ہوسکو۔ حاضرین آپس میں جھگڑنے لگے اور کہنے لگے آپ کا کیا حال ہے۔ کیا آپ ہجرت (دنیا سے) کرنے کو ہیں۔ آپ سے دریافت کرو۔ ان لوگوں نے آپ سے سوالات شروع کئے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ مجھے چھوڑ دو کیوں کہ جس حالت میں مَیں ہوں اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بُلا رہے ہو۔ پھر آپ نے تین وصیتیں کیں (۱) یہ کہ کفار مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دو (۲) کہ وفدوں کو میری طرح عطیے دیتے رہنا۔ تیسری سے ابن عباسؓ نے سکوت فرمایا یا کہا میں اسے بھول گیا"۔

توضیح:

بخاری میں یہ حدیث باختلاف الفاظ متعدد جگہ مذکور ہے۔

کسی جگہ ہے: اِيْتُوْنِي بِالْكَتِفِ وَاللَّوْحِ وَالدَّوَاتِ.

(میرے پاس شانہ اور دوات یا تختی اور دوات لاؤ)۔

فَقَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ غَلَبَهُ الْوَجْعُ وَعِنْدَكُمُ الْقُرْاٰنُ حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ (بعض نے کہا حضورؐ کو اس وقت تکلیف ہے اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے اور ہمیں کتاب اللہ کافی ہے)۔

ایک جگہ ہے:

فَقَالَ عُمَرُؓ اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَلَبَهُ الْوَجْعُ وَعِنْدَكُمُ الْقُرْاٰنُ حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ فَاخْتَلَفَ اَهْلُ الْبَيْتِ فَاخْتَصَمُوْا مِنْهُمْ مَنْ

يَقُوْلُ مَا قَالَ تَرَبُوْا يَكْتُبُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ مِنْهُمْ مَنْ يَّقُوْلُ مَا قَالَ عُمَرُ فَلَمَّا اَكْثَرُوا اللَّغْوَ وَالْاِخْتِلَافَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ قُوْمُوْا قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ فَكَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ ؓ يَقُوْلُ اِنَّ الرَّزِيَّةَ مَاحَالَ بَيْنَ رَسُوْلِ اللهِ وَبَيْنَ اَنْ يَّكْتُبَ لَهُمْ ذٰلِكَ الْكِتٰبَ مِنْ اِخْتِلَافِهِمْ وَلَغَطِهِمْ.

ترجمہ:- عمرؓ نے کہا، حضور کو اس وقت تکلیف ہے۔ اور تمہارے پاس قرآن ہے کتاب اللہ ہمیں کافی ہے۔ پس گھر والوں نے اختلاف شرع کر دیا۔ بعض کہتے تھے کہ حضور کو کاغذ دو۔ ایسی تحریر لکھ دیں کہ اس کے بعد تم کہیں گمراہ نہ ہو جاؤ۔ بعض وہ بات کہتے تھے جو عمرؓ کہتے تھے۔ جب شور و غل بڑھ گیا تو حضورؐ نے فرمایا: چلے جاؤ۔ عبداللہ کہتے ہیں۔ بڑی مصیبت تھی جو حضورؐ اور لوگوں میں تحریر کے متعلق رکاوٹ پڑ گئی کیونکہ شور و غل زیادہ ہو گیا تھا۔

خلاصہ طعن شیعہ:

اس حدیث کے متعلق شیعہ صاحبان حضرت عمرؓ پر حسب ذیل طعن کرتے ہیں:

۱۔ حضرت عمرؓ نے قول آنحضرت کو رد کیا۔ حالانکہ آپ کا قول بحکم آیت مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی الخ سراسر وحی تھا اور ردِ وحی کفر تھا۔

۲۔ حضرت عمرؓ نے قول آنحضرت ﷺ کو ہذیان سے تعبیر کیا۔ یہ کمال گستاخی اور بے ادبی ہے۔

۳۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کے حضور میں آواز کو اونچا کیا۔ جو بحکم آیت لَاتَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ الخ ممنوع تھا۔

۴۔ وصیت میں رکاوٹ ڈال کر حق امت تلف کیا۔ وصیت لکھی جاتی تو امت کی بھلائی ہوتی۔

الجواب:

اول: یہ حدیث جتنے طرق سے مروی ہے سب میں آخری راوی عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔ حالانکہ جس وقت کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس وقت ان کی عمر تیرہ سال کی تھی کیونکہ آپ ہجرت سے تین سال پہلے یعنی ۶۱۹ء میں پیدا ہوئے اور ۶۸ھ مطابق ۶۸۸ء طائف میں فوت ہو گئے تھے اور تیرہ سال کے نابالغ بچے کی اکیلی شہادت کب قابل قبول ہو سکتی ہے جب کے حضور کی مرض الموت کے وقت تمام اصحاب اور اہل بیت رسولؐ کا موجود ہونا ضروری ہے۔ ناممکن ہے کہ ایسے نازل وقت میں یہ سب لوگ موجود نہ ہوں۔ پھر جب ان اکابر صحابہؓ سے جن میں حضرت علی المرتضیٰ بھی شامل ہیں کوئی بھی اس واقعہ کو نقل نہیں کرتا۔ اس لئے اس روایت کو بنیاد بنا کر حضرت عمرؓ پر اعتراض کرنا درست نہیں۔ (آفتاب ہدایت)

حضرت عائشہؓ کے بصرہ کے سفر اور جنگ جمل کے واقعہ پر اعتراض

اعتراض: (شیعوں وغیرہ کا اعتراض)

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جنگ جمل کا اور بسرہ کا سفر کیوں کیا۔ اور حضرت علی کے خلاف جنگ جمل کیوں لڑی۔

جواب: وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کا مفہوم خود قرآنی اشارات بلکہ تصریحات سے نیز نبی کریم ﷺ کے عمل سے اور آپ کے بعد صحابہ کرام کے اجماع سے یہ ثابت ہے کہ مواقع ضرورت اس سے مستثنیٰ ہیں جن میں حج و عمرہ وغیرہ دینی ضروریات شامل ہیں' صدیقہ عائشہؓ اور ان کے ساتھ حضرت ام سلمہ اور صفیہ رضی اللہ عنہما یہ سب حج کے لئے تشریف لے گئیں تھیں' وہاں حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت اور بغاوت کے واقعات سنے تو سخت غمگین ہوئیں' اور مسلمانوں کے باہمی افتراق سے نظامِ مسلمین میں خلل اور فتنہ کا اندیشہ پریشان کیے ہوئے تھا' اسی حالت میں حضرت طلحہ اور زبیر اور نعمان

بن بشیر اور کعب بن عجرہ اور چند دوسرے صحابہ کرام مدینہ سے بھاگ کر مکہ معظمہ پہنچے' کیونکہ قاتلان عثمانؓ ان کے بھی قتل کے درپے تھے' یہ حضرات اہل بغاوت کے ساتھ شریک نہیں تھے' بلکہ ان کو ایسے فعل سے روکتے تھے' حضرت عثمان غنیؓ کے قتل کے بعد وہ ان کے بھی درپے تھے' اس لئے یہ لوگ جان بچا کر مکہ معظمہ پہنچ گئے' اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے' اور مشورہ طلب کیا' حضرت صدیقہؓ نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ آپ لوگ اس وقت تک مدینہ طیبہ نہ جائیں جب تک کہ باغی لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے گرد جمع ہیں' اور وہ ان سے قصاص لینے سے مزید فتنہ کے اندیشہ کی وجہ سے رُکے ہوئے ہیں تو آپ لوگ کچھ روز ایسی جگہ جا کر رہیں جہاں اپنے آپ کو مامون سمجھیں' جب تک کہ امیر المؤمنین انتظام پر قابو نہ پالیں' اور تم لوگ جو کچھ کوشش کر سکتے ہو' اس کی کرو کہ یہ لوگ امیر المؤمنینؓ کے گرد سے متفرق ہو جائیں' اور امیر المؤمنین ان سے قصاص یا انتقام لینے پر قابو پالیں'۔

یہ حضرات اس پر راضی ہو گئے' اور ارادہ بصرہ چلے جانے کا کیا' کیونکہ اس وقت وہاں مسلمانوں کے لشکر جمع تھے' ان حضرات نے وہاں جانے کا قصد کر لیا تو اُم المؤمنینؓ سے بھی درخواست کی کہ انتظامِ حکومت برقرار ہونے تک آپ بھی ہمارے ساتھ بصرہ میں قیام فرمائیں۔

اور اس وقت قاتلانِ عثمانؓ اور مفسدین کی قوت و شوکت اور حضرت علیؓ کا اُن پر حدِ شرعی جاری کرنے سے بے قابو ہونا خود نہج البلاغہ کی روایت سے واضح ہے' یاد رہے کہ نہج البلاغہ کو شیعہ حضرات مستند مانتے ہیں' نہج البلاغہ میں ہے کہ

"حضرت امیر سے ان کے بعض اصحاب و رفقاء نے خود کہا کہ اگر آپ ان لوگوں کو سزا دیدیں جنہوں نے عثمان غنی پر حملہ کیا تو بہتر ہوگا' اس پر حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ میرے بھائی! میں اس بات سے بے خبر نہیں جو تم کہتے ہو' مگر یہ کام کیسے ہو جبکہ مدینہ پر یہی لوگ چھائے ہوئے ہیں' اور تمہارے

غلام اور آس پاس کے اعراب بھی ان کے ساتھ لگ گئے ہیں ایسی حالت میں ان کی سزا کے احکام جاری کردوں تو نافذ کس طرح ہونگے۔"

حضرت صدیقہؓ کو ایک طرف حضرت علیؓ کی مجبوری کا اندازہ تھا دوسری طرف یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت سے مسلمانوں کے قلوب زخمی ہیں' اور ان کے قاتلوں سے انتقام لینے میں تاخیر جو امیر المؤمنین علیؓ کی طرف سے مجبوری دیکھی جا رہی تھی اور مزید یہ کہ قاتلان عثمانؓ امیر المؤمنینؓ کی مجالس میں بھی شریک ہوتے تھے' جو لوگ حضرت امیر المؤمنینؓ کی مجبوری سے واقف نہ تھے' ان کو اس معاملہ میں ان سے بھی شکایت پیدا ہو رہی تھی' ممکن تھا کہ یہ شکوہ وشکایت کسی دوسرے فتنے کا آغاز نہ بن جائے' اس لئے لوگوں کو فہمائش کر کے صبر کرنے اور امیر المؤمنین کو قوت پہنچا کر تنظیمِ مملکت کو مستحکم کرنے اور باہمی شکوہ وشکایت کو رفع کر کے اصلاح بین الناس کے قصد سے بصرہ کا سفر اختیار کر لیا' جس میں ان کے محرم بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ ان کے ساتھ تھے' اپنے اس سفر کا مقصد خود ام المؤمنینؓ نے حضرت قعقاعؓ کے سامنے بیان فرمایا تھا' اور ایسے شدید فتنہ کے وقت اصلاح بین المؤمنینؓ نے حضرت قعقاعؓ کے سامنے بیان فرمایا تھا اور ایسے شدید فتنہ کے وقت اصلاح بین المؤمنین کا کام جس قدر اہم دینی خدمت تھی وہ بھی ظاہر ہے' اس کے لئے اگر ام المؤمنین نے بصرہ کا سفر محارم کے ساتھ اور پردہ کے آہنی ہودج میں اختیار فرما لیا تو اس کو جو شیعہ اور روافض نے ایک طوفان بنا کر پیش کیا ہے کہ ام المؤمنینؓ نے احکامِ قرآن کی خلاف ورزی کی اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔

صحابہؓ میں جنگ جمل کیوں پیش آئی؟

آگے منافقین اور مفسدین کی شرارت نے جو صورت جنگ باہمی کی پیدا کر دی اس کا خیال کبھی صدیقہؓ کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا' اس آیت کی تفسیر کے لئے اتنا

ہی کافی ہے آگے واقعہ جنگ جمل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں' مگر اختصار کے ساتھ حقیقت واضح کرنے کے لئے چند سطور لکھی جاتی ہیں۔

باہمی فتنوں اور جھگڑوں کے وقت جو صورتیں دنیا میں پیش آیا کرتی ہیں ان سے کوئی اہل بصیرت و تجربہ غافل نہیں ہوسکتا' یہاں بھی صورت یہ پیش آئی کہ مدینہ سے آئے ہوئے صحابہ کرام کی معیت میں حضرت صدیقہؓ کے سفر بصرہ کو منافقین اور مفسدین نے حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰؓ کے سامنے صورت بگاڑ کر اس طرح پیش کیا کہ یہ سب اس لئے بصرہ جارہے ہیں کہ وہاں سے لشکر ساتھ لے کر آپ کا مقابلہ کریں' اگر آپ امیر وقت ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ اس فتنہ کو آگے بڑھنے سے پہلے وہیں جاکر روکیں' حضرت حسن و حسین و عبداللہ بن جعفر' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام نے اس رائے سے اختلاف بھی کیا اور مشورہ یہ دیا کہ آپ ان کے مقابلہ پر لشکر کشی اس وقت تک نہ کریں جب تک صحیح حال معلوم نہ ہوجائے' مگر کثرت دوسری طرف رائے دینے والوں کی تھی' حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی اسی طرف مائل ہو کر لشکر کے ساتھ نکل آئے' اور یہ شریر اہل فتنہ و بغاوت بھی آپ کے ساتھ نکلے۔

جب یہ حضرات بصرہ کے قریب پہونچے تو حضرت قعقاعؓ کو ام المؤمنین کے پاس دریافت حال کے لئے بھیجا' انہوں نے عرض کیا کہ اے ام المؤمنین آپ کے یہاں تشریف لانے کا کیا سبب ہوا' تو صدیقہؓ نے فرمایا: اَیْ بُنَیَّ الْاِصْلَاحُ بَیْنَ النَّاس "یعنی میرے پیارے بیٹے: میں اصلاح بین الناس کے ارادہ سے یہاں آئی ہوں" پھر حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کو بھی قعقاعؓ کی مجلس میں بلالیا' قعقاعؓ نے ان سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ قاتلانِ عثمانؓ پر حدِ شرعی جاری کرنے کے سوا ہم کچھ نہیں چاہتے' حضرت قعقاعؓ نے سمجھایا کہ یہ کام تو اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک مسلمانوں کی جماعت منظم اور مستحکم نہ ہوجائے۔ اس لئے آپ حضرات پر لازم ہے کہ اس وقت آپ مصالحت کی صورت اختیار کرلیں۔

ان بزرگوں نے اس کو تسلیم کیا' حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے جا کر امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع دیدی وہ بھی بہت مسرور ہوئے اور مطمئن ہو گئے' اور سب لوگوں نے واپسی کا قصد کر لیا' اور تین روز اس میدان میں قیام اس حال پر رہا کہ کسی کو اس میں شک نہیں تھا کہ اب دونوں فریقوں میں مصالحت کا اعلان ہو جائے گا اور چوتھے دن صبح کو یہ اعلان ہونے والا تھا اور حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی ملاقات حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ و زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہونے والی تھی جس میں یہ قاتلانِ عثمان غنی شریک نہیں تھے' یہ چیز ان لوگوں پر سخت گراں گذری' اور انہوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ تم اول حضرت عائشہ کی جماعت میں پہونچ کر قتل و غارتگری شروع کر دو' تا کہ وہ اور ان کے ساتھی یہ سمجھیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے عہد شکنی ہوئی' اور یہ لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر پر ٹوٹ پڑیں' ان کی یہ شیطانی چال چل گئی' اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لشکر میں شامل ہونے والے مفسدین کی طرف سے جب حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جماعت پر حملہ ہو گیا تو وہ سمجھنے میں معذور تھے کہ یہ حملہ امیر المؤمنین کے لشکر کی طرف سے ہوا ہے' اس کی جوابی کاروائی شروع ہو گئی' حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہ ماجرا دیکھا تو قتال کے سوا چارہ نہ رہا' اور جو حادثہ باہمی قتل و قتال کا پیش آنا تھا آ گیا' انا للہ وانا الیہ راجعون یہ واقعہ ٹھیک اسی طرح طبری اور دوسرے ثقافت مؤرخین نے حضرت حسن اور حضرت عبداللہ بن جعفر اور عبداللہ بن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم کی روایت سے نقل کیا ہے۔ (روح المعانی)

غرض مفسدین و مجرمین کی شرارت اور فتنہ انگیزی کے نتیجہ میں ان دونوں مقدس گروہوں میں غیر شعوری طور پر قتال کا واقعہ پیش آ گیا' اور جب فتنہ فرو ہوا تو دونوں ہی حضرات اس پر سخت غمگین ہوئے' حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ واقعہ یاد آ جاتا تو اتنا روتی تھیں کہ ان کا دوپٹہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا تھا' اسی طرح حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰ کو بھی اس واقعہ پر سخت صدمہ پیش آیا' فتنہ فرو ہونے کے بعد مقتولین کی لاشوں کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے تو اپنی رانوں پر ہاتھ مار کر یہ فرماتے تھے کہ کاش میں

اس واقعہ سے پہلے مر کر نسیاً منسیا ہو گیا ہوتا۔

اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت ام المؤمنین جب قرآن میں یہ آیت پڑھتیں وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ تو رونے لگتیں' یہاں تک کہ ان کا دوپٹہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا۔ (رواہ عبداللہ بن احمد فی زوائد الزہد وابن المنذر وابن ابی شیبہ عن مسروق' روح المعانی)

آیت مذکورہ پڑھنے پر رونا اس لئے نہ تھا کہ قرار فی البیوت کی خلاف ورزی ان کے نزدیک گناہ تھی یا سفر ممنوع تھا بلکہ گھر سے نکلنے پر جو واقعہ ناگوار اور حادثہ شدیدہ پیش آ گیا' اس پر طبعی رنج و غم اس کا سبب تھا۔ (یہ سب روایات اور پورا مضمون تفسیر روح المعانی سے لیا گیا ہے)۔ (تفسیر معارف القرآن مفتی محمد شفیعؒ جلد ۷ صفحہ ۱۳۵ تا ۱۳۸)

صحابہ کرامؓ کی باہمی جنگیں کیوں ہوئیں؟

اعتراض:

جب حضور ﷺ دنیا سے رخصت ہو گئے تو آپ کے بڑے بڑے صحابہ کے درمیان خونریز جنگیں کیوں ہوئیں؟

جواب: چونکہ صحابہ کرام کے بعد قیامت تک مسلمانوں میں ہونے والی باہمی لڑائیوں اور جنگوں کا اللہ تعالیٰ کو علم تھا لیکن حضور ﷺ سے ان احکامات کی عملی تعلیم نہیں ملی تھی تو حضرت ابوبکر و عمر و عثمان کے زمانہ خلافت میں ترویج اسلام کا کام ہوا اور حضرت علی کے زمانہ میں باہمی قتال و جدال کے احکام کی عملی تفصیل معلوم ہو گئی۔

باقی رہا یہ سوال کہ دیگر صحابہ کی کیا حیثیت ہو گی جن کی حضرت علی سے جنگیں ہوئیں؟

جواب: جنگوں میں شریک صحابہ اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق شریک ہوئے جس صحابی نے اپنے اختیار سے جنگ میں شرکت کو اور جس جانب کی شرکت کو درست یا ضروری سمجھا اس طرف شرکت فرمائی اسلام میں مجتہد سے اگر خطاء بھی ہو تو ایک درجہ کا ثواب ملتا ہے اور مجتہد سے درست اجتہاد ہو تو دوہرا ثواب ملتا ہے۔

بہر حال صحابہ کی جنگوں میں بعد کے آنے والے مسلمانوں کے عمل کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔ (امداداللہ انور)

مسلمان قرآن وحدیث کے بعد اجماع اور قیاس کیوں کرتے ہیں

اعتراض: (عیسائی پادریوں کا اعتراض)

''مسلمان کو جب کسی مسئلہ کا حل قرآن میں نہیں ملتا اور لاکھوں حدیثوں میں سے کوئی حدیث بھی مسئلہ سلجھانے میں سہارا نہیں بنتی تو مسلمانوں کو کیونکر اجماع کا سہارا لینا پڑتا ہے اور جب کسی مسئلہ کو حل کرنے میں' قرآن' احادیث اور اجماع سب کے سب ناکام ہو جاتے ہیں تو کیونکر مسلمانوں کو قیاس آرائیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جبکہ اکیلے قرآن کو مکمل ضابطہ حیات کہا جاتا ہے؟''

جواب: اسلام میں کسی مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے چار ذرائع ہیں۔ جنہیں ''شرعی ادلۃ'' کہا جاتا ہے۔

اول: قرآن مجید، دوم: حدیث شریف، سوم: اجماع امت، چہارم: قیاس۔ ان چاروں میں سے کسی ایک سے جو مسئلہ ثابت ہوگا۔ وہ اسلامی مسئلہ ہوگا۔ (اصول الشاشی)

دینِ اسلام' عیسائیت کی طرح نہیں کہ خود عقیدہ گھڑ کر اسے بائبل کی طرف منسوب کر دیا جیسے مسئلہ تثلیث کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

''بائبل مقدس تعلیم دیتی ہے کہ خدا ایک میں تین ہے' ایک قادرِ مطلق ذات جس میں تین اقنوم ہیں۔ جنہیں باپ بیٹا اور روح القدس کہتے ہیں'۔

(تحقیق حق صفحہ ۴۸ از پادری ایم' ایچ' فن لے صاحب)

جبکہ تثلیث کی یہ تعریف بائبل میں یقیناً موجود نہیں۔ تو دیکھو اسے خود وضع کر کے خواہ مخواہ بائبل کی طرف منسوب کر دیا۔

نیز "روح القدس" صرف باپ سے صادِر ہوتا ہے:۔ "سچائی کا روح جو باپ سے صادِر ہوتا ہے"۔ (انجیل یوحنا ۱۵:۲۶)
مگر مسیحی علماء نے اس کے خلاف یہ عقیدہ وضع کیا کہ: "سچائی کا روح جو باپ اور بیٹے سے صادر ہوتا ہے"۔
ان دونوں باتوں کے علاوہ تیسری بات یہ ہے کہ ختنہ کا حکم جو ابدی تھا (پیدائش ۱۷:۹ تا ۱۴)۔ اسے صرف قیاس سے ختم کر دیا۔ (اعمال ۱۵:۱۹ تا ۲۹)۔ دیکھو اناجیل اربعہ میں اس کا کوئی حل نظر نہیں آیا۔ الغرض جو اعتراض ہم پر کیا گیا ہے وہی اعتراض معترض صاحب پر لوٹتا ہے۔ (جواب مسلم صفحہ ۱۷۹)

یہودیوں پر ابدی ذلت کا مطلب
اور اسرائیل کی موجودہ حکومت سے شبہ

اعتراض: (یہودیوں کا اعتراض)

قرآن میں یہود کی سزا دنیا میں دائمی ذلت و مسکنت اور دنیا و آخرت میں غضب الٰہی کو بیان کیا گیا ہے' حالانکہ یہودی مالدار بھی ہیں اور اسرائیل کے نام سے دنیا میں حکومت بھی قائم کر لی ہے۔

جواب: ان کی دائمی ذلت و مسکنت کا مفہوم جو ائمہ تفسیر صحابہ و تابعین سے منقول ہے' اس کا خلاصہ ابن کثیر کے الفاظ میں یہ ہے کہ **لَا يَزَالُوْنَ مستذ لين من وجدهم استذلهم وضرب عليهم الصغار**. یعنی وہ کتنے ہی مالدار بھی ہو جائیں ہمیشہ تمام اقوام میں ذلیل و حقیر ہی سمجھے جائیں گے جس کے ہاتھ لگیں گے ان کو ذلیل کرے گا' اور اُن پر غلامی کی علامتیں لگا دے گا۔
امام تفسیر ضحاک بن مزاحم نے حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے ان کی ذلت و مسکنت کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ **هم اهل القبالات يعنى الجزية**. مطلب یہ ہے کہ یہودی

ہمیشہ دوسروں کی غلامی میں رہیں گے' ان کو ٹیکس وغیرہ ادا کرتے رہیں گے' خود اُن کی کوئی قوت واقتدار حاصل نہ ہوگا' اس مضمون کی ایک آیت سورۃ آل عمران میں ایک زیادتی کے ساتھ اس طرح آئی ہے:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ . (سورۃ آل عمران:۱۱۲)

''جمادی گئی اُن پر بے قدری جہاں کہیں جائیں گے مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعہ سے جو اللہ کی طرف سے ہو اور ایک ایسے ذریعہ سے جو آدمیوں کی طرف سے ہو''۔

اللہ تعالی کے ذریعہ کا مطلب تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالی نے ہی اپنے قانون میں امن دیدیا ہو' جیسے نابالغ بچے' عورتیں' یا ایسے عبادت گزار جو مسلمانوں سے لڑتے نہیں پھرتے' وہ محفوظ و مامون رہیں گے' اور آدمیوں کے ذریعہ سے مراد معاہدہ صلح ہے' جس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مسلمانوں سے معاہدہ صلح کا یا جزیہ دے کر ان کے ملک میں رہنے کا ہو جائے' مگر الفاظ قرآن میں مِنَ النَّاسِ فرمایا ہے مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ نہیں' اس لئے یہ صورت بھی محتمل ہے کہ دوسرے غیر مسلموں سے معاہدہ صلح کا کر کے اُن کی پشت پناہی میں آجائیں تو مامون رہ سکتے ہیں' پھر یہ استثناء حبل من اللہ اور حبل من الناس کا اگر بقول کشاف استثناء متصل قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ یہود ہمیشہ ہر جگہ ذلیل وخوار رہیں گے' بجز اُن دو صورتوں کے کہ یا تو اللہ کے عہد کے ذریعہ ان کے بچے' عورتیں وغیرہ اس ذلت وخواری سے نکل جائیں' یا معاہدہ صلح کے ذریعہ یہ اپنے آپ کو ذلت وخواری سے بچالیں اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے معاہدہ صُلح کے ذریعہ ذلت وخواری سے نکلنے کی صورت مسلمانوں سے معاہدہ صلح کر کے بھی ہو سکتی ہے' اور یہ بھی احتمال ہے کہ دوسری قوموں سے معاہدہ صلح کا کر کے اُن کے سہارے ذلت وخواری سے محفوظ رہیں۔

یہ سب وضاحت استثناء متصل کی تقدیر پر ہے' اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس کو استثناء منقطع قرار دیا ہے' تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ اپنی ذلت اور اپنی قومی حیثیت سے تو ذلیل وخوار ہی رہیں گے' گو قانون الٰہی کی وسعت میں آ کر ان کے بعض افراد اس سے محفوظ ہو جائیں گے' یا دوسرے لوگوں کا سہارا لے کر ذلت وخواری پر پردہ ڈال دیں۔

اس طرح سورۂ بقرہ کی آیت کی وضاحت سورۂ آل عمران کی آیت سے پوری ہوگئی۔۔ اور اسی سے وہ تمام شبہات بھی دور ہو گئے جو آجکل فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہونے کی بناء پر بہت سے مسلمانوں کو پیش آتے ہیں۔ کہ قرآن کے قطعی ارشادات سے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودیوں کی حکومت کبھی قائم نہ ہوگی' اور واقعہ یہ پایا جاتا ہے کہ فلسطین میں اُن کی حکومت قائم ہوگئی' جواب واضح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی موجودہ حکومت کی حقیقت سے جو لوگ باخبر ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ حکومت درحقیقت اسرائیل کی نہیں ہے بلکہ امریکہ اور برطانیہ کی ایک چھاونی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں یہ اپنی ذاتی طاقت سے ایک مہینہ بھی زندہ نہیں رہ سکتے' یوروپین طاقتوں نے اسلامی بلاک کو کمزور کرنے کیلئے اُن کے بیچ میں اسرائیل کا نام دے کر ایک چھاؤنی بنائی ہوئی ہے' اور اسرائیلی اُن کی نظروں میں بھی اُن کے فرماں بردار غلام سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے' صرف قرآن کریم کے ارشاد بِحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کے سہارے ان کا اپنا وجود قائم ہے' وہ بھی ذلت کے ساتھ' اس لئے موجودہ اسرائیلی حکومت سے قرآن کریم کے کسی ارشاد پر ادنیٰ شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہود' نصاریٰ اور مسلمانوں میں سب سے پہلے یہود ہیں ان کی شریعت' اُن کی تہذیب سب سے پہلی ہے۔ اگر پوری دنیا میں فلسطین کے ایک چھوٹے سے قصبہ پر ان کا تسلط کسی طرح ہو بھی گیا' تو پوری دنیا کے نقشہ میں یہ حصہ ایک نقطہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے' اس کے بالمقابل

نصاری کی سلطنتیں اور مسلمانوں کے دور تنزل کے باوجود ان کی سلطنتیں، بت پرستوں کی سلطنتیں، لا مذہبوں کی حکومتیں جو جگہ جگہ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہیں اُن کے مقابلہ میں فلسطین اور وہ بھی آدھا، اور اس پر بھی امریکہ، برطانیہ کے زیر سایہ کوئی تسلط یہودیوں کا ہو جائے تو کیا اس سے پوری قوم یہود پر خدا تعالیٰ کی طرف سے لگائی ہوئی دائمی ذلت کا کوئی جواب بن سکتا ہے؟ (معارف القرآن جلد اصفحہ ۲۳۷، ۲۳۸)

مجتہدین کا فقہی مسائل میں اختلاف کیوں؟

اعتراض: (بعض منکرین اسلام کا اعتراض)

جب اسلام ایک ہے اور اس کے مسائل قرآن وسنت میں موجود ہیں تو علماء مجتہدین شرعی مسائل میں اختلاف کیوں کرتے ہیں؟

جواب: حضور علیہ السلام کے طریقوں میں فرق کرنا کہ حضور کے نزدیک کون سا طریقہ مقصود ہے اور کون سا مقصود نہیں یہ کام مجتہدین علماء کا ہے ہر شخص کا کام نہیں ہے اور مجتہد سے شریعت کے مسائل میں ماہر حضرات مراد ہیں مثلاً حضور علیہ السلام سے نماز میں رفع یدین کرنا ثابت ہے اور نہ کرنا بھی ثابت ہے اب یہاں مجتہدین کا اختلاف ہوا ایک مجتہد نے سمجھا کہ رفع یدین کرنا مقصود ہے اور رفع یدین نہ کرنا بیان جواز کے لیئے ہے مقصود نہیں ہے اور جو مجتہد رفع یدین نہ کرنے کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں نماز میں سکون چاہئے چنانچہ حدیث میں آتا ہے حضور علیہ السلام نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہ تم نماز میں ہاتھ اٹھاتے ہو نماز میں سکون اختیار کیا کرو اس سے معلوم ہوا کہ رفع یدین نہ کرنا مقصود ہے اور رفع یدین کرنا مقصود نہیں بیان جواز کے لئے ہے یا منسوخ ہے۔

اسی طرح جہاں کہیں اختلاف ہوا اسی وجہ سے ہوا کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور دوسرے نے دوسری چیز کو یہی مجتہدین کے درمیان مسائل میں اختلاف کا سبب ہے۔

ساتواں باب

قرآن پاک
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

قرآن میں کسی طرح کا شک نہیں

سوال: بہت سے لوگوں کو قرآن میں ریب (شک) تھا اور اب بھی ہے اور جو کسی کو نہ ہوتا تو تمام لوگ اہل اسلام ہی نہ ہو جاتے پھر مطلقاً یہ کہنا کہ اس میں کوئی شک نہیں کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

جواب: انکار اور تکذیب اور چیز ہے شک و تردد اور چیز بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا یقین کامل ہو سکتا ہے مگر کسی خاص وجہ سے متعصب اور معاند لوگ ضد میں یا رسوم اور قوم کی پابندی میں آ کر انکار کر دیتے ہیں اور ہٹ دھرمی سے نہیں مانتے۔ سو یہ اور بات ہے ہم اس کی نفی نہیں کرتے ہاں کسی صاحبِ عقل سلیم کو قرآن کے مطالب میں بعد تامل کے شک نہ ہوگا اور جو کبھی ہوا بھی تو وہ اس کے قصور فہم سے ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ قرآن بلحاظِ وضاحت دلائل محل ریب نہیں۔ جس طرح عام محاورہ میں سچی بات کی نسبت کہہ دیتے ہیں کہ اس میں کچھ شک نہیں گو مخاطب کو شک ہو مگر بلحاظ فصاحت قرائن و دلائل مزیل شک اس شک کو کالعدم قرار دے کر نفی کر دیتے ہیں۔ بعض لوگ اس بات کو نہ سمجھے تو تفسیر میں غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

(مقدمہ حقانی ۱/۷۷)

قرآن لیلۃ مبارکہ میں اترا یا لیلۃ القدر میں

اعتراض:

لیلۃ مبارکۃ میں علماء اسلام کے دو قول ہیں۔ جمہور کے نزدیک لیلۃ القدر مراد ہے جو رمضان کے اخیر میں پائی جاتی ہے غالباً ستائیسویں رات۔ اس قول پر اس آیت میں اور دوسری آیات میں جیسا کہ **انا انزلنٰہ فی لیلة القدر** یا **شھر رمضان الذی انزل فیه القراٰن** کوئی مخالفت باقی نہیں رہتی ہاں ایک شبہ باقی

رہتا ہے کہ باتفاق مورخین قرآن مجید کی سب سے پہلی سورت جو نازل ہوئی تو اقرأ باسم ربک الخ سے اور وہ شوال میں نازل ہوئی تھی۔ اور یہ بھی کہ قرآن مجید ایک بار نازل نہیں ہوا ہے تھوڑا تھوڑا مکہ اور مدینہ میں تیئس (۲۳) برس کے عرصہ میں نازل ہوا ہے پھر کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ لیلۃ مبارکہ میں نازل ہوا ہے عام ہے کہ لیلہ مبارکہ سے لیلۃ القدر مراد لی جائے یا شب برات۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ لوح محفوظ سے آسمان دنیا کی طرف سب کا سب قرآن مجید لیلۃ القدر میں نازل ہوا جو رمضان کے مہینے میں واقع ہوئی تھی یا ہمیشہ رمضان ہی میں واقع ہوتی ہے پھر وہاں سے تھوڑا تھوڑا حسب حاجت دنیا میں آنا شروع ہوا شوال میں یا رمضان میں جیسا کہ ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لیلہ مُبارکہ میں نازل کرنے سے مراد تمام قرآن مجید نہ ہو پس اس کا ایک حصہ آنحضرت ﷺ پر رمضان میں لیلۃ القدر میں نازل ہوا اور آپؐ نے اس کا اظہار شوال میں دو چار روز بعد کیا پس لیلہ مُبارک میں نازل کرنا فرمانا صحیح ہوگیا۔

(تفسیر حقانی ۲۶۹/۴)

اللہ کے استہزاء کا معنی

اللہ یستھزئ بھم ۔استھزاء اور مکر اور خداع وغیرہ اوصاف کو جو آیاتِ قرآنیہ میں خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے تو مجازاً کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ اوصاف ذمیمہ ہیں۔ ان سے وہ پاک ہے مگر محاورہ میں ایک فعل پر کسی مناسبت سے اکثر دوسرے فعل کا اطلاق آتا ہے بولتے ہیں۔ جس طرح تم پر کوئی ظلم کرے اسی قدر تم بھی اس پر ظلم کرو۔ حالانکہ ظلم کے مقابلہ میں جو کچھ جزائے مناسب دی جائے وہ ظلم نہیں مگر وہ دونوں فعل باہم مناسبت رکھتے ہیں۔ اس لئے اس پر بھی ظلم کا اطلاق آیا۔ قال تعالیٰ: وجزاء سیئۃ

سَيِّئَةً ۔ پس وہ لوگ جو دینداروں کے ساتھ مکر اور ٹھٹھا کرتے ہیں خدا تعالیٰ ان کو اس فعل بد کی جزا دیتا ہے۔ لیکن اس جزاء پر ایک مناسبت سے مکر اور ٹھٹھے کا اطلاق آیا اور خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہوا۔ اور یہ ایک محاورے کی بات ہے اس پر طعن کرنا سراسر بیوقوفی ہے۔ بعض پادری اور ہندو مسلمانوں کو ان آیات سے ان الزامات کا جواب دیا کرتے ہیں کہ جو ان کی کتب دینیہ سے ثابت ہوتے ہیں جن میں خدا تعالیٰ کی ذات مقدس میں جسمانیت اور حدوث اور جہل وغیرہ امور کو ثابت کیا ہے مگر یہ سراسر ناانصافی ہے یا ان آیات کے مطالب سے لاعلمی یا عمداً کجروی ہے۔ (تفسیر حقانی ۱/۱۰۳،۱۰۴)

کیا لوگ خدا کی مرضی سے گمراہ یا ہدایت پر ہوتے ہیں

اعتراض: (چوبے بدریداس ہندو کا اعتراض)

اللہ تعالیٰ بغیر کسی سبب کے جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور بے باعث جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے چنانچہ سورت انعام میں ہے مَنْ يَّشَاءِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. یعنی خدا جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔

جواب: آپ کا یہ دعویٰ اس آیت سے ثابت نہیں ہے خود آپ کے اس آیت کے ترجمہ سے آپ کا دعویٰ باطل ہو رہا ہے ذرا آنکھ کھول کر آیت میں بے سبب اور بے باعث لفظ دکھا دو کہاں ہے؟ اس کی مشیت جس کام کے لئے ہو حکمت سے خالی نہیں خواہ وہ حکمت ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو۔

اور اس سے زیادہ تو بالکل اپنکھد میں موجود ہے اس میں لکھا ہے کہ

میں نڈر ہوں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں۔

چشم بصیرت کو کام میں لے آیئے یہ مضمون (کہ خدا بے باکانہ جو چاہے وہ

کرے) آپ کے اپنکھد سے نکلتا ہے یا آیت قرآن پاک سے۔

بھیکم پرب مہا بھارت میں لکھا ہے کہ میں پیدا کرنے والا ہوں اور میں گرفتار کمند کردار نہیں ہوں۔

سانت پرب میں لکھا ہے کہ جگدیس جو کام کرتا ہے اپنی عنایت سے کرتا ہے پس ظاہر ہوا کہ ہندوؤں کی معتبر کتابوں کی تصریحات کے مطابق بھی اللہ تعالیٰ کے کام علتوں اور اغراض کی بنیاد پر نہیں ہیں اور وہ کمند کردار کا پابند نہیں۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اپنی عنایت سے کرتا ہے۔ (سوط اللہ الجبار ۳/۵۰)

دیوار ذوالقرنین کہاں ہے

جواب:

اس کا ثبوت اس سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ یہ دیوار کس نے بنائی؟ پس جو اس کا بنانے والا ہے وہی شخص ذوالقرنین ہے کہ جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے اب ہم کو اس دیوار کی تلاش کرنی پڑی کہ کہاں ہے؟ ہمارے سامنے حال کے بھی متعدد جغرافیے اور کرہ زمین کے صحیح نقشے دھرے ہیں جو سرکاری مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں ان میں کسی جگہ یاجوج ماجوج قوم کا ذکر تک نہیں اور یہ ممکن ہے کیونکہ حال کے جغرافیوں میں قوموں اور ملکوں کے وہی نام ذکر کیے جاتے ہیں جو آج کل متعارف ہیں اور ایسا بہت واقع ہوا ہے کہ زمانے کے گزرنے سے ملکوں اور شہروں اور قوموں کے اور ہی نام ہو گئے پہلے نام بدل گئے۔ ہوسکتا ہے کہ یاجوج ماجوج کو آج کل کسی اور نام سے تعبیر کرتے ہوں اس لیے یاجوج ماجوج کا نام نہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں نہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کوئی قوم نہیں یا پہلے تھی اب بالکل نیست و نابود ہوگئی اس طرح اس دیوار کا بھی ذکر نہیں اور یہ بھی قرین قیاس ہے اس لیے کہ جغرافیوں اور نقشوں میں شہروں اور پہاڑوں اور بڑے بڑے نشانوں کو ذکر کیا کرتے ہیں اور یہ دیوار جیسا کہ

اہل اسلام کے مورخ کہتے ہیں کہ صرف تخمیناً ڈیڑھ گز کی ایک مرتفع اور مستحکم دیوار دو پہاڑوں کے درمیان ہے اس سے بھی بڑی بڑی صدہا چیزیں مذکور نہیں ہوتیں اب ہم کو مسلمانوں کے قدیم جغرافیہ دیکھنے چاہیں کہ جنہوں نے بطلیموس کے جغرافیے کو لے کر اس کے ساتھ اپنے سفر نامے اور اپنے دیکھے ہوئے مقامات کو بھی نہایت تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے اور گویا حال کے جغرافیوں کی انہیں پر تقسیم اقالیم و جزائر و ممالک وغیرا امور میں بنیاد ہے اور یہ بھی درست ہے کہ آج کل سامان سفر جیسے مہیا ہیں اور جس آسان طریقہ سے ہر ایک ملک کی خبر دریافت ہوسکتی ہے پہلے یہ بات نہ تھی اور اس لیے حال میں اس فن میں بہت کچھ چھان بین کی گئی مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دوسری تیسری صدی میں جب کہ مسلمانوں کی فتوحات مشرق و مغرب تک پھیل گئی تھی اور وہ باوجود صعوبت سفر کے اندلس اور جبل الطارق سے لے کر چین کے کناروں تک ایسے امور کی تحقیقات کیلئے سفر کیا کرتے تھے اور پھر ہر ایک سیاح نہایت صحت و احتیاط کے ساتھ ان مقامات و بلاد و ممالک کے احوال قلم بند کیا کرتا تھا چنانچہ اس قسم کے بہت سے جغرافیے اب تک موجود ہیں جن میں سے اکثر کو اہل فرنگستان نے طبع بھی کیا ہے ان میں سے میرے پاس اس وقت یہ کتابیں موجود ہیں جن سے ایشیاء اور افریقہ کے ملکوں کا اور ان کے شہروں اور مشہور مقاموں کا بڑی تشریح کے ساتھ حال معلوم ہوسکتا ہے۔

(۱) **کتاب المسالک و الممالک تالیف ابی القاسم بن حوقل** مطبوعہ لیڈن مطبع بریل ۱۸۷۳ء

(۲) **الآثار البافیه عن القرون الخالیه تالیف ابوریحان محمد ابن احمد** بیرونی خوارزمی مطبوعہ جرمن ۱۸۷۸ء بیرون سندھ میں کوئی قریہ یا شہر تھا شاید اب بھی ہو، یہ شخص بڑا حکیم و نجوی تھا جو سلطان محمود غزنوی کے عہد میں تھا

(۳) **نزهته المشتاق فی ذکر الامصار و الاقطار و البلدان و**

الجزر والمدائن و الآفاق اس کا مصنف علوی ادریسی چھٹی ہجری میں تھا، یہ جغرافیہ یونانی اور اس کے جغرافیوں میں سے ملخص کر کے جزیرہ صقلیہ کے عیسائی بادشاہ کیلئے تصنیف کیا تھا

(۴) مراصد الاطلاع علی اسماء الامکنة و البقاع تالیف یاقوت حموی مطبوعہ فرانس۔

(۵) کتاب البلدان تالیف ابی بکر احمد بن محمد الھمذانی المعروف بابن الفقیہ مطبوعہ لیڈن بمطبع بریل ۱۳۰۲ ہجری۔

(۶) احسن التقاسیم فی معرفة الاقالیم تالیف شمس الدین ابی عبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر البناء الشامی المقدسی المعروف لبشاری مطبوعہ لیڈن بمطبع بریل ۱۸۷۷ء اس کا مصنف شہاب الدین غوری سے بھی پہلے تھا

(۷) المسالک و الممالک تالیف ابن اسحاق ابراہیم بن محمد الفارسی الاصطخری المعروف بالکرخی مطبوعہ مطبع بریل واقع شہر لیڈن ۱۸۷۰ء۔

(۸) تقویم البلدان تالیف السلطان عماد الدین اسماعیل بن المالک الافضل یعنی ابوالفدا مطبوعہ پیرس ۱۸۴۰ء۔

(۹) مقدمہ ابن خلدون یہ شخص جو آٹھویں صدی میں گزرا ہے بڑا حکیم تھا اس نے اپنے جغرافیہ میں حکیم بطلیموس کے جغرافیہ سے لیا ہے جو حضرت مسیح سے تھوڑے دنوں بعد گزرا ہے اور نیز رجار، ابن مسعودی، ابن حوقل، قدری، ابن اسحاق منجم ونزہتہ المشتاق سے بھی لیا ہے اور اقالیم کا اس صحت وخوبی کے ساتھ حال بیان کیا ہے جو آج کل کے جغرافیوں سے بال برابر فرق نہیں رکھتا صرف ناموں کا فرق ہے اس نے اپنے مقدمہ میں تین جگہ اس دیوار کا ذکر کیا ہے صفحہ ۱۷ میں کہتا ہے۔

پہلی دیوار

وفی الجزء التاسع من هذا الاقليم السابع فی الجانب الغربی منه بلاد خفشاخ وهم قفچق یجوزها جبل قوقیا حین ینعطف من شماله عند البحر المحیط ویذهب فی وسطه الی الجنوب بانحراف الی الشرق فیخرج فی الجزء التاسع من الاقلیم السادس ویمر معترضا فیه وفی وسطه هنالک سدیا جوج وما جوج وقد ذکرناه وفی الناحیة الشرقیة من هذا الجزء ارض یاجوج وراء جبل قوقیا علی البحر قلیلة العرض مستطیلة احاطت به من شرقه و شماله ۵۱ .

کہ اس اقلیم کے نویں حصہ میں ایک گوشہ میں خفشاخ کے بلاد میں کہ جن کو قفچاق کہتے ہیں کہ جن پر سے قوقیا پہاڑ گزرتا ہے جب کہ وہ بحر محیط کے پاس سے ہو کر شمال کی طرف مڑتا ہے قدرے شرق کو مائل ہو کر تب وہ پہاڑ اقلیم سادس کے نویں حصہ تک نکل جاتا ہے اور یہیں سے وہ موڑ کھا کر نکلتا ہے اور اسی جگہ پر اس کے وسط میں یاجوج ماجوج والی دیوار ہے کہ جس کو ہم ذکر کر چکے ہیں اور اس حصہ کے شرقی کنارہ میں یاجوج کا ملک ہے جبل قوقیا کے پرے سمندر کے رخ مستطیل ٹکڑا ہے قوقیا غالباً کوہ الطائی کو کہتے ہیں اور اسی کے موڑ میں ایک جگہ وہ دیوار ہے اور کوہ الطائی کے پرلی طرف منچوریا اور منگولیا مغلوں کی قومیں ہیں جن کو یاجوج سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ لوگ سخت خونخوار درندے اور وحشی اور سفاک کافر تھے جن کا پیشہ شکار ہے پہلے زمانے میں یہ لوگ ادھر تو چین کے ملک پر تخت و تاراج کیا کرتے تھے جن کے روکنے کیلئے حضرت مسیح علیہ السلام سے تخمیناً ۲۳۵ برس بیشتر فغفور چین نے دیوار بنائی تھی جس کی لمبائی کا اندازہ بارہ سو میل سے لے کر پندرہ سو میل تک کیا گیا یہ مستحکم دیوار کہ جس کی پوری کیفیت تاریخ چین سے معلوم ہوتی ہے اب تک موجود ہے جو عجائب روزگار

میں شمار کی جاتی ہے ادھر یہ سفاک قوم اس پہاڑ کے درہ میں سے گزر کر ترکستان پر تخت وتاراج کرنے آیا کرتی تھی اب ہم یہ بتلاتے ہیں کہ دنیا میں اس قسم کی دیواریں کئی جگہ ہیں۔

(۱) ملک چین کے شمالی حصہ میں ایک دیوار ہے جس کو دیوار چین کہتے ہیں جس کو بقول مورخین چی وانگٹی فغفور چین نے بنایا تھا

دیوار دوم

(۲) دوسری وہ دیوار جو جبل الطای کے کسی درہ کے بند کیے ہوئے ہے جس کا ابن خلدون نے بھی ذکر کیا اور اسی کو اکثر مورخین اسلام سد یاجوج کہتے ہیں جس کی تحقیق خلفائے عباسیہ کے عہد میں کی گئی تھی چنانچہ ابوریحان بیرونی اپنی کتاب آثار باقیہ مطبوعہ جرمن ۱۸۷۸ء کے صفحہ ۴۱ میں لکھتے ہیں:

فاما الردم المبنی بین السدین فان ظاهر القصة فی القرآن لا ینص علی موضعه من الارض وقد نطقت الکتب المشتملة علی ذکر البلادو المدن کجغرافیا وکتب المسالک والمماملک علی ان هذه الامة اعنی یاجوج وماجوج هم صنف من الاتراک المشرقیة الساکنة فی مبادئ الاقالیم الخامس والسادس ومع هذا حکی محمد بن جریر الطبری فی کتاب التاریخ ان صاحب اذربیجان ایام فتحها وجه انسانا الیه من ناحیة الخزر فشاهده ووصفه ببناء باسق سام اسود وراء خندق وثیق منیع. وحکی عبد الله بن خرداذبة عن الترجمان بباب الخلیفة ان المعتصم رای فی المنام ان هذا الردم قد فتح فوجه بخمسین نفراً الیه لیعاینوه فسلکوا من طریق باب الابواب واللان والخزر حتی بلغوا الیه وشاهدوه معمولا من لبن حدید و مشددا بالنحاس المذاب وعلیه باب مقفل وحفظه من اهل البلدان القریبة منها وأنهم رجعوا فاخرجهم الدلیل الی البقاع المحاذیة لسمرقند، انتهی.

کہ اس دیوار کا قرآن نے کوئی موقع و محل نہیں بتلایا کہ کس جگہ ہے ہاں کتب تواریخ وجغرافیہ میں تو ہے کہ یاجوج ماجوج ترکوں میں سے ایک قوم کا نام ہے جو اقلیم خامس و سادس کے مشرق میں رہتے ہیں اور محمد بن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں بھی لکھا ہے کہ والی آذر بائیجان نے جب اس ملک کو فتح کیا تو کسی کو اس دیوار کے دیکھنے کو بھیجا جو بحیرہ خزر کی راہ سے دیکھنے گیا اور دیکھ کر آیا اور ابن خرداذبہ نے نقل کیا ہے کہ خلیفہ معتصم نے خواب میں اس دیوار کو ٹوٹا ہوا دیکھا تب اس کی تحقیق کیلئے پچاس آدمیوں کو روانہ کیا باب الابواب اور لان اور خزر کی راہ سے گئے اور اس کو دیکھ کر آئے اور بیان کیا کہ ایک دیوار مستحکم ہے جو لوہے کے تختوں یا اینٹوں سے بنائی گئی ہے نہایت بلند و مستحکم اور اس میں دروازہ بھی ہے جس پر قفل لگا ہوا ہے پھر جو اس جماعت کو راہبر نے وہاں سے نکالا تو سمرقند کے محاذی آنکلے اور کتاب احسن التقاسیم فی معرفت الاقالیم میں اسی بات کو بڑی تفصیل سے نقل کیا ہے مگر معتصم کی جگہ واثق باللہ عباسی خلیفہ کا معاملہ بتایا ہے اور یہی صحیح ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ واثق نے اس جماعت کا افسر محمد بن موسیٰ خوادزمی منجم کو بنایا تھا اور سامان سفر سے بہت کچھ دیا تھا اور بادشاہوں کے نام نامے بھی لکھ دیئے تھے پھر یہ جماعت طرخان کے ملک سے ہو کر اس مقام پر پہنچی کہ جہاں یہ دیوار ہے، آکر انہوں نے سب تفصیل بیان کی، ڈیڑھ سو گز کا دو پہاڑوں میں ایک درہ ہے جس کو دو پائے چن کر (کہ جن کا عرض پندرہ پندرہ گز ہے جو لوہے کی اینٹوں سے بنے ہوئے ہیں اور پھر پگھلے ہوئے تانبے سے ان کی درزیں ملائی گئی ہیں ایک مستحکم دروازہ بنا کر بڑے مستحکم آہنی کواڑوں سے بند کر دیا ہے اور اسی کتاب کے صفحہ ۴۸۰ میں شہر صنعانیان کی مسافت یوں بیان کرتا ہے کہ یہاں سے شومان تک دو دن کا رستہ ہے پھر اندیان تک ایک روز کا پھر واشجرد تک ایک روز کا اور وہاں سے ایلاق ایک روز کا اور وہاں سے دربند ایک روز اور یہاں سے چاؤ گان ایک روز کا انتہیٰ۔ غالباً دردبند ایک دوسری عمارت ہے جو آذر بائیجان کی طرف موجود

ہے کتاب المسالک والممالک تالیف ابی القاسم بن حوقل کے صفحہ ۳۹۹ میں ترمذ اور بخارا کی مسافت یوں بیان کی ہے کہ ترمذ سے قراجون ایک مرحلہ اور وہاں سے میان کال ایک مرحلہ اور وہاں سے یلمرغ ایک مرحلہ اور وہاں سے نسف ایک مرحلہ اور وہاں سے سونخ ایک مرحلہ اور وہاں سے دیذکی ایک مرحلہ اور وہاں سے کندک ایک مرحلہ اور وہاں سے باب الحدید ایک مرحلہ۔ اس کے علاوہ تاریخ تیموری میں تیمور بادشاہ کا اس باب الحدید تک ایک جنگ میں پہنچنا مذکور ہے اور اسکے بعد اور سیاحوں نے بھی اس پہاڑ میں اس دربند کا معائنہ کیا ہے اور یہ بات نقشہ سے بھی صاف ظاہر ہے کہ جبل الطای منگولیا اور منچوریا میں حائل ہے اور اس کا انہی حدود میں ایک موڑ معلوم ہوتا ہے اور اسی پہاڑ کے بیچ میں ایک درہ کشادہ تھا جس کو ذی القرنین نے بند کردیا جواب تک موجود ہے اور ٹھیک یہی وہ دیوار ہے جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے پھر اسی کتاب کا مصنف صفحہ ۳۶۷ میں شہر سمرقند کی بابت لکھتا ہے۔

ویزعم بعض الناس ان تبّعا عمّر مدینتها وان ذی القرنین اتم بعض بنائها ورأیت علٰی بابها الکبیر صحیفة من حدید وعلیها کتابة زعم اهلها انهابالحمیرية و انهم یتوارثون علم ذالک انتہیٰ۔

کہ لوگوں کا خیال ہے کہ تبع نے شہر سمرقند کو آباد کیا اور اس کی بعض عمارت کو ذی القرنین نے تمام کیا اور میں نے اس کے بڑے دروازے پر لوہے کی تختی دیکھی جس پر کچھ لکھا ہوا ہے وہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ حمیریہ خط میں ہے (جو شاہان حمیر والیان یمن کا خط تھا) اور یہ بات وہ اپنے باپ دادا سے سنتے چلے آتے ہیں اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ذی القرنین حمیری بادشاہ تھا اور اس نے اس نواح میں عمل داری بھی کی ہے اپنے ملک کی حفاظت کیلئے جبل الطی کا یہ درہ بھی بند کیا تھا کہ جس کو سد ذی القرنین کہتے ہیں اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ کس لیے شاہان یمن مصر پر بھی عمل داری کر چکے ہیں جو گلہ بانوں کی عملداری کے نام سے مشہور ہے اور ان کے

آثار قدیمہ جیسا کہ قصر غمدان وغیرہ یمن میں یادگار تھے اور اب بھی ہیں جو ان کی عظمت کی گواہی دے رہے ہیں پھر کیا تعجب ہے کہ مشرق و شمال میں بھی ان کی فتوحات ہوئی ہوں۔

دیوار سوم

تیسری دیوار یا ایک نہایت مستحکم بنا ہے جو غیر قوموں کیلئے بنائی گئی تھی مراصد الاطلاع کے صفحہ ۱۱۱ میں ہے: **وباب الابواب فهو دربند، دربند شيروان و باب الابواب مدينة على البحر، بحر طبرستان وهوبحر الخزر الخ و سميت باب الابواب لانها افواه شعاب فى جبل القبق فيها حصون كثيرة ولها حائط بناه انوشيروان بالصخر و الرصاص وعلاها ثلثمائة ذراع و جعل عليه و ابواباً من حديد لان الخزر كانت تغير فى سلطان فارس حتّى تبلغ همذان والموصل فبناه ليمنعهم الخروج منه، انتهى.**

باب الابواب دربند بحر خزر پر ایک شہر ہے اور اس کو باب الابواب اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں جبل قبق کی بہت سی گھاٹیاں ہیں جہاں بہت سے قلعے ہیں اور وہاں ایک دیوار ہے جو پتھر اور سیسے سے بنائی گئی ہے جس کی بلندی تین سو گز ہے اور جس میں لوہے کے دروازے ہیں اور اس کو انوشیروان نے اس لیے بنایا تھا کہ قوم خزر اس کے ملک میں آکر ہمذان اور موصل تک غارت گری کرتی تھی ان کے روکنے کیلئے اس کو بنایا تھا۔

کتاب البلدان کا مصنف ابن الفقیہ اس دیوار کا کئی جگہ ذکر کرتا ہے ایک جگہ صفحہ نمبر ۲۸۸ کہتا ہے

وبنى الحائط بينه وبين الخزر بالصخر والرصاص و عرضه ثلاث مائة ذراع حتى الحقه برؤوس الجبال ثم قاده فى البحر و جعل عليه ابواب حديد پھر ص ۲۹۱ میں کہتا ہے **الباب والابواب حائط بناه**

انوشیروان وان طرفامنه فی البحر الخ ومدسبعة فراسخ الٰی موضع اشب وجبل وعر لایتهیأ سلوکه وھو مبنی بالحجارة المنقورة المربعة لا یقل الحجر الواحد منھا خمسون رجلا وقد بقیت ھٰذه الحجارة وانفذ بعضھا الٰی بعض بالمسامیر وجعل فی ھذه السبعة الفراسخ سبعة مسالک الخ وغلق علٰی کل مسلک باب و عرض السور فی اعلاہ ما یسیر علیه عشرون فارسالا یتزاحمون، انتھی.

کہ خزر کے روکنے کیلئے پتھر اور سیسے کی انوشیروان نے ایک دیوار بنائی کہ جس کا عرض تین سوگز ہے جس کو پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچا دیا اور اس کا ایک سرا دریا میں ملا دیا۔ اس کی لمبائی سات فرسخ ہے ہر ایک فرسخ پر ایک آہنی دروازہ لگا دیا ہے اور یہ دیوار گھڑے ہوئے مربع پتھروں سے بنی ہوئی ہے کہ سوراخ کر کے ایک پتھر کو دوسرے سے میخ سے ملحق کر دیا ہے ان میں سے ایک ایک پتھر ایسا بڑا ہے کہ پچاس آدمی بھی اس کو اکھیڑ نہیں سکتے اور اوپر جا کر اس کی اتنی چوڑان ہے کہ جس پر بلا مزاحمت بیس سوار چلے جاویں۔ اور ایک جگہ یہاں کے قلعوں کو قباد اکبر کی تعمیر بتایا ہے یہ دیوار بھی اب تک قائم ہے اور بیضاوی وغیرہ بعض علماء اسلام نے اسی کو وہ دیوار بتلایا ہے کہ جس کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے۔

دیوار چہارم

(۴) یہ دیوار تبت کے شمالی پہاڑوں میں بمقام راست بنائی گئی ہے اس کی نسبت نزہتہ المشتاق میں یہ لکھا ہے کہ

والراست اقصٰی خراسان من ذٰلک الوجه وھی مدینة بین جبلین کان ھنا مدخل للترک الی الغارة فاغلق الفضل بن یحیی بن خالد بن برمک ھناک بابا.

یہ شہر راست جو دو پہاڑوں کے درمیان میں ہے اس سمت سے خراسان کا اخیر کنارہ ہے یہاں ایک رستہ ہے جہاں سے ترک دھاوا کیا کرتے تھے اس کو فضل بن یحییٰ برمکی نے دروازہ لگا کر بند کر دیا۔ یہ دیوار بالا تفاق وہ دیوار نہیں کہ جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے کیونکہ یہ نزول قرآن کے بعد بنائی گئی ہے۔

دیوار پنجم

(۵) بحر شامی یا بحر روم کا مشرقی کنارہ جو شام سے ملا ہوا ہے اس میں چند جزائر ہیں ایشیائے کوچک سے ملتے ہوئے جن میں سے ایک جزیرہ روڈس ہے اور ایک جزیرہ پلونس ہے کہ جس کو ہزار میل کے دورے سے دریا گھیرے ہوئے ہے اس کا خشکی کی طرف ایک رستہ ہے چھے میل کے فاصلہ کا سو اس کو کسی قیصر روم نے دیوار بنا کر بند کر دیا ہے چنانچہ نزہتہ المشتاق میں لکھتا ہے:

الجزء الرابع من الاقليم الرابع تضمن قطعة من البحر الشامی فيها اعداد جزائر من جزائر الرمانية و جزيرة بليونس جزيرة يُحيط بها البحر الف ميل ولها منفذ الى البر الافم ضيق مقداره ستة اميال وقد كان احد القياصرة من الروم بنى عليه سورا طوله هذه المسافة وهى ستة اميال، انتهىٰ۔

یہ معلوم نہیں کہ یہ دیوار اب بھی قائم ہے کہ نہیں مگر یہ بھی بالا اتفاق وہ دیوار نہیں کہ جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور نہ وہ دیوار مراد ہو سکتی ہے کہ جس کو بعض علما نے ملک اندلس کے پہاڑوں میں بتلایا ہے اب صرف اول و دوم و سوم دیوار میں کلام ہے ۔اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مطبوعہ ۷ جون ۱۸۹۰ میں ہمارے کسی نام اور معاصر نے ایک مضمون طبع کیا جس کی سرخی یا عنوان ازالۃ الغین عن قصۃ ذی القرنین ہے اس میں امام فخر رازی پر بہت کچھ لے دے کی ہے اول تو ذی القرنین کی وجہ تسمیہ میں

جو امام صاحب نے لوگوں کے چند اقوال نقل کیے تھے حالانکہ نہ ان کی صحت کا ذمہ لیا تھا نہ ان کو اپنا قول بتلایا تھا مگر معزز معاصر نے امام صاحب جیسے جلیل القدر شخص پر اعتراض جما کر شہرت حاصل کرنے کی غرض سے سب کو امام صاحب کی طرف منسوب کر کے قہقہہ اڑایا ہے اس کے بعد امام صاحب نے ذی القرنین کے بارے میں جو لوگوں کے قول نقل کیے کہ کسی نے سکندر بن فیلقوس مراد لیا ہے اور کسی نے کوئی حمیری بادشاہ بتلایا ہے وہاں بھی آپ کا سکندر رومی کا ذی القرنین قرار دینا امام صاحب ہی کا عقیدہ سمجھ گئے اور ابو ریحان بیرونی کا جو امام صاحب نے قول نقل کیا تھا کہ وہ حمیری بادشاہ مراد لیتے ہیں وہاں اس کی بھی تغلیط کر دی نہ جس پر کوئی دلیل لائے نہ برہان، پھر عموماً مفسرین پر عتاب فرمایا ہے اور ان کو غلطی میں پڑنے کا الزام دے کر از خود سد کے پتے سے ذی القرنین کی تعیین کرنی شروع کی ہے پھر جب آپ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور آپ کو بجز دیوار چین کے اور کسی دیوار کا پتہ نہ لگا تو اسی کو وہ دیوار قرار دیا کہ جسکا قرآن مجید میں ذکر ہے اور جب تاریخ چین کو دیکھا تو اس دیوار کا بانی چی وانگٹی فغفور کو پایا اس لئے اس کو ذی القرنین قرار دیا اور قرنین سے اس کے دو زمانے مراد لیئے ایک اسباب و سامان جمع کرنے کا دوسرا فتوحات کا اور اس کا مغربی سفر برہما اور ملایا تک پہنچنا اور غربی سمت میں خلیج بنگالہ میں آفتاب کو چشمہ سیاہ میں ڈوبتے پانا قرار دیا اور ایمان لانا جو قرآن میں مذکور ہے (کہ ذی القرنین نے کہا تھا جو ایمان لاوے گا اور اچھے کام کرے گا اس کو اچھا بدلہ ملے گا اس کے معنی فرمابرداری کرنا بتلایا اور مشرقی سفر گاہ چین کا مشرقی کنارہ مانا یہ تو سب کچھ کیا مگر بین الصدفین کی کچھ توجیہ نہ بن سکی گو ساوی کی توجیہ کر دی کہ سیدھا پن مراد ہے نہ کہ دونوں پہاڑوں کی چوٹیوں تک بلند ہونا اس لیے کہ قرآن مجید کی عبارت سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیوار دو پہاڑوں کے درمیان تھی جو بیشتر پہاڑوں کی گھاٹیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ دیوار چین تو تخمیناً پندرہ سو میل تک ہے اور پہاڑوں میں اور پہاڑوں کی

چوٹیوں پر اور میدانوں میں اور دریاؤں پر برابر بنتی چلی گئی ہے اور وہ دیوار تو صرف پہاڑوں کے درمیان بنی تھی جیسا کہ معلوم ہوا کاش معاصر یوں کہتا کہ ذی القرنین نے سب سے اول دو پہاڑوں کے درمیان بس دیوار کو چن کر ایک در بند کر دیا تھا، پھر فغفور چین نے اِدھر اُدھر سے دیوار کو اور بڑھا کر پندرہ سو میل لمبا کر دیا تھا تب تو ایک وجہ معقول ہو سکتی تھی اور یہ بھی سہی مگر اس پر بھی ایک تاریخی خدشہ باقی رہتا وہ یہ کہ اگلے زمانے میں بسبب دشوار گزاری رستوں کے آس پاس کے ملکوں کا تو حال معلوم ہوتا رہتا ہے دور دراز کے ملک جیسا کہ اہل عرب واہل شام سے چین ہے کہ ہمیشہ حیز خفا اور پردہ لاعلمی میں رہتا تھا پھر یہود کو چی وانگٹی فغفور کا قصہ کس سبب سے معلوم ہوا ۔اور جب کہ وہ باخدا اور موحد نہ تھا تو ذی القرنین یا اس کے ہم معنی لفظوں سے اس کا تذکرہ ان کی زبانوں پر جاری ہونے کی کیا وجہ؟ اس کے علاوہ قرآن مجید کے متعدد لفظوں سے ذی القرنین کا باخدا ہونا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اس کا یہ کہنا جو ایمان لائیگا اور نیک کام کریگا اس کو اچھا بدلہ ملے گا اب عام ہے کہ یہ شخص نبی ہو یا اس کا پیرو مرد باخدا جو اس کی شہرت کا قرنوں تک باعث ہوا۔

دوسری دیوار کی نسبت جمہور اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ یہی وہ دیوار ہے جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے چنانچہ تفسیر کبیر اور دیگر تفاسیر میں موجود ہے اور اس کا بانی کوئی فغفور چین نہیں بلکہ اہل تاریخ سب متفق ہیں کہ یہ دیوار کسی حمیری بادشاہ نے بنائی تھی پس ثابت ہوا کہ ذی القرنین حمیری بادشاہ نے بنائی تھی پس ثابت ہوا کہ ذی القرنین حمیری بادشاہ تھا نہ کہ سکندر رومی جیسا کہ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اس کے سوا ایک اور بھی وجہ ہے کہ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذی القرنین عرب کا رہنے والا تھا وہ یہ کہ ذی القرنین عربی لفظ ہے اور ذو کے ساتھ زمانہ قدیم میں اکثر یمن کے بادشاہ ملقب ہوا کرتے تھے جیسا کہ ذی نواس، ذوالنون، ذورعین، ذویزن، ذوجدن، اسی طرح ذوالقرنین بھی ہے۔ ابوریحان بیرونی اس کا نام ابوکرب بن عیر یاشرعش

بن افریقس حمیری بتلاتے ہیں اور اپنی سند میں اسعد یمانی کے یہ اشعار لاتے ہیں۔

فائدہ: ابوریحان بیرونی کے ایک نسخے میں ابوکرب بن عیر بن افریقس حمیری کا نام اس طرح ہے ابوکرب بن عیر یا شریعش بن افریقس حمیری۔

قد کان ذوالقرنین جد مسلما
ملکا علافی الارض غیر معبد

بلغ المشارقو والمغارب یبتغی
اسباب امر من حکیم مرشد

فائدہ: ایک نسخے میں پہلے مصرعہ کے لفظ جد کی جگہ قبلی کا لفظ ہے۔

اور دوسرے شعر کے آخری مصرعہ میں امر کی ملک اور حکیم مرشد کی بجائے کریم سید کا لفظ ہے۔

ابوالفداء اپنی تاریخ کی چوتھی فصل میں ابن سعید مغربی نقل کرتے ہیں کہ اول قحطان بن عامر ملک یمن میں آکر بادشاہ ہوا اس کے بعد اس کا بیٹا یشحب کہ جس کو سبا کہتے ہیں اسی نے شہر سبا بنایا اور مارب کی زمین میں ملک کو شاداب کرنے کیلئے پختہ بند بندھوایا اس کے بعد اس کا بیٹا حمیر بادشاہ ہوا اس نے ثمود کو یمن سے نکال دیا اس کے بعد اس کا بیٹا واثل بادشاہ ہوا اس کے بعد اس کا بیٹا السکسک پھر اس کا بیٹا یعفر بن حمیر کے خاندان میں سے ذوریاش عامر بادشاہ ہوگیا مگر یعفر کے بیٹے نعمان نے پھر غلبہ پایا اور اسکے بعد اس کا بیٹا اشح بادشاہ ہوا اور اس خاندان کی سلطنت اس پر تمام ہوگئی اور شداد بن عاد بن الملطاط بن سبا بادشاہ ہوا جو بڑا جبار بادشاہ تھا اس کے بعد اس کا بھائی لقمان ابن عاد اور اس کے بعد دوسرا بھائی ذوسدد بادشاہ ہوا اس کے بعد اس کا بیٹا حارث الرائش بادشاہ ہوا یہی تبع اول ہے اس کے بعد اس کا بیٹا صعب بادشاہ ہوا یہی ذوالقرنین ہے کہ جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے اسکے بعد اس کا بیٹا ذوالمنار (ابرہہ) بادشاہ ہوا اس کے بعد اس کا بیٹا افریقس اس کے بعد اس کا بھائی ذو

الاذعار اس کے بعد اس کا بھائی شرجیل اس کے بعد اس کا بیٹا الہد ہاد بادشاہ ہوا اس کے بعد اس کی بیٹی بلقیس بادشاہ ہوئی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئی تھی۔ (تفسیر حقانی جلد۳/صفحہ۲۲۲ تا ۲۲۷/سورۃ کہف)

یاجوج ماجوج کون ہیں کہاں ہیں

جواب: اب ہم یاجوج ماجوج پر بحث کرتے ہیں کہ وہ کون قوم ہے اور کیسی ہے؟ باتفاق محققین یہ دونوں عجمی نام ہیں دو قوموں کے کہ جو یافث بن نوح علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ تفسیر کبیر میں ہے۔

فقیل انهما من الترک و قیل یا جوج من الترک وما جوج من الجیل والدیلم.

کہ بعض کہتے ہیں کہ یاجوج ماجوج دونوں ترکوں کے قبیلے ہیں بعض کہتے ہیں کہ یاجوج ترکوں میں سے ہیں اور ماجوج جیل اور دیلم سے۔ بیضاوی اور ابوالسعود ودیگر مفسرین ان کو یافث کی نسل سے کہتے ہیں مطلب ایک ہی ہے۔ کتاب المسالک والممالک میں چین کا حال بیان کر کے لکھتا ہے۔

یکون یاجوج وما جوج ماوراء هم الی البحر المحیط.

(تفسیر حقانی ۲۳۱/۳)

کہ چین سے متصل بحر اعظم کے کنارے کنارے یاجوج ماجوج قوم ہے۔ جبل الطائے کی پرلی طرف منچوریا منگولیا کوریا چین سے ملے ہوئے ہیں دریا کی حد تک وہ ان سب کو یاجوج ماجوج بتلاتا ہے انہیں کے روکنے کے لئے فغفور چین نے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے دیوار چین بنائی تھی۔ اور انہیں کے لئے ذوالقرنین نے اس درہ کو بند کر دیا تھا اور ایک جگہ لکھتا ہے: **واما یاجوج فهم فی ناحیة الشمال اذا قطعت ما بین الکیما کیة الخ۔** اور اسی کے مطابق اور قدیم جغرافیہ والوں نے

بھی بیان کیا ہے جس سے منچوریا اور منگولیا کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دیو بھوت نہیں ہمارے جیسے آدمی ہیں ہاں کسی زمانہ میں وحشی درندے سفاک جاہل کافر ضرور تھے اور کچھ اب بھی ہیں جغرافیہ جام جم میں جو انگریزی کتابوں کا ترجمہ ہے مرزا فرہاد نے ایسا ہی لکھا ہے۔

اس تقدیر پر منگول و من جیوا جو چینی تا تار کے باشندے ہیں۔ انہیں کو اگلے زمانے میں یاجوج ماجوج کہتے تھے۔ اور یاجوج ماجوج کے لفظ کو منگول و من جیوا کر لیا یا اس کے برعکس ہوا۔ اور صدیوں کے بعد الفاظ میں اس قسم کے تغیرات ہو جاتے ہیں کہ جس کا اصل پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں یعقوب کا جیکب اور اسکندر کا الگونڈر اور یوسف کا جوزف بن گیا۔ اور اسی طرح یونانی الفاظ کا عربی میں آکر ایسا ہی حال ہوا اور زبانوں کے الفاظ کو قیاس کر لینا چاہئے۔ جب یہ مان لیا گیا کہ یہ یاجوج ماجوج عربی نہیں بلکہ عجمی لفظ ہیں اب نہیں کہہ سکتے کہ کس ملک کے لفظ اور عربی میں آکر ان میں کیا تغیر کیا اور پہلے یہ اپنی اصلی زبان میں کیا تھے اور اب وہاں یہ کس طرح پر ہیں۔

توریت کتاب پیدائش کے دسویں باب میں یوں آیا ہے (۲) یافث کے بیٹے یہ ہیں جمر اور ماجوج اور مادی اور یوان اور توبل اور مسک اور تیراس۔ اس یاجوج کی بابت ہمارا معزز معاصر لکھتا ہے کہ یہ ماکوک سے معرب ہوا جس کو عربانی میں ماغوغ کہتے ہیں اور آگے چل کر یہ ثابت کیا ہے کہ گاگ میگاگ جس کا یاجوج ماجوج بنایا ہے ایک ہی قوم پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسا ہو مگر اس کی دلیل بیان نہیں کی اس میں کوئی شک نہیں کہ یاجوج ماجوج ابتداء میں کسی شخص کے نام تھے پھر ان کی اولاد میں مستعمل ہونے لگے۔ کتاب حزقیل کے ۳۸ باب میں یوں آیا ہے "اور خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد! تو جوج کی طرف جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبال کا سردار ہے اپنا منہ کر اور اس کے برخلاف نبوت کر" یہاں جوج کو

ماجوج کی سرزمین کا رہنے والا اور روش اور مسک اور توبال قوموں کا سردار کہا۔ بظاہر ماجوج اس ملک اور اس قوم کو کہا جو ماجوج بن یافث کی اولاد میں سے ہیں اور جو انہیں بلاد شمالیہ میں رہتے تھے جن کو آج کل تاتار اور چینی تاتار و ترکستان کہتے ہیں اور انہیں کی نسل کے لوگوں سے یہ ملک آباد ہیں اور جوج یعنی یاجوج ان میں سے کسی خاص فرقے کا نام تھا جو روس و توبال اور مسک قوموں کا ان دنوں میں حاکم ہوگا۔

یہاں سے بعض صاحبوں کا یہ خیال کر لینا کہ جوج سے انگریز اور ماجوج سے روسی لوگ مراد ہیں محض غلط ہے نہ اس کی کوئی سند ہے نہ اس کا کوئی عاقل قائل ہے۔

(تفسیر حقانی جلد ۳/صفحہ ۳۳۱)

سوال: بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج ہر روز اس دیوار کو توڑا اور ڈھایا کرتے ہیں جب شام ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں کل ڈھائیں گے ذرا سی رہ گئی۔ مگر ان کے ان شاء اللہ نہ کہنے سے پھر صبح کو خدا تعالی اس دیوار کو ویسا ہی کر دیتا ہے۔ پھر جب اس کا وقت آئے گا تو ان شاء اللہ کہیں گے پھر اس کو توڑ کر باہر نکل آئیں گے اور لوگ ان سے بھاگ جائیں گے الخ۔

اس حدیث کو ترمذی نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج وقت معہود سے پہلے ان ملکوں میں نہیں آ سکتے اور جس قوم کو تم نے یاجوج ماجوج بتلایا وہ ان ملکوں میں بارہا حملہ کر کے آئے ہیں اور اب بھی وہاں کے لوگ آتے ہیں اور ان کے قریب چین کی عمل داری ہے اور روس کی مملکت بھی ہے۔

جواب: قرآن مجید سے صرف اسی درہ کا بند کرنا ثابت ہوتا ہے جس کو ذوالقرنین نے بند کیا تھا نہ یہ کہ ان کے چاروں طرف کے رستے بند کر دیئے تھے۔ پھر یہ ممکن ہے کہ اور دور دراز کے رستوں سے اس قوم کے لوگ ان ملکوں میں آتے جاتے ہوں گے مگر اس عہد میں بجز اس رستہ کے اور کوئی آسان رستہ ان کے ہاتھ میں نہ ہوگا۔ خصوصاً ان لوگوں پر حملہ آوری کے لئے کہ جن کے کہنے سے ذوالقرنین نے دیوار چنی تھی اور

جو لوگ یاجوج ماجوج چنگیز خانیوں کو کہتے ہیں ان کے نزدیک دیوار ٹوٹنے کا وقت کئی سو برس آگے آچکا اور بہ نسبت اگلے زمانے کے وہ بھی قیامت کے قریب ہے۔ قرب قیامت سے مراد نفخ صور سے متصل زمانہ نہیں اور ان کا اس دیوار پر نہ چڑھنا نہ نقب لگانا اس زمانہ تک تھا نہ ہمیشہ کے لئے یہ ہزاروں برس کا واقعہ ہے صدیوں تک وہ دیوار ان کے خروج کو مانع رہی اب کیا ضرورت ہے کہ ہمیشہ کے لئے یہی مانع رہے۔ قرآن میں کوئی بھی لفظ ایسا نہیں جو اس مطلب پر دلالت کرتا ہو۔ احادیث خبر آحاد ہیں جن کے ثبوت میں بھی یقین کامل نہیں اہل کتاب کی کتابیں قابل احتجاج نہیں۔ ہاں یہود میں یاجوج ماجوج اور دیوار کی بابت عجائب افسانے مشہور تھے جن کو بعض خوش اعتقاد مسلمانوں نے بھی روایت کر دیا۔ چنانچہ معالم التنزیل میں وہب وغیرہ کے چند اقوال یاجوج ماجوج کی نسبت منقول ہیں کہ وہ ایک کان بچھا کر ایک اوڑھ کر سوتے ہیں اور ان میں سے کسی کا قد سو گز سے زیادہ ہے اور ان کے درندوں کی طرح چنگل اور کچلیاں ہیں وغیرہ وغیرہ یہ سب وہی روایات ہیں جو اہل کتاب سے لے کر قرآن مجید سے چسپاں کی گئی ہیں۔

تیسری دیوار جو باب الابواب کے پاس ہے جس کا ہم بیان کر آئے ہیں بعض مفسروں نے اسی کو وہ دیوار ذی القرنین قرار دیا ہے کہ جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے جیسا کہ بیضاوی نے لکھا ہے **وقیل باذر بیجان الخ** کہ بعض نے اس کو آذر بیجان اور آرمینیہ کے پہاڑوں میں بتلایا ہے اور یہ بالاتفاق ہے کہ اس دیوار کا بنانے والا ایران کا کوئی بڑا جلیل القدر بادشاہ ہے پھر کوئی اس کا نام انوشیروان بتلاتا ہے کوئی قباد کہتا ہے اگر انوشیروان ہے تو یہ اخیر انوشیروان نہیں بلکہ پہلے بادشاہوں میں سے کوئی ہوگا کیخسرو کیقباد کہ جس کی سلطنت بھی مشرق و مغرب میں بہت دور تک پہنچی تھی اور اس نے بڑی بڑی مستحکم عمارتیں بھی بنائی تھیں جیسا کہ تاریخ شاہان ایران سے ظاہر ہے اس قول کے مطابق تو یہی بادشاہ ذوالقرنین قرار پاتا ہے اور اس کی سند بھی

کتاب دانیال علیہ السلام کے آٹھویں باب سے ملتی ہے۔

اس کتاب کے ۸ باب میں لکھا ہے بیلشفر بادشاہ (بخت نصر کے بیٹے) کی سلطنت کے تیسرے سال میں مجھے ہاں مجھ دانی ایل کو ایک رویا نظر آئی بعد اس کے جو شروع میں مجھے نظر آئی تھی اور میں نے عالم رویا میں دیکھا اور جس وقت میں نے دیکھا ایسا معلوم ہوا کہ میں سوسن کے قصر میں تھا جو صوبہ عیلام میں ہے پھر میں نے رویت کے عالم میں دیکھا کہ میں اولائی ندی کے کنارے پر ہوں تب میں نے اپنی آنکھیں اٹھا کے نظر کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے آگے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ تھے اور وے دو سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا میں نے اس مینڈھے کو دیکھا کہ پچھم اتر دکھن کی طرف سینگ مارتا تھا۔ یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ ہو سکا وہ جو چاہتا تھا سو کرتا تھا یہاں تک کہ وہ بہت بڑا ہو گیا اور میں اس سوچ میں تھا کہ دیکھا ایک بکرا پچھم کی طرف سے آ کے تمام روئے زمین پر ایسا پھرا کہ زمین کو بھی نہ چھوا اور اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے بیچوں بیچ ایک عجیب طرح کا سینگ تھا اور وہ اس دو سینگ والے مینڈھے پر بڑے زور سے دوڑ پڑا اور اس کو مارا اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور اس کو زمین پر دے مارا اور لتھاڑ دیا اور کوئی اس کو نہ چھڑا سکا پھر وہ بکرا نہایت بڑا ہوا اور جب پر زور ہوا تو اس کا سینگ ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ اور چار سینگ نکلے۔ جب میں دانی ایل یہ خواب دیکھ چکا تو اس کی تعبیر کی فکر میں تھا پھر میں نے اپنے سامنے کوئی شخص کھڑا دیکھا اور آواز آئی کہ اے جبرئیل اس کو رویا کے معنی سمجھا دے۔ اس نے میرے پاس آ کے کہا اے آدم زاد! سمجھ کیوں کہ یہ رویت آخری زمانہ میں انجام ہوگی۔ وہ مینڈھا کہ جس کے دو سینگ تھے وہ مادی اور فارس کے بادشاہ ہیں اور وہ بکرا یونان کا بادشاہ اور اس کے چار سینگ سو یہ چار سلاطین ہیں جو اس قوم کے درمیان برپا ہوں گے، انتہیٰ ملخصاً۔

اس بناء پر ذوالقرنین فارس کے بادشاہوں میں سے کوئی بادشاہ ہے قباد وغیرہ جو

دوسینگ والے سے یہود میں مشہور تھا جس کا ترجمہ عربی میں ذوالقرنین ہوا اور وہ بکرا ایک سینگ والا سکندر فیلیقوس یونانی بادشاہ ہے جس نے اس دوسینگ والے مینڈھے یعنی ایران کے اس بادشاہ کو جو اس کے عہد میں تھا (''دارا'' جو انہیں بادشاہوں کے ذیل میں باعتبار حشمت ووسعت وغلبہ کے دوسینگ والا مینڈھا تھا) لتاڑا اور اس کی سلطنت چھین لی اور پھر سکندر کے بعد اس کے چار سرداروں میں اس کا ملک تقسیم ہوا اور یہ چاروں ایک ایک حصہ ملک کے بادشاہ ہوگئے۔ دانیال علیہ السلام کے کئی سو برس بعد یہ واقعہ ہوا۔ حضرت دانیال علیہ السلام کا یہ خواب کتاب دانیال میں یہود کے ہاں ایک معمہ سا چلا آتا تھا۔ جس کے معنی یا تعبیر وہی جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے قریش کو بطور امتحان کے آنحضرت ﷺ سے ذوالقرنین کے حال سے سوال کرنے کو کہا کہ وہ ذوالقرنین کو کوئی بادشاہ بتلاتے ہیں یا کوئی جانور دوسینگ والا؟ کیونکہ بظاہر لفظوں میں پورا ابہام ہے مگر آنحضرت ﷺ نے بموجب وحی متلو اس کا ان آیات میں پورا حال بیان کر دیا اور اس کی دیوار بنانے اور قوم خزر کے روکنے کا تذکرہ بھی کیا جو یاجوج ماجوج کی قوم میں سے تھے۔ اور شاہ فارس کے ملک میں آکر فتور برپا کیا کرتے تھے۔ اس خواب دانیالؑ کے مطابق بھی سکندر رومی ذوالقرنین نہیں ہوسکتا۔ عوام میں جو سکندر ذوالقرنین مشہور ہوگیا ہے اس غلطی کا باعث بعض مورخوں کی لاعلمی اور پھر سکندر نامہ میں مولانا نظامی رحمۃ اللہ علیہ کی غلطی ہے۔

بعض لوگوں نے ایرانی بادشاہوں میں سے ذوالقرنین فریدون کو قرار دیا ہے جیسا کہ تفسیر ابوالسعود و تاریخ ابوالفداء میں مذکور ہے مگر جمہور محققین کا اسی پر اتفاق ہے کہ ذوالقرنین تبع حمیری ہے اور وہ دیوار جو اس نے بنائی وہی ہے جو جبل الطائی میں واقع ہے نہ دربند، اور یاجوج ماجوج وہی تاتاری اور چینی تاتار کے لوگ ہیں کہ جن کے بزرگوں کے روکنے کے لئے ذوالقرنین نے دیوار بنائی تھی اور یہی قومیں اخیر زمانے میں ملکوں پر شورش کریں گی یا کر چکیں۔ واللہ اعلم

یہ ہے ذوالقرنین کے قصہ کی تحقیق کہ جس میں توہمات باطلہ اور داستان گوئی کو کچھ بھی دخل نہیں اور جس پر حال کے جغرافیہ اور تاریخوں کے بموجب کوئی خدشہ نہیں پڑتا نہ کوئی شبہ باقی رہتا ہے اور جو محققین کے اقوال سے لی گئی۔ محض اپنی رائے سے تاریخی واقعات میں زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملائے گئے ہیں جیسا کہ ہمارے بعض معاصرین کی عادت ہے۔ بااین ہمہ اگر ہماری اس تحقیق میں کوئی غلطی ہو تو مجھے اس پر کچھ بھی اصرار نہیں۔ (تفسیر حقانی جلد ۳/صفحہ ۲۳۲-۲۳۵)

قرآن میں گمراہی کی نسبت اللہ کی طرف

اعتراض: (عیسائیوں کی طرف سے اعتراض)

قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ ہدایت اور گمراہی اللہ کی جانب سے ہے۔ جو اس امر پر دلیل ہے کہ قرآن جو ایسے قبیح مضمون پر مشتمل ہے وہ اللہ کا کلام نہیں ہو سکتا۔

جواب: یہ مضمون خود عیسائیوں کی مقدس کتابوں میں بہت سے مقامات پر موجود ہے۔ لہٰذا ان کو یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی مقدس کتابیں بھی یقینی طور پر منجانب اللہ نہیں ہیں۔ یہ اعتراض چونکہ عیسائیوں کے ہاں بہت اہمیت کا حامل ہے اس لئے ہم کچھ تفصیل سے بائبل کی آیات ناظرین کے فیصلے کے لئے نقل کرتے ہیں۔

مسئلہ تقدیر پر بائبل اور علماء نصرانیت کے اقوال

کتاب خروج باب ۴ آیت ۲۱ میں ہے۔

اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ جب تو مصر میں پہنچے تو دیکھ وہ سب کرامات جو میں نے تیرے ہاتھ میں رکھی ہیں فرعون کے آگے دکھانا۔ لیکن میں اس کے دل کو سخت کر دوں گا اور وہ ان لوگوں کو جانے نہیں دے گا۔

اسی قسم کا مضمون خروج ہی کے باب ۷ آیت ۳ باب ۱۰ آیت ۱، آیت ۲۰، آیت ۲۷، باب ۱۱ آیت ۱۰ میں ہے۔

اور کتاب استثناء باب ۲۹ آیت ۴ میں ہے۔

لیکن خداوند نے تم کو آج تک نہ تو ایسا دل دیا جو سمجھے اور نہ دیکھنے کی آنکھیں اور سننے کے کان دیئے۔

اور مزید حوالوں کے لئے دیکھیں: کتاب یسعیاہ کے باب ۶ آیت ۱۰۔

اور انجیل یوحنا باب ۱۲ میں ہے۔

اس سبب سے وہ ایمان نہ لا سکے کہ یسعیاہ نے پھر کہا اس نے ان کی آنکھوں کو اندھا اور دل کو سخت کر دیا ایسا نہ ہو کہ وہ آنکھوں سے دیکھیں اور دل سے سمجھیں اور رجوع کریں۔

تورات، انجیل اور یسعیاہ کی کتاب سے معلوم ہوا کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو اندھا کر دیا تھا۔ ان کے دلوں کو سخت اور کانوں کو بہرا بنا دیا تھا۔ تا کہ نہ وہ توبہ کر سکیں۔ نہ خدا ان کو شفا دے۔ اسی وجہ سے نہ وہ حق کو دیکھتے ہیں نہ اس میں غور کرتے ہیں نہ اس کو سنتے ہیں۔

آیت قرآنی: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ...... الخ کے معنی بھی تو صرف اسی قدر ہیں۔

کتاب یسعیاہ ترجمہ عربی مطبوعہ ۱۶۷۱ء و ۱۸۳۱ء و ۱۸۴۴ء کے باب ۶۳ آیت ۱۷ میں یوں کہا گیا ہے:

اے خداوند تو نے ہم کو اپنی راہوں سے کیوں گمراہ کیا؟ اور ہمارے دلوں کو سخت کیا کہ تجھ سے نہ ڈریں؟ اپنے بندوں کی خاطر اپنی میراث کے قبائل کی خاطر باز آ۔

کتاب حزقی ایل ترجمہ مذکورہ کے باب ۱۴ آیت ۹ میں ہے۔

اور اگر نبی فریب کھا کر کچھ کہے تو میں خداوند نے اس نبی کو فریب دیا۔ اور میں اپنا ہاتھ اس پر چلاؤں گا۔ اور اسے اپنے اسرائیلی لوگوں

میں سے نابود کردوں گا۔

یسعیاہ کے کلام میں تصریح ہے کہ اے رب! تو نے ہمیں گمراہ کیا۔ اور حزقی ایل کے کلام میں پیغمبر کو فریب دینے کا تذکرہ ہے:

اور کتاب سلاطین اول باب ۲۲ آیت ۱۹ میں ہے:

تب اس نے کہا کہ اچھا تو خداوند کی سخن کو سن لے۔ میں نے دیکھا کہ خداوند اپنے تخت پر بیٹھا ہے اور سارا آسمانی لشکر اس کے داہنے اور بائیں کھڑا ہے اور خداوند نے کہا کون اخی اب کو بہکائے گا۔ تاکہ وہ چڑھائی کرے۔ اور رامات جلعاد میں کھیت آئے؟ تب کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ لیکن ایک روح نکل کر خداوند کے سامنے کھڑی ہوئی اور کہا میں اسے بہکاؤں گی خداوند نے اس سے پوچھا کس طرح؟ اس نے کہا میں جا کر اس کے سب نبیوں کے منہ میں جھوٹ بولنے والی روح بن جاؤں گی۔ اس نے کہا تو اسے بہکائے گی اور غالب بھی ہوگی۔ روانہ ہو جا اور ایسا ہی کر۔ سو دیکھ خداوند نے تیرے ان سب نبیوں کے منہ میں جھوٹ بولنے والی روح ڈالی ہے اور خداوند نے تیرے حق میں بدی کا حکم دیا ہے۔ (آیات ۱۹ تا ۲۳)

یہ روایت صراحتہً یہ بتلا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے تخت پر بیٹھتا ہے۔ اور لوگوں کو گمراہ کرنے اور فریب دینے کے لئے اسی طرح مجلس مشاورت منعقد ہوتی ہے جس طرح لندن میں کسی سرکاری بات پر غور کرنے کے لئے پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا کرتا ہے۔ اس مجلس مشاورت میں تمام آسمانی لشکر شرکت کرتے ہیں۔ اور مشورے کے بعد اللہ تعالیٰ گمراہی کی روح کو بھیجتا ہے۔ پھر یہ روح لوگوں کو گمراہ کرتی ہے۔ اب آپ ہی غور فرمائیے کہ جب خود اللہ تعالیٰ اور آسمانی لشکر ہی انسان کو گمراہ کرنے کا ارادہ کرلیں تو یہ بے چارہ ناتواں انسان کیسے نجات پا سکتا ہے؟

اور یہاں ایک اور عجیب بات قابل غور ہے وہ یہ کہ جب اللہ تعالی نے خود مشورے کے بعد گمراہی کی روح کو اخی اب کے گمراہ کرنے کے لئے بھیج دیا تو حضرت میکاہ علیہ السلام نے اس مجلس کے سربستہ راز کو کیسے افشاء کر دیا؟ اور اخی اب کو اس کی اطلاع کیونکر دی؟

تھسلنکیوں کے نام دوسرے خط باب ۲ آیت ۱۱ میں ہے:

> اسی سبب سے (یعنی ان کے حق کو قبول نہ کرنے کے سبب سے) خدا ان کے پاس گمراہ کرنے والی تاثیر بھیجے گا تاکہ وہ جھوٹ کو سچ جانیں۔ اور جتنے لوگ حق کا یقین نہیں کرتے بلکہ ناراستی کو پسند کرتے ہیں وہ سب سزا پائیں۔

اس عبارت میں نصاریٰ کا مقدس پولس ببانگِ دہل کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالی ہلاک ہونے والوں کے پاس گمراہ کرنے والی تاثیر بھیجتا ہے جس سے وہ جھوٹ کی تصدیق کرتے ہیں اور سزا پاتے ہیں۔

اور جب مسیح علیہ السلام ان شہروں کو قیامت کے عذاب سے ڈرا کر فارغ ہوئے جنہوں نے توبہ نہیں کی تھی تو فرمایا:

> اے باپ! آسمان اور زمین کے خداوند! میں تیری حمد کرتا ہوں کہ تو نے یہ باتیں داناؤں اور عقلمندوں سے چھپائیں۔ اور بچوں پر ظاہر کیں ہاں اے باپ! کیونکہ ایسا ہی تجھے پسند آیا۔ (متیٰ باب ۱۱)

نوحہ یرمیاہ کے باب ۳ آیت ۳۸ میں ہے:

> کیا بھلائی اور برائی حق تعالی ہی کے حکم سے نہیں ہے؟

فارسی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۳۸ء میں بھی ہے

> آیا خیر و شر از دہان خدا صادر نمی شود؟

اس استفہام انکاری کا مطلب یہی تو ہے کہ خیر و شر دونوں اللہ سے صادر ہوتے ہیں۔

رومیوں کے نام خط باب ۹ میں ہے:

پس تو مجھ سے کہے گا پھر وہ کیوں عیب لگاتا ہے؟ کون اس کے ارادے کا مقابلہ کرتا ہے؟ کیا بنی ہوئی چیز بنانے والے سے کہہ سکتی ہے کہ تو نے مجھے کیوں ایسا بنایا؟ کیا کمہار کو مٹی پر اختیار نہیں کہ ایک ہی لوندے میں سے ایک برتن عزت کے لئے بنائے اور دوسرا بے عزتی کے لئے؟ (آیات ۱۱ تا ۲۱)

حواشی

(۱) یہاں تک مصنفؒ نے اکیس ۲۱ حوالوں سے یہ ثابت کردیا ہے کہ بائبل کے نزدیک خدا شر کا بھی خالق ہے۔ اور وہ لوگوں کو گمراہ بھی کرتا ہے۔ بائبل اس قسم کی عبارتوں سے لبریز ہے۔ جو اس دعوے کا ثبوت مہیا کرتی ہیں۔ مزید دیکھئے یرمیاہ ۶:۳۰، رومیوں ۱:۲۸، ۲، تھسلنیکیوں ۳:۸، طِطُس ۱:۱۶ اور ۲، کرنتھیون ۱۳:۵۔

(۲) ''عقیدہ'' جبر کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کے آگے مجبور محض ہے۔ وہ اپنے اختیار سے کوئی کام نہیں کرسکتا۔ نیکی ہو یا بدی۔ تمام کام اس سے خدا کراتا ہے۔ اسے خود نیکی یا بدی میں سے کسی ایک کو پسند کر کے اس پر عمل کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ ۱۲ تقی

پولس کی مذکورہ بالا عبارت تقدیر کے مسئلے کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہدایت اور گمراہی دونوں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں۔ اور اس معاملے میں حضرت اشعیاہ علیہ السلام کا وہ ارشاد بہت خوب ہے جو کتاب یسعیاہ باب ۴۵ آیت ۹ میں مذکور ہے:

> افسوس اس پر جو اپنے خالق سے جھگڑتا ہے! ٹھیکرا تو زمین کے ٹھیکروں میں سے ہے۔ کیا مٹی کمہار سے کہے کہ تو کیا بناتا ہے؟ کیا تیری دستکاری کہے اس کے تو ہاتھ نہیں۔

انسان کی پیدائش کس چیز سے ہوئی

اعتراض: آدمی کی پیدائش متعدد آیات میں بیان ہوئی ہے آل عمران میں من تراب اور حجر میں من حما مسنون اور صافات میں طین لازب آیا ہے اور ایک جگہ ماء مھین آیا ہے اور اس جگہ صلصال کالفخار آیا ہے۔ ان میں بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے مگر دراصل کچھ اختلاف نہیں۔

جواب: کیوں کہ روایات سے اہل اسلام کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کا قالب خشک مٹی سے بنایا گیا کھنکھناتی اور ٹھیکرے کی مثال تھی پھر اس کو مھین کر کے پانی سے گوندھا وہ طین لازب گارا ہوگئی، پھر جب خمیر اٹھ گیا تو حما مسنون ہوگئی اور اس کے بعد اس کی اولاد کا سلسلہ ماء مھین (منی) سے جاری ہوا۔

(تفسیر حقانی ۴/۲۱۰)

کیا حضورؐ پر وحی میں شیطان کچھ ملا دیتا تھا

اعتراض:۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَانَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ. فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ. کہ ہر نبی کی آرزو میں شیطان کچھ ملا دیتا ہے پھر خدا تعالیٰ آمیزش شیطان کو دور کر کے اپنی آیات کو ثابت رکھتا ہے۔

اور اسی آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے کہ جس سے شیطان کی آمیزش وحی اور کلام انبیاءؑ میں اچھی طرح ثابت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ ایک بار سورۂ نجم کی یہ آیات مجمع عام میں کہ جہاں بت پرست بھی موجود تھے پڑھ رہے تھے وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى O تو آپ کی زبان سے بے

ساختہ شیطان نے بت پرستوں کے خوش کرنے کو یہ کلمہ نکلوادیا تِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَتُرْتَجٰی یعنی یہ بڑے بڑے قد آور بت ہیں ان کی شفاعت مقبول ہے اور بقول بعض مفسرین یہ کلمہ شیطان نے آواز میں آواز ملا کر پڑھ دیا۔ بہر طور وحی میں شیطان کی آمیزش ضرور معلوم ہوئی اور اس قصہ کو بیضاوی اور صاحب معالم وغیرہما نے نقل کیا ہے اور یہاں سے ایک اور بات بھی پیدا ہوئی کہ ممکن ہے کہ جبرائیلؑ کی شکل میں شیطان آ کر کچھ آیات بنا کر سنا جاتا ہو۔

جواب: اس کا یہ ہے کہ یہ قصہ بالکل جھوٹ ہے اور ملحدوں کی بناوٹ ہے گو بعض سادہ لوح مفسروں نے بے تحقیق اس کو لکھ کر اپنی کتاب کا اعتبار کھویا ہے مگر محققین نے جیسا کہ بیضاوی اور صاحب مدارک اور امام رازیؒ بلکہ جمہور نے دلائل عقلیہ ونقلیہ سے اس کو رد کیا ہے۔

دلائل نقلیہ میں سے یہ آیات ہیں لَایَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ الآیہ کہ قرآن مجید میں کسی طرف سے غلطی نہیں مل سکتی نہ باطل کا اس میں گزر ہو سکتا ہے۔

منجملہ ان کے یہ آیت ہے وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ کہ قرآن کو حق کے ساتھ ہم نے نازل کیا اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا۔

منجملہ ان کے یہ آیت ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ یعنی قرآن کو ہم ہی نے نازل کیا اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

پھر ان آیات کے مقابلہ میں اس بے اصل قصہ کا کہ جس کو کسی محقق محدث نے کسی سند سے بھی روایت نہیں کیا کیا اعتبار ہے؟

اور اس آیت وَمَا مِنْ نَّبِیٍّ الآیہ میں اس بات کا کچھ بھی ذکر نہیں پھر اس سے استدلال کرنا فضول ہے۔ آیت مذکورہ سے صرف اس قدر ثابت ہے کہ ہر نبی گو کیسا ہی اولوالعزم نبی کیوں نہ ہو مقتضائے بشریت سے خالی نہیں اس کے بعض خیالات

میں قوت بہیمیہ کی وجہ سے خطرات نفسانیہ کی ذرا بو آجاتی ہے لیکن خدا تعالیٰ اس نبی کو نور نبوت پر ثابت اور قائم رکھتا ہے اور ان خطرات شیطانی کو دفع کر دیتا ہے اور اسی لحاظ سے انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا ضروری مانا گیا ہے لیکن بعض مفسرین کو لفظ تمنی کے معنے قرء لے کر اور آیات سے آیات قرآنیہ سمجھ کر اور نسخ سے معنی مصطلح خیال کر کے یہ مغالطہ ہو گیا ہے اس لئے اس کا شان نزول وہی جھوٹا قصہ قرار دینا پڑا اور بہت واقعی باتیں جو اس کا محمل ہو سکتی ہیں خیال سے دور کر دیں۔

منجملہ ان کے یہ بات بھی ہے کہ مشرکین مکہ نے (جو اپنی دنیا داری کی وجہ سے نہایت متکبر تھے ان کو غریب اور مفلس مسلمانوں کے ساتھ مل کر آنحضرت ﷺ کی مجلس وعظ میں بیٹھنا شاق گزرتا تھا) آپ ﷺ سے عرض کیا کہ اگر ہمارے لئے کوئی خاص وقت معین فرما دیں تو ہم حاضر ہو سکتے ہیں۔ آپ ﷺ کو چونکہ ہدایت خلق اللہ مقصود تھی اس لئے یہ خیال آیا کہ اگر ان کے لئے جدا وقت مقرر ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے لیکن یہ بات خدا تعالیٰ کو ناپسند معلوم ہوئی کس لئے کہ خدا تعالیٰ کے روبرو اس کے مخلصین کو دنیا مردار کے لئے ذلیل سمجھ کر متکبرانہ حاضر ہونا ان کے لئے مفید نہ ہو گا اور عام مسلمانوں کے دلوں میں دنیا کی وقعت ہو جاوے گی۔ سو یہ شیطانی القاء اور یہ آپ ﷺ کی تمنا اور یہ خدا تعالیٰ کا اس کو منسوخ فرمانا تھا نہ کہ وہ بات۔ اور اگر بطور الزام کلام کیا جاوے تو اس آیت سے اگر کچھ بات آمیزش شیطانی کی ثابت ہو سکے گی تو پہلے انبیاءؑ میں ثابت ہو گی نہ کہ آپ میں کیونکہ اس میں یہ صریح ہے کہ تجھ سے جس قدر پہلے انبیاءؑ ہیں ان کا یہ حال ہے کہ نہ کہ آپ ختم المرسلینؐ کا۔ یہ بات مشہور ہے کہ المعترض کالاعمیٰ وہ حق ناحق کچھ نہیں دیکھتا اس کو اعتراض کرنے کے واسطے ذرا سہارا ملنا چاہئے۔

رہا اس بات کا جواب کہ شیطان جبرئیل کی صورت میں ممکن ہے کہ آیا ہو یہ ہے کہ اس وسوسہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ نبوت کے اصلی مرتبے کو تسلیم نہ کیا جاوے او

جب کوئی نبوت کی ضرورت اور اس کی حقیقت پر مطلع ہو جاوے تب اس وسوسہ کا اس کے دل میں کبھی گزر بھی نہ ہو اس لئے کہ جب اس عالم حسی کے انتظامات ایسے ہیں کہ یہاں یہ بات ناممکن ہے (کبھی کوئی عیار کسی گورنر کی صورت میں آ کے امور سلطنت میں خلل انداز نہیں ہو سکتا) تو اس عالم ملکوت میں یہ بدانتظامی کیونکر ہو سکتی ہے؟ جب ہماری حس بصر کہ جو صدہا جگہ غلطی کرتی ہے کھرے کھوٹے کو پرکھتی ہے پیتل اور سونے بلور او ہیرے میں فرق صحیح کرتی ہے تو پھر نبی کی چشم حقیقت بین کے آگے (وہ جس پر عالم ملکوت کے اسرار اور شیاء کے حقائق منکشف ہیں) حقیقت جبرئیلیہ (جو آفتاب جہاں تاب ہے) اور حقیقت شیطانیہ جو ظلمت آمیز ہے کس طرح مشتبہ ہو سکتی ہے؟ اور اسی حکمت کے لئے جبرئیلؑ قومی امین کو اس امانت کے لئے واسطہ بنایا گیا۔

(مقدمہ تفسیر حقانی ۸۴/۱)

قرآن کریم بے ترتیب اور غیر مرتبط کلام نہیں ہے

اعتراض: (عیسائیوں اور ہندوؤں کا اعتراض)

قرآن میں ایک مضمون بیان ہو رہا ہوتا ہے اس کے درمیان میں کسی نہ کسی بے ربط بات کو ذکر دیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرآن بے ترتیب اور بے ربط کتاب ہے۔

جواب: قرآن میں ہر پہلو کی ایسی رعایت ہے کہ کسی کلام میں ویسی رعایت نہیں ہے۔قرآن میں صرف ضابطہ کو پورا نہیں کیا گیا۔اس مضمون کو آپ سہولت سے یوں سمجھیں گے کہ

حکام دو قسم کے ہیں:

(۱) ایک وہ جو بعض ضابطہ کے پابند ہیں، ضابطہ کی رو سے جو کام ان پر واجب ہے وہ کر دیا اور قانون کے موافق رعایا پر احکام لازم کر دیئے۔ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ دشوار احکام کو قانون سے خارج کریں یا ان کے سہل یا آسان کرنے کی تدبیر بتائیں۔

(۲) دوسرے وہ حکام ہیں جن کو رعایا سے محبت ہوتی ہے اور مخلوق کو راحت پہنچانا چاہتے ہیں اور حتی الامکان قانون میں کوئی دشوار حکم داخل نہیں کرتے۔ اور اگر کسی مصلحت سے کوئی دشوار حکم رکھتے بھی ہیں تو رعایا کو اس کے سہل کرنے کی تدبیر بھی بتلاتے ہیں۔ اور اس تجویز میں ان پر تعب ضرور ہوتا ہے۔ مگر یہ شفقت پر مبنی ہے۔ اتنی رعایتیں وہی حاکم کرسکتا ہے جس کو رعایا پر شفقت ہو۔

اسی طرح ایک اور مثال سمجھئے کہ

نصیحت کرنے والا ایک تو استاد ہوتا ہے اور ایک باپ ہوتا ہے، باپ کی نصیحت میں عام لوگوں کی نصیحت سے فرق ہوتا ہے۔ استاد تو ضابطہ پورا کردیتا ہے۔ مگر باپ ضابطہ پورا نہیں کرسکتا وہ نصیحت کرتے ہوئے اس کا خیال رکھتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان اور ایسے طرز سے نصیحت کروں جو اس کے دل میں گھر کرلے کیونکہ وہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ بیٹے کی اور اس میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اور اگر وہ کئی مشکل کام بھی بتلاتا ہے تو اس طریقہ کو اختیار کرتا ہے جس سے بیٹے کو عمل آسان ہوجائے۔ اور ان سب رعایتوں کا منشاء وہی شفقت ہے۔ شفقت ہی کے ساتھ تمام پہلوؤں کی رعایت کی جا سکتی ہے اور اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کے وقت کبھی بے ربط اور بے ترتیب بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً باپ بیٹے کو کھانا کھاتے ہوئے نصیحت کرے۔ کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس مضمون پر وہ مفصل گفتگو کررہا ہو۔ اسی دوران اس نے دیکھا کہ بیٹے نے ایک بڑا سا لقمہ کھانے کو لیا ہے۔ تو وہ فوراً پہلی نصیحت کو قطع کرکے کہے گا۔ کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے۔ اس کے بعد پھر پہلی بات پر گفتگو شروع کردے گا۔ اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے۔ بری صحبت سے منع کرنے میں لقمہ کا کیا ذکر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بے ترتیب کلام مرتب و مرتبط کلام سے افضل ہے۔ شفقت کا مقتضا یہی ہے کہ ایک بات کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا لحاظ نہ کرے۔

دوسری بات کو بیچ میں رکھ کر پہلی بات کو پورا کرے یہی راز ہے اس کا کہ خدا تعالیٰ کا کلام ظاہر میں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس ظاہری بے ربطی کا منشا شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے۔ کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باب کا کوئی مضمون اس میں نہ آسکے۔ بلکہ وہ ایک نیا مضمون کو بیان فرماتے ہوئے اگر کسی دوسرے امر پر تنبیہ کی ضرورت دیکھتے ہیں تو شفقت کی وجہ سے درمیان میں فوراً اس پر بھی تنبیہ فرما دیتے ہیں۔ اس کے بعد پھر پہلا مضمون شروع ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ایک آیت جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا زیادہ اعتراض کیا ہے سورۃ قیامہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان اس وقت بڑا پریشان ہوگا اور بھاگنے کا موقع ڈھونڈے گا۔ اپنے اعمال پر اسے اطلاع ہوگی۔ اس روز اس کو سب اگلے پچھلے کئے ہوئے کام جتلا دیئے جائیں گے۔ پھر فرماتے ہیں **بل الإنسان علی نفسه بصیرة ولو القی معاذیره.** (یعنی انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا۔ بلکہ اس دن) انسان اپنے نفس (کے احوال و اعمال) سے خوب واقف ہے (کیونکہ اس وقت حقائق کا انکشاف ضروری ہو جائے گا) اگر چہ وہ (باقتضائے طبیعت) کتنے ہی بہانے بنائے جیسے کفار کہیں گے۔ واللہ ہم تو مشرک نہ تھے۔ مگر دل میں خود بھی جائیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں۔ غرض انسان اس روز اپنے سب احوال کو خوب جانتا ہوگا۔ اس لئے یہ جتلانا محض قطع جواب اور اتمام حجت اور دھمکی کے لئے ہوگا نہ کہ یاد دہانی کے لئے یہاں تک تو قیامت ہی کے لئے متعلق مضمون ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

لا تحرک به لسانک لتعجل به ان علینا جمعه و قرآنه

فاذا قراناه فاتبع قرآنه ثم ان علینا بیانه.

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن نازل ہوتے

ہوئے اس کے یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے۔ ہمارے ذمہ ہے آپ کے دل میں قرآن کا جما دینا۔ اور زبان سے پڑھوا دینا۔ تو جب ہم قرآن نازل کریں۔ اس وقت فرشتے کی قراءت کا اتباع کیجئے۔ پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ قرآن کا مطلب بیان کردیں گے۔ اس کے بعد پھر قیامت کا مضمون ہے۔

کلا بل تحبون العاجلة و تذرون الأخرة. کہ تم لوگ دنیا کے طالب ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو۔ پھر فرماتے ہیں کہ وجوه يومئذ ناضرة الى ربها ناظرة. بعضوں کے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے...... الخ۔

تولا تحرک به لسانک سے اوپر بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد کو بھی اس کا ذکر ہے اور درمیان میں یہ مضمون ہے کہ

قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کیلئے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے۔

لوگ اس مقام کے ربط میں تھک تھک گئے ہیں اور بہت سی توجیہات بیان کی ہیں۔ مگر سب میں تکلف ہے۔ اور کسی نے خوب کہا ہے کہ کلام کی محتاج یعنی باشد لا یعنی است۔

تو جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضور کے ساتھ ہے۔ اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں کیا موقع ہے۔

اس کا وہی موقع ہے جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے۔ اور اس کے مفاسد بیان کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا سا لقمہ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا یہ کیا حرکت ہے۔ لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے تو ظاہر میں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط ہے۔ لیکن جو باپ ہوا ہوگا وہ جانے گا کہ نصیحت کرتے کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا۔ باپ نے فرط شفقت سے درمیان کلام میں اس پر بھی تنبیہ کردی۔ اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہے تھے۔ اور حضور ﷺ اس خیال سے کہ کہیں یہ آیتیں

ذہن سے نہ نکل جائیں جلدی جلدی ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے۔تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے اس کا بھی ذکر فرما دیا۔کہ آپ یاد کرنے کی فکر نہ کریں یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔آپ بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں۔قرآن آپ کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جائے گا۔تو اس مضمون کو درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرط شفقت ہے اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہوتا۔تو یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل تھی۔مگر پھر بھی باوجود اس کے یہاں ایک مستقل ربط بھی ہے اور یہ خدا کے کلام کا اعجاز ہے۔کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے۔(سبیل النجاح)

قرآن کے مضامین میں تکرار کیوں ہے؟

اعتراض: (عیسائیوں اور ہندوؤں کا اعتراض)

قرآن کے بہت سے مضامین میں اور بہت سی آیات میں تکرار کیوں ہے؟

جواب:

(۱) قرآن کریم میں مسئلہ توحید، احوال قیامت اور انبیاء علیہم السلام کے واقعات کا بیان متعدد مقامات پر بار بار اس لئے آیا ہے۔اہل عرب عام طور پر مشرک اور بت پرست تھے۔ان تمام چیزوں کے منکر تھے۔اہل عجم میں سے بعض اقوام جیسے ہندوستانی اور چین کے لوگ اور آتش پرست اہل عرب ہی کی طرح بت پرست اور مشرک تھے۔اور ان باتوں کے انکار میں اہل عرب ہی کی طرح تھے۔اور بعض قومیں جیسے عیسائی ان اشیاء کے اعتقاد میں افراط و تفریط میں مبتلا تھے۔اس لئے ان مضامین کی تحقیق و تاکید کے لئے مسائل توحید و معاد وغیرہ کو بار بار بکثرت بیان کیا گیا۔ پیغمبروں کے واقعات بار بار بیان کئے جانے کے اور بھی اسباب ہیں۔مثلاً چونکہ قرآن کریم کا اعجاز بلاغت کے لحاظ سے بھی تھا۔اور اس پہلو سے بھی معارضہ مطلوب

تھا۔ اس لئے قصص کو مختلف پیرایوں اور عبارتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اختصار اور تطویل کے اعتبار سے ہر عبارت دوسری سے مختلف ہونے کے باوجود بلاغت کے اعلیٰ معیار پر پہنچی ہوئی ہے۔ تا کہ معلوم ہو جائے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنا بلغاء کے نزدیک انسانی طاقت اور قدرت سے خارج ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ ان کو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ جو فصیح الفاظ اس قصے کے مناسب تھے۔ ان کو آپ ﷺ استعمال کر چکے ہیں اور اب دوسرے الفاظ اس حصہ کے لائق باقی نہیں رہے۔ یا یہ کہ ہر بلیغ کا طریقہ دوسرے بلیغ طریقے کے مخالف ہوتا ہے۔ بعض اگر طویل عبارت پر قادر ہوتے ہیں تو دوسرے صرف مختصر عبارت پر قدرت رکھتے ہیں۔ اس لئے کسی ایک نوع پر قادر نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دوسری نوع پر بھی قادر نہیں ہے۔

یا یہ کہہ سکتے تھے کہ واقعات اور قصص کے بیان کرنے میں بلاغت کا دائرہ تنگ ہے۔ اور آپ ﷺ کو اگر ایک آدھ مرتبہ قصص کے بیان کرنے پر قدرت ہوگئی تو یہ محض بخت و اتفاق ہے۔ لیکن جب قصص کا بیان اختصار و تطویل کی رعایت کے ساتھ بار بار ہوا تو گزشتہ تینوں شبہات اس سلسلے میں باطل ہو گئے۔

(۳) تیسرے یہ کہ حضور ﷺ قوم کی ایذا رسانی کی وجہ سے تنگ دل ہوتے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آیت: وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ. میں اس کی شہادت دی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ مختلف اوقات میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں سے کوئی واقعہ بیان فرماتے جاتے ہیں جو حضور ﷺ کے اس وقت کے حسب حال ہوتا ہے۔ تا کہ حضور ﷺ کو دلجمعی اور تسلی حاصل ہو۔ چنانچہ اسی غرض کی جانب آیت ذیل میں اشارہ فرمایا گیا ہے:

وَ کُلًّا نَّقُصُّ عَلَیْکَ مِنْ اَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَکَ

وَجَاءَكَ فِي هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ.

ترجمہ:- پیغمبروں کی خبروں میں سے ہم آپ ﷺ کو وہ واقعہ سناتے ہیں جو آپ ﷺ کے دل کی تسلی کا باعث ہو۔ اور ان قصوں کے ضمن میں آپ ﷺ کے پاس حق باتیں اور مسلمانوں کے لئے نصیحت و پند کی باتیں پہنچی ہیں۔"

(۴) چوتھے یہ کہ مسلمانوں کو کفار کے ہاتھوں ایذاء اور تکلیف پہنچتی ہی رہتی تھی۔ اس لئے باری تعالیٰ ایسے ہر موقع پر کوئی نہ کوئی وقت کے مناسب حال ذکر کر دیتے ہیں۔ کیونکہ پہلوں کے واقعات پچھلوں کے لئے موجب عبرت ہوتے ہیں۔

حاشیہ

(۱) اور ہم جانتے ہیں کہ ان (کفار) کی باتوں سے آپ ﷺ کا دل تنگ ہوتا ہے۔

(۵) پانچویں یہ کہ کبھی ایک ہی واقعہ متعدد حقائق پر مشتمل ہوتا ہے۔ ضمناً ایک ایک مقام پر اس کے ذکر کرنے سے اگر ایک حقیقت مقصوداً بیان ہے اور دوسری ضمناً تو دوسری جگہ اس کے بیان سے دوسرے حقائق ملحوظ ہوتے ہیں۔ اور پہلی حقیقت ضمنی بن جاتی ہے۔ (ترجمہ اظہار الحق صفحہ ۳۶۲ تا ۳۶۴ جلد ۲)

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے تمام احکام کو صاف صاف بیان فرما دیا۔ اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ مکرر سہ کرر بیان فرمایا۔ کہ کوئی اشتباہ ہی نہیں رہا۔ ہم نے کیا کیا کہ اس کی قدر تو کی نہیں برعکس اس کے اس میں شبہات نکالنے لگے کہ حق تعالیٰ نے اس مضمون کو مکرر کیوں بیان فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس تکرار کی حکمت یہی ارشاد فرمائی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں: ولقد صرفنا فی ھٰذا القرآن لیذکروا. یعنی ہم نے لوگوں کے لئے طرح طرح سے اس لئے بیان کیا ہے تا کہ نصیحت قبول کریں۔ اس کی قدر اس کو

ہوئی جو باپ کی شفقت کو پیش نظر رکھے۔ دیکھو باپ بیٹے کو کس کس طرح سے سمجھاتا ہے۔ صرف ایک مرتبہ سمجھانے پر اکتفاء نہیں کرتا۔ اور نہ ایک مرتبہ سمجھانے کے بعد مواخذہ کرتا ہے۔ بلکہ ایک مرتبہ سمجھاتا ہے۔ دوسری، تیسری، چوتھی مرتبہ بار بار سمجھاتا ہے۔ جب تک کہ بیٹے کی اصلاح نہ ہو اس کو چین نہیں آتا۔ جب بالکل لاچار ہو جاتا ہے بمجبوری زجر و توبیخ سے کام لیتا ہے۔ پھر اس میں بھی ایلام اور ایذا مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی درستی اور تہذیب مد نظر ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کو تو باپ سے بدرجہا زیادہ شفقت ہے اور اس کو باپ سے زیادہ اس کے مصالح کی رعایت ہے۔ اسی وجہ سے ایک ہی مضمون کو مختلف عنوانوں۔ نوع بنوع کے طرز سے بیان فرمایا ہے۔ اور پھر باپ کے احسان اور حق تعالیٰ کے احسانات میں فرق عظیم یہ ہے کہ باپ تو بیٹے کے حال پر جو عنایت ہے۔ اس کا منشاء تو غرض ہے کہ باپ کو یہ امید ہوتی ہے کہ بیٹا میرے کام آئے گا۔ یا یہ کہ اس سے میرا نام چلے گا۔ اور کچھ نہیں یہ تو ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ اولاد کے ساتھ ایسا ناطہ پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے مادہ اس کی تربیت و اصلاح کی طرف مضطر ہوتا ہے۔ اور اسی سے اس کو راحت ہوتی ہے۔ بہر حال کوئی نہ کوئی غرض ضرور ہوتی ہے۔ اور حق تعالیٰ کو انسان کی کوئی احتیاج نہیں ہے، غنی بالذات ہے، اور نہ ہماری طرح کسی شے سے وہ متاثر ہوتے ہیں۔ ہم تو محبت سے یا کسی دوسری غرض سے مجبور بھی ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں چونکہ غناء ذاتی ہے۔ اس لئے کسی شے کی احتیاج نہیں اور ماسوائے اس کے سب محتاج ہیں۔ بلکہ انسان احتیاج میں تمام مخلوقات سے اول نمبر ہے۔ اس لئے کہ اگر عالم میں انسان نہ رہے تو کسی شے میں کوئی خلل نہ آئے سب اپنے حال پر رہیں اور اگر عالم میں سے ایک شے بھی نہ رہے تو انسان کی بقاء دشوار ہو جائے۔ مثلاً پانی نہ رہے۔ یا آگ نہ رہے، تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور انسان اگر ایک بھی نہ رہے تو ان چیزوں میں سے کسی کا کچھ بھی نقصان نہیں۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ انسان ہر شے کا محتاج ہے۔ اور یہ بات کہ باوجود

اشرف المخلوقات ہونے کے یہ اتنا محتاج کیوں ہوا تو راز اس میں یہ ہے کہ اس کو اپنی اشرفیت پر نظر کر کے عجب (خود پسندی) نہ ہو جائے۔ اس لئے اتنی حاجتیں اس کے پیچھے لگا دی گئی ہیں۔ کہ جب ناز اور فخر ہو تو فوراً اس کی طرف بھی نظر کرے کہ میں کیا ناز کروں۔ میں تو ایک ایک جزو عالم کا محتاج ہوں۔ اس کے سوا اور بھی حکمتیں ہوں گی۔ بہر حال انسان سب چیزوں کا محتاج ہے اور کوئی شے انسان کی محتاج نہیں۔ اور اللہ تعالی کو انسان کی کیا احتیاج ہوتی۔ جن چیزوں کا انسان خود محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی بھی احتیاج نہیں۔ بلکہ یہ امر عقلاً ونقلاً ثابت ہے کہ ہر شے اپنے وجود اور بقاء میں حق تعالی کی محتاج ہے۔ پس حق تعالیٰ کے اس استغناء اور انسان کے احواج ترین مخلوقات ہونے کا اقتضاء تو یہ تھا کہ انسان کی بات بھی نہ پوچھتے اور احکام کا مخاطب نہ بناتے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حقوق بھی نہ ہوتے۔ حقوق تو ضرور ہی ہوتے۔ پس جب حقوق ہوتے اور ان کے ادا کا طریقہ بتلایا نہ جاتا۔ تو سخت مصیبت ہوتی جو آقا اشاروں اور رموز پر خادموں کو چلاتے ہیں۔ خادموں کو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ اور ایک دو ہی کوئی ایسا نکل آتا ہے جو اتنا مزاج شناس ہو کہ اشارہ کو سمجھے۔

علی حزین شہزادہ ایران کو اتفاق سے ایک خادم رمضانی نام ایسا مل گیا تھا کہ اشاروں کو سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ علی حزین نے شاہ دہلی سے درخواست کی کہ ہم کو ایک سلیقہ دار خادم کی ضرورت ہے۔ بادشاہ نے ایک بڑے ہوشیار شخص کو بھیج دیا۔ علی حزین باغ میں بیٹھے تھے۔ اور نیا خدمت گار باغ کے دروازہ پر تھا۔ ایک شخص آیا اور اس نے ایک رقعہ دیا۔ اس خادم نے وہ رقعہ پہنچا دیا۔ اس میں درخواست تھی کہ لیموں عنایت فرمائیے علی حزین نے چہرہ پر بل ڈال کر وہ رقعہ واپس دے دیا۔ یہ خادم سخت پریشان ہوا کہ زبان کو تو بند کر لیا۔ اور چہرہ سے ناگواری کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کس بات پر بگڑتے ہیں۔ اتفاق سے وہاں رمضانی بھی آنکلا۔ اس سے خدمت گار نے سارا قصہ بیان کیا۔ رمضانی نے کہا چہرہ پر بل ڈال کر رقعہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ

لیموں دے دو۔ لیموں ترش ہوتا ہے۔ انہوں نے چہرہ ترش کر کے بتلا دیا۔ وہ خادم یہ سن کر بھاگا اور سوچا کہ میں یہاں رہوں گا تو سخت مصیبت میں رہوں گا۔

یہ حکایت صحیح ہے یا غلط بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ بھی اشاروں سے کام لیتے تو حق تھا لیکن کیسی مصیبت ہوتی۔ اور ان اشاروں کو سمجھنے والا کون تھا۔ سو ایسا نہیں کیا۔ بلکہ ایک مضمون کو خوب کھول کر دو دو مرتبہ تین تین مرتبہ بیان فرمایا۔ اور بیان بھی اس طور سے نہیں فرمایا کہ کوئی پرچہ بھیج دیتے کہ اس کے پڑھنے اور سمجھنے یا عمل کرنے میں دقت ہوتی۔ بلکہ ایک عجیب اور فطرت کے موافق طریقہ اختیار فرمایا۔ وہ یہ ہے کہ ایسی ذات مقدس کو بھیجا جس کی شان یہ ہے۔

لقد جاء کم رسولٌ من انفسکم

یعنی تمہارے پاس ایک رسول آئے ہیں تمہاری جنس سے۔

پس حضور ﷺ کا ہماری جنس سے ہونا۔ ایک نعمت تو یہ ہے اس لئے کہ اگر کسی فرشتہ یا جن کو بھیج دیتے تو سب ہیبت ہی کے مارے مر جاتے اور آپس میں کچھ مناسبت نہ ہوتی۔ آج کل لوگ اس فکر میں ہیں کہ پیغمبر کو عبدیت اور بشریت کے مرتبے سے گزار کر الٰہ تک پہنچا دیں۔ گویا اس صفت کو مٹانا چاہتے ہیں کہ جو ہمارے اور ذات حق میں واسطہ اضافہ ہوئی ہے۔ حالانکہ یہ عین رحمت الٰہی اور عین کمال نبوی بھی ہے کہ بشر ہو کر قریب کے ایسے درجہ پر ہے۔ یہ تو کمال تھا اور رحمت اس لئے ہے کہ بشریت کی مناسبت سے بے راہوں کو راہ پر لا دیں۔ (الشکر ص ۱۰۵)

سورۃ قمر اور رحمٰن میں بعض آیات مکرر کیوں ہیں

اعتراض: (عیسائیوں اور ہندوؤں کا اعتراض)

سورت القمر میں زیادہ تر مضامین سرکش قوموں پر عذاب الٰہی آنے کے متعلق تھے اسی لئے ہر ایک عذاب کے بعد لوگوں کو متنبہ کرنے کے لئے ایک خاص جملہ بار

بار استعمال فرمایا ہے، یعنی فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُر. اوراس کے متصل ایمان واطاعت کی ترغیب کے لئے دوسرا جملہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ بار بار لایا گیا ہے۔

جواب: سورۃ الرحمٰن میں اس کے مقابل بیشتر مضامین حق تعالی کی دنیوی اور اخروی نعمتوں کے بیان میں ہیں اسی لئے جب کسی خاص نعمت کا ذکر فرمایا تو ایک جملہ لوگوں کو متنبہ کرنے اور شکر نعمت کی ترغیب دینے کے لئے فرمایا: فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ. اور پوری سورت میں یہ جملہ اکتیس (۳۱) مرتبہ لایا گیا ہے۔ جو بظاہر تکرار معلوم ہوتا ہے۔ اور کسی لفظ یا جملے کا تکرار بھی تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔ اس لئے وہ بھی فصاحت و بلاغت کے خلاف نہیں خصوصاً قران کریم کی ان دونوں سورتوں میں جس جملے کا تکرار ہوا ہے وہ تو صورت کے اعتبار سے تکرار ہے حقیقت کے اعتبار سے ہر ایک جملہ ایک نئے مضمون سے متعلق ہونے کی وجہ سے مکرر محض نہیں ہے۔ کیونکہ سورۂ قمر میں ہر نئے عذاب کے بعد اس کے متعلق (فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ) آیا ہے۔ اسی طرح سورۂ رحمٰن میں ہر نئی نعمت کے بیان کے بعد (فَبِاَيِّ اٰلَآءِ) کا تکرار کیا گیا ہے جو ایک نئے مضمون کے متعلق ہونے کے سبب تکرار محض نہیں۔ علامہ سیوطیؒ نے اس قسم کے تکرار کا نام تردید بتلایا ہے۔ وہ فصحاء و بلغاء عرب کے کلام میں مستحسن اور شیریں سمجھا گیا ہے۔ نثر اور نظم دونوں میں استعمال ہوتا ہے اور صرف عربی نہیں، فارسی، اردو وغیرہ زبانوں کے مسلّم شعراء کے کلام میں بھی اس کی نظائر پائی جاتی ہیں۔ تفسیر روح المعانی وغیرہ میں اس جگہ متعدد نظائر بھی نقل کئے ہیں۔ (معارف القرآن ۲۴۰/۸)

حکایت:

ایک مرتبہ کسی بادشاہ کے سامنے ایک شخص کو پیش کیا گیا جو کہتا تھا کہ قرآن میں تکرار بے فائدہ ہے بادشاہ نے جلاد کو حکم دیا کہ اس کے جسم میں جو جو چیز ایک سے زیادہ ہے اس کو کاٹ دے مثلاً کان دو ہیں ایک کاٹ دے، آنکھیں دو ہیں ایک نکال

دے وغیرہ تو اس نے کہا حضور میں مان گیا تکرار بے فائدہ نہیں ہے مجھے معاف کردیجئے۔(امداداللہ انور)

کیا تکرار الفاظ فصاحت قرآن کے منافی ہے؟

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

خود قیاس کرنا چاہئے قرآن فصاحت وعبارت کی رو سے کہاں بے مثال ہوسکتا ہے کہ اس میں اکثر جگہ الفاظ کا تکرار ہے جیسے سورت قتال میں مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِیْهَا اَنْهٰر میں انہر کا لفظ چار مرتبہ آیا ہے۔اسی طرح دوسری آیات میں بھی تکرار الفاظ موجود ہے۔اور یہ فصاحت کے منافی ہے۔

جواب: معترض صاحب نہ تو علوم ادب سے واقف ہیں اور نہ فصاحت و بلاغت کی ماہیت سے اور لفظی خوبیوں سے بھی جاہل ہیں۔

شعر: آں کہ چوں پستہ دیدمش ہمہ مغز
پوست بر پوست بود ہم چوں پیاز

شعر: مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے ہوگا کوئی زخم
تیرے سینے میں بہت کام رفو کا نکلا

اگر تکرار الفاظ فصاحت کے منافی ہوتے تو یہ فارسی فصیح شعراء اور عرب کے فصحاء اپنے قصائد میں شعر کے آخری کلمے میں اور قصیدوں اور غزلوں میں الفاظ کو مقرر لاتے ہیں اور اس کو ردیف کا نام دیتے ہیں۔فصحاء عرب وعجم میں اس قسم کی تکرار کلام میں بہت واقع ہوئی ہے چنانچہ عربی شعر میں ہے۔

شعر: یسعدنی فی غمزۃ بعد غمزۃ
سبوح لها منها علیها شواهد

فارسی شاعر کہتا ہے۔

شعر: شمع دل مشتاقان بنشست چو او برخاست
فغان زنظر بازان برخاست چو او بنشست

قدیم اردو میں میر انشاء اللہ کا شعر ہے
شعر:

تم جو کہتے ہو مجھے تو نے بہت رسوا کیا
کیا گناہ کیا جرم کیا تقصیر میں نے کیا کیا

کیا کیا کس سے کہا کس نے سنا کب کس گھڑی
کس جگہ کس وقت کس دم آپ کا چرچا کیا

آپ تو ہرگز نہ آئے اور یہ انشاء رات بھر
آپ بن رویا کیا تڑپا کیا سسکا کیا

جدید اردو میں نسیم کا شعر ہے۔
شعر:

شوق سے عشاق کے خون پہ کمر باندھیے
تیر و کمان باندھیے تیغ و تبر باندھیے

اس طرح کے کلام کی مثالیں اور نظیریں تقریباً ہر زبان میں بہت ہیں کہاں تک ان کو تحریر کیا جائے۔

علامہ تفتازانی نے اپنی تصنیفات میں اور علامہ سکاکی نے مفتاح العلوم میں تصریحات فرمائی ہیں کہ فصاحت کے منافی وہ تکرار ہے جس کے کلمات میں تنافر ہو اور کلام میں سقم کی اقسام سے خالی نہ ہو ورنہ فصاحت کلام میں کسی قسم کا خلل واقع نہیں ہوگا۔

یہ علامہ تفتازانی اور علامہ سکاکی علم ادب کے آئمہ میں سے ہیں۔

(سوط اللہ الجبار ص ۲۸۷)

قرآن کی بلاغت پر اعتراض

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

عیسائی علماء، قرآن کریم پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ قرآن کریم بلاغت کے اس انتہائی معیار پر پہنچا ہوا ہے جو انسانی دسترس سے باہر ہے اور اگر اس کو مان بھی لیا جائے تب بھی یہ اعجاز کی ناقص دلیل ہے کیونکہ اس کی پہچان اور شناخت صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کو عربی زبان اور لغت عرب کی پوری مہارت ہو۔

اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ تمام کتابیں جو یونانی لاطینی زبانوں میں بلاغت کے اعلیٰ معیار پر پہنچی ہوئی ہیں وہ بھی کلام الٰہی مانی جائیں اور اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ باطل اور قبیح مضامین جن کو فصیح الفاظ اور بلیغ عبارت میں ادا کر دیا جائے۔ وہ بھی بلاغت کے اس معیاری مقام تک پہنچ جائیں۔

جواب: قرآن کریم کی عبارت کو بلاغت کے اعلیٰ درجہ تک پہنچا ہوا نہ ماننا سوائے ہٹ دھرمی کے کچھ نہیں۔

رہی یہ بات کہ اس کی شناخت صرف وہی کر سکتا ہے جس کو عربی زبان کی کامل مہارت ہو۔ تو یہ درست ہے لیکن اس سے ان کا مدعا ہرگز ثابت نہ ہوگا کیونکہ یہ معجزہ بلغاء اور فصحاء کو عاجز اور قاصر کرنے کے لئے تھا۔ اور ان کا عاجز ہونا ثابت ہو چکا۔ نہ صرف یہ کہ وہ معارضہ نہیں کر سکے۔ بلکہ اپنی عاجزی کا اعتراف بھی کیا۔ اہل زبان نے اس کی شناخت اپنے سلیقے سے کی ہے۔ اور علماء نے علوم بلاغت اور اسالیب کلام کی مہارت سے اس کو پہچانا۔

اب رہے عوام تو انہوں نے لاکھوں اہل زبان اور علماء کی شہادت سے یہ بات معلوم کر لی۔ لہٰذا اس کا معجزہ ہونا یقیناً ثابت ہو گیا اور یہ دلیل کامل دلیل ہے۔ نہ کہ

ناقص، جیسا کہ ان کا خیال ہے اور یہ چیز ان اسباب میں سے ایک ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔

ادھر مسلمان یہ دعویٰ کب کرتے ہیں کہ قرآن کے کلام اللہ ہونے کا سبب صرف اس کا بلیغ ہونا ہی ہے بلکہ ان کا دعویٰ تو یہ ہے کہ بلاغت بھی قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے بے شمار اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ اور قرآن کریم اس لحاظ سے منجملہ بہت سے معجزات کے حضور ﷺ کا ایک معجزہ ہے۔ اور اس کا معجزہ ہونا آج بھی لاکھوں اہل زبان اور ماہرین بلاغت کے نزدیک عیاں ہے۔ اور مخالفین کا عاجز و قاصر ہونا ظہور معجزہ کے وقت سے موجودہ زمانہ تک ثابت ہے۔ جسے ہر شخص کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہے۔ جب کہ ایک ہزار دو سو اسی (اور چار سو تیس) سال کی طویل مدت ہو چکی ہے۔

رہی یہ بات کہ وہ تمام کتابیں جو دوسری زبانوں میں معیاری بلاغت رکھتی ہیں ان کو بھی کلام الٰہی ماننا پڑے گا۔ سو یہ بات ناقابل تسلیم ہے۔ اس لئے کہ ان کتابوں کا بلاغت کے اس اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ جانا ان وجوہ کے مطابق ثابت نہیں ہوا۔ اور نہ ان کے مصنفین کی جانب سے اعجاز کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ نہ اس زبان کے فصحاء ہی ان کے معارضہ سے عاجز ہوئے۔ پھر بھی اگر کوئی شخص ان کتابوں کی نسبت اس قسم کا دعویٰ کرے تو اس کے ذمے اس کا ثبوت دینا ہوگا۔ پھر اگر وہ ثابت نہ کر سکے تو اس قسم کے باطل دعوے سے احتراز ضروری ہے۔ اس کے علاوہ صرف بعض عیسائیوں کا ان کتابوں کے متعلق یہ شہادت دینا کہ ان زبانوں میں یہ کتابیں بلاغت کے اسی معیار پر پہنچی ہوئی ہیں جس معیار پر عربی زبان میں قرآن کریم ہے۔ قابل تسلیم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ چونکہ یہ لوگ خود اہل زبان نہیں ہیں اس لئے نہ تو دوسری زبان کی تذکیر و تانیث میں مفرد و تثنیہ جمع میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ نہ مرفوع و منصوب و مجرور میں تمیز کر سکتے ہیں۔ چہ جائیکہ زیادہ بلیغ اور کم بلیغ میں تمیز کرنا۔ اور یہ امتیاز نہ کرنا عربی زبان کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ اپنی زبان کے علاوہ کسی زبان میں بھی۔ عبرانی ہو یا

یونانی، سریانی ہو یا لاطینی ان کو یہ مہارت حاصل نہیں ہو سکتی۔

اور اس امتیاز نہ کرنے کا منشاء ان کی زبان کی تنگ دامنی، بالخصوص انگریزوں کا تو یہی حال ہے کیونکہ یہ بھی اپنی تنگ دامنی میں عیسائیوں کے ساتھ شریک ہیں۔

رہی ان لوگوں کی یہ بات کہ باطل مضامین اور قبیح مقاصد کو بھی فصیح و بلیغ عبارت اور الفاظ میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ایسا کلام بھی کلام الٰہی ہونا چاہئے۔ سو یہ اعتراض قرآن کریم پر ہرگز وارد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے قرآن حکیم شروع سے آخر تک ستائیس قسم کے مضامین کے بیان سے بھرا ہوا ہے۔ اس کی کوئی طویل آیت ایسی نہ پائیں گے جو ان مضامین میں سے کسی مضمون سے خالی ہو۔

(بائبل سے قرآن تک ص ۳۶۵ جلد ۲)

قرآن کی فصاحت و بلاغت پر اعتراض

اعتراض: (بیس برن لالہ اندر من ہندو کا اعتراض)

مسلمان قرآن پاک کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کی عبارت فصیح و بلیغ ہے اور کوئی کتاب فصاحت و بلاغت میں اس کے برابر نہیں ہے جب کہ ہر زبان میں مثلاً فارسی اور ترکی وغیرہ میں کوئی نہ کوئی کتاب فصاحت و بلاغت میں اتنے بڑے مرتبہ شہرت پر پہنچی ہوتی ہے کہ اس سے مزید کا تصور نہیں ہوتا جیسے فارسی میں گلستان سعدی۔

جواب: قرآن پاک کو منکرین نے شعراور کبھی کاہنوں کی بات قرار دی کبھی اس کو جنات کی تعلیم قرار دیتے تھے قرآن پاک نے اس کا رد کرتے ہوئے فرمایا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. (سورۃ البقرۃ: ۲۳)

(ترجمہ) اور اگر تم شک میں ہو اس کلام کے متعلق جو ہم نے اپنے بندہ پر اتارا تو اس جیسی ایک سورت لاؤ اور اللہ کے سوا جو تمہارا مددگار ہو اس کو

بھی بلا ؤ اگر تم سچے ہو۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا.

(سورۃ الاسراء:۸۸)

(ترجمہ) آپ کہہ دیجئے اگر انسان اور جنات اس بات کیلئے جمع ہو جائیں کہ ایسا قرآن بنا لائیں تو ایسا قرآن نہیں لاسکیں گے اگر چہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔

قرآن پاک کے نازل ہونے کے زمانے میں فصاحت و بلاغت کی بڑی شہرت تھی۔ تمام عرب خصوصاً اہل مکہ فصاحت و بلاغت میں بڑے اونچے مرتبے پر پہنچے ہوئے تھے جن کی کوئی برابری نہیں کرسکتا تھا بلیغ خطاب اور فصیح قصیدے مجمعوں میں منبروں پر کہا کرتے تھے اور اس پر ایک دوسرے پر فخر کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں اس وقت کے فصحاء باوجود شدت حرص کے اور قرآن پاک کو جھوٹا کہنے کے اور قرآن پاک کی طرف سے مقابلے کی دعوت کے قرآن پاک جیسی ایک سورت بھی بنا کر نہ لا سکے اور قرآن پاک نے فرمایا "لن تفعلوا" کہ یہ قرآن پاک جیسی ایک سورت بھی ہرگز نہیں بنا سکتے۔ اور ایک جگہ فرمایا "لا یاتون بمثله" قرآن جیسا قرآن نہیں بنا سکتے۔ تو اس چیلنج کے جواب میں ایسے فصیح لوگوں کو قرآن کا بنانا آسان تھا لیکن ایک سورت بھی نہ بنا سکے اور اپنی جان کو جنگ و جدال میں لا کھڑا کیا۔ اور اپنے دوستوں کو بھی ذلت کی خاک میں ڈال دیا۔ اور کچھ قید ہوئے کچھ جلا وطن ہوئے۔

اس سے واضح ہوا کہ قرآن مخلوق کا کلام نہیں ہے ورنہ ممکن تھا کہ یہ آسان کام کر گزرتے اور ذلت میں نہ پڑتے۔

اب بھی چودہ سو سال گزر چکے قرآن کے منکر ہر مذہب و ملت میں ہر طرف سے قرآن کی تکذیب کے لئے موجود ہیں اور ہر طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ ایک سورت

کی طرح کی سورت بنا دیتے لیکن ایسا نہ کر سکے تو اس سے ظاہر ہوا کہ یہ کلام کسی جن اور انسان کا نہیں ہے اور اس طرح کا کلام کسی فرد اور بشر کی طاقت میں نہیں ہے۔

یہ جو معترض نے گلستان سعدی کا حوالہ دیا ہے یہ اس کی فنون فصاحت و بلاغت سے جہالت کی دلیل ہے ورنہ وہ کبھی نہ کہتا کہ سعدی کی کتاب بے مثل ہے فارسی دان لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ اگرچہ شیخ سعدیؒ نصیحت آمیز قصہ گوئی میں زیادہ فصیح ہیں مگر ان کا کلام اعجاز کے درجے کو نہیں پہنچا بہت جگہ پند و نصائح مولوی معنوی نے مثنوی میں اس سے بہتر کلام کیا ہے۔ اور اسی طرح سے اکثر مضامین میں مولوی معنوی شیخ سعدی سے افضل رہے ہیں، اسی طرح فردوسی رزم میں، اور حافظ شیرازی مضامین خمریہ میں، اور حسین واعظ مضامین احزان و مراثی میں، اور مرزا صائب تمثیل و تشبیہ میں شیخ سعدی سے گوئے سبقت لے گئے ہیں اور یہ ان سب کے کلام ایک دوسرے سے موازنے سے معلوم ہوتا ہے جو کسی دلیل و برہان کا محتاج نہیں۔

بہر حال انسان کی طاقت سے باہر ہے جب قرآن نے ان کو چیلنج دیا ہے اور سب انسان مل کر بھی اس جیسے چند فقرے اور چند سورتیں بھی بنا کر نہ لا سکے نہ شاعر شعر میں نہ نثر نویس نثر میں اگر کوئی کوشش کرے گا تو اپنے کلام میں اس کا ایک قسم کا سلیقہ غالب ہوگا بعض لوگ عاشقانہ مضامین میں اور خال و خط کے حسن میں اور بعض بزم میں اور بعض رزم میں' اور بعض مدح میں اور بعض ذم میں اور بعض بشارت کے مضامین میں' اور بعض پند و نصائح میں' اور بعض ترغیب میں اور بعض ڈرانے میں اسی طرح سے مہارت رکھتے ہیں اور یہ قرآن پاک وہ کلام ہے جب اس میں غور کیا جائے تو یہ ہر فن میں بے نظیر ہے۔ جیسا کہ ارباب معانی کے سامنے مخفی نہیں ہے۔

معترض کے جواب میں یہ شعر بھی کافی ہے۔

با چنیں بے ہودہ گوئی میتوان گفتن اگر
قوت داری بگو ور قدرتے داری بیا

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ. (سورۃ البقرۃ:۲۴)

(ترجمہ) اگر ایسا نہ کر سکو اور کبھی کر بھی نہ سکو گے تو پھر اس آگ سے بچو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں کافروں کیلئے تیار کی ہوئی ہے۔

(سوط اللہ الجبار ص ۲۸۱۔۲۸۲)

ہوسکتا ہے قرآن کے مقابلہ میں کتابیں لکھی گئی ہوں مگر محفوظ نہ ہوں

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

بعض لوگوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ قرآن کے مقابلہ میں کتابیں اور مقالات لکھے گئے ہوں مگر وہ محفوظ نہ رہے ہوں۔

جواب: لیکن اگر ذرا بھی انصاف سے کام لیا جائے تو اس احتمال کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ جب سے قرآن نازل ہوا۔ پوری دنیا میں قرآن کے ماننے والے کم اور منکرین زیادہ رہے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ ذرائع نشر و اشاعت جتنے منکرین قرآن کو حاصل رہے ہیں قرآن کے ماننے والوں کو اکثر زمانوں میں اس کا کوئی قابل ذکر حصہ حاصل نہیں رہا۔ قرآن اتنا بلند بانگ دعویٰ اپنے مخالفین کے سامنے کرتا ہے ان کو چیلنج دیتا ہے، غیرتیں دلاتا ہے اور مخالفین اسلام اس کے مقابلہ میں جان، مال اور اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔ اگر انہوں نے قرآن کا چیلنج قبول کر کے کوئی چیز مقابلہ کے لئے پیش کی ہوتی تو کیسے ممکن تھا کہ وہ ساری دنیا میں شائع نہ ہوتی اور ہر زمانہ میں منکرین قرآن مسلمانوں کے مقابلہ میں اس کو پیش نہ کرتے۔ اور مسلمانوں کی طرف سے اس پر جرح و قدح میں سینکڑوں کتابیں نہ لکھی گئی ہوتیں۔

اسلام کے قرن اول میں صرف ایک واقعہ مسیلمہ کذاب یمنی کا پیش آیا کہ اس

نے کچھ چند بے حیائی کے الٹے سیدھے کلمات لکھ کر یہ کہا تھا کہ یہ وحی آسمانی قرآن کی مثل ہے۔ مگر دنیا جانتی ہے کہ ان کلمات کا کیا حشر ہوا۔ خود اس کی قوم نے اس کے منہ پر مار دیئے۔ وہ کلمات ایسے شرمناک غیر مہذب تھے کہ کسی مذہب اور سوسائٹی میں ان کو بیان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور بہر حال جیسے بھی تھے وہ آج تک کتابوں میں نقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر کسی اور شخص نے کوئی اچھا کلام قرآن کے مقابلہ میں پیش کیا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دنیا کی تاریخ اس کو یکسر بھلا دیتی۔ اور منکرین قرآن اس کو ہر قیمت پر باقی رکھنے کی کوشش نہ کرتے۔

وہ لوگ جو قرآن کے مقابلہ پر ہر وقت سینہ سپر تھے قرآن کے اس چیلنج کے جواب میں انہوں نے طرح طرح کی باتیں کیں جن کو قرآن میں نقل کر کے جواب دیا گیا۔ مگر اس کا ایک واقعہ نہیں کہ کوئی کلام مقابلہ پر پیش کر کے اس کے قرآن کا مثل ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو۔

واقعہ:

ایک رومی غلام جو مدینہ میں لوہار کا کام کیا کرتا تھا اور کچھ تورات و انجیل پڑھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی آنحضرت ﷺ سے ملتا تھا۔ عرب کے کچھ جاہلوں نے تعصب و عناد سے یہ مشہور کیا کہ آنحضرت ﷺ کو یہ قرآنی مضامین اس نے سکھائے ہیں قرآن نے ان کا یہ اعتراض نقل کر کے خود جواب دیا کہ جس شخص کی طرف سکھانے کی نسبت کرتے ہیں وہ تو خود عجمی ہے۔ عربی زبان کی بلاغت کو کیا جانے۔ اور یہ قرآن عربی کی انتہائی بلیغ کتاب ہے سورہ نحل کی آیت نمبر ۱۰۳ دیکھئے۔

لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ.

ترجمہ: ہم جانتے ہیں کہ یہ مخالفین اسلام یہ کہتے ہیں آپ کو یہ قرآن سکھاتا ہے حالانکہ وہ جس آدمی کی طرف نسبت کرتے ہیں وہ عجمی

ہے اور قرآن ایک بلیغ عربی زبان میں ہے۔

کچھ لوگوں نے قرآن کے چیلنج کے جواب میں یہ کہا کہ

لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا.

ترجمہ: اگر ہم چاہتے تو ہم بھی قرآن کے مثل کلام کہہ دیتے۔

لیکن کوئی ان سے پوچھے کہ پھر چاہا کیوں نہیں؟ قرآن کے مقابلہ کے لئے سارا ایڑی چوٹی کا زور تو خرچ کیا۔ جان و مال کی قربانی دی، اگر تمہیں اس کا مثل کلام لکھنے یا کہنے کی قدرت تھی تو قرآن کے اس چیلنج کے بعد تم نے اس کی مثل کلام بنا کر فتح کا سہرا اپنے سر کیوں نہ لیا؟

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے اس دعویٰ کے بعد مخالفین نے کچھ شریفانہ سکوت نہیں کر لیا بلکہ جو کچھ ان کے منہ پر آیا اس کے مقابلہ پر کہتے رہے لیکن یہ پھر بھی کسی نے نہ کہا کہ ہم میں سے فلاں آدمی نے قرآن جیسا فلاں کلام لکھا ہے اس لئے قرآن کا یہ دعویٰ یکتائی (معاذ اللہ) غلط ہے۔

بحیرا راہب سے سیکھنے کا اعتراض و جواب

بعض معاندین کو یہ سوجھی کہ آنحضرت ﷺ جو قبل از نبوت چند روز کے لئے ملک شام تشریف لے گئے۔ اور راستہ میں بحیرا، راہب سے ملاقات ہوئی وہ تورات کا ماہر تھا۔ اس سے آپ نے علوم سیکھے۔ مگر کوئی ان سے پوچھے کہ ایک دن کی ایک ملاقات میں اس سے یہ سارے علوم و معارف فصاحت و بلاغت کا اعجاز، اخلاقی تربیت، نظام خانگی، نظام مملکت کیسے سیکھ لئے۔

کسی کلام کی مثل نہ بنایا جانا اس کے معجز ہونے کی دلیل نہیں

اعتراض: (جدید معترضین کا اعتراض)

آج کے بعض معترضین نے کہا کہ کسی کلام کی مثل نہ بنایا جانا اس کی دلیل نہیں ہو

سکتی کہ وہ خدا کا کلام یا معجزہ ہے ہوسکتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کا ماہر بلاغت کوئی نثر یا نظم ایسی لکھے کہ دوسرے آدمی اس کی نظیر نہ لاسکیں۔

سعدی شیرازی کی گلستان، فیضی کی تفسیر بے نقط کو عام طور پر بے مثل و بے نظیر کتابیں کہا جاتا ہے تو کیا وہ بھی معجزہ ہیں؟

جواب: لیکن اگر ذرا غور کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ سعدی اور فیضی کے پاس سامان تعلیم و تالیف کس قدر موجود تھا۔ کتنے عرصہ تک انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ برسوں مدرسوں میں پڑے رہے۔ راتوں جاگے، مدتوں محنتیں کیں، بڑے بڑے علماء کے سامنے زانوئے ادب طے کیے، سالہا سال کی محنتوں اور دماغ سوزیوں کے نتیجہ میں اگر بالفرض فیضی یا حریری یا متنبی یا کوئی اور عربی زبان میں اور سعدی فارسی میں اور ملٹن انگریزی میں یا ہومر یونانی میں یا کالی داس سنسکرت میں ایسے ہوئے ہیں کہ ان کا کلام دوسروں کے کلام سے فائق ہوگیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

معجزہ کی تعریف تو یہ ہے کہ وہ اسباب متعارفہ کے توسط کے بغیر وجود میں آئے۔ کیا ان لوگوں کی باقاعدہ تحصیل علوم، استادوں کے ساتھ طویل ملازمت و صحبت، وسیع مطالعہ، مدتوں کی مشاقی ان کی علمی مہارت کے کھلے ہوئے اسباب نہیں ہیں؟ اگر ان کے کلام دوسروں سے ممتاز ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جس نے کبھی کتاب و قلم کو ہاتھ نہ لگایا ہو۔ کسی مدرسہ و مکتب میں قدم نہ رکھا ہو۔ وہ ایسی کتاب دنیا کے سامنے پیش کرے کہ ہزاروں سعدی اور لاکھوں فیضی اس پر قربان ہوجانے کو اپنا سرمایۂ فخر سمجھیں۔ اور ان کو جو کچھ علم و حکمت حاصل ہوئے اس کو بھی آپ ﷺ ہی کے فیض تعلیم کا اثر قرار دیں۔ اس کے علاوہ سعدی اور فیضی کے کلام کا مثل پیش کرنے کی کسی کو ضرورت بھی کیا تھی؟ کیا انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور اپنے کلام کے بیمثل و بے نظیر ہونے کو اپنا معجزہ کہا تھا اور دنیا کو اس کا چیلنج دیا تھا کہ ہمارے کلام کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی جس کے نتیجہ میں لوگ اس کا

مقابلہ کرنے اور مثال پیش کرنے کے لئے مجبور ہوتے۔

پھر قرآن کی صرف فصاحت و بلاغت اور نظم و ترتیب ہی بے مثال نہیں۔لوگوں کے دل و ماغ پر اس کی تاثیرات عجیبہ اس سے زیادہ بے مثال اور حیرت انگیز ہیں۔ جن کی وجہ سے قوموں کے مزاج بدل گئے۔انسانی اخلاق میں ایک کایا پلٹ گئی ہو۔ عرب کے تند خو، گنوار، حلم و اخلاق اور علم و حکمت کے استاد مانے گئے ان حیرت انگیز انقلابی تاثیرات کا اقرار صرف مسلمان نہیں موجودہ زمانے کے سینکڑوں غیر مسلموں نے بھی کیا ہے۔یورپ کے مستشرقین کے مقالات اس بارے میں جمع کئے جائیں تو ایک مستقبل کتاب ہو جائے۔اور حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب شہادۃ الاقوام علیٰ صدق الاسلام تحریر فرمائی ہے اس جگہ چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر گستاولی بان نے اپنی کتاب تمدن عرب میں صفائی سے اس حیرت انگیزی کا اعتراف کیا۔

ان کے الفاظ کا ترجمہ اردو میں یہ ہے:

اس پیغمبر اسلام اس نبی امی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگذشت ہے جس کی آواز نے ایک قوم ناہنجار کو جو اس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہ آئی تھی رام کیا۔اور اس درجہ پر پہنچا دیا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر وزبر کر ڈالا۔اور اس وقت بھی وہی نبی امی اپنی قبر کے اندر سے لاکھوں بندگان خدا کو کلمۂ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے۔

مسٹر وڈول جس نے قرآن مجید کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا ہے لکھتا ہے کہ

جتنا بھی ہم اس کتاب (یعنی قرآن) کو الٹ پلٹ کر دیکھیں اسی قدر پہلے مطالعہ میں اس کی نامرغوبی نئے نئے پہلوؤں سے اپنا رنگ جماتی ہے۔لیکن فوراً ہمیں مسخر کر لیتی ہے۔متحیر بنا دیتی ہے۔اور آخر میں ہم

سے تعظیم کرا کر چھوڑتی ہے۔ اس کا طرزِ بیان باعتبار اس کے مضامین و اغراض کے، عفیف، عالی شان اور تہدید آمیز ہے اور جا بجا اس کے مضامین سخن کی غایت رفعت تک پہنچ جاتے ہیں۔ غرض یہ کتاب ہر زمانہ میں اپنا پُر زور اثر دکھاتی رہے گی۔ (شہادۃ الاقوام، ص ۱۳)

مصر کے مشہور مصنف احمد فتحی بک زاغلول نے ۱۸۹۸ء میں مسٹر کونٹ ہنروی کی کتاب الاسلام کا ترجمہ عربی میں شائع کیا تھا۔ اصل کتاب فرنچ زبان میں تھی۔ اس میں مسٹر کونٹ نے قرآن کے متعلق اپنے تأثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے ہیں۔

عقل حیران ہے کہ اس قسم کا کلام ایسے شخص کی زبان سے کیونکر ادا ہوا جو بالکل امی تھا۔ تمام مشرق نے اقرار کرلیا ہے کہ نوع انسانی لفظاً و معناً ہر لحاظ سے اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ یہ وہی کلام ہے جس کی بلند انشاء پردازی نے عمر بن خطاب کو مطمئن کر دیا۔ ان کو خدا کا معترف ہونا پڑا۔ یہ وہی کلام ہے کہ جب یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق اس کے جملے جعفر بن ابی طالب نے حبشہ کے بادشاہ کے دربار میں پڑھے تو اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے۔ اور بشپ چلا اٹھا کہ یہ کلام اسی سرچشمہ سے نکلا ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام کا کلام نکلا تھا۔ (شہادۃ الاقوام ص ۱۴)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۶ اص ۵۹۹ میں ہے:

قرآن کے مختلف حصص کے مطالب ایک دوسرے سے بالکل متفاوت ہیں۔ بہت سی آیات دینی و اخلاقی خیالات پر مشتمل ہیں۔ مظاہر قدرت، تاریخ، الہاماتِ انبیاءؑ کے ذریعہ اس میں خدا کی عظمت، مہربانی اور صداقت کی یاد دلائی گئی ہے۔ بالخصوص حضرت محمد (ﷺ) کے واسطہ سے خدا کو واحد اور قادر مطلق ظاہر کیا گیا ہے۔ بت پرستی اور مخلوق پرستی کو

بلا لحاظ ناجائز قرار دیا گیا ہے۔قرآن کی نسبت یہ بالکل بجا کہا جاتا ہے
کہ وہ دنیا بھر کی موجودہ کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔
انگلستان کے نامور مؤرخ ڈاکٹر گبن اپنی مشہور تصنیف (سلطنت روما کا انحطاط و زوال) کی جلد ۵ باب ۵۰ میں لکھتے ہیں:-

قرآن کی نسبت بحر اٹلانٹک سے لے کر دریائے گنگا تک نے مان لیا ہے کہ یہ پارلیمنٹ کی روح ہے۔قانون اساسی ہے، اور صرف اصول مذہب ہی کے لئے نہیں، بلکہ احکام تعزیرات کے لئے اور قوانین کے لئے بھی ہے جن پر نظام کا مدار ہے جن سے نوع انسان کی زندگی وابستہ ہے۔جن کو حیات انسانی کی ترتیب وتنسیق سے گہرا تعلق ہے۔حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی شریعت سب پر حاوی ہے، یہ شریعت ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سارے جہان میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

اس جگہ مستشرقین یورپ کے اقوال واعترافات کا استیعاب کرنا نہیں کہ اس کی گنجائش نہیں۔نمونہ کے طور پر چند اقوال نقل کئے گئے ہیں۔جن سے واضح ہوتا ہے کہ باعتبار فصاحت و بلاغت کے اور باعتبار اغراض و مقاصد کے اور باعتبار علوم و معارف کے قرآن کے بے نظیر و بے مثل ہونے کا اقرار صرف مسلمانوں نے نہیں ہر زمانہ کے منصف مزاج غیر مسلموں نے بھی کیا ہے۔

قرآن نے ساری دنیا کو اپنی مثال لانے کا چیلنج دیا تھا اور کوئی نہ لا سکا۔آج بھی ہر مسلمان دنیا کے ماہرین علم وسیاست کو چیلنج کر کے کہہ سکتا ہے کہ پوری دنیا کی تاریخ میں ایک واقعہ ایسا دکھلا دو کہ ایک بڑے سے بڑا ماہر حکیم فیلسوف کھڑا ہو اور ساری دنیا کے عقائد ونظریات اور رسوم و عادات کے خلاف ایک نیا نظام پیش کرے۔اور اس کی قوم بھی اتنی جاہل گنوار ہو۔پھر وہ اتنے قلیل عرصہ میں اس کی تعلیم کو بھی عام کر دے اور

عملی تنفیذ کو بھی اس حد پر پہنچا دے کہ اس کی نظیر آج کے مضبوط و مستحکم نظاموں میں ملنا ناممکن ہے۔

دنیا کی پہلی تاریخ میں اگر اس کی کوئی نظیر نہیں تو آج تو بڑی روشنی، روشن خیالی، بڑی تیز رفتاری کا زمانہ ہے۔ آج کوئی کر کے دکھلا دے، اکیلا کوئی نہ کر سکے تو اپنی قوم کو بلکہ دنیا کی ساری اقوام کو جمع کر کے اس کی مثال پیدا کر دے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ.

ترجمہ:- اگر تم اس کی مثال نہ لا سکے اور ہرگز نہ لا سکو گے تو پھر اس جہنم کی آگ سے ڈرو، جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، جو منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ (معارف القرآن ۱/۱۶۰)

وید کے ہوتے ہوئے قرآن کی ضرورت

اعتراض : (پنڈت دیانند کا اعتراض)

وید (بید) کے ہوتے ہوئے قرآن کی کیا ضرورت ہے۔

جواب: کے متعلق جواب سنئے! آپ ہی کے لفظوں میں سناتے ہیں۔

ایشور کا علم غیر متناہی ہے یا نہیں؟ ہے تو پھر کس کام کے لئے؟ اگر کہو کہ اپنے ہی لئے ہے تو کیا ایشور اور پکار (دوسروں کی بھلائی) نہیں کرتا۔ تم یہ کہو گے کہ کرتا ہے پھر اس سے کیا؟ اس سے یہ کہ علم اپنے لئے ہوتا ہے اور دوسروں کیلئے بھی۔ کیونکہ اس کو یہی دو مقصد ہیں اگر ایشو اپدیش (الہام) نہ کرتا تو علم کا دوسرا مقصد فوت ہو جاتا اس لئے ایشور نے اپنے علم (یعنی قرآن سوامی کی تحریر میں وید ہے) کے اپدیش سے اس دوسرے مطلب کو پورا کیا ہے۔ پرمیشور بڑا رحیم ہے۔ اگر ایسا نہ کرتا تو ہمیشہ جہالت کا سلسلہ قائم رہتا اور انسان دہرم ارتھ (دولت) کام (مراد) موکش (نجات) کے

حصول سے محروم رہ کر پرم آنند (راحت اعلیٰ) نہ پاسکتا۔"

(رگ وید آدی بھاشہ بھومکا صفحہ ۸)

بتلایئے! اگر قرآن نہ آتا تو عرب جیسے خونخوار وحشی اور شرک آلود ملک کو کون ہدایت کرتا ویددانوں کو تو وہ راستہ بھی معلوم نہ تھا نہ وہ غیروں کو ہدایت کر کے اپنے میں ملاتے تھے۔ نہ وید میں یہ کشش تھی کہ غیر کو کھینچ لاتا جس کا بدیہی ثبوت ہے کہ بقول آپ کے دو ارب سال وید بنے کو ہو گئے آج تک کہیں کسی ملک میں بجز ہند کے کوئی بھی اس کا نام لیوا نہیں کوئی اتنا بھی تو نہیں جانتا۔

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

توریت انجیل والوں کا حال یہ تھا کہ بجائے توحید کے تثلیث میں آج تک باوجود دعوی تکذیب اور "یہ" اور "وہ" سرشار ہیں سنئے قرآن اپنے بیان میں قاصر نہیں ہے وہ اپنی وجہ آپ بتلاتا ہے۔ وید کی طرح "مریداں ہمے پرانند" کا محتاج نہیں۔ خدا عربوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ "اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ. عربی میں قرآن اس لئے اتارا ہے تاکہ تم نہ کہنے لگو کہ ہم سے پہلے لوگوں پر کتاب اتری تھی اور ہم ان کی تعلیم سے بے خبر تھے۔

بے شک واقعی ان کو بندر بنایا تھا۔ جھوٹ کیوں ہوتا۔ مگر ایسے نہیں کہ آپ کو تناسخ کی سوجھے بلکہ ان کے اسی جسم کو جس میں وہ تھے بندر بنادیا تھا نہ کہ حسب معمول ماں کے رحم میں جا کر جیسے ویدک مت والے بنتے ہیں اور کہتے ہیں۔

کیا نزول قرآن کے وقت اصل تورات انجیل موجود تھی

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

اہل کتاب بالخصوص پادریوں نے اس توراۃ وانجیل موجودہ کے اصلی توراۃ و انجیل ہونے پر چند دلائل بیان کیے ہیں کہ جو محض وہم پر مبنی ہیں میں ان کے دلائل اور پھر ان کے جواب ذکر کرتا ہوں۔ (۱) قرآن میں متعدد جگہ توراۃ وانجیل پر اہل کتاب کو عمل کرنے کی ترغیب دی اور ان کے محامد بیان فرمائے ہیں اور ان پر ایمان لانے اور ادب کرنے کی ترغیب دی اگر اس وقت یہ کتابیں موجود نہ ہوتیں تو عمل کس پر اور ایمان کس پر لاتے اور وہ آیات یہ ہیں:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ الأية.

قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ.

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ. الأية

قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰةِ فَاتْلُوْهَا اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ.

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ. الأية

وغیرہا من الآیات

پس صاف معلوم ہوا کہ اس وقت توراۃ وانجیل اصلی موجود تھیں اور وہ یہی ہیں جو اب ہمارے پاس ہیں۔ نیاز نامہ کے مصنف نے اس دلیل پر بڑا زور دیا ہے اور بہت سے ورق سیاہ کیے ہیں۔

جواب: اول اور دوسری اور پانچویں آیت کا اور جس قدر آیات اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں ان سب کا یہ جواب ہے کہ توراۃ وانجیل پر چلنے اور ان کے قائم رکھنے سے توراۃ وانجیل اصلی کے احکام مراد ہیں جیسا کہ بیضاوی وغیرہ جمہور مفسرین نے بیان کیا اور خود مستدل نے نقل کیا اور قرینہ بھی دال ہے اور احکام توراۃ وانجیل کے بیشتر ان توراۃ وانجیل میں بھی پائے جاتے ہیں۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت توراۃ و

انجیل کے احکام ان کے پاس موجود تھے اور احکام کے موجود ہونے سے مجموعہ توراۃ و انجیل کا موجود ہونا لازم نہیں آتا۔ دیکھئے ہدایہ وغیرہ۔

کتب فقہ میں قرآن کے احکام موجود ہوتے ہیں مگر ہدایہ کو قرآن نہیں کہہ سکتے۔ تیسری اور چوتھی آیت جس میں یہ ہے کہ یہود کے پاس توراۃ ہے اور اس قسم کی اور جملہ آیات کا جواب یہ ہے کہ یہاں بھی توراۃ سے مراد احکام توراۃ ہیں سو وہ بیشک یہود کے پاس خواہ بلا تغیر خواہ بالتغیر اس توراۃ فرضی میں اب تک موجود ہیں۔ پس احکام کے موجود ہونے سے مجموعہ تمام اصلی تورات کا موجود ہونا لازم نہیں آتا۔

(حقانی ۱/۱۹۷ تا ۲۰۰)

قرآن کریم نے بائبل کی مخالفت کی ہے

اعتراض: (عیسائیوں کی طرف سے اعتراض)

چونکہ قرآن کریم نے بعض مقامات پر عہد جدید و عہد قدیم (یعنی بائبل) کی کتابوں کی مخالفت کی ہے اس لئے وہ خدا کا کلام نہیں ہوسکتا۔

پہلا جواب:

چونکہ (عیسائیوں کی) ان کتابوں کا سلسلۂ سند متصل اپنے مصنفوں تک ثابت نہیں ہوسکا۔ اور نہ یہ ثابت ہوسکا کہ یہ کتابیں الہامی ہیں۔ ادھر یہ بھی ثابت ہے کہ ان کتابوں میں خود بے شمار مقامات پر آپس میں معنوی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور یقینی طور پر بے شمار غلطیوں سے بھری پڑی ہیں۔ جیسا کہ آپ عیسائیوں کے رد میں معروف کتاب اظہار الحق میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کتابوں میں تحریف بھی ثابت ہو چکی ہے اس کو بھی تفصیل سے اظہار الحق میں دیکھ لیں۔ پھر قرآن کریم کا بہت سے مقامات پر ان کے مخالف ہونا کوئی مضر نہیں ہے۔ بلکہ اس بات کی دلیل ہے کہ بائبل کے ان مقامات میں غلطیاں ہیں۔ یا پھر تحریف کی گئی ہے جس طرح کہ بائبل میں دوسری

اغلاط اور تحریفات موجود ہیں۔ جن کا بیان پہلے دو بابوں میں ہو چکا ہے۔ اور اس باب کی پہلی فصل کی چوتھی خصوصیت میں واضح ہو چکا ہے کہ قرآن کریم کی یہ مخالفت ارادی اور جان کر ہے۔ اس سے یہ جتانا مقصود ہے کہ قرآن کے خلاف جو کچھ ہے، یا غلط ہے، یا تحریف شدہ ہے، یہ بات نہیں کہ یہ مخالفت سہواً ہوئی ہو۔

دوسرا جواب:

عیسائی پادری قرآن کریم اور بائبل کے درمیان جو مخالفتیں بیان کرتے ہیں وہ تین قسم کی ہیں۔

(۱) منسوخ، احکام کے لحاظ سے۔

(۲) وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بعض واقعات ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے اور دونوں عہد ناموں میں نہیں پایا جاتا۔

(۳) قرآن کے بعض بیان کردہ حالات ان کتابوں کے بیان کیے ہوئے احوال کے مخالف ہیں۔

ان تینوں لحاظ سے عیسائیوں کا قرآن پر طعن کرنا محض بے جا اور بے معنی ہے۔ اول اس اعتبار سے کہ نسخ قرآن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ کثرت سے پچھلی شریعتوں میں بھی پایا جاتا رہا ہے۔ اور اس میں کوئی محال عقلی نہیں ہے۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت نے سوائے نو (۹) احکام کے تمام احکام کو منسوخ کر دیا۔ یہاں تک کہ توریت کے مشہور دس (۱۰) احکام بھی منسوخ کر دیئے گئے۔ اور عیسائی نظریئے کے مطابق اس میں تکمیل واقع ہوئی۔ اور تکمیل بھی ان کے خیال کے مطابق نسخ ہی کی ایک قسم ہے۔ لہذا یہ احکام بھی اس لحاظ سے منسوخ ہی کہلائیں گے۔ اس کے بعد کسی عقلمند مسیحی کے لئے اس لحاظ سے قرآن پر طعن کرنے کی مجال باقی نہیں رہی۔

دوسرے لحاظ سے بھی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ عہد نامہ جدید میں بھی بہت سے قصے وہ ذکر کیے گئے ہیں جن کا ذکر عہد نامہ قدیم کی کسی کتاب میں نہیں

ہے۔تو کیا اس طرح سے عہد نامہ جدید بھی خدا کا کلام نہیں ہوسکتا۔

(بائبل سے قرآن تک ۲/ ۳۹۰)

حضرت مسیح مریم کے واقعہ میں قرآن پر نکتہ چینیوں کا جواب

اعتراض: اس مقام پر عیسائی نکتہ چین قرآن مجید پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ حضرت مسیح اور مریم کے اور اسی طرح یوحنا یعنی یحییٰ کے قصہ میں چند غلطیاں قرآن میں بیان ہوئیں جو تاریخی واقعات سے علاقہ رکھتے ہیں۔

(۱) یہ کہ مریم کی ماں کا نذر ماننا اور پھر مریم کو ہیکل میں بھیج دینا اور وہاں کاہنوں میں باہم ان کی پرورش کی بابت گفتگو ہو کر زکریا کے نام قرعہ نکلنا۔اور زکریا کا مریم کو بے موسم کے پھل کھاتے دیکھ کر اپنے لئے اولاد کے واسطے دعا کرنا انجیل سے ثابت نہیں اس لئے یہ باتیں غلط ہیں۔

(۲) قرآن میں لکھا ہے کہ زکریا تین روز تک بغیر اشارہ کے کسی سے کلام نہ کریں گے حالانکہ انجیل لوقا کے اول باب ورس ۲۰ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکریا کو یوں فرشتہ نے کہا کہ تو جب تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں گونگا ہو جائے گا کسی سے بول نہ سکے گا۔اور اسی باب کے ۶۴ ورس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب یحییٰ پیدا ہوئے اور آٹھویں دن ان کا ختنہ ہوا اور ان کا نام یحییٰ رکھا گیا تب ان کی زبان کھلی جس کی مدت تخمیناً دس مہینے ہوتے ہیں۔قرآن نے باوجود دعوائے الہام اور تصدیق انجیل کے کتنی غلطی کی۔

(۳) لڑکپن میں مسیح کا کلام کرنا اور پھر پرندوں کا معجزہ کہ مٹی کے جانور بنا کر ان میں پھونک مارنا اور ان کا زندہ ہو کر اڑ جانا کہیں سے ثابت نہیں قرآن نے اس کو کہاں سے لیا۔

جواب: ان اعتراضات کا جواب یہ ہے اول سوال جواب یوں ہے۔اگر تاریخی باتیں انجیل اربعہ کے مصنف نے اپنی مختصر تاریخوں میں نہ لکھیں تو اس سے کوئی

یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ امور غلط ہیں دیکھوز کریا کا فرشتہ سے بشارت پانا اور یحییٰ نام رکھنا وغیرہ باتیں صرف لوقا نے لکھی ہیں اوروں نے نہیں۔ پھر کیا اس وجہ سے یہ غلط ہو سکتی ہیں؟ اسی طرح مسیح کے پیدا ہونے کے دنوں میں مجوسیوں کو ایک ستارہ دکھائی دینا اور اس کا ان کے آگے آگے چلنا سوائے متّی کے اور کسی نے نہیں لکھا۔ اسی طرح ان چاروں مؤرخوں کا باہم سینکڑوں باتوں میں تفاوت بیان پایا جاتا ہے۔ یہی تیسرے اعتراض کا بھی جواب ہے اور تائید اس کی یہ ہے کہ یوحنا اپنی انجیل کے سب سے اخیر میں یہ لکھتا ہے کہ اور بھی بہت سے کام ہیں جو یسوع نے کئے اگر وہ جدا جدا لکھے جاتے تو میں گمان کرتا ہوں کہ کتابیں جو لکھی جاتیں دنیا میں نہ سماتیں۔ پھر کیا مسیح نے یہ ہی چند باتیں اور یہی چند کام کئے ہیں جو اناجیل اربعہ میں ہیں؟ ہرگز نہیں۔ علاوہ اس کے یہودی مؤرخوں اور دیگر اناجیل سے بھی ان باتوں کا پتہ لگتا ہے اور ان اناجیل کے زیادہ معتبر نہ ہونے کی وجہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے سب تاریخی واقعات غلط ہوں۔ دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ لوقا نے نہ کریا کو دیکھا نہ یحییٰ کو نہ حضرت عیسیٰ کو یہ مؤرخ سنی ہوئی باتیں لکھتا ہے جس پر گمان ہوسکتا ہے کہ یا راوی نے غلطی کی یا خود لوقا سے سہو ہوگیا یا نسخہ میں اور غلطیوں کی طرح یہ بھی واقع ہوئی اور جو تطبیق کرو تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ عدد زبان عرب میں انحصار کے لئے نہیں ہوتا۔ ہمارے عرف میں کہتے ہیں دو دن کی زندگی میں آدمی کیا کرتا ہے مراد تھوڑی زندگی سے اسی طرح تین روز سے یہ قلیل مدت مراد ہے جو تخمیناً دس مہینے مؤرخ نے بیان کئے۔ قرآن انجیل لوقا کی تصدیق کا مدعی نہیں۔ (تفسیر حقانی ۲/۵۸، ۵۹)

قرآن میں روح کے پسندیدہ مضامین نہیں ہیں

اعتراض:

قرآن کریم میں وہ مضامین نہیں پائے جاتے جو روح کے مقتضیات اور اس

کے پسندیدہ ہو سکتے ہیں۔

جواب: جو چیزیں روح کے مقاصد اور مقتضیات ہیں اور جو اس کی پسند اور چاہت کی چیزیں ہیں وہ صرف دو ہیں۔ کامل اعتقادات اور نیک اعمال۔

اور قرآن کریم ان دونوں قسم کے مضامین کو مکمل طور پر بیان کرتا ہے۔ اب ان چیزوں کے قرآن میں مذکور نہ ہونے سے جو علماء پروٹسٹنٹ کے خیال کے مطابق روح کے مقاصد میں سے ہیں قرآن کریم کا ناقص ہونا اسی طرح لازم نہیں آتا جس طرح توریت اور انجیل اور قرآن میں ان چیزوں کے مذکور نہ ہونے سے کوئی نقص لازم نہیں آتا۔ جو مشرکین ہند کے علماء یعنی برہموں کے خیال میں روح کی پسندیدہ ہیں۔ چنانچہ آپ نے برہموں کا یہ اعتراض سنا ہوگا کہ جانور کا ذبح کرنا محض کھانے اور لذت کے لئے ہے، اور روح کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ بلکہ عقل کے نزدیک بھی ناپسندیدہ حرکت ہے اس کا امکان ہی نہیں کہ اللہ کی طرف سے ایسے شنیع فعل کی اجازت دی جائے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ عیسائیوں کی جو کتاب اس قسم کے مضمون پر مشتمل ہوگی وہ بھی خدائی کتاب نہیں ہو سکتی۔ (بائبل سے قرآن تک ۲/۴۲۸)

کیا سب جاندار پانی سے پیدا ہوئے ہیں

اعتراض:

قرآن پاک میں ہے: **وجعلنا من الماء کل شیء حي.** ”اور ہم نے ہر جاندار کو پانی سے بنایا“ حالانکہ بہت سے جاندار ہیں جو پانی سے پیدا نہیں ہوئے جیسا کہ جن آگ سے پیدا ہوئے ہیں یا فرشتے نور سے اور خود حضرت آدم جن کی نسبت آیا ہے **خلقہٗ من تراب** اور وہ جانور جن کو حضرت مسیح علیہ السلام گارے کا بنا کر اس میں کچھ پھونکتے تھے کہ وہ اڑ جاتا تھا پھر سب جانداروں کا پانی سے پیدا ہونا نہ پایا گیا۔

جواب(۱): لفظ اگرچہ عام ہے مگر قرینہ مخصص موجود ہے اس لئے کہ اللہ تعالی اولم یر سے وہ چیزیں بیان کرتا ہے جوان کے دیکھنے میں آتی ہیں اور یہ چیزیں انہوں نے کب دیکھی ہیں پس یہ اس میں شامل نہیں یا بیان اکثر یہ ہے جس کو محاورہ عرب میں کلیہ سے تعبیر کیا کرتے ہیں اور عرف عام کا یہی کلیہ ہے۔
(تفسیر حقانی جلد۳/صفحہ۲۹۰)

جواب(۲): من ماء صلہ کل دابۃ کا ہے نہ کہ خلق کا۔ یعنی جو جانور پانی سے بنتے ہیں ان کو اللہ تعالی نے ایسا بنایا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اصل جمیع مخلوقات کی پانی ہے پھر اس پانی سے اور عناصر پیدا ہوئے جیسا کہ جلد ثانی میں ہم نے بیان کیا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دابۃ سے مراد زمین پر چلنے والے جانور ہیں جن کی پیدائش پانی سے ہے پس جن اور ملائکہ ان میں داخل نہیں من ماء کو نکرہ لا کر یہ بتا دیا کہ ہر نوع دابۃ کو اس پانی سے پیدا کیا جس کے ساتھ وہ مخصوص ہے۔ بعض جانور پیٹ کے بل چلتے ہیں سانپ وغیرہ۔ بعض دو پاؤں سے انسان وغیرہ۔ بعض چار سے گائے بھینس گھوڑا وغیرہ اور بھی عجائب مخلوقات ہیں یا کسی کے چار سے زیادہ پاؤں ہیں کھنکھجورا وغیرہ تو ان سب کی طرف یخلق اللہ مایشاء ان اللہ علی کل شیء قدیر میں اشارہ کر دیا۔ (تفسیر حقانی جلد۳/صفحہ۲۹۲)

اختلافات مضامین کا اعتراض

اعتراض:

قرآن میں جا بجا معنوی اختلاف پائے جاتے ہیں، مثلاً آیت:

لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ .

دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ اور

فَذَکِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَکِّرٌ لَّسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُسَیْطِرٍ .

پس اے نبی! آپ نصیحت کیجئے آپ نصیحت کرنے والے ہی تو ہیں۔آپ ان کے داروغہ نہیں۔

اور

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ.

ترجمہ:- بلاشبہ آپ کہہ دیجئے کہ تم اللہ اور اس کے رسولؑ کی اطاعت کرو۔پھر اگر وہ اعتراض کریں تو رسول کے اعمال رسول کے ساتھ ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ، اور اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول پر سوائے واضح تبلیغ کے اور کوئی ذمہ داری نہیں۔

یہ تمام آیتیں ان آیات کے مخالف ہیں جن میں جہاد کا حکم پایا جاتا ہے۔

اسی طرح اکثر آیات میں کہا گیا ہے کہ مسیح انسان اور صرف رسول ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے موقع پر اس کے خلاف یہ کہا گیا ہے کہ وہ نوع انسانی میں سے نہیں ہیں بلکہ ان کا مقام بلند تر ہے۔ پہلا مضمون سورۂ نساء کی آیت ذیل میں ہے:

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ.

ترجمہ:- بلاشبہ عیسیٰ ابن مریم اللہ کے رسول اور اللہ کا وہ کلمہ ہیں، جو اللہ نے مریم پر نازل کیا، اور اللہ کی روح ہیں۔

اور دوسرا مضمون سورۂ تحریم کی آیت ذیل میں موجود ہے:

وَمَرْيَمَ ابْنَةَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا.

ترجمہ:۔ اور مریم بنت عمران جس نے اپنی شرمگاہ کو (بدکاری سے) محفوظ رکھا، تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی۔

(عیسائیوں کے نزدیک یہ) بڑے زبردست اختلافات ہیں۔اسی لئے میزان الحق میں مصنف نے اس کتاب کے باب ۳ فصل ۳ میں انہی دو کے بیان پر اکتفاء کیا ہے۔

جواب:

(۱) پہلے اختلافات کی نسبت تو یہ کہا جائے گا کہ اس کو اختلاف کہنا ہی غلط ہے۔ بلکہ یہ حکم جہاد کے حکم سے قبل کا ہے۔ جب جہاد کا حکم نازل ہوا تو پہلا حکم منسوخ ہو گیا اور نسخ کو اختلاف معنوی کہنا بالکل لغو ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ توریت اور انجیل کے تمام احکام منسوخہ میں اختلاف معنوی تسلیم کیا جائے۔ اسی طرح مطلقاً توریت اور انجیل کے احکام میں بھی تضاد مانا جائے۔ اس کے علاوہ ارشاد خداوندی لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنَ. منسوخ نہیں ہے اور اس حکم کا جہاد کے حکم کے ساتھ کوئی تعارض بھی نہیں ہے۔

(۲) دوسرے اختلاف کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں قسم کی آیات ہرگز اس پر دلالت نہیں کرتیں کہ عیسیٰ ابن مریم نوع انسان میں سے نہیں ہیں۔ آیات مذکورہ سے یہ معنی سمجھنا محض فاسد خیالی اور لغویات ہے۔ تعجب اور حیرت تو یہ ہے کہ یہ عقلمند ان اختلافات اور غلطیوں کو نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے جو ان کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ جن کا نمونہ آپ اظہار الحق میں پہلے باب کی تیسری فصل میں دیکھ سکتے ہیں۔

(اظہار الحق ۴۲۹/۲)

قرآن کریم ایک دم کیوں نازل نہیں ہوا؟

اعتراض:

قرآن کریم کا نزول تھوڑی تھوڑی مقدار میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تیئس (۲۳) برس میں ہوا۔ تمام قرآن ایک دم نازل نہیں ہوا۔

جوابات:

(۱) حضور ﷺ چونکہ پڑھے لکھے نہ تھے، اس لئے اگر سارا قرآن ایک دم نازل ہوتا تو اندیشہ تھا کہ آپ ﷺ اس کو ضبط اور محفوظ نہ کر سکیں گے۔ بھول جانے کے قوی امکانات تھے۔

(۲) اگر قرآن کریم پورا ایک دم نازل ہوتا تو ممکن تھا کہ آپ ﷺ لکھے ہوئے پر اعتماد کرتے اور یاد کرنے میں پورا اہتمام نہ ہوتا۔ اب جب کہ اللہ تعالی نے تھوڑا تھوڑا نازل کیا تو بسہولت اس کو محفوظ کر لیا۔ اور تمام امت کے لئے حفظ کی سنت جاری ہوگئی۔

(۳) پورا قرآن ایک دم نازل ہونے کی صورت میں اگر سارے احکام بھی اسی طرح ایک بار نازل ہوتے تو مخلوق کے لئے دشواری اور گرانی پیدا ہو جاتی۔ تھوڑا تھوڑا نازل ہونے کی وجہ سے احکام بھی تھوڑے تھوڑے نازل ہوئے۔ اس لئے ان کا تحمل امت کے لئے آسان ہوگیا۔

ایک صحابیؓ سے منقول ہے کہ اللہ تعالی کا ہم پر بڑا احسان و کرم ہے۔ ورنہ ہم لوگ مشرک تھے۔ اگر حضور ﷺ پورا دین اور سارا قرآن ایک دم لے آتے تو ہمارے لئے بڑا دشوار ہو جاتا۔ اور اسلام قبول کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ بلکہ ابتداء میں حضور ﷺ نے ہم کو صرف توحید کی دعوت دی۔ جب ہم نے اس کو قبول کر لیا اور ایمان کی دعوت اور اس کی شیرینی کا ذائقہ چکھ لیا۔ تو اس کے بعد آہستہ آہستہ تمام احکام ایک ایک کر قبول کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ دین کامل اور مکمل ہوگیا۔

(۴) جب آپ ﷺ وقتاً فوقتاً جبرئیل علیہ السلام سے ملاقات کرتے تو ان کے بار بار آنے سے آپ ﷺ کے دل کو تقویت حاصل ہوتی۔ جس کی وجہ سے اپنے فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی میں آپ ﷺ مضبوطی کے ساتھ مستعد رہے۔ اور جو مشقتیں نبوت کا

لازمہ ہیں ان پر صبر کرنے اور قوم کی ایذا رسانی پر ثابت قدم رہنے میں پختہ رہے۔

(۵) جب باوجود تھوڑا تھوڑا نازل ہونے کے اس میں اعجاز کی شرائط پائی گئیں تو اس کا معجزہ ہونا ثابت ہوگیا۔ کیونکہ اگر لوگ اس کے معارضہ پر قادر ہوتے تو بڑی آسانی کے ساتھ تھوڑی مقدار میں نازل شدہ حصے کے برابر کوئی کلام بنا سکتے تھے۔

(۶) قرآن کریم، ان کے اعتراضات اور موجودہ زمانے میں پیش آنے والے واقعات کے مطابق نازل ہوتا رہتا تھا۔ اس طریقے پر ان کی بصیرت میں ترقی اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں قرآنی فصاحت کے ساتھ غیبی امور کی اطلاع اور پیشین گوئی بھی شامل ہوتی جاتی تھی۔

(۷) قرآن کریم جب تھوڑی تھوڑی مقدار میں نازل ہوتا اور ادھر حضور ﷺ نے اس کے معارضہ کا چیلنج شروع ہی سے دیا تھا۔ تو گویا آپ ﷺ نے قرآن کے ہر ہر جزو کے بارے میں مستقل چیلنج کیا۔ جب وہ لوگ ایک ایک جزو کے معارضے سے عاجز آ گئے تو سارے قرآن کے معارضہ سے ان کا عاجز ہونا بدرجہ اولیٰ معلوم ہو گیا۔ اس طرح لوگوں کا نفسِ معارضہ سے عاجز ہو جانا قطعی طور پر ثابت ہو گیا۔

(۸) اللہ اور اس کے نبیوں کے درمیان سفارت کا منصب ایک عظیم الشان اور جلیل القدر عہدہ ہے۔ اب اگر قرآن کریم ایک دم نازل ہوتا تو جبرئیل علیہ السلام سے اس منصب اور عہدے کے شرف سے محروم ہو جانے کا احتمال تھا۔ قرآن کے تھوڑی تھوڑی مقدار میں نازل ہونے کی وجہ سے جبرئیل علیہ السلام کے لئے یہ شرف باقی رہا۔

(اظہار الحق ۲/۳۶۰)

حضور ﷺ جمع قرآن سے پہلے فوت ہو گئے

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

قرآن ابھی اپنی کسی بھی جامع کتابی حالت اور نہ ہی کسی طومار کی حالت میں تھا

جبکہ محمد عربی زمینی موت کا شکار ہوا۔

جواب: قرآن کریم، نبی پاک ﷺ کی حیات میں لکھا جاتا تھا۔ دیکھو قرآن شریف خود فرماتا ہے:

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا. (الفرقان: ۵)

ترجمہ: اور (کفار) کہنے لگے، یہ پہلے لوگوں کی نقلیں ہیں جن کو اس نے لکھوالیا ہے سو وہی لکھوائی جاتی ہیں اس کے پاس صبح و شام)۔

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اس آیت مبارکہ کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

ف: اوّل نماز کا وقت مقرر تھا، مسلمان حضرتؐ کے پاس جمع ہوتے جو نیا قرآن اترا ہوتا یاد کرنے کو لکھ لیتے۔ (تفسیر موضح القرآن)

اس کے علاوہ نبی اکرم ﷺ بھی قرآن مجید کو مختلف حضرات صحابہؓ سے لکھواتے تھے۔ جنہیں کاتب وحی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد تقی عثمانی تفسیر ''معارف القرآن'' کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کاتب وحی کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے۔ (فتح الباری ۱۸/۹)

اس زمانے میں چونکہ عرب میں کاغذ کمیاب تھا۔ اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں۔ البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ (ایضاً ۱۱/۹)

اس طرح عہد رسالت ﷺ میں قرآن کریم کا ایک نسخہ تو وہ تھا جو آنحضرت ﷺ نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا۔ اگرچہ وہ مرتب کتاب کی شکل میں نہیں تھا۔ بلکہ

متفرق پارچوں کی شکل میں تھا۔ (مقدمہ صف ۳۷)

قرآن مجید کی حفاظت کا دارومدار صرف کتابت پر نہیں تھا۔ بلکہ زبانی یاد کرنے (حفظ) پر تھا۔ اور قرآن مجید کے پہلے حافظ رسول اکرم ﷺ تھے۔

چنانچہ مولانا محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں:

چنانچہ ابتدائے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ زور حافظہ پر دیا گیا۔ شروع شروع میں جب وحی نازل ہوتی تو آپ ﷺ اس کے الفاظ کو اسی وقت دہرانے لگتے تھے۔ تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہو جائیں۔ اس پر سورۂ قیامہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ہدایت فرمائی کہ قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لئے آپ ﷺ کو عین نزول وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ ہرانے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ خود آپ ﷺ میں ایسا حافظہ پیدا فرما دے گا کہ ایک مرتبہ نزول وحی کے بعد آپ ﷺ اسے بھول نہیں سکیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ اِدھر آپ ﷺ پر آیات قرآنی نازل ہوتیں اور اُدھر وہ آپ ﷺ کو یاد ہو جاتیں۔ اس طرح سرکار دو عالم ﷺ کا سینہ مبارک قرآن کریم کا سب سے زیادہ محفوظ گنجینہ تھا۔ جس میں کسی ادنیٰ غلطی یا ترمیم و تغیر کا امکان نہیں تھا۔ پھر آپ ﷺ مزید احتیاط کے طور پر ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے۔ اور جس سال آپ ﷺ کی وفات ہوئی اس سال آپ ﷺ نے دو (۲) مرتبہ حضرت جبریلؑ کے ساتھ دور کیا۔

(صحیح بخاری مع فتح الباری، ص ۳۶ ج ۹، مقدمہ صفحہ ۳۵)

نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں بہت سے حضرات صحابہؓ نے قرآن مجید حفظ کیا تھا۔ ان میں سے مشہور حضرات صحابہؓ اور ان میں تین امہات المؤمنینؓ بھی

ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب لکھتے ہیں:

امام ابوعبید قاسمؒ بن سلام ان معلمین قراءات کے متعلق کتاب القراءات میں کہتے ہیں:

مہاجرین میں سے حضرت ابوبکرؓ: حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت ابو موسیٰ ؓ، حضرت سالمؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن زبیرؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عبداللہ بن السائبؓ، حضرت ابیؓ، حضرت معاذؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت زیدؓ، حضرت ابوزیدؓ، حضرت مجمع بن جاریہؓ، حضرت انس بن مالکؓ سے وجوہ قراءات منقول ہیں۔ اسی گروہ میں سے حضرت عیاشؓ اور آپ کے فرزند ابوالحارث عبداللہ بن عیاش قرشیؓ حضرت فضالہ بن عبیدہ انصاریؓ اور حضرت واثلہ بن اسقع لیثیؓ ہیں ان میں سے اکثر حضرات نے خود نبی ﷺ سے براہ راست اور بعض نے دوسرے صحابہؓ کے واسطہ سے قرآن پڑھا تھا اور تمام جماعت روزانہ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے سنتی رہتی تھی۔ اس برگزیدہ جماعت نے ہر حرکت واسکان اور حذف واثبات کو حضور ﷺ سے ضبط کیا تھا اور جس طرح پڑھا تھا اسی طرح تابعین کو پڑھا دیا۔

(شرح احادیث حروف سبعہ اور تاریخ قراءات متواترہ صفحہ ۲۲)

اگر قرآن حکیم، نبی کریم ﷺ کے دور مبارک میں ایک جلد اور کتابی صورت میں نہ تھا تو اس سے یہ دلیل اخذ کرنا کہ قرآن مجید آپ ﷺ کی وفات کے بعد جاتا رہا تھا یقیناً غلط ہے۔ کیونکہ پورا قرآن پاک اکثر حضرات صحابہؓ کے سینوں میں محفوظ اور مختلف اشیاء پر لکھا ہوا بھی موجود تھا۔ قراء اور حفاظ کی تعداد اتنی کثرت سے تھی کہ

آپ ﷺ کی وفات کے بعد جنگ یمامہ میں سات سو شہید ہوئے اور واپس بھی بہت آئے تھے۔ ان کے بعد باقی کتنے حفاظ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ و دیگر مقامات میں بھی موجود قرآن پاک سکھانے اور پڑھانے میں مصروف و مشغول تھے۔ ان کی پوری تعداد اللہ کو معلوم ہے۔ نتیجہ یہ کہ قرآن شریف سرکار دو عالم ﷺ کی وفات کے بعد بہت سے حضرات صحابہؓ اور تین امہات المؤمنینؓ (۱- حضرت عائشہ صدیقہؓ / ۲- حضرت حفصہؓ / ۳- حضرت ام سلمہؓ) کے مبارک سینوں میں اسی طرح محفوظ اور موجود تھا جس طرح انہوں نے امام الانبیاء ﷺ سے سیکھا اور پڑھا تھا۔

(جواب مسلم صفحہ ۹۴)

حفاظ صحابہؓ شہید ہو گئے تھے تو قرآن کہاں سے جمع ہو گیا

اعتراض (عیسائیوں کا اعتراض)

اپنی موت سے قبل محمد عربی نے کہا تھا کہ قرآن چار صحابہؓ سے لو۔ (جن کے سینوں میں قرآن تھا) مگر یہ چاروں صحابہ بھی قرآن کو تشکیل دیئے بغیر ہی جنگی معرکوں میں مارے گئے۔ تو پھر حقیقت میں قرآن کی تالیف اور تدوین یا تشکیل کرنے والا کون رہا؟

جواب: جو الفاظ خطوط وحدانی میں لکھے گئے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صرف یہ چار حضرات صحابہؓ ہی حافظ قرآن تھے۔ حالانکہ یہ بات صریحاً جھوٹ ہے کیونکہ ان کے علاوہ بھی اکثر حضرات صحابہؓ حافظ قرآن تھے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

یہ تو سچ ہے کہ جب سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قرآن مجید کو ایک جلد میں جمع کیا تو اس سے پیشتر حضرت سالم بن معقلؓ جنگ یمامہ میں شہید ہو چکے تھے مگر

(۱) حضرت ابن ام عبد یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ۳۲ھ میں۔

(۲) حضرت ابی بن کعبؓ ۱۹ھ میں۔

(۳) حضرت معاذ بن جبلؓ ۱۸ھ میں فوت ہوئے۔

(دیکھو مشکوٰۃ شریف کے آخر میں ''اکمال فی اسماءِ الرجال'')

اس صداقت کے پیش نظر یہ تینوں حضرات صحابہؓ اس وقت زندہ تھے۔ پس مسیحی مبشر کا ان تینوں حضرات صحابہؓ کے متعلق یہ کہنا کہ ''جنگی معرکوں میں مارے گئے''، سفید جھوٹ ہے۔

باقی رہا یہ کہ قرآن حکیم کی تالیف، تدوین اور تشکیل کیسے ہوئی؟ تو سماعت فرمائیے!

محبوب کبریا، امام الانبیاء ﷺ کی وفات، ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ میں ہوئی آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ بنے۔ آپ کے دور میں جنگ یمامہ ہوئی تو اس جنگ میں سات سو قراء اور حفاظ شہید ہوئے تو حضرت عمرؓ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر اسی طرح قراء اور حفاظ شہید ہوتے رہے تو قرآن مجید کا بہت سا حصہ ناپید ہو جائے گا تو آپ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت عالیہ میں عرض کیا۔ بہر حال صلاح و مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ واقعی قرآن کریم کو ایک جلد میں یکجا کرنا چاہیے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو اس عظیم اور نیک کام کو سرانجام دینے کے لئے منتخب فرمایا حضرت زیدؓ اس مقدس کام کے لئے نہایت موزوں اور بہت مناسب تھے کیونکہ یہ حافظ قرآن اور کاتب وحی تھے۔ حضرت زیدؓ نے ہمہ تن مصروف و مشغول ہو کر جن مختلف اشیاء پر قرآن مجید لکھا ہوا تھا ان سے اور دیگر حفاظ قرآن سے قرآن مجید ایک جلد میں جمع کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد کتنی مدت میں قرآن ایک جلد میں جمع کیا گیا۔ تو آنحضرت ﷺ کی وفات ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو ہوئی سرکار دو عالم ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ بنے اور آپ کی وفات ۱۷ جمادی الاخریٰ ۱۳ھ کو ہوئی۔ اس حساب سے آپؓ کی خلافت کا زمانہ دو برس تین ماہ نو دن بنتا ہے۔ اور جنگ یمامہ کے بعد قرآن پاک کو جمع کرنے کا کام شروع ہوا اس حساب سے گو تھوڑا عرصہ بنتا ہے مگر اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ نبی اکرم

ﷺ کی وفات کے ایک سال بعد یعنی دوسرے سال میں قرآن کریم ایک جلد میں جمع ہو گیا تھا تو بجا ہے مگر تورات تو مختلف اشیاء پر بھی لکھی ہوئی نہ تھی۔ تورات کا حافظ بھی کوئی نہ تھا اور تورات تین سو ستاون سال گم ہونے کے بعد ملی تھی۔ تو بھی یہود و نصاریٰ اس بات کے قائل ہیں کہ وہ بالکل صحیح اور اس کا ایک حرف بھی ضائع نہیں ہوا تھا۔ ہم اہل اسلام کے نزدیک دور نبوت میں قرآن حکیم پورا مختلف اشیاء پر لکھا ہوا موجود۔ اس کے حفاظ بھی کثرت سے تھے اور نبی پاک ﷺ کی وفات کے ایک سال بعد یعنی دوسرے سال میں قرآن کریم ایک جلد میں موجود تھا۔ پھر بھی اہل کتاب موجودہ قرآن پاک کی صحت کے منکر ہیں انصاف و عدل کی دنیا میں اس طریق کار اور انداز کو بے انصافی کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد مرقس کے سن تالیف کی طرف توجہ فرمائیے! تو مسیحی دنیا میں سب سے پہلی انجیل مرقس ہے۔ اس کے سن تالیف کی بابت پادری جے علی بخش صاحب رقمطراز ہیں۔

> اگر یروشلم کی بربادی کے بعد لکھی جاتی تو ضرور ایسے اہم واقعہ کا کچھ ذکر اس میں ہوتا اس لئے یہ کہنا درست ہوگا کہ ۶۳ء و ۷۰ء کے مابین یہ انجیل لکھی گئی۔ (تفسیر مرقس صفحہ ۴)

پادری خیر اللہ صاحب لکھتے ہیں:

> یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ۶۸ء اور ۷۰ء (جب یروشلیم تباہ ہوا) کے درمیانی عرصہ میں لکھی گئی۔ (قاموس الکتاب صفحہ ۸۹۹)

اگر انجیل مرقس کا سن تصنیف ۶۸ء فرض کر لیا جائے پھر بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع جسمانی (۳۳ء) کے بعد کی ہے۔ نتیجہ یہ کہ عیسائیوں کے بقول انجیل مرقس حضرت مسیح علیہ السلام کے آسمان پر چلے جانے کے پینتیس (۳۵) سال بعد لکھی گئی۔

جس میں مسیحی علماء کو غلطیوں کا اقرار، انسانی کلام کی آمیزش کا اعتراف اور اس کا کوئی حافظ نہ ہونا بھی تسلیم ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود مسیحی علماء کے نزدیک انجیل مرقس الہامی اور بالکل صحیح ہے۔ قرآن مجید اور فرقان حمید جو سرور کائنات اور فخر موجودات ﷺ کی وفات کے ایک سال بعد کتابی صورت اور ایک جلد میں جمع کیا گیا جو کہ غلطیوں سے مبرا، انسانی کلام کی آمیزش سے منزہ اور اس کے بے شمار اور لاتعداد حفاظ دور نبوت سے لے کر آج تک لگاتار، متواتر اور مسلسل موجود ہیں۔ تو بھی قرآن پاک مسیحی علماء کے نزدیک غیر الہامی ہے۔

سورج میں لگے دھبے قدرت کے کرشمے ہیں
بت ہمیں کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے

(جواب مسلم ۹۶)

کیا حضرت عمرؓ کے جمع قرآن کے وقت کئی آیات غائب تھیں؟

قرآن کے مختلف نسخے اور بعض کو نذر آتش کرنا

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

حضرت عثمان نے کئی رائج الوقت قرآنی نسخوں کو اکٹھا کیا، بعض کو محفوظ کر لیا، بعض کو نذر آتش کر دیا۔

جواب: مولانا محمد تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں۔ چوتھا مشہور قول امام طحاویؒ کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم نازل تو صرف قریش کی لغت پر ہوا تھا۔ لیکن چونکہ اہل عرب مختلف علاقوں اور مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ہر ایک کے لئے اس ایک لغت پر قرآن کریم کی تلاوت بہت دشوار تھی۔ اس لئے ابتداء اسلام میں

اجازت دیدی گئی تھی کہ وہ اپنی علاقائی زبان کے مطابق مرادف الفاظ کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کرلیا کریں۔ چنانچہ جن لوگوں کے لئے قرآن کریم کے اصلی الفاظ سے تلاوت مشکل تھی۔ ان کے لئے خود آنحضرت ﷺ نے ایسے مرادفات متعین فرما دیئے تھے جن سے وہ تلاوت کرسکیں یہ مرادفات قریش اور غیر قریش دونوں کی لغات سے منتخب کئے گئے تھے اور یہ بالکل ایسے تھے جیسے تَعَالَ کی جگہ هَلُمَّ یا اَقْبِلْ یا اُدْنُ پڑھ دیا جائے۔ معنیٰ سب کے ایک ہی رہتے ہیں۔ لیکن یہ اجازت صرف اسلام کے ابتدائی دور میں تھی۔ جبکہ تمام اہل عرب قرآنی زبان کے پوری طرح عادی نہیں ہوئے تھے پھر رفتہ رفتہ اس قرآنی زبان کا دائرۂ اثر بڑھتا گیا۔ اہل عرب اس کے عادی ہوگئے اور ان کے لئے اسی اصلی لغت پر قرآن کی تلاوت آسان ہوگئی۔ تو آنحضرت ﷺ نے وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کریم کا آخری دور کیا۔ جسے عرضہ اخیرہ کہا جاتا ہے اس موقع پر یہ مرادفات سے پڑھنے کی اجازت ختم کردی گئی۔ اور صرف وہی طریقہ باقی رہ گیا جس پر قرآن نازل ہوا تھا۔ (مشکل الآثار للطحاوی صفحہ ۱۸۶ تا ۱۹۱، جلد ۴)

اس قول کے مطابق "سات حروف" والی حدیث اسی زمانے سے متعلق ہے۔ جب تلاوت میں مرادفات استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ اور اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے بلکہ مطلب یہ تھا کہ وہ اس وسعت کے ساتھ نازل ہوا ہے کہ اسے ایک مخصوص زمانے تک سات حروف پر پڑھا جاسکے گا اور سات حروف سے بھی مراد یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم کے ہر کلمہ میں سات مرادفات کی اجازت ہے۔ بلکہ مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ جتنے مرادفات استعمال کئے جاسکتے ہیں ان کی تعداد سات ہے اور اس اجازت کا مفہوم بھی یہ نہ تھا کہ ہر شخص اپنی مرضی سے جو الفاظ چاہے استعمال کرلے بلکہ متبادل الفاظ کی تعین بھی خود آنحضرت ﷺ نے فرمادی تھی۔ اور ہر شخص کو آپ ﷺ نے اس طرح قرآن سکھلایا تھا جو اس کے

لئے آسان ہو۔ لہذا صرف ان مرادفات کی اجازت دی گئی تھی جو حضور ﷺ سے ثابت تھے۔ (فتح الباری ص ۲۲:۲۳ ج ۹، علوم القرآن صفحہ ۱۰۴، ۱۰۵)

مولانا محمد تقی عثمانی ''حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن تیسرا مرحلہ'' کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر روم وایران کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا۔ ہر نئے علاقہ کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاہدین اسلام یا ان تاجروں سے قرآن کریم سیکھتے جن کی بدولت انہیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی۔ ادھر آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا۔ اور مختلف صحابہ کرامؓ نے اسے آنحضرت ﷺ سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا اس لئے ہر صحابیؓ نے اپنے شاگردوں کو اسی قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا جس کے مطابق خود اس نے حضور ﷺ سے پڑھا تھا۔ اس طرح قراءتوں کا یہ اختلاف دور دراز ممالک تک پہنچ گیا۔ جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے۔ اس وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن جب یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پہنچا اور یہ بات ان لوگوں میں پوری طرح مشہور نہ ہوسکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے۔ تو اس وقت لوگوں میں پوری طرح مشہور نہ ہوسکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے۔ تو اس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے۔ بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دینے لگے۔

ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر قراءتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے۔ دوسرے سوائے حضرت زیدؓ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا۔ پورے عالم اسلام میں کوئی ایسا معیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری امت کے لئے حجت بن سکے۔ کیونکہ دوسرے نسخے

افرادی طور پر لکھے ہوئے تھے۔ اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا۔ اس لئے ان جھگڑوں کے تصفیہ کی کوئی قابل اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دیئے جائیں جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انہیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ کونسی قراءت صحیح اور کونسی غلط ہے؟ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ اس کارنامہ کی تفصیل روایات حدیث کے ذریعہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ آرمینیا اور آذربائیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں اختلاف ہو رہا ہے۔ چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی وہ سیدھے حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے اور جا کر عرض کیا کہ امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ امت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلاف کا شکار ہو آپ اس کا علاج کیجئے۔ حضرت عثمانؓ نے پوچھا بات کیا ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے جواب میں کہا کہ میں آرمینیہ کے محاذ پر جہاد میں شامل تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ شام کے لوگ اُبی بن کعبؓ کی قراءت پڑھتے ہیں جو اہل عراق نے نہیں سنی ہوتی۔ اور اہل عراق عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت پڑھتے ہیں جو اہل شام نے نہیں سنی ہوتی۔ اس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔ حضرت عثمانؓ خود بھی اس خطرے کا احساس پہلے ہی کر چکے تھے۔ انہیں یہ اطلاع ملی تھی کہ خود مدینہ طیبہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک معلم نے اپنے شاگردوں کو ایک قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا اور دوسرے معلم نے دوسری قراءت کے مطابق۔ اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد جب باہم ملتے تو ان میں اختلاف ہوتا اور بعض مرتبہ یہ اختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا۔ اور وہ بھی ایک دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دیتے جب حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے بھی اس خطرے کی طرف توجہ دلائی تو حضرت عثمانؓ نے جلیل القدر صحابہؓ کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا اور فرمایا کہ

"مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دوسرے سے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے۔ اور یہ بات کفر کی حد تک پہنچ سکتی ہے۔ لہذا آپ لوگوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔"

صحابہؓ نے خود حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ

"آپ نے کیا سوچا ہے"

حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ

"میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک مصحف جمع کر دیں تا کہ کوئی اختلاف اور افتراق پیش نہ آئے"

صحابہؓ نے اس رائے کو پسند کر کے حضرت عثمانؓ کی تائید فرمائی۔

چنانچہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ

"تم لوگ مدینہ طیبہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں ایک دوسرے کی تکذیب اور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مجھ سے دور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور اختلاف کرتے ہوں گے۔ لہذا تمام لوگ مل کر قرآن کریم کا ایسا نسخہ تیار کریں جو سب کے لئے واجب الاقتدار ہو۔"

اس غرض کے لئے حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس (حضرت ابو بکرؓ کے زمانے کے) جو صحیفے موجود ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجئے، ہم ان کو مصاحف میں نقل کر کے آپ کو واپس کر دیں گے۔ حضرت حفصہؓ نے وہ صحیفے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے۔ حضرت عثمانؓ نے چار صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی۔ جو حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن العاصؓ، اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشامؓ پر مشتمل تھی۔ اس جماعت کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ حضرت ابو بکرؓ کے صحیفوں سے نقل کر کے کئی ایسے مصاحف

تیار کرے جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں۔ ان صحابہؓ میں سے چار حضرت زیدؓ انصاری تھے اور باقی تینوں حضرات قریشی تھے۔ اس لئے حضرت عثمانؓ نے ان سے فرمایا کہ

"جب تمہارا اور زیدؓ کا قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہو (یعنی اس میں اختلاف ہو کہ کونسا لفظ کس طرح لکھا جائے؟ تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھنا، اس لئے کہ قرآن کریم انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔"

بنیادی طور پر یہ کام مذکورہ چار حضرات ہی کے سپرد کیا گیا تھا۔ لیکن پھر دوسرے صحابہؓ کو بھی ان کی مدد کے لئے ساتھ لگا دیا گیا۔ یہاں تک کہ ابن ابی داودؒ کی روایت کے مطابق ان حضرات کی تعداد بارہ تک پہنچ گئی۔ جن میں حضرت ابی بن کعبؓ حضرت کثیر بن افلح ؓ، حضرت مالک بن ابی عامرؓ، حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی شامل تھے۔ ان حضرات نے کتابت قرآن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کام انجام دیئے۔

(۱) حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو نسخہ تیار ہوا تھا اس میں سورتیں مرتب نہیں تھیں۔ بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی۔ ان حضرات نے تمام سورتوں کو ترتیب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا۔

(۲) قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قراءتیں سما جائیں۔ اسی لئے ان پر نہ نقطے لگائے گئے اور نہ حرکات (زیر، زبر، پیش) تا کہ اسے تمام متواتر قراءتوں کے مطابق پڑھا جا سکے۔ مثلاً سرھا لکھا تا کہ اسے نَنشُرُھَا اور نُنشِزُھَا دونوں طرح پڑھا جا سکے کیونکہ یہ دونوں قراءتیں درست ہیں۔

(۳) اب تک قرآن کریم کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے مرتب کیا گیا ہو صرف ایک تھا۔ ان حضرات نے اس نئے مرتب مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں۔ عام طور پر مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے پانچ مصحف تیار

کرائے تھے۔لیکن ابو حاتم سجستانیؒ کا ارشاد ہے کہ کل سات نسخے تیار کئے گئے تھے۔ جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا اور ایک مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا۔

(۴) مذکورہ بالا کام کرنے کے لئے ان حضرات نے بنیادی طور پر تو انہیں صحیفوں کو سامنے رکھا جو حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں لکھے گئے تھے۔اس کے ساتھ ہی مزید احتیاط کے لئے وہی طریق کار اختیار فرمایا۔ جو حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانے کی جو متفرق تحریریں مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں۔ انہیں دوبارہ طلب کیا گیا اور ان کے ساتھ از سر نو مقابلہ کر کے یہ نئے نسخے تیار کئے گئے۔(علوم القرآن صفحہ ۱۸۷ تا ۱۹۱)

نیز، موصوف لکھتے ہیں:

(۵) قرآن کریم کے یہ متعدد معیاری نسخے تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمانؓ نے وہ تمام انفرادی نسخے نذر آتش کر دیئے جو مختلف صحابہؓ کے پاس موجود تھے۔ تاہم رسم الخط، مسلمہ قراءتوں کے اجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

حضرت عثمانؓ کے اس کارنامہ کو پوری امت نے بہ نظر استحسان دیکھا اور تمام صحابہؓ نے اس کام میں ان کی تائید اور حمایت فرمائی۔(علوم القرآن صفحہ ۱۹۲)

الحاصل حضرت عثمانؓ نے اختلاف قراءت کے مسئلہ کو احسن طریقہ اور عمدہ سلیقہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حل فرما دیا۔ اور اہل اسلام کو آئندہ کے فتنہ سے محفوظ کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے جو نسخے منگوائے اور جو نسخے تیار کروائے اس کا جواب مولانا موصوف کی تحریر میں موجود ہے۔

باقی رہا ''نذر آتش'' والا معاملہ۔ تو اس سے آپؓ پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا کیونکہ اسلام سے قبل بھی مذہبی دنیا میں ایسا ہوتا تھا۔

چنانچہ پادری فانڈر صاحب لکھتے ہیں:

بعض اوقات کہنہ مسودوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ نقل کر کے غایت درجہ کی تعظیم کے ساتھ جلا دیتے تھے تاکہ ان کی کسی طرح سے بے حرمتی و بے عزتی نہ ہونے پائے۔ (میزان الحق پہلا حصہ باب ۳)

چنانچہ "نذر آتش" کا اعتراض آپؓ پر وارد نہیں ہوتا اس لئے آپؓ کا دامن صاف ہے۔ (جواب مسلم ۱۰۴)

کیا قرآن کی کچھ آیات گم یا تحریف شدہ ہیں

اعتراض:

تفسیر اتقان وغیرہ کتب میں مذکور ہے کہ زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ یہ آیت لقد جاء کم رسول من انفسکم. میں نے تمام جگہ تلاش کی کہیں نہ ملی مگر ابوخزیمہ انصاریؓ کے پاس لکھی ہوئی ملی اور اسی طرح حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ ایک آیت لکھی ہوئی ہمارے ہاں پلنگ کے تلے پڑی تھی بکری کھا گئی۔ پس اسی طرح اور روایات بھی ہیں کہ جن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ممکن ہے کہ اسی طرح قرآن کی بہت آیات رہ گئی ہوں یا حضرت عثمانؓ اور ابوبکرؓ اور عمرؓ نے وہ آیات کہ جن میں اہل بیت کی مدح تھی درج نہ کی ہوں چنانچہ شیعہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے دس پارے قرآن مجید کے کم کر دیئے اور بعض شیعہ سورۂ حسنینؓ اور سورۂ علی اور سورہ فاطمہؓ پڑھا کرتے ہیں مگر قرآن میں ان کا کہیں پتہ نہیں معلوم ہوا کہ یہ سورتیں نکال ڈالیں۔

جواب: اس شبہ بے اصل کو بعض پادریوں نے اتنا پھیلایا کہ اس میں رسالے لکھ ڈالے۔

چنانچہ عبدالمسیح اور رامچند اور عمادالدین نے اس میں بڑا ہی زور مار کر قرآن مجید میں تحریف ثابت کی ہے لیکن جواب اس کا بہت سہل ہے اور وہ یہ کہ اگر ایسی ایسی دو

چار کیا سو دوسو روایات بھی ہماری کتب معتبرہ صحیح بخاری ومسلم وغیرہما سے نقل کی جائیں اور سب کو علی سبیل فرض محال تسلیم بھی کیا جائے بلکہ اس سے بڑھ کر ہماری طرف سے اتنی بات اور ملادی جائے کہ ایک آیت کیا بلکہ دس بیس آیتیں حضرت زید بن ثابتؓ کو کسی کے مصحف میں بھی نہ ملیں تھیں اور سو دو سو آیات حضرت عائشہؓ کی بکری بلکہ پورا یا نصف قرآن بھی کھا گئی تھی تب بھی قرآن میں باعتبار اصل مُنَزَّ ل کے ایک حرف کی کمی بھی نہ تھی ہاں اگر عیسائیوں کی اناجیل اور یہود کی تورات کی طرح قرآن کا دارومدار ایک آدھ نسخے پر ہوتا تو احتمال تھا کہ ایک دو ورق جانے سے کچھ قرآن جاتا رہا ہو مگر یہاں تو حفظ پر دارومدار تھا اور اول ہی قرن میں بے شمار ایسے پکے حافظ موجود تھے کہ جن میں سے ایک ایک قرآن کے لفظ لفظ پر حاوی تھا خیر آپ اس اہل زبان کے زمانہ کو تو جانے دیجئے۔ ذرا اس ضعف اسلام کے زمانے کو ہی دیکھ لیجئے۔ اگر اس وقت روئے زمین پر ایک نسخہ بھی قرآن کا نہ رہے (خدا نہ کرے) تو ایک ادنیٰ گاؤں کے لوگ اپنی یاد سے اس کو حرف بحرف (۱) لکھوا سکتے ہیں پس انجیل و تورات پر قیاس کر کے یہ گمان کرنا محض بیہودہ خیال ہے۔ رہا شیعہ کا وہ خیال سو وہ جہلا کی گپ ہے۔ آج تک سلف سے لے کر خلف تک کوئی محقق شیعہ بلکہ کوئی اہل اسلام بھی یہ عقیدہ نہیں رکھتا چنانچہ علماء شیعہ اس خیال کی براءت اپنی کتابوں میں بڑی شدومد سے کرتے ہیں۔ شیخ صدوق ابوجعفر محمد بن علی بابویہ اپنے رسالہ عقائد میں کہتے ہیں کہ "جو قرآن کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو دیا تھا وہی ہے کہ جو اب لوگوں کے پاس موجود ہے نہ اس میں کچھ کم ہوا ہے نہ زیادہ۔" تفسیر مجمع البیان میں کہ جو

(۱) اس مقام پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ابتداء عملداری انگریزی میں یہاں پادری لوگ آئے تو انہوں نے یہ خیال خام اس بات کے کہ یہاں مطابع تو ہیں نہیں قلمی نسخوں پر مدار ہے۔ مسلمانوں سے قرآن مجید کو گراں گراں قیمت کو خریدنے شروع کئے اور سالہا یہ معاملہ رہا چنانچہ میرٹھ اور دہلی

کے نواح کے بہت لوگ معمر اس کی شہادت دیتے ہیں وہ بزرگ کہتے ہیں کہ ایک پادری میرے دوست تھے میں نے ان سے پوچھا کہ سچ کہو یہ اس قدر نسخے تم کیوں خریدتے ہو؟ بالآخر بڑے اصرار سے اس نے یہ راز بتلایا کہ یہاں کے مشن کی یہ رائے ہے کہ ان لوگوں کے نسخے خرید لئے جائیں۔ پھر جب نہایت نایاب ہوں تو لندن سے مختلف نسخے قرآن مجید کے طبع کر کے یہاں کے مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کئے جائیں۔ پس مسلمانوں میں بڑا اختلاف قرآن میں پڑ جائے گا اور دین مسیحی کا خوب ظہور ہوگا۔ وہ کہتے ہیں میں نے کہا کہ یہ خبط ہے اس سے کچھ بھی نہ ہوگا ناحق روپیہ صرف کرتے ہو چنانچہ اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور خریدنا موقوف کیا۔ والعلم عنداللہ۔ منہ

جو شیعہ کے نزدیک معتبر تفسیر ہے سید مرتضٰی کہتے ہیں:

> جو قرآن کہ عہد پیغمبر علیہ السلام میں تھا وہی اب بھی ہے بلا تفاوت۔

قاضی نور اللہ شوستری اپنی کتاب مصائب النواصب میں لکھتے ہیں کہ

> یہ بات جو شیعہ کی طرف منسوب کی جاتی ہے کہ وہ قرآن میں تغیر و تبدل کے قائل ہیں محض غلط ہے محققین شیعہ میں سے کوئی اس کا قائل نہیں اور جو کوئی کہے تو اس کا کیا اعتبار ہے۔

ملا صادق شرح کلینی میں لکھتے ہیں:

> یہ قرآن اسی طرح امام مہدیؑ تک سالم رہے گا۔

محمد بن حسن عاملی کہتے ہیں کہ

> جو روایات پر ذرا بھی نظر کرے گا یقینی طور پر جان جائے گا کہ قرآن میں بچند وجوہ کمی زیادتی ناممکن ہے اور بالفرض کوئی صاحب یہ عقیدہ بھی رکھیں تو ہم اس کو دو وجہ سے قائل کرتے ہیں۔

(۱) یہ کہ ائمہ اہل بیت اور بنی ہاشم بالخصوص آل علیؓ اور خود علیؓ اور بنی فاطمہؓ نے کیوں اپنے مصاحف کو محفوظ نہ رکھا بلا سے شیعہ ہی میں وہ قرآن مروج اور مستعمل ہوتا۔ اور خیر اگر ظاہراً اس کو نہ رکھتے چھپا ہی کے رکھتے ورنہ حفظ ہی کے طور سے متوارث رکھتے بلکہ اصل حمیت اسلام تو یہ تھی کہ اس خیانتِ قرآن کے بارے میں مخالفین کو علی رؤس الاشہاد فضیحت کرتے اول تو جس طرح کچھ نہ کچھ لوگ ہر زمانے میں ان کے ساتھ ہوتے رہے ہیں اس وقت بھی ہوتے ورنہ بنی ہاشم تو ضرور ساتھ دیتے اور اگر کوئی نہ دیتا تو خدا تعالیٰ تو ساتھ ضرور ہی دیتا کہ جس نے قریش کے مقابلہ میں ایک یتیم بے کس بے زر یعنی سید المرسلین علیہ السلام کی مدد کی اور روئے زمین پر اس کا مذہب پھیلا دیا ورنہ خیر جس طرح امامت اور ریاست کے بارے میں نوبت بشہادت پہنچی اس خاص دینی کام میں پہنچتی تو کیا تھا زہے نصیب اب پادری صاحب فرمائیے وہ کونسا بے حمیت شیعہ ہے جو اپنے اکابر علیہم السلام کی نسبت یہ بد گمانیاں جائز رکھ کر برائے شگن کے لئے اپنی ناک کٹائے گا۔ اصحابہ ثلثہؓ کی ضد میں اپنے بزرگوں کو برا کہہ کے قرآن کی تحریف کا قائل ہو جائے گا۔

(۲) ان آیات کا کیا جواب ہے کہ جن میں خدا پاک نہایت تاکید کے ساتھ اس کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے قال تعالی: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ.

تنبیہ: ماسٹر رامچند ر نے اپنی کتاب تحریف القرآن اور پادری عماد الدین نے کتاب ہدایت المسلمین میں اور دیگر پوادر (پادریوں) نے اپنی اپنی تصانیف میں اس الزام کے دفاع میں (کہ تورات وانجیل میں متقدمین اہل کتاب کی بد دیانتی یا غفلت سے بیشمار تحریفات لفظی اور معنوی ہوئیں جس کے محققین اہل کتاب بھی مقر ہیں چنانچہ ہارن اور ہنری اور اسکاٹ اپنی تفاسیر میں اور پادری فنڈر اختتام مباحثہ دینی مطبوعہ اکبر آباد میں صدہا بلکہ ہزارہا ویریوس ریڈنگ یعنی غلطی کاتب کے قائل ہیں۔ اور بہت سی آیات اناجیل اور بعض ابواب کتب بائبل کو الحاقی مانتے ہیں) چندوہ

روایات ہماری کتب تفاسیر اتقان وغیرہ سے نقل کی ہیں کہ جن سے بعض آیات قرانیہ کا منسوخ التلاوۃ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اوران کو بڑے بسط کے ساتھ لکھ کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن مجید میں بھی تحریف ہے۔ مگر کسی قدر مختصر یہاں بھی بیان کرنا ضروری ہے۔

تفصیلی جواب:

تحریف لفظی یا معنوی خواہ بزیادت خواہ بہ نقصان کسی کتاب میں جب ثابت ہوتی ہے کہ جب صاحب کتاب کے بعد یا اس کی غیبت میں اس کی مرضی کے بغیر کی جائے۔

اور جب وہ خود کمی زیادتی اپنی کتاب میں کرے تو اس کو کوئی دانشمند تحریف نہ کہے گا۔

پس جب یہ قرار پاچکا تو اس اعتراض کا جواب دو طور پر ہے (۱) یہ کہ یہ روایات اگر صحیح تسلیم کی جائیں تو ان سے غایۃ مافی الباب یہ ثابت ہوگا کہ یہ آیات آنحضرت ﷺ کے روبرو کسی خدائی راز کی وجہ سے منسوخ التلاوۃ ہوگئیں اور اس کے اکثر اہل سلام قائل ہیں البتہ تحریف جب لازم آئے گی کہ کسی روایت صحیحہ سے یہ ثابت کردیا جائے کہ جو قرآن آنحضرت ﷺ بوقت اخیر دنیا میں چھوڑ گئے تھے اس میں بعد آنحضرت ﷺ کے کچھ کم زیادہ ہوگیا ہے۔ (۲) یہ کہ قرآن وہ ہے جو آنحضرت ﷺ سے بہ نقل متواتر بلاشبہ منقول ہے اوران روایات میں بعض تو محض بے اصل ہیں اور بعض جو صحیح ہیں تو خبر آحاد ہیں ان کے ذریعے جو جملے منقول ہیں ان کو ہم قرآن کی آیات نہیں کہہ سکتے۔ پس جب وہ قرآن کے جملے ہی نہیں تو اب ان کے قرآن میں نہ ہونے سے یہ نہیں لازم آتا کہ قرآن میں کمی ہوگئی یا تحریف واقع ہوئی کیونکہ تحریف جب کہتے ہیں کہ جب ان کا جزء قرآن ہونا ثابت ہوجاتا اور پھر یہ قرآن موجود میں نہ پائے جاتے بلکہ بعض محققین تو یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ روایات تواتر کو بھی پہنچ جائیں

تب بھی ان جملوں کو ہم جزء یا آیتِ قرآن نہ کہیں گے کیونکہ نسخ التلاوۃ بے اصل بات ہے پس وہ جو نص صحابہؓ سے منقول ہے کہ ہم اس آیت کو حضرت ﷺ کے عہد میں قرآن میں پڑھتے تھے لو کان لابن آدم و ادیان من الذھب لا بتغیٰ ثالثاً ولا یملأ جوف ابن آدم اِلّا التّراب و یتوبُ اللہ علیٰ من تابَ. یا اس کو جزء قرآن سمجھتے تھے۔ الشیخ والشیخۃ اذازنیا فارجموھما نکالاً مّن اللہ واللہ عزیز حکیم. یا یہ جملہ آیت میں شامل تھا: حافظوا علی الصّلوات والصّلوۃ الوسطیٰ العصر. وغیرہ ذٰلک تو اس کی یہ وجہ ہے کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام سمجھانے بطور تفسیر کے کوئی جملہ مذکورہ جملوں میں سے آیت کے ساتھ پڑھ دیا تو بعض لوگوں نے غلطی سے اس کو بھی قرآن کی آیت اور جب یہ جملے اصل قرآن میں نہ ملے نہ آنحضرت ﷺ نے ان کے لکھنے کا کاتبوں کو حکم دیا تو ان کو منسوخ التلاوۃ سمجھ گئے۔ پس امر حق یہی ہے کہ یہ قرآن بجنسہٖ وہی ہے جس کو جبرئیلؑ آسمان سے لائے تھے اس میں حرف بھی کم زیادہ نہیں ہوا۔ نہ آنحضرت ﷺ کے عہد میں نہ بعد میں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ۔

(مقدمہ تفسیر حقانی ۱/۸۷)

مسئلہ اختلاف قراءت بائبل میں بھی موجود ہے

اسلامی دنیا میں جو اختلاف قراءت کا مسئلہ پایا جاتا ہے ایک ہوش مند مسیحی عالم اس پر اعتراض نہیں کر سکتا کیونکہ یہ مسئلہ بائبل میں بھی موجود ہے۔

چنانچہ پادری ایچ، یو، ویٹمکن صاحب لکھتے ہیں:

مختلف نسخوں میں جو اختلاف قراءت تھا اس کو علمائے اسلام نے اپنے دعویٰ تحریف کے ثبوت میں پیش کیا لیکن دراصل یہ اختلاف قراءت خود اس امر کا ثبوت ہے کہ مسیحی علماء ان قدیم مقدس نسخوں کی اصلیت و

صداقت کی تحقیق و چھان بین میں کس قدر محتاط و بے لاگ تھے۔
(تفسیر متی صفحہ ۱۰)

یہ بات خصوصی طور پر یاد رہے کہ علماء اسلام نے کبھی بھی "اختلاف قراءت" کو "تحریف" قرار نہیں دیا کیونکہ علماء اسلام کے نزدیک، "تحریف، نسخ اور اختلاف قراءت" یہ تینوں مضامین الگ الگ اور جدا جدا ہیں۔ اس لئے پادری صاحب کا یہ لکھنا حقیقت کے خلاف ہے۔

پادری برکت اللہ صاحب ایم، اے لکھتے ہیں:

مسوراہی علماء کے دو بڑے فریق تھے۔ ایک فریق بابلون میں تھا۔ جو صدیوں سے یہودی علم اور فضل کا مرکز تھا۔ دوسرا فریق کنعان میں تھا۔ اور اس کا مرکز طبریاس تھا۔ جہاں مسورہ کا مطالعہ صدیوں تک جاری رہا۔ عبرانی کتب مقدسہ کے مطالعہ میں دونوں فریق ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ دونوں کی قراءتوں میں چند ایک اختلافات تھے جو نہایت باریک تھے۔ اور جو "مشرقی" اور "مغربی" قراءتیں کہلاتی ہیں یہ اختلافات ایسے باریک قسم کے تھے ان سے کسی لفظ کے معنی میں فرق نہیں پڑتا تھا۔ (صحت کتب مقدسہ صفحہ ۱۳۲)

انہوں نے اختلاف قراءت کا خیال رکھ کر اس کو بھی قلم بند کیا۔ لیکن عبرانی متن میں کسی دوسری قراءت کو جگہ نہ دی بلکہ جس قراءت کو وہ درست یا بہتر خیال کرتے تھے وہ اس کو حاشیہ میں لکھ دیتے تھے اس حاشیہ کی قراءت کو وہ "قری" (یعنی پڑھنا) کہتے تھے اور متن کی قراءت کو "کتب" (یعنی لکھی ہوئی) کہتے تھے۔ یوں قراءتوں کو الگ لکھ کر پڑھتے وقت وہ حاشیہ کی قراءت پڑھتے تھے لیکن نقل کرتے وقت وہ متن کی قراءت کو ہی متن میں جگہ دیتے تھے۔ (صفحہ ۱۳۳)

علاوہ ازیں مختلف زبانوں اور ملکوں کے نسخہ جات اور مختلف زبانوں کے تراجم کی

مدد سے ہم اصول تنقید کے ذریعے آسانی سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ان مختلف قراءتوں میں سے جو مختلف نسخوں میں ہم کو ملتی ہیں کونسی قراءت صحیح ہے؟ (صفحہ ۱۴۱)

پادری فانڈر صاحب لکھتے ہیں:

قرآنی اختلاف قراءت سے بائبل کا اختلاف قراءت بہت زیادہ ہے۔

(میزان الحق پہلا حصہ باب ۴)

پادری فانڈر صاحب قرآن مجید کی بعض آیات مبارکہ کا اختلاف قراءت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ان اختلافات سے معانی میں نہایت خفیف سی تبدیلی ہوتی ہے لیکن قرآن کی تعلیم نہیں بدلتی۔ پر اگر ان اختلافات کی بناء پر کوئی مسیحی کہے کہ قرآن محرف ہے تو علمائے اسلام کیا جواب دیں گے؟ ان کا یہ کہنا درست ہوگا کہ جو کوئی ایسا نتیجہ نکالتا ہے وہ محض لاعلمی اور ہٹ دھرمی کا اظہار کرتا ہے۔ (میزان الحق پہلا حصہ باب ۴)

بقول پادری فانڈر صاحب قرآن کریم کے مسئلہ اختلاف قراءت پر اعتراض کرنا ایک لاعلم اور ہٹ دھرم انسان کا کام ہے۔

(جواب مسلم صفحہ ۱۱۰)

نسخ قرآن پر اعتراض

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

جناب عالم غیب اور سب حکمت والا اسلامی اللہ کیوں اپنی ہی بعض قرآنی آیات کو منسوخ کر دیتا اور پھر اس کے بعد میں نئی آیات نازل کرنا پڑتیں تھیں۔

جواب: مسئلہ نسخ میں جو حکمتیں ہیں وہ اللہ تبارک وتعالی بہتر جانتا ہے۔ ویسے اس مسئلہ پر اعتراض کرنا بغض وحسد اور تعصب پر مبنی ہے کیونکہ بائبل میں بھی نسخ

کا مسئلہ موجود ہے ملاحظہ فرمائیے!

بائبل سے نسخ کی پہلی مثال:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ختنہ کے متعلق یہ حکم دیا۔

پھر خدا نے ابرہام سے کہا کہ تو میرے عہد کو ماننا اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت اسے مانے اور میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے اور جسے تم مانو گے سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے۔ اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کیا کرنا۔ اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ تمہارے ہاں پشت در پشت ہر لڑکے کا ختنہ جب وہ آٹھ روز کا ہو کیا جائے۔ خواہ وہ گھر میں پیدا ہو خواہ اسے کسی پردیسی سے خریدا ہو جو تیری نسل سے نہیں۔ لازم ہے کہ تیرے خانہ زاد اور تیرے زرخرید کا ختنہ کیا جائے اور میرا عہد تمہارے جسم میں ابدی عہد ہوگا۔ اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہ ہوا ہو اپنے لوگوں میں کاٹ ڈالا جائے کیونکہ اس نے میرا عہد توڑا۔

(پیدائش ۱۷:۹ تا ۱۴)

غور فرمائیے ختنہ کرنے کی کس قدر سخت اور بار بار تاکید ہے اور یہ حکم قیامت تک کے لئے اور ابدی ہے۔ یہ حکم صرف حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی شریعت میں ہی نہیں بلکہ تورات میں بھی موجود ہے۔

اور آٹھویں دن لڑکے کا ختنہ کیا جائے۔ (احبار ۱۲:۳)

اس مقام سے بھی صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ ختنہ کرانے کا حکم ابدی اور ہمیشہ کے لئے ہے۔

اسی حکم کے تحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی ختنہ کیا گیا۔

جب آٹھ دن پورے ہوئے اور اس کے ختنہ کا وقت آیا تو اس کا نام یسوع رکھا گیا۔ جو فرشتہ نے اس کے پیٹ میں پڑنے سے پہلے رکھا تھا۔
(لوقا۲:۲۱)

اور جب وہ خداوند کی شریعت کے مطابق سب کچھ کر چکے تو گلیل میں اپنے شہر ناصرۃ کو پھر گئے۔ (لوقا۲:۳۹)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع جسمانی کے بعد جب مسئلہ ختنہ پر اختلاف ہوا (اعمال ۱۵:۱،۲) تو چند افراد کو اس مسئلہ کے حل کے لئے یروشلیم بھیجا گیا تو وہاں جناب یعقوب نے اپنی ذاتی رائے سے حکم ختنہ کو منسوخ کر دیا۔ (اعمال ۱۵:۱۹) اس کے بعد باقی افراد نے بھی اس کے حق میں ووٹ دے دیئے اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔ (اعمال ۱۵:۲۸،۲۹) غور فرمایئے کہ ختنہ کرانے کا جو ابدی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حکم تھا اسے چند افراد نے منسوخ کر دیا۔

دوسری مثال

انہی دنوں میں حزقیاہ ایسا بیمار پڑا کہ مرنے کے قریب ہوگیا اور یسعیاہ نبی عاموص کے بیٹے نے اس کے پاس آکر اس سے کہا کہ خداوند یوں یوں فرماتا ہے کہ تو اپنے گھر کا انتظام کر دے کیونکہ تو مر جائے گا اور بچنے کا نہیں۔ تب حزقیاہ نے اپنا منہ دیوار کی طرف کیا اور خداوند سے دعا کی۔ اور کہا خداوند میں تیری منت کرتا ہوں یاد فرما کہ میں تیرے حضور سچائی اور پورے دل سے چلتا رہا ہوں اور جو تیری نظر میں بھلا ہے وہی کیا ہے اور حزقیاہ زار زار رویا۔ تب خداوند کا یہ کلام یسعیاہ پر نازل ہوا کہ جا اور حزقیاہ سے کہہ کہ خداوند تیرے باپ داؤد کا خدا یوں فرماتا ہے کہ میں نے تیری دعا سنی۔ میں نے تیرے آنسو دیکھے۔ سو دیکھ میں تیری عمر پندرہ برس اور بڑھا دوں گا۔
(یسعیاہ ۳۸:۱تا۵)

غور فرمایئے کہ خط کشیدہ الفاظ نمبر ایک میں حزقیاہ کی موت کی خبر ایسی پکی ہے جو

کبھی بھی ٹلنے کی نہیں مگر خط کشیدہ الفاظ نمبر دو میں موت کے ٹلنے اور حزقیاہ کی عمر بڑھانے کا ذکر ہے پس ہم اہل اسلام کے نزدیک خط کشیدہ الفاظ نمبر ایک ''منسوخ'' اور خط کشیدہ الفاظ نمبر دو ''ناسخ'' ہیں۔ الغرض پہلا حکم ''منسوخ'' ہے۔

تیسری مثال

مندرجہ ذیل مقام میں لفظ ''منسوخ'' دو مرتبہ موجود ہے۔

تب میں نے فضل نامی لاٹھی کو لیا اور اسے کاٹ ڈالا کہ اپنے عہد کو جو میں نے سب لوگوں سے باندھا تھا منسوخ کروں۔ اور وہ اسی دن منسوخ ہو گیا تب گلہ کے مسکینوں نے جو میری سنتے تھے معلوم کیا کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ (زکریاہ ۱۱: ۱۰، ۱۱)

لفظ ''منسوخ'' اور خط کشیدہ الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ''خداوند کے کلام'' میں مسئلہ نسخ پایا جاتا ہے۔

چوتھی مثال

مسیحی کلیسیا کے مایہ ناز رسول پولوس لکھتے ہیں:

''غرض پہلا حکم کمزور اور بے فائدہ ہونے کے سبب منسوخ ہو گیا۔''

(عبرانیوں ۷: ۱۸)

دیکھو مندرجہ بالا مقام میں مسئلہ نسخ موجود ہے۔ اور پولوس اللہ تبارک وتعالیٰ کے پہلے حکم کو منسوخ، کمزور اور بے فائدہ قرار دیتے ہیں۔

پانچویں مثال

بائبل کی ایک الہامی کتاب میں مسئلہ نسخ اس طرح بھی موجود ہے۔

اور تو جو کے پھلکے کھانا اور تو ان کی آنکھوں کے سامنے انسان کی نجاست سے ان کو پکانا اور خداوند نے فرمایا کہ اسی طرح سے بنی اسرائیل اپنی ناپاک روٹیوں کو ان اقوام کے درمیان جن میں میں ان کو آوارہ کروں گا کھایا کریں گے۔ تب میں نے کہا کہ ہائے خداوند خدا! دیکھ میری جان کبھی ناپاک نہیں ہوئی اور اپنی جوانی سے اب تک

کوئی مردار چیز جو آپ ہی مر جائے یا کسی جانور سے پھاڑی جائے میں نے ہرگز نہیں کھائی اور حرام گوشت میرے منہ میں کبھی نہیں گیا۔ تب اس نے مجھے فرمایا دیکھ میں انسان کی نجاست کے عوض تجھے کو بر دیتا ہوں سو تو اپنی روٹی اس سے پکانا۔

(حزقی ایل ۴: ۱۴ تا ۱۵)

مندرجہ بالا مقام کے خط کشیدہ الفاظ نمبر ایک منسوخ اور نمبر دو ناسخ ہیں۔ پس بائبل کے ان پانچوں مقامات سے مسئلہ نسخ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر قرآن کریم پر مسئلہ نسخ کی بابت کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ بائبل قرآن پاک سے پہلے کی ہے۔ ایسے میں مسئلہ نسخ پر مسیحی معترض کا قرآن پاک اس سے بری ہے۔

اے چشم اشکبار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو جل رہا ہے کہیں تیرا ہی گھر نہ ہو

(جواب مسلم ۱۱۶)

ابن مسعودؓ کے حوالہ سے تحریف قرآن کا اعتراض

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

ابن مسعود کے قرآنی نسخہ میں کیونکر ۱۱۲ سورتیں تھیں جبکہ قرآن میں ایک ۱۱۴ سورتیں ہیں۔

جواب: حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے قرآنی نسخہ میں جو دو سورتیں (معوذتین) کی کم تھیں۔ اس کا جواب حضرت مولانا محمد تقی صاحب عثمانی نے یہ دیا ہے۔

یہ واقعہ بالکل غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی پوری امت کی طرح معوذتین کو قرآن کریم کا جزء قرار دیتے تھے اور جن روایتوں میں یہ

بیان کیا گیا ہے کہ وہ ان دوسورتوں کے قرآن ہونے کے قائل نہ تھے وہ درست نہیں ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے قرآن کریم کی جو متواتر قراء تیں منقول ہیں ان میں معوذتین شامل ہیں۔ قراءات عشرہ میں سے حضرت عاصمؒ کی قراءات حضرت ابو عبدالرحمٰن سلمی، حضرت زر بن جیشؒ اور حضرت ابو عمرو الشیبانیؒ سے منقول ہے۔ اور یہ تینوں حضرات اسے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت حمزہؒ کی قراءات علقمہؒ، اسود، ابن وہبؒ، مسروقؒ، عاصم بن ضمرہؒ اور حارثؒ سے منقول ہے۔ اور یہ تمام حضرت اسے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ قراء ات عشرہ میں سے کسائیؒ اور خلفؒ کی قراءتیں بھی بالآخر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر ختم ہوتی ہیں۔ کیونکہ کسائیؒ حمزہؒ کے شاگرد ہیں۔ اور خلفؒ ان کے شاگرد کے شاگرد ہیں۔ اور اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ قراءات عشرہ کی ساری اسانید ساری دنیا میں سب سے زیادہ قوی اور صحیح اسانید ہیں اور نسلاً بعد نسل تواتر سے نقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔ اس لئے اگر کوئی خبر واحد ان متواتر قراءتوں کے خلاف ہو تو وہ یقیناً واجب الرد ہے۔ اور اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اسی بناء پر محقق علماء اور محدثین کی اکثریت نے ان روایتوں کو ضعیف، موضوع یا کم از کم نا قابل قبول بتایا ہے۔ جو حضرت ابن مسعودؓ کی طرف یہ باطل مذہب منسوب کرتی ہیں۔ ان علماء میں شیخ الاسلام علامہ نوویؒ، علامہ ابن حزمؒ، امام رازیؒ، قاضی ابو بکر بن عربیؒ، علامہ بحر العلومؒ اور آخری دور کے مشہور محقق عالم علامہ زاہد کوثریؒ شامل ہیں۔ اس پر شبہ ہو سکتا ہے کہ حافظ ابن حجرؒ اور علامہ نورالدین ہیثمیؒ نے تصریح کی ہے کہ ان روایتوں کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ پھر ان روایتوں کو غیر صحیح کیسے کہا جاتا ہے لیکن جو حضرات علم حدیث سے واقف ہیں ان پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ صرف راویوں کا ثقہ ہونا کسی روایت کے صحیح ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں کوئی علت یا

شذوذ نہ پایا جائے تمام محدثین نے "حدیثِ صحیح" کی تعریف میں یہ بات لکھی ہے کہ وہ روایت ہر قسم کی علت اور شذوذ سے خالی ہو۔ چنانچہ اگر کسی روایت میں علت یا شذوذ پایا جاتا ہو تو راویوں کے ثقہ ہونے کے باوجود اس کو صحیح قرار نہیں دیا جاتا۔

حافظ ابن الصلاحؒ اپنے "مقدمہ" میں تحریر فرماتے ہیں:

پس حدیث معلل وہ حدیث ہے جس میں کوئی علت معلوم ہوتی ہو جو اس حدیث کی صحت کو مجروح کرتی ہو۔ باوجودیکہ ظاہری نظر میں یہ حدیث صحیح سالم معلوم ہوتی ہو۔ اور یہ "علت" اس سند میں بھی واقع ہو جاتی ہے جس کے راوی ثقہ ہوتے ہیں اور جس میں بظاہر صحت کی تمام شرائط موجود ہوتی ہیں اور اس علت کا ادراک علم حدیث میں بصیرت رکھنے والوں کو مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ کبھی راوی کو منفرد دیکھ کر اور کبھی یہ دیکھ کر کہ وہ راوی کسی دوسرے راوی کی مخالفت کر رہا ہے اور اس کے ساتھ کبھی دوسرے قرائن بھی مل جاتے ہیں۔"

اس طرح حدیث کی ایک قسم "شاذ" ہے۔ اس کے راوی بھی ثقہ ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ اپنے سے زیادہ ثقہ راویوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی حدیث قبول نہیں کی جاتی۔ لہذا جب روایتوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ وہ معوذتین کو قرآن کریم کا جزء نہیں مانتے تھے علامہ نوویؒ اور ابن حزمؒ وغیرہ ان کو راویوں کے ثقہ ہونے کے باوجود مندرجہ ذیل تین وجوہ سے قابل قبول نہیں سمجھا۔

(۱) یہ روایتیں معلول ہیں۔ اور ان کی سب سے بڑی علت یہ ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ان قراءتوں کے خلاف ہیں جو ان سے بہ طریق تواتر منقول ہیں۔

(۲) مسند احمدؒ کی وہ روایت جس میں حضرت ابن مسعودؓ کا یہ صریح قول نقل کیا گیا ہے کہ انھما لیستا من کتاب اللہ. (معوذتین اللہ کی کتاب جزء نہیں ہیں) صرف عبدالرحمٰن بن یزید نخعیؒ سے منقول ہے اور کسی نے صراحۃً ان کا جملہ نقل نہیں کیا۔

اور متواترت کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ جملہ یقیناً شاذ ہے اور محدثین کے اصول کے مطابق ''حدیث شاذ'' مقبول نہیں ہوتی۔

(۳) اگر بالفرض ان روایتوں کو صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی بہر حال یہ اخبار احاد ہیں اور اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ جو خبر واحد متواتر اور قطعیات کے خلاف ہو وہ مقبول نہیں ہوتی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو قراءتیں تواتر کے ساتھ ثابت ہیں ان کی صحت قطعی ہے۔ لہذا ان کے مقابلے میں یہ اخبار آحاد یقیناً واجب الرد ہیں۔ اب صرف ایک سوال رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ روایتیں صحیح نہیں ہیں تو ان ثقہ راویوں نے ایسی بے اصل بات کیونکر روایت کردی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان روایتوں کی حقیقت یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ معوذتین کو قرآن کریم کا جزء مانتے ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے انہوں نے اپنے مصحف میں ان کو لکھا نہ ہو۔ اس واقعہ کو روایت کرتے ہوئے کسی راوی کو وہم ہوا اور اس نے اسے اس طرح روایت کردیا۔ گویا وہ انہیں سرے سے جزء قرآن ہی نہ مانتے تھے۔ حالانکہ حقیقت صرف اتنی تھی کہ معوذتین کو جزء قرآن ماننے کے باوجود انہوں نے اپنے مصحف میں ان کو نہیں لکھا تھا۔ اور نہ لکھنے کی وجوہ بہت سی ہوسکتی ہیں۔ مثلاً علامہ زاہد کوثری نے فرمایا ہے کہ انہوں نے معوذتین کو اس لئے نہیں لکھا کہ ان کے بھولنے کا کوئی ڈر نہ تھا کیونکہ یہ ہر مسلمان کو یاد ہوتی ہیں۔ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے مصحف میں سورۂ فاتحہ بھی نہیں لکھی تھی۔ اور امام ابوبکر الانباریؒ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اگر میں سورۂ فاتحہ لکھتا تو اسے ہر سورت کے ساتھ لکھتا۔ امام ابوبکرؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں ہر سورت سے پہلے سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ اس لئے میں نے اسے نہ لکھ کر اختصار سے کام لیا۔ اور مسلمانوں کے حافظے پر اعتماد کیا۔

بہر حال اگر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے مصحف میں سورۂ فاتحہ اور معوذتین تحریر نہ فرمائی ہوں تو اس کی بہت معقول توجیہات ہوسکتی ہیں اور ان سے یہ سمجھنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ وہ ان کو قرآن کریم کا جزء ہی نہیں مانتے تھے۔ جبکہ ان سے تواتر کے ساتھ قرآن ثابت ہے جس میں معوذتین بھی شامل ہیں۔

(علوم القرآن صفحہ ۲۲۳ تا ۲۲۷)

سورۂ احزاب میں پہلے ۲۰۰ آیات تھیں اب ۷۳ کیوں ہیں؟

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

سورۃ الاحزاب میں پہلے ۲۰۰ آیات تھیں اب صرف ۷۳ آیات رہ گئیں ہیں۔

جواب: آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ میں سورۃ الاحزاب کی بہت سی آیات منسوخ ہوگئی تھیں یہ تہتر سے زائد آیات بھی ان ہی میں سے ہیں۔

(نور الانوار صفحہ ۲۱۱)

الزامی جواب:

ان الفاظ کے بعد اب مسیحی دنیا ذرا اپنا حال بھی ملاحظہ کرلے!

مسیحی دنیا میں پہلی اور بڑی کلیسیا ''رومن کیتھولک'' ہے۔ اس کی بائبل کے عہد قدیم میں مندرجہ ذیل کتب زیادہ ہیں۔

(۱) طوبیاہ (۲) یہودیت (۳) حکمت

(۴) یشوع بن سیراخ (۵) باروک

(۶) مکابین اول (۷) مکابین دوم

پروٹسٹنٹ کی بائبل میں یہ کتابیں موجود نہیں کیونکہ یہ فرقہ انہیں غیر الہامی قرار دیتا ہے اور اس فرقہ کی بنیاد جناب لوتھر نے ۱۵۱۷ء میں رکھی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ ۱۵۱۶ء تک جو مسیحی لوگ ان کتابوں کو الہامی مانتے تھے وہ سچے تھے یا جو فرقہ ۱۵۱۷ء

سے ان کتابوں کے الہامی ہونے کا منکر ہے وہ سچا ہے؟ (جواب مسلم ۱۱۵)

قرآن میں پہلے اعراب نہیں تھے اب کیوں ہیں؟

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

لندن کے عجائب گھر میں جو سب سے قدیم ترین قرآنی نسخہ موجود ہے وہ کیوں تمام طرح کے زیر، زبر، مد اور حرکات سے محروم ہے؟ اور موجودہ قرآن کو کیونکر حرکات دینا پڑیں۔ جبکہ ایک زیر یا زبر یا مد یا حرکت کے شامل کرنے یا بدلنے سے عربی کے الفاظ کے مطلب میں آسمان اور زمین کا فرق پڑ سکتا ہے؟

جواب: بقول موصوف لندن کے عجائب گھر میں جو قرآن کریم کا نسخہ موجود ہے۔ وہ سب سے قدیم ترین قرآنی نسخہ ہے۔ چونکہ قدیم ترین قرآنی نسخوں میں اعراب نہیں تھے اس لئے اس پر بھی نہیں۔ کاش مسیحی مبشر صاحب اس قرآنی نسخہ کو عجائب گھر سے لے کر شائع کر کے منظر عام پر لائیں۔ تاکہ دنیا بھر کے لوگوں کو اس حقیقت کا بخوبی علم ہو سکے کہ سب سے قدیم ترین "قرآنی نسخہ" قرآن مجید کے "نسخہ مروج" میں صرف اعراب نہ ہونے اور ہونے کا فرق ہے۔ باقی الفاظ مبارک بالکل ایک ہی ہیں باقی رہا قرآن مجید پر اعراب لگانے کا مسئلہ تو اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے!

پادری برکت اللہ صاحب ایم، اے لکھتے ہیں:

اعراب کی ایجاد: ان مسوراہی فقہاء نے چھٹی اور آٹھویں صدی کے درمیان شامی تاثرات کے ماتحت حروف علت وحرکت اور صوت اور چھوٹے بڑے اعراب کو ایجاد کر کے عبرانی کتب سماوی کے الفاظ کے اس تلفظ کو جو قدیم زمانہ سے اہل یہود میں سینہ بسینہ چلا آتا تھا ہمیشہ کے لئے قائم اور برقرار کر دیا۔ یہی اعراب اس زمانہ کے تمام نسخوں میں موجود ہیں۔ ان اعراب کے وجود کی وجہ سے ہم عبرانی کے مختلف الفاظ یعنی ہم شکل الفاظ کے تلفظ اور ہم آواز الفاظ کے معنی میں تمیز کر سکتے ان فقہاء نے

مختلف الفاظ پر وقف اور لہجہ کی علامات بھی لگائی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم عبرانی الفاظ کا تلفظ اہل یہود کی اس قدیم طرز پر کر سکتے ہیں جو خداوند مسیح سے صدیوں پہلے علماء اسرائیل میں رائج تھی۔ اور عبارت کو اسی لب ولہجہ اور توقف کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں جس طرح قدیم فقہاء پڑھا کرتے تھے۔ (صحت کتب مقدسہ صفحہ ۱۴۰)

پادری خیر اللہ صاحب رقمطراز ہیں:

اعراب۔ وہ نشانات جو لفظوں کے حروف کی حرکات وسکنات کو ظاہر کرنے کے لئے مقرر کیے گئے اعراب کہلاتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب قدیم عبرانی (اور اسی طرح عربی بھی) اعراب کے بغیر لکھی جاتی تھی۔ چونکہ یہ زبان عام بولی جاتی تھی اس لئے صحیح تلفظ ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب عبرانی کی جگہ ارامی نے لے لی تو عوام عبرانی سے ناواقف ہو گئے۔

(قاموس الکتاب تحت اعراب صفحہ ۶۵)

اس لئے مسوراتی (دیکھئے مسوراتی) علماء نے ساتویں صدی عیسوی میں کچھ نشانات مقرر کیے جن سے صحیح تلفظ ممکن ہوا۔ (صفحہ ۶۵)

اب جبکہ ساتویں صدی عیسوی مکمل تک عہد قدیم پر اعراب لگائے گئے تو عہد قدیم کی پہلی کتاب تورات ہے تو ایسے میں سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات سے ساتویں صدی عیسوی تک اگر حساب لگایا جائے تو یہ مدت بہت بنتی ہے۔ اگر اس مدت مدید اور عرصہ بعید کو نظر انداز کر دیا جائے اور عہد قدیم کی آخری کتاب ملاکی سے ساتویں صدی عیسوی تک حساب لگائیں تو یہ مدت گیارہ سو سال بنتی ہے۔ کیونکہ کتاب ملاکی سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت تک تخمیناً چار سو سال بنتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ کتاب ملاکی کے گیارہ سو سال بعد عہد قدیم پر اعراب لگائے گئے۔ ہم اہل اسلام اس بات کے قائل ہیں کہ حجاج بن یوسف نے قرآن حکیم پر اعراب لگوائے تھے۔ اور اس کی وفات ۹۵ھ میں ہوئی۔ اس حقیقت کے پیش نظر

اگر بالفرض محال یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اس نے اپنی زندگی کے آخری سال میں اعراب لگوائے تھے۔ تو یہ بات پہلے تحریر کی جا چکی ہے کہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قرآن مجید کو ایک جلد میں جمع کروایا تھا۔ تو آپؓ کی وفات ۱۳ھ کو ہوئی تو اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے تقریباً بیاسی (۸۲) سال بعد قرآن مجید پر اعراب لگائے گئے تو اس وقت قرآن مجید کے بے شمار اور لا تعداد حفاظ بھی موجود تھے۔ تو معترض کی ''نرالی عقل'' کے نزدیک قرآن مجید پر اعراب لگانے سے عربی زبان میں فرق کا امکان ہے۔ اور عہد قدیم جس کا ایک بھی حافظ نہ تھا اور ملاکی سے گیارہ سو سال بعد اس پر اعراب لگائے گئے تو معترض کی ''عقل سلیم'' کے نزدیک عبرانی زبان میں فرق کا امکان نہیں۔ اس مقام پر یہ بات بالکل درست، صحیح اور بجا ہے کہ یہ طریق کار صرف عداوت اسلام ہے۔ (جواب مسلم صفحہ ۱۰۰)

حضورؐ لکھ پڑھ سکتے تھے یا نہیں

اعتراض: (منکرین حدیث کا اعتراض)

چہارم قرآن اور تاریخ ہر دو شاہد ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نہ لکھ سکتے تھے اور نہ لکھی ہوئی چیز پڑھ سکتے تھے لیکن بخاری میں ہے کہ وہ لکھ سکتے تھے (دو اسلام ص ۱۹۵) پھر آگے وہ حدیث نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں:۔

وَكَتَبَ هذا ما قاضی محمد بن عبد الله الخ پس رسول اللہ ﷺ نے لکھ دیا کہ یہ وہ فیصلہ ہے جو محمد بن عبد اللہ نے تسلیم اور طے کیا ہے الخ پھر آگے لکھتے ہیں کہ بخاری کی ایک اور روایت (ج ۲ ص ۱۳۵) بتلاتی ہے کہ حضور نے رسول اللہ کا لفظ کھرچ ڈالا تھا اور کاتب نے ابن عبد اللہ کے الفاظ کا اضافہ کردیا تھا اسی حدیث پر باقی محدثین اعتماد کرتے ہیں اور تاریخ بھی اسی کی تائید کرتی ہے اس لیے لکھنے والی حدیث غلط ہے۔ (بلفظہٖ دو اسلام ص ۱۹۵ و ص ۱۹۶)

جواب: ٹھیک ہے کہ جناب رسول ﷺ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ آپ نے رسول اللہ کا لفظ کھرچ دیا تھا لیکن بخاری کی کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ لکھ سکتے تھے یہ برق صاحب کی خود اپنی اختراع ہے درحقیقت بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے کاتب حضرت علیؓ کو لکھنے کا حکم دیا تھا اور انہوں نے لکھا تھا آنحضرت ﷺ کی طرف لکھنے کی نسبت مجازی طور پر کی گئی ہے دراصل آپ نے حکم دیا تھا علامہ نوویؒ لکھتے ہیں کہ:۔

كتب معناه امر بالكتابة كما يقال رجم ماعزاً وقطع السارق وجلد الشارب اى امر بذلك واحتجوا بالرواية الاخرىٰ فقال لعلىؓ اكتب محمد بن عبد الله.

(نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۱۰۵)

(ترجمہ) كَتَبَ کا معنی یہ ہے کہ آپ نے لکھنے کا حکم دیا تھا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور نے ماعزؓ کو سنگسار کیا چور کا ہاتھ قطع کیا شرابی کو سزا دی یعنی آپ نے ان کو سزا دینے کا حکم دیا تھا جمہور کہتے ہیں کہ یہ مطلب اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ دوسری روایت میں تصریح ہے کہ آپ نے حضرت علیؓ کو لکھنے کا حکم دیا تھا۔

اور حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ:

وهذه محمولة علىٰ الرواية الاخرىٰ ثم امر فكتب.

(تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۴۱۷)

كَتَبَ کی روایت دوسری روایت پر حمل کی گئی ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پھر حضور نے حکم دیا پس معاہدہ لکھا گیا اور اس اسنادِ مجازی کے وقوع اور اس کے صحیح ہونے پر قرآن کریم حدیث اور عرف سبھی متفق ہیں چنانچہ قرآن کریم میں یہود کی مذمت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔:

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا. (پ ۴ ال عمران۔ رکوع ۱۹)

اب لکھ رکھیں گے ان کی بات۔

کیا برق صاحب کے نزدیک خدا تعالیٰ بھی قلم دوات وغیرہ کے ذریعہ سے خود لکھا کرتا ہے۔

خود برق صاحب لکھتے ہیں کہ کیا ہر انسان کے اعمال اللہ خود لکھ رہا ہے؟ ہر کرہِ سماوی کو وہ خود کھینچ رہا ہے؟ ہر مکھی اور مچھر کے انڈے میں سے اپنے ہاتھ سے بچہ بنا رہا ہے؟ (بلفظہٖ ایک اسلام ص ۲٦٦)

اور اگر وہ خود نہیں لکھتا بلکہ فرشتوں کو لکھنے کا حکم دیتا ہے تو کیا کتابت کی نسبت مجازی طور پر آمر ہونے کے لحاظ سے خدا تعالیٰ کی طرف صحیح نہیں اگر صحیح ہے تو حدیث کا بھی ایسا ہی معنی سمجھ لیں۔ (صرف ایک اسلام صفحہ ٦٦ تا ٦٧)

کیا قرآن بائبل سے ماخوذ ہے

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

اگر چہ چند اصول جو قرآن میں موجود ہوئے وہ تو پہلے ہی سے پاک توریت پاک زبور پاک انجیل میں موجود تھے اور ان کو چرا کر، اور توڑ موڑ کر، غلط مفہوم کے ساتھ غلط اور جھوٹا رنگ دے کر قرآن میں شامل کر لیا گیا؟

جواب: پوری بائبل سے یہ دکھایا جائے کہ "وضو" اور "اذان" نماز، حج، زکوٰۃ، روزہ، اعتکاف وغیرہ جیسے لاکھوں مسائل بائبل کی کس کتاب اور کون سے مقام سے چرائے گئے ہیں؟ اگر معترض بائبل سے اس بات کا جواب دینے سے قاصر و عاجز رہے تو پھر تسلیم کر لینا چاہیے کہ جس اللہ نے مخبر صادق ﷺ کو یہ دونوں حکم ارشاد فرمائے ہیں اسی نے آپ ﷺ پر باقی سارا دین نازل فرمایا ہے۔ پس چرانے توڑنے مروڑنے اور دیگر باتیں وہم و مراق ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ نے تورات کے بعض احکامات کی بابت ارشاد فرمایا تھا:

(اوّل) تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا"۔ (متی ۵:۲۱)
(دوم) تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا" (متی ۵:۲۷)
(سوم) پھر تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا"۔ (متی ۵:۳۳)
(چہارم) تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا"۔ (متی ۵:۳۸)
(پنجم) تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا"۔ (متی ۵:۴۳)

غور فرمائیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پانچ مرتبہ یہ الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ان سے صاف صاف پتہ چلتا ہے کہ آپؑ کے ان الفاظ کا مصداق "تورات" اور "یہودی" ہیں۔

ان الفاظ کے بعد آپؑ نے (متیٰ ۵:۲۱ تا ۴۴) تورات کے کئی احکامات میں تغیر و تبدل کیا ہے۔اس وجہ سے یہودی یہ بات کہتے ہیں کہ عیسائیت، یہودیت سے نکلی ہے۔
چنانچہ پادری برکت اللہ ایم،اے نے یہودی ربی ڈاکٹر کلاسز کا قول یوں نقل کیا ہے:

"یہ حق ہے کہ یہودیت سے مسیحیت پیدا ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ یہودیت اور مسیحیت میں مماثلت اور مشابہت ہے"۔

(اسرائیل کا نبی یا جہان کا منجی صفحہ ۹۳)

اب اگر اس بات کو مسیح مبشر صاحب کی زبان میں یوں نقل کر دیا جائے تو کوئی مبالغہ اور زیادتی نہ ہوگی۔

اگر چہ چند قانون جو انجیل متیٰ میں آموجود ہوئے وہ تو پہلے ہی سے پاک تورات اور بائبل کی دیگر پاک کتابوں میں موجود تھے اور ان کو چرا کر، اور توڑ مروڑ کر، غلط مفہوم کیساتھ،غلط اور جھوٹا رنگ دیکر انجیل متیٰ میں شامل کر لیا گیا؟۔

اور یہ اعتراض بالکل صحیح ہے جیسا کہ (متیٰ ۵:۲۱ تا ۴۴) سے ظاہر ہوتا ہے۔
دیکھئے مسیحی معترض یہودی ربی کے اس اعتراض کا کیا جواب دینگے؟!!

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا

میری آہِ آتش سے بال عنقا جل گیا۔ (جواب مسلم صفحہ ۱۷۶ تا ۱۷۸ مختصرا)

قرآن کے مضامین چوری شدہ ہیں اصل کتاب بید ہے

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

قرآن کے مضامین دوسری کتابوں سے چوری کیے گئے ہیں بید چونکہ سب سے پہلی کتاب ہے اس لئے یہی خدا کی اصل کتاب ہے۔

جواب: معترض کی یہ بات کہ بید سب سے پہلی کتاب ہے غیر مسلم ہے بلکہ واضح طور پر غلط ہے جیسا کہ معجزہ شق قمر کی بحث میں آپ اس کتاب میں اس کو ملاحظہ فرمائیں گے۔

اس اعتراض کا بطلان خود ہندوؤں کی کتابوں سے بھی ثابت ہے۔

(سوط اللہ الجبار ص ۲۶۹)

مقرض کو ضروری تھا کہ قرآن کے ان چوری کردہ مقامات کی نشاندہی کرتا محض اعتراض لگانا تو کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ عرب میں نزول قرآن اور ترتیب قرآن یعنی حضور اور صحابہ کے زمانہ میں نہ عرب میں کوئی ہندو تھا نہ ہندو کے بید۔

چنانچہ اب تک عرب کی یہی حالت آرہی ہے کہ وہاں نہ تو ہندو مذہب کا کوئی رواج ہے اور نہ ہی ہندو وہاں رہتے ہیں۔ اب چند سالوں سے جب سے عرب متمدن ہوئے ہیں بعض ہندو دولت کمانے کے لئے آتے جاتے ہیں۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ بید کی زبان خود ہندوؤں کے پنڈتوں اور پیشواؤں کو بھی نہیں آتی۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے ایسی غیر معلوم اور غیر مانوس زبان سے حضور اکرم ﷺ نے بید کے مضامین چوری کر کے کس طرح سے قرآن بنالیا تھا۔

یہ ایک ایسا الزام ہے جس کے کوئی سر پیر نہیں ہیں تہمت لگانے والے کو ایسی خرافات سے بالکل شرم نہیں آئی۔ (امداد اللہ)

کیا قرآن میں اختلاف ہے

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)
اس اختلاف کی سبب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے یہود و نصاری سے حکایات اور چیزوں کو سن کر آگے قرآن کی صورت میں نقل کیا ہے چونکہ باتیں پوری طرح یاد نہ ہو سکتیں اس لئے غلطی اور بھول میں پڑ گئے اور خود اپنی اس یادداشت کو بھی لکھنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے کیونکہ امی تھے۔

جواب: قرآن مجید میں کسی قسم کا کوئی سہو واقع نہیں ہوا۔ وہ عقائد جن میں قرآن نے یہود و نصاری سے مخالفت کی ہے ان کے متعلق کوئی عقل مند یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اختلاف سہو پر مبنی ہے دیکھئے الوہیت مسیح کے رد میں قرآن پاک کا یہ ارشاد واقع ہوا ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يَا بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاوٰهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ. (سورة المائدہ:۷۲)

(ترجمہ) وہ لوگ یقیناً کافر ہیں جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے حالانکہ حضرت مسیح (عیسیٰ) نے خود فرمایا تھا اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے بے شک جو اللہ کے ساتھ شرک کرے گا اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

اور اسی طرح سے تین خداؤں کے عیسائیوں کے قول کے رد میں یہ آیت نازل ہوئی۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اِلٰهٌ

ایک ''زندہ باد'' کی قسم کا نعرہ یا جیکارہ ہے لیکن متی کی یونانی سے ظاہر ہے کہ اس کے یونانی مترجم نے اس مقام کی عبرانی یا ارامی زبان کو نہیں سمجھا''۔(قدامت واصلیت اناجیل اربعہ جلد دوم صفحہ ۲۳۹)۔

پادری صاحب کے اس بیان سے یہ حقیقت کسی اہل علم پر پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ اس قسم کی غلطیوں سے یقیناً عبارت میں فرق پڑا اور مفہوم بھی بدل جاتا ہے ان غلطیوں کے علاوہ اناجیل اربعہ میں جو تضادات کا لشکر موجود ہے وہ الگ ہے۔

(جواب مسلم صفحہ ۲۱۱ تا ۲۱۲)

مسیحی دین منسوخ اور اسلام ناسخ ہے

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

مسلمان کیونکر توریت اور انجیل کی پاک الہامی تعلیمات کو رد کرتے ہیں جبکہ قرآن میں کسی ایک بھی آیت کا ایسا حوالہ نہیں جو کہ ثابت کر سکے کہ توریت زبور یا انجیل منسوخ ہو چکی ہیں۔

جواب: رسول اکرم ﷺ کے حق میں حضرت مسیح علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے''۔(یوحنا ۱۶:۱۲)

رسول اکرم ﷺ نے دین کی ان باتوں کو بیان فرما دیا جن کا بیان حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چھوڑ دیا تھا۔ بالآخر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس دین کی ابتدا سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے کی تھی اس دین کی انتہاء اور تکمیل نبی اکرم ﷺ پر فرما دی۔

چنانچہ باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْناً. (المائدة:۳)

جب دین مکمل ہو گیا تو اس سے پہلے کا غیر مکمل دین خود بخود منسوخ ہو گیا۔
اس بات کی تائید و تصدیق مسیحی کلیسا کے مایۂ ناز رسول جناب پولوس نے بھی کی ہے۔
"کیونکہ ہمارا علم ناقص ہے اور ہماری نبوت ناتمام۔ لیکن جب کامل آئیگا تو ناقص جاتا رہے گا۔" (کرنتھیوں ۱۳: ۹، ۱۰)
"غرض پہلا حکم کمزور اور بے فائدہ ہونے کے سبب سے منسوخ ہو گیا"۔
(عبرانیوں ۷: ۱۸) (جواب مسلم صفحہ ۸۶ تا ۸۸ مختصراً)

قرآن میں فحش گوئی کا رد

ترجمہ آیت: اور اس عورت کا تذکرہ کیجئے جس نے اپنے ناموس کی حفاظت کی پھر ہم نے اس عورت میں اپنے (حکم سے) روح پھونک دی اور اس کو اور اس کے بیٹے کو جہان والوں کیلئے نشانی بنا دیا۔ (سورۂ انبیاء: ۹۱)

اعتراض: (پنڈت سوامی دیانند کا اعتراض)
ایسی فحش باتیں خدا کی کتاب میں خدا کی تو کیا کسی شائستہ آدمی کی بھی نہیں ہو سکتیں جبکہ انسان ایسی باتوں کا لکھنا اچھا نہیں سمجھتے تو خدا کے سامنے کیونکر اچھا ہو سکتا ہے؟

جواب: سوامی جی! خیر تو ہے؟ کیسی فحش کی باتیں؟ ایک تو بتلائی ہوتی۔ کیا نیوگ کا ذکر آ گیا؟ کہئے تو سہی ہاں اب سمجھے کہ عورت کا ذکر آ گیا۔
سوامی جی! کہیں روح پھونک دینے کو تو فحش نہیں کہتے؟ نہیں ایسا کیوں کہنے لگے جب خود ہی ان باتوں کا ذکر کیا کرتے ہیں اور لوگوں کو دیا کھیان (وعظ) سنایا کرتے ہیں۔

سماجیو! سنو!
"حیض کے نمودار ہونے کے پانچویں دن سے لیکر سولہویں دن تک جو ہم بستری کا وقت ہے اس سے پیشتر کے چار دن ترک کر دینے چاہیں۔ باقی جو بارہ دن رہے۔ ان میں سے گیارہویں اور تیرھویں رات کو چھوڑ کر

ایک ''زندہ باد'' کی قسم کا نعرہ یا جیکارہ ہے لیکن متی کی یونانی سے ظاہر ہے کہ اس کے یونانی مترجم نے اس مقام کی عبرانی یا ارامی زبان کو نہیں سمجھا''۔ (قدامت واصلیت اناجیل اربعہ جلد دوم صفحہ ۲۳۹)۔

پادری صاحب کے اس بیان سے یہ حقیقت کسی اہل علم پر پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ اس قسم کی غلطیوں سے یقیناً عبارت میں فرق پڑا اور مفہوم بھی بدل جاتا ہے ان غلطیوں کے علاوہ اناجیل اربعہ میں جو تضادات کا لشکر موجود ہے وہ الگ ہے۔

(جواب مسلم صفحہ ۲۱۱ تا ۲۱۲)

مسیحی دین منسوخ اور اسلام ناسخ ہے

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

مسلمان کیونکر توریت اور انجیل کی پاک الہامی تعلیمات کو رد کرتے ہیں جبکہ قرآن میں کسی ایک بھی آیت کا ایسا حوالہ نہیں جو کہ ثابت کر سکے کہ توریت زبور یا انجیل منسوخ ہو چکی ہیں۔

جواب: رسول اکرم ﷺ کے حق میں حضرت مسیح علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے''۔ (یوحنا۱۶:۱۲)

رسول اکرم ﷺ نے دین کی ان باتوں کو بیان فرما دیا جن کا بیان حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چھوڑ دیا تھا۔ بالآخر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس دین کی ابتدا سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے کی تھی اس دین کی انتہاء اور تکمیل نبی اکرم ﷺ پر فرما دی۔

چنانچہ باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. (المائدۃ:۳)

جب دین مکمل ہوگیا تو اس سے پہلے کا غیر مکمل دین خود بخود منسوخ ہوگیا۔

اس بات کی تائید و تصدیق مسیحی کلیسا کے مایۂ ناز رسول جناب پولوس نے بھی کی ہے۔

"کیونکہ ہمارا علم ناقص ہے اور ہماری نبوت ناتمام۔ لیکن جب کامل آئیگا تو ناقص جاتا رہے گا۔" (کرنتھیوں ۱۳: ۹، ۱۰)

"غرض پہلا حکم کمزور اور بے فائدہ ہونے کے سبب سے منسوخ ہوگیا"۔ (عبرانیوں ۷: ۱۸) (جواب مسلم صفحہ ۸۶ تا ۸۸ مختصرا)

قرآن میں فحش گوئی کا رد

ترجمہ آیت: اور اس عورت کا تذکرہ کیجئے جس نے اپنے ناموس کی حفاظت کی پھر ہم نے اس عورت میں اپنے (حکم سے) روح پھونک دی اور اس کو اور اس کے بیٹے کو جہان والوں کیلئے نشانی بنادیا۔ (سورۂ انبیاء: ۹۱)

اعتراض: (پنڈت سوامی دیانند کا اعتراض)

ایسی فحش باتیں خدا کی کتاب میں خدا کی تو کیا کسی شائستہ آدمی کی بھی نہیں ہوسکتیں جبکہ انسان ایسی باتوں کا لکھنا اچھا نہیں سمجھتے تو خدا کے سامنے کیونکر اچھا ہوسکتا ہے؟

جواب: سوامی جی! خیر تو ہے؟ کیسی فحش کی باتیں؟ ایک تو بتلائی ہوتی۔ کیا نیوگ کا ذکر آ گیا؟ کہئے تو سہی ہاں اب سمجھے کہ عورت کا ذکر آ گیا۔

سوامی جی! کہیں روح پھونک دینے کو تو فحش نہیں کہتے؟ نہیں ایسا کیوں کہنے لگے جب خود ہی ان باتوں کا ذکر کیا کرتے ہیں اور لوگوں کو دیا کھیان (وعظ) سنایا کرتے ہیں۔

سماجیو! سنو!

"حیض کے نمودار ہونے کے پانچویں دن سے لیکر سولہویں دن تک جو ہم بستری کا وقت ہے اس سے پیشتر کے چار دن ترک کر دینے چاہیں۔ باقی جو بارہ دن رہے۔ ان میں سے گیارہویں اور تیرھویں رات کو چھوڑ کر

باقی دس راتوں میں عمل متعلقہ حمل اچھا ہے۔حیض کے نمودار ہونے کے دن سے لیکر سولھویں رات کے بعد ہم بستری نہیں کرنی چاہیے اور جب تک کہ دوبارہ وقت معینہ ہم بستری کا جیسا کہ بیان کیا گیا ہے نہ آوے تب تک نیز حمل ٹھہر جانے کے بعد ایک برس تک صحبت نہ کرے''۔ (ستھیارتھ پرکاش باب ۲ نمبر شروع)

اور سنو!

جیسے علانیہ بیاہ ویسے علانیہ نیوگ جس طرح بیاہ میں نیک اشخاص کی صلاح اور دولہن دولہا کی رضامندی ہوتی ہے ویسے نیوگ میں بھی ہونی چاہیئے یعنی جب عورت مرد کا نیوگ (تعریف نمبر ۴۸ میں دیکھو) ہونا ہو۔ تب اپنے خاندان میں مرد عورتوں کے سامنے ظاہر کریں، کہ ہم دونوں نیوگ اولاد پیدا کرنے کی غرض سے کرتے ہیں۔جب نیوگ کا مدعا پورا ہوجائے گا۔تب ہمارا قطع تعلق ہوگا۔اگر اس کے خلاف کریں تو گنہگار اور ذات یا راجہ کی سزا کے مستوجب ہوں۔مہینے میں ایک بار گربھادان (جماع) نہیں معلوم اس لفظ کا ترجمہ سنسکرت لفظ میں کیوں کیا گیا) کا کام کریں گے (توبہ توبہ ایسا فحش؟ سوامی جی کہاں ہیں؟) حمل کے قیام کے ایک برس بعد تک جدا رہیں گے۔(ستھیارتھ پرکاش باب ۴، نمبر ۱۲۳) (صفحہ ۱۱۲ مطبوعہ مہاشہ کرشن لاہور)

آریہ سجنو! تم کہو گے سوامی جی کا کیا؟ وہ تو ایک غیر الہامی آدمی تھے۔ الہامی نوشتوں میں ایسا نہ ہونا چاہئے۔تمہارا اگر یہ خیال ہو تو سنو! تمہارے الہامی نوشتے میں پرماتما کا قول ہے۔

''پورش (مرد) کا لنگ (ذکر) استری (عورت) کی یونی (فرج) میں گھسنے پر خصوصیت سے نطفہ چھوڑتا ہے''۔(یجروید باب ۱۹، منتر ۷۶)

سماجیو! بتلاؤ! جب انسان ایسی باتوں کا لکھنا اچھا نہیں سمجھتے تو خدا کیوں سمجھنے لگا یقین نہ ہو تو دونو عبارتیں (قرآن اور وید) کسی شریف برہمو وغیرہ کا سنا کر آزما لو۔

(حق پرکاش صفحہ ۱۸۵،۱۸۶)

محاسن اسلام وقرآن کے متعلق غیر قوموں کی شہادتیں:

جو اس مصرعہ کے مصداق ہیں **الفضل ماشهدت به الاعداء**

(الف) منقول از اخبار وکیل ۱۸ جون ۱۹۱۳ء

اسلام کے واجبات اور فرائض حفظ صحت

جرمنی کے مشہور علمی رسالہ ''دی ہائف'' میں نامور جرمن فاضل اور مستشرق علامہ جوا کیم دی یولف نے اسلام کے واجبات اور فرائض حفظ صحت پر ایک نہایت قابل قدر مضمون لکھا ہے جس کی نقل ذیل میں درج کی جاتی ہے وہ تحریر کرتا ہے کہ

''دین اسلام کے اصول وعقائد وقواعد کو اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی مانند ظاہر ہو جاتی ہے کہ موجودہ مسلمان ان کی پابندی سے کوسوں دور ہیں اور اگر مسلمانوں میں کوئی ایسی اولوالعزم روح پردۂ غیب سے شہود میں آئے جو ان کو از سر نو اسلام کے اصلی اور صحیح مرکز پر لے آئے تو اس میں کلام نہیں کہ ان کی قوت کا طرۂ افتخار آسمان تک جا پہنچے اور سیاسی اعتبار سے نہ سہی اخلاقی اجتماعی اور علمی پہلو سے وہ دنیا کی بساط پر ایک نہایت اہم مہرہ بن سکتے ہیں مجھے اس وقت اسلام کی سیاسی اہمیت سروکار نہیں بلکہ میں صرف اس کے ایک خاص پہلو پر بحث کرنا چاہتا ہوں جس پر اس وقت تک شاید کسی یورپین نے غور نہیں کیا۔ یہ پہلو ان احکام وقوانین سے تعلق رکھتا ہے جو قرآن کریم نے حفظان صحت اور تندرستی کے متعلق اپنے ماننے والوں پر فرض کئے ہیں میں نہایت وثوق کے ساتھ کہ سکتا ہوں کہ روئے زمین کی تمام کتب سماوی پر قرآن کو اس لحاظ سے خاص امتیاز حاصل ہے اگر ہم شاندار مگر سادہ واجبات و

فرائض حفظان صحت پر نظر کریں جو قرآن کریم میں مذکور ہوئے ہیں اور پھر اس امر پر غور کریں کہ ان کی پابندی کرنے والوں کو جنت الفردوس کے مستحق قرار دینے میں اس کی کیا حکمت ہے تو ہم پر روشن ہو جائے گا کہ اگر یہ صحیفہ آسمانی اور کلام ربانی ساکنان ایشیا کہ نہ ملتا تو ایشیا کا سادابا آفرین خطہ زمین یورپ کے حق میں اور بھی بلا خیز ہو گیا ہوتا۔

اسلام نے صفائی اور پاکیزگی اور پاکبازی کی صاف اور صریح ہدایات کو نافذ کر کے جرائم ہلاکت کو مہلک صدمہ پہنچا دیا ہے غسل اور وضو کے واجبات نہایت دور اندیشی اور مصلحت پر مبنی ہیں۔

غسل میں تمام جسم اور وضو میں ان اعضاء کا پاک صاف کرنا ضروری ہے جو عام کاروبار یا چلنے پھرنے میں کھلے رہتے ہیں منہ کو صاف کرنا اور دانتوں کو مسواک کرنا ناک کے اندرونی گرد و غبار وغیرہ کو دور کرنا یہ تمام حفظ صحت کے لوازم ہیں اور ان واجبات کی بڑی شرط آب رواں کا استعمال ہے جو فی الواقع جراثیم کے وجود سے پاک ہوتا ہے۔

حضرت محمد ﷺ نے لحم خنزیر میں اور بعضے ممنوع جانوروں کے اندر امراض ہیضہ وثان فالین بخار وغیرہ کا خطرہ دریافت کر لیا تھا۔

حیوانات کے ذبح کرنے کا جو طریقہ شارع اسلام نے تلقین کیا ہے وہ بہت ضروری ہے اور اہم ہے گرمی اور حدت جانوروں کے خون میں مواد فاسد پیدا کرتی اور ہزار ہا ایسی بیماریوں کا باعث ہوتی ہے جو نسل انسانی کے سم قاتل کا حکم رکھتی ہے ایسے بیمار جانوروں کے جراثیم پیدا کر دیتا ہے اس لئے ذبح کرنے کے عمل میں جانور کے خون کا کثرت سے خارج ہونا لازمی ہے غسل اور وضو سے جو صفائی اور پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور حفظ صحت کی ان دو شرطوں کے بعد تیسری اہم اور قابل قدر شرط ورزش جسمانی کی ہے یہ شرط نہایت آسانی کے ساتھ ادائے نماز سے پوری ہوتی ہے۔

نماز میں قیام و رکوع و قعود و سجود کی حرکات اعلیٰ حکمت عملی اور تدبر پر مبنی ہیں۔ اگر

اہل یورپ میں اسلامی نماز کا رواج ہوتا تو ہمیں جسمانی ورزش کیلئے نئی نئی ورزشیں حرکتیں ایجاد نہ کرنا پڑتیں ایشیاء کے گرم ملک میں انسانی جسم کے اندر چربی زیادہ پیدا ہوتی ہے اور سجدہ میں دونوں ہاتھ اور دیگر اعضاء ایک خاص کشش کے ساتھ پھیلانا اور سمیٹنا نامناسب فربہی کی مضرتوں کو دور کر دیتا ہے اسلام میں تعداد ازدواج کی اجازت قوم کی کمی نسل کی ناقابل تلافی نقصان سے محفوظ رکھنے کیلئے ایک بے نظیر اصول ہے جس کی ہمیں تہ دل سے قدر کرنی چاہیئے ، یہ ایک ایسا اصول ہے کہ اگر بوقت ضرورت اس کی پیروی کی جائے تو اس سے سلسلہ توالد و تناسل میں خلل انداز ہونے والے امراض پیدا نہیں ہونے پاتے آپ ایشیا میں عمر رسیدہ دوشیزہ لڑکیاں بہت کم پائیں گے جو زیادہ عمر تک شادی نہ ہونے کے سبب ہڑیا کی تکلیف دہ بیماری میں مبتلا ہوں منشیات و مسکرات کو حرام قرار دینا اسلام کا اتنا بڑا احسان ہے کہ جس کے بار گراں سے انسان کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا اور ہم مدعیان تہذیب و تمدن یعنی اقوام یورپ کو اس بارہ میں مسلمانوں پر حسد کرنا لازم ہے حیات مستعار کو ایک بے حقیقت سمجھنا اور جان کی مطلق پروانہ کرنا جس کے ساتھ ایک قادر مطلق ہستی کا پختہ اعتقاد بھی شامل ہے اور مزید براں حفظ صحت کے قدرتی و فطرتی اصول و قوانین جن میں انسانی فکر و تدبر کو کچھ دخل نہ ہو۔ یہ تمام باتیں جسم انسانی کی تمام طاقتوں اور قوتوں کی مدت دراز تک صحیح و سالم و مضبوط و مستحکم رکھنے کیلئے نہایت مؤثر اور یقینی وسائل ہیں۔

با ایں ہمہ اگر ایشیاء بعض خصائص میں ہم پر بمراتب فوقیت رکھنے کے باوجود اکثر امور میں ہم اہل یورپ سے بہت پس ماندہ ہے تو اس کے خاص وجوہ ہیں منجملہ ان کے ایک امر میں مختلف قوموں کا باہمی اختلاط بھی ہے جن میں سے اکثر کو اسلام کے ساتھ موہوم سا تعلق ہے اور ایک قصہ یہ بھی ہے کہ خالص عربی النسل مسلمانوں کی سوسائٹی میں دوسری قوموں کی عورتوں کا عقد نکاح کے ذریعہ سے داخل ہو جانا ان کی ہیئت اجتماعیہ کے فساد کا موجب ہوا ہے اور یہ قانون قدرت ہے کہ کامل چیز وہی ہے

جو خالص بھی ہو، بہر حال اسلامی تعلیمات کی یہ بڑی فضیلت اور منزلت اظہر من الشمس ہے بالخصوص اختلاط اجناس واقوام کے لحاظ سے اس کے اصول اور بھی قابل قدر اور لائق تحسین ہیں اس موقع پر یہ سوال قدرۃً دل میں پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں میں اسلام عملی صورت میں آجکل کہیں بھی موجود نہیں ہے اور اس کی بگڑی ہوئی ہیئت نے اپنے پیرووں کو تنزل اور ضلالت و جہالت کے عمیق غار میں دھکیل دیا ہے تو آخر ان کا انجام کیا ہوگا۔ ہمارے نزدیک اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی ہونا چاہیے کہ اگر اسلام نہ ہوتا تو ان قوموں کا جواب مسلمان کہلاتی ہیں کیا حشر ہوسکتا تھا اور ان ہی قوموں پر کیا منحصر ہے ہمیں خود اپنی نسبت یہ سوال کرنا چاہیے کہ اگر اسلامی تہذیب دنیا میں جلوہ فگن نہ ہوتی تو ہماری کیا کیفیت ہوتی آئیں احسان مندی کی رو سے ہم پر واجب ہے کہ عربی علوم وفنون نے ہمارے علوم وفنون پر جو حیرت انگیز اثر ڈالا ہے اس کو فراموش نہ کریں اگر عربوں نے فلسفہ ارسطو کا اپنی زبان سے ترجمہ نہ کیا ہوتا اور پھر عربوں کی معرکۃ الآراء تالیفات وتصانیف وفنی زبان میں ترجمہ ہوکر ہم تک نہ آئی ہوتیں تو ہمیں اس فلسفہ کی اصل یونانی کتابوں کے حصول سے بہت مدت پیشتر ہی اس کا علم کیونکر ہوسکتا چند سو سال قبل ہی کا زمانہ لیجئے یورپ کے تشنگان علوم کا چشمہ شیریں اندلس کے عربی اسلامی دار العلوم تھے اور سچ پوچھو تو آج بھی جب کہ اسلام روبہ تنزل ہے ہم اسلام کے سیاسی علوم سے بہت کچھ اخذ کرسکتے ہیں۔ فقط۔ (بؔ)

منقول از اخبار مدینہ بجنور ۹ مارچ ۱۹۱۷ء ۱۹ ج ٦۔

قرآن کے بارہ میں عیسائی محققین وغیرہ کی آراء

ڈاکٹر موریس نے جو فرانس کے نامور اہل علم مستشرق اور ماہر علوم عربیہ ہیں اور جنہوں نے گورنمنٹ فرانس کے حکم سے قرآن کریم کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا تھا اپنے ایک مضمون میں جو ''لا بارول فرانس رومان'' میں شائع ہوا تھا ایک اور فرانسیسی

مترجم قرآن موسیو سالمان ریناش کے اعتراضات کا جوابات دیتے ہوئے لکھتا ہے۔

قرآن کیا ہے؟ قرآن اگر کوئی ایسی منقبت ہوسکتی ہے جس پر تیس کروڑ اب ایک ارب چالیس کروڑ انسان فخر کر رہے ہیں وہ یہی ہے کہ مقاصد کی خوبی اور مطالب کی خوش اسلوبی کے اعتبار سے یہ کتاب تمام آسمانی کتابوں پر فائق ہے بلکہ ہم کہ سکتے ہیں کہ قدرت کی ازلی عنائت نے انسان کیلئے جو کتابیں تیار کی ہیں ان سب میں یہ بہترین کتاب ہے۔ اس کے نغمے انسان کی خیر وفلاح کے متعلق فلاسفہ یونان کے نغموں سے کہیں اچھے ہیں اس میں آسمان وزمین کے بنانے والے کی حمد وثناء بھری ہے خدا کی عظمت سے اس کا حرف حرف لبریز ہے جس نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں اور ہر ایک چیز کی اس کی استعداد کے مطابق رہنمائی کی ہے۔ (پیام آمین)

(1) منقول از اخبار وحدت ۸ فروری ۱۹۲۵ء ۲۶ ج ۲

مسٹر آرنلڈ وہائٹ نے اسلامک ریویو ماہ مئی ۱۹۱۶ء میں لکھا ہے۔

''وہ اسباق جو ہم عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید سے یہویوں کے توسط سے سیکھتے ہیں (نصف یورپ ایک یہودی یعنی جناب مسیح اور بقیہ نصف ایک یہودن یعنی جناب مریم کی پرستش کرتا ہے) ہمیں بنی نوع انسان کے ساتھ انسانیت سے پیش آنا اور تمام لوگوں کے خیالات کا احترام کرنا سکھاتے ہیں لیکن قرآن نے جس کو ایک ساربان کے فرزند نے لکھا مسلمانوں کو نہ صرف زبردست جنگ آرائی سکھائی بلکہ پرائیویٹ زندگی میں ہمدردی خیرات، فیاضی، شجاعت اور مسلمان نوازی کا سبق پڑھایا۔

(2) منقول از اخبار وحدت ۸ فروری ۱۹۲۵ء ۲۶ ج ۲

بابا نانک نے لکھا ہے۔ توریت، زبور، انجیل۔ ترے پڑھ سن ڈٹھے وید۔ رہی قرآن کتاب کل جگ میں پروار (جنم ساکھی کلاں ۱۴۷) (توریت، زبور، انجیل اور وید وغیرہ تمام پڑھ کر دیکھ لئے قرآن شریف ہی قابل قبول اور اطمینان قلب کی کتاب نظر آئی) رہی کتاب ایمان دی بیج کتاب قرآن (اگر سچ پوچھو تو سچی اور ایمان کی

کتاب جس کی ملاقات سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے قرآن شریف ہی ہے)

(3) منقول از اخبار وحدت ۸ فروری ۱۹۲۵ء ۲۶ ج ۲

پرفیسر اڈورڈ جی براؤن ایم اے ایم بی نے اپنی تالیفات دوائے لٹریری ہسٹری آف پرشیا" (تاریخ ادبیات ایران) میں ژندادستا اور قرآن پر غور کرتا اور اس کے مفہوم دمعانی کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں میرے دل میں اس کی قدر و منزلت زیادہ ہوتی جاتی ہے لیکن ژندادستا کا مطالعہ بجز ایسی حالتوں کے کہ اس کو علم الاوثان یا تحقیق لسانی یا اسی قسم کے دیگر اغراض کیلئے پڑھا جائے طبیعت میں تکان پیدا کرتا اور بار خاطر ہو جاتا ہے۔

(4) منقول از اخبار وحدت ۸ فروری ۱۹۲۵ء ۲۶ ج ۲

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی جلد ۱۶ صفحہ ۹۹ میں لکھا ہے۔ قرآن کے مختلف حصص کے مطالب ایک دوسرے سے بالکل متفاوت ہیں بہت سی آیات دینی واخلاقی خیالات پر مشتمل ہیں۔ مظاہر قدرت تاریخ الہامات انبیاء کے ذریعہ اس میں خدا کی عظمت مہربانی اور صداقت کی یاد دلائی گئی ہے۔ بالخصوص حضرت محمد ﷺ کے واسطہ سے خدا کو واحد اور قادر مطلق قرار دیا گیا ہے۔ بت پرستی اور مخلوقات کی پرستش کو (جیسا کہ جناب مسیح کو خدا کا بیٹا سمجھ کر پوجا جاتا ہے۔) بلالحاظ ناجائز قرار دیا گیا ہے قرآن کی نسبت یہ بالکل بجا کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا بھر کی موجودہ کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔

منقول از اخبار وحدت ۸ فروری ۱۹۲۵ء ۲۶ ج ۱۲

ڈاکٹر کنین آئزک لیٹر نے ۱۸۷۷ء میں بحیثیت صدر نشین کلیسائے انگلستان کے ایک تقریر کی تھا جو اسی زمانہ میں لندن ٹائمز میں شائع ہوئی تھا اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے جو تمدن کا جھنڈا اڑاتا ہے جو تعلیم دیتا ہے کہ انسان جو نہ جانتا ہو اس کو سیکھے جو بتاتا ہے کہ صاف کپڑے پہنو اور صفائی سے رہو جو حکم دیتا ہے

کہ استقلال و استقامت لازمی فرض ہے۔ بے شبہ دین اسلام کے تمام اصول ارفع ہیں اور اس کی خصوصیات شائستگی اور تمدن سکھلاتی ہے۔

(5) منقول از اخبار وحدت ۸ فروری ۱۹۲۵ء ۲۶ ج ۲

''ہربرٹ لیکچرز'' میں یہ فقرات موجود ہیں۔ اسلامی قانون قابل تعریف اصول پر مشتمل ہے اور زیادہ قابل تعریف یہ امر ہے کہ اسے ان اصول کی تعلیم و انجام دہی کی زبردست حمائل میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ ''شریعت اسلام نہایت اعلیٰ درجہ کے عقلی احکام کا مجموعہ ہے جن فضائل و اعمال کی اس میں ہدایت کی گئی ہے وہ ایسے برگزیدہ اور شائستہ ہیں کہ مشہور مسیحی قسیس کی ہدایتیں بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔

(6) منقول از اخبار وحدت ۸ فروری ۱۹۲۵ء ۲۶ ج ۲

مسٹر وڈول جس نے قرآن شریف کا ترجمہ شائع کیا۔ لکھتا ہے جتنا بھی ہم اس کتاب (قرآن) کو الٹ پلٹ کر دیکھیں اسی قدر پہلے مطالعہ سے اس کی نامرغوبی نئے نئے پہلوؤں سے اپنا رنگ جماتی ہے لیکن فوراً ہمیں مسخر کرلیتی۔ متحیر بنادیتی اور آخر میں ہم سے تعظیم کرا کر چھوڑتی ہے اس کا طرز بیان باعتبار اس کے مضامین و اغراض کے عفیف عالی شان اور تہدید آمیز ہے اور جابجا اس کے مضامین کی غایت و رفعت تک پہنچ جاتے ہیں۔ غرض یہ کتاب ہر زمانہ میں اپنا پرزور اثر دکھاتی رہے گی۔

پیغمبر اسلام سے ایک جرمنی ڈاکٹر کی عقیدت

جرمن کے مشہور ڈاکٹر کرخ نے ایک مضمون اخبار النصیحت میں لکھا تھا جس کا اقتباس ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ تاکہ یہ ظاہر ہو کہ حدیث شریف کی جو تعلیم ہے وہ ایسی معقول ہے کہ ایک سلیم الفطرت انسان خواہ وہ کسی مذہب و ملت کا ہو اس کو قبول کرے گا۔

ڈاکٹر مذکور لکھتا ہے کہ جس وقت سے مجھ کو نوشادر کا داء الکلب کیلئے تیر بہدف

علاج ہونا دریافت ہو گیا ہے اس وقت سے میں عظیم الشان نبی (یعنی محمد ﷺ) کی خاص طور پر قدر و منزلت کرتا ہوں اس انکشاف کی راہ میں مجھ کو انہیں کے مبارک قول کی شمع نور نے روشنی دکھائی میں نے ان کی وہ حدیث پڑھی جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس برتن میں کتا منہ ڈالے اس کو سات بار دھو ڈالو چھ مرتبہ پانی سے اور ایک مرتبہ مٹی سے یہ حدیث دیکھ کر مجھے خیال آیا محمد (ﷺ) جیسے عظیم الشان پیغمبر کی شان میں فضول گوئی نہیں ہوسکتی۔ضرور اس میں کوئی مفید راز ہے۔اور میں نے مٹی کے عنصروں کی کیمیائی تحلیل کر کے ہر ایک عنصر کا داء الکلب میں الگ استعمال شروع کیا۔اخیر میں نوشادر کے تجربہ کی نوبت آتے ہی مجھ پر منکشف ہو گیا کہ اس مرض کا یہی علاج ہے۔ آنحضرت (ﷺ) نے مٹی سے برتن دھونے کی رغبت کیوں دلائی اس کی وجہ یہ ہے کہ نوشادر ہمیشہ مٹی میں موجود رہتا ہے اور اگر آپ نے محض نوشادر ہی سے برتن دھونے کی ہدایت فرمائی ہوتی تو بسا اوقات اس کا ملنا غیر ممکن ہوتا اس لئے مٹی جو ہر وقت اور ہر جگہ پائی جاتی ہے برتنوں کی صفائی کیلئے بہترین ذریعہ صفائی تھا اور اسی طرح آنحضرت (ﷺ) کی حدیث **الحمی من فیح جهنم فاطفوا حرها بالماء** پر اطباء ہنسا کرتے تھے حالانکہ آپ کی غرض اس ارشاد سے یہ تھی کہ صفراوی بخار کا علاج آب سرد سے کرو چنانچہ اب تحقیقات نے واضح کر دیا کہ بخار کا علاج صرف ٹھنڈا پانی ہی نہیں ہے بلکہ برق آب ہے۔(سردی کے بخار میں گرم پانی سے ہاتھوں اور پاؤں کو دھونے سے بخار فوراً اتر جاتا ہے،انور)غرض کہ آنحضرت (ﷺ) کی بہت سی حدیثیں فن طب کی جان اور اصل الاصول ہیں اور تحقیق و تفتیش ان کی صداقت کاملہ کا اظہار کرتی ہے۔میں اس پیغمبر کا ادب و احترام کرتا اور کہتا ہوں کہ ابتدائے آفرینش آدم سے اب تک کوئی طبیب و حکیم دنیا میں آپ کا ہم پلہ پیدا نہیں ہوا۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَعَلیٰ اٰلِ محمد وبارک وَسَلِّمْ

منقول از اخبار وحدت ۸ فروری ۱۹۲۵ء ۲۱ ج ۲
(منقول از احکام اسلام عقل کی نظر میں صفحہ ۳۱۰ تا ۳۱۴)

تحریف تورات

عیسائی قرآن پاک کے بارے میں تو مختلف اعتراضات کرتے ہیں جن کو آپ گذشتہ صفحات پر پڑھ چکے ہیں اپنے گھر کی خبر نہیں لیتے۔ درج ذیل مضمون میں ہم بعض دلائل ان کی بائبل کی تحریف کے ذکر کرتے ہیں۔ تفصیل دیکھنی ہو تو حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کتاب ''اعجاز عیسوی'' اور'' بائبل سے قرآن تک'' کو ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر تویدِ جاوید کے حوالہ سے بطور خلاصہ کے لکھتے ہیں:

تورات میں تحریف واقع ہو چکی ہے۔

اور قرآن کریم بھی اس پر شاہد ہے يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ مَاهُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ پ ۲ –سورہ بقرہ رکوع ۵) کہ وہ (یہودی) اپنے ہاتھوں سے (محرف) کتاب (تورات) لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے۔

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ (پ ٦– سورۃ المائدہ رکوع ۳) کہ وہ اللہ تعالیٰ کی باتوں میں تحریف کر کے ان کی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں۔

خود محقق پادری صاحبان کو اس بات کا اقرار ہے کہ بائبل میں تحریف واقع ہوئی ہے چنانچہ پادری کنی کاٹ صاحب بشپ والٹن صاحب اسٹاہلن صاحب، کاکرن صاحب، عماد الدین صاحب شیلر صاحب، اسٹرن صاحب، ادریس ہارن صاحب،

موشیم صاحب، اوڈن صاحب، کیلسو صاحب، لوتھر صاحب، ڈاکٹر بیلی صاحب، فانڈر صاحب اور برکس صاحب وغیرہ کو اسکا اقرار ہے۔
(نوید جاوید میں ان کی عبارتیں بھی نقل کر دی گئی ہیں)

اور پادری والشس صاحب فرماتے ہیں کہ اسقوف بٹلر صاحب نے کہا کہ انگلستان میں ایک بھی فاضل ایسا نہیں ہے جو پاک نوشتوں کے الہام کا قائل ہو (قربت الٰہی ص ۵۹ بحوالہ نوید جاوید ص ۱۷۰)۔

اور امریکی مشن کے پراٹسٹنٹ پادری صاحبان کا تورات وانجیل کے الہام کی بابت جو عقیدہ ہے اور جسے انہوں نے چھپوا کر تمام ہندوستان میں مشتہر کیا (جس میں خصوصیت سے ذیل کے پادری صاحبان کے نام درج ہیں۔

پادری ای راس مس آر سائمیس، گروشش، لیکلرک۔ پفا لیف، بشب لوتھ، بشب وار برٹن، آرجڈیکن، پیلی کلارک، ڈاڈرچ، بیکسٹر، آرش بشپ سمیز اور طامس اسکاٹ وغیرہ) اس میں یہ مقولہ بھی ہے کہ بائبل میں خدا کا کلام ہے لیکن بائبل ساری خدا کا کلام نہیں (نور افشاں لاحیانہ مطبوعہ ۲۵ جولاء ۱۹۷۸ء امریکن مشن پریس باہتمام پادری کیلسو صاحب نمبر ۳۰ جلد ۶ صفحہ ۲۳۸ بحوالۂ نوید جاوید ص ۱۸۵) اور خاص طور پر بشپ کولنز وصاحب کہ انگلستان کے فضلاء اکابر میں ہیں انہوں نے اپنی رائے توریت کی نسبت یہ ظاہر کی ہے کہ یہ کتاب حضرت موسیٰ کی لکھی ہوئی نہیں اور الہامی کتاب نہیں بلکہ ایک تواریخ معتبر ہے (بحوالۂ نوید جاوید ص ۸۲)

اناجیل اوران کی تحریف

سپنگلر لکھتا ہے:

جب حضرت مسیح کے دوست اور شاگرد بوڑھے ہوگئے اور یروشلم میں اس جماعت کا صدر آپ کا بھائی تھا تو انہوں نے ان قصص وروایات کو جو عام طور پر زبان

زد خلائق تھیں یکجا مرتب کر کے آپکی سوانح عمری تصنیف کی یہی انجیل ہے۔(زوال مغرب جلد دوم ص ۲۱۴ بحوالہ معارف القرآن جلد ۴ ص ۲۹)

موسیو رینان لکھتا ہے:

یہی وجہ ہے کہ ابتدائی ڈیڑھ سو سال میں اناجیل کو کوئی مستند حیثیت حاصل نہ تھی ان میں اضافے کرنے یا مختلف انداز سے ترتیب دینے یا ایک کی تکمیل دوسرے سے کرنے میں کوئی باک اور تامل نہ تھا۔(حیات مسیح ص ۱۲ بحوالہ معارف ۴ ص ۳۱)

یوحناؔ کی انجیل کے متعلق یہ مورخ رقمطراز ہے:

میں کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ چوتھی انجیل تمام کی تمام گلیلی کے ماہی گیر کے قلم کی لکھی ہوئی ہے حقیقت یہ ہے کہ اسمیں اکثر اضافے بعد کے ہیں (ص ۴ اور ص ۱۸ بحوالہ معارف ۴ ص ۳۲ سینٹ پال کا سابقہ ڈین ڈاکٹر (W.R.Inge) (ڈبلیو آر انجے) اپنی کتاب (The Foll of The idol) (دی فال آف دا آئیڈلز) میں لکھتا ہے کہ بہت کم علماء ایسے ہوں گے جو اس باب میں اختلاف کرتے ہوں کہ انجیل چہارم (یوحنا) ایشیائے کوچک کے کسی گمنام تصوف پسند نے ۹۵ء اور ۱۲۵ء کے درمیان لکھی تھی (ص ۲۶۱ معارف ج ۴ ص ۳۲) متی اور یوحنا کے بیانات کا ذکر کرنے کے بعد موسیو رینان لکھتا ہے کہ اگر مسیح نے ویسے ہی باتیں کی تھیں جیسے متی نے لکھا ہے تو یقیناً وہ (مسیح) یوحنا کے بیان کے مطابق باتیں نہیں کر سکتا تھا (یعنی متی اور یوحنا کے اسلوب و انداز میں اس قدر بیّن فرق ہے کہ ایک ہی شخص ایسے متضاد انداز میں باتیں کبھی نہیں کر سکتا۔

ص ۱۶ لوقا کی انجیل کے متعلق رینان کا بیان ہے کہ اس انجیل کی تاریخی حیثیت بہت کمزور ہے یہ صحیفہ ہم تک دوسرے ہاتھوں سے پہنچا ہے اس میں کئی فقرے موڑے توڑے ہوئے اور مبالغہ آمیز ہیں اسے تو (یروشلم کے) ہیکل کے متعلق بھی صحیح اندازہ نہیں۔(ص ۲۲۲ معارف ۴ ص ۳۲)

ہر چہار انجیل کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ اناجیل کھلے طور پر ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں (ص ۲۹ معارف ۴ص ۳۲) اسی طرح ڈاکٹر good (جوڈ) اپنی کتاب God and Evil (گوڈ اینڈ ایول) میں لکھتا ہے کہ اناجیل کے باہمی تضاد نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ (ص ۳۱ معارف ۴ص ۳۲)۔

بائیبل پر خود عیسائیوں کے اعتراضات

مسیحی مبلغین بائیبل کو ربانی اور الہامی کلام باور کراتے ہیں۔ انہوں نے عیسائی عوام کو اس حد تک اس بات کا یقین دلا دیا ہے کہ وہ بائیبل پڑھنے کے باوجود اس کے اختلافات اور تضادات کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا پھر غلو کی وجہ سے محسوس نہیں کرتے، حالانکہ صاف دل عیسائی محققین نے خود ان کتابوں کی اصلیت کو چیلنج کیا ہے اور ان پر ٹھوس اعتراضات کیے ہیں۔ نمونہ کے طور پر صرف ہم چند مشہور عیسائی اہل قلم اور محققین کی نگارشات کے اقتباس پیش کرتے ہیں۔

لیکی کا بیان:

مشہور برطانوی مصنف مسٹر لیکی کہتا ہے۔ ’’آخر کار سب سے پہلے سترھویں صدی کے عین وسط یعنی ۱۶۴۹ء میں ایک فرنچ پروٹسٹنٹ پادری نے جرأت کر کے یہ دعوی کیا کہ یہ تصانیف تمام تر جعلی اور موضوع ہیں۔ چنانچہ مدت دراز کی ردوقدح کے بعد اب جا کر دنیائے مسیحیت کو اس کا یقین آیا۔ (تاریخ اخلاق یورپ صفحہ ۳۲۰ لیکی)

اسٹراس کی سیرت مسیح:

اسٹراس نے ۱۸۳۵ء میں ایک معرکۃ الآرا کتاب بنام ’’سیرت مسیح‘‘ لکھی۔ اس کتاب میں اس نے ثابت کیا کہ اناجیل کی روایات مثلاً قصہ ولادت مسیح اور دوسرے معجزات ناقابل اعتبار ہیں۔ ان کی حیثیت محض افسانہ کی ہے۔ (تاریخ صحف سماوی صفحہ ۱۱۷ بحوالہ کرالیسٹ بایوگرافی اور کرسٹس۔ نواب علی)

برونو بائیز:

۱۸۷۸ء میں برونو بائیز نے یہ دعویٰ کیا کہ موجودہ اناجیل تاریخی حیثیت سے ناقابل اعتبار ہیں یسوع کی شخصیت مشکوک ہے وہ چند اقوال و مواعظ جن کو عیسائی اناجیل کی خصوصیات سمجھتے ہیں مثلاً پہاڑی وعظ دراصل حکمائے یونان و روم سے لفظ بہ لفظ سرقہ کیے گئے ہیں۔ (حوالہ مذکورہ)

ڈاکٹر رابن سن:

فلپ دیوین لکھتا ہے کہ ''ڈاکٹر رابن سن کو اقرار ہے کہ اناجیل اربعہ مشکوک ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ دوسری صدی کی یہ روایت معتبر ہے کہ اناجیل دوم کا مصنف سینٹ مارک (مرقس) ہے اور یہ کہ مارک پطرس حواری کا ترجمان تھا اور اپنی انجیل کو حواری مذکور کی روایت سے رومہ میں تحریر کیا تھا۔ لیکن اس راوی کو صرف ایک سال مسیح کی صحبت حاصل ہوئی لطف یہ ہے کہ یہ حواری ناخواندہ تھا، اس نے تیس یا چالیس سال کے بعد روایت کی جس کو ایک دوسرے شخص (مرقس) نے غیر زبان میں تحریر کیا۔ اور پھر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا ترجمہ کہاں تک اصل کے مطابق ہوا ہے۔

علاوہ اس کے ڈاکٹر رابن سن اپنے ابواب ''وعظ کبیر'' اور غیر مرقسی دستاویز'' میں انجیل مرقس کی اہم فروگذاشتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس انجیل میں نہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا ذکر ہے نہ آپ کے عہد طفولیت کے حالات مذکور ہیں جن کو سابقہ پیشین گوئی کی تصدیق سمجھتے ہیں۔ اسی طرح پہاڑی والے وعظ کا بھی کچھ ذکر نہیں ہے۔ دوبارہ زندہ ہونے کا قصہ صرف چند سطور میں مذکور ہے اور آسمان پر تشریف لے جانا صرف ایک سطر میں''۔

بدقسمتی سے یہی وہ سطریں ہیں جو بالاتفاق الحاقی مانی جاتی ہیں کیوں کہ انجیل مرقس کا حقیقت میں باب ۱۶ آیت ۸ پر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے نہ حلول، نہ بعثت ثانی، نہ صعود کسی بھی مسئلہ کا ذکر نہیں۔ زبانی روایت گم شدہ دستاویز اور نامعلوم کاتب

بس یہی ایک ذریعہ رہ گئے، جس سے ہم کو ان تفصیلی حالات کا علم ہوتا ہے جو ہمارے مذہب کی روح رواں ہیں۔ کیا اس سے بڑھ کر اور بھی کوئی ناقابل اطمینان امر ہے جس سے مسیحی صداقت اور انجیلی حقانیت پر شبہ عائد ہوتا ہے۔ تاریخ صحف سماوی بحوالہ صفحہ ۱۲۳۔۱۲۵۔ نواب علی۔ فلپ ریوین دی چرچ اینڈ ماڈرن تھاٹ ص ۹۸۔99

پروفیسر ہارنک۔ برلن یونیورسٹی:

اس واضح اور مکمل تبصرہ کے بعد (جو خود ایک عیسائی مصنف کا ہے) ضرورت نہیں رہتی کہ مزید کچھ لکھا جائے، آخر میں پروفیسر ہارنک کی رائے بھی پڑھ لیجئے جو برلن یونیورسٹی میں تاریخ کلیسا کے پروفیسر اور پروشیا کی رائل اکیڈمی کے ایک ممتاز ممبر تھے۔ انہوں نے عیسائیت پر جرمن زبان میں لیکچرز دیے تھے۔ ان تمام لیکچرز کو کتابی شکل دے کر انگریزی میں ترجمہ کیا اور ان کا نام What is Christianity ہے پروفیسر ہارنک کہتا ہے کہ پہلی تین انجیلیں بھی چوتھی انجیل کی طرح تاریخی حیثیت سے گری ہوئی ہیں۔ یہ اس غرض سے تحریر نہیں ہوئیں کہ واقعات جس طور سے گذرے۔ اس تسلسل سے قلم بند کیے جائیں۔ بلکہ غایت یہ تھی ان کتابوں کے ذریعہ دین عیسوی کی بشارت دی جائے۔ (ہارنک۔ ایف واٹ از کرسچیانٹی ص ۱۳۲)

نیویارک ٹائمز کی خبر:

نیو یارک ٹائمز میں یہ خبر چھپی ہے کہ امریکہ میں پریسبائٹیرین Presbytarian کلیسا کی ایک نمایاں برانچ نے اعلان کیا کہ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ بائبل غلطیوں سے پاک ہے۔ (نیویارک ٹائمز مئی ۱۹۶۶ء)

ٹائم میگزین:

اسی طرح ٹائم میگزین کے ایک آرٹیکل میں مسطور ہے۔ یہ مضمون جو ایک رجعت پسند میتھوڈسٹ مذہبی رہنما کے بارے میں چھپا ہے یہ مذہبی رہنما مشی گن اسٹیٹ کے ایک کالج میں طلبہ کو بتاتا ہے۔ بائبل مغربی تہذیب وثقافت کی تاریخ میں

دیو مالائی قصوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے۔" (ٹائم میگزین ۴ فروری ۱۹۶۶ء)

بائیبل کے متعلق عیسائی علماء کے یہ خیالات کچھ نئے نہیں ہیں۔ نصف صدی قبل ۱۹۲۹ء کی یہ رپورٹ ملاحظہ ہو، مذہب کی تعلیم حاصل کرنے والے پانچ طلبہ کے ایک گروپ نے (جو پسٹنٹ، کانگریگلسٹ، ایلپس کویلین، ایوینجیلیکل، لوتھرن، متھوڈسٹ اور پریس بائیٹرین کلیسا سے تعلق رکھتا تھا) ایک سروے کے سلسلہ میں سوال کیا گیا تھا۔ کیا آپ یقین رکھتے ہیں کہ بائیبل مکمل طور پر دیو مالائی قصوں او رخیالی کہانیوں سے پاک ہے؟ ان جواب دینے والوں میں سے ۹۵ فیصد نے کہا "نہیں" (Is the Bible really the word of God p.165)

اینگلیکن پادری کا بیان:

آسٹریلیا کے ایک رسالہ میں اینگلی کن ریکٹر (حلقہ کو پادری جس کا خود کلیسا کی طرف سے معاشی مدد ملتی ہے) کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "عہد نامہ قدیم کے اسی فیصد حصہ کے لئے میوزیم سب سے بہترین جگہ ہوگی۔

(The Age of Melbourne.Feb 16.1961)

پروفیسروں کی رائے:

جرمنی کا ایک رسالہ دے اسپگل لکھتا ہے کہ ("دینیات کے) بہت سے پروفیسروں کی تنقیدی فہم نے کتاب مقدس کو دیو مالائی قصوں پریوں کی کہانیوں، شعر، شاعری اور تصاویر کے مجموعہ میں ڈھال دیا ہے۔

(Is the Bible quality the word of God p.164.)

چند مزید شہادتیں:

اب کتاب مقدس کے جعلی ہونے کے بارے میں چند آراء ملاحظہ ہوں۔ ایک اینگلی کن پادری کہتا ہے کہ یہ چالاک جعل سازی ہے۔

(Is the Bible really the word of God p.70)

کوپن ھیگن (ڈنمارک) کے چرچ آف رائل ڈاک یارڈ کا ڈین کہتا ہے کہ عہد نامہ جدید نہ تاریخی ہے اور نہ ہی صحیح ہے۔ Ibid

بائیبل کی ناقدری:

یہ سچ ہے کہ بائیبل کی اشاعت عیسائی دنیا میں بہت زیادہ ہے۔ اور تقریباً ہر عیسائی کے پاس اس کی ایک جلد ضرور ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر عیسائی اسے پڑھتا ہے؟ اور ہر پادری نے اس کو شروع سے آخر تک پڑھا ہے؟ اور بار بار پڑھا ہے؟ مندرجہ ذیل چند واقعات اس حقیقت کی پردہ کشائی کرتے ہیں:۔

جاپان کے ایک خبار نے یونائیٹڈ بائیبلز سوسائیٹز کے سیکرٹری کا بیان نقل کیا ہے۔ ان دنوں ہزاروں لاکھوں افراد بائیبل کو اپنے پاس رکھتے ہیں لیکن بجز غیر عیسائیوں کے یہ کتاب زیادہ نہیں پڑھی جا رہی ہے۔ Ibid ;p. 163

یہ تو عام عیسائیوں کی بات تھی خود مذہبی رہنما اور عہدیداروں کی بابت یہ رپورٹ ایک رومن کیتھولک اخبار میں شائع ہوئی ہے۔

''کیا یہ ایک افسوس ناک صورت حال نہیں ہے کہ ہمارے کیتھولک علماء کی ایک کثیر تعداد جو ہمارے پادری بھی ہیں۔ انہوں نے بائیبل کو کبھی پورا نہیں پڑھا، حتی کہ عہد نامہ جدید کو بھی۔ Ibid, p 164

وانڈ لکھتا ہے کہ آج بہت کم لوگ ہیں جو پابندی سے بائیبل پڑھتے ہیں کم از کم ''اتھارائز ڈورژن (مصدقہ بائیبل)۔

(Wand J.W.C. The Church To.Day. p.28)

ایک ایسے عیسائی سے جو ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء کو اپنی بیوی اور دو بھائیوں کے ساتھ حلقہ بگوش اسلام ہوا میں نے دریافت کیا کہ تم نے بائیبل پڑھی تھی؟ وہ کہنے لگا نہیں البتہ پادری سے سنا کرتے تھے۔ لیکن یہ خدا کی کتاب کیسی ہے جس کا کوئی احترام نہیں کیا جاتا۔''

خود عیسائی حضرات اس کو کبھی دوکانوں پر اور کبھی راستوں میں جہاں چاہتے ہیں ڈال دیتے ہیں۔ خدا کی کتاب کی تو عزت ہونی چاہیے تھی۔ مسلمانوں کی کتاب واقعی اللہ کی کتاب ہے کہ وہ بڑی عزت واحترام سے ہمیشہ اونچی جگہ رکھی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ذراسی بھی بے ادبی روا نہیں رکھی جاتی۔

(پاکستان میں مسیحیت صفحہ ۱۰۱ تا ۱۰۵)

آٹھواں باب

حدیث شریف کے متعلق اعتراضات کے جوابات

قرآن فہمی کیلئے حدیث کی ضرورت

اعتراض: (منکرین حدیث کا اعتراض)

قرآن کے سمجھنے کیلئے حدیث کی ضرورت نہیں ہے صرف عربی زبان جاننا ہی کافی ہے۔

جواب: قرآن فہمی کے لئے حدیث رسولؐ ضروری ہے، حدیث کا انکار در حقیقت قرآن کا انکار ہے:

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ اس آیت میں ذکر سے مراد باتفاق قرآن کریم ہے، اور رسول اللہ ﷺ کو اس آیت میں مامور فرمایا ہے کہ آپ قرآن کی نازل شدہ آیات کا بیان اور وضاحت لوگوں کے سامنے کر دیں، اس میں اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن کریم کے حقائق و معارف اور احکام صحیح کا سمجھنا رسول کریم ﷺ کے بیان پر موقوف ہے، اگر ہر انسان صرف عربی زبان اور عربی ادب سے واقف ہو کر قرآن کے احکام کو حسب منشاء خداوندی سمجھنے پر قادر ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کو بیان و توضیح کی خدمت سپرد کرنے کے کوئی معنیٰ نہیں رہتے۔ علامہ شاطبیؒ نے موافقات میں پوری تفصیل سے ثابت کیا ہے کہ سنت رسول اللہ ﷺ پوری کی پوری کتاب اللہ کا بیان ہے کیونکہ قرآن کریم نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق فرمایا ہے۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ اور حضرت صدیقہ عائشہؓ نے اس خلق عظیم کی تفسیر یہ فرمائی کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن اس کا حاصل یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے جو بھی کوئی قول و فعل ثابت ہے وہ سب قرآن ہی کے ارشادات ہیں۔ بعض تو ظاہری طور پر کسی آیت کی تفسیر توضیح ہوتے ہیں جن کو عام اہل علم جانتے ہیں۔ اور بعض جگہ بظاہر قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا مگر رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک میں بطور وحی اس کا القاء کیا جاتا ہے وہ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی کے حکم میں ہوتا ہے کیونکہ حسبِ تصریح

قرآنی آپ کی کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں ہوتی، بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔

اس سے معلوم ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تمام عبادات، معاملات، اخلاق، عادات، سب کی سب بوحی خداوندی اور بحکم قرآن ہیں۔ اور جہاں کہیں آپؐ نے اپنے اجتہاد سے کوئی کام کیا ہے۔ تو بالآخر وحیِ الٰہی سے یا اس پر کوئی نکیر نہ کرنے سے اس کی تصحیح اور پھر تائید کردی جاتی ہے، اس لئے وہ بھی بحکم وحی ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت نے رسول اللہ ﷺ کا مقصد بعثت قرآن کریم کی تفسیر و بیان کو قرار دیا ہے، جیسا کہ سورۂ جمعہ وغیرہ کی متعدد آیات میں تعلیم کتاب کے الفاظ سے مزین بعثت کو ذکر کیا گیا ہے اب وہ ذخیرہ حدیث جس کو صحابہ و تابعین سے لے کر متاخرین محدثین تک امت کے باکمال افراد نے اپنی جانوں سے زیادہ حفاظت کر کے امت تک پہونچایا ہے، اور اس کی چھان بین میں عمریں صرف کر کے روایات حدیث کے درجے قائم کردیئے ہیں اور جس روایت کو بحیثیت سند اس درجہ کا نہیں پایا کہ اس پر احکام شرعیہ کی بنیاد رکھی جائے، اس کو ذخیرہ حدیث سے الگ کر کے صرف ان روایات پر مستقل کتابیں لکھ دی ہیں۔ جو عمر بھر کی تنقیدوں اور تحقیقات کے بعد صحیح اور قابل اعتماد ثابت ہوئی ہیں۔

اگر آج کوئی شخص اس ذخیرہ حدیث کو کسی حیلے بہانے سے ناقابل اعتماد کہتا ہے، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس حکم قرآنی کی خلاف ورزی کی کہ مضامین قرآنی کو بیان نہیں کیا۔ یا یہ کہ آپؐ نے تو بیان کیا تھا مگر وہ قائم و محفوظ نہیں رہا، بہر دو صورت قرآن بحیثیت معنی کے محفوظ نہ رہا جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ رکھی ہے، وانا له لحافظون۔ اس کا یہ دعویٰ اس نص قرآنی کے خلاف ہے، اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص سنتِ رسول کو اسلام کی حجت ماننے سے انکار کرتا ہے وہ در حقیقت قرآن ہی کا منکر ہے نعوذ باللہ۔ (معارف القرآن جلد ۵ صفحہ ۳۳۶ تا ۳۳۷)

احادیث کی صحت کا ثبوت

زبانی روایات بھی قابلِ اعتماد ہو سکتی ہیں، پہلا فائدہ

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

مسلمانوں کی حدیث کی کتابیں زبانی روایات کے طور پر چلتی رہیں ایک طویل زمانہ کے بعد ان کو ضبط تحریر میں لایا گیا۔ اس لئے ان پر کیونکر اعتماد ہو سکتا ہے۔

جواب: تمام اہل کتاب خواہ یہودی ہوں یا عیسائی، پہلے ہوں یا پچھلے، زبانی روایات کو ایسا ہی معتبر مانتے ہیں جیسا لکھی ہوئی روایتوں کو، بلکہ یہودی حضرات تو ایسی......روایات کو لکھی ہوئی روایتوں سے زیادہ مرتبہ اور درجہ دیتے ہیں، عیسائیوں کے مشہور فرقے کیتھولک کے نزدیک دونوں برابر درجے کی ہیں، اور دونوں ہی واجب التسلیم ہیں، اور ایمان کی اصل ہیں، البتہ عیسائیوں کا دوسرا فرقہ پروٹسٹنٹ ان روایات کا ایسا ہی منکر ہے جیسا کہ یہودیوں کا فرقہ صدوقی، مگر فرقہ پروٹسٹنٹ والے اپنے اس انکار میں مجبور ہیں، اس لئے کہ اگر وہ ان روایات کا انکار نہ کریں تو ان کیلئے اپنے اصل مذہب اور نو ایجاد عقیدوں کو ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا، اس کے باوجود وہ بھی بہت سے موقعوں پر زبانی روایات کے محتاج نظر آتے ہیں، اور اسی اعتبار کی سند ان کی مقدس کتابوں میں ملتی ہے۔

مشنا اور تالمود کی حقیقت:

(یہ دونوں یہودیوں کی مذہبی کتابیں ہیں جن کا مفصل تعارف آدم کلارک اور ن کے الفاظ میں آپ کے سامنے آ رہا ہے، ۱۲ ات)

آدم کلارک اپنی تفسیر مطبوعہ ۱۸۵۱ء جلد ثانی میں کتاب عزراء کے دیباچے کی شرح میں یوں کہتا ہے:

یہودیوں کا قانون دو قسم کا تھا، ایک لکھا ہوا جس کو وہ توریت کہتے تھے، اور دوسرا بغیر لکھا ہوا، جس کو زبانی روایات کہا جاتا ہے، یہ ان کو بزرگوں کے ذریعے پہونچی تھیں ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر دونوں قسم کے قوانین دیئے تھے، جن میں سے ایک بذریعہ تحریر ہم تک پہنچا، اور دوسرا بزرگوں کے واسطے سے جو ان کا نسلاً بعد نسلٍ بیان کرتے چلے آئے، اس لئے ان کا عقیدہ ہے کہ دونوں مرتبے میں مساوی اور منجانب اللہ ہونے اور واجب التسلیم ہونے میں قطعی برابر ہیں، بلکہ یہ لوگ دوسری قسم کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ لکھا ہوا اکثر ناقص اور پیچیدہ ہوا کرتا ہے اور اسے بغیر زبانی روایات کے پورے طور پر ایمان کی بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا، اور زبانی روایتیں نہایت واضح اور مکمل طور پر قانون کی تشریح کرتی ہیں، اسی لئے یہ لوگ لکھے ہوئے قوانین کی ان تفسیروں کا قطعی انکار کرتے ہیں، جو زبانی روایات کے مخالف پائی جائیں، اور یہ بات یہودیوں میں مشہور ہے کہ وہ عہد جو بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا وہ اس لکھے ہوئے قانون کے لئے ہرگز نہ تھا، بلکہ ان زبانی روایات ہی کیلئے لیا گیا تھا۔

(بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ وہ خدا کے دیئے ہوئے احکام کی پابندی کریں گے، (دیکھئے استثناء ۲۹:۱) تقی)۔

گویا انہوں نے اس حیلے سے لکھے ہوئے قانون کو نظر انداز کردیا، اور زبانی روایتوں کو اپنے دین کی بنیاد قرار دیا، بالکل اسی طرح رومانیہ کے کیتھولک فرقے کے لوگوں نے اپنے مذہب کیلئے اسی طریقے کو اختیار کیا، اور اللہ تعالیٰ کے کلام کی تفسیر ان روایتی ہی کے مطابق کرتے رہے، اگرچہ یہ روایتی تفسیر بہت سے مقامات کے مخالف ہی کیوں نہ ہو، ان کی

یہ کیفیت ہمارے خدا کے زمانے میں اس درجہ پر پہونچ چکی تھی کہ خدا نے ان لوگوں پر اس معاملے میں گرفت کی کہ تم لوگ اللہ کے کلام کو ان کی سنت کی وجہ سے باطل کرتے ہو؟ اور خدائی عہد کے بارے میں بھی انہوں نے حد سے تجاوز کیا یہاں تک کہ ان روایات کو لکھے ہوئے سے برتر بنا دیا ان کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ مشائخ کے الفاظ توریت کے الفاظ سے زیادہ محبوب ہیں اور توریت کے بعض کلمات اچھے عمدہ اور بعض بالکل نکمے اور ناپسندیدہ ہیں، اور مشائخ کے سارے کلمات عمدہ اور پسندیدہ ہی ہیں، بلکہ مشائخ کے الفاظ پیغمبروں کے کلمات سے بہت ہی بہتر ہیں، مشائخ کے کلمات سے ان کی مراد یہی زبانی روایات ہیں جو ان کو مشائخ کے واسطے سے پہنچی تھیں، نیز یہودیوں کی کتابوں میں لکھا ہے کہ لکھا ہوا قانون پانی کی طرح ہوتا ہے، اور مشنا اور تالمود کی بیان کردہ روایات جو دونوں مذہبوں میں منضبط ہیں سیاہ مرچ والی شراب کے مانند ہیں، نیز ان کی کتابوں میں لکھا ہے کہ لکھا ہوا قانون نمک کے مانند ہے، اور مشنا اور تالمود سیاہ مرچ اور میٹھے تخم کی طرح ہیں، اس قسم کے اور بھی اقوال ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ لکھے ہوئے قانون کے مقابلے میں زبانی روایات کی برتری اور فوقیت کے قائل ہیں، اللہ کے کلام کا مفہوم ان زبانی روایات روشنی میں سمجھتے ہیں، اس لئے لکھے ہوئے قانون کی حیثیت ان کی نگاہوں میں مردہ جسم سے زیادہ نہیں ہے، اور زبانی روایات ان کے خیال میں اس روح کی مانند ہیں جو حیات اور زندگی کی بنیاد ہے۔

ان زبانی روایات کے بنیادی ہونے کی دلیل وہ لوگ یہ پیش کرتے ہیں کہ جب خدائے تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو توریت دی تھی، تو توریت

کے معانی اور تفسیر بھی سمجھائی تھی، اور یہ بھی حکم دیا تھا کہ توریت کو لکھا جائے اور تفسیر کو یاد رکھا جائے اور اس کو صرف زبانی طریقے پر دوسروں تک پہنچایا جائے، اور وہ اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ منقول ہوتی رہیں، اسی لئے پہلی قسم کے لئے یہ لوگ ''قانون مکتوب'' کے الفاظ اور دوسری قسم کے لئے۔ ''زبانی قانون'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اور وہ فتاویٰ جوان روایات کے مطابق ہوں ان کا نام ''قوانین موسیٰ'' (جوان کو کوہ سینا پر ملے تھے) رکھتے ہیں۔

ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ موسیٰؑ کو توریت جس طرح چالیس روز میں دی گئی تھی جو ان کے اور خدا کے درمیان براہِ راست مکالمہ اور بات چیت کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح ان کو زبانی روایات بھی عطا کی گئی تھیں، اور موسیٰ دونوں کو کوہِ طور سے لے کر آئے اور بنی اسرائیل کو پہنچا دیا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ آپ نے اپنے بھائی ہارون کو کوہِ طور سے واپسی کے بعد اپنے خیمہ میں بلایا اور پہلے ان کو لکھا ہوا قانون سکھایا، پھر وہ روایات سکھائیں جو لکھے ہوئے قانون کی شرح اور تفسیر تھیں جن کو انھوں نے خدا کے ہاں سے حاصل کیا تھا، ہارونؑ تعلیم حاصل کرنے کے بعد موسیٰؑ کے داہنے ہاتھ آ بیٹھے اور ہارونؑ کے دو بیٹے العیزر اور اِیتمر داخل ہوئے اور جس طرح ان کے باپ نے ان دونوں چیزوں کو سیکھا تھا، ان دونوں نے بھی سیکھا پھر ان میں سے ایک موسیٰ کے بائیں ہاتھ اور دوسرا ہارون کے دائیں ہاتھ جا بیٹھا پھر ستر مشہور مشائخ حاضر ہوئے انہوں نے بھی وہ قوانین سیکھے، اور سب لوگ خیمے میں بیٹھ گئے، پھر جو لوگ سیکھنے کے مشتاق تھے انہوں نے بھی سیکھا، پھر موسیٰ اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہارون نے سیکھا ہوا سبق سنایا پھر وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے، تو العیزر اور اِیتمر نے

سبق سنایا وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے، پھر ان ستر مشائخ نے لوگوں کے سامنے سیکھا ہوا قانون سنایا غرض ان سب حاضرین نے چار مرتبہ اس قانون کو سنا اور خوب یاد کر لیا، پھر ان لوگوں نے موسیٰ کی مجلس سے واپسی پر تمام بنی اسرائیل کو خبر دی، اور لکھے ہوئے قانون کو تحریر کے ذریعے، اور اس کے معانی کو نقل وروایت کے ذریعے دوسری نسل تک پہونچایا، اور وہ احکام جو توریت میں لکھے ہوئے تھے۔ان کی تعداد ۶۱۳ تھی، اس لئے اس قانون کو اسی لحاظ سے تقسیم کر لیا۔

اور یہ بھی کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے تمام بنی اسرائیل کو خروج مصر کے چھیالیسویں سال کے گیارہویں مہینے کی پہلی تاریخ کو جمع کیا تھا، اور ان کو اپنی وفات کی بھی اطلاع دے دی، اور حکم دیا کہ اگر کوئی شخص اس قانون الٰہی کا کوئی قول جو میرے ذریعہ سے اس کے پاس پہونچا ہے بھول گیا ہے تو وہ میرے پاس آکر مجھ سے دریافت کر لے، یا کسی کو اگر ان اقوال میں سے کسی قول پر اعتراض ہو تو میرے پاس آکر اپنا شک دور کر لے، اس کے بعد اپنی آخری زندگی تک تعلیم ہی میں مشغول رہے (یعنی گیارہویں مہینہ کی پہلی تاریخ سے بارہویں مہینے کی چھٹی تاریخ تک) اور لکھا ہوا اور بے لکھا ہوا دونوں قسم کے قوانین سکھا دیئے، اور اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے ''قانون مکتوب'' کے تیرہ نسخے بنی اسرائیل کو عطا کئے یعنی ہر فرقے کو ایک ایک نسخہ دیدیا گیا، تا کہ وہ ان کے پاس نسلاً بعد نسلٍ محفوظ رہے۔ اور ایک نسخہ لاوی کی اولاد کو بھی عطا کیا تا کہ وہ عبادت خانے میں محفوظ رہے۔

اور زبانی قانون (یعنی زبانی روایات) یوشع کو سنایا، پھر آپ اسی مہینے کی ساتویں تاریخ کوہ نبو پر چڑھ گئے اسی مقام پر آپ کی وفات ہوگئی، یوشع

نے موسیٰ کی وفات کے بعد یہ روایات مشائخ کے حوالے کر دیں، اور انہوں نے پیغمبروں کے سپرد کیں، پھر ہر نبی دوسرے آنے والے نبی کے حوالے کرتا رہا، یہاں تک کہ ارمیاءؑ نے باروخ تک اور باروخ نے عزراء تک اور عزراء نے علماء کے اس مجمع تک پہنچا دیا، جن میں سب سے آخر شمعون صادق تھے، پھر اس نے انیتی کونوس تک اور انہوں نے یوثی بن یختان تک اور اس نے یوسی بن یوسیر تک پھر اس نے نتھان اربلی اور یوشع بن برخیا تک، پھر ان دونوں نے یہوداہ بن یحییٰ اور شمعون بن شطاۃ تک اور انہوں نے شمایا اور ابی طلیون تک، پھر ان دونوں نے ہلل تک اور اس نے اپنے بیٹے شمعون تک اور گمان یہ ہے کہ یہ شمعون وہی شمعون ہیں جنہوں نے ہمارے نجات دہندہ خدا کو مریمؑ سے اپنے ہاتھوں میں لیا تھا، جب کہ وہ اپنے ایام نفاس سے پاک ہو کر عبادت گاہ میں آئی تھیں، پھر اس نے اپنے بیٹے کملائیل تک پہونچایا، اس کملائیل سے ہی پولس نے سیکھا، پھر اس نے اپنے بیٹے شمعون کو سکھایا، اور اس نے اپنے بیٹے کملائیل کو پھر اس نے اپنے بیٹے ربی یہوداحق دوش کو، پھر یہودا نے ان تمام روایات کو کتابی شکل میں جمع کر کے اس کا نام مشنا رکھا۔"

پھر آدم کلارک کہتا ہے:

یہودی اس کتاب کی بے حد تعظیم کرتے ہیں، ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ ہے سب منجانب اللہ ہے جو اس نے موسیٰؑ پر کوہِ طور کے مقام پر لکھے ہوئے قانون کی طرح وحی کیا تھا، اس لئے اس کی طرح یہ بھی واجب التسلیم ہے جب سے یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے برابر یہودیوں میں درس و تدریس کے طور پر رائج ہے، بڑے بڑے علماء نے

اس کی دو شرحیں لکھی ہیں، پہلی شرح تیسری صدی میں اور شلیم میں لکھی گئی اور دوسری شرح چھٹی صدی کے شروع میں بابل کے اندر لکھی گئی ان دونوں شرحوں کا نام کمرا ہے کیونکہ کمرا کے معنی لغت میں ''کمال'' کے ہیں ان کے خیال میں ان دونوں شرحوں سے متن کی پوری پوری توضیح ہو گئی ہے، شرح اور متن دونوں کے مجموعے کا نام تالمود ہے، ویسے الگ الگ امتیاز کے لئے یوں کہا جاتا ہے کہ ''تالمود اور شلیم'' اور ''تالمود بابل'' موجودہ زمانے کا یہودی مذہب مکمل طور پر ان دونوں ''تالمودوں'' میں جو انبیاء کی کتابوں سے خارج ہیں درج ہے، اور چونکہ ''تالمود اور شلیم'' پیچیدہ ہے اس لئے ان کے یہاں موجودہ زمانے میں تالمود بابل زیادہ مروّج ہے''۔

اور ہورن اپنی تفسیر مطبوعہ ۱۸۲۲ء جلد ۲ حصہ اوّل کے باب ۷ میں کہتا ہے:

''مشنا وہ کتاب ہے جو یہودیوں کی مختلف روایتوں پر اور مقدس کتابوں کے متون کی شرحوں پر مشتمل ہے، ان کا خیال اس کے بارے میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو کوہ طور پر جس وقت توریت عطا فرمائی تھا اسی وقت یہ روایات بھی دے دی تھیں پھر موسی سے ہارونؑ کو اور یوشعؑ سے الیعزر کو اور ان سے دوسرے پیغمبروں کو اور ان سے دوسرے مشائخ کو، اسی طرح ایک پشت سے دوسری پشت کو چلتے ہوئے شمعون تک پہونچیں، یہ وہی شمعون تھے جنہوں نے ہمارے نجات دہندہ خدا کو اپنے ہاتھوں میں لیا تھا، ان سے کملائیل کو پھر اس سے یہوداہ حق دوش کو پہنچیں، اس نے بڑی محنت سے چالیس سال میں ان کو دوسری صدی میں کتابی صورت میں جمع کیا، یہ کتاب نسلاً بعد نسلٍ یہودیوں میں اس وقت سے مستعمل چلی آتی ہے، اور اکثر اس کتاب کی عزت لکھے ہوئے قانون کی

نسبت زیادہ ہوتی ہیں۔

پھر کہتا ہے کہ: مشنا کی دو شرحیں ہیں جن میں سے ہر ایک کا نام کمرا ہے ایک ''کمرا اور شلیم'' جو بعض محققین کی رائے کے مطابق تیسری صدی میں اور شلیم میں لکھی گئی اور فادر مون کی رائے کے مطابق پانچویں صدی میں دوسری ''کمرا بابل'' جو چھٹی صدی میں بابل کے اندر لکھی گئی، یہ کمرا قطعی بیہودہ قصوں اور کہانیوں پر مشتمل ہے، لیکن یہی یہودیوں کے نزدیک زیادہ معتبر ہے اس کا پڑھنا پڑھانا ان میں مروّج ہے یہ لوگ ہر مشکل اور پیچیدہ معاملے میں اس یقین کے ساتھ اس کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ وہ ان کی رہنمائی کرے گی، کمرا کا نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس لفظ کے معنی کمال کے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ یہ شرح توریت کا کمال ہے اور کسی شرح کا اس سے بہتر ہونا ناممکن ہے اور نہ اس کے بعد اور کسی شرح کی ضرورت باقی رہتی ہے، اور جب متن کے ساتھ کمرا اور شلیم کو شامل کر لیا جائے تو مجموعے کو ''تالمود اور شلیم'' کہا جاتا ہے اور جب ''کمرا بابل'' کو متن کے ساتھ ملا لیا جائے تو مجموعے کو ''تالمود بابل'' کہا جاتا ہے۔

(''تالمود بابل'' اور ''تالمود پروشلیم'' میں سے ہر ایک کے پھر دو دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کو ''هلکه'' کہا جاتا ہے اور دوسرے حصے کو ''ہجدہ'' ہلکہ میں چھ سو تیرہ احکام ہیں، اور ہجدہ میں روایات اور قصے، (تاریخ صحف سماوی از سید نواب علی صاحب، ص ۲۲۸ کراچی ۱۹۶۳ء)۔

اوّل یہ کہ یہودی زبانی روایات کا توریت کی طرح اعتبار کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات ان کی اس سے زیادہ تعظیم کرتے ہیں۔ وہ ان کو بمنزلہ رُوح اور توریت کو بمنزلہ جسم سمجھتے ہیں، پھر جب توریت کی پوزیشن یہ ہے تو دوسری کتابوں کا اندازہ آپ خود

کر سکتے ہیں۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ان روایات کا جامع یہوداہ حق دوش ہے جس نے ان کو دوسری صدی کے آخر میں جمع کیا، یہ روایات ایک ہزار سات سو سال تک محض زبانی یادداشت کی حیثیت رکھتی تھیں، پھر اس دوران میں یہود پر بڑے بڑے مصائب اور شدائد بھی واقع ہوئے۔ مثلاً بخت نصر اور انٹیوکس اور طیطوس وغیرہ کے حادثے جن میں تواتر کی صورت یقیناً منقطع ہو گئی تھی، اور کتابیں بھی ضائع اور برباد ہو چکی تھیں۔ (دیکھئے بائبل سے قرآن تک ص ۷۸۹ و ۷۹۰) جلد دوم)

ان حالات کے باوجود یہود کے نزدیک اس کا اعتبار توریت سے بھی زیادہ ہے۔

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہ روایتیں اکثر طبقات میں صرف ایک ایک راوی سے منقول ہوتی رہیں جیسے کملائیل اوّل و دوم اور شمعون دوم وسوم، حالانکہ یہود کے نزدیک یہ لوگ انبیاء میں بھی شامل نہیں ہیں، اور عیسائیوں کے نزدیک شدید ترین کافر اور منکرینِ مسیح میں سے ہیں اس کے باوجود یہ روایات یہود کے نزدیک ایمان کی بنیاد اور اصل عقائد ہیں اس کے برعکس ہمارے نزدیک وہ صحیح حدیث بھی جو آحاد کی (یعنی تین سے کم اس کے راوی ہوں) کی روایت سے منقول ہو عقائد کی بنیاد ہرگز قرار نہیں دی جاسکتی۔

چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ جب ''کمرا بائل'' چھٹی صدی میں لکھی گئی ہے تو اس کے بیہودہ قصے کہانیاں ہورن کے قول کے موافق دو ہزار سال تک محض زبانی روایت کے ذریعے محفوظ تھے۔

جب محققین فرقہ پروٹسٹنٹ کے اعتراض کے مطابق یہود کی پوزیشن یہ ہے تو اس سے تمام مسیحی متقدمین کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں، یوسی بیس جس کی تاریخ علماء کیتھولک اور فرقۂ پروٹسٹنٹ دونوں کے یہاں معتبر ہے اپنی تاریخ مطبوعہ ۱۸۴۸ء کی کتاب ۲ کے باب ۹ میں یعقوب حواری کے حال میں یوں کہتا ہے کہ:

”کلیمنٹیس نے ایک قابل یادداشت قصہ اپنی ساتویں کتاب میں اس یعقوب کے حال کے بیان میں نقل کیا ہے ظاہر ہے کہ کلیمنٹس نے یہ قصہ ان زبانی روایات سے نقل کیا ہے، جو اس کو اپنے باپ دادوں سے پہونچی تھیں۔

اس کے بعد تیسری کتاب کے تیسرے باب میں ص ۱۲۴ ارینیوس کا قول نقل کرتا ہے:

”افسس کا گرجا جس کو پولس نے تعمیر کیا تھا اور جس میں یوحنا حواری نے سلطنت ٹرجانوس تک قیام کیا، حواریوں کی احادیث کا پختہ گواہ ہے۔

ان مذکورہ روایات سے معلوم ہوا کہ یہودیوں کے نزدیک روایات واحادیث کی عظمت توریت کی عظمت سے زیادہ ہے، اسی طرح عیسائیوں کے تمام متقدمین مثلاً کلیمنٹس، ارینوس، کلاروس، سکندریانوس، افریکانوس، ٹرٹولین، آریجن، باسلیوس، اپی فانیس، کریز اسٹم، آگسٹائن، ون سنٹ اسقف وغیرہ تمام زبانی روایتوں کی عظمت کے قائل ہیں، اور ان کو معتبر اور مستند مانتے ہیں، اور اگناشس نے اپنی آخری عمر میں زبانی روایتوں کو مظبوطی کے ساتھ تھامے رہنے کی وصیت کی تھی۔

زبانی روایات کے حق میں انجیل کی شہادتیں:

چنانچہ انجیل مرقس کے باب ۴ آیت ۳۴ میں یوں ہے کہ:

”اور بے تمثیل (یعنی حضرت مسیح علیہ السلام اپنی ہر بات کو تمثیلات میں کہا کرتے تھے، اور تنہائی میں ان تمثیلات کی تشریح کرتے تھے۔ تقی) ان سے کچھ نہ کہتا تھا۔ لیکن خلوت میں اپنے خاص شاگردوں سے سب باتوں کے معنی بیان کرتا تھا۔

اور یہ بات بعید ہے کہ یہ تمام تفسیریں یا ان میں سے بعض منقول نہ ہوں، اور یہ بھی ناقابل یقین ہے کہ حواری تو تفسیر کے محتاج ہوں اور ہمارے ہم

عصر لوگ ان سے بے نیاز اور مستغنی ہوں، اور انجیل یوحنا کے باب ۲۱ آیت ۲۵ میں ہے کہ: ''اور بھی بہت سے کام ہیں جو یسوع نے کیئے، اگر وہ جدا جدا لکھے جاتے تو میں سمجھتا ہوں کہ جو کتابیں لکھی جاتیں ان کیلیے دنیا میں گنجائش نہ ہوتی۔''

انجیل کی اگر چہ یہ بات مبالغہ اور غلو سے خالی نہیں ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں اسکا یہ کہنا کہ ''اور بہت سے کام ہیں'' یہ مسیح کے تمام افعال کو شامل اور عام ہے، خواہ وہ معجزات ہوں یا دوسری چیزیں، اور یہ بات بعید ہے کہ ان میں سے کوئی چیز زبانی روایت سے منقول نہ ہو،

اور تھسلنیکیوں کے نام دوسرے خط کے باب ۲ آیت (۱۴ یا) ۱۵ میں ہے:

''اے بھائیو! ثابت قدم رہو، اور جن روایتوں کی تم نے ہماری زبانی یا خط کے ذریعے تعلیم پائی ہے ان پر قائم رہو۔

اس کے یہ الفاظ کہ ''خواہ زبانی ہوں یا خط کے واسطے سے'' صاف اس پر دلالت کررہے ہیں کہ بعض چیزیں تو ہم تک بذریعہ تحریر پہنچی ہیں، اور بعض روبرو بات چیت کے ذریعے سے، لہٰذا ضروری ہوا کہ عیسائیوں کے نزدیک دونوں معتبر ہوں، جیسا کہ اس مقام کی شرح میں کریز اسٹم نے تصریح کی ہے۔

لہٰذا ان بیانات مذکورہ سے ثابت ہوا کہ فرقۂ پروٹسٹنٹ میں سے جو شخص مطلقاً احادیث کے معتبر ہونے کا انکار کرتا ہے وہ جاہل ہے، یا پھر انتہائی متعصب اور ہٹ دھرم ہے اور اسکی بات کتب مقدسہ اور جمہور علماء متقدمین کے خلاف ہے اور بعض متقدمین کے فیصلے کے مطابق اس کا شمار بدعتیوں میں ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فرقے کی بہت سی طبع زاد چیزوں میں روایات کا اعتبار کرنے پر مجبور ہے۔

بعض محققین علماء پروٹسٹنٹ کا اعتراف:

بعض محققین علماء پروٹسٹنٹ نے انصاف سے کام لیتے ہوئے اعتراف کیا ہے

کہ زبانی روایات بھی لکھی ہوئی کتاب کی طرح معتبر ہیں کتاب کیتھولک ہیرلڈ جلد نمبر ۲ صفحہ ۲۴ میں اس طرح ہے:

''ڈاکٹر بریٹ جو فرقۂ پروٹسٹنٹ کے فضلاء میں سے ہے اپنی کتاب کے ص ۷۴ پر کہتا ہے کہ یہ بات کتب مقدسہ سے واضح ہے کہ دین عیسوی پہلے اسقفوں اور حواریوں کے تابعین کو زبانی روایت کے ذریعے حوالے کر دیا گیا تھا، اور ان کو اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اسکی حفاظت کریں، اور پچھلی نسل کے حوالے کر دیں، اور کسی مقدس کتاب سے خواہ وہ پولس حواری کی ہو، یا کسی دوسرے حواری کی، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے ان تمام چیزوں کو جن کو نجات میں دخل ہے اجتماعی طور پر یا انفرادی طریقے پر لکھا ہو، اور اس کو قانون بنایا ہو، جس سے یہ بات سمجھی جائے کہ دینِ عیسوی میں کوئی ایسی ضروری چیز جس کو نجات میں دخل ہے سوائے لکھی ہوئی چیز کے نہیں ہے، اور اسی کتاب کے صفحہ ۳۲، ۳۳ میں کہتا ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ پولس وغیرہ حواریوں کو کہ انہوں نے جس طرح احادیث کو ہم تک بذریعہ تحریر پہنچایا ہے اسی طرح زبانی روایات کے ذریعے بھی پہنچایا ہے تو ان لوگوں کے لئے بڑی ہلاکت ہے جو دونوں کو محفوظ نہ رکھیں، اور احادیث عیسویہ ایمان کے باب میں لکھی ہوئی کے مانند معتبر ہیں اور بشپ مون ٹیک کہتا ہے کہ حوارئین کی احادیث ایسی ہی معتبر ہیں جیسے ان کے خطوط اور تحریریں، پروٹسٹنٹ راویوں میں سے کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ حوارئین کی زبانی تقریریں ان کی تحریرات سے بڑھی ہوئی ہیں، جلنگ ورتھ کہتا ہے کہ: کہ یہ جھگڑا کہ کونسی انجیل قانونی ہے اور کونسی قانونی نہیں ہے زبانی روایت سے ختم ہو سکتا ہے جو ہر جھگڑے کے لئے انصاف کا قاعدہ ہے۔''

پادری تھامس انگلس کیتھولک کا فیصلہ:

پادری تھامس اپنی کتاب مرآۃ الصدق مطبوعہ ۱۸۵۱ء کے صفحہ ۱۸۰ و ۱۸۱ پر کہتا ہے:

''اسقف مانی سیک جو پروٹسٹنٹ کے علماء میں سے ہے، اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ چھ سو احکام ایسے ہیں جن کو اللہ نے دین میں مقرر کیا ہے، اور کلیسا ان کا حکم کرتا ہے لیکن ان کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کتاب مقدس نے نہ ان کو کسی مقام پر بیان کیا ہے نہ تعلیم دی ہے۔''

اس فاضل کے اعتراف کے مطابق چھ سو احکام زبانی روایت سے ثابت ہوئے ہیں اور فرقہ پروٹسٹنٹ کے نزدیک واجب التسلیم ہیں۔

اہم باتیں یاد رہتی ہیں، دوسرا فائدہ:

یہ بات صحیح تجربے سے ثابت ہے کہ جو چیز عجیب اور مہتم بالشان ہوتی ہے وہ اکثر لوگوں کو یاد ہوتی ہے، اور جو معمولی اور سرسری ہوتی ہے وہ عموماً اہم نہ ہونے کی وجہ سے محفوظ نہیں رہتی، یہی وجہ ہے کہ اگر آپ ایسے لوگوں سے جو کسی مخصوص کھانے یا مخصوص کھانوں کے عادی نہ ہوں یہ سوال کریں کہ آپ نے گذشتہ کل یا پرسوں کونسا کھانا کھایا تھا؟ تو یہ بات ان کو اس لئے یاد نہیں ہوگی کہ نہ تو ان کو اس کا خاص اہتمام ہوتا ہے نہ ان کی نگاہ میں کھانا کوئی عجیب اور اہم معاملہ ہے کہ وہ ہر کھانے کو یاد رکھیں، یہی صورت تمام عمومی افعال و اقوال کی ہے، لیکن اگر آپ ان سے اس دمدار ستارے کے متعلق دریافت کریں جو صفر ۱۲۵۹ھ مطابق مارچ ۱۸۴۳ء میں نمودار ہوا تھا، اور پورے ایک مہینے تک فضائے آسمانی پر چمکتا رہا، اور کافی لمبا تھا، تو یہ واقعہ اکثر دیکھنے والوں کو محفوظ ہوگا، یہ دوسری بات ہے کہ اس کے نمودار ہونے کا مہینہ اور سال ان کو یاد نہ رہا ہو، حالانکہ اس واقعہ کو اکیس سال سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ یہی کیفیت بڑے بڑے زلزلوں اور بڑی بڑی لڑائیوں اور نادر واقعات کی ہوتی ہے۔

چونکہ مسلمانوں کو ہر زمانے میں حفظ قرآن کا اہتمام رہا ہے اس لئے ان میں قرآن کے حافظ اس زمانے میں بھی اسلامی ممالک میں ایک لاکھ سے زیادہ موجود ہیں، حالانکہ اکثر ملکوں سے اسلامی سلطنت مٹ گئی، اور ان ممالک میں دینی امور میں سستی بھی پیدا ہوگئی، اگر کسی عیسائی کو ہمارے اس دعوے میں کوئی شک ہو تو وہ تجربہ کرلے، اور صرف جامع ازہر میں جا کر دیکھ لے، جہاں اس کو ہر وقت ایک ہزار سے زائد حافظ قرآن ملیں گے، جنہوں نے کامل تجوید کے ساتھ قرآن کو یاد کیا ہے اور اگر مصر کے دیہات میں تلاش کیا جائے تو مسلمانوں کا کوئی بھی گاؤں قرآن کے حافظوں سے خالی نہیں ملے گا، مصر کے بہت سے خچر، ٹٹو اور گدھے ہانکنے والے حافظ قرآن ملیں گے، پھر اگر وہ منصف مزاج ہوگا تو ضرور اقرار کرے گا کہ یہ گدھے اور ٹٹو ہانکنے والے یقیناً اس معاملے میں ان پاپاؤں، بشپوں، اور پادریوں سے فائق ہیں جو اس زمانے میں مشرق سے مغرب تک پھیلے پڑے ہیں، حالانکہ یہ زمانہ عیسائی دنیا کی علمی ترقی اور عروج کا ہے، چہ جائیکہ وہ گذشتہ عیسائی دور جس کی ابتداء ساتویں صدی سے پندرہویں صدی تک ہے جس میں علماء پروٹسٹنٹ کے اعتراف کے مطابق جہالت علماء کا شعار تھا، ہمارا خیال تو یہ ہے کہ تمام یورپین ممالک میں مجموعی طور پر بھی توریت یا انجیل کے یا دونوں کتابوں کے دس حافظ بھی ایسے نہیں ملیں گے جن کو کوئی ایک کتاب یا دونوں کتابیں ان گدھے اور خچر ہانکنے والے حافظوں کے برابر یاد ہوں۔

ولیم میور تاریخ کلیسا مطبوعہ ۱۸۴۸ء کے باب ۳ میں کہتا ہے کہ:

''متقدمین عیسائیوں کے یہاں ایمانی عقیدوں میں جو عقیدے ایسے ہیں کہ ان کا اعتقاد نجات کیلئے ضروری ہے ان میں سے ایک بھی ان کے پاس لکھا ہوا نہیں ہے حالانکہ وہ بچوں کو اور ان اشخاص کو جو مذہب عیسوی میں داخل ہوتے ہیں زبانی طور پر سکھائے جاتے ہیں اور یہ عقیدے ہر قریب و دور مقامات پر یکساں ہی چلے آتے تھے، پھر جب ان کو کتابت

کے ذریعے ضبط کیا گیا اور مقابلہ کیا گیا تو ٹھیک اور مطابق پایا گیا، اور سوائے معمولی لفظی اختلاف کے نفس مطلب اور اصل مقصد میں کوئی فرق نہیں پایا گیا۔"

معلوم ہوا کہ جو بات اہم اور مہتم بالشان ہوتی ہے وہ محفوظ رہتی ہے، اس میں زمانۂ دراز گزرنے کی وجہ سے کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، یہ وصف اور خصوصیت قرآن کریم میں نمایاں ہیں، حالانکہ بارہ سواتی سال کا طویل عرصہ گذر چکا ہے، مگر وہ جس طرح ہر زمانے میں تحریر کے ذریعے محفوظ رہا، اسی طرح ہر دور میں ہزاروں لاکھوں سینوں کے ذریعے محفوظ چلا آتا ہے پھر اس زمانے میں عیسائیوں کے بہت سے فرقے ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کے خواص اور بڑے بڑے عالموں کی جانب نگاہ ڈالیں، اور عوام اور جہلاء کو نظر انداز کریں تو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ان کو بھی اپنی کتاب مقدس کی تلاوت کرنا نصیب نہیں ہوتا۔

تدوین حدیث کی مختصر تاریخ، تیسرا فائدہ:

صحیح حدیث مسلمانوں کے یہاں بھی اس طریقے اور شرائط کے مطابق، جو عنقریب ہم تفصیل سے بیان کریں گے معتبر ہے، اور چونکہ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: من کذب علیّ متعمدا فلیتبوّأ مقعده من النار۔

(ترجمہ) جو شخص مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے گا وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے"۔

(علامہ سیوطیؒ نے الجامع الصغیر حدیث نمبر ۸۹۹۳ کے تحت اس کی تفصیل سے تخریج لکھی ہے اور (۶۴) صحابہ کرامؓ کے نام بیان کئے ہیں جنہوں نے اس حدیث کو حضور ﷺ سے روایت کیا ہے۔ علامہ مناوی نے حافظ ابن جوزی کے حوالہ سے ۹۸ صحابہؓ کا اس کو روایت کرنا نقل کیا ہے اور امام طبرانی نے بھی اتنے ہی صحابہؓ سے اس کی روایت کی ہے اور ابن دحیہ نے چار سو سندوں سے اس کی تخریج کی ہے اور بعض محدثین نے کہا ہے کہ اس حدیث کو دو سو صحابہؓ نے روایت کیا ہے ان سب کے الفاظ

ملتے جلتے ہیں اور معنی سب کا ایک ہے۔ (فیض القدیر جلد ۶ صفحہ ۲۱۶، امداد اللہ انور)

یہ حدیث متواتر ہے، جس کو ۶۲ صحابہ نے جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں روایت کیا ہے اس بناء پر قرن اوّل سے حضور علیہ السلام کی احادیث کا اہتمام رہا ہے ان کا یہ اہتمام عیسائیوں کے کتب مقدسہ کے حفظ کرنے کے اہتمام سے زیادہ رہا ہے۔ مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اپنے زمانے میں بعض مجبوریوں کی بناء پر ان روایتوں کو کتابی شکل میں جمع نہیں کیا، جس کی ایک بڑی مصلحت یہ تھی کہ آنحضرت علیہ السلام کا کلام قرآن کریم کے ساتھ مخلوط اور مشتبہ نہ ہو جائے۔ (اس کے باوجود بعض صحابہؓ کے پاس احادیث کے لکھے ہوئے مجموعے موجود تھے جنہیں انہوں نے کامل احتیاط کے ساتھ قرآن کریم سے الگ رکھا ہوا تھا، چنانچہ عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے بارے میں ابوداؤد کی روایت میں تصریح ہے کہ انہوں نے آنحضرتؐ کے حکم سے احادیث لکھی ہیں (جمع الفوائد ص ۲۶ ج ۱) بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے اپنے مجموعے کا نام ''الصحیفۃ الصادقہ'' رکھا تھا، اس کے علاوہ حال ہی میں ہمام بن منبہؒ کا جمع کیا ہوا ایک مجموعۂ حدیث دریافت ہوا ہے جو انہیں حضرت ابوہریرہؓ نے املا کرایا تھا جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اس وقت ہی سے کتابت حدیث کی ابتداء ہو چکی تھی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، اس مسئلے کی مسلسل اور محققانہ بحث حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی صاحبؒ کی کتاب تدوین حدیث مطبوعہ مجلس علمی، کراچی میں ملے گی، ۱۲ تقی) البتہ تابعین میں سے امام زہریؒ ربیع بن صبیحؒ، سعیدؒ وغیرہ رحمہم اللہ جیسے بزرگوں نے اس کی تدوین اور جمع کی ابتداء کی، مگر انہوں نے فقہی ابواب کی ترتیب کے مطابق ان کو ترتیب نہیں دی۔ لیکن چونکہ یہ ترتیب عمدہ اور بہترین تھی، اس لئے تبع تابعین نے اسی ترتیب کو اختیار کیا چنانچہ امام مالکؒ نے جن کی پیدائش ۹۵ھ میں ہے مدینہ میں مؤطا تصنیف کی، اور مکہ میں ابومحمد عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریجؒ نے، شام میں عبدالرحمٰن بن اوزاعیؒ نے، کوفہ میں سفیان ثوریؒ نے بصرہ میں حماد بن سلمہؒ نے

حدیث میں کتابیں جمع کیں، پھر بخاریؒ اور مسلمؒ نے اپنی صحیحین تصنیف کیں اور ان میں صرف صحیح حدیثوں کے ذکر پر اکتفاء کیا اور دوسری کمزور اور ضعیف روایتوں کو ترک کر دیا۔

ائمہ محدثین نے احادیث کے معاملے میں انتہائی جانفشانی اور محنت کی چنانچہ ''اسماء الرجال'' کا ایک عظیم الشان فن قائم کیا۔ جس کے ذریعے ہر ایک ناقل حدیث کا پورا حال اور کچا چٹھا معلوم ہو سکے، کہ اس کی دیانت اور یادداشت کا کیا حال ہے؟ اور صحاح کے مصنفوں میں سے ہر ایک نے ہر روایت کی سند اپنے سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک بیان کرتے ہوئے روایت کی، اور بخاری کی بعض حدیثیں ثلاثی ہیں۔ (یعنی صرف تین واسطوں سے براہ راست حضور ﷺ سے مل جاتی ہیں)۔

حدیث کی تین قسمیں:

پھر صحیح حدیث کی تین قسمیں قرار دی گئی ہیں: ا۔ متواتر ۲۔ مشہور ۳۔ خبر واحد

حدیث متواتر: وہ کہلاتی ہیں جس کو ایسی جماعت دوسری جماعت سے نقل کرتی ہے کہ جن سب کا کسی جھوٹی بات پر متفق ہو جانا عقل کے نزدیک محال ہو اس کی مثال نماز کی رکعتوں والی روایت یا زکوٰۃ کی مقداروں والی روایت وغیرہ

خبر مشہور: وہ ہے کہ جو صحابہؓ کے دور میں تو ''اخبار آحاد'' کی طرح تھی، پھر تابعین کے زمانے میں یا تبع تابعین کے دور میں مشہور ہو گئی، ان دونوں زمانوں میں سے کسی ایک زمانے میں تمام امت نے اس کو قبول کر لیا، اور اب وہ متواتر کے درجے کی ہو گئی، مثلاً سنگساری کا حکم زنا کے سلسلے میں۔

خبر واحد: وہ ہے کہ جس کو ایک راوی نے دوسرے ایک راوی سے یا ایک جماعت سے یا ایک جماعت نے ایک شخص سے روایت کیا ہو۔

متواتر حدیث علم یقینی کو مستلزم ہے اور اس کا انکار کفر ہے، حدیث مشہور علم طمانیت کی موجب ہے، اس کا انکار بدعت اور فسق ہے، خبر واحد دونوں قسم کے علم کی

موجب نہیں مگر واجب العمل ہونے کی حد تک معتبر ہے، نہ اس سے عقائد کا اثبات ممکن ہے اور نہ اصول دین کا، اور اگر دلیل قطعی کے خلاف ہو خواہ وہ عقلی ہو یا نقلی تو اگر تاویل ممکن ہے تو اس میں تامہل کی جائے گی ورنہ اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اور اس کی جگہ دلیل قطعی پر عمل ضروری ہوگا۔

حدیث صحیح اور قرآن میں فرق:

یہ فرق تین طرح سے ہے: اوّل یہ کہ قرآن پورا کا پورا تواتر کے طریقے پر منقول ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح حضور ﷺ پر نازل ہوا تھا، اس کے نقل کرنے والوں نے اس کے کسی لفظ کو کسی دوسرے لفظ سے نہیں بدلا، خواہ وہ اسکے ہم معنیٰ ہی کیوں نہ ہو، اس کے برعکس صحیح حدیث کا روایت بالمعنیٰ (روایت بالمعنیٰ کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو لفظ ارشاد فرمائے تھے راوی بعینہ ان الفاظ کو تو نقل نہیں کرتا مگر ان کا مفہوم پوری طرح ادا کر دیتا ہے، تقی) کے طور پر نقل کرنا ایسے ناقل کیلئے جائز تھا جو لغت عرب کا ماہر اور ان کے طرزِ کلام سے واقف ہو۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ قرآن چونکہ سارا متواتر ہے، اس لئے اس کے کسی جملے کا انکار بھی مستلزم کفر ہے، برخلاف حدیث صحیح کے کہ اس کی ایک قسم یعنی متواتر کے علاوہ اور کسی کے انکار سے کفر لازم نہیں آتا۔ (یعنی کوئی شخص کسی مخصوص حدیث مشہور یا خبر واحد کے انکار کرنے سے کافر نہیں ہوتا، لیکن یہ واضح رہے کہ جو شخص احادیث کو اصولی طور پر ہی حجت تسلیم نہ کرتا ہو وہ تمام مسلمان مکاتب فکر کے نزدیک کافر ہے۔ اسکی مثال تقریباً ایسی ہے جیسے کہ نصاری کے یہاں اگر کوئی شخص بائبل کی کسی آیت کو الحاقی قرار دیدے تو وہ ان کے نزدیک عیسائیت سے خارج نہیں ہوتا، چنانچہ بہت سے نصرانی علماء نے بائبل کی بہت سی عبارتوں کو الحاقی تسلیم کیا ہے، لیکن جو شخص بائبل کو اصولی طور پر تسلیم نہ کرے اسے وہ عیسائیت سے خارج قرار دیتے ہیں ۱۲ تقی)۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ بہت سے احکام کا تعلق خالی قرآن کے الفاظ سے بھی ہے

جیسے نماز کا صحیح ہونا اور اسکی عبارت کا معجز ہونا بخلاف حدیث کے کہ اس کے الفاظ سے احکام کا کوئی تعلق نہیں ہے،

اب تینوں بیان کردہ فوائد کے بعد آپ کے خوب ذہن نشین ہوگیا ہوگا کہ اس خاص طریقے پر صحیح حدیث کا اعتبار کرنے سے مسلمانوں پر کسی قسم کی برائی یا اعتراض لازم نہیں آسکتا۔

حدیث کے راوی حضورؐ کے رشتہ دار تھے

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

حدیث کے نقل کرنے والے حضور ﷺ کی بیویاں اور آپؐ کے عزیز رشتہ دار یا صحابی ہیں اس لئے ان کی شہادت حضور اکرم ﷺ کے حق میں معتبر نہیں۔

جواب: یہ اعتراض تھوڑے سے تغیر کے بعد خود معترضین پر آپڑتا ہے، کیونکہ مسیح کے حالات اوران کے اقوال جو موجودہ انجیلوں میں مذکور ہیں ان کے نقل کرنے والے عیسی علیہ السلام کی والدہ ہیں یا ان کا فرضی باپ یوسف نجار یا آپ کے شاگرد، اس لئے ان لوگوں کی شہادت آپ کے حق میں معتبر نہیں ہوسکتی۔

اور اگر عیسائی حضرات یہ کہیں کہ حضورؐ کے عزیزوں اور صحابہؓ کا ایمان نا قابل اعتماد تھا کیونکہ یہ لوگ دنیوی ریاست کے حصول کے لئے ایمان ظاہر کرتے تھے، تو یہ احتمال تو قطعی باطل ہے اس لئے کہ حضور ﷺ کی مکہ کی تیرہ سالہ زندگی کافروں کی ایذارسانی کی بناء پر نہایت کلفت اور مصائب سے بھرپور تھی، اس ساری مدت میں آپؐ کے صحابہ کو بھی کافروں کی ایذاءرسانی کا شکار ہونا پڑا، اور ہمیشہ مبتلاء مصائب رہے، یہاں تک کہ وطن عزیز کو خیر باد کہ کر حبشہ اور مدینہ میں جا کر پناہ لینے پر مجبور ہوئے اس عرصے میں ان کی جانب سے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، کہ ان کو طمع دنیا یا حرص ریاست کا خیال آسکے۔

مزید برآں یہی احتمال حوارئین کی نسبت بھی تو ہوسکتا ہے کیونکہ یہ سب نہایت تنگدست اور شکار پیشہ تھے، ان لوگوں نے یہودیوں سے بھی یہی سن رکھا تھا، کہ مسیح عظیم الشان بادشاہ ہوں گے، پھر جب عیسیٰ علیہ السلام نے یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی مسیح موعود ہوں تو ان پر یہ سمجھ کر ایمان لائے کہ آپ کے اتباع کرنے سے بڑے بڑے عہدے ملیں گے، اور مچھلیاں شکار کرنے والے جال کے جھنجٹ سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔ (یہ غالباً جناب پطرس کی طرف اشارہ ہے جو مچھلیاں پکڑ کر گذارا کیا کرتے تھے۔۱۲ تقی)

نیز جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے یہ وعدہ بھی کیا کہ:

جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہولئے ہو بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے۔

جیسا کہ انجیل متی کے باب ۱۹ آیت ۲۸ میں صاف موجود ہے نیز حضرت مسیح علیہ السلام نے ان سے یہ وعدہ بھی فرمایا تھا کہ: ’’ایسا کوئی نہیں جس نے گھر یا بھائیوں یا بہنوں یا ماں باپ یا بچوں یا کھیتوں کو میری خاطر اور انجیل کی خاطر چھوڑ دیا ہو اور اب اس زمانے میں سوگنا نہ پائے‘‘۔

مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ہم کو ہماری خیالی سلطنت نصیب نہیں ہوئی، نہ اس دنیا میں سوگنا عوض مل سکا، بلکہ مسیح بھی دنیوی دولت سے قطعی محروم اور جوں کے توں تنگدست اور قلاش رہے، یہودیوں کے خوف سے ڈرتے اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر بھاگتے پھرے، انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ یہودی مسیح کے پکڑنے اور قتل کرنے کے درپے ہیں تب ان کو ہوش آیا کہ ہم غلط سمجھ رہے تھے، اور مذکورہ وعدے محض سراب کے مانند تھے جس کو پیاسا غلطی سے پانی سمجھتا ہے، ان میں سے ایک صاحب نے تو اس خیالی سلطنت اور وہمی ترقیات کے عوض میں فقط تیس درہم

لینے پر قناعت کر کے مسیحؑ کو دشمنوں اور یہودیوں کے ہاتھوں گرفتار کرادیا اور اس کے صلے میں یہ قلیل رقم ان سے وصول کی اور باقی اصحاب مسیح کی گرفتاری کے موقع پر نہ صرف یہ کہ ان کو چھوڑ کر بھاگ گئے، بلکہ تین مرتبہ ان کو پہچاننے سے بھی انکار کیا، پھر ان میں جو صاحب حواریین میں سے سب سے بلند پایہ اور کلیسا کے بانی اور مسیح کے خلیفہ ہیں یعنی حضرت پطرس انہوں نے تو صاف طور پر اپنے مسیح پر لعنت فرمائی اور قسم کھا کر ان کو پہچاننے سے انکار کردیا۔

(متی ۲۶: ۳۵، لوقا۔ ۲۲: ۳۴، مرقس ۱۴: ۳۰۔ یوحنا ۱۸: ۱۶)

غرض کہ مسیحؑ کے سولی دیئے جانے کے بعد حواریین اپنے فرضی اور خیالی منصوبوں سے ناامید ہوگئے پھر جب دوبارہ مسیحؑ کو زندہ دیکھا تو انکی امیدوں میں از سر نو جان پڑ گئی، کہ ممکن ہے کہ اس مرتبہ ہم سلطنت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں، چنانچہ مسیح کے آسمان پر چڑھنے کے وقت یہ سب مخلصین پھر مسیح کے گرد جمع ہوکر دریافت کرنے لگے کہ کیا اس وقت کھوئی ہوئی بادشاہت اسرائیل کو پھر ملے گی، جیسا کہ کتاب اعمال کے باب اوّل میں صاف طور پر لکھا ہے۔

اے خداوند کیا تو اسی وقت اسرائیل کو بادشاہی پھر عطا کرے گا۔ (اعمال ۱/۲)

اور آسمان پر چڑھنے کے بعد تو حواریین کے دلوں میں ایک جدید خیال نے کروٹ لی جو ان کے نزدیک اس خیالی سلطنت سے بھی بڑھ کر تھا، جس سے وہ لوگ مسیح کے آسمان پر جانے تک محروم رہے، وہ یہ کہ مسیحؑ دوبارہ عنقریب آسمان سے نازل ہوں گے، اور یہ کہ قیامت بہت ہی نزدیک ہے۔ اور یہ کہ نازل ہونے کے بعد دجال کو قتل کریں گے اور شیطان کو ہزار سال کے لئے قید کردیں گے اور مسیح کے نزول کے بعد ہم لوگ تختوں پر جلوہ فرما ہوں گے اور دنیا میں اس پوری مدت میں عیش کی زندگی گذاریں گے ۔۔۔۔ جیسا کہ کتاب المشاہدات کے باب ۱۹ و ۲۰ سے اور کرنتھیوں کے نام پہلے خط کے باب ۶ آیت ۲ سے مفہوم ہوتا ہے پھر قیامت ثانیہ آنے پر ان کو

جنت میں دائمی اورابدی مسرت نصیب ہوگی اس لئے انہوں نے مسیحؑ کے احوال بیان کرنے میں اوران کی تعریف کرنے میں مبالغہ آمیزی کی چنانچہ چوتھا انجیلی اپنی انجیل کے آخر میں کہتا ہے کہ

''اور بھی بہت سے کام ہیں جو یسوعؑ نے کئے اگر وہ جدا جدا لکھے جاتے تو میں سمجھتا ہوں کہ جو کتابیں لکھی جاتیں ان کیلئے دنیا میں گنجائش نہ ہوتی۔

حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ یہ محض جھوٹ اور شاعرانہ مبالغہ ہے، یہ لوگ اس قسم کی مبالغہ آمیز باتوں کے ذریعے جاہلوں کواپنے جال میں پھنسایا کرتے تھے، یہاں تک کہ مر گئے، مگر اپنی مراد کو پھر بھی حاصل نہ کرسکے، اس لئے ان کی شہادت مسیح کے حق میں کیونکر قابل قبول ہوسکتی ہے۔

یہ ساری بات الزام کے طریق پر کہی جاتی ہے خدانخواستہ ہمارا اعتقاد ہرگز ایسا نہیں ہے جیسا کہ کئی مرتبہ صاف طور پر کہا جاچکا ہے۔

پھر جس طرح یہ احتمال حضرت عیسیٰ علیہ السلام اوران کے سچے حواریوں کے حق میں غلط اور باطل ہے اسی طرح حضور ﷺ کے صحابہ کی نسبت بھی باطل اور لغو ہے۔

محدثین آنحضرت ﷺ کے بہت بعد پیدا ہوئے

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

حدیث کی کتابوں کے مؤلفین نے خود حضور اقدس ﷺ کے حالات اور معجزات کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے نہیں کیا اور نہ آپؐ سے آپؐ کے اقوال بلا واسطہ سنے، بلکہ حضور ﷺ کی وفات سے سو دو سو سال بعد وہ اقوال تواتر کے ساتھ سنے اوران کو جمع کرلیا، بلکہ ان میں سے نصف مقدار معتبر نہ ہونے کی وجہ سے حذف کردی۔

جواب: یہ بات ناظرین کو معلوم ہوچکی ہے کہ زبانی روایت جمہور اہل کتاب

کے نزدیک معتبر ہے، اور اس کا معتبر ہونا اس موجودہ انجیل سے بھی ثابت ہے جو آجکل رائج ہے اور فرقہ پروٹسٹنٹ تو بے شمار چیزوں میں جن کی تعداد مانی سیک اسقف کے اقرار کے مطابق چھ سو ہے، زبانی روایت کا اعتبار کرنے پر مجبور ہے، نیز یہ کہ سفرامثال کے پورے پانچ باب حزقیاہ کے زمانے میں سلیمان علیہ السلام کی وفات سے بھی دوسو ستر سال بعد زبانی روایتوں سے جمع کئے گئے ہیں اسی طرح انجیل مرقس اور انجیل لوقا اور کتاب الاعمال کے ۱۹ اباب صرف زبانی روایتوں سے لکھے گئے ہیں،

یہ بات بھی معلوم ہو چکی ہے کہ اہم اور عظیم الشان واقعات و معاملات محفوظ بھی رہتے ہیں اور زمانے کا امتداد بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا، اور یہ کہ تابعین حضرات نے احادیث کو کتابوں میں جمع کرنا شروع کر دیا تھا، البتہ انہوں نے فقہی ابواب کی ترتیب کے موافق اپنی کتابوں کو ترتیب نہیں دیا تھا۔

ان کے بعد تبع تابعین نے فقہی ابواب کے مطابق مرتب کیا پھر ان سب کے بعد بخاریؒ اور دوسری صحاح کے مؤلفوں نے صرف صحیح حدیثوں کے ذکر پر اکتفاء کیا اور کمزور حدیثوں کو ترک کر دیا، نیز صحاح کے ہر مؤلف نے ہر ہر حدیث کو پانے سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک پوری سند کیساتھ نقل کیا اسی طرح اسماء الرجال کے نام سے عظیم الشان فن قائم کیا، اور کتابیں تصنیف کیں، جس کے ذریعے حدیث کے ہر راوی اور ناقل کا پورا پورا حال با آسانی معلوم ہو سکتا ہے نیز یہ کہ مسلمان صحیح حدیث کا کیونکر اعتبار کرتے ہیں؟

ان جملہ امور کے معلوم ہونے کے بعد مسلمانوں پر اس سلسلے میں کوئی بھی اعتراض واقع نہیں ہو سکتا۔

اس طرح ان کا یہ کہنا کہ ساری روایتیں تواتر کے ساتھ سنی اور نصف مقدار غلط اور معتبر نہ ہونے کی وجہ سے ساقط کر دی یہ بات غلط ہے، اس لئے محدثین کسی ایسی حدیث کو جو تواتر کے ساتھ سنی گئی ہو معتبر نہ ہونے کیوجہ سے ساقط نہیں کر سکتے کیونکہ

ایسی حدیث تو محدثین کے نزدیک واجب الاعتبار ہے، ہاں بیشک ان ضعیف حدیثوں کو ضرور چھوڑ دیا جن کی سندیں کامل نہ تھیں اور ان کا چھوڑنا مضر نہیں، جیسا کہ ناظرین اظہار الحق کے دوسرے باب میں آدم کلارک کی شہادت سے معلوم کر سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ:

یہ بات محقق ہے کہ بہت سی جھوٹی انجیلیں عہد مسیحی کی ابتدائی صدیوں میں رائج تھیں۔ ان غیر صحیح اور جھوٹی روایات کی کثرت نے لوقا کو جدید انجیل مرتب کرنے پر آمادہ کیا، اور اس قسم کی جھوٹی انجیلوں کی تعداد ۷۰ سے زیادہ مذکور پائی جاتی ہے، اس قسم کی جھوٹی انجیلوں کے بہت سے اجزاء آج بھی باقی ہیں۔ چنانچہ ثابرسی بوس نے ان جھوٹی انجیلوں کو جمع کر کے تین جلدوں میں طبع کیا ہے۔

بعض احادیث خلافِ واقعہ ہیں

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

ہر عاقل غیر متعصب جان سکتا ہے کہ اکثر حدیثوں کے معانی صادق اور واقع کے مطابق نہیں ہیں۔

جواب: یہ ہے کہ کوئی صحیح حدیث اس قسم کی پیش نہیں کی جا سکتی جس کا مضمون ممتنع اور عقل کے خلاف ہو اب رہے وہ معجزات جو عادات کے خلاف ہیں یا جنت دوزخ کے بعض حالات یا فرشتوں کے احوال جن کی نظیر اس دنیا میں موجود نہیں ہے سو اگر وہ ان چیزوں کو اس لئے مستبعد اور بعید سمجھتے ہیں کہ وہ دلائل کی بناء پر محال ہیں، تو عیسائی حضرات کے ذمہ ان دلائل کا پیش کرنا ضروری ہوگا، اور ہمارے ذمے ان کا جواب دینا بیشک لازمی ہوگا۔

اور اگر وہ محض اس لئے انکار کرتے ہیں کہ یہ باتیں محض عادت کے خلاف ہیں،

یا اس دنیا میں ان کی مثال یا نظیریں نہیں پائی جاتیں تو یہ چیز ہمارے لئے بالکل مضر نہیں ہے کیونکہ اگر معجزہ عادت کے موافق ہو تو وہ حقیقت میں معجزہ ہی نہیں ہوسکتا، بھلا بتائیے کہ لاٹھی کا اژدہا بن جانا، اور پھر اس کا تمام جادوگروں کے سانپوں کو نگل جانا پھر اس کا بغیر حجم میں کمی بیشی کے اپنی پہلی حالت پر واپس ہو کر لاٹھی بن جانا ۔(دیکھئے خروج ۴: ۱ تا ۴) اور اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے تمام معجزے عادت کے خلاف نہیں ہیں؟ اسی طرح کیا اس دوسرے عالم کو اس دنیا پر اور وہاں کی اشیاء کو یہاں کی چیزوں پر قیاس کرنا یہ غلط قیاس نہیں ہے؟ بے شک اگر کوئی قطعی دلیل ایسی موجود ہے جس سے عالم آخرت میں اس شے کے یقینی طور پر محال ہونے پر دلالت ہو رہی ہو تو بے شک اس حالت کو محال تسلیم کیا جاسکتا ہے، لیکن بغیر کسی قطعی دلیل کے عالم آخرت میں اس کے وجود سے انکار کی جرأت نہیں کی جاسکتی۔

کیا ایسی موٹی بات ان لوگوں کو نظر نہیں آتی کہ دنیا کے مختلف حصّوں اور اقلیموں (قدیم علمائے جغرافیہ نے زمین کو اس کی طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے سات حصوں پر منقسم کیا تھا ان میں سے ہر حصے کو اقلیم کہا جاتا ہے۔تقی) کا حال یکساں نہیں ہے ایک چیز جو ایک اقلیم میں پائی جاتی ہے اس کا دوسری اقلیم میں نام ونشان بھی نظر نہیں آتا، اب اگر ایک اقلیم کا شخص بعض ایسی عجیب چیزوں کا حال سنتا ہے جو دوسری اقلیم کے ساتھ مخصوص ہیں تو اس کو ضرور وہ مستبعد اور بعید معلوم ہوتا ہے، بلکہ بسا اوقات اس کا انکار کرنے لگتا ہے مگر یہ بات تب ہوتی ہے جب کہ اس نے بلا تواتر یہ بات سنی ہو۔

اسی طرح بعض چیزیں جو کسی ایک زمانے میں بعید معلوم ہوتی ہیں دوسرے وقت میں مستبعد نہیں معلوم ہوتیں، چنانچہ سمندری راستوں کو اس قدر تیزی کے ساتھ مشینی جہازوں کے ذریعہ یا خشکی کی مسافت کو اتنی تیزی کے ساتھ موٹروں کے ذریعے طے کر لینا جو ہمارے زمانے میں ایک عام بات ہو چکی ہے ان جہازوں اور موٹروں کی ایجاد سے پہلے لوگوں کے نزدیک نہایت بعید اور مستبعد سمجھا جاتا تھا، اسی طرح ٹیلی

گرام یا تار برقی کے ذریعے ایک دو سیکنڈ میں ہزاروں میل دور کی خبر کا پہنچ جانا ان آلات کی ایجاد اور ان کے مشاہدہ اور امتحان کے بعد اب وہ بعید اور مستبعد نہیں رہا۔

مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ معترضین عیسائی حضرات کی یہ پرانی عام عادت ہے کہ وہ انصاف کی آنکھ بند کر کے ہر اس چیز کی نسبت جو ان کی نگاہ و خیال میں مستبعد معلوم ہوتی ہے محال ہونے کا حکم لگا دیتے ہیں علمائے پروٹسٹنٹ نے یہ نامعقول عادت اپنی قوم کے ان لوگوں سے سیکھی ہے جن کو "ملحد" اور "بددین" کہتے ہیں، مگر ان علماء پر سخت حیرت ہوتی ہے کہ خود ان کی کتابیں بے شمار غلط چیزوں سے بھری پڑی ہیں جن کا کچھ نمونہ اظہار الحق باب۔۔۔۔اوّل کی تیسری فصل میں دیکھ سکتے ہیں ان معترضین کو اپنے ہم قوم لوگوں کے استبعاد سے ہوش نہ آیا، اور انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو ان دہریوں نے معترضین کے ساتھ کیا تھا، حالانکہ ان ملحدوں نے عیسائیوں کے عقیدوں اور روایتوں کو جو عقل کے خلاف سمجھا تھا وہ یقیناً زیادہ وزنی تھا، اور یہ عیسائی جو اعتراضات حدیثوں پر کرتے ہیں وہ ان کی نسبت سے بہت کمزور ہیں۔

ہم نمونہ کے طور پر ان مقامات کو ذکر کرتے ہیں جن کا مذاق دہریوں اور ملحدوں نے اڑایا ہے۔ مثلاً

عیسائی تعلیمات پر دہریوں اور ملحدوں کا استہزاء:

پہلی شہادت: کتاب گنتی باب ۲۲ آیت ۲۸ تا ۳۰ میں ہے:

"تب خداوند نے گدھی کی زبان کھول دی اور اس نے بلعام (بلعام بن بعور جسے موآبیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف لڑنے کے لئے بلایا تھا بائبل میں ہے کہ جب بلعام ان کی دعوت پر موآب جا رہا تھا، تو راستے میں اس کی گدھی خدا کے فرشتے کو دیکھ کر رک گئی بلعام نے اسے

مارا تو اس نے یہ بات کہی) سے کہا میں نے تیرے ساتھ کیا کیا ہے، کہ تو نے مجھے تین بار مارا؟ بلعام نے گدھی سے کہا اس لئے کہ تو نے مجھے چڑایا ، کاش! میرے ہاتھ میں تلوار ہوتی تو میں تجھے ابھی مار ڈالتا۔ گدھی نے بلعام سے کہا، کیا میں تیری وہی گدھی نہیں ہوں جس پر تو اپنی ساری عمر آج تک سوار ہوتا آیا ہے؟ کیا میں تیرے ساتھ کبھی ایسا کرتی تھی؟ اس نے کہا نہیں۔

ہورن اپنی تفسیر کی جلد ۲، صفحہ ۶۳۶ میں لکھتا ہے کہ کافر لوگ کچھ دنوں سے گدھی کے بلعام سے باتیں کرنے کا انکار کرنے لگے ہیں، اور اس چیز کا مذاق اڑاتے ہیں۔

دوسری شہادت: کتاب سلاطین اوّل کے باب ۱۷ میں ہے کہ کوّے عرصہ دراز تک ایلیاء پیغمبر کے لئے گوشت اور روٹی لاتے رہے اور یہ چیز ان کے ہم قوموں کے خیال میں محض ایک گپ ہے جس پر وہ ہنستے ہیں یہاں تک کہ ان کا مشہور محقق ہورن بھی ان کا ہم خیال ہو گیا اور اپنے مفسرین اور مترجمین کو تین وجوہ سے احمق اور بے وقوف قرار دیا۔

تیسری شہادت: کتاب حزقی ایل باب ۴ آیت ۴ میں جو واقعہ ہے ہم اسے عربی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۴۴ء کے مطابق نقل کرتے ہیں:

”پھر تو اپنی بائیں کروٹ پر لیٹ رہ (یہ بائبل کے بقول حضرت حزقی ایل علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے حکم سنایا جا رہا ہے۔) اور بنی اسرائیل کی بدکرداری اس پر رکھ دے جتنے دنوں تک تو لیٹا رہے گا تو ان کی بدکرداری برداشت کرے گا، اور جب تو ان کو پورا کر چکے تو پھر اپنی داہنی کروٹ پر لیٹ رہ ، اور چالیس دن تک بنی یہوداہ کی بدکرداری کو برداشت کر، میں نے تیرے لئے ایک ایک سال کے بدلے ایک ایک دن مقرر کیا ہے پھر تو یروشلم کے محاصرے کی طرف منہ کر اور اپنا بازو ننگا

کر، اور اس کے خلاف نبوّت کر اور دیکھ میں تجھ پر بندھن ڈالوں گا کہ تو کروٹ نہ لے سکے، جب تک اپنے محاصرے کے دنوں کو پورا نہ کر لے۔ اور تو اپنے لیئے گیہوں اور جو اور باقلا (یعنی لوبیا) اور مسور اور چنا اور باجرا لے، اور ان کو ایک ہی برتن میں رکھ اور ان کی اتنی روٹیاں پکا جتنے دنوں تک تو پہلی کروٹ پڑ لیٹا رہے گا۔ تو تین سو نوّے دنوں تک ان کو کھانا اور تیرا کھانا وزن کر کے بیس مثقال روزانہ ہوگا جو تو کھائے گا تو گاہے گاہے کھانا، تو پانی بھی ناپ کر ایک ھین کا چھٹا حصہ پیئے گا، تو گاہے گاہے پینا، اور تو جو کے پھلکے کھانا اور تو ان کی آنکھوں کے سامنے انسان کی نجاست سے ان کو لتھیڑنا۔'' (آیت ۷ تا ۱۲) (اظہار الحق میں ایسا ہی ہے ''تلطخه بذبل یخرج من لانسان'' لیکن موجودہ اردو اور انگریزی ترجموں میں اس کی جگہ یہ الفاظ ہیں: ''انسان کی نجاست سے ان کو پکانا'' جس سے بالکل مفہوم ہی بدل جاتا ہے، تقی)۔ اور مرزا پور کے ۱۸۷۰ کے مطبوعہ بائبل میں ہے ''اور تو ان کی آنکھوں کے سامنے انسان کی گوہ سے انہیں پکائے گا''۔ (امداد اللہ انور)

اس میں اللہ تعالیٰ نے حزقیال علیہ السلام کو تین حکم دیئے۔

۱۔ اپنی بائیں کروٹ پر تین سو نوے دن تک سوتے رہیں اور اولاد اسرائیل کے گناہوں کو برداشت کریں، پھر داہنی کروٹ پر چالیس دن تک سوئیں اور یہوداہ کی اولاد کے گناہ اپنے اوپر لادیں۔

۲۔ اورشیلم کے محاصرے کے وقت سامنے کی جانب منہ رکھیں اس حالت میں کہ ہاتھ بندھے ہوں اور جب تک محاصرے کی مدت پوری نہ ہو ایک جانب سے دوسری جانب متوجہ نہ ہوں۔

۳۔ ۳۹۰ دن تک روزانہ ایک روٹی کو انسان کا پاخانہ لگا کر کھاتے رہیں۔ ان

کے ہم قوم ان احکام کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان احکام کے منجانب اللہ ہونے کو مستبعد سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ باتیں واہیات اور عقل کے خلاف ہیں اللہ تعالیٰ اپنے کسی مقدس پیغمبر کو یہ حکم ہرگز نہیں دے سکتا کہ تین سو نوے دن تک روزانہ ایک روٹی انسان کی غلاظت لگا کر کھاتا رہے، کیا سوائے اس ترکاری کے کوئی اور سالن موجود نہ رہا تھا؟ ہاں بے شک ایک صورت ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ پاک لوگوں کے لئے پاخانہ بھی پاک بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ ان کے مقدس پولس کے کلام سے بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ ططس کے نام اس کے خط کے باب اوّل آیت ۱۵ میں صاف طور پر موجود ہے۔ ''پاک لوگوں کے لئے سب چیزیں پاک ہیں'' طِطُس ،۱:۱۵)۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ ہے کہ کتاب حزقی ایل ہی کے باب ۱۸ آیت ۲۰ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت حزقیلؑ کے واسطے سے ہمیں یہ بتلایا ہے کہ:

''بیٹا باپ کے گناہ کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور نہ باپ بیٹے کے گناہ کا بوجھ، صادق کی صداقت اسی کیلئے ہوگی اور شریر کی شرارت شریر کے لئے۔''

پھر اس کے بعد خود حضرت حزقیلؑ ہی کو چار سو تیس دن تک اسرائیل اور یہوداہ کے گناہوں کا بوجھ اٹھانے کا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے؟

چوتھی شہادت: کتاب یسعیاہ کے باب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا تھا کہ تین سال تک ننگے بدن اور ننگے پاؤں رہو، اور اسی حالت میں چلو پھرو۔ (جس طرح میرا بندہ یسعیاہ تین برس تک برہنہ اور ننگے پاؤں پھرا گیا [یسعیاہ، ۲۰:۳]) عیسائیوں کے ہم قوم اس حکم کا بھی مذاق اڑاتے ہیں اور استہزاء کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو جو صحیح العقل ہے مجنون بھی نہیں ہے یہ حکم دے رہا ہے کہ وہ تین برس تک تمام مردوں عورتوں کے سامنے مادرزاد ننگا پھرتا رہے؟

پانچویں شہادت: ہوسیع کی کتاب کے باب اوّل میں لکھا ہے کہ:

جا ایک بدکار بیوی اور بدکار کی اولاد اپنے لئے لے''۔ (آیت ۲)

پھر اسی کتاب کے باب ۴ (آیت ۱) میں ہے کہ:

"جا اس عورت سے جو اپنے یار کی پیاری اور بدکار ہے محبت رکھ۔"

دوسری طرف کتاب احبار کے باب ۲۱ آیت ۱۳ میں کاہن کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"اور وہ کنواری عورت سے بیاہ کرے جو بیوہ یا مطلقہ یا ناپاک عورت یا فاحشہ ہو ان سے وہ بیاہ نہ کرے بلکہ وہ اپنی ہی قوم کی کنواری کو بیاہ لے"۔

اور انجیل متی کے باب ۵ میں ہے کہ:

جس کسی نے بری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔ متی ۵:۲۸

پھر کیسے ممکن ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کو مذکورہ باتوں کا حکم دیدیا ہو؟

اسی قسم کی اور بھی مستبعد باتیں ہیں اگر کوئی صاحب دیکھنا چاہیں تو عیسائیوں کے ہم قوموں کی کتابوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

ا۔ حدیثیں قرآن کے مخالف ہیں؟

۲۔ کیا حضورؐ پہلے گمراہی اور جہالت میں مبتلا تھے؟

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

قرآن اعلان کرتا ہے کہ محمد ﷺ ابتداء میں گمراہی اور جہالت میں مبتلا تھے، (نعوذ باللہ) جیسا کہ سورۂ والضحیٰ میں وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى. اور اللہ نے آپ کو بے راہ پایا پھر ہدایت دی (ضحیٰ:۷) یا سورۂ شوریٰ میں مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا (آپ نہیں جانتے تھے کہ کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے لیکن ہم نے اسے ایک نور بنادیا جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت

دیتے ہیں (شوریٰ:۹۵) میں یہ بات صاف طور پر موجود ہے اس کے برعکس حدیثیں یوں کہتی ہیں کہ آپ خلقی اور پیدائشی طور پر ایمان کے ساتھ موصوف تھے اور اسی لئے آپؐ سے بہت سے معجزے ظاہر ہوئے قرآن وحدیث کے درمیان تعارض اور مخالفت ثابت کرنے کے لئے عیسائیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یہ ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

جواب: وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی کی تفسیر:

پہلی آیت میں "ضـال" سے مراد "ضال عن الایمان" نہیں ہے۔ یعنی ایمان سے بھٹکا ہوا۔ کہ کافر کے معنی میں ہو سکے اور عیسائیوں کے لئے موجب اعتراض بنے بلکہ اس آیت کی چند تفسیریں ہیں۔

اوّل مرفوع روایت میں منقول ہے "کہ میں بچپن میں اپنے دادا عبدالمطلب سے راستہ بھول کر الگ ہو گیا تھا، قریب تھا کہ شدت بھوک سے جان جاتی رہے کہ اللہ نے صحیح راستے پر ڈال دیا، اور میں دادا کے پاس پہونچ گیا۔ قلت لم اَجدہ مرفوعا فیما قلّبت ونظرت وانما رواہ ابن عباسؓ بطریق وکعبؓ بطریق آخر کما ذکرہ القرطبیؒ وابن کثیرؒ والبغوی (راجع تفسیر القرطبی ص ۹۷و۹۸ ج ۲۰ وتفسیر ابن کثیر ص ۵۲۳ ج ۴)

دوسرے مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ کو اپنی شریعت سے ناواقف پایا یعنی آپ کو اپنی شریعت کا علم الہام الٰہی کے بعد ہوا، یا وحی کے ذریعے، غرض خدا نے ہی شریعت کی جانب کبھی وحی جلی کے ذریعے اور کبھی وحی خفی کے ذریعے سے آپ کو حکم واحکام کے علم سے ناواقف پایا، پس خدا نے آپ کی رہنمائی کی اور وحی کے ذریعے حکم واحکام کی تعلیم دی اور غور وفکر کی توفیق عطا فرمائی، اسی قسم کا ارشاد موسیٰ علیہ السلام کے حق میں آیت ذیل میں فرمایا گیا ہے: "فَعَلْتُھَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ"۔

تیسرے یہ کہ عربی میں اس قسم کا محاورہ ہے جیسے کہا جاتا ہے: "ضَلَّ الْمَآءُ فِی اللَّبَنِ"، "یعنی پانی دودھ میں مل گیا"۔ لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہے کہ پہلے آپؐ مکہ

کے کافروں میں گھلے ملے تھے اور ممتاز و نمایاں اور ان سے الگ نہ تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو طاقت ور بنا دیا، جس سے آپؐ نے خدا کے دین کو چمکا دیا، اسی معنیٰ میں آیت ذیل میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے: "ءَ اِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ اَئِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيْدٍ". (اس آیت میں ہے کہ کیا جب ہم زمین میں گھل مل جائیں گے تو کیا پھر نئی پیدائش میں ہوں گے؟ (سجدہ: ۱۰)

چوتھے اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس سے قبل نبوّت کے ملنے کی کوئی توقع یا امکان نظر نہ آتا تھا۔ بلکہ اس کا تصور و خیال بھی آپ کو نہ ہوا تھا کیونکہ یہود و نصاریٰ میں یہ بات عام طور پر مشہور چلی آتی تھی کہ نبوت صرف اسرائیل کی اولاد کے ساتھ مخصوص ہے پس ہم نے آپؐ کے لئے نبوّت کی راہ کھول دی جس کی آپ کو کچھ بھی توقع نہ تھی۔

پانچویں یہ کہ آپ اس سے پہلے ہجرت اور ترک وطن کے مجاز نہ تھے، نہ آپ کو اس کا علم تھا نہ اس کی توقع کہ وطن چھوڑنے کی اجازت اور حکم ہوگا، پس اللہ تعالیٰ نے اذن و اجازت کے ساتھ ہجرت کی راہ کھول دی۔

چھٹے یہ کہ اہل عرب ایسے درخت کو جو کسی چٹیل میدان میں یکہ و تنہا پایا جائے "ضالہ" کہا کرتے تھے۔ اب آیت شریفہ کے معنیٰ یہ ہوئے کہ گویا حق تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ وہ عرب کا علاقہ اس چٹیل بیابان کی طرح تھا جس میں کوئی ایسا درخت جس پر ایمان کا پھل آتا ہو سوائے آپؐ کی ذات گرامی کے کوئی نہ تھا، گویا آپؐ جہل و ضلالت کے صحراء میں پائے جانے والے یکتا ایمان کے درخت تھے پس ہم نے آپؐ کے ذریعے مخلوق کی رہنمائی کی اسکی مثال حضور ﷺ کے ارشادات میں ملتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ۔ حکمت کی بات مومن کی گم شدہ چیز ہے۔

رواه الترمذی و ابن ماجه، عن ابی هریرةؓ بسند فيه وهْنٌ ولفظه "الكلمة الحكمة ضالة المؤمن". (مشکوٰۃ المصابیح، ص ۳۴ طبع کراچی)

ساتویں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ قبلہ کی نسبت متحیر وحیران تھے کیونکہ آپؐ کی پرانی آرزو تھی کہ کعبۃ اللہ کو قبلہ بنایا جائے، لیکن آپ کو پتہ نہ تھا کہ یہ آرزو پوری ہوگی یا نہیں؟ اس تحیّر کو ضلال کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا، پھر اللہ نے اس کا پتہ آپ کو اس ارشاد سے کردیا کہ "فَلَنُوَ لِّیَنَّکَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا"۔

آٹھویں ضلال کے معنی عربی زبان میں محبت کے بھی آتے ہیں چنانچہ آیت اِنَّکَ لَفِیْ ضَلاَ لِکَ الْقَدِیْمِ ۔ (ہم آپ کو ایسا قبلہ دیدیں گے جو آپ کو پسند ہوگا)۔(البقرہ) میں محبت ہی کے معنی مراد ہیں اب مطلب یہ ہوا کہ آپ محبّ اور اللہ کے عاشق تھے پس ہم نے آپؐ کی رہنمائی ان احکام شرعیہ کی جانب کی جن کے ذریعے آپ کو اپنے محبوب کے تقرب کی دولت نصیب ہو جائے۔

نویں یہ مطلب ہے کہ ہم نے آپ کو اپنی قوم میں کسمپرسی کی حالت میں پایا کہ وہ لوگ آپ کو اذیتیں دیتے چلے جاتے تھے، اور آپؐ کی شخصیت کا قطعی احترام ولحاظ نہ کرتے تھے پس آپؐ کے مشن اور تحریک کو طاقتور بنا کر آپ کو ان کا حاکم اور والی بنادیا۔

دسویں یہ کہ اس سے قبل آپ کو آسمانی راستوں اور راہوں کا پتہ نہ تھا، شب معراج کے ذریعہ ہم نے آپؐ کی رہنمائی آسمانی راستوں کی جانب فرمائی۔

گیارھویں یہ کہ ہم نے آپ کو بھولنے والا پایا، پس آپ کو یاد دلا دیا، یعنی شب معراج میں حضوری کے وقت اللہ کی ہیبت اور خشیت کی وجہ سے اس موقع پر دربار شاہی کے آداب کے تحت جو کچھ آپ کو عرض کرنا چاہیے تھا وہ آپ بھول گئے تھے، اللہ نے آپ کو خدا کی حمد وثناء کا مضمون یاد دلا دیا، چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ "لا احصی ثناء علیک" اس معنی کیلئے اس آیت میں ضلال کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ "اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى"۔ (گواہ عورتیں دو کیوں ہونی چاہیں؟ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے سورۂ بقرہ میں ہے کہ "اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلائے)۔

بارہویں حضرت جنیدؒ کا ارشاد ہے کہ آپؐ کو احکام قرآنی کے بیان وتوضیح میں متحیر اور حیران پایا، پس آپؐ کو اس کی توضیح وتفسیر کا طریقہ بتادیا، آیت ذیل اس پر شاہد ہے: **وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ**. (اور ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) اتارا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے کھول کھول کر وہ باتیں بیان فرمادیں جو ان کیلئے اتاری گئی ہیں۔(نحل))

نیز آیت ذیل بھی اس مضمون کی تائید کرتی ہے: **لَا تُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ**. (روایات میں ہے کہ نزول قرآن کے وقت آپؐ قرآنی آیات کو یاد کرنے کے لئے انہیں ساتھ ساتھ دہراتے تھے کہ بھول نہ جائیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی "اپنی زبان کو اس (قرآن) کے ساتھ حرکت مت دو تاکہ تم اس کے ساتھ جلدی کرو، بلاشبہ ہمارے ذمہ اس کا جمع کرنا اور پڑھنا ہے، پھر جب ہم اسے پڑھ لیں تو آپؐ اس کے پڑھنے کی اتباع کیجئے، پھر اسکی تشریح وتبیین بھی ہمارے ذمے ہے"۔(قیامہ) اسی طرح آیت ذیل: **وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ وَحْیُہٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا**. (اور آپؐ قرآن (کو پڑھنے) میں جلدی نہ کیجئے قبل اس کے کہ اس کی وحی آپؐ پر پوری ہوجائے اور یہ کہئے کہ "اے میرے پروردگار علم کے اعتبار سے مجھ میں اضافہ فرمادے"۔(طٰہٰ:۱۱۴))

غرض کسی صورت میں بھی اس آیت سے عیسائیوں کا استدلال اپنے دعوے پر صحیح نہیں ہے، آیت مذکور کی تفسیر ان مذکورہ صورتوں میں سے کسی ایک طریق سے کرنا ضروری ہے، یا پھر ان معانی کے ساتھ جن کو مفسرین نے آیت ذیل کی تفسیر میں ذکر کیا ہے "**مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی**". (نہ تمہارے ساتھی (یعنی آنحضرت ﷺ) بھٹکے نہ گمراہ ہوئے" (النجم) کیونکہ اس سے بلاشبہ دینی امور میں ضلالت اور غوایت کی نفی مقصود ہے، مطلب یہ ہے کہ نہ آپؐ سے کفر کا صدور ہوا نہ اس سے کم چیز یعنی فسق کا۔

دوسری آیت (یعنی مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتَابُ الخ) میں کتاب سے مراد قرآن اور ایمان سے مراد احکام شرعیہ کی تفصیلات ہیں، مطلب یہ ہے کہ قرآن کے نازل ہونے سے پہلے اس کے پڑھنے اور جملہ فرائض واحکام کی تفصیلات کا علم آپ کو نہ تھا، یہ بات قطعی صحیح ہے، کیونکہ حضور ﷺ وحی کے نازل ہونے سے قبل توحید پر اجمالی طور پر ایمان رکھتے تھے، اسکی اور جملہ احکام شرعیہ کی تفصیلات کا حال آپ کو معلوم نہ تھا، جو آپ کو نزول وحی کے بعد حاصل ہوا۔ یا پھر ایمان سے مراد نماز ہے جیسا کہ آیت ذیل میں وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَکُمْ. اور اللہ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔" (البقرہ: ع ۱۷) میں ایمان سے مراد نماز ہے، اب آیت کا مطلب یہ ہوا کہ آپ قرآن اور نماز سے واقف نہ تھے، اور یہ بات یقینی ہے کہ حضور ﷺ کو نبوت سے قبل اس نماز کی کیفیت کا جو بعد کو آپ کی شریعت میں مشروع ہوئی ہے علم نہیں تھا، یا پھر ایمان سے مضاف محذوف ہونے کی بناء پر اہل ایمان مراد ہیں یعنی آپ کو قرآن اور اہل ایمان کا علم نہ تھا، کہ کون لوگ آپ پر ایمان لائیں گے، اور مضاف کا محذوف ہونا کتب مقدسہ میں بکثرت موجود ہے۔

چنانچہ:

مضاف محذوف ہونیکی شہادت کتب مقدسہ سے

زبور نمبر ۷۸ آیت نمبر ۲۲ میں ہے: موجودہ زبور ۷۸: ۲۱

"پس خداوند یہ سنکر غضبناک ہوا، اور یعقوب کے خلاف آگ بھڑک اٹھی، اور اسرائیل پر قہر ٹوٹ پڑا۔"

اور کتاب یسعیاہ باب نمبر ۱۷ آیت نمبر ۴ میں ہے:

"اور اس وقت یوں ہوگا کہ یعقوب کی حشمت گھٹ جائیگی، اور اس کا چربی دار بدن دبلا ہو جائے گا۔"

اور یسعیاہ باب ۴۳ آیت ۲۲ میں ہے:

''تو بھی اے یعقوب! تو نے مجھے نہ پکارا بلکہ اے اسرائیل! تو مجھ سے تنگ آ گیا۔''

اور آیت ۲۸ میں ہے:

''اس لئے میں نے مقدس کے امیروں کو ناپاک ٹھہرادیا، اور یعقوب کو لعنت اور اسرائیل کو طعنہ زنی کے حوالے کیا۔''

اور کتاب یرمیاہ باب نمبر ۳ آیت نمبر ۶ میں ہے:

''اور یوسیاہ بادشاہ کے ایام میں خداوند نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تو نے دیکھا برگشتہ اسرائیل نے کیا کیا ہے؟ وہ ہر ایک اونچے پہاڑ پر اور ہر ایک درخت کے نیچے گئی اور وہاں بدکاری کی، اور جب وہ یہ سب کچھ کر چکی تو میں کہا وہ میری طرف واپس آئے گی، پر وہ نہ آئی اور اس کی بے وفا بہن یہوداہ نے یہ حال دیکھا، پھر میں نے دیکھا کہ جب برگشتہ اسرائیل کی زنا کاری کے سبب سے میں نے اس کو طلاق دیدی اور اسے طلاق نامہ لکھ دیا، تو بھی اس کی بے وفا بہن یہوداہ نہ ڈری، بلکہ اس نے بھی جا کر بدکاری کی،..........اور خداوند فرماتا ہے کہ باوجود اس سب کے اس کی بے وفا بہن یہوداہ سچے دل سے میری طرف نہ پھری، بلکہ ریاکاری سے ....اے برگشتہ اسرائیل واپس آ''۔ (آیت ۶ تا ۱۲)

اور کتاب ہوسیع باب نمبر ۴ آیت نمبر ۱۵ میں ہے:

''اے اسرائیل: اگر چہ تو بدکاری کرے تو بھی ایسا نہ ہو کہ یہوداہ بھی گنہگار رہو،......کیونکہ اسرائیل نے سرکش بچھیا کی مانند سرکشی کی ہے ......افرائیم بتوں سے مل گیا ہے۔'' (آیات ۱۵ تا ۱۷)

اور ہوسیع باب نمبر ۸ میں ہے:

''اسرائیل نے بھلائی کو ترک کردیا''..........''اسرائیل نگلا گیا، اب وہ

قوموں کے درمیان ناپسندیدہ برتن کے مانند ہوں گے......افرائیم نے گنہگاری کیلئے بہت سی قربان گاہیں بنائیں..........اسرائیل نے اپنے خالق کوفراموش کر کے بت خانے بنائے ہیں۔

(علی الترتیب آیات ۳، ۸، ۱۱، ۱۴)

اب ان عبارتوں میں مضاف کا حذف ماننا نہایت ضروری ہے، ورنہ خدا کی پناہ یہ لازم آئے گا کہ یعقوب علیہ السلام مغضوب علیہ اور کم بزرگی والے اور خدا کی طرف دعوت نہ دینے والے اور قاتل وناشکرے اور انکی نافرمان بیوی ہر درخت کے نیچے زنا کرنے والی تھی اور وہ خدا کی طرف رجوع کرنے والے نہ تھے، اور سرکش بچھیا کی طرح تھے، اور نیکی کو حقیر سمجھنے والے تھے اور ناپاک برتن کی مانند اور خدا کو بھولے ہوئے تھے۔

کیا احادیث میں اختلاف اور تعارض ہے

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

حدیثوں میں اختلاف وتعارض پایا جاتا ہے:

جواب: ہمارے نزدیک معتبر حدیثیں وہ ہیں جو کتب صحاح میں منقول ہیں اور جو حدیثیں ان کے علاوہ دوسری کتابوں میں پائی جاتی ہیں نہ وہ ہمارے نزدیک معتبر ہیں اور نہ صحیح حدیثوں سے ان کا تعارض ممکن ہے، بالکل اسی طرح جیسا کہ ابتدائی صدیوں میں ستر سے زیادہ پائی جانے والی انجیلیں عیسائی حضرات کے نزدیک موجودہ چار انجیلوں کے معارض نہیں ہوسکتیں۔ (نصاریٰ تسلیم کرتے ہیں کہ ابتداء میں بہت سے لوگوں نے انجیلیں لکھی تھیں، ان انجیلوں میں بہت سی باتیں اناجیل اربعہ کے خلاف بھی ہیں، لیکن وہ لوگ چار انجیلوں کی بات کو درست قرار دیکر باقی تمام روایات کو رد کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اناجیل اربعہ سنداً قوی ہیں اور باقی انجیلیں ان کے مقابلے میں کمزور اس لئے کوئی تعارض نہیں)۔

اور صحیح حدیثوں میں اگر کہیں تعارض بظاہر نظر آتا ہے تو وہ عموماً معمولی تامل کے بعد دور ہو جاتا ہے۔ اور پھر بھی یہ اختلاف اتنا شدید نہیں ہو سکتا جس قدر ان کی مقدس کتابوں کی روایتوں میں آج تک چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ اظہار الحق کے پہلے باب میں اس کے ۱۲۴ نمونے آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اور اگر ہم ان کی مقبول کتابوں میں سے ایسے اختلاف نقل کرنے لگیں جس قسم کے عیسائی لوگ بعض صحیح حدیثوں میں ثابت کرتے ہیں تو کوئی باب بھی اس قسم کے اختلاف سے خالی نہیں ملے گا۔

جن لوگوں کو علمائے پروٹسٹنٹ ملحد اور بد دین کہتے ہیں انہوں نے اس قسم کے اختلافات بہت کچھ نقل کئے ہیں، اور ان کا خوب مذاق اڑایا ہے، اگر کوئی صاحب دیکھنے کا شوق رکھتے ہوں تو وہ ان کتابوں کو ملاحظہ فرمائیں، ہم بھی بطور نمونے کے جان کلارک کی کتاب مطبوعہ ۱۸۳۹ء لندن سے اور کتاب اکسیہو مو مطبوعہ لندن ۱۸۱۳ء وغیرہ سے ۳۵ اختلافات جو اللہ کی ذات وصفات کے بارے میں ہیں دونوں عہدوں کی کتابوں سے نقل کرتے ہیں۔ اور صرف اختلاف کے نقل کرنے پر اس لئے اکتفاء کرتے ہیں کہ معترضین (خدا ان کو ہدایت دے) نے اگرچہ ان اختلافات پر تبصرہ کرتے ہوئے ادب کے حدود سے تجاوز کیا ہے، مگر یہ تجاوز اس گستاخی اور بے ادبی سے پھر بھی کم ہے، جو ان کے کلام میں انبیاء علیہم السلام پر طعن و تشنیع کرتے وقت بالخصوص مریم اور عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے وقت کی جاتی ہے چنانچہ اختلاف نمبر ۲۴ میں جو قول ہم ضمناً نقل کریں گے اس سے آپ کو یہ بات واضح ہو جائے گی، اور یہ اعتراضات ہم نے صرف ناظرین کی بصیرت میں اضافہ کرنے کی غرض سے نقل کئے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ علمائے پروٹسٹنٹ جس قسم کے اعتراضات صحیح حدیثوں پر کرتے ہیں وہ ان اعتراضات سے بہت ہی خفیف اور ہلکے ہیں جس قسم کے اعتراض ان کے ہم قوم مقدس کتابوں کے مضامین پر کرتے ہیں میں نے اُن اعتراضات کو اس لئے نقل نہیں کیا کہ ہمارے نزدیک وہ ٹھیک اور مناسب ہیں بلکہ ہم تو دونوں فریق کی

لغویات سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، اور پناہ مانگتے ہیں۔ مگر نقل کفر کفر نباشد کے ماتحت بیان کئے جاتے ہیں۔

مقدس کتابوں کے اختلاف جو ملحدین نے بیان کئے ہیں:

اختلاف نمبر ۱:

زبور نمبر ۱۴۵ کی آیت ۸ میں ہے:

"خداوند رحیم وکریم ہے، وہ قہر کرنے میں دھیما اور شفقت میں غنی ہے ،خداوند سب پر مہربان ہے"۔ (آیت ۸ و ۹)

اور کتاب سموئیل اوّل باب نمبر ۶ آیت نمبر ۱۹ میں ہے:

"اور اس نے (یعنی خدا نے) بیت شمس کے لوگوں کو مارا، اس لئے کہ انھوں نے خداوند کے صندوق کے اندر جھانکا تھا، سو اس نے ان کے پچاس ہزار اور ستر آدمی مار ڈالے۔"

ذرا خدا کی بے شمار "رحیمی" اور "بردباری" ملاحظہ کیجئے کہ خاص اپنی قوم کے پچاس ہزار ستر انسانوں کو کس بیدردی کے ساتھ معمولی خطا پر قتل کر ڈالا؟

اختلاف نمبر ۲:

کتاب استثناء باب نمبر ۳۲ آیت نمبر ۱۰ میں ہے:

"وہ خداوند کو ویرانے اور سونے ہولناک بیابان میں ملا۔ (بائبل کے بیان کے مطابق یہ حضرت موسیٰؑ کا کلام ہے جس میں وہ بنی اسرائیل پر خدا کی شفقتوں کا ذکر فرما رہے ہیں کہ اللہ نے ان کی کیسی خبر گیری فرمائی)۔ خداوند اس کے چوگرد رہا اس نے اس کی خبر لی اور اسے اپنی آنکھ کی پتلی کی طرح رکھا۔"

اور کتاب گنتی باب نمبر ۲۵ آیت نمبر ۳ میں ہے:

"تب خداوند کا قہر بنی اسرائیل پر بھڑکا، اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا قوم

کے سب سرداروں کو پکڑ کر خداوند کے حضور دھوپ میں ٹانک دے، تاکہ خداوند کا شدید قہر اسرائیل پر سے ٹل جائے"۔

پھر اسی باب کی آیت نمبر ۹ میں ہے:

"اور جتنے اس وباء سے مرے ان کا شمار چوبیس ہزار تھا۔

ذرا ملاحظہ کیجئے اپنی قوم کی کس طرح اپنی آنکھوں کے برابر حفاظت کی ہے کہ موسیٰ کو حکم دیدیا کہ قوم کے سارے رئیسوں کو پھانسی چڑھادو، اور چوبیس ہزار انسان ہلاک کردیئے۔

اختلاف نمبر ۳:

کتاب استثناء کے باب نمبر ۸ آیت نمبر ۵ میں ہے:

"اور تو اپنے دل میں خیال رکھنا کہ جس طرح آدمی اپنے بیٹے کو تنبیہ کرتا ہے ویسے ہی خداوند تیرا خدا تجھ کو تنبیہ کرتا ہے"۔

اور کتاب گنتی باب نمبر ۱۱ آیت ۳۳ میں ہے:

"اور ان کا گوشت انہوں نے دانتوں سے کاٹا ہی تھا اور اسے چبانے بھی نہ پائے تھے کہ خداوند کا قہر ان لوگوں پر بھڑک اٹھا، اور خداوند نے ان کو بڑی سخت وباء سے مارا"۔

کیا کہنے ہیں باپ کی طرح سزا دینے کے وہ بیچارے بھوکے فاقہ مست لوگ جب ان کو گوشت نصیب ہوا تو ابھی انہوں نے کھانا ہی شروع کیا تھا کہ ایک دم غریبوں پر اتنی سخت مار پڑی۔

اختلاف نمبر ۴:

کتاب میکا کے باب نمبر ۷ میں اللہ کی نسبت یوں فرمایا گیا ہے: وہ شفقت کرنا پسند کرتا ہے"۔

اور کتاب استثناء کے باب نمبر ۷ میں آیت نمبر ۲ میں یوں کہا گیا ہے:

''اور جب خداوند تیرا خدا ان کو تیرے آگے شکست دلائے اور تو ان کو مار لے تو تو ان کو بالکل نابود کر ڈالنا، تو ان سے کوئی عہد نہ باندھنا اور نہ ان پر رحم کرنا۔''

اور اسی باب کی آیت نمبر ۱۶ میں ہے:

''اور تو ان سب قوموں کو جن کو خداوند تیرا خدا تیرے قابو میں کر دے گا ، نابود کر ڈالنا، تو ان پر ترس نہ کھانا۔''

ذرا دیکھئے اللہ کس قدر رحم و کرم کو پسند فرما رہا ہے کہ بنی اسرائیل کے سات عظیم الشان قبیلوں کے قتل کا حکم دے رہا ہے اور ان پر قطعی رحم نہ کرنے کا اور معاف نہ کرنے کا۔

اختلاف نمبر ۵:

رسالہ یعقوب کے باب نمبر ۵ آیت نمبر ۱۱ میں یوں کہا گیا ہے کہ:۔

''اور خداوند کی طرف سے اس کا جو انجام ہوا اسے بھی معلوم کر لیا جس سے خداوند کا بہت ترس اور رحم ظاہر ہوتا ہے۔''

اور کتاب ہوشع کے باب نمبر ۱۳ آیت نمبر ۱۶ میں یوں ہے کہ:

''سامریہ اپنے جرم کی سزا پائے گا کیونکہ اس نے اپنے خدا سے بغاوت کی ہے وہ تلوار سے گر جائیں گے ان کے بچے پارہ پارہ ہوں گے اور بار دار عورتوں کے پیٹ چاک کئے جائیں گے۔''

معصوم بچوں اور حاملہ عورتوں کے حق میں کتنی شفقت اور رحم کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔

(واضح رہے کہ اسلام نے دشمن کے ساتھ کہیں اس قسم کی بدسلوکی کو روا نہیں رکھا اسلام کے اصول جنگ کا پہلا سبق آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا بَعَثَ جَیْشاً قَالَ اِنْطَلِقُوْا بِسْمِ اللّٰهِ وَلَا تَقْتُلُوْا شَیْخاً فَانِیاً وَلَا طِفْلاً صَغِیْراً وَلَا امْرَأَةً وَلَا تَغُلُّوْا وَضُمُّوْا غَنَائِمَکُمْ

وَاَصلِحُوْا وَاَحسِنُوا اِنَّ اللہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ.

(جمع الفوائد، ص ۸ ج ۲ بحوالہ ابوداؤد)

ترجمہ:- حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ کوئی لشکر روانہ فرماتے تو ان سے فرماتے کہ اللہ کے نام پر جاؤ اور نہ کسی بہت عمر رسیدہ بوڑھے کو قتل کرنا، نہ کسی چھوٹے بچے کو اور نہ کسی عورت کو، اور مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا، اور اپنے مالِ غنیمت کو جمع کرنا، اور اصلاح کرنا اور اچھا سلوک کرنا، بلاشبہ اللہ نیکو کاروں کو پسند کرتا ہے۔

حضورؐ کی بیان کردہ بہت سی پیش گوئیاں پوری نہیں ہوئیں:

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

حضورؐ کی بیان کردہ بہت سی پیش گوئیاں پوری نہیں ہوئیں:

جواب: مقدس کتابوں کی بیان کردہ پیشینگوئیاں جو غلط نکلیں۔

پہلی وہ پیشگوئی جو کتاب پیدائش کے باب ۶ میں منقول ہے، دوسری وہ جو کتاب اشعیاء کے باب ۷ آیت ۸ میں منقول ہے، تیسری وہ خبر جو کتاب ارمیاہ کے باب ۲۹ میں منقول ہے، چوتھے وہ خبر جو کتاب حزقیال کے باب ۲۶ میں اور پانچویں وہ خبر جو کتاب دانیال کے باب ۸ میں مندرج ہے، چھٹے وہ خبر جو کتاب مذکور کے باب ۹ میں منقول ہے، ساتویں وہ خبر جو کتاب مذکور کے باب ۱۲ میں ہے، آٹھویں وہ خبر جو سفر سموئیل ثانی باب ۷ میں ہے۔ نویں وہ خبر جو انجیل متیٰ کے باب ۱۲ آیت ۳۹ و ۴۰ میں ہے دسویں وہ خبر جو انجیل متی کے باب ۱۶ آیت ۲۷ تا ۲۸ میں ہے گیارھویں وہ خبر جو انجیل متی کے باب ۲۴ میں ہے، بارھویں وہ خبر جو انجیل متیٰ کے باب ۱۰ میں مذکور ہے۔

یہ تمام پیشینگوئیاں غلط اور جھوٹی ثابت ہوئیں، جیسا کہ باب اوّل سے معلوم

ہو چکا ہے اب اگر کوئی عیسائی معترض حضور ﷺ کی بیان کردہ پیشینگوئیوں پر جو آئندہ پیش آنے والے امور کی نسبت آپؐ نے کی ہیں اعتراض کرنے کی جرأت کرے تو اسکے لئے ضروری ہوگا کہ پہلے ان مذکورہ پیشینگوئیوں کی سچائی ثابت کرے، جو کہ ان کی مقدس کتابوں میں موجود ہیں۔ تب اس کو حضور ﷺ کی پیشینگوئیوں پر اعتراض کرنے کا حق ہوسکتا ہے۔

صحابہؓ نے حضرت عائشہؓ سے عریاں سوال کیوں کیا

اعتراض: (منکر حدیث غلام جیلانی برق کا اعتراض)

عن عبد الرحمٰنؓ بن عوف قال سالت عائشہؓ مایوجب الغسل قالت اذا جا وز الختان الختان فقد وجب الغسل.

(مؤطا ص ۱۶)

عبدالرحمٰنؓ بن عوف کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کس صورت میں غسل واجب ہو جاتا ہے کہا جب آلہ تناسل کا سر عورت کی شرمگاہ کے ابتدائی حصے میں داخل ہو جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اس زمانہ میں سینکڑوں صحابہ مدینے میں موجود تھے اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف خود بھی فقیہ صحابہ میں شمار ہوتے تھے اس مضمون پر احادیث بھی لوگوں کو یاد ہوں گی اور پھر انہوں نے یہ کمال کیا کہ ایک نہایت نازک مسئلہ حضور علیہ السلام کی سب سے کم عمر زوجہ مطہرہ سے جا پوچھا کیا مدینہ بھر میں اس چھوٹی سی بات کو کوئی مرد بتانے والا موجود نہیں تھا؟ کیا کوئی غیر مرد کسی معزز خاتون سے اس قسم کی بات دریافت کرنے کی جرأت کرسکتا ہے؟ اور اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ابن عوفؓ یہ غلطی کر بیٹھے تھے تو حضرت عائشہؓ کو چاہیے تھا کہ اس جسارت پر ڈانٹتیں کہ تم کو حرم نبوی سے ایسا عریاں سوال پوچھنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ یا خاموشی اختیار فرما لیتیں یہ

آلۂ تناسل کا سر شرمگاہ میں داخل ہونا۔ ایسے ننگے الفاظ ہیں جو ایک حیادار اور شریف خاتون اپنے شوہر کے سامنے بھی منہ سے نہیں نکال سکتی چہ جائیکہ غیر مردوں کے سامنے۔ (دو اسلام ص ۱۶۴ و ص ۱۶۵ طبع اوّل و ص ۱۷۸ طبع ششم)

بیان کو جاری رکھتے ہوئے آگے لکھا ہے کہ:

میری اس رائے پر حدیث پرست علماء چیخ اٹھیں گے تو کون ہوتا ہے۔ امام مالکؒ کی حدیث کی تردید کرنے والا الخ (ص ۱۶۶ طبع اوّل و ص ۱۷۸ طبع ششم)

جواب: اس سے پہلے کہ ہم پیش کردہ مرکزی سوال کا جواب دیں، چند ضروری باتیں عرض کرتے ہیں۔

۱۔ ابتداء اسلام میں یہ حکم تھا کہ انزال کے بغیر غسل واجب نہیں ہوتا تھا اور بعد کو یہ حکم منسوخ ہوگیا تھا جس کی پوری تفصیل اپنے موقع پر بیان کی جا چکی ہے،

۲۔ جن بعض صحابہ کو نسخ کا علم نہ تھا وہ اسی سابق حکم پر فتویٰ دیتے تھے اور جن کو نسخ کا علم ہو چکا تھا (جو جمہور صحابہؓ تھے) وہ ان کو ایسا فتویٰ دینے سے منع کرتے تھے اور نوبت بایں جا رسید کہ اس مسئلہ پر صحابہ کرامؓ میں کافی لے دے ہوئی اور جن صحابہؓ نے حضور علیہ السلام سے براہِ راست نہ پہلا حکم سنا اور نہ دوسرا وہ کافی پریشان تھے اور ہر ایک اس کے لیے بے تاب تھا کہ یہ ایسا اہم مسئلہ ہے جس پر نماز و طواف وغیرہ بڑی بڑی عبادتیں موقوف ہیں اس کو طے کر لینا چاہیے۔

۳۔ گو جمہور صحابہؓ پہلے حکم کو منسوخ سمجھتے تھے لیکن جن بعض کو نسخ کا علم نہ تھا انہوں نے پہلا حکم براہ راست آنحضرت ﷺ سے سنا تھا اور تاوقتیکہ ان کو کسی معقول دلیل اور روشن ثبوت سے نہ تسلیم کرایا جاتا ان کی تسلی کیسے ہو سکتی تھی؟ اس لیے ان کی رائے بھی بلا کسی بیّن ثبوت کے نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تسلی اور اطمینان کے لیے اس مسئلہ کو موضوع بحث بنا کر اپنے اختلاف کو نمایاں طور پر بیان کیا تھا۔

۴۔ صحابہ کرامؓ کے اس اختلاف کو دیکھ کر جب حضرت موسیٰ اشعریؓ کو تسلی نہ ہوئی تو مجبوراً ان کو حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کرنا پڑا۔

فقال لها لقد شق عَلَیَّ اختلاف اصحاب النبی ﷺ فی امرانی لاعظم ان استقبلک به فقالت ماهو ماکنت سائلا عنه امک فسلنی عنه الحدیث.

(موطا امام مالک ج ۱ ص ۴۵ طبع مصر)

ترجمہ: کہ اس معاملہ میں صحابہ کرامؓ کے اختلاف کی وجہ سے میں بہت کافی پریشان ہوں لیکن ساتھ ہی ہمت اور جرأت نہیں پڑتی کہ آپ سے یہ مسئلہ پوچھ سکوں حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ جو بات تم اپنی والدہ سے پوچھ سکتے ہو وہ مجھ سے بھی پوچھ لو۔ (میں بھی تو آخر تمہاری والدہ کی مانند ہوں)۔

چونکہ قرآن کریم میں ازواج مطہراتؓ کو مومنوں کی مائیں کہا گیا ہے اس لیے حضرت عائشہؓ کا یہ فرمان بے جا نہ تھا، چنانچہ حضرت ابو موسیٰؓ کو جواب سن کر تسلی ہوئی اور فرمایا مجھے آپ کے بعد کسی اور سے سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (موطا ص ۴۵)

۵۔ جب صحابہ کرامؓ کے اختلاف کا یہ عالم تھا تو برق صاحب ہی فرمائیں کہ جناب رسول خدا ﷺ کے قول اور خاص طور پر عمل کے بارے میں وہ کس سے پوچھتے اور کس سے سوال کرتے؟ صحابہؓ کا حضرت عائشہؓ سے دریافت کرنا اس مسئلہ پر گویا آخری فیصلہ کرانا تھا ان کا حضرت صدیقہؓ سے دریافت کرنا اُس لحاظ سے ہرگز نہ تھا جس کو برق صاحب نے کم عمر زوجہ مطہرہ کا پہلو اختیار کر کے اپنی بد باطنی اور بری فطرت کا ثبوت دیا ہے، جب فیصلہ صحابہ کرامؓ نے سن لیا تو سب کو یقین ہو گیا اور جن کو غلط فہمی تھی انہوں نے اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیا اور جمہور صحابہؓ کا اس پر عمل اتفاق اور اجماع ہو گیا بقیہ ازواج کو چھوڑ کر ان سے دریافت کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ازواج

مطہراتؓ سے ذہین اور شرعیات میں باخبر تھیں۔ بلکہ بڑے بڑے کبار صحابہؓ جس مسئلہ کو از خود حل نہ کر سکتے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مراجعت فرماتے تھے وہ مسلمہ فقیہ النفس ہونے کی وجہ سے درایۃً اور روایۃً اس کو حل فرما دیتی تھیں خود آنحضرت ﷺ کی محبت کا غالب منشاء بھی یہی ان کا کامل سمجھ دار ہونا تھا۔ نہ وہ جو برق صاحب کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے۔

برق صاحب ان روایات کے متعلق کیسا ہی نظریہ کیوں نہ قائم کریں لیکن حقیقت یہ ہے حضرت عائشہؓ کی کتنی قربانی اور ایثار ہے کہ امت کی سہولت کے لیے انہوں نے ایسی باتیں نمایاں اور آشکارا کر دی ہیں جن کو شاید کوئی بڑی مہربان اور شفیق ماں بھی بیان نہ کر سکے، ان ضروری امور کے بعد آپ برق صاحب کی پیش کردہ روایت کا جواب سنئے اصل روایت یوں تھی:۔

عن ابی سلمة بن عبد الرحمنؓ بن عوف قال سألت عائشةؓ زوج النبی ﷺ مایوجب الغسل.فقال هل تدری ما مثلک یا ابا سلمة مثل الفرّوج یسمع الدیکة تصرخ فیصرخ معها اذا جاوز الختان الختان فقد وجب الغسل.

(مؤطا امام مالک ص ۲۵ طبع مصر و مؤطا امام محمد ص ۷۸)

ترجمہ: عبد الرحمنؓ بن عوف کے لڑکے ابو سلمہؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے جو آنحضرت ﷺ کی زوجہ مطہرہؓ تھیں دریافت کیا کہ غسل کس چیز سے واجب ہوتا ہے؟ وہ بولیں اے ابو سلمہ تم جانتے ہو تمہاری کیا مثال ہے؟ تمہاری مثال ایسی ہے جیسے چوزۂ مرغ مرغوں کی جماعت کو بانگ دیتا سنے تو وہ بھی ساتھ ہی بانگ دینے لگ پڑے سن لو اپنے سوال کا جواب جب خاوند کے آلۂ تناسل کا سر ختنہ عورت کی شرمگاہ میں داخل ہو تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔

علامہ ابوالولید الباجیؒ (المتوفی ۴۷۴ھ) اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ابو سلمہؒ نابالغ بچے تھے انہوں نے قبل از وقت ایک ایسا سوال کیا جس کی ان کو ضرورت نہ تھی اور حضرت عائشہؓ نے ڈانٹ کر اس کو چوزۂ مرغ سے تشبیہ دی کہ جوان اور عمر رسیدہ مرغوں کو دیکھ کر وہ بھی ان کے ساتھ بانگ دینے میں شرکت کرتا ہے حالانکہ اس کا ایسا کرنا قبل از وقت ہے (دیکھئے تعلیق الممجد ص ۷۸) معہذا حضرت عائشہؓ نے اصل مسئلہ بتلا بھی دیا تاکہ ابوسلمہؒ کی مزید دل شکنی نہ ہو اور آئندہ اگر کوئی دینی مسئلہ پوچھنا ہو تو پوچھ سکیں مزید براں کتمان علم کا گناہ بھی پیش نظر ہوگا بہرحال ابوسلمہؒ کو قدرے تنبیہ کر کے ان کے سوال کا تسلی بخش جواب دے دیا اور یہ بھی یاد رکھئے کہ ابو سلمہؒ حضرت عائشہؓ کے رضاعی بھانجے تھے۔ (حاشیہ بخاری ج اص ۳۹)

اس تمام بحث کو سامنے رکھتے ہوئے آپ برق صاحب کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ابوسلمہؒ جو سائل تھے ان کو حذف کر دیا اور سائل حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو قرار دے دیا اور پھر ان کے فقیہ اور غیر محرم ہونے کی گیت شروع کر دی۔ بلاشک وہ عشرہ مبشرہؓ میں سے ایک جلیل القدر اور فقیہ صحابی تھے لیکن سوال انہوں نے نہیں کیا بلکہ ان کے لڑکے ابوسلمہؒ نے کیا تھا۔ اور پھر ان کا دوسرا ظلم اور بے انصافی دیکھئے کہ درمیان کی عبارت **ما مثلک یا ابا سلمة مثل الفروخ یسمع الدیکة تصرخ فیصرخ** جس میں حضرت عائشہؓ نے ابوسلمہؒ کو تنبیہ کی اور ڈانٹا تھا وہ بالکل حذف کر دی گویا اس کا حدیث میں کہیں ذکر تک نہیں، اور لطف بالائے لطف یا تاسف بالائے تاسف یہ ہے کہ وہ بایں ہمہ یہ لکھتے ہیں کہ علماء حدیث پرست چیخ اٹھیں گے۔ علماء بیچارے اس بددیانتی اور جہالت پر کیوں نہ چیخیں کہ درحقیقت سائل ابوسلمہؒ تھا اور برق صاحب نے وہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف بنا دیا اور درمیان کی مذکورہ عبارت کو شیر مادر سمجھ کر ہضم کر گئے اور رضاعی بھانجے کو غیر محرموں کی صف میں جا کھڑا کیا اور نابالغ بچے کو غیر مرد سے تعبیر کر دیا ہے اور مومنوں کی ماں کو کم عمر زوجہ سے ذکر کیا اور امام مالکؒ

کا نام لے کر غلط حوالہ دیا اگر اس جہالت اور خیانت کے پلندہ کو دیکھ کر بھی علماء نہ چیخ اٹھیں تو کیا کریں؟ کیا علماء لوہے اور پتھر کی بے جان مورتیاں ہیں ۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
بولیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

(صرف ایک اسلام صفحہ ۱۳۸ تا ۱۴۳)

حضورؐ کا جملہ ازواج سے ایک رات میں شب باشی کرنا

اعتراض: (منکر حدیث غلام جیلانی برق کا اعتراض)

حضرت انسؓ سے اسی مضمون کی روایت بخاری وغیرہ میں آتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی جملہ ازواج سے مجامعت کی اور جو ازواج آپ کے نکاح میں آئی تھیں ان سب کی تعداد گیارہ تھی حضرت انسؓ سے سوال کیا گیا کہ آپ اس کی طاقت رکھتے تھے انہوں نے جواب دیا ہم یہ گفتگو کیا کرتے تھے کہ آپ کو تیس مردوں کی طاقت عطا کی گئی ہے برق صاحب اس حدیث کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ: یہ حدیث صریحاً غلط ہے (دو اسلام ص ۲۱۷ طبع اوّل اور اب یہ حذف کر دیا ہے) اور اس پر کافی طویل بحث کر کے آگے لکھتے ہیں کہ میرا یہ خیال ہے کہ حضور نے مدینہ میں آ کر ازواج مطہراتؓ کو بطور شوہر استعمال ہی نہیں فرمایا تھا اور اس پر کئی قرائن ملتے ہیں۔

اوّل آپ کافی سن رسیدہ ہو گئے تھے۔

دوم کسی بیوی کا حاملہ تک نہ ہونا اس پر شاہد ہے (اور لکھتے ہیں کہ لونڈی کے پیٹ سے تو رسول کی اولاد ہو اور نو بیویوں میں سے کوئی حاملہ تک نہ ہو تعجب، حیرت!! (دو اسلام ص ۲۲۰ طبع اوّل و ص ۲۳۰ طبع ششم) سوم تجربہ بتلاتا ہے کہ مصروفیات بڑھ جائیں تو انسان ازدواجی زندگی کے فرائض سرانجام دینے کے لیے نہ وقت نکال سکتا ہے اور نہ اس میں خواہش پیدا ہوتی ہے کمال اتاترک اور نپولین جب بہت

مصروف ہوگئے تو ایک ایک بیوی کو بھی مطمئن نہ کر سکے اور وہ چلتی بنیں۔ ہٹلر اس قدر مصروف تھا کہ وہ شادی کے معاملہ پر سوچنے کی فرصت بھی نہ نکال سکا اور ہمارے آقا تو اس قدر مصروف تھے کہ اللہ کی پناہ ۱ھ میں مسجد کی تعمیر اور قبائل سے معاہدے میں جنگ بدر، جنگ احد، سریہ غطفان اور سریہ ابوسلمہ، ۳ھ میں مفتوحہ علاقے کا انتظام فوجوں کی اسلحہ بندی راشن وغیرہ کے انتظامات مجروحین اور مقتولین کے متعلق تدابیر ۴ھ میں جنگ ابی سلمہ، جنگ ابن انیس، حادثہ بئر معونہ، غزوہ بنی قینقاع اور غزوہ بنی نضیر، ۵ھ میں غزوہ بنی مصطلق، غزوہ خندق جنگ دومۃ الجندل جنگ مریسیع الخ۔
(دو اسلام ص ۲۲۰ و ص ۲۲۱ بلفظہ طبع اوّل و ص ۲۳۱ طبع ششم)

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ساری قوم کا غم، سارے عرب کی فکر، دشمنوں کی فتنہ انگیزی سے پریشانی، دن بھر روزہ، تقریباً رات بھر عبادت خدا کے لیے بتاؤ کہ انہیں گیارہ گیارہ بیویوں کے ساتھ مباشرت کی فرصت کیسے مل سکتی تھی (دو اسلام ص ۲۲۲ طبع اوّل و ص ۲۳۲ طبع ششم)

یہ سب کچھ لکھ چکنے کے بعد آخری فیصلہ یوں صادر فرماتے ہیں کہ اس لیے میری رائے میں یہ مباشرت و مجامعت کے قصے من گھڑت ہیں (دو اسلام ص ۲۲۳ طبع اوّل و ص ۲۳۳ طبع ششم)

جواب: اس سے قبل کہ ہم برق صاحب کے قرائن اور مقدمات کے جوابات عرض کریں چند ایک نہایت ضروری اور ضمنی اجزاء پر بحث کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ایسے اور بھی کافی ہیں۔ مگر ہم صرف چند ہی عرض کرتے ہیں اور اس بحث کو ہم اس لیے بھی قدرے تفصیل سے بیان کرنا پسند کرتے ہیں کہ دور جدید کے ایک نئے مجدّد اور مجتہد مودودی صاحب نے بھی اس حدیث پر محض اپنی عقل کی وجہ سے کافی لاطائل اور بے سود لے دے کی ہے۔

۱۔ یہ ٹھیک ہے کہ آنحضرت ﷺ کے حبالۂ نکاح میں مختلف اوقات میں گیارہ

ایسی ازواج مطہراتؓ آچکی تھی جن سے آپ نے مخصوص ازدواجی تعلق قائم کیا جن کے اسماء گرامی یہ ہیں:

حضرت خدیجہ۔ حضرت سودہ، حضرت عائشہ، حضرت زینب ام المساکین، حضرت جویریہ، حضرت زینب بنت جحش، حضرت ام سلمہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت صفیہ، حضرت حفصہ، اورحضرت میمونہ رضی اللہ عنھن، لیکن گیارہ بیک وقت موجود نہ تھیں۔

حضرت خدیجہؓ کا ۱۰ھ نبوت میں انتقال ہوچکا تھا، اس وقت تک آپ کے نکاح میں اور کوئی زوجہ نہیں آئی تھیں، اور حضرت زینب ام المساکینؓ نکاح کے تقریباً تین ماہ بعد ۳ھ میں وفات پا گئی تھیں، صرف نو ازواج مطہراتؓ تھیں۔

۲۔ حضرت سودہؓ بنت زمعہ جب کافی سن رسیدہ ہوگئیں تو انہوں نے اپنی باری اور نوبت اپنی مرضی سے حضرت عائشہؓ کو دے دی تھی (متفق علیہ مشکوۃ ج ا ص ۲۷۹) اس لحاظ سے آنحضرت ﷺ صرف آٹھ بیویوں سے ہی مخصوص ازدواجی تعلق رکھتے تھے، اور جس حدیث میں سب ازواج سے مجامعت کا ذکر آتا ہے اس سے صرف یہی آٹھ مراد ہیں۔ ویسے ضمنی طور پر راوی نے تمام ازواج مطہراتؓ کا ذکر کردیا ہے۔ کہ ان کی تعداد گیارہ تھی، نہ یہ کہ جن سے آپ نے ایک رات کے اندر مخصوص طواف کیا وہ گیارہ تھیں۔

۳۔ آنحضرت ﷺ نے ان ازواج سے (جن کی تعداد آٹھ تھی) باری مقرر کر رکھی تھی جیسا کہ متعدد صحیح احادیث سے یہ ثابت ہے۔ اور باری باری آپ ہر بیوی کے پاس رات بسر کرتے تھے، ہاں البتہ دو مرتبہ صرف آپ نے ان جملہ ازواج کی مرضی سے سب کے ساتھ مجامعت کی ایک مرتبہ **بغسل واحد** (متفق علیہ مشکوۃ ج ا ص ۴۹) (اس پہلو پر عمل کرکے آپ نے امت کو یہ بھی بتلا دیا کہ ازواج کی مرضی سے ایسا کرنا بھی جائز اور صحیح ہے اور بعض محدثین کرامؒ فرماتے ہیں کہ آپ سفر سے واپس تشریف لائے تھے اور کافی عرصہ باہر رہ چکے تھے اور ابھی تک باقاعدہ باری مقرر

نہیں ہوئی تھی اس ضرورت کے تحت یہ واقعہ پیش آیا (قالہ ابن عبد البر وغیرہ نیل الاوطار ج اص ۲۳۱) کہ آپ نے سب پر مخصوص چکر کاٹنے کے بعد صرف ایک ہی غسل کیا اور دوسری مرتبہ کان یغتسل عند ھذہ وعند ھذہ (رواہ احمد والنسائی و ابن ماجۃ والترمذی، مشکوۃ ج اص ۵۰ و نیل الاوطار ج اص ۲۳۱) کہ آپ نے سب پر مخصوص طواف کرنے کے بعد ہر ایک کے پاس جانے سے قبل الگ اور جدا غسل کیا اس کے علاوہ ساری زندگی میں احادیث کی رو سے ثابت نہیں ہے کہ آپ نے ہر رات ایسا عمومی طواف کیا ہو باقی کان یطوف اور کان یدور سے مغالطہ لگ جانا صحیح نہیں ہے تحقیق پہلے گذر چکی ہے امام نووی فرماتے ہیں کہ لفظ کان اگر چہ مضارع پر داخل ہو دوام اور استمرار کو نہیں چاہتا (شرح مسلم ج اص ۲۵۴)۔

۴۔ چونکہ حضرت انسؓ کی مذکورہ حدیث میں اس کی کوئی تعیین نہیں کہ یہ دونوں واقعے کب پیش آئے؟ اس لیے بہت ممکن ہے کہ یہ ۷ ھ سے قبل کے ہوں اور اس سے قبل ازواج مطہراتؓ کی ذکر کردہ تعداد آٹھ سے بھی کم تھی ان ضمنی ابحاث کے بعد اب آپ برق صاحب کے مرکزی قرائن کے جوابات سنئے:

حضرت ابراہیمؑ کا اسی سال کی عمر میں اپنا ختنہ کرنا

اعتراض: (منکر حدیث برق کا اعتراض)

حدیث کا علم التاریخ، بخاری و مسلم کے چند تاریخی شاہکار صفحات گذشتہ میں درج ہو چکے ہیں ایک دو اور سنئے اور داد دیجئے:۔ ابو ہریرہؓ حضور سے راوی ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ختنہ اسی برس کی عمر میں ہوا تھا (بخاری ج ۲ ص ۱۵۳)

راوی نے یہ نہ بتایا کہ پورے اسی سال تک اس مبارک کام میں کون سی رکاوٹ حائل رہی جو وفات سے عین پہلے دور ہوئی اور آپ باں ضعف و پیری حجام کے سامنے جا بیٹھے ختنہ کا مقصد صفائی صحت اور جنسی لذتوں میں اضافہ ہے اسی برس کے بعد یہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے تو پھر ختنہ سے فائدہ؟ انتہی۔ (بلفظہ دو اسلام ص ۳۳۸ طبع

اوّل اور اب طبع ششم میں اس کو حذف کر دیا ہے)

جواب: برق صاحب نے حدیث کے ترجمہ میں خیانت یا جہالت کا ثبوت دیا ہے بخاری وغیرہ کی اصل روایت یوں ہے:۔

اختتن وقد اتت علیه ثمانون سنة ۔ (بخاری ج ۱ ص ۴۷۳، و مسلم ج ۲ ص ۲۶۵ و ادب المفرد ص ۱۸۲) کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی سال پورے ہو چکنے کے بعد اپنا ختنہ خود کیا تھا، عربی کا ادنیٰ طالب علم بھی اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ اختتن باب افتعال کی ماضی ہے جو لازمی اور متعدی دونوں طریق سے مستعمل ہے اور جس کے معنی خود اپنا ختنہ کرنے کے بھی ہیں نہ کہ حجام کے سامنے جا بیٹھنے اور اس سے ختنہ کرانے کے جیسا کہ برق صاحب نے سمجھا ہے اور اس پر ضعف اور پیری کی حالت میں حجام کے سامنے جا بیٹھنے کا قابل رشک حاشیہ چڑھایا ہے اور مزید برآں یہ گوہر افشانی فرمائی ہے کہ ختنہ وفات سے عین پہلے ہوا جس سے نظر بہ ظاہر عرف عام میں یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ شاید وفات سے صرف چند ہی دن قبل ختنہ ہوا تھا یہ تو بیان ہو چکا ہے کہ اسی سال کے بعد ختنہ ہوا اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسو سال کی عمر تھی (دیکھئے ادب المفرد ص ۱۸۳ والبدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۷۵ وغیرہ) گویا اس لحاظ سے حضرت ابراہیمؑ نے ختنہ کے بعد ایک سو بیس برس کی عمر پائی تھی اور شاید برق صاحب کی اصطلاح میں اتنا طویل عرصہ وفات سے قبل کا زمانہ تصوّر ہو گا۔

نام اس کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں

رہا یہ سوال کہ اسی سال تک ختنہ کرنے سے کیا چیز مانع تھی؟ تو یہ سوال ہی نظام تشریعی سے ناواقفی کی دلیل ہے جب اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں ہوا تھا ختنہ نہیں کیا تھا اور جب حکم ہو گیا کر لیا تھا جیسا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جب کام کاج کے قابل ہو گئے تھے (فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ) اور جب کہ ان کی عمر تیرہ برس کی ہو چکی تھی

(دیکھئے مدارک ۵ص۳۴۲ و بیضاوی ۵ص۳۴۲ وغیرہ) تو اس وقت ان کو ذبح کے لیے پیش کیا گیا حالانکہ قربانی اس سے پہلے بھی ہو سکتی تھی برق صاحب ہی فرمادیں کہ ۱۳ برس کی عمر سے پہلے کیا چیز مانع تھی؟ جو دلیل وہ اس کی اور اس کے علاوہ دیگر بے شمار احکام کی بیان کریں گے وہی ہماری طرف سے حدیث مذکور کی دلیل سمجھ لیں، لیجئے برق صاحب کی مستند اور غیر محرف تورات کے حوالے سن لیں اگر حدیث ان کے نزدیک حجت نہیں تو شاید تورات ہی ان کی تسلی کرا دے۔ تورات کتاب پیدائش باب ۷، آیت ۲۴ میں ہے ابراہام ننانوے برس کا تھا جب اس کا ختنہ ہوا اور باب ۷ آیت ۲۶ میں ہے ابراہام اور اس کے بیٹے اسماعیل کا ختنہ ایک ہی دن ہوا۔ اور باب ۲۵ آیت ۷ میں مذکور ہے اور ابراہام کی کل عمر جب تک کہ وہ جیتا رہا ایک سو پچھتر ۱۷۵ برس کی ہوئی۔ حدیث میں تو اسی برس کی عمر بیان ہوئی تھی جس کا علم التاریخ فہم و ادراک سے بالاتر رہا لیکن برق صاحب کی مستند کتاب میں ننانوے برس کی عمر بیان کی گئی ہے دیکھئے وہ اس ننانوے کے پھیر سے نکلنے کا کیا حل تجویز کرتے ہیں؟

کتابت حدیث سے ممانعت کے باوجود حدیثیں کیوں لکھی گئیں؟

اعتراض: (منکر حدیث) برق صاحب لکھتے ہیں:

عن ابی سعید الخدری ؓ قال قال رسول الله ﷺ لا تکتبوا عنی فمن کتب عنی غیر القران فلیمحه. (صحیح مسلم، کتاب الزہد۱۲ حدیث۷۲)

ابی سعید خدری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن کے بغیر میری کوئی اور قول قلمبند نہ کرو اگر کوئی شخص ایسا کوئی قول لکھ چکا ہو تو اسے مٹا دے۔

اور اس حکم کی دو وجہیں تھیں۔ اوّل کہ کہیں غلطی احادیث قرآن کے متن میں شامل نہ ہو جائیں بعض گذشتہ انبیاء کے الہامی صحائف میں ان کی احادیث بھی شامل ہو گئی تھیں اور کتاب الٰہی کا حلیہ بگڑ گیا تھا، دوم رسول کریم ﷺ کی زندگی میں ان۔

اقوال محرف ہو چکے تھے اور یہ ہے بھی ایک فطری چیز آدمی کو اپنی کہی ہوئی بات تک یاد نہیں رہتی وہ دوسرے کی کیا یاد رکھ سکتا ہے الخ۔

(دو اسلام ص ۳۹ طبع اوّل و ص ۵۵ طبع ششم بلفظہٖ)

برق صاحب نے اپنے اس مزعوم کو ثابت کرنے کیلئے کئی صفحات اس پر سیاہ کر دیے ہیں مگر کوئی نقلی یا عقلی صحیح دلیل اس پر پیش نہیں کر سکے۔

جواب: ہم چند امور عرض کر دیتے ہیں جن سے آپ کو اس اعتراض کا صحیح اور تسلی بخش جواب مل جائے گا۔ (ابتدائے اسلام میں آنحضرت ﷺ نے کتابت حدیث سے منع کر دیا تھا تا کہ احادیث قرآن کے متن میں شامل نہ ہو جائیں اور منع کی اس علت اور وجہ کا برق صاحب کو خود بھی اقرار ہے جیسا کہ درج کیا جا چکا ہے۔ ۲۔ یہ ممانعت عارضی اور وقتی تھی بعد کو آنحضرت ﷺ نے لکھنے کی اجازت دیدی تھی۔

امام نوویؒ نقل کرتے ہیں کہ تابعینؒ کے زمانہ میں کتابت حدیث کے بارے میں اختلاف تھا بعض حضرات لکھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے (ہاں بیان ضرور کرتے تھے) اور اکثریت کتابت حدیث کے جواز کی قائل تھی پھر آگے لکھتے ہیں: **ثم اجمع المسلمون علیٰ جوازھا وزال ذلک الخلاف** (نووی ج ۲ ص ۴۱۴) پھر تمام مسلمانوں کا جواز پر اتفاق ہو گیا اور اختلاف ختم ہو گیا۔) اور متعدد صحابہ کرامؓ نے حدیثیں قلمبند کر لی تھیں، جن میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت انسؓ، حضرت ابو شاہ یمنیؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ، خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور ان کے علاوہ بے شمار صحابہ کرامؓ نے بیسیوں ہی نہیں بلکہ سینکڑوں حدیثیں قلمبند کی تھیں اس کی مفصل تحقیق راقم السطور کی کتاب شوق حدیث میں ملاحظہ کیجئے خوف طوالت سے ہم حوالوں کو نظر انداز کرتے ہیں (۳) اگر برق صاحب دیانت سے کام لیتے اور پوری حدیث نقل کر دیتے تو شاید سامعین کو غلط فہمی پیدا نہ ہوتی مگر کیا کرتے وہ اپنی عادت سے مجبور ہیں اس حدیث میں یہ الفاظ بھی مذکور ہیں۔ **وحدثوا عنی ولا**

حرج و من كذب علىّ متعمدا فليتبوأ مقعده من النار (مسلم ج ۲ ص ۴۱۴) اور میری حدیث بیان کیا کرو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور جس نے مجھ پر دیدہ دانستہ جھوٹ بولا وہ دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنالے۔

اس حدیث کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کتابت حدیث سے منع کیا تھا نہ کہ بیان حدیث سے اگر مطلقاً حدیث حجت نہ ہوتی تو آپ صاف فرمادیتے کہ میری حدیث قطعاً حجت نہیں ہے کوئی آدمی اس کو بیان کرنے کی زحمت گوارا نہ کرے اور نہ اپنا وقت ضائع کرے اور آپ کی احادیث کوئی افسانہ تو تھی نہیں بلکہ آپ جو کچھ فرمایا کرتے تھے اصلاح عقائد اخلاق معاملات اور اقتصادی و معاشرتی زندگی کو درست اور بہتر بنانے کے لیے ہی فرمایا کرتے تھے۔ (اسی لیے ۱۰ ذوالحجہ ۱۰ھ کو جب کہ ہزاروں نفوس قدسیہ حاضر خدمت تھے ایک بلیغ خطبہ دینے کے بعد بطور تاکید آپ نے فرمایا فليبلغ الشاهد الغائب (بخاری ج ۱ ص ۱۶) کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ میری باتیں اور حدیثیں ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں)۔ لہذا احادیث کو بیان کرنا وسیلہ اور ان پر عمل کرنا اصلی مقصود ٹھہرا، اس سے بڑھ کر حجیت حدیث کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔ ۴۔ اگر لکھی ہوئی احادیث کا وقتی طور پر مٹا دینا عدم حجیت حدیث کی دلیل ہوتا جیسا کہ برق صاحب اور ان کے ہمنوا دوست سمجھے بیٹھے ہیں تو دیگر صحابہ کرامؓ عموماً اور حضرت ابوسعید خدریؓ (جو اس روایت کے راوی ہیں) خصوصاً ایک حدیث بھی بیان نہ کرتے لیکن دیگر صحابہؓ نے بھی اور خود حضرت ابوسعید خدریؓ نے بھی ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں روایتیں بیان کی ہیں (حضرت ابوسعید خدریؓ سے کل ۱۱۷۰ حدیثیں مروی ہیں، بحوالہ اسوۂ صحابہ ج ۲ ص ۳۲۰) جو کتب حدیث میں درج ہیں برق صاحب مسند احمد اور مسند طیالسی میں ہی ان کی روایات دیکھ لیں کہ کتنی ہیں؟ بلکہ ابوسعید خدریؓ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ

مذاكرة الحديث افضل من قراءة القرآن (تدریب الراوی ۱۸۰)

حدیث کا آپس میں تکرار کرنا تلاوت قرآن کریم سے بھی افضل ہے۔
وجہ ظاہر ہے کہ تلاوتِ قرآن کریم گو بڑے درجہ اور فضیلت کی حامل ہے لیکن ہے تو بہر حال ایک لازمی عبادت اور مذاکرۂ حدیث میں افہام و تفہیم کے ذریعہ دوسروں کو فائدہ ہوتا ہے جو ایک متعدی عبادت ہے جس کے افضل اور اعلیٰ ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے؟ علاوہ بریں قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ تو خود اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہے اس کے ضائع ہونے کا کوئی خطرہ نہیں وہ خود اس کی حفاظت اور نگرانی کے اسباب پیدا کرتا رہے گا، لیکن ابوسعید الخدریؓ کے خیال میں حدیث کا مذاکرہ اس کے احیاء کے لیے نہایت ضروری تھا تاکہ وہ مٹ نہ جائے چنانچہ امت نے اپنے پیارے رسول کی پیاری حدیثوں کی ایسی حفاظت کی کہ دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے صرف عاجز ہی نہیں بلکہ ان کی خدمت جلیلہ کی مداح بھی ہے۔

والفضل ماشهدت به الاعداء

حضرت ابونضرہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے دریافت کیا کہ ہم جو حدیثیں آپ سے حاصل کرتے ہیں ان کو نہ لکھ لیا کریں؟ فرمایا: **ان نبيكم ﷺ كان يحدثنا فنحفظ فاحفظوا كما كنا نحفظ.** (جامع بیان العلم ص ۳۲) کہ نبی کریم ﷺ ہم سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے اور ہم ان کو یاد کرلیا کرتے تھے۔ تم بھی (بجائے لکھنے کے) اسی طرح حدیثوں کو زبانی یاد کرو جیسے ہم یاد کرتے تھے۔ (۵)۔ جو لوگ حافظہ کے لحاظ سے ساری دنیا میں اپنا نظیر نہ رکھتے ہوں ۔جن کو گدھوں اور گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوں ایک دو نہیں بلکہ ہزاروں اشعار اور قصائد انہوں نے قرنا بعد قرن زبانی یاد رکھے ہوں اس قوم کے متعلق یہ نظریہ اور رائے قائم کرلینا کہ انہوں نے اپنے محبوب پیغمبر کی باتوں اور حدیثوں کو فراموش کر دیا ہوگا۔ اور پروانہ کی ہوگی، کس قدر حقائق سے پہلو تہی اور سینہ زوری کا بیّن ثبوت ہے غرضیکہ جن لوگوں کا حافظہ ضرب المثل اور اپنے رسول کے ساتھ عشق صادق ہو ان

کے متعلق یہ نظریہ قائم کر لینا خالص بہتان اور سراسر افتراء ہے اور بس۔ ۶۔ برق صاحب نے کس معصومانہ انداز میں یہ لکھ دیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ان کے اقوال محرف ہو چکے تھے۔ نہ تو اس کے ثبوت پر صحیح احادیث سے کوئی مثال نقل کرنے کی تکلیف فرمائی اور یہ نہ بتلایا کہ تحریف صحابہ کرامؓ نے کی تھی یا منافقوں اور مرتدوں نے؟ نیز یہ بھی واضح نہ کیا کہ ان محرف اقوال کو صحابہ کرامؓ اور محدثین نے ٹھکرادیا تھا، یا اپنی کتابوں میں ان کو بھی درج کر لیا تھا؟ اور اگر ان محرف اقوال کو امت کے سامنے نقل کیا تو اس لیے کہ ان کو مغالطہ نہ ہو جائے یا اس لیے کہ ان پر عمل کر کے وہ ثواب دارین حاصل کریں؟ محض اپنی دنیوی خواہش کو پورا کرنے کے لیے جناب رسول خدا ﷺ کی احادیث اور صحابہ کرامؓ کے پاک نفوس پر ایسا حملہ کرنا کتنی جسارت اور جرأت کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے گستاخوں اور بے ادبوں سے محفوظ رکھے۔
(صرف ایک اسلام صفحہ ۱۸۶ تا ۱۹۱)

شکوک وشبہات کے دور کرنے کا اصلی طریقہ بحث ومباحثہ نہیں شرح صدر کی تحصیل ہے:۔ اور آج پوری دنیا ان شکوک وشبہات کے گھیرے میں پھنسی ہوئی ہے اور بحث ومباحثہ کی راہ سے اس کو حل کرنا چاہتی ہے جو اس کا صحیح راستہ نہیں۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

راستہ وہی ہے جو صحابہ کرامؓ اور اسلاف امت نے اختیار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور ان کے انعام کا استحضار کر کے اس کی عظمت ومحبت ان میں پیدا کی جائے تو شبہات خود بخود کافور ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ خود قرآن کریم نے رسول کریم ﷺ کو یہ دعاء مانگنے کی تلقین فرمائی ہے کہ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ، یعنی اے میرے پروردگار میرا سینہ کھول دیجئے آخر آیت میں فرمایا كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ، یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں پر

پھٹکار ڈال دیتا ہے، اور حق بات ان کے دل میں نہیں اترتی، اور ہر برائی اور بیہودگی کی طرف دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں۔

ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سائل کی دینی مصلحت کی رعایت لازم ہے:

امام جصاصؒ نے اس جواب سے یہ مسئلہ نکالا کہ مفتی اور عالم کے ذمہ یہ ضروری نہیں کہ مسائل کے ہر سوال اور اسکی ہر شق کا جواب ضرور دے بلکہ دینی مصالح پر نظر رکھ کر جواب دینا چاہیئے جو جواب مخاطب کے فہم سے بالاتر ہو یا اسکے غلط فہمی میں پڑ جانے کا خطرہ ہو تو اس کا جواب نہیں دینا چاہیے اسی طرح بے ضرورت یا لایعنی سوالات کا جواب بھی نہیں دینا چاہیے البتہ جس شخص کو کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس کے متعلق اسکو کچھ عمل کرنا لازم ہے اور خود وہ عالم نہیں تو مفتی اور عالم کو اپنے علم کے مطابق اس کا جواب دینا ضروری ہے۔(جصاص)

امام بخاریؒ نے کتاب العلم میں اس مسئلہ کا ایک مستقل ترجمۃ الباب رکھ کر بتلایا ہے کہ جس سوال کے جواب سے مغالطہ میں پڑنے کا خطرہ ہو اسکا جواب نہیں دینا چاہیے۔

دارالاسلام میں غیر مسلم ذمیوں کو اسلام پر علمی تنقید کی تو اجازت ہے مگر طعن و تشنیع کی نہیں:

طَعَنُوا فِي دِينِكُمْ کے لفظ سے بعض حضرات نے اس پر استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کے دین پر طعن و تشنیع کرنا عہد شکنی کرنے میں داخل ہے جو شخص اسلام اور شریعت اسلام پر طعنہ زنی کرے وہ مسلمانوں کا معاہد نہیں رہ سکتا، مگر باتفاقِ فقہاء اس سے مراد وہ طعن و تشنیع ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی اہانت اور تحقیر کے طور پر اعلاناً کی جائے، احکام و مسائل کی تحقیق میں کوئی علمی تنقید کرنا اس سے مستثنیٰ ہے اور لغت میں اس کو طعن و تشنیع کہتے بھی نہیں، اس لئے دارالاسلام کے غیر مسلم باشندوں کو علمی تنقید کی تو اجازت دی جا سکتی ہے، مگر اسلام پر طعنہ زنی اور تحقیر و توہین کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

نواں باب
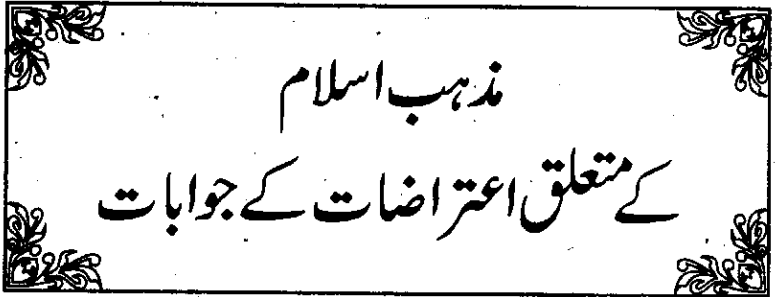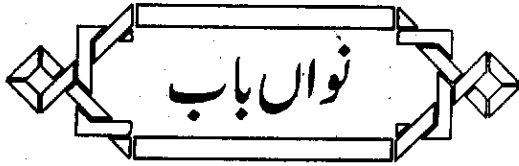
مذہب اسلام
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

اسلام مدارِ نجات ہے کسی مخالف مذہب میں نجات نہیں ہو سکتی

قرآن حکیم کے اس واضح فیصلہ نے ان لوگوں کی بے راہی اور کج روی کو پوری طرح کھول دیا ہے، جو دوسرے اہل مذاہب کے ساتھ رواداری میں مذہب اور مذہبی عقائد کو بطور نوتہ اور ہبہ کے پیش کرنا چاہتے ہیں، اور قرآن وسنت کے کھلے ہوئے فیصلوں کے خلاف دوسرے مذہب والوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے نزدیک نجات صرف اسلام میں منحصر نہیں، یہودی اپنے مذہب پر اور عیسائی اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی نجات پا سکتا ہے، حالانکہ یہ لوگ سب رسولوں کے یا کم از کم بعض رسولوں کے منکر ہیں جن کے کافر جہنمی ہونے کا اس آیت نے اعلان کر دیا ہے،

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ عدل وانصاف اور ہمدردی و خیر خواہی اور احسان رواداری کے معاملے میں اپنی مثال نہیں رکھتا، لیکن احسان وسلوک اپنے حقوق اور اپنی ملکیت میں ہوا کرتے ہیں، مذہبی اصول وعقائد ہماری ملکیت نہیں جو ہم کسی کو تحفہ میں پیش کر سکیں اسلام جس طرح غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کی تعلیم میں نہایت سخی اور فیاض ہے اسی طرح ہمدردی و خیر خواہی اور انتہائی رواداری کے ساتھ کفر اور رسوم کفر سے پوری طرح اعلان برأت بھی کرتا ہے، مسلمانوں کو غیر مسلموں سے الگ ایک قوم بھی قرار دیتا ہے، اور ان کے قومی شعائر کی پوری طرح حفاظت بھی کرتا ہے وہ عبادت کی طرح مسلمانوں کی معاشرت کو بھی دوسروں سے ممتاز رکھنا چاہتا ہے جس کی بے شمار مثالیں قرآن وسنت میں موجود ہیں،

اگر اسلام اور قرآن کا یہ عقیدہ ہوتا کہ ہر مذہب وملت میں نجات ہو سکتی ہے تو اس کو مذہب اسلام کی تبلیغ پر اتنا زور دینے کا کوئی حق نہ تھا، اور اس کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا دینا اصولاً غلط اور خلاف عقل ہوتا، بلکہ اس صورت میں خود رسول کریم ﷺ اور خلفائے

راشدینؓ کا سارا جہاد بے معنی بلکہ ملک گیری کی ہوس رہ جاتی ہے۔ اس معاملہ میں بعض لوگوں کو سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۶۲ سے شبہ ہوا ہے، جس میں ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصَّابِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ.

ترجمہ: یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صائبین ان میں جو بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس محفوظ ہے، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

اس آیت میں چونکہ ایمانیات کی پوری تفصیل دینے کی بجائے صرف ایمان باللہ و الیوم الآخر پر اکتفاء کیا گیا ہے تو جو لوگ قرآن کو صرف ادھورے مطالعہ سے سمجھنا چاہتے ہیں اس سے وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ صرف اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان کی اصطلاح میں ایمان باللہ وہی معتبر ہے جو ایمان بالرسول کے ساتھ ہو ورنہ محض خدا کے اقرار اور توحید کا تو شیطان بھی قائل ہے قرآن کریم نے خود اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرما دیا ہے:

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ.

کفار کی دنیاوی عیش و عشرت بھی درحقیقت عذاب ہی کی تکمیل ہے

اعتراض: (ماڈرن لوگوں کا اعتراض)

یہاں کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مہلت اور عمر دراز اور عافیت و راحت کے سامان اس لئے دیئے ہیں کہ وہ اپنے جرم میں بڑھتے جائیں تو پھر کفار بے قصور ہوئے۔

جواب: کیونکہ مقصود آیت کا یہ ہے کہ کفار کی اس چندروزہ مہلت اور عیش و عشرت سے مسلمان پریشان نہ ہوں، کیونکہ باوجود کفر وعصیان کے ان کو دنیوی قوت، طاقت، سامانِ دنیا یہ بھی ان کے عذاب ہی کی ایک صورت ہے جس کا احساس آج نہیں اس دنیا سے جانے کے بعد ہوگا کہ یہ دنیا کا سامان راحت جو انھوں نے گناہوں میں خرچ کیا، درحقیقت جہنم کے انگارے تھے، جیسا کئی آیتوں میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ بِھَا. یعنی کفار کے اموال اور عیش وعشرت ان کے لئے کوئی فخر کرنے کی چیز نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہی کی ایک قسط ہے، جو ان کے عذاب آخرت بڑھانے کا سبب ہے۔

(معارف القرآن صفحہ ۲۴۶ جلد ۲)

نجات کس مذہب میں ہے؟

سوال: (عیسائیوں اور ہندوؤں کا سوال)

نجات کس مذہب میں ہے؟

جواب: عرف میں کسی مصیبت سے چھوٹ جانے کا نام نجات ہے مگر اصطلاح شریعت میں غضب الٰہی اور قہر خداوندی سے بچ جانے کو نجات کہتے ہیں۔ یا بعنوان دیگر: آخرت کے مصائب سے بچ جانے کا نام نجات ہے۔

قہر خداوندی اور عذاب الٰہی سے بچنے کا کیا طریق ہے۔ نصاریٰ نے کفارہ کو طریقۂ نجات ٹھہرایا ہے۔

اور آریوں نے آواگوان اور تناسخ کو طریقۂ نجات سمجھا ہے۔

مگر اسلام نے نجات کا ایک ایسا سہل اور عجیب وغریب طریقہ بتلایا کہ جو عین فطرت اللہ کے مطابق اور عقل سلیم اور فہم مستقیم کے موافق ہے وہ یہ ہے کہ:

اسلام کا طریقہ نجات

اول انسان حق جل جلالہٗ پر ایمان لائے یعنی اس کو خدائے برحق مانے اور جن جن چیزوں کے ماننے کا اس نے حکم دیا ہے خلوص دل اور صدق زبان سے ان کی تصدیق کرے۔

دوم یہ کہ جن چیزوں کے کرنے کا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے حکم دیا ہے ان کو بجالائے اور جن چیزوں سے اس نے منع فرمایا ہے اس سے پرہیز کرے اور ان کے ارتکاب کو حیات روحانی کے حق میں سم قاتل اور اپنے مولائے حقیقی اور منعم اصلی کے درمیان میں حجاب اکبر سمجھے۔ پس جو شخص خدائے برحق پر ایمان لایا اور اس کے احکام کی اطاعت کی اور اس کی نافرمانیوں سے احتراز اور اجتناب کیا وہ اللہ کے فضل اور رحمت الٰہی سے غضب الٰہی اور عذاب خداوندی سے نجات پا گیا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

”وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ، فَضْلًا مِنْ رَبِّكَ . ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ.“ (الدخان)

(اور اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب دوزخ سے بچالیا۔ محض اپنے فضل سے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے)

خلاصہ یہ کہ نجات کا مدار تین چیزوں پر ہے۔ اول ایمان۔ دوم اعمال صالحہ۔ سوم تقویٰ اور پرہیزگاری۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ آمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ“. (القصص)

ترجمہ: (پس جس نے کفر سے توبہ کی اور ایمان لایا اور اعمال صالحہ کئے۔

پس امید ہے کہ وہ کامیاب ہوگا)۔

مگر جو شخص ایمان ہی نہ لائے اس کی نجات ناممکن ہے اس لیے کہ جس طرح حق جل شانہ پر ایمان لانا اور اس کو خدائے برحق ماننا اور اس کے احکام کو بے چوں و چرا تسلیم کرنا نجات دائمی اور ہمیشہ کی زندگانی کا سبب ہے اسی طرح حق جل وعلا پر ایمان نہ لانا اور جھٹلانا اور اس کی اطاعت سے انکار کرنا اور اس کی بندگی اور فرمانبرداری کو اپنے لئے عار سمجھنا ہلاکت ابدی اور شقاوت سرمدی کا سبب ہے۔

خدائے عزوجل پر ایمان لانے سے بڑھ کر کوئی نعمت عزت اور سربلندی اور سرفرازی نہیں اور خدا کے ساتھ کفر کرنے سے بڑھ کر کوئی مصیبت اور ذلت ونکبت، خواری اور رسوائی نہیں۔شیطان لعین جو ساری دنیا کے نزدیک ملعون ومردود رجیم ومطر ودوملوم ومدحور مغضوب ومقہور ہے۔وہ صرف اسی کفر اور انکار اور استکبار کی وجہ سے ہے

سلاطین عالم کے یہاں خطا اور قصور معاف ہو جاتا ہے مگر بغاوت اور سرکشی اور حکومت سے مقابلہ کا جرم کبھی معاف نہیں ہوتا۔باغیوں کی سزا سب کے نزدیک قتل یا حبس دوام ہے۔اسی طرح جو لوگ اس احکم الحاکمین سے بغاوت کرتے ہیں اور اس کی خدائی اور فرمانروائی کو تسلیم نہیں کرتے اور نہایت بے حیائی اور ڈھٹائی کیساتھ اس کے احکام اور وزراء یعنی انبیاء ومرسلین کا مقابلہ کرتے ہیں۔ان کی سزا بھی حبس دوام کے سوا کچھ نہیں ایسے باغیوں اور سرکشوں کیلئے ایک دائمی جیل خانہ تیار کیا ہے۔اس جیل خانہ کا نام جہنم ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرماتے ہیں:

وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِيْنَ حَصِيْرًا۔"(بنی اسرائیل)

ترجمہ: (اور ہم نے کافروں کیلئے جہنم کو جیل خانہ بنایا ہے)

انجیل متی باب ۱۲ ورس ۳۱ میں ہے کہ

ہر گناہ اور کفر (یعنی کفر عملی) تو معاف کیا جائے گا۔مگر جو کفر روح کے حق میں ہو وہ معاف نہ کیا جائے گا۔انتہی

ہاں جو شخص خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا اس کے احکام کو تسلیم کیا۔ مگر بمقتضائے بشریت اپنی جہالت اور نادانی سے کسی حکم کے خلاف کر گذرا اور کوئی گناہ اس سے سرزد ہو گیا تو اس رب کریم اور رؤف رحیم نے ہم کو یہ بشارت اور مژدۂ جانفزا سنایا ہے کہ اے میرے گناہ گار اور خطا کار بندو! میری رأفت و رحمت اور میرے عفو اور مغفرت سے تم ناامید مت ہو میری رحمت کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ جس وقت چاہو معذرت کے لیے حاضر ہو جاؤ اور عفو اور مغفرت کی استدعا اور درخواست میری بارگاہ میں پیش کرو میں ضرور تمہاری معذرت کو سنوں گا اور عفو اور مغفرت کی درخواست کو قبول کروں گا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَاِنِّی لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی". (سورہ طٰہٰ)

ترجمہ: اور میں بلاشبہ ہر اس شخص کو معاف کرنے والا ہوں جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل صالح کرے اور پھر ٹھیک سیدھے راستہ پر چلتا ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ." (الانعام)

ترجمہ: تمہارے پروردگار نے رحمت اور مہربانی کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ جو شخص نادانی سے گناہ کر بیٹھے اور پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور آئندہ اپنے اعمال کی اصلاح کر لے تو اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ بڑے ہی مغفرت فرمانے والے اور رحمت کرنے والے ہیں۔

معاذ اللہ وہ غفور رحیم ایسا نہیں جیسا کہ نصاریٰ کہتے ہیں کہ وہ خدائے قدوس جب تک گنہگاروں کی طرف سے کسی معصوم اور بے گناہ کو صلیب پر نہ چڑھا لے اس وقت تک نجات نہیں ہو سکتی۔ اور نہ معاذ اللہ وہ ایسا ہے جیسا کہ آریہ (ہندو) کہتے ہیں

کہ بندہ ہزار گڑگڑائے اور لاکھ گریہ وزاری کرے اور اپنے گناہوں سے توبہ کرے مگر جب تک گدھا اور کتا، بندر اور سوئر نہ بنایا جائے اس وقت تک کسی طرح درگزر نہ کرے گا۔ حالانکہ اللہ ان سب باتوں سے پاک اور منزہ ہے۔

اس کا ارشاد تو یہ ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا، اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ. وَاَنِيْبُوْا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ." (الزمر)

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ اے بندو جنہوں نے کفر اور شرک کر کے اپنے اوپر زیادتی کی ہے تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو اور یہ خیال مت کرو کہ ایمان لانے کے بعد بھی کفر و شرک پر مواخذہ ہوگا بالیقین اللہ تعالیٰ تمام گذشتہ گناہوں کی مغفرت فرمانے والے ہیں البتہ تم کو یہ چاہیے کہ عذاب آنے سے پہلے تم اللہ کی طرف رجوع کرو اور اسلام میں داخل ہو کر اس کے مطیع و فرمانبردار بن جاؤ۔ عذاب آنے کے بعد تمہاری کوئی مدد نہ کی جائے گی۔ (علم الکلام صفحہ ۳۶۰ تا ۳۶۷ مختصرا)

حضورؐ کو اپنی آخرت کا علم نہ ہو سکا تو دوسروں کو نجات کیسے ملے گی:

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

جبکہ محمد کو اپنی آخرت کا علم نہ ہو سکا اور نہ ہی محمد اپنی بیٹی یا کسی اور کو جنت کا یقین دلا سکا تو کیونکر پیروی محمد کسی مسلمان کو ابدی نجات دلا سکے گی؟

جواب: رسول پاک ﷺ کیلئے سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا اور آپؐ سب سے پہلے جنت میں تشریف فرما اور جلوہ آرا ہونگے۔

(مشکوٰۃ شریف باب فضائل سید المرسلین ﷺ۔ الفصل الاول)

ہادی دو جہان اور نبی آخر الزمان ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت فاطمہؓ جنت کی عورتوں کی سردار ہونگی۔

(مشکوٰۃ شریف۔ الفصل الاوّل۔ باب مناقب اہل بیت النبی ﷺ وباب جامع المناقب۔ الفصل الثانی)

پس جو شخص نبی پاک ﷺ پر خلوص دل سے ایمان لائے اور آپؐ کے ارشاوات عالیہ پر عمل کرے تو قرآن پاک اس نیک بخت اور خوش قسمت انسان کو ابدی نجات پانے اور جنت میں داخل ہونے کی بشارت دیتا ہے۔ (جواب مسلم)

کیا سب مسلمان جہنم میں جائیں گے؟

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

''ہر مسلمان کا قرآن اور محمد کے مطابق جہنم میں وارد ہونا بتاتا ہے کہ سب مسلمان جہنم میں جائیں گے۔

جواب: سورۃ مریم کی آیت نمبر اے کے بعد والی آیت کو سمجھ لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جہنم میں وارد ہونیکا'' صحیح مطلب اور واضح مفہوم نارِ جہنم میں ''داخل'' ہونا ہرگز ہرگز نہیں۔ چنانچہ اگلی آیت مبارکہ یہ ہے:۔

''ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَو اوَّ نَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا.'' (مریم:۷۲)

ترجمہ: (پھر بچائینگے ہم ان کو جو ڈرتے رہے اور چھوڑ دینگے گنہگاروں کو اس میں اوندھے گرے ہوئے)۔

ہمارے اسلامی عقیدہ کے مطابق بات یہ ہے کہ جہنم کے اوپر ''پل صراط'' ہے اس سے ہر ایک کو گزرنا پڑے گا کیونکہ جنت کو جو راستہ جاتا ہے وہ اسی سے گزر کر جاتا ہے۔ تو سب لوگ یقیناً پل صراط سے گزریں گے، ان میں جو متقی اور فرمانبردار

ہوں گے۔ ان کو اللہ رب العزت جہنم سے بچالیں گے اور جو نافرمان اور باغی ہوں گے ان کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اور یہ بات بالکل صحیح ہے جیسا کہ آیت مبارکہ کا پہلا جملہ ''متقیوں'' کے حق میں دوسرا جملہ ''ظالموں'' کے حق میں فرمانے سے ثابت ہوتا ہے۔ چونکہ اس آیت مبارکہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ''وارد'' کا معنیٰ ''داخل'' ہونا نہیں۔ اس لئے اعتراض باطل ہے۔

بلکہ یہ بات بالکل بجا، صحیح اور درست ہے کہ ہر مسیحی کو ''جہنم'' میں جانا ہوگا۔

چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:۔

''کیونکہ ہر شخص آگ سے نمکین کیا جائے گا۔ (مرقس ۹:۴۹)

یاد رہے کہ اس جگہ وہ آگ مراد نہیں جو روح القدس کے نزول کے وقت آگ کے شعلہ کی زبانیں نظر آئی تھیں۔ (اعمال ۲:۳)

بلکہ اس جگہ جہنم کی آگ مراد ہے کیونکہ مرقس آیت نمبر ۴۷ میں ''جہنم'' کا لفظ موجود ہے۔ (جواب مسلم صفحہ ۲۱۴، ۲۱۵)

پیغمبروں کو ماننے والے فرقے کافر کیوں؟

اعتراض: (سوامی دیانند کا اعتراض)

اگر سب قوموں کیلئے پیغمبر بھیجے ہیں تو وہ سب لوگ جو کہ پیغمبر کی راہ پر چلتے ہیں وہ کافر کیوں ہیں؟ کیا سوائے تمہارے پیغمبر کے اور کسی پیغمبر کی عزت نہیں یہ بالکل طرف داری کی بات ہے؟

جواب: اور قوموں کو کافر کہنے کی یہ وجہ ہے کہ وہ دین محمدی جو سب نبیوں کی تعلیم کا لب لباب بتلانے والا آیا ہے کے منکر ہیں باقی سب لوگوں نے اپنے بزرگوں کی تعلیم کو بگاڑ بگاڑ کر ستیاناس کر دیا۔ دیکھو تو ہندوؤں نے کیا کیا کہ ویدکی (بقول آپ کے) توحیدی تعلیم کو کیسا بت پرستی سے بدلا پھر بجائے تسلیم کرنے کے الٹا آریوں

سے لڑنے مرنے پر تلے بیٹھے ہیں بلکہ اگر ان کا بیان سچ ہو تو دیا ندیوں کو بھاگتے ہوئے راہ نہیں ملتی یہی حال عیسائیوں کا ہے کہ ایک (خدا) سے تین (خدا) اور تین سے ایک (خدا) تو آپ نے بھی سنے ہوں گے پس اسی وجہ سے غیر قومیں کافر ہیں اور کافر کے لفظ سے برا ماننے کی کوئی وجہ بھی نہیں۔

اسلام میں تبدیلی مذہب کی اجازت کیوں نہیں

اعتراض: (عیسائی پادریوں کا اعتراض)

جبکہ موجودہ عالمی معاشرہ میں تمام مذہبوں کی تحقیق اور مذہب کی تبدیلی کی مکمل آزادی ہے، تو اسلامی ممالک میں ایسی آزادی کیوں نہیں؟"

جواب: موجودہ مہذب عالمی معاشرہ میں یقیناً دہریے، مشرک، بت پرست اور ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ایسی باتیں کہتے ہیں۔

اگر گویم زباں سوزد

ایسے مہذب عالمی معاشرہ" سے اللہ بچائے۔

علاوہ ازیں موجودہ مہذب عالمی معاشرہ، بہت ہی زیادہ غیر مہذب ہے۔ جور و جفا اور ظلم و ستم کا دور دورہ اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ ہے۔ شراب خوری کی اس قدر کثرت ہے کہ نابالغ لڑکیاں بھی اس کی دلدادہ ہیں۔ فحاشی اور عریانی کے سوہان روح اور مکروہ مناظر جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ زنا کاری اس قدر عام کہ (بے شمار) کنواری لڑکیاں مائیں بن رہی ہیں۔ بے حیائی اور بے غیرتی کا یہ حال ہے کہ باپ اپنی کنواری لڑکی کے "فرینڈ" کو فخر سے ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے۔ اس مذموم فعل سے شرم محسوس نہیں کرتا۔ تو ایسا "مہذب عالمی معاشرہ" ایک عقلمند اور غیرت مند انسان کیلئے کیونکر حجت ہو سکتا ہے؟

خوب یاد رہے کہ عالمی معاشرہ نہ قابل تقلید اور نہ قابل حجت ہوتا ہے اگر عالمی

معاشرہ قابل تقلید اور قابل حجت ہوتا تو باری تعالیٰ انسانوں کی فلاح و بہبود اور رہنمائی کے واسطے کبھی بھی حضرات انبیاء علیہم السلام کو مبعوث نہ فرماتا۔ بلکہ لوگ خود ہی معاشرہ کی تقلید کرتے چلے جاتے۔ (پس معلوم ہوا کہ) وحی الٰہی کے مقابلہ میں اس معاشرہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہمارے لئے "موجودہ مہذب عالمی معاشرہ" حجت و برہان نہیں۔ اسلام کا اپنا ایک معیار ہے موجودہ بلکہ کوئی بھی عالمی معاشرہ اس معیار کے کسی حصہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔

اسلام میں مذاہب کی تحقیق کا میدان ہر وقت کھلا اور آزاد ہے پابندی نہیں مگر اسلام اپنی صداقت و غیرت کی وجہ سے اپنے ماننے والوں کو اپنے سے بغاوت و سرکشی، اپنے سے منہ موڑنے اور تعلق توڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مسلمان ہونے کے بعد مذہب بدلنے پر اگر توبہ نہ کرے تو واجب القتل ٹھہرتا ہے۔ اسلام کا یہ فعل مبارک قابل تحسین ہے۔ (عیسائیوں کو چاہیے کہ وہ درج ذیل بائبل کی عبارت کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنائیں، اسلام کی صداقت خود بخود واضح ہو جائے گی اور یہ اعتراض ہوا میں اڑ جائے گا)۔

چنانچہ تورات میں بھی ایسا ہی ہے:

اگر تیرے درمیان تیری بستیوں میں جن کو خداوند تیرا خدا تجھ کو دے کہیں کوئی مرد یا عورت ملے جس نے خداوند تیرے خدا کے حضور یہ بدکاری کی ہو کہ اس کے عہد کو توڑا ہو۔ اور جا کر اور معبودوں کی یا سورج یا چاند یا اجرام فلک میں سے کسی کی جس کا حکم میں نے تجھ کو نہیں دیا پوجا اور پرستش کی ہو۔ اور یہ بات تجھ کو بتائی جائے اور تیرے سننے میں آئے تو تو جانفشانی سے تحقیقات کرنا اور اگر یہ ٹھیک ہو اور قطعی طور پر ثابت ہو جائے کہ اسرائیل میں ایسا مکروہ کام ہوا تو اس مرد یا اس عورت کو جس نے یہ برا کام کیا ہو باہر اپنے پھاٹکوں پر نکال لے جانا اور ان کو ایسا سنگسار کرنا کہ وہ مر جائیں۔ جب واجب القتل ٹھہرے وہ دو یا تین آدمیوں کی گواہی سے مارا جائے۔ اس کو قتل کرتے وقت گواہوں کے ہاتھ پہلے اس پر اٹھیں اس کے بعد باقی سب لوگوں

کے ہاتھ یوں تو اپنے درمیان سے شرارت کو دور کیا کرنا۔

(تورات کی پانچویں کتاب: استثناء ۱۷: ۲ تا ۷)

ایک مرتبہ مؤلف کتاب مسیحی اشاعت خانہ فیروز پور روڈ لاہور میں گیا وہاں عیسائیوں کے بڑے مصنف اور مؤلف پادری وکلف اے سنگھ سے گفتگو ہوئی اس نے اسلام پر یہ اعتراض کیا کہ اسلام اپنے ماننے والے کو پھر کسی اور مذہب میں جانے کی اور اس کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ اسے مرتد قرار دے کر واجب القتل قرار دیتا ہے۔ جبکہ ہمارے عیسائی مذہب میں یہ تشدد نہیں ہے تو اسلام میں ایسا کیوں ہے؟

راقم الحروف نے یہ جواب دیا کہ جب کوئی شخص مسلمان ہوتا ہے تو اس کے تمام احکامات کو تسلیم کر کے مسلمان ہوتا ہے اور سہ اسلام کے احکامات اس کے ساتھ ایک طرح کا معاہدہ ہوتے ہیں کہ وہ ان کی پابندی کرے گا ورنہ جو اسلام کا حکم ہو مجھے قبول ہوگا۔

اس لئے جب کوئی مسلمان مرتد ہو جائے تو اس کو تین دن کی مہلت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لے اور دوبارہ اسلام کو قبول کر لے اس موقعے کے دیئے جانے کے باوجود اگر کوئی مرتد ہونے پر ہی بضدر ہے تو تین دن کے بعد اس کو قتل کرنے کا حکم ہے۔ اور یہ قتل اس کے اسلام قبول کرنے کے اس معاہدہ کے تحت ہو رہا ہے۔ اس لئے اسلام میں کوئی تشدد نہیں۔

تو اس سے کوئی جواب نہ بن سکا اور یہی کہا کہ آپ کا جواب درست ہے۔

(امداد اللہ)

اگر غیر مسلم مہذب ہو تو نجات کیوں ممکن نہیں؟

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

اس شبہ کا جواب کہ غیر مسلم اگر مہذب ہو۔ تو ناجی کیوں نہیں؟

جواب: ایک شخص ہے کہ وہ گورنمنٹ کے شاہی اقتدار کو مانتا ہے۔ مگر ہمیشہ قانون کے خلاف عمل کرتا ہے۔ چوری بھی کرتا ہے۔ جوا بھی کھیلتا ہے۔ اور بدتہذیب بھی ہے۔ تو ایسے شخص کے دل میں چونکہ گورنمنٹ کا اقتدار ہے۔ اس لئے اسے بغاوت کی سزا نہ ہوگی اور ہمیشہ کیلئے مردود نظر نہ ہوگا۔ بلکہ صرف اختتام سزائے معین تک اور اس کے بعد پھر وہ گورنمنٹ کی محبوب رعایا میں داخل ہو جائے گا۔ برخلاف اس شخص کے جو نہایت مہذب و متین ہو اور افعال قبیحہ خلاف قانون سے بھی بچتا ہو۔ مگر گورنمنٹ کے اقتدار شاہانہ کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ تو اس کو بغاوت کی یہ سزا ہوگی کہ عبور دریائے شور کر دیا جائے گا۔ یا پھانسی دے دیا جائے گا۔ اور ہمیشہ کیلئے معتوب رہے گا۔

اسی طرح اسلامی قانون بھی ہے کہ جس کے عقائد اچھے نہیں وہ باغی ہے۔ اگرچہ نماز روزہ کرے۔ اور کیسا ہی شائستہ ہو ہمیشہ کیلئے مردود بارگاہ خداوندی ہوگا۔ اگر توبہ نہ کرے۔ برخلاف اس شخص کے جو نماز روزہ کچھ نہیں کرتا۔ ہر قسم کے معاصی میں مبتلا رہتا ہے۔ مگر عقائد صحیح ہوں۔ تو اس کو وہی میعادی سزا خلاف قانون عمل کرنے کی ہوگی۔ اگر توبہ نہ کرے۔ لیکن باغیوں میں شمار نہ ہوگا۔ اور اختتام سزا کے بعد پھر وہ حق تعالیٰ کی محبوب رعایا یعنی جنتیوں میں داخل ہو جائے گا۔

مگر یہاں پر بعضے شبہ کیا کرتے ہیں کہ جب کسی غیر مسلم میں اخلاق و اعمال شائستہ ہوں۔ تو کیا وجہ ہے کہ وہ ناجی نہیں؟ میں کہتا ہوں کہ گورنمنٹ پر بھی یہی اعتراض کیا ہوتا کہ کیا وجہ ہے کہ جب ایک باغی مہذب ہے بقیہ جرائم قانونی سے محفوظ ہے پھر کیوں اس کو سزا ہوتی ہے۔

اس کے سزا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ باغی ہے تو اس کے سارے کمالات ہیچ در ہیچ ہیں۔ پس اسلامی قانون بھی ایسا ہی ہے (حضرت تھانوی کا وعظ الوقت صفحہ ۱۲۹)

کافر کے اچھے عمل مردود کیوں؟

اعتراض: (بیس برن لالہ اندر من ہندو کا اعتراض)
قرآن خبر دیتا ہے کہ اگرچہ کافر اچھے عمل کرتے ہیں لیکن سب برباد جاتے ہیں اللہ کو کوئی قبول نہیں۔

جواب: اگر کسی کا منہ کالا ہو اس کو جتنا سفید کرنا چاہو گورا نہیں ہوگا۔
اگر کوئی ساری زندگی بادشاہ کی فرمانبرداری کرتا رہے اور کبھی بغاوت کرے تو اس کا استیصال واجب ہو جاتا ہے۔
اس پر عقلی دلائل تو بہت ہیں لیکن ہم چند نقلی دلائل ہندوؤں کی کتابوں سے نقل کرتے ہیں۔

پرب اول مہابھارت پر لکھا ہے:
کھٹولی اپنکھد اتھربن بید تمام عمر کی حسنات کا نتیجہ ایک مہمان کے ملول رہنے سے باطل ہو جاتا ہے۔ انتہیٰ

مہابھارت سانت پرب فصل موچھا دھرم میں لکھا ہے:
جو شخص دغا بازی' نادانی' چوری' برائی' جھوٹ بولنے اور حسد کرنے اور کسی کو اپنانے کا شیوہ اختیار کرے گا چغلی کرے گا چوری کرے گا اس کی اطاعت وعبادت سب برباد ہو جائیں گی۔

ادھیائے ۱۳۸ اسکند پوران میں لکھا ہے کہ
جو شخص غیر منکوحہ عورت کے ساتھ جماع کرے گا اس کے تمام اعمال باطل ہو جائیں گے۔

پس مذکورہ تصریحات کی بنیاد پر ہندوؤں کے اعمال بھی باطل ہو جاتے ہیں اور یہ ہندوؤں کے برے اعمال کی وجہ سے سب اعمال باطل ہوتے ہیں اگر کوئی فروع

کے بجائے اصول میں منکر ہو تو اس کے نیک اعمال بدرجہ اولیٰ ضائع ہونے چاہئیں اور یہ کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ عدل ہی ہے۔ (سوط اللہ الجبار ص ٦٦-٦٧)

کیا شریعت قید محض ہے؟

اعتراض: (آزاد خیال لوگوں کا اعتراض)

جواب: ہمارے ترقی یافتہ بھائی آزادی کا بہت دم بھرتے ہیں اور شریعت کو قید بتلاتے ہیں ہم تو اس کا برعکس دیکھ رہے ہیں کہ یہ لوگ مقید ہیں۔ اور ہم آزاد ہیں۔ ایک صاحب کانپور میں کوٹ پتلون بوٹ سوٹ سے کسے کسائے میرے پاس آئے۔ وہ بیٹھنا چاہتے تھے۔ کرسی پر وہ سہولت سے بیٹھ جاتے لیکن ہم غریبوں کے پاس کرسی کہاں؟ ہمارے لئے تو چٹائی پر بیٹھنا فخر ہے۔ اب وہ کھڑے ہیں لیکن کھڑے کھڑے بات کیسے کریں ہاتھ میں ایک چھڑی بھی تھی۔ چھڑی پر سہارا دیکر اور تاک لگا کر بھدے سے گر پڑے۔ مجھے ہنسی آئی۔ یہ بتلایئے کہ یہ تعذیب آزادی ہے۔ یا قید ہے۔ بیٹھنا تو مصیبت تھا ہی اور اٹھنا اور بھی مصیبت ہوا۔ اور اگر چلتے چلتے گر پڑیں تو بس وہاں ہی پڑے رہتے ہوں گے۔ اور لیجیے اگر جنگل میں کھانے کا وقت آجائے تو ہم تو دانے بھی چبا سکتے ہیں۔ اور روٹی ہو وہ بھی آدمیوں کی طرح بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔ اور ان کے لئے میز کرسی ہو۔ کانٹا ہو چھری ہو۔ تب یہ کھانا تناول فرمائیں۔ کپڑوں میں ہماری یہ حالت ہے کہ پاجامہ نہ ہو لنگی باندھ لیں گے۔ اچکن نہ ہو کرتہ کافی ہے۔ عمامہ نہ ہو ٹوپی ہی سہی۔ پھر ٹوپی بھی خواہ کسی کپڑے کی ہو۔ پھر حدود شرعیہ کی کوئی قید نہیں اگر وہ بھی نہ ہو تو ننگے سر رہیں گے اور پھر اچکن اگر بانات کا ہو تو اس کی قید کوئی نہیں کہ پاجامہ کشمیرہ کا ہو لٹھا کا ہو گاڑھے کا ہو گزی کا ہو کسی شے کا ہو۔ نہ ہو لنگی کفایت کرتی ہے۔ ان کو یہ مصیبت ہے کہ اگر پتلون کسی خاص کپڑے کا ہو۔ تو کوٹ بھی اس کے مناسب ہو۔ قمیص بھی اس کے مناسب ہو۔ ورنہ فیشن کے خلاف ہے۔

کیوں صاحبو! یہ آزادی تو بڑی بھاری قید ہے۔ میں ان کی آزادی کی حقیقت عرض کرتا ہوں کہ یہ لوگ صرف خدا اور رسول سے آزاد ہیں۔ باقی نہ کھانے میں آزاد نہ پینے میں آزاد۔ نہ پہننے میں آزاد ہر بات میں مقید ہیں۔ اگر آزاد ہیں۔ تو خدا اور رسول سے آزاد ہیں تو خاک پڑے ایسی آزادی پر۔ اور مبارک رہے ہم کو یہ قید۔ اگر ہم مقید ہیں تو ہماری قید کی تو یہ حالت ہے

اسیرش نخواہد رہائی زبند
شکارش بجوید خلاص ازکمند

اور یہ وہ قید ہے

گرد و صد زنجیر آری بگلم
غیر زلف آن نگار مقبلم

اور ہماری ایسی قید ہے کہ مدتوں کے بعد محبوب کسی کو ملا ہو اور وہ اپنے لطف وکرم سے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ کر عاشق کو اپنے پاس بٹھلا لے اور اس کو نہ چھوڑے تو اس عاشق کی اس وقت کیا حالت ہوگی اس کی غیبت میں یہ حالت تھی۔ کہ کہا کرتا تھا

اگر چہ دور افتادم بدیں امید خرسندم
کہ شاید دوست من بارد گر جاناں گیرد

بھلا اب کیا حال ہوگا۔ بلکہ اگر محبوب یہ کہے کہ وہ اگر تم کو زور سے ہاتھ پکڑنے میں تکلیف ہو تو تمہارا ہاتھ چھوڑ دوں۔ تو وہ عاشق یہ کہے گا کہ میرا ہاتھ کیا جان بھی نہ چھوڑ۔ اور کہے گا

نہ شود نصیب دشمن کہ ہلاک تیغت
دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

بس جن کو خدا اور رسول کے ساتھ اس درجہ محبت ہے کیا وہ اس قید کو ناگوار سمجھیں گے؟ ہرگز نہیں۔ جس کو کسی سے محبت ہوئی ہوگی وہی اس کا لطف جانتا ہے

ہاں جس دل میں محبت کا ذوق ہی نہ ہو وہ کیا جانے کہ اس میں کیا لطف ہے۔ نامرد اصلی کیا جانے کہ عورت میں لطف ہوتا ہے۔ ورنہ اگر ذوق ہے۔ تو خدا جانتا ہے کہ ساری قیدیں آسان ہیں۔ وہ چولہے میں ڈالے گا ان قیدوں سے آزاد ہونے کو۔ اور بھاڑ میں ڈالے گا ایسی عقل کو اور سر پر رکھ لے گا دیوانگی کو، اسی دیوانگی کی نسبت مولانا فرماتے ہیں۔

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم
مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

ایسے شخص پر جو حالت بھی ہو۔ ناداری ہو۔ بیماری ہو۔ افلاس ہو۔ اس کو سب گوارا ہیں۔ اور اوّل تو ایسے شخص کو کوئی بھی مصیبت نہیں ہوتی۔ اور بالفرض اگر ہو بھی تو اس کو اس حالت میں بھی چین ہے سکون ہے اطمینان ہے۔ اس کی زندگی لطف کی زندگی ہے۔ خواہ کسی حالت میں ہو۔ حق تعالیٰ اسی حیات کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً. یعنی جو شخص نیک عمل کرے۔ مرد ہو یا عورت اس کو ہم پاکیزہ زندگی عطاء فرماتے ہیں۔ ان کی ہر وقت تسلی کی جاتی ہے۔ ان کے قلب میں سکون اور چین کا افاضہ ہوتا ہے۔ اور ان کو ہر حال میں یہ کہا جاتا ہے۔

سوئے نو میدی مرو کامید ہاست
سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

پس اس قید میں اگر ان کو کچھ تعب بھی ہو تو کچھ پرواہ نہیں اور ایسی قید کے مقابلہ میں جو آزادی ہے وہ نری مہمل ہے۔ اور سراسر خسران ہے حرمان ہے۔ اور یہ آزادی بس خدا اور رسول سے آزادی ہے۔ ورنہ یہ لوگ سراپا مقید ہیں۔

(الاتفاق ص ۳۰ وعظ حضرت تھانویؒ)

کیا اہل کتاب کافر ہیں؟

اعتراض : (عیسائی پادری کا اعتراض)

''کس طرح یہودی اور مسیحی لوگ کافر کہلائے جاسکتے ہیں جب کہ ان کے پاس بھی آسمانی کتاب اور الہامی پیغمبر ہیں۔ اور وہ آسمانی خدا، فرشتگان، یوم آخرت، مسیح کی آمد کے منتظر ہیں اور قرآن میں ان لوگوں کی بابت، آخرت میں نیک اجر کا وعدہ ہے اور قرآن کے مطابق یہودیوں اور مسیحیوں کو محمد اور قرآن ماننے کی ہرگز ضرورت بھی نہیں۔''

جواب: فرمایئے قرآن و بائبل میں یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ اہل کتاب سچے نبی کے انکار سے کافر نہیں ہوتے؟

کاش کوئی اس بات کو سمجھ سکے کہ یہودیوں کے اہل کتاب ہونے کے باوجود بھی حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو کافر قرار دیا ہے۔

چنانچہ آپؑ نے فرمایا:

''اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ آسمان کی بادشاہی لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔'' (متی ۲۳:۱۳)

''اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ ایک مرید کرنے کیلئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو (متی ۲۳:۱۵)

''تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔'' (متی ۲۳:۲۳)

''اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن

میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہو۔(متی ۲۳: ۲۸)
الحاصل حضرت مسیح علیہ السلام یہودیوں کو کافر اور جہنمی قرار دیتے ہیں۔اور جو مسیحی حضرت مسیح علیہ السلام کے ان الفاظ کا انکار کرے کیا وہ مسیحی ہے؟!!

لگے ہاتھوں یہ بھی سماعت فرمایئے کہ سامری لوگ بھی آسمانی کتاب کا نام لیتے اور ان کے پاس بھی تورات ہے۔چونکہ وہ تمام سچے انبیاء علیہم السلام پر ایمان نہیں لاتے اس لئے وہ کافر ہیں۔

بالکل اسی طرح مسیحی لوگوں کا آنحضرت ﷺ کی نبوت کا انکار کرنا بھی کفر ہے۔نیز قرآن مجید مسیحوں کو الوہیت مسیحؑ اور تثلیث کے قائل ہونیکی وجہ سے بھی کافر قرار دیتا ہے۔(المائدۃ ۷۲: ۷۳)

نیز جو لوگ اللہ ربُّ العزت کے تمام انبیاء علیہم السلام میں سے بعض پر ایمان لائے ہوں اور بعض کے منکر ہوں تو یہ لوگ خواہ اہل کتاب ہی کیوں نہ ہوں۔تو بھی قرآن کریم ان کو کافر قرار دیتا ہے۔اور ان کیلئے ''ذلت کے عذاب'' کا برملا اعلان سناتا ہے۔(النساء ۱۵۰: ۱۵۱)

اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْناً فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ج وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ. (ال عمران: ۸۵)

(اور جو کوئی چاہے سوا دین اسلام کے اور کوئی دین۔سو اس سے سو ہرگز قبول نہ ہوگا، اور وہ آخرت میں خراب ہے)۔

الغرض منکرینِ اسلام کیلئے قرآن مجید میں نیک اجر کا کوئی وعدہ نہیں بلکہ ان کے ساتھ عذاب کا وعدہ پختہ ہے۔آج جو لوگ اسلام پر طرح طرح کے بہتان لگاتے اور بے بنیاد اعتراضات کرتے ہیں تو کل قیامت کے دن تمنا کریں گے کہ کاش ''ہم بھی مسلمان ہوتے''۔(الحجر: ۲)

پس قرآن کریم کی کسی آیت مبارکہ سے غیر مسلم کو آخرت میں ''نیک اجر'' ملنے کی توقع رکھنا اور آس لگانا صرف غلط فہمی، وہم وخیال اور نفس کا دھوکہ ہے۔ ہاں البتہ قرآن پاک میں یہ فرمان مبارک موجود ہے کہ جو کوئی اہل کتاب میں سے مشرف بہ اسلام ہوگا تو اسے دوہرا اجر ملے گا:

''اُولٰٓئکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ'' (القصص: ۵۲ تا ۵۴)

ترجمہ: اور وہ لوگ (اہل کتاب) پائیں گے اپنا ثواب دوہرا۔

قرآن کریم کے اس فرمان مبارک کے مطابق اس سنہری موقعہ سے ہر اہل کتاب فائدہ اٹھا سکتا اور دوہرا اجر وثواب کما سکتا ہے۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں

جبکہ مسیحی معترض صاحب کے نزدیک یہودی حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان نہ لا کر بھی ایماندار ہیں کیونکہ یہودی اہل کتاب ہیں تو پھر حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں تو اب موصوف کو بھی یہودی ہو جانا چاہیے!!۔

(جواب مسلم صفحہ ۱۸۸ تا ۱۹۰)

قرآن آجانے کے بعد انجیل وغیرہ کی ضرورت نہیں رہی

اعتراض : (پادری کا اعتراض):

کیا آج بھی مسلمان ایسی ہی مشکل میں نہیں کہ وہ پاک انجیل کو پڑھنے لکھنے کا علم رکھتے ہوئے بھی نہیں پڑھتے اور سچائی سے ناواقف اور محروم ہیں۔''

جواب:

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ. (الزمر:۲۲)

(بھلا جس کا سینہ کھول دیا اللہ نے دین اسلام کے واسطے سو وہ نور میں ہے اپنے رب کی طرف سے)

الحمدللہ! اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ہم اہل اسلام کا سینہ دین اسلام پر ایمان ویقین لانے اور اس پر عمل کرنے کے لیے کھول دیا ہے۔ چونکہ یہ خوش قسمت اور نیک بخت انبوہ کثیر اور جم غفیر باری تعالیٰ کے نور، روشنی، اور اجالے میں ہے اس لیے وہ کسی ضلالت وظلمت کی طرف منہ نہیں کرتا۔ دنیا کے تمام مسلموں کو بھی اسلام کی دعوت ہے وہ مسلمان ہو کر تو دیکھیں اور اس پر عمل کر کے تو دیکھیں اس میں کیسا مزہ اور شرح صدر ہے۔ (امداداللہ انور)۔ (جواب مسلم)

کیا مسلمان دوسروں کی باتیں نہ مان کر متعصب ہیں؟

اعتراض: (پنڈت دیانند کا اعتراض)

اگر مسلمان دوسروں کی اچھی باتیں نہیں مانتے تو متعصب ہیں۔

جواب: اگر اپنے ہی مذہب کو صحیح سمجھنا تعصب ہے تو آپ اوّل درجہ کے متعصب ہیں جو لکھتے ہیں۔

''اگر کوئی پوچھے کہ تمہارا اعتقاد کیا ہے تو یہی جواب دینا چاہیے کہ ہمارا اعتقاد وید ہے یعنی جو کچھ ویدوں میں بیان کیا گیا ہے ہم اس کو مانتے ہیں۔'' (ستیارتھ پرکاش سملاس نمبر ۷، اخیر)

کیا دین میں تنگی اور دشواری ہے؟

اعتراض: (غیر مسلموں کا اعتراض)

دین میں تنگی اور دشواری ہے؟

جواب: اس کے دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ قانون کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ اور یہ دشوار ہے اور ایک یہ کہ خود قانون ہی سخت ہے۔

تو اسلام میں کون سی دشواری ہے آیا یہ کہ قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ تو یہ تسلیم ہے کیونکہ اس میں ضرور دشواری ہوتی ہے۔ خواہ کتنا ہی سہل قانون ہو۔

مثلاً جو لوگ عدالت میں نوکر ہیں۔ اور ان کا وقت دس بجے سے ہے۔ تو کیا کبھی یہ پابندی دشوار نہیں ہوتی؟ ضرور ہوتی ہے۔ اور اس وقت کہتے ہیں کہ نوکری بڑی ذلت کی چیز ہے مگر اتنی ہی بات پر اس کو کبھی نہ چھوڑا۔ تو جب قانون کی پابندی ہوگی اس میں دشواری ضرور ہوگی۔ تو اگر اسلام میں یہ دشواری ہے تو تسلیم ہے۔ بلکہ اس کو تو ہم خود ہی ثابت کرتے ہیں۔ (لا تتبعوا الھوی اور اس سے صاف اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخَاشِعِیْنَ.

یہ دشواری تو تسلیم ہے مگر اس میں اسلام کی کیا تخصیص ہے۔ یہ تو سبھی کام میں بلکہ کھانے میں بھی ہے۔

کوئی اپاہجوں سے پوچھے خاص کر واجد علی شاہ کے احدیوں سے کہ کھانا کتنا مشکل کام ہے۔

حکایت:

مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کے دو احدی (سست و کاہل اہلکار) تھے۔ ان میں باری اس طرح تھی کہ ایک لیٹا ہوا آرام کرے۔ دوسرا بیٹھا ہوا اسکی حفاظت کرے۔ اسی طرح ایک لیٹا ہوا تھا ایک بیٹھا ہوا۔ ایک سوار ادھر سے گزرا۔ لیٹے ہوئے نے پکارا کہ میاں سوار ذرا یہ بیر جو میرے سینے پر رکھا ہے میرے منہ میں ڈال دو۔ سوار کو اس آرام طلبی سے سخت حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ حیرت یہ ہوئی کہ اس کا رفیق جو پاس بیٹھا ہے۔ اس سے اتنا کام نہیں ہوتا۔ اس لئے اس بیٹھے ہوئے سے کہا کہ بھائی تو ہی اس کے منہ میں ڈال دے۔ وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ جناب میری آپ کی لڑائی ہو جائے گی آپ کو کیا خبر یہ میرے ساتھ کیسا ہے کل میں لیٹا تھا یہ بیٹھا ہوا تھا مجھ کو جو جمائی آئی اس سے منہ کھل گیا، ایک کتا آ کر منہ میں پیشاب کرنے لگا۔ یہ بیٹھا ہوا

دیکھتا رہا اور اس سے اتنا نہ ہوا کہ کتے کو ہٹا دے۔ میں ضرور اس کے منہ میں بیر دوں گا۔ سوار حیرت میں غرق ہو گیا۔ اور لاحول پڑھتا ہوا چل دیا۔

تو اگر کوئی احدیوں سے پوچھے تو ان کو کھانا بھی مشکل ہے۔

ہمارے عزیز دو بھائی ہیں۔ ایک چھوٹے ایک بڑے، بڑے صاحب ہاتھ پاؤں لپیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور چھوٹے سے کہتے ہیں۔ کہ میرے منہ میں لقمے دے کر مجھ کو کھانا کھلا۔

تو دنیا میں تو ایسی نظریں بھی موجود ہیں اور رہیں گی تو اس طرح تو کھانے میں بھی دشواری ہے اور اس میں شرعی اور قانونی پابندیاں بھی ہیں۔

مثلاً یہ کہ دوسرے کی چیز نہ کھاؤ، ڈکیتی نہ ڈالو۔ مگر اس کو کسی نے نہ کہا کہ بڑا سخت قانون ہے وجہ یہ کہ آپ کو ڈکیتی ڈالنا ہی نہیں ہے۔ اس لئے آپ کو ممانعت کا قانون سخت معلوم نہیں ہوتا اور رشوت لینا مقصود ہے اس لئے اس کی ممانعت سخت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جو ڈکیتی پیشہ ہیں ان سے کوئی پوچھے اس ممانعت کے قانون کو کتنا سخت سمجھتے ہیں۔

اسی طرح ایک جماعت بیہودوں کی ایسی بھی ہے کہ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی سلطنت نہ ہو۔ حالانکہ ضرورت سلطنت کا قانون امر فطری ہے مگر یہ ان کو گراں ہے۔ تو ایسے لوگ تو انسانیت ہی سے خارج ہیں۔ تو محض پابندی سے تو کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ پھر اسلام ہی پر کیوں اعتراض ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ پابندی کی ضرورت تو تسلیم ہے مگر خود قانون ہی بڑا سخت ہے تو واقعی یہ دشواری ہے۔ مگر دین میں ایسی دشواری ہی نہیں کہ قانون سخت ہو۔ اب یہ شبہ ہوگا کہ یہ تو مشاہدہ کے خلاف ہے۔ تو حقیقت میں اس میں تلبیس ہوتی ہے۔ قانون کی سختی تو وہ ہے کہ اگر اس کو سب بھی مان لیں تب بھی دشواری پیش آئے۔ مثلاً یہ قانون ہو جائے کہ اگر چھٹانک بھر سے زیادہ کوئی کھائے تو پھانسی ہوگی۔ یہ ایسی سخت بات ہے کہ اگر سب عمل کرنے کا ارادہ کریں تب بھی تکلیف ہو۔

اور ایک دشواری اس طرح کی ہے کہ قانون تو نرم ہے اور علامت اس کی یہ ہے کہ، اگر سب اس پر عمل کرنے لگیں، تو کسی کو بھی دشواری پیش نہ آئے لیکن اس میں ایک خاص عارض کی وجہ سے سختی پیش آجائے۔ وہ عارض یہ ہے کہ زیادہ آدمی اس پر عمل نہیں کرتے پس جب تھوڑے آدمی عمل کریں گے تو ان کو دوسروں کی وجہ سے ضرور تنگی ہوگی۔ کیونکہ تعلق معاملات کا ان دوسروں سے ہی ہے۔ تو اس کو قانون کی سختی نہ کہیں گے بلکہ اس سختی کا منشا ان باغیوں کی بغاوت ہے۔ مثلاً کوئی ایسی جگہ پہنچے کہ وہاں کے لوگ باغی ہوں۔ اور یہ شخص وہاں پہنچ کر کوئی چیز خریدے۔ اور دام دے دے۔ پھر اس سے کہا جائے کہ قانون سلطنت یہ ہے کہ پورے دام لے کر پوری چیز دے۔ مگر ہم اس قانون کو نہیں مانتے۔ اس لئے تم کو آدھی چیز ملے گی۔ تو ایمان سے کہیے کہ یہ دشواری قانون کی ہے یا ان بدمعاشوں کی بدمعاشی کی۔ قانون کا منشا تو یہ ہے کہ سیر بھر دو مگر ان بدمعاش لوگوں نے بدمعاشی کی اور سیر بھر کی آدھ سیر دی۔ تو اس دشواری سے اگر کوئی گورنمنٹ کو برا کہنے لگے تو وہ احمق ہے یا نہیں۔

تو جو دشواری اس وقت پیش آرہی ہے۔ وہ دشواری یہ ہے جس کو اسلام پر تھوپا جاتا ہے۔ کوئی شخص اسلام کا کوئی ایسا قانون بتلائے کہ سب مسلمانوں کے ان لینے اور عمل کرنے کے بعد بھی اس میں دشواری پیش آئے۔ اگر پچاس قباحتیں بھی آجائیں جب بھی شریعت کا کوئی ایک قانون بھی ایسا نہیں بتلا سکتے۔

صرف موجودہ دشواری کی وجہ یہ ہے کہ نافرمانوں سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ مثلاً قرض کی ضرورت ہوئی۔ اب جس کے پاس جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سود لاؤ تو سود کی حرمت کا الزام شریعت پر دینا اور اپنے کیے کو اسلام پر تھوپنا ایسا ہے کہ ؎

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد
ہمچو آن شیرے کہ بر خود حملہ کرد

مثنوی میں شیر کی ایک لمبی چوڑی حکایت لکھی ہے:

شیر اور خرگوش کی حکایت

ایک شیر کو خرگوش نے دھوکا دیا اور کہا میں تمہاری خوراک کے لئے ایک موٹا خرگوش لاتا تھا۔ راستہ میں ایک دوسرا شیر ملا، اور مجھ سے چھین لیا۔ شیر کو غصہ آیا۔ کہ بتلا وہ کہاں ہے۔ اس نے ایک کنویں پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ واقعی اس میں شیر کا عکس نظر آیا ۔بس شیر اس کنویں میں جا کودا اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ میں نے اپنے ہی اوپر حملہ کیا تھا۔

مولانا اس کو فرماتے ہیں

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد
ہمچو آن شیرے کہ بر خود حملہ کرد

اسی طرح ہم کو بھی اپنی دشواری کی صورت شریعت میں نظر آتی ہے۔ مگر حقیقت میں یہ اپنے اوپر اعتراض ہے۔

اس پر ایک حکایت اور یاد آئی کہ

آئینہ والے حبشی کی حکایت

ایک حبشی نے ایک آئینہ دیکھا اس میں اپنی صورت نظر پڑی۔ آئینہ کو بڑے زور سے پتھر پر کھینچ مارا کہ ایسا ہی بدشکل تھا۔ تب ہی تو کوئی تجھ کو راستہ میں پھینک گیا۔

ایک احمق کی حکایت

ایک اور احمق کی حکایت ہے کہ اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا۔ لوٹے میں ایک ٹکڑا گر پڑا۔ جھانکنے سے اپنی صورت نظر آئی۔ سمجھا کہ اس میں کوئی بچہ ہے جس نے میرا ٹکڑا چھین لیا ہے تو بچہ نے باپ سے کہا۔ ابا اس نے یہ میرا ٹکڑا لے لیا۔ آپ چھیننے اٹھے۔ جھانک کر دیکھا تو اپنی شکل نظر پڑی۔ بولے کہ لعنت خدا کی بڈھا ہو کر بچہ کا ٹکڑا

چھین لیا۔ تف ہے۔ تیری اوقات پر۔ سو وہ کس کو تف کہہ رہے تھے۔

اسی طرح ہم لوگوں نے آئینہ شریعت میں اپنی شکل کو دیکھا۔ اور وہ تنگی اپنی صفت میں دیکھی اس کو شریعت کی تنگی سمجھا۔ یہ ہے حقیقت تختی کی۔

ایک طبیب کی مثال

اور میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک طبیب علاج کر رہا ہے۔ اور بہت شفیق بھی ہے۔ مگر نہ ایسا آزاد کہ خاک پتھر۔ سب کی اجازت دے دے ظاہر ہے کہ جب غذائیں کھائی جائیں گی تو کسی چیز کی تو ضرور ہی ممانعت ہوگی۔

اتفاق سے ایک دیہاتی پہنچا۔ کہ صاحب کھاؤں کیا۔ جواب دیا کہ بکری کا گوشت پالک۔ وہ بولا یہ تو ملتا نہیں۔ کہا مونگ کی دال۔ کہا یہ بھی نہیں ملتی۔ کہا فیرنی۔ کہنے لگا یہ بھی نہیں ہے۔ پھر خود پوچھا بینگن کھا لوں۔ کہا ہرگز نہ کھانا۔ کریلہ کو پوچھا۔ اس کو بھی منع کیا۔ آلو سے بھی روک دیا۔ تو دیہاتی نے کہا کہ صاحب ہمارے یہاں تو یہی چیزیں ملتی ہیں۔ طبیب نے کہا کہ فتویٰ طب کا تو یہی ہے۔ دیہاتی نے باہر آکر کہا کہ صاحب یہ تو بڑے سخت ہیں۔ کہ یہ بھی نہ کھاؤ۔ وہ بھی نہ کھاؤ۔ تو کیا طبیب پر یہ الزام صحیح ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ وسعت تو یہ ہے کہ متعدد چیزوں کی سب کی اجازت دے دی۔ لیکن وہ علاقہ ایسا بے کار ہے کہ بجز مضر چیزوں کے وہاں کچھ ملتا ہی نہیں۔ تو یہ طب کی تنگی تو نہیں۔ اس شخص کے گاؤں والوں کی معاشرت کی تنگی ہے۔

اسی طرح حاجت ضروریہ پر نظر کر کے دیکھیے کہ معاش کے ضروری طریقوں کو جو کہ قریب الوقوع ہیں۔ اگر پچیس آپ نکالیں گے تو بیس کو شریعت جائز کہے گی اور پانچ کو ناجائز لیکن اگر آپ کے ملک والے ہمیشہ ان ہی پانچ کو استعمال کریں۔ اور بیس کو متروک کر دیں۔ تو یہ تنگی معاشرت کی ہوئی یا قانون شریعت کی۔ پس یہ الزام تو بحمد اللہ رفع ہو گیا۔ اور اگر اس کی تصدیق میں شبہ ہو تو علم دین پڑھیے۔ اس سے معلوم

ہوگا۔ کہ شریعت نے معاشی مسائل میں کس قدر توسیع کی ہے۔

اب صرف ایک فریاد رہ گئی ہے، اس میں جی چاہتا ہے مسلمانوں کی ہمدردی کرنے کو وہ یہ ہے کہ یہ تو سمجھ میں آگیا کہ شریعت میں تو دشواری نہیں۔ مگر حالت موجودہ میں اس عارض کے سبب کہ ہم کو واسطہ ایسوں سے پڑا ہے جو شریعت پر عمل نہیں کرتے۔ عارضی دشواری تو ہوگئی۔ تو ہم پر تو دشواری کا اثر آخر پہنچ گیا۔ البتہ اعتقاد درست ہوگیا کہ شریعت میں دشواری نہیں۔ مگر عمل کس طرح سے کریں کیا لین دین چھوڑ دیں کیونکہ نوکریاں اکثر ناجائز، معاملات اکثر ناجائز، تجارت اکثر ناجائز، تو یہ ایک فریاد قابل استماع ہے۔ سو اس کے متعلق بھی سن لیجئے اسمیں قدرے تفصیل ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے جو چند معاملات کو دیکھ کر اس عارضی دشواری کے اعتبار سے عام حکم کر دیا کہ سب ہی دشوار ہے غیر مسلم ہے۔

سمجھئے کہ ایسے اعمال دو قسم کے ہیں ایک وہ کہ ان کی اصلاح کرنے سے معاش کی گاڑی کچھ اٹکتی ہے۔ اور ایک وہ کہ ان کی اصلاح سے معاش کا کچھ بھی نقصان نہیں۔ مثلاً وضع شریعت کے موافق بنائے، نماز روزہ کرے، حج کرے، تکبر نہ کرے، باجا گاجا چھوڑ دے۔ تو بتلایئے اس میں معاش کا کیا نقصان ہے تو اس میں تو آج ہی سے اصلاح کر لیجئے۔ پس زیادہ اعمال تو آپ کے آج ہی درست ہو جائیں گے کیونکہ پچاس عمل میں چالیس ایسے نکلیں گے کہ محض گناہ بے لذت ہیں، کہ خواہ مخواہ آپ نے ان کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ آگے دس ہی رہ جاویں گے اس میں اگر آپ کی اصلاح نہ بھی ہوئی۔ تو چونکہ غالب درجہ اعمال صالحہ کا موجود ہو چکا ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ سے امید ہے کہ بقیہ اعمال کو جو کہ مغلوب و قلیل ہیں درست فرما دیں گے۔ جیسے ایک شعلہ جوالہ کے دیکھنے میں پورا دائرہ شعلہ نظر آتا ہے حالانکہ اس میں بہت چھوٹی قوس نورانی ہے اور بڑی قوس ظلمانی۔ مگر جب نور و ظلمت جمع ہوتے ہیں تو نور ہی غالب آتا ہے اور اس درستی میں گویا یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس کی خاصیت ہی یہی ہے

جیسے مقناطیس کہ بالخاصہ لوہے کا جاذب ہے۔پس اگر ہم یہ کہیں کہ اعمال صالحہ میں بھی خاصیت یہی ہے کہ بقیہ اعمال کو درست کر دیتا ہے تو اس کا دعویٰ ہو سکتا ہے۔

مگر میں اس کا راز بھی بتلاتا ہوں کہ اعمال صالحہ میں ایک اثر ہے کہ اس سے دل میں قوت ہوتی ہے اور صحابہ کی ترقی کا راز یہی ہے۔ہم نے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ بیماری میں اٹھا نہیں جاتا مگر نماز کے وقت بلا تکلف کھڑے ہو کر نماز ادا کر لیتے ہیں۔ خوب کہا ہے ؎

ہر چند کہ پیر خستہ و بس ناتواں شدم

ہر گاہ نظر برروئے تو کردم جواں شدم

ان کی خدمت میں جب جی چاہے جا کر دیکھ لیجئے۔غرض طاعت سے قوت ہوتی ہے۔اور اصلاح نہ کرنے کا صرف یہی سبب تھا کہ ہمت نہیں ہوتی تھی۔مگر جب قوت ہوگی تو تمام موانع ختم ہو جائیں گے۔

اور اگر کوئی اس ڈر سے کہ کبھی اصلاح ہو جائے یہ تدبیر بھی نہ کرے تو دوسری بات ہے۔

جیسے کسی نے یہ سن کر کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے کہا تھا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں گے۔غرض اس طرح قوت پیدا ہو جاتی ہے اور ضعف جاتا رہتا ہے یہ ہے وہ راز اور اگر بالفرض اصلاح بھی نہ ہوئی۔تو ایک اور بات تو ضرور پیدا ہو جائے گی کہ اس معصیت کی مذمت آپ کے دل میں جمتی چلی جائے گی اور اس سے نفرت پیدا ہو جائے گی۔اور یہ مذمت و نفرت آپ کی اصلاح کر دے گی۔اور آخری بات یہ ہے کہ اگر اس طرح بھی اصلاح نہ ہوئی تو جرائم تو گھٹ گئے۔اگر ایک شخص پر چار جرم قائم ہوئے اور وکیل نے کہا کہ تین تو ٹل سکتے ہیں۔مگر ایک نہیں ٹل سکتا۔تو کیا کوئی یہ کہے گا کہ ؎

چو آب از سر گذشت

چہ یک نیزہ چہ یک دست

ہرگز نہیں۔ بلکہ تخفیف ہی کو غنیمت سمجھیں گے۔ تو اس طرح آپ بھی پچاس جرائم میں سے صرف دس ہی کے مجرم رہ گئے۔

اب وہ حصہ رہ گیا جس میں تغیر کرنے سے معاش کا حرج ہے تو اوّل تو چونکہ آپ کو شریعت کے احکام معلوم نہیں ہیں اس کی وجہ سے بہت سے افعال ناجائز صادر ہو جاتے ہیں۔

اگر آپ احکام کی تحقیق کیجئے گا تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ تھوڑے تغیر سے وہ ناجائز ہو جائے گا۔

مثلاً اگر آپ نے چاندی خریدی تو اس میں مسئلہ یہ ہے کہ چاندی کا مقابلہ اگر چاندی سے ہو تو زیادتی کمی حرام ہے۔

اب اگر کہیئے کہ صاحب اچھا مسئلہ سنا کہ نرخ کے حساب سے تو سو روپے کی چاندی ایک سو بیس روپے بھر آتی۔ مگر اب سو روپے کی سو ہی روپے بھر ملی اچھا عمل کیا کہ بیس روپے کا خسارہ ہوا۔ اب ساری عمر کیلئے مولویوں کو خیر باد کہہ دیں گے تو سنئے بات یہ ہے کہ اگر مولوی صاحب سے یوں پوچھتے کہ مولوی صاحب جب چاندی میں زیادتی حرام ہے تو اب اگر اس پر اس خاص صورت میں عمل کریں تو بڑا نقصان ہوگا کیا کوئی جائز شکل بھی معاملہ کی ہے تو مولوی صاحب یوں کہتے کہ ان روپوں میں ایک گنی بھی ملا دو۔ تو ایک سو بیس بھر چاندی جو آئے گی تو پچاس روپے بھر تو پچاس روپے کی آئے گی اور باقی کی اس گنی میں شریعت محسوب کرے گی تم کو نیت کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ شریعت خود فیصلہ کر چکی ہے۔ تو اب بتلایئے کیا نقصان ہوا۔

اب مشکل تو یہ ہے کہ علماء سے پوچھتے بھی نہیں۔ جناب پوچھتے تو رہے اور میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب کو مولوی صاحب جائز ہی کہہ دیں گے۔ کیونکہ شریعت ان کے گھر کی تو ہے نہیں۔ کہ وہ اپنے اختیار سے جسے چاہے جائز کر دیں۔

جیسا کہ ایک مطوف (طواف کرانے والے) سے ایک بڑھیا نے صفا مروہ کی

سعی میں تھک کر کہا تھا۔ کہ مولوی صاحب اب تو معاف کردو۔ (اس کے معاف کرنے سے کیا طواف معاف ہوجاتا)۔

اسی طرح بعضے لوگ یوں چاہتے ہیں کہ علماء ہند مثل بعض علماء مصر کے کرنے لگیں۔ ان بعض علماء نے ایسا کر رکھا ہے کہ جو دنیا میں ہو رہا ہے سب جائز ہے۔ تو یہاں کے لوگ بھی یہی کرانا چاہتے ہیں۔

حکایت:

جیسے ایک رئیس نے ایک نوکر سے یہ کام لیا تھا۔ کہ جو ہماری زبان سے نکلے۔ تم اس کی تصدیق کر کے توجیہہ کردیا کرو چنانچہ ایک بار رئیس کے منہ سے نکلا۔ کہ ہم شکار کو گئے ایک ہرن پر گولی چلائی وہ اسکے سم کو توڑ کر ماتھے کو پھوڑ کر نکل گئی۔ سب اہل مجلس ہنسنے لگے کہ سم اور ماتھے کا کیا جوڑ۔ نوکر بولا سچ ہے حضور وہ اس وقت سم سے پیشانی کھجلا رہا تھا۔

تو جناب علماء سے ایسی نوکری ہوتی نہیں۔ نہ ہم اتنے ذہین ہیں۔ اور نہ خدا کرے کہ ہوں تو حاصل یہ کہ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ سب کو جائز کہہ دیں مگر پوچھ کر دیکھو تو بہت سے اشکالات کا جواب مل جائے گا۔ تو بہت بڑا حصہ اس عارضی دشواری کا اس طرح ختم جائے گا۔

ہاں بعض امور پھر بھی ایسے رہ جائیں گے۔ کہ وہ بالکل ناجائز ہوں گے۔ مگر اس میں بھی دو درجے ہیں۔ ایک تو وہ کہ اس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ سکتے ہیں۔ پس اس کو چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ اس کا چھوڑنا حاجات ضروریہ کیلئے مضر نہیں۔

اور ایک وہ درجہ ہے کہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ دوسرے کام اس کے حاجات ضروریہ کو کافی نہیں۔ تو ناپسندیدہ دل سے اس کو کرتے رہو اور گو یہ جائز تو نہ ہوں گے۔

مگر اس کے متعلق ایک دستور العمل ایسا بتلاتا ہوں کہ اس سے ایسے جرائم خفیف ہوجائیں گے اور یہ کہ اس میں دو برتاؤ کرنے چاہئیں۔

ایک تو یہ کہ ہر روز توبہ کیا کرے۔ اب تو یہ غضب ہے کہ لوگ توبہ کی حقیقت نہیں سمجھتے توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو کیا اس پر پچھتایئے اور دعا کیجئے کہ اے اللہ مجھے معاف فرمایئے مواخذہ نہ کیجئے تو یہ کیوں نہیں کرتے کیا ایسے کرنے سے نوکری سے موقوف ہو جاؤ گے ہرگز نہیں بلکہ تم نوکر ہی رہو گے دوسرے یہ دعا کیا کرو کہ اے اللہ کوئی دوسری سبیل میرے لئے نکال دیجئے تو اس میں یا تو کوئی سبیل نکلے گی اور جو کوئی دوسری سبیل نہ نکلی تو یہ شخص شرمندہ گنہگاروں کی فہرست میں تو لکھا جائے گا جرمی گنہگاروں کی فہرست میں نہیں لکھا جائے گا۔

اور یہ توسیع آپ میری ہی زبان سے سنیں گے۔

اور توسیع میں راز شرعی یہ ہے کہ اگر چھوڑنے پر مجبور کیا جائے تو شاید اس کو چھوڑ کر اس سے بھی زیادہ کسی گناہ شدید میں مبتلا ہو جائے۔ مثلاً یہی کہ چلو آریہ (ہندو) بنیں تو یہ توسع۔

این بلا دفع بلا ہائے بزرگ

کا مصداق ہے۔

اور میں کفر سے بچا رہا ہوں کیونکہ جب آدمی نادار ہوتا ہے۔ تو خدا جانے کیا کیا اس کو سوجھتا ہے۔

حکایت:

ہمارے حضرت حاجی صاحب جب تھانہ بھون میں رہتے تھے۔ ایک پٹھان حضرت کی خدمت میں دعا کرانے آیا کرتے تھے کہ مجھ پر ایک شخص نے جائیداد کے معاملہ میں بڑا ظلم کر رکھا ہے۔ حضرت جی دعا فرما دیتے۔ ایک بار آ کر کہنے لگے کہ اب اس نے حد ہی کر دی اور جائیداد غصب ہی کرنے کو ہے۔ حضرت نے فرمایا بھائی صبر کرو۔ اس نے کہا بہت اچھا دفعۃً حافظ محمد ضامن صاحب حجرہ میں سے نکل آئے اور اس پٹھان سے فرمایا ہرگز صبر نہ کرنا جاؤ مقدمہ کرو ہم دعا کریں گے اور حضرت سے

فرمایا آپ تو صابر شاکر تھے سب چھوڑ کر بیٹھ رہے اس میں تو اتنی قوت نہیں یہ اگر اسباب معاش کو چھوڑ دے گا تو جب حاجت ستائے گی یہ جھوٹی گواہی دے گا چوری کرے گا تو ایسوں کو صبر نہیں کرایا کرتے۔

تو یہ ہے اصل راز اس توسیع کا۔ تو آپ کسی سے اتنی گنجائش نہ سنیں گے۔ مگر یہ اس لئے ظاہر کر دیا گیا کہ کفر سے بچانا ہے لیکن خدا کیلئے اس کو آپ تمام معاصی میں آڑ نہ بنالیں کہ یہ جز تو بہت اچھا ہاتھ آیا۔ بات یہ ہے کہ اوّل تو یہ بہت تھوڑا حصہ ہے سب معاصی میں اس کا توڑ یہ نہیں ہوسکتا۔ دوسرے اس میں یہ بھی قید لگی ہوئی ہے کہ اس سے نکلنے کی ہر وقت فکر کرتے رہو۔ جیسے کوئی پاخانہ میں بیٹھا ہوا ہو اور تقاضا نکلنے کا رہتا ہے۔

حکایت:

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک رئیس صاحب ریل میں بیٹھے ہوئے تھے اور کہیں جگہ نہ تھی، مگر انہوں نے کئی آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی، اور کوئی کچھ کہتا تو دھمکاتے آخر ضرورت سے پائخانہ میں گئے تو چٹخنی لگ گئی اور ان کے کھولنے سے نہ کھلی بڑے پریشان ہوئے۔ لوگوں سے التجا کی سب نے انکار کر دیا آخر بڑی ساجت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو تنگ نہ کرنے قسم کھلائی یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ پائخانہ میں ہے اس میں قسم کھلانا جائز نہیں۔ تو جس طرح وہ پائخانہ سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی طرح حرام نوکری میں ایک سے ہی رہو۔ کیا کوئی پائخانہ (بیت الخلاء) میں جا کر فخر کرتا ہے؟ بلکہ قید سمجھتے ہیں مگر مجبوری میں کیا کریں۔

یوسف علیہ السلام کا قصہ یہ ہوا کہ جب زلیخا نے دروازہ بند اور مقفل کر لیا اور آپؑ نکلنے کیلئے دوڑے ہیں۔ عجیب توکل اور ہمت تھی کہ باوجود قفل لگے رہنے کے دوڑے اور آخر قفل ٹوٹ کر دروازے کھل گئے۔ اس کو فرماتے ہیں کہ

گر چہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیر یوسف وار میباید دوید

اور اگر نہ بھی کھلے گا تو حق تعالیٰ تو یہ دیکھیں گے کہ یہ تو دوڑا ٹکر بھی لگ گئی۔ اتنے پر بھی فضل ہو جائے گا۔ اب بتلایئے اس میں کون سی چیز مشکل ہے میں تو نوکری نہیں چھوڑتا مگر نفور رہیں سو یہ کیا مشکل ہے اب تو یہ بھی نہیں بلکہ معصیت پر ناز ہے بیبا کی ہے سو یہ فخر کیسا اور تکبر کیسا اور اہل دین کو ذلیل کیوں کہا جاتا ہے۔ سو اہل اسباب کا علماء کے ساتھ بڑا اختلاف معاش کے باب میں تھا۔ مگر اس سے زیادہ معاش کے متعلق کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ تو اب کون سا مرتبہ اختلاف کا رہ گیا نرا قانون تو دشواری ہی نہیں اور قانون سخت نہیں صرف بات یہ تھی کہ لوگوں کی طرف سے دشواری ہو جاتی ہے۔ تو اس میں بہت بڑی فہرست اصلاح کی تو معاش میں مخل ہی نہیں۔ اور جو مخل ہے اس کا بڑا حصہ تدبیر سے جائز ہو سکتا ہے۔

اور جو تدبیر سے بھی جائز نہ ہو سکے۔ وہ اولاً بہت مختصر ثانیاً اس میں اس طرح رہنے کی اجازت کہ اس سے نکلنے کی کوشش اور کیے پر پچھتانا اور توبہ کرتے رہنا۔ تو اب وہ کون سا جزو ہے جس پر یہ اشکال ہے کہ شریعت کی پابندی بہت سخت ہے۔ تو بحمد اللہ بے غبار یہ ثابت ہو گیا کہ

مَاجَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ.

(نفی الحرج ص ۱۸، وعظ حضرت تھانویؒ)

کیا اسلام میں زبردستی ہے؟

اعتراض: (عام کفار کا اعتراض)

اس آیت لا اکراہ فی الدین کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں زبردستی نہیں ہے۔ حالانکہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم سے ٹکرا رہی ہے۔

جواب: اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراض صحیح نہیں

ہے۔ اس لئے کہ اسلام میں جہاد وقتال کی تعلیم لوگوں کو قبول ایمان پر مجبور کرنے کے لئے نہیں ہے۔ ورنہ جزیہ لے کر کفار کو اپنی ذمہ داری میں رکھنے اور ان کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کرنے کے اسلامی احکام کیسے جاری ہوتے۔ بلکہ جہاد دفع فساد کے لئے ہے، کیونکہ فساد اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ جس کے درپے کافر رہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا وَاللّٰهُ لَايُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ۔ یہ لوگ زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کے ذریعے سے ان لوگوں کے فساد کو دور کرنے کا حکم دیا ہے، پس ان لوگوں کا قتل ایسا ہی ہے جیسے سانپ، بچھو اور دیگر موذی جانوروں کا قتل۔

اسلام نے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور اپاہج وغیرہ کے قتل کو عین میدان جہاد میں بھی سختی سے روکا ہے، کیونکہ وہ فساد کرنے پر قادر نہیں ہوتے، ایسے ہی ان لوگوں کے بھی قتل کرنے کو روکا ہے جو جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے قانون کے پابند ہو گئے ہوں۔

اسلام کے اس طرز عمل سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ جہاد اور قتال سے لوگوں کو ایمان قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ وہ اس سے دنیا میں ظلم وستم کو مٹا کر عدل وانصاف اور امن وامان قائم رکھنا چاہتا ہے، حضرت عمرؓ نے ایک نصرانی بڑھیا کو اسلام کی دعوت دی تو اس کے جواب میں اس نے کہا۔ "اَنَا عُجُوْزٌ كَبِيْرَةٌ وَالْمَوْتُ اِلَيَّ قَرِيْبٌ"، یعنی میں ایک قریب المرگ بڑھیا ہوں، آخری وقت میں اپنا مذہب کیوں چھوڑوں؟ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اس کو ایمان پر مجبور نہیں کیا، بلکہ یہی آیت تلاوت فرمائی "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" یعنی دین میں زبردستی نہیں ہے۔

درحقیقت ایمان کے قبول پر جبر واکراہ ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ ایمان کا تعلق ظاہری اعضاء سے نہیں ہے۔ بلکہ قلب کے ساتھ ہے، اور جبر واکراہ کا تعلق صرف ظاہری اعضاء سے ہوتا ہے، اور جہاد وقتال سے صرف ظاہری اعضاء ہی متاثر ہو سکتے

ہیں، لہذا اس کے ذریعہ سے ایمان کے قبول کرنے پر جبر ممکن ہی نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ آیات جہاد وقتال آیت ''لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ'' کے معارض نہیں ہیں۔ (تفسیر مظہری، تفسیر قرطبی)

اسلام کی شہرت کے اسباب

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

دین اسلام کی شہرت خواہشات نفسانی شہوات جسمانی مثلاً گوشت چربی' متعہ' جماع کنیزوں کے ساتھ' اور دارالحرب میں اور دارالبغی میں زنا اور اس طرح کی دوسری مثالوں کی وجہ سے ہے پس ہندوؤں کا دین اسی وجہ سے نہیں پھیلا کیونکہ یہ تمام مسائل ہندو مذہب میں منع ہیں۔

جواب: لالہ صاحب نے حیا کے دامن کو تار تار کر دیا ہے اور یہ بے ہودہ لب سرائی کی ہے۔ اور اپنے اکابر اور اصاغر جو ہندو مذہب میں بڑی عظمت رکھتے ہیں خود گوشت کھاتے تھے جیسے رام چندر اور کرشن اور رکھشیر وں کی حکایات گوشت خوری میں مروی اور مرقوم ہیں۔

اسی طرح سے برہمن اور چھتری اور بیس اور شودر یہ چاروں قومیں بھی اس زمانے میں گوشت خور ہیں اور ہندو مذہب کے مطابق اس کو وہ خلاف اور ناجائز نہیں کہتیں حتی کہ خنزیر کے گوشت کو بھی حلال کہتے ہیں۔ منشی کنہیالال الکھداری جو بیدوں کا اور کرشن گیتا کا اور جوگ بشسٹ وغیرہ کا مترجم ہے اپنے مذہب کی حمایت میں کمال عرق ریزی کرتے ہوئے کرشن گیتا کا ترجمہ کرتے ہوئے صفحہ ۱۶۱ پر صاف لکھا ہے۔ کہ

> گوشت اور شراب کو کرشن نے بھی استعمال کیا ہے اور اس کے کھانے کو کسی شاستر نے منع نہیں کیا۔ انتہی

اور اکثر زمانوں میں خصوصاً اسمید جگ (کے زمانہ میں) جو تمام جگ (یعنی زمانوں) میں افضل ترین ہے جانوروں کو ذبح کرتے تھے اور کھاتے تھے بلکہ بغیر اس کے وہ جگ (زمانہ) تمام نہیں ہوا تھا۔

معترض صاحب اگر غور کرتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ شہوت پرستی اور فسق و فجور کے تمام اسباب کی اصل شراب ہے' اور یہ ہمارے مذہب اسلام میں تمام خباثتوں کی جڑ ہے اور ہندو مذہب میں حلال ہے اوتار اور رکھشیر اس کو پیتے تھے پس ہندوؤں کے دین کا اس تن پروری اور شہوت پرستی کے باوجود نہ پھیلنا ان کے مذہب کے بطلان کی دلیل ہے۔

بیس برن لالہ اندرمن ہندو کے نکاحوں کی تفصیل:

معترض نے شہوت پرستی کے اسباب میں متعہ کے نکاح کو شمار کیا ہے لیکن یہ ایسی بات ہے کہ اگر معترض اپنے مذہب میں نکاح کی اقسام کو بالاستیعاب یاد رکھتا تو اس کو شرمندگی سے سرنیچا نہ کرنا پڑتا۔ قطع نظر اس کے کہ نکاح متعہ ہمارے مذہب میں جائز نہیں ہے اگر معترض غور کرتا تو اس کے مذہب کے نکاحوں کی اقسام کے مقابلے میں نکاح متعہ ہزار درجہ پھر بھی بہتر ہوتا۔ معترض کے مذہب میں درج ذیل نکاح درست ہیں۔

۱۔ نکاح کندھرپ ۲۔ نکاح راکشن

۳۔ نکاح پیشاچ

یہ شاستر کی رو سے عموماً خصوصاً جائز ہیں۔

اور ان کی تفصیل یہ ہے۔

نکاح کندھرپ یہ ہے کہ لوگوں کو بتائے بغیر مرد اور عورت کو جو دوستی کا جوش ہوتا ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعلق قائم کرتے ہیں۔

اور نکاح راکشن یہ ہے کہ اگر کسی کی بیٹی ظلم اور زور آوری کی وجہ سے کسی گھر میں چلی جائے اور وہاں اپنے ساتھ صحبت کی خواہش کرے۔

اور نکاح پیشاچ یہ ہے کہ کوئی عورت سورہی ہو دوسرا مستی اور بے خبری میں اس کے ساتھ صحبت کرے۔

پہلی قسم زنا بالرضا ہے اگر پردہ فاش ہو تو نکاح کا نام دے دیں ورنہ جانبین کی دلی مراد حاصل ہو۔

دوسری قسم زنا بالجبر ہے۔

اور تیسری قسم بھی صریح زنا ہے۔

اور ان سب سے بدترین عمل نیوگ ہے کہ شاستر میں اس کے جواز کا حکم صریح طور پر نافذ ہے۔

نیوگ کیا ہے؟ وہ عورت جو کسی کی منکوحہ ہو اور اولاد کے حاصل کرنے کے لئے کسی اور کے ساتھ ہمبستر ہو چنانچہ راجہ پانڈ اور راجہ دھربدر کی ماؤں نے اسی عمل سے اپنے بچے جنے تھے۔

غور فرمائیں عقل اس کو کیسے پسند کرسکتی ہے کہ ایک عورت دومردوں کا بستر بنے۔

پس وہ مذہب جس میں اس قسم کی شہوت پرستی اور نفس پروری جائز اور موجود ہو پھر بھی وہ روز بروز تنزلی کی طرف جارہا ہے اور تمام اقسام شہوت پرستی اور نفس پروری کے باوجود ترقی کی طرف نہیں جارہا۔

بیں برن لالہ اندرمن ہندو میں نکاح متعہ:

کوئی عقل مند یہ شک نہ کرے کہ نکاح متعہ ہندوؤں کے دین میں ممنوع ہے یہ سراسر غلط بیانی اور تلبیس ہے مہابھارت پرب میں واضح ہے:

کہ دختر راجہ حجات نے راجہ ہرجس اور راجہ دیوداس اور راجہ بنارس اور راجہ بھوج

اور بسوامیتر کے ساتھ بعوض دودوسو گھوڑوں کے مدتوں تک راجہ حجات کی رضامندی سے متعہ کیا تھا اور یہ نکاح کھور برہمن کی دلالی سے منعقد ہوا تھا اور یہ سب راجے اور بسوامتر ہندوؤں کے اکابر اور عمائد میں سے ہیں۔

یہ اعتراض کہ کنیزوں کے ساتھ جماع اسباب شہوانیت نفسانی میں سے ہے عین حماقت ہے اور کوتاہ اندیشی ہے کیونکہ جو کنیز کسی کی مملوک ہے تو مالک کو اس میں تصرف کرنا شریعت کی رعایت کے ساتھ عقلاً مذموم اور معیوب نہیں ہے۔

ہندو مذہب میں کنیزوں سے جماع کا ثبوت:

اور یہ خصوصیت اسلام کے دین میں نہیں بلکہ ہندوؤں میں بھی جائز ہے۔ مہا بھارت میں ہے کہ دریا بند جو در ارلبطن کنیز کے پیٹ سے پیدا شدہ تھا یہ کنیز راجہ پچھتر کے تصرف میں تھی۔ (سوط اللہ الجبار ص ۲۳۲۔۲۳۳)

اعمال آخرت میں رغبت کیوں نہیں ہوتی

اعتراض: (ماڈرن لوگوں کا اعتراض)

اعمال آخرت میں رغبت کیوں نہیں ہوتی؟

جواب: اعمال میں کوتاہی اور بے رغبتی کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اعمال میں اور ان کی جزاء میں کچھ تعلق نہیں سمجھتے۔ یوں سمجھتے ہیں کہ ان اعمال پر جو جزائیں ملتی ہیں۔ ان میں اور اعمال میں باہم کوئی تعلق نہیں ایسا تعلق نہیں سمجھتے جیسے اس دنیا کے اسباب اور مسببات میں ہے۔ مثلاً سہارنپور سے ریل میں سوار ہو کر نینی تال چلے تو اس لین میں نینی تال میں یہ تعلق ہے کہ پہلے بریلی پہنچے۔ پھر بریلی سے چل کر کاٹھ گودام کا اسٹیشن ملتا ہے۔ وہاں کچھ دیر کے بعد اور سواری ملتی ہے بہر حال نینی تال اور ان اسباب میں ایک قوی تعلق ہے تو معلوم ہوا کہ اس تعلق کی وجہ سے کشش ہوتی ہے اور یہاں تعلق ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور سمجھ میں اس لئے نہیں آتا کہ نظر نہیں آتا۔ اس

لئے دل کی کشش ابھرتی نہیں۔ طبیعت جیسی مقصود کیلئے ابھرنی چاہیے۔ بعنوان دیگر۔ میری مراد یہ ہے کہ اس مقصود کے لئے طبیعت اسی واسطے نہیں سمجھتے کہ اسباب میں اور مقصود میں یعنی اعمال اور جزاؤں میں کچھ تعلق نہیں سمجھتے۔ ورنہ اگر تعلق سمجھتے تو چونکہ اسباب اختیاری ہیں۔ اس لئے اس حیثیت سے مقصود کو بھی اختیاری سمجھتے۔ جب اختیاری نہیں سمجھتے۔ تو طبیعت ابھرتی بھی نہیں۔ کیونکہ طبیعت اسی کام میں ابھرتی ہے جس کو انسان اپنے اختیار میں سمجھتا ہے۔ چنانچہ یہی بات ہے کہ عام آدمی کو کبھی سلطنت کی ہوس بھی نہیں ہوتی۔ اس کو کبھی اس کا وسوسہ بھی نہیں آتا کہ میں بادشاہ ہو جاؤں۔ وہ کبھی اس پر غور ہی نہیں کرتا کہ کسی ترکیب سے سلطنت حاصل کرو۔ بادشاہ بنو۔ محل میں رہو۔ مثلاً ایک رئیس سے سنا کہ بادشاہ یوں محلوں میں رہا کرتے ہیں۔ یوں ان کے ساز و سامان ہوتے ہیں یوں حشم و خدم ہوتے ہیں۔ خیر ان عجائب امور کو سن کر چاہے اس کا جی خوش ہونے لگے۔ لیکن یہ ہرگز نہ ہوگا کہ اس کی طبیعت میں گدگدی اور دھڑ دھڑی پیدا ہو کہ کسی ترکیب سے سلطنت حاصل کرنی چاہیئے۔ لاؤ سلطنت حاصل کرنے کا طریقہ معلوم کریں۔ یہ بھی سمجھتا ہے کہ اگر کسی سے پوچھوں گا بھی تو وہ ڈانٹ دے گا کہ بھئی تو پاگل ہو گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ جوتیاں کھائے گا۔ سبحان اللہ! رہیں جھونپڑوں میں خواب دیکھیں محلوں کا۔ غرض بادشاہوں کے قصے سن کر وہ سلطنت حاصل کرنے کے طریق معلوم نہ کرے گا۔ اور اگر معلوم بھی کر لے تو کیا ہے۔ وہ اتنے بعید ہیں کہ بیچارہ کا طائرہ وہم بھی وہاں نہیں۔

(نفی الحرج وعظ حضرت تھانوی صفحہ ۱۸)

دیندار لوگ مصائب میں کیوں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں؟

اعتراض: (عام لوگوں کا اعتراض)

اگر آپ کہیں کہ ہم تو کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ فرمانبرداروں کے زیادہ کام

اٹکتے ہیں، کوئی تنگ دست ہے، کوئی بیمار ہے، غرض فرمانبرداروں پر زیادہ مصائب آتے ہیں۔ نافرمان بلکہ غیر مسلم زیادہ عیش و آرام میں ہیں؟

جواب: یہ ہے کہ کامیابی کی ایک تو صورت ہوتی ہے۔ اور ایک اس کی حقیقت وروح ہوتی ہے۔ مال اور صحت اور جاہ کامیابی کی صورت ہے اور حقیقت اور روح اس کی راحت و جمعیت قلب ہے۔ مال وجاہ اور صحت سب سے مقصود اطمینان اور راحت ہے، اگر سب کچھ ہو، لیکن دل پریشان ہو، تو اس کو اہل دنیا بھی کامیابی شمار نہیں کرتے۔ چنانچہ اگر ایک شخص کے یہاں مال و دولت حشمت و شوکت سب کچھ ہو، اور اس کو پھانسی کا حکم ہو جائے، اور اس کے مقابلے میں ایک شخص فرض کیا جائے کہ جس کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ اور مزدوری کر کے اطمینان کے ساتھ اپنا پیٹ پالتا ہے۔ اس سے اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص کی دولت تم کو ملے گی۔ اگر بجائے اس کے تم پھانسی پر چڑھ جاؤ۔ اور یہ اقرار کرلو کہ قاتل میں ہوں۔ وہ ہرگز منظور نہ کرے گا۔ اور کہے گا کہ میں دولت کو لے کر کیا چولہے میں ڈالوں گا۔ جب میری جان ہی نہ ہوگی، تو ایسی دولت کو کیا کروں گا اور اس دولتمند سے اگر پوچھا جائے، کہ تم کو خلاصی ہو جائے گی، مگر اس شرط پر کہ اس کا فقر و فاقہ تم کو ملے گا۔ تو وہ خوشی سے راضی ہو جائے گا۔

معلوم ہوا کہ کامیابی کی حقیقت مال وجاہ اور صحت نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت اس کی اطمینان اور راحت قلب ہے۔ پس ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ اگر اہل اللہ پر فقر و فاقہ اور مصائب خواہ کسی قدر ہوں۔ ان کا دل پریشان نہیں ہوتا۔ اور نافرمان کو کتنی ہی عیش وعشرت ہو۔ لیکن اس کا دل ہمیشہ پریشان ہے۔ خاص کر مسلمان کو تو نافرمانی میں آرام ملتا ہی نہیں۔ کیونکہ اس کو وہاں نقصان کا بھی کھٹکا لگا ہے۔ تو اس کا گناہ تو اور بھی بے لذت ہے۔ اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ فرمانبرداری سے روح کو عیش میسر ہوتی ہے ظاہری ناداری اور تنگ دستی اس کو پریشان نہیں کرتی کیمیا گر اگرچہ مفلس ہو۔ لیکن وہ ہر وقت خوش ہے کہ جب چاہوں گا سونا بنالوں گا۔ اس لئے بڑے بڑے والیان

ملک اور حکام وقت اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ پس جب وہ کیمیا جو تانبے کو سونا بنادیتی ہے یہ اثر رکھتی ہے۔ تو حقیقی کیمیا یعنی حق تعالیٰ کی محبت اور اطاعت میں کیا یہ اثر نہ ہوگا۔ پس یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ شریعت پر عمل کرنے سے کامیابی نہیں ہوتی اور یہ ثابت ہوگیا کہ حقیقی کامیابی اتباع شریعت میں ہی منحصر ہے۔

(شرط الایمان حضرت تھانوی ص ۲۲۴)

اعتراض:

مصیبت اگر گناہوں کی وجہ سے آتی ہے تو کفار پر آنی چاہیئے۔ حالانکہ مسلمانوں پر زیادہ مصائب آتے ہیں۔

جواب: مصیبت آنے کا سبب جیسا کہ گناہ ہے اسی طرح بلندی درجات بھی اس کا سبب ہے بعض دفعہ امتحان اور آزمائش کے لئے اور درجات بلند کرنے کے لئے بھی بلائیں نازل ہوتیں ہیں۔

سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ۔

ترجمہ: کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ جنت میں ویسے ہی داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک تم کو وہ حالت پیش نہیں آئی جو پہلے لوگوں کو پیش آچکی ہے کہ ان کو لڑائی اور تکلیف پہنچی اور وہ یہاں تک جھڑ جھڑا گئے۔ کہ رسول اور ان کے ساتھ والے مسلمان کہنے لگے۔ کہ دیکھئے اللہ کی مدد کب آتی ہے۔ سن لو اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔

ایک جگہ فرماتے ہیں:

حَتّٰۤى اِذَا اسۡتَيۡـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ قَدۡ كُذِبُوۡا جَآءَهُمۡ

نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاءُ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ.

ترجمہ: یہاں تک کہ جب رسول ناامید ہو گئے اور کفار نے گمان کیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا۔ اس وقت ہماری مدد آئی۔ سو جس کو ہم نے چاہا ان کو نجات دی گئی (اور باقی لوگ ہلاک کئے گئے) اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ٹل نہیں سکتا۔

ان آیتوں سے حاصل مشترک اتنا ثابت ہوا کہ پہلے زمانہ میں حضرات مقبولین پر اور ان سے بڑھ کر رسولوں کا طبقہ ہے جن میں گناہ کا احتمال ہی نہیں۔ ان پر ایسے ایسے مصائب آئے کہ رسول گھبرا کر کہنے لگے۔ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ کہ خدا کی مدد کب آئے گی۔ حَتّٰی اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ اَیْ مِنْ اِیْمَانِ قَوْمِهِمْ یہاں تک کہ جب رسول اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو گئے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی یہ حالت نہ تھی کہ ایک وعظ کہہ کر جو دیکھا کہ لوگ جنید بغدادی نہیں ہوئے تو ان کی اصلاح سے ناامید ہو جائیں بلکہ حالت یہ تھی کہ ایک مدت مدید تک وعظ کہہ کر بھی ناامید نہ ہوتے تھے۔ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو نصیحت کی اور ناامید نہ ہوئے۔ جب اتنی مدت میں بھی ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ تب ان کے ایمان سے مایوس ہوئے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کتنی مدت دراز تک اپنی قوم سے مایوس نہ ہوئے تھے تو اتنی طویل مدت کے بعد نصرت خداوندی نازل ہوتی تھی۔ اور اس وقت تک انبیاء اور مومنین مصیبتیں ہی جھیلتے تھے۔

یاد رکھو خدا تعالیٰ پر کبھی کسی کو بدگمانی کا حق نہیں۔ اس کی حکمتوں کے راز کسی کو کیا معلوم۔ آپ اپنے خانگی معاملات کے راز اپنے نوکروں کو نہیں بتلاتے حالانکہ آپ میں اور ان میں بہت قرب ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی اپنا بھید آپ نوکروں کو نہیں بتلاتے تو خدا کیوں آپ کو اپنے معاملات کے راز بتلائے۔ آپ میں اور خدا میں تو کچھ بھی مناسبت نہیں

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

بہرحال حق تعالیٰ کی حکمتیں ہیں جن کی وجہ سے مقبولین پر بھی وہ مصائب نازل کرتے ہیں ؎

جان صدیقاں ازیں حسرت بریخت
کا سماں برفرق ایشاں خاک بیخت

زاں بلاہا کانبیاء برداشتند
سر بچرخ ہفتمیں افراشتند

یہ گویا بلندی درجات ہے۔ان بلاؤں سے مقبولین کے درجے بلند ہوتے ہیں۔ نیز اس میں مجاہدہ اضطراریہ بھی ہے۔ کہ مصائب سے اخلاق درست ہوجاتے ہیں۔ نفس کی اصلاح بہت کچھ ہو جاتی ہے۔ جب ہم لوگوں کو اپنے نفس کی اصلاح اور درستی اخلاق کی خود فکر نہیں ہوتی تو حق تعالیٰ مجاہدہ اضطراریہ سے ہماری اصلاح فرماتے ہیں۔ مگر آپ کو کیا معلوم ہے کہ اس سے جو لوگوں کے نفس کی اصلاح ہوئی ہوگی وہ کتنی فتوحات کا پیش خیمہ ہوگی۔ یہی حال طاعون میں سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں میں طاعون کا زیادہ پھیلنا اس کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ معاذ اللہ مسلمان خدا تعالیٰ کے نزدیک ان کافروں سے بھی زیادہ ذلیل ہیں ہرگز نہیں بلکہ کبھی مسلمانوں کے درجے بلند کرنے اور ان کو شہادت کے مرتبے دینے منظور ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں طاعون زیادہ پھیلتا ہے۔ حدیث میں صاف تصریح ہے کہ **المطعون شھید** یعنی طاعون میں مرنے والا شہید ہے۔ اسی لئے جو لوگ اس راز کو سمجھتے ہیں۔ وہ ہر بلا سے خوش ہوتے ہیں۔ نہ وہ شکست و ہزیمت سے گھبراتے ہیں۔ نہ طاعون سے پریشان ہوتے ہیں اور یوں کہتے ہیں۔

ناخوش تو خوش بود برجانِ من
دل فدائے یار دل رنجانِ من

اور دوسروں کو بھی اسی کی وصیت کرتے ہیں کہ محبوب حقیقی سے راحت میں اور رنج میں غرض ہر حال میں خوش رہنا چاہیے۔

مسلمان توبہ کی بنیاد پر بڑے بڑے گناہ کرتے ہیں

اعتراض: (کفار کا اعتراض)

مسلمان کبیرہ گناہ اس لئے زیادہ کرتے ہیں کہ ان کے عقیدہ میں کبائر معاف ہو سکتے ہیں:۔

جواب (۱): اقدام جرائم اگر اس عقیدہ کا نتیجہ ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جن لوگوں کو اسلام سے زیادہ تعلق ہے مثلاً علماء واتقیاء وصوفیہ ان میں یہ نتیجہ زیادہ ظاہر ہوتا۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ مذہب کے ثمرات کا ظہور ان ہی لوگوں میں زیادہ ہوتا ہے جن کو مذہب سے تعلق زیادہ ہے حالانکہ ہم دیکھتے ہیں اور کفار بھی اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو اسلام سے تعلق زیادہ ہے وہ جرائم کا ارتکاب تو کیا کرتے وہ تو شبہات سے بھی بچتے ہیں۔

حکایت:

چنانچہ ہمارے ایک دوست کا جو کہ بی۔ اے ہیں۔ واقعہ ہے کہ وہ ایک بار ریل کا سفر کر رہے تھے ان کے پاس سامان ۱۵ کلو سے زیادہ تھا۔ اسٹیشن پر تنگی وقت کی وجہ سے وہ اس کا وزن نہ کرا سکے اس وقت تو جلدی میں سوار ہو گئے لیکن جب منزل مقصود پر اترے تو وہاں کے بابو سے جا کر اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں جلدی میں سامان کو وزن نہ کرا سکا اب آپ اس کو وزن کر لیں اور جو محصول میرے ذمہ ہو اس کو وصول کر لیں بابو نے انکار کیا کہ مجھ کو فرصت نہیں تم ویسے ہی لے جاؤ ہم تم سے محصول نہیں لیتے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب آپ کو معافی کا کوئی حق نہیں کیونکہ آپ ریلوے کے مالک نہیں بلکہ ملازم ہیں۔ آپ کو محصول مجھ سے لینا چاہیے مگر اس نے پھر بھی انکار کیا تو یہ اسٹیشن

ماسٹر کے پاس گئے اس نے بھی کہا کہ آپ بلا تکلف سامان لے جائیں ہم آپ سے محصول نہیں لیتے انہوں نے اس سے بھی کہا کہ آپ کو معافی کا کوئی حق نہیں اس کے بعد اسٹیشن ماسٹر اور ان بابو میں انگریزی میں گفتگو ہونے لگی وہ یہ سمجھے کہ یہ مسافر انگریزی نہیں سمجھتا ہوگا (کیونکہ ان کی صورت ملانوں جیسی تھی) غرض ان دونوں نے اس گفتگو میں یہ رائے قرار دی کہ یہ شراب پیے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود ہمارے انکار کے یہ محصول دینے پر اصرار کرتا ہے انہوں نے جواب دیا کہ صاحب میں نے شراب نہیں پی بلکہ ہمارا مذہبی حکم ہے کہ کسی کا حق اپنے ذمہ نہ رکھو اس پر وہ دونوں بولے کہ صاحب ہم تو اس وقت سامان وزن نہیں کر سکتے۔ آخر یہ سامان اٹھا کر پلیٹ فارم سے باہر لائے۔ اور سوچنے لگے کہ یا اللہ تعالیٰ اب میں ریلوے کے اس حق سے کس طرح سبکدوشی حاصل کروں۔ آخر خدا نے امداد کی اور یہ بات دل میں ڈالی کہ جتنا سامان زیادہ ہے اس کے محصول کے برابر ایک ٹکٹ اسی ریل کا کسی اسٹیشن کا لے کر چاک کر دیا جائے اس طرح ریلوے کا حق اس کو پہنچ جائے گا، چنانچہ ایسا ہی کیا۔

جواب (۲): اور اس کا جواب عقلی یہ ہے کہ یہ عقیدہ عقلاً اقدام جرائم کا سبب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس کو چاہیں گے باوجود کبائر کے عذاب سے معاف کر دیں گے جس میں تعیین کسی کی نہیں ہے یعنی کسی شخص کو معلوم نہیں ہے کہ میرے متعلق منشائے الٰہی بصورت عفو ہے یا بصورتِ عذاب؟ پھر اس صورت میں کوئی بھی شخص عذاب سے بے فکر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہر ایک کو یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ شاید میرے ساتھ قانونی برتاؤ کیا جائے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک نامرد شخص شرم وندامت کی وجہ سے خودکشی پر آمادہ ہو کر سنکھیا استعمال کرے اور اتفاقاً وہ سنکھیا کھا کر ہلاک نہ ہو بلکہ سنکھیا ہضم ہو کر اس کے اندر قوتِ مردی پیدا کر دے چنانچہ بعض جگہ ایسے واقعات ہوئے ہیں۔ مگر کیا اس اتفاقی واقعہ سے کسی کو سنکھیا کھانے پر جرأت ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ زہر کا خاصہ تو

ہلاک کرنا تھا۔ مگر اتفاقاً اس شخص میں اس کی خاصیت کا ظہور نہ ہوا۔ تو اس سے یہ خاصیت نہیں بدل گئی۔ اس لئے مردانگی بڑھانے کیلئے سنکھیا کھانے کی کوئی نہ اجازت دے سکتا ہے اور نہ ہر شخص اس پر جرأت کر سکتا ہے۔ علیٰ ہذا سب کو معلوم ہے کہ بعض دفعہ حکام و سلاطین مراحم خسروانہ سے کسی قاتل کو رہا بھی کر دیتے ہیں مگر اس کے باوجود ہر شخص کو قتل پر جرأت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ قتل کی اصل سزا تو قتل ہی ہے اور عمل بھی اکثر اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے اور مراحم خسروانہ کوئی قانون نہیں۔ بلکہ محض حاکم کی مشیت پر ہے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کس کے ساتھ مراحم خسروانہ کا برتاؤ کرے، کس کے ساتھ نہ کرے۔ لہذا مراحم خسروانہ کے بھروسہ پر اقدام جرائم کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ بعینہٖ اسی طرح کبائر کا بدون عذاب کے معاف ہو جانا بطور مراحم خسروانہ کے ہے، پس اس مسئلہ کو اقدام جرائم کا سبب کیونکر سمجھ لیا گیا۔

بھلا اگر کوئی شخص جنگل میں پاخانہ کرنے جائے اور استنجے کیلئے ڈھیلا توڑتے ہوئے اس کو زمین سے سونے کا گھڑا مل جائے تو کیا اس اتفاقی بات پر بھروسہ کر کے کوئی شخص بھی تجارت زراعت سے مستغنی ہو کر بیٹھ سکتا ہے کہ مجھ کو بھی اسی طرح پاخانہ کرتے ہوئے سونے کا گھڑا مل جائے گا؟ ہرگز نہیں، اسی طرح اتفاقاً کسی مرتکب کبائر کا بغیر عذاب کے بخش دیا جانا اتفاقی ہے اس لئے یہ اقدام جرائم کا سبب ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مگر پھر بھی جو لوگ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اپنی طبیعت کے خبث سے ایسا کرتے ہیں اس عقیدے کو اس میں کیا دخل ہے؟

جواب (۲): پھر یہ جو بعض گنہگاروں کی مغفرت بغیر عذاب کے ہو جاتی ہے اس کی وجہ یہ بھی معلوم ہے کہ یہ مغفرت کیونکر ہو گی؟ یہ بھی کسی عمل صالح ہی کی وجہ سے ہو گی۔

ابو داؤد شریف کی ایک حدیث شریف سے ابھی یہ مسئلہ معلوم ہوا ہے۔ وہ حدیث شریف یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی مقدمہ میں حضور ﷺ کے سامنے جھوٹی قسم

کھائی اور اس طرح کہا۔ اشھد باللہ الذی لا الٰہ الا ھو مافعلت ذلک. قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ فقال رسول اللہ ﷺ بلٰی قد فعلت (لکن غفر اللہ لک باخلاص قول لا الٰہ الا ھو ابو داود حدیث نمبر ۳۲۷۵) حضور ﷺ نے فرمایا کہ تو نے یہ کام ضرور کیا ہے (اور تیری قسم جھوٹی ہے جس کا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے) لیکن حق تعالیٰ نے تجھے اس اخلاص سے ایمان لاتے ہوئے لا الٰہ الا اللہ کہا تھا۔ نہ معلوم اس وقت کس دل سے اس نے خدا کا نام لیا تھا جو اس درجہ مقبول ہو گیا تھا۔

(محاسن اسلام حضرت تھانویؒ ص ۱۵)

مسلمانوں کے جنتی ہونے کا ثبوت

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

مسلمانوں کے جنتی ہونے کا اور دیگر لوگوں کا دوزخ میں جانے کا کیا ثبوت ہے؟

جواب: مسلمانوں کے جنتی ہونے کا وہی ثبوت ہے جو آپ کے اس فقرہ کا ثبوت ہے کہ "جو کوئی پوچھے کہ تمہارا اعتقاد کیا ہے تو یہی جواب دینا چاہیے کہ ہمارا اعتقاد وید ہے (ستیارتھ ص ۲۷۲ سملاس ۷ نمبر ۸۱) اور سنیئے! ایک بڑا بھاری ثبوت مسلمانوں کے جنت میں جانے کا یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہب پر کوئی اعتراض نہیں آتا۔

دل پر مہر کرنے کا جواب

ترجمہ آیت: "ان کے دلوں میں بیماری ہے اللہ نے ان کی بیماری بڑھا دی" (آیت ۱۰)

اعتراض: (پنڈت سرسوتی کا اعتراض)

کسی کے دل پر مہر لگانا کسی کی بیماری بڑھانا خدا کا کام نہیں ہو سکتا کیونکہ بیماری کا بڑھنا اپنے گناہوں کا نتیجہ ہے۔

جواب: خدا کسی کے دل پر ناحق مہر نہیں لگاتا سنیئے اس کلام کے وہی معنی ہیں جو آپ ستیارتھ پر کاش صفحہ ۵۴۱ پر بودھوں کی بے دینی اور گمراہی کے بارے میں لکھ چکے ہیں۔

انہوں نے کس درجہ اپنی ادویا (جہالت) کی ترقی کی ہے۔ جس کی نظیر سوائے اُن کے دوسری ہو نہیں سکتی۔ یقین تو یہی ہے کہ وید اور ایشور سے مخالفت کرنے کا ان کو بھی یہ نتیجہ ملا ہے۔ (سملاس ۱۲ نمبر ۲۷)

اور جس کو یجر وید ادھائے ۲۵ منتر ۱۳ میں یوں ادا کیا ہے

جو پر میشور علم وغیرہ عطا کرنے والا اور جس کے ظل حمایت و پناہ و عنایت سے محروم ہونا ہی موت یعنی متواتر جینے مرنے کے چکر میں پڑنا ہے۔

قرآن نے تو اپنی تفسیر دوسری آیت میں خود کردی ہے سنئے!

كَذَالِكَ يَطْبَعُ اللهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّار.

ترجمہ ''خدا متکبروں گردن کشوں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔''

بلکہ اسی آیت میں ایک لفظ ایسا بھی ہے جس کو آپ غور سے دیکھتے تو گو آپ کو اعتراض کرنے کا شوق ہے تاہم یہ شوق کسی اور جگہ پورا کرتے۔

سنئے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ.

جس کا ترجمہ آپ نے نقل کیا ہے اس میں سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ صلہ سے بدل ہے اگر علم ہے تو سمجھو یا کسی عربی پاٹھ شالا (مدرسہ) میں پڑھو۔

پس آیت کے معنی بالکل صاف ہیں کہ خدا کے حکموں سے گردن کشی کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے

باقی جواب فقرہ ۵ میں آ گیا، سوامی جی کو زیادہ نمبر لینے کا شوق ہے اسی جواب میں شیطانی باتوں کا جواب بھی ملے گا۔

سوالی جی رگ وید اشٹک، ادھیائے ۳ ورگ ۱۸ منتر ۲ کو غور سے دیکھیئے جو اس کے ارتھ ہیں وہی اس آیت کے معنی ہیں اگر آپ کو دیکھنے کا موقع نہ ملے تو سنیئے ہم بتلائے دیتے ہیں غور سے سنیے پرمیشور کہتا ہے:

''میں بدکار ظالموں کو کبھی آشیرباد (نیک دعا) نہیں دیتا۔''

یعنی ان کو ہدایت یا برکت نہیں کرتا۔

شریعت کی ضرورت کیوں؟

اعتراض : (منکرین اسلام کا اعتراض)

شریعت کی ضرورت کیوں ہے کیا زندگی گزارنے کیلئے عقل کافی نہیں ہے؟

جواب: عالم میں جس طرف بھی نظر ڈالتے ہیں ایک عظیم اختلاف نظر آتا ہے ایک ہی فعل ہے کہ ایک شخص اس کو مستحسن اور دوسرا قبیح سمجھتا ہے اب نہ معلوم حق تعالیٰ شانہ کے نزدیک وہ حسن ہے یا قبیح اور کونسی صورت خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے اور کونسی ناپسندہ عقل اس سے بالکل قاصر ہے کہ ٹھیک ٹھیک کسی شے کا حسن وقبیح بتلا سکے اس لیے کہ ہر انسان کو صرف اپنی ہی اغراض پیش نظر ہوتی ہیں۔ دوسروں کی اغراض و مقاصد سے بے خبر ہوتا ہے اس لیے بہت ممکن ہے کہ غلبہ ہوئی اور حب غرض کی وجہ سے کسی شے کو مستحسن سمجھ کر واجب قرار دے اور خلاف غرض شے کو قبیح سمجھ کرنا جائز اور حرام بتلائے اور دوسرا شخص اپنی غرض کی وجہ سے اس کے برعکس سمجھے۔

نیز اس ظلوم وجہول انسان سے ایک ہی شے کے تمام اطراف و جوانب اور اس کے تمام حالات کا احاطہ قطعاً محال ہے اس لیے کچھ بعید نہیں کہ کوئی شے بعض حالات میں حسن ہو اور بعض حالات میں قبیح ہو اور یہ شخص ایک جانب سے بے خبر ہونے کی وجہ سے دوسری جانب کو علی الاطلاق حسن یا قبیح بتلادے نیز انسانی طبیعتیں کہ اکثر اوہام کی مطیع ہوتی ہیں۔ ان کی کسی تجویز کا وہم کی آمیزش سے بالکلیہ منزہ ہونا نہایت دشوار

ہے جس مکان میں مردہ پڑا ہوا ہو اس مکان میں انسان شب گزارنے سے گھبراتا ہے حالانکہ اس کو یقین ہے کہ مردہ کسی قسم کی حس وحرکت نہیں کر سکتا لیکن وہم ضرور ہے کہ ممکن ہے کہ اس وقت یہ مردہ حس وحرکت کرنے لگے اور اٹھ کر مجھ کو چمٹ جائے۔

علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ عقل کی مثال اس ترازو کی سی ہے کہ جس سے سونا اور جواہرات تولے جائیں۔ اگر اس ترازو سے سونے چاندی کا وزن معلوم کرنا چاہو تو صحیح وزن معلوم کر سکتے ہو لیکن اگر اس ترازو سے پہاڑوں کو تولنا چاہو تو یہ ناممکن اور محال ہے اسی طرح عقل سے اس کی دائرہ کی چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں لیکن اگر یہ چاہو کہ اس بے چاری اور کمزور عقل سے خداوند ذوالجلال کی ذات وصفات اور عالم غیب اور عالم ملکوت کی چیزوں کو معلوم کرو تو یہ امر محال ہے۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عقل بے کار ہے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ بارگاہ قدس اور عالم غیب کی چیزوں کے ادراک اور معرفت میں قاصر اور درماندہ ہے۔ اپنے محدود دائرہ کی چیزوں کے معلوم کرنے کی صحیح میزان ہے اس میں بے کار نہیں جیسے سونے چاندی تولنے کی ترازو صحیح میزان اور صحیح ترازو ہے سونے اور چاندی کا وزن ٹھیک بتلاتی ہے لیکن اس سے پہاڑوں کے وزن کا تصور کرنا حماقت ہے۔

(مقدمہ ابن خلدون ص ۲۵۰ بحث علم الکلام)

اور سائنس فقط ان امور کو بتلاتی ہے کہ جو عقل اور تجربہ سے حاصل ہو سکیں جیسے ریل گاڑی اور تار برقی۔ اس قسم کے علوم میں وحی اور الہام کی ضرورت نہیں تجربہ کافی ہے اور نبوت ان کمالات علمیہ اور عملیہ کی رہنمائی کرتی ہے کہ جہاں عقل اور حس کی رسائی نہ ہو۔

چراغ بے شک ایک روشن چیز ہے مگر آفتاب کے سامنے اس کی کیا حقیقت ہے اسی طرح عقل بے شک ایک منور اور روشن شے ہے مگر نور اور آفتاب نبوت کے سامنے اس کی کیا ہستی ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

مصطفیٰ اندر جہاں وانگہ کسے جوید زعقل

پیش مہر نور افشاں ازسہا جوید ضیا

نیز حق تعالیٰ شانہ نے ہر حس کی ایک حد مقرر فرمائی ہے کہ اس حس کا ادراک واحساس اس حد سے کسی طرح متجاوز نہیں ہوسکتا مثلاً آنکھ مبصرات کا احساس کرسکتی ہے مسموعات اور معقولات کا ادراک نہیں کرسکتی، خلاصہ یہ کہ ہر حس کا ادراک محدود اور متناہی ہے غیر محدود اور غیر متناہی نہیں۔

(روح المعانی بحوالہ امام الشافعی جلد۱۲ صفحہ۱۳۲)

اسی طرح انسان کی عقل محدود ہے اپنی حد سے زائد ادراک نہیں کرسکتی۔ معاذ اللہ اگر عقل کا ادراک غیر محدود اور غیر متناہی ہوجائے تو پھر عقل کے ادراکات اور علوم اور حق تعالیٰ شانہ کے علوم وادراکات دونوں میں کیا فرق رہے۔ معاذ اللہ دونوں برابر ہوجائیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا.

اور فرمایا:

وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖ اِلَّا بِمَا شَاءَ "

ترجمہ: اور نہیں دیئے گئے تم علم سے مگر تھوڑا۔

اور نہیں احاطہ کرسکتی وہ کسی ایک چیز کا بھی مگر جتنا وہ چاہے۔

محدود اور متناہی کا ادراک واحساس متناہی اور محدود ہی ہوسکتا ہے غیر محدود کیسے ہوسکتا ہے۔ انسان اگر سینہ سے سینہ بھی ملادے اور چیر کر دل بھی دکھلا دے تب بھی دل کی بات دوسرے کو نہیں معلوم ہوسکتی۔ پس وہ لطیف وخبیر کہ جس کے ادراک سے ابصار اور بصائر سب ہی قاصر اور عاجز ہیں اس کی رضا اور عدم رضا بغیر اس کے بتلائے ہوئے کیسے معلوم ہوسکتی ہے اور اگر بالفرض عقل سلیم سے کسی شے کے متعلق معلوم بھی

کرلیا کہ یہ شے امر خداوندی ہے یا نہی خداوندی کے لائق ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حق تعالیٰ شانہ اس کے پابند ہو جائیں۔ شان بے نیازی کے بنا پر اس کے خلاف بھی حکم صادر فرما سکتے ہیں۔

نیز ایک دو بات کا معلوم ہو جانا کچھ مفید نہیں تاوقتیکہ تفصیلی طور پر تمام امور کا علم نہ ہو اس لیے اس کے ارشاد اور حکم کا انتظار کرنا چاہیے اور یہ اس کی شان کے ہرگز مناسب نہیں کہ وہ اپنی مرضی اور غیر مرضی سے ہر کس و ناکس کو خود مطلع کرے۔ سلاطین عالم کو جب انہی اس سلطنت پر ناز ہے کہ وہ اپنے احکام ہر کس و ناکس سے نہیں کہتے پھرتے حالانکہ وہ ان کے ہم جنس اور ہم نوع ہیں بلکہ وزراء اور حکام کے ذریعہ سے اطلاع دیتے ہیں تو کیا اس احکم الحاکمین کی شان کے یہ مناسب ہو سکتا ہے کہ وہ ہر کس سے منہ لگائے۔ یقیناً وہ احکم الحاکمین بھی اپنے مقربین کے توسط سے اپنے قوانین اور احکام کی اطلاع دے گا۔ ایسے حضرات کو اہل اسلام انبیاء و رسل و پیغمبران خدا کہتے ہیں۔

اور جس طرح کہ حکام اور مقربین میں فرق مراتب ہوتا ہے اسی طرح انبیاء و رسل کے مراتب و مدراج میں بھی فرق ہوتا ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"تلک الرسل فضلنا بعضهم علی بعض منهم من کلم اللہ ورفع بعضهم درجات" (سورۃ بقرہ)

ترجمہ: ان سب رسولوں کو ہم نے فضیلت دی بعض کو بعض پر بعض سے اللہ نے کلام فرمایا کہ بعض کے درجے بلند کیے۔

اور جس طرح حکام و وزراء کا سلسلہ وزیر اعظم پر ختم ہو جاتا ہے اسی طرح انبیاء و رسل کا سلسلہ بھی خاتم النبیین پر ختم ہو جاتا ہے اور جس طرح وزارت عظمیٰ کا کوئی فیصلہ منسوخ نہیں ہو سکتا اسی طرح جب کسی حکم کا فیصلہ ختم نبوت کی بارگاہ سے صادر ہو چکا

ہے وہ تا قیامت منسوخ نہ ہو سکے گا۔

الحاصل: انبیاء علیہ السلام کے بھیجنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو اس سے آگاہ کریں کہ بعض کام ایسے ہیں جو خدا کے نزدیک پسندیدہ ہیں، اور بعض ایسے ہیں کہ ناپسندیدہ ہیں، اور بعض ایسے ہیں کہ خدا ان کے کرنے سے نہ راضی ہوتا ہے اور نہ ناراض، بندوں کو اختیار ہے چاہیں کریں یا نہ کریں، پس کسی فعل سے رضا کا تعلق ہونا یا دونوں سے بے تعلق ہونے کا نام حکم ہے۔

کیا احکام خداوندی میں نسخ خلاف عقل ہے

اعتراض: (پنڈت سرسوتی کا اعتراض)

مسلمان قائل ہیں کہ احکام خداوندی میں نسخ ہوتا ہے لیکن یہ امر بالکل خلاف عقل ہے کیونکہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ خدا نے بے سوچے آج کچھ کہہ دیا کل کو جب کوئی خرابی دیکھی تو حکم بدل دیا۔ خدا کا حکم آدمیوں کے حکم کے برابر نہیں۔ ہمیشہ اس کا ایک حکم رہتا ہے اور تغییر و تبدیل احکام کی اس کی ہاں نوبت نہیں آتی۔

جواب (۱): نسخِ احکام حسب مقتضائے عقل ہے۔

اگر حکم خداندی میں بھی تغییر و تبدیلی خلاف عقل ہے۔ تو ارادۂ خداوندی میں بھی تغیر و تبدل خلاف عقل ہے حکم کی تبدیل میں اگر یہ خرابی ہے کہ خدا کی طرف غلط فہمی کا الزام آئے گا تو ارادہ کی تغییر و تبدیل میں بھی یہی خرابی ہے۔ وہ بھی مثل حکم فہم پر موقوف ہے یعنی جیسے جب حکم دیتے ہیں جب پہلے کچھ اپنے دل میں سمجھ لیتے ہیں ایسے ہی ارادہ بھی کسی کام کا جب ہی کرتے ہیں جب اول اپنے دل میں کچھ سمجھ لیتے ہیں مگر یہ ہے تو پھر پیدا کرنے کے بعد ختم کر دینا اور جلانے کے بعد مارنا اور عطائے صحت کے بعد مریض کر دینا اور راحت کے بعد تکلیف میں ڈال دینا علیٰ ہذا القیاس اُس کا اُلٹا بھی خدا سے ممکن نہ ہو سکے کیونکہ یہ سب با ارادہ خدا ہوتے ہیں۔ سوا ایک

ارادہ کے بعد دوسرا ارادہ مخالف ارادہ اول خدا کرے تو یوں کہو پہلے بے سوچے سمجھے خدا نے ارادہ کرلیا تھا۔

جواب (۲): حکم اول کہیں بوجہ غلطی بدلا جاتا ہے اور کبھی مصلحت کے بدل جانے سے بدلا جاتا ہے، طبیب کبھی تشخیص میں غلطی کرتا ہے اور اس وجہ سے بعد اطلاعِ غلطی نسخہ اول کو بدل دیتا ہے اور کبھی مریض کے حالات بدل جانے سے مریض یا بوجہ اختتام وقت دوا اُس دوائے اول کو بدل دیتا ہے۔ اثنائے بخار میں اگر سرسام ہوجائے تو بوجہ تبدیلی احوال مریض نسخہ بدلا جاتا ہے اور بعد اختتام میعادِ منضج جو مسہل لکھا جاتا ہے تو یہ تبدیلی اختتام وقت دوائے اول ہوتی ہے مگر ان دونوں صورتوں میں تغیر و تبدیلی بوجہ اطلاعِ غلطی نہیں ہوتی۔ سو خدا کے احکام کا تبدل و تغیر بھی اسی قسم کا ہوتا ہے اُس قسم کا نہیں ہوتا مگر معترض کو ان دونوں صورتوں کی خبر نہ ہی ہو تو وہ کیا کریں معذور ہیں۔

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی طرف سے تفصیلی جواب:

اور جس طرح زمان و مکان اور حالات مریض کے مختلف ہونے سے نسخہ اور اس کی مقدار کا بدلنا خلاف عقل نہیں بلکہ عین حکمت ہے اسی طرح اختلاف امم اور زمانوں اور جگہوں کے اختلاف کی بناء پر احکام شرعیہ میں بھی تغیر و تبدل کا ہونا خلاف عقل نہیں بلکہ عین حکمت ہے بسا اوقات چند مریض ایک ہی مرض میں مبتلا ہوجاتے ہیں مگر طبیب ان کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے دواؤں کی مقدار میں فرق کر دیتا ہے مثلاً ایک بچہ اور ایک جوان اور ایک بوڑھا تینوں ایک ہی مرض کے مریض ہیں مگر طبیب دوائیں مختلف المقدار تجویز کرتا ہے۔

دین ایک ہے اور شریعتیں مختلف

الحاصل تینوں کا مرض ایک ہے اور علاج بھی ایک اور دوا بھی ایک صرف

اختلاف مزاج اور اختلاف طبیعت کی بناء پر مقدار ادواء میں فرق کردیا گیا۔

اسی طرح تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا دین ایک ہے سب ایک ہی اصل پر متفق ہیں، اختلاف زمان اور مکان اور اختلاف حالات کی وجہ سے اسی ایک دین اور ایک اصل کی صورتیں اور شکلیں اور طریقے مختلف ہوتے رہے اس لئے کہ دین کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کو وحدہ لاشریک لہ سمجھنا ذات وصفات کے اعتبار سے بے مثل اور یکتا ماننا راحت وتکلیف، عیش ونشاط، انقباض وانبساط ہر حال میں اسی کو پکارنا اسی کے سامنے سر جھکانا اس کی راہ میں جان و مال سے دریغ نہ کرنا۔ قیامت اور حشر ونشر جنت وجہنم کو حق سمجھنا، اس کے نافرمانوں پر حدود وتعزیرات کا قائم کرنا اس کے دشمنوں سے جہاد کرنا اس کے احکام اور فرامین کی نشر واشاعت میں پوری پوری کوشش کرنا یہ ہے حقیقت دین کی جس پر تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام متفق رہے ان امور میں کسی کا اختلاف نہیں ہوا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

شرع لکم من الدین ما وصی به نوحا والذی اوحینا الیک و ما وصینا به ابراهیم و موسیٰ و عیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیه. (سورۃ شوریٰ)

ترجمہ: حق تعالیٰ نے تمہارے لیے وہ دین تجویز فرمایا کہ جس کا نوح کو حکم دیا اور جس کی وحی آپ کی طرف بھیجی اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں متفرق نہ ہو)۔

اختلاف اگر ہوا تو وہ صرف امور مذکورہ کی صورتوں اور شکلوں میں ہوا جیسا کہ شریعت موسویہ میں بیت المقدس کی جانب نماز پڑھی گئی اور شریعت محمدیہ میں خانہ کعبہ کی طرف اصل نماز میں دونوں شریعتیں متفق ہیں۔ اختلاف صرف کیفیت اداء میں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں زانی کا حکم صرف رجم (سنگسار کردینا) تھا اور ہماری شریعت میں زانی محصن (شادی شدہ) کے لئے رجم اور غیر محصن (غیر شادی شدہ) کیلئے سو تازیانے (کوڑے) ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں صرف قصاص کا حکم تھا اور ہماری شریعت میں قصاص بھی ہے اور دیت بھی۔

اور انہی خاص صورتوں اور خاص خاص شکلوں کا نام شریعت اور منہاج ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَ مِنْهَاجًا. (سورۃ المائدہ)

ترجمہ: ہر ایک کیلئے ہم نے ایک شریعت اور طریقہ مقرر کیا ہے۔

چنانچہ عارف رومی قدس سرہ السامی فرماتے ہیں۔

چوں بصورت بنگری چشمت دواست

بنورش در نگر کاں یکتواست

اگر صورت کو دیکھو تو آنکھیں دو ہیں اور اگر نور کو دیکھو تو ایک ہی ہے۔

لاجرم بر یکے افتد نظر

آں یکے بینی دونا ید در بصر

چنانچہ جب کسی چیز پر نظر پڑتی ہے تو ایک ہی نظر آتی ہے دو نہیں۔

نور ہر دو چشم نتواں فرق کرد

چونکہ در نورش نظر انداخت مرد

جبکہ اس میں کوئی تامل کرے تو دونوں آنکھوں کے نور میں امتیاز اور تفریق ناممکن ہے

دہ چراغ ار حاضر آید در مکان

ہر یکے باشد بصورت غیر آں

دس چراغ اگر کسی مکان میں رکھ دیئے جائیں تو صورت ہر ایک کی مختلف ہے

فرق نتواں کرد نور ہر یکے

چوں بنورش روئے آری بے شکے

لیکن ایک چراغ کے نور کو دوسرے چراغ کے نور سے ممتاز اور علیحدہ نہیں کر سکتے

اطلب المعنی من الفرقان وقل

لانفرق بین احد من رسل

پس ان تمثیلات سے حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب سمجھو۔ لا نفرق بین احد من رسلہ۔ (مثنوی شریف دفتر اول صفحہ ۵۸)

ہمارے اس مختصر بیان سے علاوہ نبوت و رسالت کی ضرورت کے یہ مسئلہ بھی بحمد اللہ حل ہو گیا کہ احکام الٰہیہ میں نسخ و تبدیل کا جاری ہونا خلاف عقل نہیں، جیسے کسی حاذق طبیب کا کسی مریض کے لئے کبھی منضج تجویز کرنا اور کسی وقت مسہل اس کی حذاقت اور مہارت میں قابل اعتراض نہیں۔ ایسے ہی احکام الٰہیہ میں باقتضاء حکمت کسی قسم کا نسخ بھی منافی نہیں۔

اور اگر آپ کو یہ سوال ہے کہ احکام الٰہی میں تغیر اور تبدل کیوں ہے اور اس کی کیا حکمت ہے تو ہمیں آپ سے یہ سوال ہے کہ افعال الٰہی میں تغیر اور تبدل کیوں ہے اور اس کی کیا مصلحت ہے مثلاً دن کے بعد شب اور ایک موسم کے بعد دوسرا موسم اور بچپن کے بعد شباب اور شباب کے بعد بڑھاپا کے آنے میں کیا حکمت ہے غالباً آپ یہی فرمائیں گے کہ حق تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں گو ہمیں اس کی حکمت کا علم نہ ہو۔

اسی طرح ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا کوئی حکم خلاف حکمت نہیں ہو سکتا گو ہم قصور عقل کی وجہ سے اس کے اقوال و احکام کے حکم اور مصالح معلوم کرنے سے قاصر اور عاجز ہیں اور جب آپ یہ نہیں بتلا سکتے کہ اتنے ماہ موسم گرما اور اتنی مدت موسم سرما کیوں رہا موسم سرما میں رات طویل اور دن قصیر اور موسم گرما میں اس کا بالعکس کیوں ہوا۔

تو ہم سے بھی اس سوال کا کوئی حق نہیں کہ کیا وجہ ہے کہ فلاں حکم شریعت موسویہ میں مشروع رہا۔ اور پھر شریعت عیسویہ میں آکر منسوخ ہوگیا اور علی ہذا جو حکم انبیاء سابقین صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین کی شریعت میں مشروع تھا وہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ والف الف تحیۃ میں آکر کیوں بدل گیا۔

مرتد، اصلی کافر سے بدتر کیوں

اعتراض: (منکرین اسلام کا اعتراض)

مرتد کا درجہ کافر اصلی سے کیوں بڑھا ہوا ہے؟

جواب: ترک اسلام کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اول ہی سے اسلام قبول نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ بعد قبول کے ترک دے۔ دونوں صورتوں میں یہی سزا ہے بلکہ دوسری صورت میں پہلی سے سخت ہے۔ چنانچہ قوانین سلطنت میں باغی کی سزا ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جو پہلے ہی سے اس سلطنت کی رعایا نہیں ہیں بلکہ کسی مخالف سلطنت کی رعایا ہیں ایسے لوگوں پر اگر بھی غلبہ ہو جائے تو ان کو غلام بنا لیتے ہیں یا احسان کر کے رہا کر دیتے ہیں۔ یا عزت کے ساتھ نظر بند کر دیتے ہیں مگر باغی کیلئے بجز قتل یا عبور دریائے شور کے کچھ سزا نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رعایا بن کر باغی ہو جانے میں سلطنت کی زیادہ توہین ہے اسی طرح اسلام لا کر مرتد ہو جانے میں اسلام کی سخت توہین اور اس کی تعلیم کو دوسروں کی نظر میں حقیر کرنا ہے۔

دیکھئے ایک تو وہ شخص ہے جس سے آپ کی کبھی دوستی نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ سے مخالف ہے اس کی مخالفت سے آپ کا اتنا ضرر نہیں ہوتا اور اگر کبھی وہ آپ کی مذمت وہجو کرے تو لوگوں کی نظروں میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی سب کہہ دیتے ہیں کہ میاں اس کو ہمیشہ سے اس کے ساتھ عداوت ہے دشمنی میں ایسی باتیں کرتا ہے۔

اور ایک وہ شخص ہے جو سالہا سال سے آپ کا دوست رہا پھر کسی وقت مخالف

بن کیا اسکی مخالفت سے بہت ضرر پہنچتا ہے اور وہ جو کچھ برائیاں آپ کی کرتا ہے لوگ ان پر توجہ دیتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس کی منشاء محض عداوت نہیں ہے اگر دشمن ہوتا تو سالہا سال تک دوست کیوں بنتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دوستی کے بعد فلاں شخص کے اترے پترے معلوم ہو گئے ہیں اس لیے مخالف ہو گیا حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص دوستی کے بعد دشمن بنا ہو وہ اترے پترے معلوم کرنے کے بعد ہی دشمن بنا ہو۔ ممکن ہے کہ اس شخص نے دوستی بھی اس نیت سے کی ہو کہ لوگ دوستی کے زمانہ میں مجھے اس کا رازدار سمجھ لیں گے تو مخالفت کی حالت میں جو کچھ کہوں گا اس کو یہ سمجھ کر قبول کر لیں گے کہ یہ شخص رازدار رہ چکا ہے اس کو ضرور کچھ راز کی باتیں معلوم ہوئی ہیں اس لیے مخالف ہو گیا۔ چنانچہ بعض یہود نے اسلام کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ.

پس ہر چند کہ دوست کے دوست کی مخالفت میں یہ احتمال بھی ہے مگر اس لیے عقلاً وشرعاً وقانوناً وہ شخص بڑا مجرم شمار ہوتا ہے جو موافقت کے بعد مخالفت کرے اس لیے شریعت میں مرتد کیلئے دنیوی سزا بھی سخت ہے اور عذاب آخرت بھی اشد ہے۔

(محاسن اسلام صفحہ ۱۹)

اسلام میں تہتر فرقے کیوں؟

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

جبکہ ایک اللہ، ایک نبی اور ایک قرآن کے پیش نظر اسلام کی ایک ہی قوم میں ایک ہی فرقہ ہونا چاہیے تو پھر اسلام میں ۷۳ فرقے کہاں سے آ موجود ہوئے؟

جواب (۱): پادری برکت اللہ صاحب ایم۔ اے لکھتے ہیں:

"اگر چہ دور حاضرہ میں مسیحیت بیسیوں فرقوں پر مشتمل ہے۔

(اسرائیل کا نبی یا جہان کا منجی صفحہ ۱۱۵)

جبکہ مسیحی دنیا میں ایک باپ، ایک بیٹا، ایک روح القدس اور ایک عہد جدید کے پیش نظر مسیحیت کی ایک ہی قوم میں ایک ہی فرقہ ہونا چاہیے تو پھر مسیحیت میں بیسیوں فرقے کہاں سے آموجود ہوئے؟

یہودیوں کا کلمہ:۔سن اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے"۔
(استثناء ۶:۴)

مسیحیوں کا کلمہ: اے اسرائیل سن۔ خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے"
(مرقس ۱۲:۲۹)

صرف حضرت مسیح علیہ اسلام کے بعد نہیں بلکہ آپؑ کے مقدس شاگردوں کے بہت بعد۔

مسیحیوں کا کلمہ:" باپ، بیٹا اور والدہ حضرت مریم" اسے مسیحی دنیا میں تثلیت یا ثالوث کہا جاتا ہے۔

مسیحیوں کا کلمہ:۔" باپ، بیٹا اور روح القدس"۔(ایک نادیدنی روح)

اہل اسلام کا کلمہ:" لَا اِلٰہ اللہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ " (اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں)۔

گو اہل اسلام کے کئی فرقے ہیں مگر کسی فرقہ نے اس کلمہ کو نہیں بدلا بلکہ چودہ سو سال سے اس طرح ہے۔ مگر عیسائیوں نے اپنے کلمہ کو دو مرتبہ بدلا ہے۔ جبکہ مسیحی مذہب میں ایک خدا، ایک مسیح اور ایک عہد جدید ہے تو پھر عیسائیوں میں خدا تعالیٰ کی بابت یہ تین عقیدے کہاں سے آموجود ہوئے؟ (جواب مسلم)

احادیث کا اور فرقوں کا اختلاف

اعتراض: (بیں برن لالہ اندر من ہندو کا اعتراض)

احادیث ایک دوسرے کے ساتھ شدید اختلاف رکھتی ہیں اور ہر فرقہ مثلاً شیعہ سنی معتزلہ وغیرہ بھی ایک دوسرے کو جھٹلاتے ہیں۔

جواب: یہ اعتراض خود لالہ جی پر واقع ہوتا ہے کہ بسبب اختلاف چین اور بام مارگی اور بدھ اور چارپاک تمام ہندوؤں کی کتابیں اور شاستر اور پوران باطل اور بے اصل ہو جائیں گے اور کوئی اعتبار نہیں رہے گا۔ تناقض کی تفصیل بید اور مہا بھارت اور بھاگوت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (سوط اللہ الجبار ص ۲۳۱)

مسیحی فرقے

جواب نمبر (۲): حضرت مسیح کے فوراً بعد ہی ان کے پیروؤں کے درمیان عقائد اور نظریات میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا بعض اہم ترین حواری مثلاً برناباس اور پطرس الزام لگاتے تھے کہ پولیس حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کے خلاف جا رہا ہے اور ادھر پولیس ان حواریوں پر الزام لگاتا تھا کہ وہ منافق و ریاکار ہیں (گلتیون ۲:۱۱-۱۳)۔ ہر فرقہ خود کو حضرت مسیح کی صحیح تعلیمات کا علمبردار کہتا تھا اور دوسرے کو بدعتی قرار دیتا تھا، پھر ان فرقوں کے اندر مزید فرقے پیدا ہوتے چلے گئے۔ مشہور مورخ فلپ کے حتی بھی اعترف کرتا ہے کہ چوتھی یا پانچویں صدی میں مسیحیت کے متعلق جو اختلاف پیدا ہوئے ان کی وجہ سے شامی مسیحیت بھی مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔

(تاریخ شام صفحہ ۲۶۹)

عیسائیت کی تاریخ فرقوں سے بھری ہے۔ آج کے روشن دور میں صرف امریکہ میں ڈھائی سو کے قریب فرقے ہیں جبکہ افریقہ کے صرف بانتو قبائل میں ایسوسی ایٹڈ پریس جوہانسبرگ نے اپنے ۱۲ اگست ۱۹۵۷ کے اعلامیہ میں چودہ سو فرقوں کی اطلاع دی ہے۔

تمام مسیحی فرقوں کا احاطہ ممکن نہیں صرف چند مشہور فرقوں کے بارے میں

مختصراً لکھا جاتا ہے خصوصاً جو پاکستان میں بھی موجود ہیں اور تبلیغی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ان میں سے بعض فرقے اس وقت بہت زیادہ مستعد ہیں وہ چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ کلیسا میں داخل ہو کر عیسائیوں کی تعداد میں اضافہ کریں۔

امریکہ میں عیسائی فرقے

امریکہ میں موجود عیسائی فرقوں کا ایک خاکہ یہاں دیا جاتا ہے تاکہ فرقوں کی تعداد سمجھنے میں آسانی ہو۔ ہر فرقہ کی تفصیل کیلئے یہ کس طرح وجود میں آیا، اختلاف کی بنیاد کیا تھی اور کب قائم ہوا؟ فرانک ایس میڈ کی ہینڈ بک آف ڈینامی نیشن ان یو ایس اے کو دیکھا جاسکتا ہے

۱۔ ایڈوینٹسٹ	اس فرقہ کی ۱۵ شاخیں ہیں
۲۔ بپٹسٹس	اس فرقہ کی ۲۶ شاخیں ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ۱۹۶۰ء ایڈیشن میں اس کی ۲۷ شاخیں بتائی گئی ہیں۔
۳۔ بریدرین (ڈنکرس)	اس کی ۵ شاخیں ہیں۔
۴۔ ریوز بریدرین	اس کی ۱۶ شاخیں ہیں
۵۔ چرچ آف گاڈ	اس کی ۱۶ شاخیں ہیں
۶۔ کانگریگشنل کرسچین چرچز	اس کی ۵ شاخیں ہیں
۷۔ ایسٹرن آرتھوڈکس چرچ	اس کی ۲۴ شاخیں ہیں
۸۔ ایونجیلیکل ایسوسی ایشن	اس کی ۱۴ شاخیں ہیں
۱۰۔ لیٹر ڈے سینٹس یا مارمونس	اس کی ۸ شاخیں ہیں
۱۱۔ لوتھران	اس کی ۱۷ شاخیں ہیں (وانڈ نے اس کی بیس شاخیں لکھی ہیں)۔
۱۲۔ مینونائٹس	اس کی ۱۶ شاخیں ہیں۔

۱۳۔ میتھوڈسٹس	اس کی ۱۹ شاخیں ہیں۔
۱۴۔ موراوینس	اس کی ۱۵ شاخیں ہیں۔
۱۵۔ اولڈ کیتھولک چرچز	اس کی ۵ شاخیں ہیں
۱۶۔ پنیٹو کوسٹل باڈیز	اس کی ۱۰ شاخیں ہیں
۱۷۔ پریس بائی ٹیرین	اس کی ۱۲ شاخیں ہیں۔ واٹڈ نے اس کے ۱۰ فرقے لکھے ہیں۔
۱۸۔ ریفارمڈ باڈیز	اس کی ۹ شاخیں ہیں
۱۹۔ اسپر چیوالیسٹ	اس کی ۶ شاخیں ہیں
۲۰۔ یونائیٹڈ بریدرین	اس کی ۷ شاخیں ہیں۔

گویا ان بیس فرقوں کی جملہ ۲۴۸ شاخیں ہیں۔

فرقوں میں اتحاد کی کوشش:

عیسائی فرقوں میں جوں جوں اختلاف بڑھتا جا رہا تھا اور نئے نئے فرقے پیدا ہو رہے تھے بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں فرقوں کی تعداد (پادری برکت اللہ کے بیان کے مطابق) تمام عیسائی ملکوں سے زیادہ ہے۔ سلیم الطبع اور سنجیدہ عیسائی حضرات فرقوں کی اس کثرت پر دل مسوس کر کے رہ جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ کوئی معجزہ ان فرقوں کو متحد کر سکتا ہے...... بالآخر وہ معجزہ رونما ہوا اور مختلف فرقوں میں اتحاد کی راہیں کھلیں۔ اتحاد کیلئے طویل مذاکرات ہوئے۔ رپورٹوں کا تبادلہ ہوا۔ چنانچہ پاکستان میں چار پروٹسٹنٹ مختلف فرقوں کا اتحاد یکم نومبر ۱۹۷۰ء کو عمل میں آیا یعنی پروٹسٹنٹ چرچز، انجیلکین چرچ، میتھوڈسٹ چرچ، لوتھرن چرچ اور چرچ آف اسکاٹ لینڈ ایک دوسرے میں مدغم ہوئے۔ اس تقریب میں امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور افریقہ وغیرہ کے مسیحی علماء آئے تھے ان چاروں کلیساؤں کے ادغام کے بعد

اب اس کا نام چرچ آف پاکستان (کلیسائے پاکستان) ہے۔

اسی طرح ہندوستان میں انڈین کرسچین، متھوڈسٹ، کانگرنگیشنلیسٹ اور انجیلکین مدغم ہوئے۔ اتحاد نہ صرف پروٹسٹنٹوں کے درمیان ہو رہا ہے بلکہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ بھی اتحاد کی کوشش کر رہے ہیں جیسا کہ انگریزی بولنے والے کیتھولک اور پروٹسٹنٹوں کا بالآخر بائبل کے ایک ترجمہ پر اتفاق ہو گیا اس موقع پر چند مسیحی مصلحین کا ذکر بے محل نہ ہو گا جو اصلاح احوال کیلئے اُٹھے لیکن بعد میں خود ایک فرقے کے بانی بن گئے۔

مارٹن لوتھر ۱۴۸۳۔۱۵۴۶ء:

مارٹنلوتھر ایک غریب گھرانے میں ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا۔ ۱۵۰۵ء میں وہ سینٹ آگسٹائن کے راہب خانہ کا راہب بن گیا۔ اس راہب خانہ کی تعلیمات نے اس پر کافی اثر ڈالا جو پولیوسی نظریات پر زور دیتا ہے یعنی کسی انسان کی نجات اس کے اچھے کاموں پر منحصر نہیں بلکہ یسوع پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے اس کی نجات ہوتی ہے۔ مارٹن لوتھر روما بھی گیا اس نے کیتھولکوں کے اعمال و رسوم پر نظر ڈالی تو اس نے محسوس کیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے...... معافی ناموں کی فروختگی کا مسئلہ سر فہرست تھا۔ ان دنوں جان ٹیٹزل پوپ لیودھم کی جانب سے روما میں سینٹ پطرس کے گرجے کی تعمیر اور معافی نامے فروخت کرنے کیلئے ۱۵۱۷ء میں جرمنی بھی گیا۔ لوتھر طیش میں آ گیا اور اس نے پچانوے نکات کیتھولکوں کے خلاف لکھ کر گرجے کے دروازے پر لٹکا دیئے۔

لوتھر کو ۱۵۱۸ میں پوپ کے ایک نمائندے کے سامنے بلایا گیا اور ہدایت کی گئی کہ معافی ناموں کے بارے میں اپنی بعض تجاویز واپس لے لے۔ لوتھر نے انکار کر دیا اس پر اُسے دائرہ مذہب سے خارج کر دیا گیا۔

کلیساؤں کے باہمی جھگڑے:

یہ ایک فطری امر ہے کہ جب کلیساؤں نے اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے

سے الگ ہو کر اپنی انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کی تو ان کے پیروؤں میں شدید اختلاف پیدا ہوا اور ہر فریق خود کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش میں دوسرے کو غلط اور بدعتی بتانے لگا اسی طرح اختلاف، عداوت اور دشمنی میں تبدیل ہو گیا۔ مذہبی اختلافات کے علاوہ اقتدار کا بھی مسئلہ تھا جس کے حصول کے لیے عیسائی ملکوں میں خوفناک جنگیں ہوئیں۔

عیسائیوں کے آپس کے مکروہ اور گھناؤنے جھگڑوں کو ایک پادری اس طرح بیان کرتا ہے:

''گو ابتداء سے کلیسا میں تفرقہ بندی چلی آ رہی ہے۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد یگانگت پیدا ہو گئی تھی۔ اب تفرقہ بندی میں صدیاں گذر چکی ہیں۔ نفاق کی خلیج بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اوّل الذکر مشرق و مغرب (یعنی بازنطینی اور رومی) کلیسا کی تفریق ہے جو بارہویں صدی سے جاری ہے اور مؤخر الذکر وہ فرقہ بندی ہے جس نے کلیسائے روم کو انگلستان، جرمنی اور دیگر یورپی ممالک کی کلیساؤں میں بانٹ دیا ہے۔ اس تفرقہ بندی کو چار سو برس گذر چکے ہیں۔ ہر علاقہ کا کلیسا اپنے آپ کو کامل، خود مختار، ایمان کا محافظ، مسائل کا پاسدار اور خطا سے پاک سمجھتا ہے۔ ہر ایک کا دعویٰ ہے۔ ''ہم چوں ما دیگرے نیست۔''

(تاریخ کلیسائے رومۃ الکبریٰ صفحہ ۶۳ پادری خورشید عالم)

کلیساؤں کے باہمی جھگڑوں کے کچھ واقعات بالخصوص مشرقی و مغربی کلیسا کے افتراق و اختلاف کے کچھ حالات تحریر کیے جاتے ہیں جن سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان عیسائی حضرات کے پیش نظر حضرت مسیح کے پیغام امن کی زیادہ وقعت تھی یا اپنے اقتدار کی۔

چند دعوے اور ان کے جواب:

مشرقی کلیسا کے مقابلہ میں مغربی کلیسا یعنی روم والوں نے دعویٰ کیا کہ

ا۔ ہماری کلیسا تمام کلیساؤں کی ماں اور ان کی ملکہ ہے۔" یہ دعویٰ پوپ نے قسطنطنیہ کی کونسل منعقدہ ۳۸۲ء کے موقعہ پر ایک خط کے ذریعے کیا۔ لیکن آریتنس نے یروشلم کی نسبت یہ جواب دعویٰ پیش کیا کہ وہ نئے عہد نامہ کے باشندوں کا دارالسلطنت ہے یا بمنزلہ ماں کے ہے۔"

۲۔ کلیسائے روم کا دعویٰ ہے کہ وہ مقدس پطرس کی مقرر کردہ ہے۔" اس کا جواب دیا گیا کہ "اس دعویٰ کا تاریخی ثبوت نہیں کیونکہ مقدس پولوس کے شہر روما پہلی مرتبہ ۶۱ء میں جانے سے پیشتر ہی وہاں مسیحی مقیم تھے۔ اور مقدس پولیوس نے کتاب روم ۱:۱۔۱۲ میں روما جانے کی خبر دی ہے اس خط میں وہ مقدس پطرس کا کوئی ذکر نہیں کرتا لہذا ممکن نہیں کہ اس نے وہاں کسی کلیسا کی بنیاد رکھی ہو، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ پولیوس نے دورانِ قید مقدس پطرس کو وہاں آنے کی دعوت دی ہو تا کہ آکر رومی کلیسا کو منظم کرنے مین اس کی مدد کرے۔"

۳۔ کلیسائے روم کا دعویٰ ہے کہ مقدس پطرس پچیس سال تک روما کا بشپ رہا ہے، جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ دعویٰ بدعتی ناشک کی کتاب کلیمنٹائن ہومیلز اینڈ ریگگ نیشنز .Clementine Homiles and Recognitions سے ماخوذ ہے دیگر غیر مستند کتب میں بھی بیان ہے۔ مثلاً پطرس اور پولیوس کے اعمال انجیل جو پطرس کی معرفت لکھی گئی۔ مقدس یوسیبیس چوتھی صدی میں ان کتب کے متعلق رقم طراز ہے کہ ہم ان کتابوں کو قدیم کیتھولک کتب میں شامل نہیں کرتے پوپ گلیسیس ۴۹۲۔۴۹۶ء ان کو باطل فرضی تحریریں کہتا ہے۔

۴۔ کلیسائے روم کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے خداوند نے مقدس پطرس کو اپنے دیگر حواریوں پر کامل اختیار عطا فرمایا تھا۔ اور اپنی کلیسا کو کلیۃً اس کے ماتحت کر دیا تھا۔ اس

دعویٰ کے ثبوت میں وہ متی ۱۶: ۱۸۔۱۹، لوقا ۲۲: ۳۱۔۳۲ اور یوحنا ۲۲: ۱۵۔۱۷ پیش کرتے ہیں، جواب دعویٰ یہ ہے۔ ''متی ۱۸: ۱۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ باقی تمام رسولوں سے بھی کہے گئے ہیں۔ نیز یہ کہ قدیم مصنفین مذکورہ بالا دعویٰ میں اختلاف رکھتے ہیں۔

۵۔ پوپوں کا دعویٰ ہے کہ وہ الٰہی شریعت وقوانین کو منسوخ کرنے کی بھی طاقت و اختیار رکھتے ہیں۔ کلیسائے روم کے مقنوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ پوپ کو اختیار ہے کہ وہ قانون قدرت کے خلاف، پولیوس رسول کے خلاف، اور عہد نامہ جدید کے خلاف عمل کرسکتا ہے۔ اگر چاہے تو عہد نامہ، عتیق اور عہد نامہ جدید کے جملہ احکام کو بھی منسوخ کرسکتا ہے۔ ۱۵۶۷ء میں کارڈینل زابریلا نے پوپوں کو خدا سے بھی برتر بنا دیا۔''

اس دعویٰ کا کوئی جواب دعویٰ ان صفحات پر نہیں ہے (صدیقی)

دسواں باب

عبادات اسلامیہ
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کی وجہ

اعتراض: (ہندوؤں اور عیسائیوں کا اعتراض)

مسلمان نماز میں کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز کیوں پڑھتے ہیں۔

جواب: غائب کی طرف طبعاً توجہ قوی ودائی نہیں ہوسکتی۔ توجہ کامل ودائمی حاضر محسوس ہی کی طرف ہوسکتی ہے۔ غائب کی طرف تھوڑی دیر توجہ ہوتی ہے پھر غائب ہو جاتی ہے تو اس توجہ کی قوت کیلئے کوئی واسطہ ہونا چاہیے اور واسطہ بھی ایسا ہو جو انسان کے مناسب ہو یوں تو مراقبات اور اشغال بہت ہیں مگر ان میں بھی کسی محسوس کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ غائب ہی کی طرف توجہ ہوتی ہے اور انسان کی خاصیت یہ ہے کہ غائب سے یک دم اس کا تعلق قوی نہیں ہوتا۔ اب اس تعلق کے قوی کرنے کی دو صورتیں ہیں یا تو حق تعالیٰ خود سامنے ہوں۔ یہ تو دنیا میں دشوار ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ساتھ خاص تعلق رکھنے والی کوئی چیز اس کے سامنے ہو جس سے حق تعالیٰ کا خاص تعلق ہو۔ کیونکہ تعلق عام توجہ خاص کیلئے کافی نہیں۔ دیکھئے عاشق محبوب کے شہر میں جاتا ہے تو گو شہر سے بھی محبوب کو تعلق ہے مگر اتنا نہیں جتنا خاص اپنے گھر سے ہے اسی لیے شہر میں جا کر عاشق کی وہ حالت نہیں ہوتی جو خاص کر گھر کو دیکھ کر ہوتی ہے۔

غرض دلائل سے اس کی ضرورت ثابت ہوگئی کہ کوئی چیز ایسی ہونی چاہئے جس کے ذریعے حق تعالیٰ کی یاد بڑھ جائے اور اس کی طرف توجہ جم جائے شریعت نے اس کا بہت اہتمام کیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ **یا انس افعل بصرک حیث تسجد**۔ یعنی نماز میں نظر اِدھر اُدھر نہ لے جاؤ بلکہ سجدہ کی جگہ پر نظر رکھو کہ سجدہ کی جگہ پر رحمت کا نزول ہوتا ہے جیسا ابھی آتا ہے۔ اگر صاحب قرب کا مشاہدہ نہیں ہے تو کم

ازکم مقام قرب ہی کا مشاہدہ کرتے رہو۔ اس سے توجہ الی اللہ میں اعانت ہوگی، اسی طرح نماز میں فضول حرکات سے ممانعت ہے۔ سکون کا حکم ہے۔

حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

اذا قام احدکم الی الصّلوٰۃ فلایمسح الحصاۃ فان الرحمۃ تواجهه.

یعنی نماز میں کنکریوں کو نہ چھوؤ کیونکہ حق تعالیٰ کی رحمت کے سامنے ہوتی ہے۔

اسی طرح نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنے کی ممانعت فرمائی اور علت اس کی یہ ارشاد فرمائی:

لایزال اللہ عزوجل مقبلا علی العبد وهو فی صلاته مالم یلتفت فاذا التفت انصرف عنه.

جب بندہ خدا سے اعراض کر کے اِدھر اُدھر متوجہ ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ بھی بندہ سے اعراض کرتے ہیں، ان روایات میں مقام سجدہ اور جہت قبلہ کی طرف متوجہ رہنے کی کتنی تاکید ہے۔ اب خدا تعالیٰ تو نظر نہیں آتے مگر وہی موقع جو مقام عبادت ہے اس کو خدا تعالیٰ سے خاص تعلق ہے، ادھر متوجہ ہونا گویا خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی طرف توجہ بالواسطہ ہی ہوسکتی ہے غائب کی طرف توجہ بالا واسطہ قائم نہیں رہ سکتی ذرا توجہ کی اور اُچٹ گئی اس لیے وسائط کی ضرورت ہے وسائط کو جس طرح بقاء توجہ میں دخل ہے۔ حدوث توجہ میں بھی داخل ہے۔ کیونکہ ان کو حق تعالیٰ سے تعلق ہے تو ان کی طرف متوجہ ہونے سے حق تعالیٰ کی طرف توجہ پیدا بھی ہوگی اور متوجہ رہنے سے توجہ الی اللہ دائم رہے گی اور چونکہ اس واسطہ کی تجویز اور طریق استعمال اور اس کے حدود و اصول اور حکمت توسط سب مشروط ہیں ورود نص کے ساتھ اس لیے ان واسطوں پر دوسرے اختراعی واسطوں کو قیاس کرنا جائز نہیں۔ منجملہ ان ہی وسائط کا ایک

واسطہ بیت اللہ ہے۔ حق تعالیٰ نے انسان کی اس خاصیت کی رعایت کیلئے کہ اس کی توجہ غائب کی طرف بلا واسطہ دائم نہیں رہ سکتی۔ دنیا میں ایک مقام کو اپنی ذلت کی طرف منسوب فرمایا اور اس کو اپنا گھر کہا اور اس میں وہ انوار و برکات رکھے جن کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت صحیح ہوگئی ورنہ خدا تعالیٰ مکان سے منزہ ہے پھر بندوں کو اس کے حج کا حکم دیا۔ اب وہاں جا کر عشاق اسی حالت کو عبادت سمجھ کر سامنے رکھتے ہیں۔ اور مسلمانوں کا دعویٰ صحیح ہے، کیونکہ وہ کعبہ کے بغیر بھی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ بہر حال یہ وسائط محض اس لیے مشروع ہوئے ہیں کہ انسان کی خاصیت یہ ہے کہ وہ غائب کی طرف بلا واسطہ ہمیشہ متوجہ نہیں رہ سکتا، باقی یہ وسائط (واسطے) مقصود نہیں ہیں اور خیر یہ وسائط تو کیا مقصود ہوتے ان سے بڑھ کر جو وسائط ہیں یعنی وسائط فی السلوک وہ بھی مقصود نہیں ہیں۔ ہر واسطہ میں مسلمان کا مقصود صرف ایک ہی ذات ہے۔

اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وسائط کی دو قسمیں ہیں، ایک وسائط فی العلوم جو تعلیم طریق میں واسطہ ہیں۔ دوسرے وسائط فی العمل جو توجہ فی اداء العبادۃ میں واسطہ یعنی مددگار ہیں اور توحید کی کس قدر حفاظت کی گئی ہے کہ وسائط طریق کو سمتِ عبادت نہیں بنایا گیا۔ گو فضیلت ان کی کعبہ سے زیادہ ہے۔ چنانچہ علماء امت کا اتفاق ہے کہ جس حصۂ زمین سے سیدنا رسول اللہ ﷺ کا جسد اطہر متصل ہے وہ عرش سے بھی افضل ہے تو کعبہ سے تو بدرجہ اولیٰ افضل ہے اور ظاہر ہے کہ یہ فضیلت اس جگہ محض رسول اللہ ﷺ کے اتصال سے آئی ہے تو خود آپ کی ذات مقدس تو یقیناً عرش سے افضل ہوگی اور عرش کعبہ سے افضل ہے تو آپ ﷺ کعبہ سے بھی افضل و اعظم ہیں۔

نیز ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دن کعبہ کو دیکھا اور اس کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں تیری عظمت اور حرمت کو جانتا ہوں مگر مومن کی حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تیری حرمت سے بھی زیادہ ہے اسی لیے نماز سے فارغ ہو کر جب امام بیٹھتا ہے تو مسلمانوں کی طرف منہ کر کے کعبہ سے انحراف کر لیتا ہے۔

جب ہر مسلمان کی حرمت کعبہ سے زیادہ ہے تو جو حضرات مشائخ طریق اور انبیاء اور اولیاء ہیں یقیناً ان کی حرمت کعبہ سے بدرجہ اولیٰ زیادہ ہوگی مگر بایں ہمہ ان کو سمت عبادت نہیں بنایا گیا کیونکہ کعبہ تو ایک کوٹھری ہے اس کے سمت عبادت ہونے سے کسی کو اس کے مقصود و مسجود ہونے کا وہم نہیں ہوسکتا، کوئی بہت ہی احمق ہوگا جسے ایسا وہم ہو بخلاف وسائط تعلیم کے ان کو سمت عبادت بنانے میں اندیشہ قوی تھا کہ جہلاء ان کو مقصود و مسجود سمجھ جائیں۔ اس لیے کہ وسائط تعلیم میں سب سے افضل رسول ﷺ ہیں آپؐ کی یہ حالت تھی کہ ہزاروں معجزات و خوارق عادات آپؐ کے ہاتھ سے ظاہر ہوئے۔ آپؐ کی ذات بابرکات میں سینکڑوں کمالات ایسے موجود تھے جو کسی انسان میں نہ تھے۔ اس حالت میں اگر آپؐ کی ذات کو سمت عبادت بنا دیا جاتا تو یقیناً بہت سے جاہل آپؐ کو خدا بنا لیتے باوجود سمت عبادت نہ بنانے کے تو جہلاء کی یہ حالت ہے کہ آپؐ کو بشریت سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اگر آپؐ کی ذات کو سمت عبادت بنا دیا جاتا تو نہ معلوم لوگ کیا غضب ڈھاتے اسی طرح اہل اللہ میں اپنے زمانہ کے لوگوں سے زیادہ کمالات معنویہ ہوتے ہیں اور بعض صاحب کرامات حسیہ بھی ہوتے ہیں ان کو سمت عبادت بنانے میں یہی اندیشہ تھا۔ اس لیے وسائطِ تعلیم کو سمت عبادت نہیں بنایا گو فضیلت میں وہ کعبہ سے بدرجہا زائد ہوں مگر ان کے احکام اور ہیں اور وسائط فی العمل کے احکام اور ہیں۔ وسائط تعلیم کی طرف سجدہ کرنا یا ان کے سامنے جھکنا حرام ہے اور وسائط فی العمل کے ساتھ یہ برتاؤ ہے کہ عبادت میں ان کی طرف منہ کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی وسائط میں سے ایک واسطہ بیت اللہ ہے کہ اس کے خاص تعلقات حق تعالیٰ کے ساتھ ظاہر کیے گئے اور اس اظہار کی تقریر کیلئے اس کے کونہ میں ایک پتھر جنت کا نصب کیا گیا جس کا لقب یمین اللہ رکھا گیا کیونکہ اگر آپ محبوب حقیقی کو دیکھتے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ کرتے۔ ایک معاملہ تو یہ ہوتا کہ اس کو محبوب و مطلوب اور معبود و مسجود سمجھتے اس کو تو مستثنیٰ کر دیا گیا۔ اس کے سوا جو معاملہ بھی آپ

محبوب کے ساتھ کرتے ان سب معاملوں کی بیت اللہ کے ساتھ اجازت ہے۔ اگر آپ محبوب کے گھر پہنچتے تو جب تک صاحب خانہ سے نہ ملتے تو اس وقت تک گھر کے گرد گھومتے پھرتے۔ دیواروں کو چومتے جیسا کہ مجنوں کہتا ہے۔

امر علی الدیار دیار لیلیٰ
اقبل ذاالجدار و ذاالجدارا

و ماحب الدیار شغفن قلبی
ولکن حب من سکن الدیارا

میں گھروں پر یعنی لیلیٰ کے گھروں پر گذرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو بوسہ دیتا ہوں کبھی اس دیوار کو۔ میرے دل میں گھروں کی محبت نہیں گھسی لیکن جوان گھروں میں رہ رہا ہے اس کی محبت گھس رہی ہے۔

اسی طرح یہاں بھی بیت اللہ کا طواف کیا جاتا ہے۔ اور کعبہ کے بعض ارکان کو بوسہ دیا جاتا ہے اور ایک معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے مصافحہ کرتے تو یمین اللہ سے مصافحہ کیجیے۔ عاشق محبوب کے مکان پر پہنچ کر جب تک محبوب سے ملاقات نہ ہو اس کے گھر کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑا رہتا ہے اسی طرح یہاں بھی نماز میں استقبال بیت اللہ کیا جاتا ہے اور یہ معاملات جس طرح محبت سے پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح یہ منشا بھی ہوجاتے ہیں محبت کے کسی کے لباس کو روزانہ بتکلف آنکھوں سے ملا کرو، دیکھو چندروز میں محبت کا ولولہ پیدا ہوجائے گا، کسی کے گھر پر روزانہ ایک دو گھنٹہ بیٹھ کر چلے آیا کرو۔ چندروز میں اس گھر سے اور اس کے مالک سے محبت ہوجائے گی یہ نری باتیں نہیں ہیں تجربہ کر کے دیکھ لو۔ اسی طرح طواف بیت اللہ بعض تو محبت کے بعد کرتے ہیں اور بعض کو طواف کے بعد محبت حق پیدا ہوجاتی ہے۔ غرض اس کی ضرورت عقل تھی کہ کوئی چیز ایسی بنائی جائے جس کے ساتھ اظہار محبت کا معاملہ کیا جائے تاکہ

انسان کو اس واسطہ سے حق تعالیٰ کے ساتھ محبت پیدا ہو اور جس کو پہلے سے محبت ہے اس کی محبت قوی و دائم ہو کیونکہ میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ غائب کے ساتھ توجہ اور محبت بلا واسطہ دائم نہیں رہتی چنانچہ وہ چیز بیت اللہ ہے جس کے ساتھ محبت کا برتاؤ ظاہر کیا جاتا ہے اور چونکہ اس کو حق تعالیٰ کی طرف نسبت واضافت ہے اور اس میں انوار و برکات بھی ہیں اس لیے بیت اللہ کے ساتھ اس برتاؤ سے خدا کے ساتھ تعلق محبت کا پیدا ہوتا اور قوی و مستحکم ہو جاتا ہے۔ (البدائع صفحہ ۲۹۱ تا ۳۰۰ ملخصا)

مسلمان کعبہ کی پوجا کرتے ہیں

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

مسلمان کعبہ کی پرستش کرتے ہیں؟

جواب: حضرت تھانوی ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

ہم کعبہ کی پرستش نہیں کرتے بلکہ عبادت خدا کی کرتے ہیں اور صرف منہ قبلہ کی طرف کرتے ہیں اور اس کیلئے ہمارے پاس بہت سے دلائل ہیں۔

ایک یہ کہ ہم خود اس کی معبودیت کی نفی کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کوئی عابد اپنے معبود کی معبودیت کی نفی نہیں کرتا۔

دوسرے یہ کہ نماز پڑھتے ہوئے اگر کسی کے دل میں کعبہ کا خیال بھی نہ آئے مگر کعبہ کی طرف ہی منہ رہے تو اس کی نماز درست ہے چنانچہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ وہ مسجد میں آ کر نماز شروع کر دیتے ہیں اور کعبہ کا کچھ بھی خیال ان کو نہیں آتا ان کی نماز درست ہے اگر ہم کعبہ کی عبادت کرتے ہوتے تو اس کی نیت کرنا بھی شرط ہوتا مگر ایسا نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ اگر کسی وقت کعبہ نہ رہے تو جب بھی نماز فرض رہے گی اور اس طرف منہ کیا جائے گا جہاں کعبہ موجود ہے اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کعبہ کی اینٹ

پتھروں کو نہیں پوجتے ورنہ انہدام کعبہ کے بعد نماز موقوف ہو جاتی۔ چوتھے یہ کہ اگر کوئی شخص کعبہ کی چھت پر نماز پڑھے تو اس کی نماز درست ہے اگر کعبہ مسلمانوں کا معبود ہوتا تو اس کے اوپر چڑھ کر نماز صحیح نہ ہوتی کیونکہ اب کعبہ اس کے سامنے نہیں ہے۔ دوسرے معبود کے اوپر چڑھنا گستاخی ہے اس حالت میں کسی طرح نماز درست نہیں ہونا چاہئے تھی مگر فقہاء نے تصریح کی ہے کہ کعبہ کی چھت پر بھی نماز صحیح ہے تو کیا معبود کے اوپر بھی چڑھا کرتے ہیں۔

ہاں معترضین نے اپنے اوپر قیاس کیا ہوگا کہ وہ گائے بیل کو دیوتا و معبود بھی سمجھتے ہیں پھر ان کے اوپر سوار بھی ہوتے ہیں مگر اس کا خلاف عقل ہونا ظاہر ہے۔

اب آپ کو بتلاتا ہوں کہ استقبال قبلہ کا راز یہ ہے کہ عبادت کی روح دل جمعی اور یکسوئی ہے بغیر دل جمعی اور یکسوئی کے عبادت کی صورت ہی صورت ہوتی ہے روح نہیں پائی جاتی اور یہ ایسی بات ہے کہ جس کو تمام اہل ادیان تسلیم کرتے ہیں اب سمجھئے کہ اجتماع خواطر میں اجتماع ظاہر کو بہت بڑا دخل ہے اسی لیے نماز میں سکون اعضاء کا امر ہے التفات وعبث سے ممانعت ہے صف کے سیدھا کرنے کا امر ہے کیونکہ صف کو ٹیڑھا کرنے سے قلب پریشان ہوتا ہے۔ عام قلوب کو اس کا احساس کم ہوگا کیونکہ ان کو دل جمعی اور یکسوئی بہت کم نصیب ہے مگر جن کو نماز میں دلجمعی کی دولت نصیب ہے ان سے پوچھئے کہ صف ٹیڑھی ہونے سے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے صوفیہ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ صف غیر منظم سے قلب کو خلجان و پریشانی ہوتی ہے اسی دل جمعی کیلئے سجدہ گاہ پر نظر جمانے کی تاکید ہے کیونکہ جگہ جگہ نظر گھمانے سے بھی قلب کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی۔ پس نماز میں اگر ایک خاص جہت مقرر نہ ہوتی تو کوئی کسی طرف منہ کرتا اور کوئی کسی طرف منہ کرتا اس اختلاف جہات وتباین ہیأت سے تفرق قلب ہوتا لہذا یکسوئی کیلئے ایک خاص جہت مقرر کر دی گئی۔

رہا یہ کہ کعبہ ہی کی جہت کیوں مقرر ہوئی اور جہت کیوں نہ ہوئی اس سوال کا کسی

کو حق نہیں کیونکہ یہ سوال تو اس دوسری جہت میں بھی ہو سکتا ہے کہ یہی کیوں ہوئی دوسری کیوں نہ ہوئی۔ دیکھئے عدالت وقت مقرر کرتی ہے کہ کچہری کا وقت فلاں وقت سے فلاں وقت تک ہے تو آپ یہ سوال تو کر سکتے ہیں کہ وقت مقرر کرنے کیا ضرورت ہے جس کا جواب یہ دیا جائے گا تا کہ کام کرنے والے سب کے سب ایک وقت میں حاضر ہو سکیں اور رعایا اہل حاجت کو وقت مقرر ہونے سے اطمینان ہو جائے کہ عدالت کا یہ وقت ہے تو اس کے علاوہ اوقات میں وہ اپنے دوسرے کام کر سکیں اگر وقت مقرر نہ ہو تو ہر شخص کو تمام دن عدالت میں رہنا پڑے کہ نا معلوم کس وقت حاکم آ جائے باقی اس سوال کا حق کسی کو نہیں کہ گورنمنٹ نے دس بجے سے چار بجے تک ہی کا وقت کیوں مقرر کیا کوئی اور وقت مقرر کر دیا ہوتا کیونکہ وہ کوئی بھی وقت مقرر کرتی یہ سوال تو کبھی ختم نہیں ہو سکتا تھا۔

علیٰ ہذا القیاس ہم کو یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ جہت کعبہ ہی کو استقبال کیلئے کیوں مخصوص کیا گیا، ہاں ہم نے اس کا راز بتلا دیا کہ خاص جہت کے تعین میں کیا مصلحت ہے یہ جواب تو ضابطہ کا ہی ہے اور طالب کیلئے یہ جواب ہے کہ حق تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کی (یعنی حق تعالیٰ کی) توجہ کس طرف زیادہ ہے جس طرف ان کی توجہ زیادہ تھی اسی کو جہتِ صلوٰۃ مقرر فرما دیا۔ رہا یہ کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی توجہ کعبہ کی طرف زیادہ ہے سو جن کی آنکھیں ہیں وہ جانتے ہیں کہ واقعی کعبہ پر تجلیاتِ الٰہیہ بہت زیادہ ہیں اور توجہ سے یہی مراد ہے اور وہی تجلیات روح کعبہ اور حقیقت کعبہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کعبہ ظاہری کی چھت پر بھی نماز ہو جاتی ہے کیونکہ اس وقت گو صورت کعبہ سامنے نہیں مگر حقیقت کعبہ یعنی تجلی الٰہی تو سامنے ہے اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان دراصل تجلی کا استقبال کرتے ہیں کعبہ کی دیواروں کا استقبال نہیں کرتے مگر چونکہ تجلی الٰہی کا احساس ہر شخص کو نہیں ہوتا اس لیے حق تعالیٰ نے اس خاص جگہ کی حد مقرر فرما دی جس پر اللہ تعالیٰ کی تجلی دوسرے مکانوں سے زیادہ ہے پس یہ عمارت

محض اس تجلی اعظم کی جگہ دریافت کرنے کے لئے ہے ورنہ خود عمارت مقصود بالذات نہیں چنانچہ انہدام عمارت کے بعد نماز کا موقوف نہ ہونا اور کعبہ کی چھت پر نماز کا درست ہونا اس کی دلیل ہے۔

فقہاء نے اس کو راز سمجھا ہے اس لیے وہ فرماتے ہیں کہ قبلہ وہ ہوا ہے جو کعبہ کی کے برابر میں آسمان تک اور اس سے نیچے زمین کے سب سے نچلے طبقات تک ہے۔ لیکن چونکہ عمارت کعبہ کو اور اس جگہ کو تجلی الہی سے تلبس ہے اس تلبس کی وجہ سے اس میں بھی برکت آ گئی۔ (اشرف الجواب صفحہ ۱۲۷ از وعظ محاسن اسلام صفحہ ۶۶)

مولانا ثناء اللہ امرتسری لکھتے ہیں:

جواب: بڑے ہی جاہل اور متمرد ہیں وہ لوگ جو متکلم کے خلاف منشاء کلام کے معنی کرتے ہیں خصوصاً ہٹ دھرمی جن کی عقل مذہب کی تاریکی میں پھنس کر زائل اور معدوم ہو جاتی ہے۔ (دیباچہ ستیارتھ پرکاش ص ۷)

افسوس ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور ہیں پنڈت جی اگر یہ اصول صحیح ہے کہ ہر کلام کے وہی معنی صحیح ہے جو متکلم کی مراد ہے تو سنئے ہم آپ کو متکلم کی مراد بتلاتے ہیں دور کیوں جاتے ہیں ایک ہی آیت پر غور کر لیا ہوتا۔

آیت میں ہے:

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ.

ترجمہ: ان مشرکوں کو چاہیے کہ اس گھر کے خدا کی عبادت کریں جو بھوک میں ان کو کھانا دیتا ہے اور خوف میں ان کو امن بخشتا ہے۔

سوامی جی! آپ کو اپنے بھائی ہندوؤں سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنا خیال بھی نہ آیا کہ وہ تو صاف اور صریح لفظوں میں انہی سے جن کے وہ بت سامنے رکھتے ہیں دعائیں کریں اور انہی سے اپنی حاجات طلب کریں۔ کیا ہماری نماز کے الفاظ میں بھی

کوئی لفظ ایسا آپ کو ملا ہے جس کے یہ معنی ہوں کہ ہم اس کعبہ سے حاجات طلب کرتے ہیں یا اس کو مخاطب بناتے ہیں بلکہ یہاں تک کہ کعبہ کا نام تک بھی ساری نماز کے الفاظ میں آپ کو نہ ملے گا۔ مطلب قرآنی تو بالکل صاف ہے مگر اسکا کیا علاج ہو کہ

''ناپاک باطن والے جاہلوں کو واقعی علم نہیں ہوتا'' (بھومکا صفحہ ۵۲)

(حق پرکاش صفحہ ۸۳)

کیا حجر اسود کو بوسہ دینا اس کی عبادت نہیں ہے

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

مسلمان حجر اسود کو بوسہ دے کر اس کی عبادت کرتے ہیں۔

جواب: یہ ہے کہ تقبیل حجر عظمت سے نہیں بلکہ محبت سے ہے جیسے بیوی بچوں کا بوسہ لیا کرتے ہیں اگر بوسہ دینا عبادت و عظمت کی دلیل ہے تو لازم آئے گا کہ ہر شخص اپنی بیوی کی عبادت کرتا ہے اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے معلوم ہوا کہ بوسہ دینا عبادت و تعظیم کو مستلزم نہیں بلکہ کبھی محبت سے بھی تقبیل ہوا کرتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ پھر تم حجر اسود سے محبت کیوں کرتے ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ہمارے گھر کی بات ہے اس کے متعلق مخالف کو سوال کرنے کا حق نہیں ہے دیکھئے کہ اگر کوئی شخص عدالت میں یہ دعویٰ دائر کرے کہ فلاں مکان میری ملکیت ہے تو اس سے اس پر ثبوت طلب کیا جائے گا لیکن جب وہ ثبوت پیش کر دے تو خصم کو اس سوال کا حق نہیں کہ اچھا مکان تو تمہارا ہی ہے مگر یہ بتلا دو کہ اس گھر میں کیا کیا سامان ہے یا کوئی شخص اپنی بیوی کا بوسہ لے تو اس سے یہ سوال ہو سکتا ہے کہ تم اس کا بوسہ کیوں لیتے ہو لیکن جب وہ یہ بتلا دے کہ میں محبت کی وجہ سے بوسہ لیتا ہوں تو پھر اس سوال کا کسی کو حق نہیں کہ تم کو بیوی سے محبت کیوں ہے اور تم دن رات کو کتنے بوسے لیتے ہو۔

اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کی وجہ بتلا نہیں سکتے کہ ہم کو حجر اسود سے کیوں محبت ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مخالفین کے اعتراض کا جواب اسی حد تک دینا چاہئے جہاں تک ان کو سوال کا حق ہے اور جو سوال ان کے منصب سے باہر ہو اس کا جواب نہ دینا چاہیے بلکہ صاف کہہ دینا چاہیے کہ تم کو اس سوال کا کوئی حق نہیں مخالفین کا دماغ ہر بات کی حقیقت سمجھنے کے قابل نہیں۔ امور دقیقہ کو ان کے سامنے بیان نہ کرنا چاہئے بعض لوگ اس پر تعجب کرتے ہیں کہ وہ بات کونسی ہے جس کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ آخر ہم بھی تو انسان ہیں اگر باریک بات ہمارے سامنے بیان کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو نہ سمجھ سکیں، میں کہتا ہوں کہ اگر ایسی بات ہے تو میں ایک ریاضی دان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اقلیدس کی کوئی شکل ایک گھس کھدے تو سمجھا دیں جس نے اقلیدس کے مبادی واصول موضوعہ کو کبھی نہ سنا ہو۔ یقیناً وہ اقرار کرے گا کہ میں ایسے شخص کو اقلیدس کی اشکال نہیں سمجھا سکتا آخر کیوں کیا انسان نہیں مگر بات وہی ہے کہ بعض امور کے لئے مبادی ومقدمات کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے اس لیے اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کے ذہن میں تمام مبادی ومقدمات حاضر ہوں ہر شخص ان کو نہیں سمجھ سکتا۔ اور یہ بالکل موٹی بات ہے مگر حیرت کی بات ہے کہ آج کل کے عقلاء کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔

(مگر میں تبرعاً اسکا راز بھی بتلائے دیتا ہوں) تقبیل حجر کے راز کے متعلق میں کہہ چکا ہوں کہ اس کا منشا عظمت وعبادت نہیں ہے بلکہ محض محبت اس کا منشا ہے چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس حقیقت کو مجمع عام میں ظاہر کر دیا کہ ایک بار آپ طواف کر رہے تھے اس وقت کچھ لوگ دیہات کے موجود تھے جب آپ نے تقبیل حجر کا ارادہ کیا تو حجر کے پاس ذرا ٹھہرے اور فرمایا کہ

انی لاعلم انک لحجر لا تضر ولا تنفع ولو لا انی رأیت رسول الله ﷺ قبلک ما قبلتک.

ترجمہ: (یعنی میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ کچھ نفع دے سکتا ہے اور نہ ضرر دے سکتا ہے اور اگر میں نے رسول ﷺ کو تجھے بوسہ نہ دیتے ہوئے دیکھا ہوتا تو میں بھی تجھے بوسہ نہ دیتا)۔

کیا خشک معاملہ کیا ہے حجر کے ساتھ، بھلا اگر مسلمانوں کا یہ معبود ہوتا تو کیا اس سے بھی ایسا خطاب کیا جاتا کہ نہ تو نفع دے سکتا ہے نہ ضرر پہنچا سکتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس تقبیل کا منشا محض محبت ہے اور محبت کی وجہ یہ ہے کہ حضورؐ نے اس کو بوسہ دیا۔ حضورؐ کا فضلہ بھی کسی جگہ گرا ہو تو ہم کو اس جگہ سے محبت ہوگی۔ چہ جائیکہ وہ جگہ جہاں حضورؐ کے ہاتھ لگے ہوں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ کا دہن مبارک لگا ہو ۔

درمنزلے کہ جاناں روزی رسیدہ باشد
باخاک آستانش داریم مرحبائے

رہا یہ کہ حضورؐ نے اس کو کیوں بوسہ دیا اس سوال کا کسی کو حق نہیں اور نہ ہم کو اس کی وجہ بتلانا ضروری ہے ہاں اتنی بات یقینی ہے کہ حضورؐ نے بطور عبادت وعظمت کے بوسہ نہیں دیا ورنہ حضرت عمرؓ اس بیباکی کے ساتھ لاتضرُّ ولا تنفع نہ فرماتے۔ وہ حضورؐ کے مزاج شناس تھے جب انہوں نے حجر کے ساتھ یہ معاملہ کیا تو یقیناً اس تقبیل کا عبادت ہونا ہرگز نہیں۔

اور تبرعاً اس کا جواب بھی دیئے دیتا ہوں کہ ممکن ہے حضور ﷺ کو حجر کے اندر تجلیات الٰہیہ کا بہ نسبت دوسرے حصص بیت اللہ کے زیادہ ہونا منکشف ہوا ہو پس منشا اس تقبیل کا تلبس زائد ہے تجلیات الٰہیہ سے، اور جس چیز کو محبوب کے انوار سے زیادہ تلبس ہو اس کا بوسہ دینا اقتضائے محبت ہے۔

امر علی الدیار دیار لیلیٰ
اقبل ذا الجدار و ذا الجدارا

وما حب الدیار شغفن قلبی
و لکن حب من سکن الدیارا
(محاسن اسلام ۶۸)

تسبیح خلائق پر اعتراض

اعتراض: (پنڈت سوامی جی کا اعتراض)
جو غیر ضروری روح اشیاء ہیں وہ خدا کو جان ہی نہیں سکتیں تو پھر وہ اس کی عبادت کیونکر کر سکتی ہیں۔

جواب: سوامی جی! سنئے! سجدہ کے معنی فرمانبرداری، فروتنی کے ہیں (دیکھو صراح) ہاں ہر چیز کی اطاعت اور فروتنی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ہوتی ہے۔ پس آیت کے معنی صاف ہیں کہ "زمین و آسمان کی سب چیزیں خدا کی فرمانبردار ہیں جو جو کام ان کے سپرد ہیں وہ ان کو عمدہ طرح سے پورے کر رہے ہیں" قرآن سے شہادت ان معنی کی سنی ہو تو سنو! كُلٌّ لَّهُ قَانِتُونَ (ہر ایک چیز خدا کی فرمانبردار ہے)۔

نماز گناہوں سے کیسے روکتی ہے

اعتراض: (عام منکرین کا اعتراض)
حسب قرآن بری باتوں سے بچانا نماز کا خاصہ ہے تو پھر اس کے خلاف کیوں ہوتا ہے؟

جواب: وہ یہ نہیں دیکھتے ہم نماز کس شان کی پڑھتے ہیں آپ کی نماز کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کہے کہ مجھے آدمی کی ضرورت ہے اور آپ اس کے سامنے ایک اپاہج گوشت کے لوتھڑے کو لا کر پیش کر دیں اور وہ جب کہے کہ میں اپاہج کو لے کر کیا کروں یہ بھی کوئی آدمی ہے تو آپ اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ صاحب تم نے آدمی کہا تھا میں نے آدمی لا دیا۔ دیکھ لو یہ حیوان ناطق ہے یا نہیں۔ تو بیشک وہ معقولی

آدمی تو ہے مگر معمول کا آدمی نہیں وہ اس قابل نہیں ہے جس کو آدمیوں کے کام کیلئے لے جائیں بس یہ حال ہماری نماز کا ہے کہ نام کو نماز ہے مگر اس کی شان یہ ہے کہ اس کے ہاتھ ہیں نہ پیر نہ سر ہے نہ آنکھیں اگر ہاتھ ہیں تو سر کٹا ہوا ہے سر ہے تو آنکھیں اندھی ہیں ، اہل حقیقت تو ایسی نماز کو کالعدم سمجھتے ہیں جیسے اپاہج گوشت کے لوتھڑے کو کالعدم سمجھا گیا تھا مگر فقہاء نے یہ دیکھ کر کہ نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے اگر نہ ہونے کا حکم لگایا جائے گا تو لوگ اسے بھی چھوڑ بیٹھیں گے اس پر صحت کا حکم لگا دیا ہے مگر یہ حکم صحت ویسا ہی ہے جیسے آپ نے اس اپاہج کو حیوان ناطق ہونے کی وجہ سے آدمی کہا تھا پس ایسے ہی آپ کی نماز اصطلاحی نماز تو ہے مگر حقیقی نماز نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کو بے کار سمجھ کر چھوڑ دیں نہیں صاحب بالکل بے کار یہ بھی نہیں نہ ہونے سے اس کا ہونا پھر بہتر ہے کیونکہ بعض دفعہ اگر نظر عنایت ہو جائے تو حق تعالیٰ کے یہاں یہ صورت بھی قبول ہو جاتی ہے مولانا رومؒ نے ایسی نماز کے قبول ہونے کی عجیب مثال دی ہے فرماتے ہیں۔

ایں قبول ذکر تو از رحمت است

چوں نماز مستحاضہ رخصت است

یعنی جس طرح عورت مستحاضہ کی نماز شرعاً صحیح مانی گئی ہے حالانکہ نماز کے اندر بھی اس کا خون جاری ہے اور حقیقت کے اعتبار سے وہ ناپاک ہے مگر محض رحمت کی بناء پر اس کو قبول کر لیا جاتا ہے یہی حالت ہماری نمازوں کی ہے کہ گو حقیقت کے لحاظ سے وہ کالعدم ہیں مگر حق تعالیٰ کی نظر عنایت سے کبھی یہ بھی قبول ہو جاتی ہیں۔

نیز بعض دفعہ شدہ شدہ یہ نماز حقیقی کی طرف وسیلہ ہو جاتی ہے جیسے بعض طلبہ بدشوق ہیں نہ مطالعہ کر کے پڑھتے ہیں نہ پڑھ کر دیکھتے ہیں تو ان کا اس وقت پڑھنا نہ پڑھنے کے مثل ہے مگر شفیق استاد اس کو مکتب سے نہیں نکالتا اور یہ کہتا ہے کہ گو یہ اس وقت شوقین طالبعلم کے برابر نہیں مگر شدہ شدہ شوق کی امید ہے چنانچہ اکثر ایسا بھی

ہو جاتا ہے کہ جن طالبعلموں کو ابتداء میں شوق نہ تھا جب وہ عرصہ تک کام میں لگے رہے تو ایک وقت خود بخود ان کو شوق پیدا ہو گیا انہیں اسباب پر نظر کر کے حضرات فقہاء نے ایسی نمازوں پر صحت کا حکم لگا دیا اور واقعی فقہاء کا وجود بھی امت کیلئے رحمت ہے۔ پس آپ اپنی نماز کو بے کار تو نہ سمجھیں مگر کامل بھی نہ سمجھیں۔

اب اعتراض کا جواب ہو گیا کہ نماز کی تاثیر تو حق تعالیٰ نے یہ بتلائی ہے کہ **تنھی عن الفحشاء و المنکر** اور ہم اپنے اندر یہ اثر نہیں پاتے تو بات یہ ہے کہ یہ شان کامل نماز کی ہے اور آپ کی نماز کامل نہیں اس لیے اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا ہم نماز کو بری طرح ادا کرتے ہیں جیسے کوئی جوشاندے کو سفوف بنا کر پھانک لے تو بتلایئے کہ نفع کیونکر ہو۔

دوسرے یہ کہ جیسی ہماری نماز ہے ویسی ہی اس کی **نھی عن الفحشاء** بھی ہے اگر کامل نماز ہوتی تو وہ ہم کو تمام فحشاء سے روک دیتی اب ناقص ہے تو کسی قدر فحشاء سے روک دیتی ہے اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔

تجربہ ہے کہ نمازی آدمی عموماً بے نمازیوں سے کم گناہ کرتے ہیں اور ادنیٰ نفع تو یہی ہے کہ نمازی آدمی کے پاس کوئی کافر بہکانے کے واسطے نہیں آتا کفار جس کو نمازی دیکھتے ہیں اس کو دین کا پابند اور پختہ سمجھ کر کچھ نہیں کہتے اس سے وہ ناامید ہو جاتے ہیں کہ ہمارے بہکانے میں نہیں آ سکتا۔ (ایواء الیتامی ص ۶)

گیارہواں باب

ذبائح اور قربانی کے متعلق اعتراضات کے جوابات

قربانی کے جانوروں کا ذبح کرنا خلاف رحم نہیں

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

مسلمان بے شمار جانوروں کو قربانی کے ایام میں ذبح کر کے ان پر ظلم کرتے ہیں۔ اور ان کو جانداروں پر رحم نہیں آتا۔

جواب: خدا تعالیٰ کو ماننے والی قومیں خواہ کوئی ہوں اس بات کی ہرگز قائل نہیں ہیں کہ خدا تعالیٰ ظالم ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کو رحمن، رحیم مانتے ہیں اب خدا تعالیٰ کا فعل دیکھو کہ ہوا میں باز، شکرے، گدھ، چرغ وغیرہ شکاری جانور موجود ہیں اور وہ غریب پرندوں کا گوشت کھاتے ہیں گھاس اور عمدہ سے عمدہ میوے اور اس قسم کی کوئی چیز نہیں کھاتے پھر دیکھو آگ میں پروانہ کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے پھر پانی کی طرف خیال کرو کہ اس میں کس قدر خونخوار جانور موجود ہیں گڑیال اور بڑی بڑی مچھلیاں اود بلاؤ وغیرہ یہ چھوٹے چھوٹے آبی جانور کھا جاتے ہیں بلکہ بعض مچھلیاں قطب شمالی سے قطب جنوبی تک شکار کے لئے جاتی ہیں پھر ایک قدرتی نظارہ سطح زمین پر دیکھو کہ چیونٹی خور جانور کیسے زبان نکالے پڑا رہتا ہے جب بہت سی چیونٹیاں اس کی زبان کی شیرینی کی وجہ سے اس کی زبان پر چڑھ جاتی ہیں تو جھٹ زبان کھینچ کر سب کو نگل جاتا ہے۔ مکڑی مکھیوں کا شکار کرتی ہے مگس خور جانور اپنی غذا ان جانوروں کو مار کر بہم پہنچاتے ہیں بندروں کو چیتا مار کر کھاتا ہے جنگل میں شیر بھیڑیے تیندوے کی غذا جو مقرر ہے وہ سب کو معلوم ہے بلی کس طرح چوہے کو پکڑ کر ہلاک کرتی ہے۔

اب بتلاؤ کہ اس نظارہ عالم کو دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے یہ قانونی ذبح جو عام طور پر جاری ہے یہ کسی ظلم کی بناء پر ہے ہرگز نہیں پھر انسان پر حیوان کے ذبح کرنے کے ظلم کا الزام کیا مطلب رکھتا ہے انسان کے جوئیں پڑ جاتی ہیں یا کیڑے پڑ جاتے ہیں، کیسی بے

با کی سے ان کی ہلاکت کی کوشش کی جاتی ہے کیا اس کا نام ظلم رکھا جاتا ہے جب اسے ظلم نہیں کہتے کہ اشرف کیلئے اخس کا قتل جائز ہے تو ذبح پر اعتراض کیونکر ہو سکتا ہے۔

بلکہ غور کرو تو حضرت ملک الموت کو دیکھو کیسے کیسے انبیاء رسل بادشاہ بچے غریب امیر سوداگر سب کو موت دے کر روح نکال لیتا ہے۔

پھر غور کرو اگر ہم جانوروں کو عید الاضحی پر اس لیے ذبح نہ کریں کہ ہمارا ذبح کرنا رحم کے خلاف ہے تو کیا اللہ تعالیٰ ان کو ہمیشہ زندہ رکھے گا اور ان پر یہ رحم ہوگا کہ وہ نہ مریں۔

پس اس تمہید کے بعد گزارش ہے کہ اگر جانوروں کو ذبح کرنا خلاف رحم ہوتا تو اللہ تعالیٰ شکاری اور گوشت خور جانوروں کو پیدا نہ کرتا نیز اگر ان کو ذبح نہ کیا جائے تو خود بیمار ہو کر مریں گے، پس غور کرو کہ ان کے مرنے میں کیسی تکلیف ان کو لاحق ہوگی۔

(۱) قانون الٰہی کو ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز بے حد بڑھنا چاہتی ہے اگر ہر ایک برگد کے بیج حفاظت سے رکھے جائیں تو دنیا میں برگد ہی برگد ہوں اور دوسری کوئی چیز نہ ہو مگر دیکھو ہزار جانور اس کا پھل کھاتے ہیں اس سے پتہ لگتا ہے کہ اس بڑھنے کو روکنا مرضی الٰہی ہے اس طرح اگر ساری گائیوں کی پرورش کریں تو ایک وقت میں دنیا کی ساری زمین بھی ان کے چارے کیلئے کافی نہ ہوگی۔ آخر بھوک پیاس سے خود ان کو مرنا پڑے گا جبکہ یہ نظارہ قدرت موجود ہے تو ذبح کرنا خلاف مرضی الٰہی کیوں ہے۔

(۲) قوموں کی تاریخ پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادنیٰ چیز اعلیٰ کے بدلے میں قربان کی جاتی ہے یہ سلسلہ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیزوں میں پایا جاتا ہے ہم بچے تھے تو یہ بات سنی جاتی تھی کہ کسی کو سانپ کاٹے تو وہ انگلی کاٹ دی جائے تا کہ کل جسم زہریلے اثر سے محفوظ رہے گویا انگلی تمام جسم کیلئے قربان کی گئی ہے۔

(۳) اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا کوئی دوست آ جائے تو ہمارے پاس جو کچھ اس کی خوشی کیلئے قربان کرنا پڑتا ہے۔ گھی، آٹا، گوشت وغیرہ قیمتی اشیاء اس پیارے کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

(۴) اس سے زیادہ عزیز ہو تو مرغے مرغیاں حتیٰ کہ بھیڑیں اور بکرے قربان کیے جاتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر گائے اور اونٹ بھی عزیز مہمان کیلئے قربان کر دیئے جاتے ہیں۔

(۵) طب میں دیکھا گیا ہے کہ وہ قومیں جو اس کو جائز نہیں سمجھتیں کہ کوئی جاندار قتل ہو وہ بھی اپنے زخموں کے سینکڑوں کیڑوں کو مار کر اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔

اس سے اوپر چلو تو ہم دیکھتے ہیں کہ ادنیٰ لوگوں کو اعلیٰ کیلئے قربان کیا جاتا ہے مثلاً بھنگی ہیں گو تمام قوموں کی عید ہی کا دن ہو مگر ان بے چاروں کے سپرد وہ کام ہوتا ہے بلکہ ایسے ایام میں ان کو زیادہ تاکید کی ہوتی ہے کہ لوگوں کی آسائش و آرام کی خاطر کوئی گندگی کسی گزرگاہ میں نہ رہنے دیں گویا ادنیٰ کی خوشی اعلیٰ کی خوشی پر قربان ہوئی۔

(۶) بعض ہندو گئو رکھشا بڑے زور سے کرتے ہیں لداخ کے ملک میں تو دودھ تک نہیں پیتے کیونکہ یہ بچھڑوں کا حق ہے مگر یہاں کے ہندو دھوکا دے کر اس کا دودھ دوہ لیتے ہیں اور پھر اس سے اور اس کی اولاد سے سخت کام لیتے ہیں یہاں تک کہ اپنے کاموں کیلئے انہیں مار مار کر درست کرتے ہیں یہ بھی ایک قسم کی قربانی ہے۔

(۷) ادنیٰ سپاہی اپنے افسر کیلئے اور وہ افسر اپنے اعلیٰ افسر کیلئے اور وہ اعلیٰ افسر اپنے بادشاہ کے بدلے میں قربان ہوتا ہے۔ پس خدا نے اس فطرتی مسئلہ کو برقرار رکھا اور اس کو قربانی میں تعلیم دی کہ اعلیٰ ادنیٰ کیلئے قربان کیا جائے۔

(احکام اسلام عقل کی نظر میں صفحہ ۱۲۳)

حضرت تھانوی ایک اور جگہ میں لکھتے ہیں کہ دوسری قوموں کا یہ شبہ ہے کہ مسلمان لوگ بڑے سنگدل ہوتے ہیں کہ انہیں جانوروں کے گلے پر چھری پھیرتے ہوتے ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ یہ اعتراض محض ناواقفی یا ضد کی بنا ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ شبہ اور یہ اعتراض فقط گائے کی قربانی سے متعلق ہے چوہے۔ بکری، مرغی، کبوتر کے متعلق نہیں معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دال میں کالا ہے یعنی اس شبہ کا سبب ترحم نہیں ہے بلکہ محض اپنی

حمایت مذہبی ہے اور اگر کوئی ذہین آدمی مذہب سے قطع نظر کر کے سب جانوروں کے متعلق یہی الزام دے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسے کیا خبر کہ مسلمان نرم دل ہوتے ہیں یا سخت پس ان کا اعتراض اگر حمیت مذہب سے نہیں تو ناواقفیت سے ضرور ہے۔ پس اس کا فیصلہ بہت ہی ظاہر ہے مگر باوجود اس کے ظاہر ہونے کے علماء مناظرین نہ معلوم جواب میں کہاں کہاں پہنچاتے ہیں لیکن ان پر بھی اعتراض نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ تحقیق مقصود نہیں ہوتی محض الزام اور خاموش کرانا مقصود ہوتا ہے، باقی جہاں تحقیق منظور ہوتی ہے وہاں حق تعالیٰ کی جانب سے اصل حقیقت کا القاء ہوتا ہے، سو الحمدللہ حق تعالیٰ نے اس وقت مجھے جواب میں یہ بات سمجھا دی کہ انہیں کیا خبر مسلمانوں میں رحم نہیں۔ اب آپ سب مسلمانوں کو ٹٹول لیجئے کہ ذبح کے وقت قلب کی کیا کیفیت ہوتی ہے کڑھتا ہے یا نہیں؟ بعض موجودہ بزرگوں کا قصہ سنا ہے کہ ذبح کے وقت آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ آخر یہ کیا بات ہے ترحم اور کسے کہتے ہیں لیکن اس کے ساتھ بڑا کمال مسلمانوں کا قوت عدل ہے کہ ایک ہی طرف نہیں چلے گئے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا.

وسط کی تفسیر عدل ہے کہ اعتدال ہے قوت علمیہ وعملیہ دونوں میں کہ جربزہ وبلاہت کے وسط میں حکمت، جبن وتہور کے وسط میں شجاعت، اسی طرح قوت شہویہ خمور وفجور میں توسط عفت ہے اور ان تینوں کے مجموعہ یعنی حکمت، شجاعت، عفت کا نام عدل ہے تو یہ امت عادلہ ہے۔ حق تعالیٰ نے احکام بھی ایسے رکھے ہیں کہ اگر ان کے اندر امت عادلہ ہے۔ حق تعالیٰ نے احکام بھی ایسے رکھے ہیں کہ اگر ان کے اندر صفت عدل کم ہو تو ان احکام کے برتنے سے درست ہو جائے۔ نہ افراط ہو کہ چھری ڈال دو اور نہ تفریط کہ رحم نہ ہو غرض دونوں میں اعتدال رکھو تو ہمارا بڑا کمال یہ ہے کہ رحم بھی ہے اور چھری بھی پھیرتے ہیں مگر یہ سمجھ کر کہ ع۔

آں کہ جاں بخشد اگر بکشد رواست

اگر کوئی کہے کہ انہوں نے مارا تو نہیں تو اس کا جواب دوسرے مصرعہ میں دیتے ہیں کہ

نائب است او، دستِ اودستِ خداست

یہ تو مسلم ہے کہ جان جس کی دی ہوئی ہو وہ لے سکتا ہے، ہم اس کے نائب ہیں اس نے ہمیں حکم دیا اس لیے ہم نے چھری پھیر دی۔ باقی ہم نے جان نہیں نکالی، ہم نے تو فقط راستہ کھول دیا جان تو انہیں نے نکالی۔

اب کیا شبہ رہا اہل اسلام پر کہ یہ بڑے سنگدل ہوتے ہیں۔

آپ بڑے رحمدل ہوتے ہیں کہ خود چوہے نہیں مارتے مسلمانوں کے محلے میں چھوڑ آتے ہیں کہ یہ ماریں جب تم ہمیں موش کشی میں اپنا نائب بناتے ہو تو اگر اللہ تعالیٰ نے گاؤ کشی میں ہمیں اپنا نائب بنا دیا تو کیا قباحت ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کی نیابت میں یہ نفع بھی ہے کہ مارو اور کھاؤ اور تمہاری نیابت میں تو فقط مار کر پھینکنا ہی ہے اور کچھ بھی نہیں۔

سبحان اللہ یہ رحم ولی ہے ہم سے تو نہیں مارے جاتے تم مارو، نیابت اور کسے کہتے ہیں؟ یہ تو زبان سے کہنے سے بھی بڑھ کر ہے اگر زبان سے کہتے تو ایک مسلمان بھی نہ کر سکتا کیونکہ یہ کس کو غرض تھی کہ وہ اپنا کاروبار چھوڑ کر تمہارے گھروں اور دکانوں پر چوہے مارنے جاتا مگر ان کے گھر لا کر چھوڑ دیئے کہ اچھی طرح ان کو مار سکیں۔

حکایت:

یہ رحم تو ویسا ہی ہو گیا کہ کسی کی ایک بے حیا بہو تھی اس سے کسی نے پوچھا کہ تمہارا شوہر کہاں گیا ہے؟ حیا کی وجہ سے منہ سے تو نہ کہہ سکی مگر بتلانا بھی ضرور تھا تو آپ نے کیا کیا کہ لہنگا اٹھایا اور اس کے سامنے موتا اور پھر اوپر سے پھاند گئی، مطلب یہ کہ ندی پار گیا ہے۔

حکایت:

تو حضرت بعض ترحم بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ کسی نے زنا کیا حمل رہ گیا، رسوائی ہوئی تو لوگوں نے اس سے کہا کہ کمبخت تو نے عزل کیوں نہ کرلیا (عزل انزال سے پہلے علیحدہ ہوجانے کو کہتے ہیں) تو آپ کہتے ہیں کہ سنا تھا کہ عزل مکروہ ہے۔

کمبخت، منحوس اور زنا کونسا فرض سنا تھا؟ تو بعضوں کا تقویٰ بھی ایسا ہی ہوتا ہے یہ تو ترحم ویسا ہی ہے جیسی اس بہو کی شرم تھی کہ منہ سے بولنے میں تو حیا تھی اور لہنگا کھول کر سامنے بیٹھ جانے میں حیا نہ تھی اور پھر مسلمانوں پر اعتراض۔

حضرات میں بقسم کہتا ہوں کہ ترحم مسلمانوں کے برابر کسی قوم میں نہیں ہے مگر امتحان کے وقت معلوم ہوتا ہے۔

کسی کا قطعہ ہے جس کے اشعار یہ ہیں۔

دے کر قسم کہے کہ تو میرا لہو پیئے
گر پی نہ جائے جلد سے پیالہ شراب کا

اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کا
گر کچھ بھی خوف کیجیے روز حساب کا

اور امتحان بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شباب کا

دنیا کے واقعات نے کھلم کھلا ثابت کردیا ہے کہ ترحم کے موقع پر ترحم کرنا یہ خاصہ مسلمانوں ہی کا ہے۔ مسلمانوں کے برابر کوئی قوم رحمدل نہیں۔

میرے پاس ایک برہمن کا خط آیا تھا کہ مسلمانوں پر تو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جیو مارتے ہیں مثلاً گاؤکشی وغیرہ کرتے ہیں مگر وہ جیوگا نہیں مارتے (جیوگا آدمی کے نفس کو کہتے ہیں) مگر یہ معترض قوم جیوگا مارتی ہے یعنی آدمیوں پر ظلم کرتی ہے۔ مجھے

اس شخص کا قول نقل کرنے سے فقط یہ مقصود ہے۔
الحق ما شهدت به الاعداء یعنی جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے اب تو گئی شہادتیں ہو گئیں کہ مسلمان بڑے رحمدل ہوتے ہیں بہرحال ان کی رحمدلی ثابت ہو گئی۔ (وعظ روح اعج العج ص ۱۵)

موذی جانوروں کے قتل پر اعتراض

اعتراض: (چوبے بدریداس ہندو کا اعتراض)
تمہیں کہاں لائق ہے کہ بچھو وغیرہ کو بغیر کسی قصور کے ظاہر ہونے کے مار ڈالو۔ اور جانے نہ دو نیک مردوں کا یہ طریقہ ہے کہ دشمنوں کے حال پر بھی رحم کھاتے ہیں۔

جواب: مہاراج کہنا کچھ اور کرنا کچھ ہمیں یہ پسند نہیں کہ بکری کی بکری تو نگل جائیں گائے بیل بنام نہاد جگ کے نوش جان فرمائیں۔ یہاں تک کے اگر آدمی کا گوشت بھی مل جائے تو ایسا ہضم کریں کہ ڈکار بھی نہ لیں پاخانہ کی راہ سے ہوا نکال دیں۔ دیکھئے! کہ سیتل برہمن جو آپ کا بڑا پیشوا اور بڑا صاحب کرامات ہے بانات کو سب ہضم کر گیا ڈکار بھی نہ لی۔ پھر اس سب کے باوجود آپ کس منہ سے یہ بے فائدہ بات کرتے ہیں اور تماشہ یہ ہے کہ جرائم کو معاف کرنے اور رحم کھانے کو آپ تحفۃ الاسلام کے صفحہ ۲۳ میں بہت مذموم لکھتے ہیں۔

راجہ پرتچھت نے ہزاروں سانپ جگ میں قتل کر ڈالے۔ اور اس جگ کے اہتمام میں بہت سے برہمن شامل تھے۔ آج تک کسی نے ان کو برا نہیں کہا بلکہ وہ راجہ بڑا دیندار مشہور ہے۔

ہندوؤں پر تعجب ہے کہ خود جو چاہیں کھا جائیں جس جانور کو چاہیں مار ڈالیں مسلمان اگر بتقاضہء عقل موذی جانوروں کے قتل کا حکم نافذ کریں تو ان پر اعتراض کریں۔ (سوط اللہ الجبار ۳/ ۶۵)

حج کی قربانیاں خلاف عقل ہیں، ان کا گوشت ضائع ہو جاتا ہے

اعتراض: (عام کفار کا اعتراض)

مکہ معظمہ میں ہزاروں جانوروں کا ذبح ہو جانا خلاف عقل ہے کیونکہ ان کا گوشت کوئی بھی نہیں کھاتا۔

جواب: اس کا یہ ہے کہ جناب من ہے تو فحش بات لیکن تفہیم کیلئے عرض ہے کہ اگر تمہاری عقل میں کسی شے کا نہ آنا خلاف عقل ہونے کی دلیل ہے تو ہمارا آپ کا پیدا ہونا جس طریقہ سے ہے وہ بھی عقل کے خلاف ہے اور اس کا امتحان یہ ہے کہ ایک بچہ ایسا تجویز کیا جائے کہ وہ تہہ خانہ میں پرورش کیا جائے اور اس کے سامنے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا جائے آدمی کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جب بیس برس کا ہو جائے تو اس سے دفعتاً کہا جائے کہ آدمی اس طور سے پیدا ہوتا ہے تو ہرگز اس کی عقل میں نہ آئے گا اور ہم چونکہ رات دن دیکھتے ہیں سنتے ہیں کہ اس طریقہ سے انسان پیدا ہو سکتا ہے اس لیے ہم کو خلاف عقل نہیں معلوم ہوتا تو جناب ہم تو جب پیدا ہوئے ہیں ہمارے تمام حالات ہی خلاف عقل ہیں ہماری عقل تو بس کھانے کمانے کی ہے۔ ایسے ہی جیسے کسی بھوکے سے پوچھا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں کہا چار روٹیاں۔ ایسے ہی ہماری عقل صرف اس قدر ہے کہ کھا پی لو اور باتیں بنالو، جب اتنی عقل ہے تو اسرار شریعت کہاں سے سمجھ میں آئیں ایسے ہی صرف جانوروں کی قربانی میں بلاتقسیم گوشت کے بھی حکمت ہے اگر ہماری عقل میں نہ آئے تو قابل انکار کیسے ہوگی اور اس لیے ہمارے ذمہ ضروری نہیں ہے کہ اس حکمت وراز کو بیان کریں لیکن تبرعاً بتائے دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اصل میں یہ سنت ابراہیمی کا اتباع ہے اور شے محبوب کا خرچ کر مقصود ہے اور وہ صرف جانور ذبح کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے گوشت خواہ رکھیں یا تقسیم کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اصل عمل تو یہ ہے کہ بیٹے کو ذبح کریں لیکن اول تو سب

کے بیٹا نہیں ہوتا دوسرے یہ کہ اگر یہ حکم ہوتا تو بہت کم ایسے نکلتے جو یہ عمل کرتے۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ جانور کو اولاد کے ذبح کے قائم مقام کر دیا۔ اس لیے یہ کہنا کہ قربانی میں مال ضائع کرنا ہے جیسے آج کل نوتعلیم یافتہ اصحاب کا خیال ہے۔ سراسر غلط ہے اور قربانی کا مقصود اظہار محبت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور وہ اس میں حاصل ہے پھر مال کہاں ضائع ہوا۔ (ترغیب الاضحیہ صفحہ۱۲)

ذبح انسان ناجائز کیوں؟

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

ذبح کرنے سے اگر جان آسانی سے نکلتی ہے تو انسان کو بھی ذبح کر دینا چاہیے۔

جواب: ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ سے زیادہ رحم کسی مذہب میں بھی نہیں ہے اور ذبح حیوان رحم کے خلاف نہیں ہے بلکہ ان کے حق میں اپنی موت آپ مرنے سے ذبح ہو کر مرنا بہتر ہے کیونکہ خود مرنے میں قتل و ذبح کی موت سے زیادہ تکلیف ہے، رہا یہ سوال کہ پھر انسان کو بھی ذبح کر دیا جایا کرے تاکہ آسانی سے مر جایا کرے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حالت یاس سے پہلے ذبح کرنا تو دیدہ دانستہ قتل کرنا ہے اور حالتِ یاس کا پتہ نہیں چل سکتا۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں کہ مرنے کے قریب ہو گئے تھے پھر اچھے ہو گئے۔

اور یہ شبہ اگر حیوانات میں کیا جائے کہ ان کی یاس کا بھی تو انتظار نہیں کیا جاتا۔

جواب یہ ہے کہ جانوروں اور انسان میں فرق ہے وہ یہ ہے کہ انسان کا تو باقی رکھنا مقصود ہے کیونکہ خلق عالم سے وہی مقصود ہے اس لیے ملائکہ کے موجود ہوتے ہوئے بھی اس کو پیدا کیا گیا بلکہ تمام مخلوق کے موجود ہونے کے بعد اس کو پیدا کیا گیا کیونکہ نتیجہ اور مقصود تمام مقدمات کے بعد موجود ہوا کرتا ہے اس لیے انسان کے ذبح

وقتل کی اجازت نہیں دی گئی۔ ورنہ بہت لوگ ایسی حالت میں ذبح کر دیئے جائیں گے جس کے بعد ان کے تندرست ہونے کی امید تھی اور ذبح کرنیوالوں کے نزدیک ان کی یاس کی حالت تھی اور جانور کا باقی رکھنا مقصود نہیں اس لیے ان کے ذبح کی اجازت اس بناء پر دے دی گئی کہ ذبح ہو جانے میں ان کی راحت ہے اور ذبح کے بعد ان کا گوشت وغیرہ بقاء انسان میں مفید ہے جس کا ابقاء مطلوب ہے اگر اس کو ذبح نہ کیا جائے اور یوں ہی مرنے کے لئے ان کو چھوڑ دیا جائے تو مردہ ہو کر اس کے گوشت وغیرہ میں زہر کا اثر پھیل جائے گا اور اس کا استعمال انسان کی صحت کیلئے مضر ہوگا تو بقاء انسان کا وسیلہ نہ بنے گا اور قصاص و جہاد میں چونکہ افناء بعض افراد بغرض ابقاء جمیع الناس یقینی ہے اس لیے وہاں قتل انسان کی اجازت دی گئی ہے مگر ساتھ ہی اس کی رعایت کی گئی ہے کہ حتی الامکان سہولت کی صورت سے مارا جائے یعنی قصاص میں جو کہ قتل اختیاری ہے تلوار سے اور جہاد میں مثلہ وغیرہ کی ممانعت ہے۔

(افناء المحبوب ص ۵)

حضرت تھانوی ہی لکھتے ہیں:

پھر کوئی کہے کہ ذبح انسان بھی جائز ہو سکتا ہے اس میں شک نہیں کہ فی نفسہ ذبح انسان کیلئے بھی عمدہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ شہادت کو متفق اللفظ ہو کر اعلیٰ کمال مانا مگر انسان کے ذبح نہ کرنے پر اور بہت سے قوی دلائل ہیں۔

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ انسان کے ساتھ اوروں کے بھی حقوق ہیں کسی کی پرورش ہے کسی کا کچھ اور کسی کا کچھ۔ اگر ایسا حکم دیں تو مشکلات کا ایک بڑا سلسلہ پیدا ہو جاتا ہے اس لیے قتل انسان مستلزم سزا عرفی اور شرعی قانون میں سخت گناہ کہا گیا ہے۔

الغرض انسان کا قتل اس لیے تجویز نہیں ہوا کہ انسان کے ساتھ بہت سے حقوق ہوتے ہیں ان کا ضائع ہونا زیادہ دکھوں کا موجب ہے۔ (المصالح العقلیہ)

جانور بسم اللہ پڑھنے سے حلال ورنہ حرام کیسے ہو جاتا ہے؟

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

مسلمان جو گوشت کھاتے ہیں تو وہ حلال کر کے کھاتے ہیں پس اگر یہ جانور دعا کے پڑھنے سے حلال ہو جاتے ہیں تو سب جانور حلال ہو سکتے ہیں اور اگر دعا کے پڑھنے سے حلال نہیں ہوتے تو خود مرا ہوا کیوں حلال نہیں ہوتا سوال کا منشا یہ ہے کہ گوشت کی حلت کی وجہ کیا ہے اگر گوشت میں حلت اس دعاء سے آتی ہے جو تم جانور کو ذبح کرتے ہوئے پڑھتے ہو تو ہر ایک جانور دعا پڑھنے سے حلال ہو جانا چاہیے یہاں تک کہ سُور اور کتا بھی اور اگر حلت موت سے آتی ہے تو جانور خود مر جائے اس کا گوشت کیوں حلال نہیں سمجھتے۔

جواب (۱): کوئی پنڈت جی سے پوچھے غیر کی چیز جو اس کی اجازت سے حلال ہو سکتی ہے تو اگر بوجہ اجازت حلال ہو سکتی ہے تو لازمی بات ہے جس کو اجازت دیتا ہے اس کی گائے اور سُور اور اس کے گھر کا پاخانہ پیشاب سب حلال ہو جائے بلکہ اس کی جورو بھی۔ اگرچہ اس کی ماں بہن بیٹی ہی کیوں نہ ہو۔

اور اگر اس کی اجازت سے حلال نہیں ہوتیں بلکہ یوں ہی حلال ہیں تو پھر چوری قزاقی، غصب میں کیا خرابی رہی کہ (اخلاقاً وقانوناً ان کو برا سمجھا جائے اور جرم قرار دیا جائے)۔

علاوہ بریں مہابھارت کی فصل سوم میں جو مرقوم ہے کہ

جن جانوروں کے قتل کے وقت بید پڑھا جائے ان کا گوشت پاک ہے جو کوئی اسے کھائے وہ ان ہی لوگوں میں داخل ہے جنھوں نے حیوانات کو ترک کر دیا اور جن حیوانات کے قتل کے وقت بید نہ پڑھا جائے وہ روا نہیں۔ انتہی

اس میں پنڈت جی کیا فرماتے ہیں۔ اگر بید کی وجہ سے یہ حلت ہے تو سب ہی جانور حلال ہو سکتے ہیں پھر اسرب پنکھدرکھ بید کی اس کی تخصیص کے کیا معنی کہ جن حیوانات کے تلے کے دانت ہیں اور اوپر کے نہیں وہ خوراک ہیں۔
اور اگر بید کی وجہ سے یہ حلت نہیں تو مردار کے حلال نہ ہونے کی کیا وجہ؟

(انتصار الاسلام حضرت نانوتوی)

حضرت تھانوی لکھتے ہیں:

ہر تاثیر کیلئے ایک موثر چاہیے اور ایک قابل آفتاب کی تاثیر سے جو آئینہ منور ہو جاتا ہے اور آتشیں شیشہ میں شعاعیں آجاتی ہیں تو ان دونوں صورتوں میں آفتاب موثر ہے اور آئینہ اور آتشیں شیشہ متاثر اور قابل، اگر ادھر آفتاب نہ ہوتو یہ نورانیت جو آئینہ میں ہوتی ہے اور یہ سوزش جو آتشیں شیشہ میں پیدا ہو جاتی ہے ظہور نہ کرے اور اگر ادھر آئینہ اور آتشیں شیشہ نہ ہوتب بھی یہ نورانیت اور یہ سوزش ظاہر نہ ہو۔
اسی طرح تکبیر وغیرہ ذکر اللہ مؤثر ہیں اور حیوانات معینہ قابل اور متاثر اگر مؤثر کی جانب بالکل خالی ہو یا بجائے ذکر اللہ کچھ اور ہو جب بھی حلت متصور نہیں اور اگر قابل کی جانب سے بالکل خالی ہو یا سوائے معینہ کے اور کوئی حیوان ہوتب بھی حلت متصور نہیں۔
اب تکبیر کے موثر ہونے کی وجہ سمجھو جب حکمت الٰہی نے انسان کیلئے ان حیوانات کو جو زندگی میں اس کے مثل ہیں مباح کر دیا اور ان حیوانات پر اس کو قدرت عطا فرمائی تو واجب ہوا کہ ان حیوانات کی جان نکالنے کے وقت اس نعمت سے غافل نہ ہونے کی یہی صورت ہے کہ خدا تعالیٰ کا نام ان پر ذکر کریں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْاَنْعَامِ

ترجمہ: یعنی خدا تعالیٰ کا نام لیں اس چیز پر جو خدا تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی چار پایوں میں سے۔

شرح اس کی یہ ہے کہ غلہ پھل وغیرہ نباتات کا بنی آدم کیلئے ہونا تو ظاہر تھا کون نہیں جانتا کہ یہ چیزیں نہ ہوتیں تو بنی آدم کی زندگی محال تھی۔ البتہ حیوانات کا بنی آدم کیلئے ہونا اس وجہ سے مخفی تھا کہ مثل بنی آدم کے دست و پا وچشم گوش وغیرہ اعضاء وقویٰ ان کے حق میں بھی آلات انتفاع ہیں، پھر جیسے غلہ پھل وغیرہ نباتات بنی آدم کے کام آتے ہیں ایسے ہی حیوانات ہم سنگ بنی آدم نظر آتے ہیں۔ البتہ نباتات میں پیدا کرنے کے سوا اور اجازت کی ضرورت ہے ورنہ ایذاء ذبح جو اعلیٰ درجہ کی ایذا ہے کیونکہ قتل ہے اعلیٰ درجہ کا ظلم ہوگا اور کیوں نہ ہو ہماری تمہاری ملک برائے نام ملک ہے جب ہماری مملوکات میں تصرف بے اجازت ظلم سمجھا جائے تو خدا تعالیٰ کی مملوکات ومخلوقات میں تصرف بے اجازت ظلم کیوں نہ ہوگا اس لیے اس کی اجازت کی ضرورت پڑی۔

مگر ہر کس ناکس جانتا ہے کہ مالک کی اجازت اس وقت متصور ہے جب تصرف کرنے والا مالک کو مالک سمجھتا ہو اور اگر کسی اور کو سوائے مالک کے مالک سمجھے جب تو بجائے اجازت بحکم غیرت مالک ممانعت ضروری ہے۔ علی ہذا القیاس انعام کی توقع اسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ حقوق مالکیت اسی کو ادا کیے جائیں اور اگر بالفرض مالک کے حقوق کسی اور کو ادا کیے جائیں تو اس وقت انعام کی جگہ الٹا مستحق سزا ہوگا اس لیے بغرض رفع اشتباہ ذبح کے وقت مالکیت اور اجازت کا اعلان لازمی ہوگا۔

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اہل اسلام اور اہل کتاب کے مذہب میں وقت ذبح بسم اللہ کا کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ بالجملہ وقت ذبح خدا کا نام لینا موافق عقل ضروری ہے۔

مذبوح اور غیر مذبوح جانور میں کیا فرق ہے؟

اعتراض: (پنڈت دیانند کا اعتراض)

کوئی جانور خود بخود مرا ہو یا کسی کے مارنے سے دونوں حالتوں میں وہ

مردار ہے ہاں ان میں کچھ فرق بھی ہے تو موت میں کچھ فرق نہیں۔

جواب: ہمیں بھی سمجھ نہیں آتا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے کھانے میں کیا فرق ہے؟ جو آپ ستیارتھ پرکاش صفحہ ۳۵۶، سملاس (۱۰)، نمبر (۱۵) میں گوشت خور قوموں کے ہاتھ کا کھانے سے منع کرتے ہیں بلکہ شودروں (ہندوؤں کی نیچ قوم) کے ہاتھوں کا پکا ہوا بلکہ ان کے برتنوں میں بھی کھانے سے منع کیا گیا ہے ایسی وہم پرستی کی کیا وجہ ہے؟ خود مردہ جانور کے اندر تمام خون بند رہتا ہے اور مذبوح سے نکل جاتا ہے جس سے اس کی حرارت میں فرق آجاتا ہے یہی فرق کافی ہے۔

(حق پرکاش صفحہ ۸۸)

انسان کیلئے جانوروں کا گوشت کیوں حلال ہے؟

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

انسان کے لئے گوشت کھانا کیوں جائز ہوا؟

جواب: انسان کو مثل شیر، چیتا، بھیڑیا وغیرہ کچلیوں کا عطا ہونا اس جانب اشارہ ہے کہ اس کی اصلی غذا گوشت ہے اور اہل عقل کے نزدیک یہ بات کم از اجازت نہیں اور ظاہر ہے کہ انسان کو جتنی چیزیں دی گئی ہیں۔ آنکھ، کان جیسے دیکھنے سننے کیلئے ہیں اس لیے ان سے صاف عیاں ہے کہ یہ دیکھنے سننے کی اجازت ہے۔ ایسے ہی کچلیوں کو بھی خیال فرمالیجئے ہاں یہ بات مسلم ہے کہ سارے حیوانات یکساں نہیں ہر کسی کے گوشت میں جدا تاثیر ہے۔ لہذا جس جانور کا گوشت مفید ہوگا وہی جائز ہوگا جس جانور کا گوشت مضر ہوگا بقدر ضرورت ناجائز ہوگا۔ کیونکہ خداوند کریم کے امرونہی واجازت وممانعت آدمی کے نفع ونقصان کے لحاظ سے ہے۔ اپنے نفع ونقصان کے لحاظ سے نہیں۔ اس لئے سور اور شیر وغیرہ درندے بوجہ بداخلاقی کے قابل ممانعت ہوگئے اور انکا کھانا انسان پر حرام ہوگیا تاکہ ان کے کھانے سے مزاج میں

بدخلقی نہ پیدا ہو جائے جیسے گرم غذا سے گرمی اور سرد سے سردی پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی حیوانات کے کھانے سے ان کے مزاج کے موافق انسان میں اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

گوشت ترکاریاں کھانے سے انسان کے روحانی اخلاق کیسے پیدا ہوتے ہیں

ہم قبل ازیں لکھ چکے ہیں اور اس بات کو دوبارہ یاد دلاتے ہیں کہ غذا کا اثر جسم پر ویسا ہی ہوتا ہے جیسا غذا کا مزاج ہو۔ گرم غذا سے گرمی اور سرد سے سردی کا پیدا ہونا مسلّم ہے۔ اسی طرح حیوانات کے کھانے سے انسانی اوصاف کا تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ ہمیشہ سبزیاں اور غلہ جات کے کھانے سے انسان میں نرمی و حلم و رحم کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں اور گوشت کھانے سے اس میں شجاعت و جسارت و قوت غضبیہ کو تحریک ہوتی ہے چونکہ انسان جامع جلال و جمال ہے لہذا اس کیلئے سبزیاں اور گوشت دونوں قسم کی غذائیں حلال ہوئیں اگر انسان سے قوت غضبیہ بالکل مفقود ہو جائے تو انسانی صفت سے محروم رہ جائے اور اس کے بہت سے امور خلل پذیر ہو جائیں۔ کہیں گرمی کی ضرورت ہوتی ہے اور کہیں سردی کی حاجت، کبھی تلخ ادویہ مفید ہوتی ہیں اور گاہے شیریں سے حاجت برآری ہوتی ہے۔ جہاں تلخ ادویہ کے ساتھ معالجہ کرنا ہو وہاں شیریں اشیاء کا استعمال کرنا سراسر نقصان دہ غیر مفید ہوگا، کبھی غصے و غضب سے ہی کام نکلتا ہے اور نرمی سے بگڑتا ہے اور گاہے نرمی و رفق و حلم سے معاملہ سنورتا ہے اور غصہ و غضب سے خراب ہوتا ہے اسی طرح اغذیہ کو سمجھ لو اور مرچ جیسی تیز اور نیم جیسی تلخ اشیاء اور قند جیسی شیریں چیزوں کا انسان کیلئے پیدا ہونا اس جانب مشیر ہے کہ انسان کو ہمیشہ ایک ہی چیز کا استعمال کرنا مضر ہے۔ گاہے تلخ اور گاہے شیریں، گاہے غلہ و میوہ جات و سبزی اور گاہے گوشت، گاہے رحم اور گاہے غضب کا برتاؤ کرے اور اسی طریق سے عدالت قائم ہو سکتی ہے۔

مولانا محمد علی بچھرایونیؒ فرماتے ہیں:

حق تعالیٰ کی رحمت کے بارے میں اس سے کوئی نقص لازم نہیں آتا کہ اس

جہان میں قتل اور موت کے مختلف اسباب موجود ہیں کیونکہ حیات کے بعد اگر موت نہ ہوتی تو روئے زمین پر جانداروں کے لئے عرصہ حیات تنگ ہو جاتا۔ موت کی پیدائش میں اللہ نے بہت سی مصلحتیں رکھی ہیں۔ ان کا احاطہ کرنا ہمارے علم وفہم سے باہر ہے لیکن جتنا ہماری سمجھ میں آتا ہے حکماء اسلام اور ہندوؤں کی کتابوں میں جو کچھ موجود ہے اس سے بے دین لوگوں کا خاموش کرانا کافی ہے۔

زندہ رہنے کے لئے موت کو پیدا کرنا عین رحمت اور مصلحت ہے۔ معترض صاحب حیوانات کو ذبح کرنے، کھانے کے لئے اور دیگر عبادات کے لیے اپنے خیال کے مطابق ناجائز جانتے ہیں حالانکہ ان کا یہ اعتراض جہالت پر مبنی ہے اور خود ہندوؤں کے بید اور حکایات اور تاریخ سے خوب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کی کتاب ''مہابھارت'' کی تیسری فصل سانت پرب ۱۲ میں صاف لکھا ہے کہ۔

> حیوانات کا گوشت کہ جب اس کو ذبح کرتے وقت بید پڑھا جائے پاک ہے۔ جس نے بھی یہ گوشت کھایا وہ پھر بھی ترک حیوانات میں داخل رہا اوران حیوانات کا گوشت جس پر بید نہیں پڑھا گیا اس کا کھانا جائز نہیں۔

بید بباتگ دہل اعلان کر رہا ہے کہ وہ حیوانات جن کے دانت نیچے والے ہوں وہ کھانے کے لائق ہیں اور بیل اور گائے نہ کھائے جائیں ان کے دودھ سے نفع اٹھانا درست ہے۔

اسرب اپنکھد رکھ بید میں ہے:

> زمین اور پانی خوراک ہے اور خورندہ بھی ہے کیونکہ اس سے نباتات پیدا ہوتے ہیں اور حیوانات پیدا ہوتے ہیں جو خوندہ ہیں۔ غرض کہ نباتات کو حیوانات کھاتے ہیں اور حیوانات کو حیوانات بھی کھاتے ہیں جن حیوانات کے تلے کے دانت ہیں اوپر کے نہیں ہیں وہ خوراک ہیں جن حیوانات کے دونوں طرف دانت ہیں وہ خورندہ ہیں اور خورندہ سے

حیوانات کو شرف حاصل ہے۔

بید کی اس بات سے ثابت ہوا انسان ان حیوانات کی قسم سے ہے جن کے اوپر اور نیچے کے دانت ہیں مادہ گائے اور میشہ اور اونٹ وغیرہ صرف نیچے کے دانت رکھتے ہیں اور ان کا حکم نباتات اور پانی کی طرح کا ہے اور اس وجہ سے انسان کو ماکولات پر فضیلت حاصل ہے۔

اور اسی اپنکھد میں مذکور ہے:

کہ دیوتاؤں نے آقا سے کہا کہ ہمارے کھانے اور پینے کو مقرر کرو تا کہ ہم کھائیں اور پئیں پھر گائے کی صورت پیدا ہوئی اس سے کھانے اور پینے کا بہت سا نفع پیدا ہوا۔ پھر گھوڑا پیدا ہوا اور آقا نے کہا کہ ان میں حلول کر کے کھاؤ اور پیو تو یوتاؤں نے کہا کہ اگرچہ گائے سے کھانے اور پینے کا بہت فائدہ ہے اور گھوڑے سے سواری کا مگر یہ واسطے انسان کے ہیں ہمارے لائق نہیں ہیں ہمارے واسطے کچھ اور تجویز کرو۔

اور اپنکھد میں یہ بھی لکھا ہے:

کہ عوام اور ظاہر میں کوتاہ عقل اور بے علم اسمید جگ کی ترکیب یہ سمجھتے ہیں کہ گھوڑے کو آگ میں ڈال کر تھوتھنی سے جگ ہوتا ہے حالانکہ موجد کی یہ مراد نہیں ہے اور یہ ایک اصطلاحی لفظ ہے اس کے معنی بہت عمدہ ہیں باریک بین اور عمدہ رس فرماتے ہیں کہ گھوڑا اپنے جسم کو فرض کرو۔ انتہی

اس عبارت سے بھی جواز اور حیوانات کے ذبح ہونے کا پرانے زمانے سے رواج معلوم ہوتا ہے۔ (سوط اللہ الجبارج اص ۲۰۔۳۱)

جیسا کہ

ہندو اور مسلمان کا مناظرہ:

حکایت:

ایک دن ایک برہمن نے مسلمان کے ساتھ گوشت کھانے اور نہ کھانے کے بارے میں مناظرہ کیا چنانچہ ان کا مناظرہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مسلمان نے کہا:

مہراج آپ کے بڑے جن کے نطفہ سے آپ پیدا ہوئے ہیں سب گوشت کھاتے چلے آئے ہیں چند روز سے یہ امر معیوب سمجھنے لگے ہیں اور آپ کی کتاب کی رو سے بھی گوشت کھانا کچھ معیوب نہیں۔

برہمن نے جواب دیا ہاں چھتری اور شودر گوشت کھاتے تھے مگر برہمن نہیں کھاتے تھے مسلمان نے کہا۔ مہاراج حیوانات تو درکنار برہمن تو آدمی کے آدمی نگل کر ایسے ہضم کر جاتے تھے کہ ڈکار بھی نہیں لیتے تھے صرف تبخیر اس کی معدے سے مقعد کی راہ سے با آواز بلند نکال دیتے تھے پھر مسلمان نے قصہء الل و سہیل د بانات مہابھارت کی کتاب سے بن پرب سے نقل کیا اور سنایا۔

اس قصے کو سننے کے بعد مسلمان کی بات سچی ثابت ہوگئی اور اس کا دعویٰ بھی ثابت ہوا۔

چنانچہ وہ قصہ مہابھارت سے اس جگہ نقل کرنا مناسب ہے کہ تینوں راجے سہیل برہمن نر بذ کی شکل میں لا کر ذبح کر دیا اور اس کے گوشت سے کھانا پکایا ان تینوں راجوں نے سنا کہ بانات کو ذبح کر دیا ہے اور وہ ان راجوں کو کھلانا چاہتا ہے چنانچہ کھانا پک گیا اور کھانے کی بہت چاہت ہوئی او جب سہیل کو یہ قصہ سنایا گیا کہ الل نے اپنے بھائی بانات کو ذبح کر کے گوشت پکایا ہے تو سہیل نے کہا کہ تم کوئی خوف نہ کرو بانات کا گوشت میں کھاؤں گا۔ چنانچہ الل کھانا تیار کر کے لے آیا اور بانات کا گوشت پکا ہوا تھا وہ سہیل کے سامنے رکھ دیا۔ سہیل نے وہ سارا گوشت کھا لیا اور فارغ ہوا تو الل نے فریاد کر کے بنات کو پکارا اسی وقت سہیل سے بادلوں کی گرج کی سی آواز نکلی۔

الل نے پھر فریاد کر کے بانات کو پکارا کہ بانات باہر آ جا۔ سہیل ہنس پڑا اور کہنے لگا بانات کے نکلنے کی جگہ نہیں رہی میرا معدہ اس کو ہضم کر چکا ہے۔

گوشت خوری کے بہت سے حوالے سوط اللہ الجبار کے مصنف نے نقل کئے ہیں۔ ہم نے مختصراً چند حوالے ذکر کر دیئے ہیں۔ (سوط اللہ الجبار ص ۳۱۔۳۲۔۳۵)

حاجی عبدالرحمٰن کی کرامت:

حکایت:

اب آخر میں ایک حکایت بھی نقل کی جاتی ہے جس کو میں نے حضرت مفتی جمیل احمد تھانوی صاحبؒ سے سنا تھا انہوں نے بیان کیا کہ

ہندوستان میں ایک حاجی عبدالرحمٰن صاحب تھے اللہ نے ان میں یہ خوبی رکھی تھی کہ اگر تانگے میں انکے ساتھ کوئی ہندو بیٹھ گیا تھا جو جب وہ اترتا تو کلمہ پڑھ کر اترتا تھا۔ چنانچہ ایک ہندو تانگے میں سوار ہوا اور اترنے سے پہلے کلمہ پڑھ کر اترا۔ جب وہ اپنے گاؤں میں گیا تو وہاں کے ہندوؤں نے بہت شور کیا اور مناظرے کا چیلنج ہو گیا حاجی عبدالرحمٰن صاحب بھی چند لوگوں کے ہمراہ پہنچ گئے ہندوؤں نے ان کے ساتھ یہ شرط رکھی کہ اگر مناظرے میں مسلمان ہار گئے تو سب مسلمانوں کو ہندو بننا پڑے گا اور اگر مسلمان جیت گئے تو ہم سب ہندو مسلمان ہو جائیں گے۔ جب مناظرہ شروع ہوا تو ہندو پنڈت نے اعتراض کیا کہ مسلمان جانوروں کو ذبح کر کے ان کا گوشت کھا جاتے ہیں مسلمان بھی ظالم ہیں ان کا مذہب بھی ظالم ہے۔ اور جو مذہب ظالم ہو وہ سچا نہیں ہو سکتا لہذا مسلمان بھی جھوٹے اور اسلام بھی غلط ہے اور ہندوؤں کے مذہب میں ایسی خوبی ہے کہ یہ جانوروں کا خیال کرتے ہیں ان کو اذیت بھی نہیں پہنچاتے اور ان کو ذبح کر کے کھاتے بھی نہیں ہیں تو حاجی عبدالرحمٰن نے جواب میں سب ہندوؤں کو مخاطب کر کے پوچھا یہ بتاؤ کے مہادیو کی سواری کیا تھی؟ سب ہندوؤں نے کہا کہ

نیل کنٹھ فرمایا کہ نیل کنٹھ کی خوراک کیا ہے تو ہندوؤں نے بتایا کہ وہ شکار کر کے کھاتا ہے تو فرمایا کہ اگر جانوروں کا شکار کر کے کھانا درست نہ ہوتا تو مہادیو جی ایسے جانور کی سواری کو کیوں پسند کرتے جو شکار کر کے کھاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خوراک کے لئے جانور کا شکار کرنا اور ان کو ذبح کرنا مہادیو جی کے نزدیک صحیح ہے۔

چنانچہ حاجی صاحب کے اس جواب پر ہندوؤں سے کوئی جواب نہ بن سکا اور ہندوؤں کو مسلمان ہونا پڑا۔ (امداداللہ انور)

مفید جانوروں کے کھانے اور خونخواروں کے نہ کھانے کی وجہ؟

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

مفید مفید جانور تو کھالیتے ہو اور خونخوار درندوں کو حرام سمجھتے ہو؟

جواب: معترض صاحب اگر طبی اور ڈاکٹری اصول کو ملحوظ خاطر رکھتے تو کبھی یہ اعتراض منہ پر نہ لاتے علم طب کی چھوٹی چھوٹی کتابوں میں یہ بات ملتی ہے کہ جو غذا آدمی کھاتا ہے وہ جزو بدن بن کر اپنا اثر کرتی ہے۔ اس طبی تحقیق سے بڑھ کر شرعی تحقیق ہے کیونکہ طب تو صرف جسم کی محافظ ہے مگر شریعت جسم اور روح دونوں کی محافظ ہے لیکن ان دونوں حفاظتوں میں روح کی حفاظت اس کی نظر میں مقدم ہے جسم کی حفاظت کے معنی تو سب جانتے ہیں کہ ظاہری تکالیف اور اذیتوں سے محفوظ رکھا جائے ۔روح کی حفاظت کے معنی یہ ہیں کہ اسے بداخلاقیوں سے بچایا جائے جو اسکے لئے دوسری زندگی میں موجب تباہی ہوں، پس جو چیزیں یا جانور شریعت نے حرام کیے ہوئے ہیں وہ اسی اصول کے لحاظ سے کیے ہیں ان درندے جانوروں کو تو آپ بھی خونخوار مانتے ہیں جن کے کھانے سے آدمی واقعی پورا نہیں تو نیم خونخوار ہو جائے گا۔ کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ چوری کے مال سے پوری کچوری یا بھاجی خرید کی ہوئی کیوں حرام ہے بظاہر جسمانی نقصان تو اس میں کوئی نظر نہیں آتا مگر چونکہ دوسری زندگی میں اس

کا نقصان ظاہر ہوگا اس لیے حرام ہے۔ پس اسی طرح تمام محرمات شرعیہ کو سمجھئے کہ جو چیز انسان کی دوسری زندگی یا اسی زندگی میں اس کے اخلاق پر برا اثر کرتی ہو اس کو شریعت نے حرام کیا۔ آپ لوگ اخلاقی اثر کی تفصیل سے واقف نہ ہونگے اخلاقی اثر کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ اس کام کے کرتے وقت آدمی کوئی نامناسب حرکت کر گزرتا ہے جیسا شرابی حالت مستی میں ناجائز حرکات کیا کرتا ہے ایک اخلاقی اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کام کے کرنے سے یا اس چیز کے کھانے سے آئندہ کو اس کی روح پر برا اثر پہنچتا ہے کہ نیک کاموں کی طرف اس کی طبیعت نہیں جھکتی پھر اگر وہ اس کا جلدی سے علاج نہ کرے تو آہستہ آہستہ اس کی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ بالکل مسلول یا مدقوق کی طرح لاعلاج ہو جاتا ہے پھر اسے کسی نیک کام میں توفیق نہیں ملتی۔ قرآن مجید سے اس دعوے کا ثبوت چاہو تو ہر ایک سورت اور سپارے سے مل سکتا ہے۔

ایک ہی آیت سنو! فَلَمَّا زَاغُوٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ. (یعنی جب وہ لوگ ٹیڑھے ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا) اور اگر اپنے سوامی جی کے کلام سے سند چاہو تو سنو! سوامی جی بودھوں کے حق میں کیا لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> انہوں (بودھ مت والو) نے کس درجہ اپنی جہالت میں ترقی کی ہے جس کی نظیر ان کے سوائے دوسری ہو ہی نہیں ہوسکتی یقین تو یہی ہے کہ وید اور ایشور کی مخالفت کرنے کا ان کو یہی نتیجہ ملا ہے۔

(ستیارتھ صفحہ ۵۴۱، سملاس ۱۲، نمبر ۱۷)

اس عبارت سے صاف معلوم ہوا ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب ہو جاتا ہے پس جس درجہ میں کوئی غذا روحانی طور پر برا اثر کرنے والی ہوتی ہے اسی انداز سے شریعت میں منع ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام میں بعض چیزیں سخت حرام ہیں اور بعض کس قدر کم جن کو مکروہ کہتے ہیں۔ درندے جانوروں کی حرمت بھی اسی اصول پر مبنی ہے غرض یہ ایک اصول ہے کہ تمام جزئیات اسی سے متفرع (نکلتے) ہیں۔

ہاں اس بات کی تشخیص کرنا کہ کونسی چیز بداخلاقی اور روحانی زندگی میں برا اثر پیدا کرنے والی ہے اور کونسی چیز نہیں۔ ہر ایک کا کام نہیں بلکہ الہامیوں کا منصب ہے جس سے آپ کو بھی انکار نہیں ہوگا کیونکہ الہام کی ضرورت تو آپ لوگ بھی مانتے ہیں۔
(حق پرکاش صفحہ ۲۹)

جب غیر مذبوح جانور کا خون گوشت میں جذب ہو جاتا ہے تو حرمت کی کیا وجہ؟

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

جب غیر مذبوح جانور کا خون گوشت میں جذب ہو کر گوشت ہی بن جاتا ہے تو پھر اس کی حرمت کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اس کی تحقیق کہ آیا بعد مرگ خون گوشت میں جذب ہو جاتا ہے یا وہ بعد استحالہ کے گوشت بن جاتا ہے یہ ہے کہ مستحیل (یک جان) ہونے کیلئے تو قوت ہاضمہ کی اور قوت محیلہ کی یعنی اس قوت کی جس کا کام یہ ہے کہ ایک شئے کو دوسرے کی طرف مستحیل کر دے ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ بدن کی سب قوتیں جیسے قوت باصرہ اور سب قوائے حیوانی حیات ہی کے ساتھ ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اعضائے حیوانی مثل آنکھ، کان وغیرہ ان قویٰ کیلئے ایسے ہیں جیسے آئینہ نور کیلئے یعنی قابل اور مستفد سو جیسے اصل نور آئینہ میں نہیں ہوتا بلکہ آفتاب میں ہوتا ہے ایسے ہی اصل قوائے حیوانی نفوس حیوانی میں ہوتے ہیں اعضاء میں نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ جیسے آئینہ بے امدادِ آفتاب نور کے اعتبار سے بیکار ہیں اس صورت میں بعد مرگ استحالہ ممکن نہیں۔ نہ وہ جذب ہی ہوگا جو بعد مرگ کاٹو تو خون نہیں نکلتا اور جذب ہوا تو پھر ناپاکی یقینی ہے۔
(احکام اسلام عقل کی نظر میں صفحہ ۲۲۶)

بارہواں باب

جہادِ اسلام کے متعلق اعتراضات کے جوابات

جہاد کا حکم کیوں؟

سب لوگوں کو کیوں دین اسلام پر پیدا نہ کیا

اعتراض: (بیں برن لالہ اندر من ہندو کا اعتراض)

قطع نظر اس کے کہ اگر مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق خدا تعالی قادر مطلب ہوتا تو وہ دین اسلام کو ویسے ہی رواج دے دیتا جہاد کا حکم نہ فرماتا تا کہ جانداروں کو اذیت نہ ہوتی اور سب لوگ ایک ہی دین پر متفق ہوتے۔

جواب: خدا تعالی کا عالم اسباب میں اچھے اور برے لوگوں کو پیدا کرنا اور بروں کو نیک لوگوں کے مقابلے میں قوت دینا بھی حکمت کاملہ کے مقتضی کے مطابق ہے اور قدرت کاملہ کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ایک قدرت ہے۔

اگر معترض اپنے مذہب کی کتابوں پر نظر رکھتا تو ایسی بے کار بات نہ کہتا۔ اگر شرح منشی الکھدھاری کا ادھیائے نہم گیتا دیکھتا تو اس پر خطر راستے میں قدم نہ رکھتا۔

بھاگوت کی آٹھویں اسکندھ میں لکھا ہے کہ سر یعنی اخیار اور اسر یعنی اشرار کی ماں دو ہیں اور باپ ایک ہیں اگر چور جہاں میں نہ ہوتے اور نہ رہتے تو چوکیدار نوکر کون رکھتا۔ انتہی مختصراً۔

گیتا کے گیارھویں ادھیاء میں لکھا ہے کہ وقت ہنگامہء کارزار درکوروان و پانڈوان کرشن بہ ارجن گفت نہیں قاتل ہوں واسطے قتل خلا کے مجسم ہوا ہوں پس قتل میں خلقت کے مشغول ہوں جتنے لشکری میدان میں ہیں منجملہ ان کے سوائے تیرے باقی نہ رہے گا تو دونوں ہاتھوں سے تیر لگا اور دیر نہ کر اور وہ کام کر جس سے تیری تعریف ہو۔ انتہی

اور مذکورہ کتاب کے چوتھے ادھیاء میں لکھا ہے

"واسطے مدد دینے نیکوں کے اور استیصال بدوں کے پیدا ہوا ہوں۔"

اور تیسرے ادھیاء میں ارجن کو حکم کرتے ہوئے لکھا ہے:

جدہ کرنا راج نیت ہے اس سے راجوں کو فضیلت ہوتی ہے چونکہ تو اس کرم کی جوگ ہے پس تجھے لازم ہے کہ بدکار ظالموں کو سزا دے۔ انتہی

ان حوالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہندو مذہب میں بھی دشمنوں سے لڑنے کا حکم دیا ہے۔ ہندو مذہب کے اوتار اشرار کے ساتھ لڑتے رہے ہیں اس لئے اسلام اور انبیاء کرام پر اعتراض نہایت غلط ہے۔ (سوط اللہ الجبار ج ا ص ۱۰)

کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے؟

اعتراض: (کفار کا اعتراض)

اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے۔

جواب (۱): اگر تلوار کے زور سے لوگ اسلام لاتے تو ان کے قلوب پر تلوار کا اثر کیسے ہو جاتا اور دل پر اثر ہو جانے کی دلیل یہ ہے کہ ان کے اخلاق و عادات نہایت پاکیزہ اور شریعت مطہرہ کی تعلیم کے بالکل مطابق ہو گئے تھے۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زرہ ان کی خلافت کے وقت چوری ہو گئی تھی، ایک یہودی کے پاس ملی، آپ نے دیکھ کر پہچان لیا اور فرمایا کہ یہ میری زرہ ہے، یہودی نے کہا کہ گواہ لاؤ، اللہ اکبر، کس قدر اسلامی تعلیم کا نمونہ اپنے کو بنا لیا تھا کہ جہاں رعایا کو زبان سے آزاد کیا عمل سے بھی دکھلا دیا۔ کہ ایک یہودی کی یہ جرأت ہے کہ صاحب سلطنت سے کہتا ہے کہ گواہ لاؤ، پس ایک تو اس کو قومی ذلت اور پھر یہ کہ آپ ہی کی قلمرو کا رہنے والا، مگر اس پر بھی یہ جرأت۔

چنانچہ حضرت شریح رضی اللہ تعالی عنہ کے ہاں جو اس وقت کے قاضی تھے اور

حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے وقت سے اسی عہدہ پر چلے آتے تھے جاکر نالش دائر کی۔ دونوں مدعی مدعا علیہ بن کر مساوات کے ساتھ عدالت میں گئے۔ حضرت شریح رضی اللہ تعالی عنہ نے موافق قاعدہ شریعت کے پوچھنا شروع کیا۔ یہ نہیں کہ امیر المومنین ؓ کے آنے سے ہل چل پڑ جائے، غرض نہایت اطمینان سے اس یہودی سے پوچھا کہ کیا یہ زرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہے۔ اس نے انکار کیا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ گواہ لائیے۔ اللہ اکبر! ذرا آزادی دیکھئے کہ ایک قاضی سلطنت خود امیر المومنین سے گواہ طلب کر رہے ہیں، اور امیر المومنین بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ، جن پر احتمال دعویٰ خلاف واقع کا ہو ہی نہیں سکتا مگر یہ محض ضابطہ کی بدولت تھا۔ واللہ جن لوگوں نے تمدن سیکھا اسلام سے سیکھا اور پھر بھی اسلام کے برابر عمل نہ کر سکے۔ غرض حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ دو گواہ لائے، ایک امام حسن رضی اللہ تعالی عنہ اور ایک اپنا آزاد کردہ غلام جس کا نام قنبر تھا۔ حضرت شریح رضی اللہ تعالی عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ میں یہ مسئلہ مختلف فیہ تھا۔ کہ حضرت شریح رضی اللہ تعالی عنہ بیٹے کی گواہی باپ کے لئے جائز نہ سمجھتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کے نزدیک جائز تھی اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ تعالی عنہ کو پیش کر دیا۔

حضرت شریح رضی اللہ تعالی عنہ اس کو مانتے نہیں تھے۔ حضرت شریح رضی اللہ تعالی عنہ نے اپنے اجتہاد پر عمل کیا اور امام حسن رضی اللہ تعالی عنہ کی گواہی نہیں مانی اور حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سے کہا کہ غلام تو چونکہ آزاد ہو چکا اس کی گواہی تو مقبول ہے۔ مگر بجائے امام حسن رضی اللہ تعالی عنہ کے اور کوئی گواہ لائیے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے کہا کہ اور تو کوئی گواہ نہیں ہے۔ آخر حضرت شریح رضی اللہ تعالی عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کا دعویٰ خارج کر دیا۔ اگر آج کل کے معتقد ہوتے تو حضرت شریح رضی اللہ تعالی عنہ سے لڑ مرتے لیکن حضرت شریح رضی اللہ تعالی عنہ اور

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی طرح مذہب فروش نہ تھے۔ وہ تو مذہب کے ہر امر پر جان فدا کرتے تھے، اگر حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا جاتا تو وہ قسم کھا کر کہہ سکتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سچے ہیں۔ لیکن چونکہ ضابطہ شریعت اجازت نہیں دیتا تھا اس لئے آپ نے اپنی عقیدت پر کارروائی نہیں کی۔ آخر باہر آکر یہودی نے دیکھا کہ ان پر تو ذرا بھی ناگواری کا اثر نہیں ہوا باوجودیکہ آپ اسد اللہ ہیں اور برسرِ حکومت ہیں۔ تو کس چیز نے ان کو برہم نہیں ہونے دیا۔ غور کر کے کہا کہ حقیقت میں اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کا مذہب بالکل سچا ہے یہ اثر اسی کا ہے۔ لیجئے یہ زرہ آپ ہی کی ہے اور میں مسلمان ہوتا ہوں اور کہتا ہوں: ''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.'' آپ نے فرمایا کہ ہم نے یہ زرہ تجھ ہی کو دی، غرض وہ یہودی مسلمان ہو گیا اور آپ ہی کے ساتھ رہا۔ حتیٰ کہ ایک لڑائی میں شہید ہو گیا۔ اب بتلائیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار کو سر پر دیکھ کر مسلمان ہوا یا اس کو نیام میں دیکھ کر۔ (وعظ ازالۃ الغفلۃ ص۴)

جواب(۲): اہل یورپ کا خیال یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کے زور سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ اور اس کے لئے دلیل میں وہ واقعاتِ جنگ پیش کرتے ہیں کہ سلاطین نے کس قدر خونریزیاں کی ہیں، میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ تو کوئی عاقل نہیں کہہ سکتا کہ جنگ مطلقاً تمدن کے خلاف ہے، آج متمدن قومیں بھی ضرورت کے موقع پر جنگ کرتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ بروقتِ ضرورت لڑائی کرنا تہذیب و تمدن کے اعتبار سے جائز ہے۔ بس اب میں ظالم سلاطین کی تو طرف داری کرتا نہیں البتہ خلفائے راشدین کی بابت دعویٰ سے کہتا ہوں کہ انہوں نے ضعیف بنیاد پر کبھی جنگ نہیں کی۔ کسی قوی سبب کی بناء پر وہ لڑائی کرتے تھے۔

اور لڑائی کے متعلق اسلامی قانون اگر مخالفین کی نظر سے گزرتا تو کبھی یہ لفظ زبان سے نہ نکالتے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے، قوانینِ جنگ اسلام نے بہت سے

بتلائے ہیں مگر میں اس وقت ایک مختصر قانون بیان کرتا ہوں۔ اسلام کا مسئلہ ہے اور خلفائے راشدین کا اس پر ہمیشہ عملدرآمد رہا کہ اگر کوئی شخص مقابلہ کے وقت تمہارے باپ کو تمہارے بیٹے کو اور بھائی کو غرض سب متعلقین کو قتل کر ڈالے اور عرصہ تک خونریزی کرتا رہے، پھر کسی وقت قابو میں آجائے اور تم اس سے بدلہ لینا چاہو اور وہ زبان سے ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کہہ دے تو حکم ہوتا ہے کہ اس کو فوراً چھوڑ دو اگر چہ تم کو یقین کامل ہو کہ اس نے جان کے خوف سے کہا ہے اور دل سے اسلام نہیں لایا۔ تب بھی فوراً تلوار ہٹالو، ورنہ اگر اس کو مارا گیا تو تم جہنم میں جاؤ گے۔ اگر چہ یہ بھی خطرہ ہو کہ یہ اس وقت جان بچا کر پھر تم کو قتل کرے گا جو کچھ چاہے ہو اب اس کا مارنا ہرگز جائز نہیں۔ تو جب مذہب نے اتنی بڑی سپر دوسروں کے ہاتھوں میں دیدی ہو اب بھی اس کے بارہ میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ بزور شمشیر پھیلا ہے اور اس قانون پر ہمارے سلف صالحین پوری طرح عمل کرتے تھے۔

حکایت:

ہرمزان نے مسلمانوں کو بہت سی ایذائیں پہنچائی تھیں۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گرفتار کر کے لایا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس پر اسلام پیش کیا۔ مگر اس نے نہ مانا آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ اس نے ایک چال چلی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا کہ آپ مجھے قتل تو کرتے ہی ہیں تھوڑا پانی منگا دیجئے، آپ نے پانی منگایا جب پانی آیا تو اس نے کہا کہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ میں پانی نہ پی چکوں اور جلاد مجھ پر تلوار چلا دے، آپ نے فرمایا نہیں جب تک تم پانی نہ پی چکو گے قتل نہ کئے جاؤ گے یہ سن کر اس نے پانی فوراً زمین پر پھینک دیا اور کہا کہ اب تم مجھ کو قتل نہیں کر سکتے کیونکہ اس پانی کا پینا اب ممکن نہیں اور اس کے پینے تک مجھ کو امن تھا۔ آپ نے اس کو آزاد کر دیا، ہرمزان کو اپنی اس چال پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ خوب جانتا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (کے اس فرمان پر کہ تم جب تک پانی نہ

پی چکو گے قتل نہ کئے جاؤ گے) ہرگز قتل نہ کریں گے۔ یہ واقعہ دیکھ کر ہرمزان فوراً اسلام سے آیا کہ واقعی یہ دین برحق ہے جس میں مخالف کے ساتھ بھی اتنا اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ اس پر خلفاء نے اس طرح پابندی کی ہے کہ ان کی نظیر آج کوئی دکھا نہیں سکتا۔ ہاں پچھلے بادشاہوں کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔ اگر انہوں نے ظلم کیا ہے تو وہ بھگتیں گے۔ ہمارے اسلاف نے ان قوانین پر پورا عمل کیا اور ان کو ترقی و عروج بھی ایسا نصیب ہوا جو کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ صحابہؓ کے طرز کا دوسری قوموں پر ایسا اثر تھا کہ بہت لوگ جاسوس بن کر آئے مگر ان حضرات کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔ (وعظ شعب الایمان ۱۱۴)

جواب (۲): لوگ اسلام کو بدنام کرتے ہیں کہ وہ تلوار سے پھیلا ہے۔ واللہ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر مسلمان تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان کیا کرتے تو آج ہندوستان میں جہاں اسلامی سلطنت چھ سو برس تک رہی ایک بھی ہندو باقی نہ رہتا۔

مولانا محمد قاسمؒ کا جواب اس اعتراض کے متعلق یہ ہے کہ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو یہ بتلاؤ کہ وہ شمشیر زن کہاں سے آئے تھے کیونکہ تلوار خود تو نہیں چل سکتی تو جن لوگوں نے سب سے پہلے تلوار چلائی ہے یقیناً وہ تو تلوار سے مسلمان نہیں ہوئے تھے کیونکہ ان سے پہلے تلوار چلانے والا کوئی تھا ہی نہیں، تو ثابت ہو گیا کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ جہاد مدینہ منورہ میں آکر شروع ہوا اور اہل مدینہ زیادہ تر رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔ آخر ان کو کس تلوار نے مسلمان کیا تھا۔ اور مکہ معظمہ میں جو کوئی سو آدمی مسلمان ہوئے تھے اور کفار کے ہاتھ سے اذیتیں برداشت کرتے رہے وہ کس تلوار سے مسلمان ہوئے تھے (پھر ہجرت مدینہ منورہ سے پہلے بعض صحابہؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی ہے اور وہاں کفارِ قریش کے ساتھ مسلمانوں کا مناظرہ ہوا۔ اور نجاشی شاہِ

حبشہ نے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی زبان سے قرآن شریف سن کر بے تحاشا رونا شروع کیا اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور قرآن شریف کی حقانیت کی گواہی دی اور اسلام قبول کیا اس پر کس کی تلوار چلی تھی، اسی طرح صدہا واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام محض اپنی حقانیت سے پھیلا ہے۔ خصوصاً عرب کی قوم جو جنگ جوئی میں شہرہ آفاق ہے وہ کبھی اور کسی طرح تلوار کے خوف سے اسلام قبول نہ کرسکتی تھی ان کے نزدیک لڑمرنا معمولی بات تھی مگر دب کر دین کا بدلنا سخت عیب تھا۔ وہ ہرگز تلوار کے خوف سے اسلام نہیں لاسکتے تھے۔ (جامع)

جہاد اسلام پھیلانے کیلئے نہیں اسلام کی حفاظت کیلئے ہے

اس پر شاید یہ سوال ہو کہ پھر جہاد کس لئے شروع ہوا تو خوب سمجھ لو کہ جہاد اسلام کی حفاظت کے لئے شروع ہوا ہے نہ کہ اشاعتِ اسلام کے لئے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے، لوگ اس فرق کے نہ سمجھنے کی وجہ سے غلطی میں پڑے ہوئے ہیں جہاد کی مثال آپریشن کی سی ہے کیونکہ مادے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک متعدی اور ایک غیر معتدی، جو مادہ غیر متعدی ہوتا ہے اس کو تو محللات اورام کے ذریعہ دبا دیا جاتا ہے۔ کوئی مرہم لگا دیا، مالش کردی، جس سے وہ دب گیا، اور متعدی مادہ کے لئے آپریشن کیا جاتا ہے۔ اس کو چیر کر نکال دیا جاتا ہے، اسی طرح دشمنانِ اسلام دو طرح کے ہیں۔ بعض تو وہ جن سے صلح کرلینی مناسب ہوتی ہے وہ صلح کر کے مسلمانوں کو ستانا چھوڑ دیتے ہیں ان سے تو صلح و مصالحت کرلی جاتی ہے۔ اور بعض ایسے موذی و مفسد ہوتے ہیں کہ صلح پر آمادہ نہیں ہوتے، یہ مادہ متعدیہ ہے ان کے واسطے آپریشن کی ضرورت ہے۔ اسی کا نام ”جہاد“ ہے۔ پس جہاد سے لوگوں کو مسلمان بنانا مقصود نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی حفاظت مقصود ہے۔

لوگ عالمگیرؒ کو بدنام کرتے ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کیا

ہے یہ بالکل غلط ہے، عالمگیر شریعت کے پابند تھے، بارہ ہزار متن احادیث کے حافظ تھے۔ قرآن شریف لکھ لکھ کر ہدیہ کر کے گزارہ کرتے تھے۔ اپنے خرچ میں خزانہ کا ایک پیسہ نہ لاتے تھے۔ ان کے سامنے **لا اکراہ فی الدین** کا حکم موجود تھا وہ اس کے خلاف کیونکر کر سکتے تھے۔

یہ تو پہلے واقعات تھے، ان سے قطع نظر کر کے میں پوچھتا ہوں کہ اچھا اس وقت جو لوگ ہندوستان میں اسلام لاتے ہیں وہ کیوں مسلمان ہوتے ہیں۔ ان پر کونسی تلوار کا زور ہے یقیناً اس وقت کسی طرح بھی ان پر زور نہیں ہے بلکہ ہر طرح آزادی ہے۔ نہ ہم ان کو کسی طرح کی طمع دلاتے ہیں اور مسلمانوں کے پاس اتنا مال ہی نہیں جو وہ طمع دلا کر کسی کو مسلمان کریں۔ بلکہ حالت یہ ہے کہ آج کوئی نو مسلم اسلام لایا تو کل کو اس سے بھی دینی کاموں کے لئے چندہ مانگتے ہیں۔ اور اگر کوئی اسلام لاتے وقت ہم سے روپے کی درخواست کرے تو ہم صاف کہہ دیتے ہیں کہ تم اپنی نجات کے واسطے اسلام لاتے ہو تو لاؤ ورنہ ہم کو لالچ کے ساتھ مسلمان کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ جو دولت ہم تم کو دے رہے ہیں اس کے مقابلہ میں اگر تم خود ہم کو نذرانہ دو تو بجا ہے۔ لیکن باوجود اس آزادی اور استغناء کے پھر بھی لوگ اسلام لاتے ہیں اور لا رہے ہیں اور اسلام لاتے ہی ان کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ گویا بچھڑا ہوا محبوب ان کو مل گیا ہے۔

ایک ہندو اسلام لانے کے بعد خدا کی محبت اور اس کی یاد میں اس قدر روتا تھا کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اور کہتا تھا کہ مجھ کو تو اب معلوم ہوا ہے کہ خدا کس کو کہتے ہیں، غرض اس کی عجیب حالت تھی۔ (وعظ محاسن الا اسلام ص ۷۸)

اور آج دنیا میں مسلمان جس طرح سے کفار کے ہاتھوں امریکی جنگوں میں قتل ہو رہے ہیں ستائے جا رہے ہیں ان کو دیکھ کر اور دین کی باتیں انٹرنیٹ سے حاصل کر کے اور تبلیغی جماعت کی تبلیغ سے لاکھوں کروڑوں عیسائی، ہندو، سکھ وغیرہ مسلمان ہو رہے ہیں کیا یہ سب تلوار کے زور سے ہو رہے ہیں جیسا اب نہیں تو پہلے بھی نہیں تھا۔

ایسا اعتراض صرف منکر اسلام کو بدنام کرنے کے لئے کرتے ہیں۔

عیسائی مذہب کی کتب سے جہاد کا ثبوت

باقی رہا جہاد کا مسئلہ تو اس کی بابت ملاحظہ فرمائیے کہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جہاد کا حکم ہوا۔ (استثناء ۷:۱ تا ۵، ۲۰:۱ تا ۲۰)

چوتھی آیت اسی باب کی ملاحظہ فرمائیے کہ:

''کیونکہ خداوند تمہارے ساتھ ساتھ چلتا ہے تا کہ تم کو بچانے کو تمہاری طرف سے تمہارے دشمنوں سے جنگ کرے۔''

غور فرمائیے کہ یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ خدا تعالیٰ خود میدان میں آیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے جنگی کارنامے ''کتاب یشوع'' میں ملاحظہ فرمائیے پھر ان کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کے جنگی معرکے ''۲۔ سموئیل'' میں درج ہیں۔ اور جناب پولوس ان کے کارنامے بڑے فخر سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اب اور کیا کہوں؟ اتنی فرصت کہاں کہ جدعون اور برق اور سمسون اور افتاہ اور داؤد اور سموئیل اور نبیوں کا احوال بیان کروں۔ انہوں نے ایمان ہی کے سبب سے سلطنتوں کو مغلوب کیا۔ راستبازی کے کام کئے۔ وعدہ کی ہوئی چیزوں کو حاصل کیا۔ شیروں کے منہ بند کئے۔ آگ کی تیزی کو بجھایا۔ تلوار کی دھار سے بچ نکلے، کمزوری میں زور آور ہوئے، لڑائی میں بہادر بنے غیروں کی فوجوں کو بھگا دیا۔ (عبرانیوں ۱۱:۳۲ تا ۳۴)

بائبل کے ان مندرجہ بالا مقامات کی وجہ سے بھی اسلام کے اس مسئلہ پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

اس سوال کا کیا جواب ہے؟ کہ ایک دہریہ ملک کی حکومت جو کہ شریر بھی ہے اس

کے پڑوس میں ایک مسیحی ملک ہے۔ یہ دہریہ اور شریر حکمران ٹولہ اپنے پڑوسی مسیحی ملک پر حملہ کر دیتا ہے۔ اب اس مسیحی حکومت کو کیا پہلو اختیار کرنا چاہئے؟ جبکہ حضرت عیسیٰؑ کا ایسے موقع پر یہ فرمان مبارک ہے کہ:

"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے" اور اگر کوئی تجھ سے نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔"

(متی ۵:۳۸ تا ۴۱)

مولانا بشیر احمد حسینی لکھتے ہیں:

جہاد کا مسئلہ: جس مسئلہ کی وجہ سے اہل اسلام پر اعتراض کیا گیا ہے۔ وہ زیادہ سخت انداز سے خود عیسائیوں کی مذہبی کتاب بائبل میں بھی موجود ہے۔

حوالے ملاحظہ فرمائیے:

۱) جب خداوند تیرا خدا تجھ کو اس ملک میں جس پر قبضہ کرنے کے لئے تو جا رہا ہے پہنچا دے اور تیرے آگے سے ان بہت سی قوموں کو یعنی حتیوں اور جرجاسیوں اور اموریوں اور کنعانیوں اور فرزیوں اور حویوں اور یبوسیوں کو جو ساتوں قومیں تجھ سے بڑی اور زور آور ہیں نکال دے۔ اور جب خداوند تیرا خدا ان کو تیرے آگے شکست دلائے اور تو ان کو مار لے تو ان کو بالکل نابود کر ڈالنا۔ تو ان سے کوئی عہد نہ باندھنا۔ اور نہ ان پر رحم کرنا۔ (استثناء ۷:۱ تا ۲)

۲) جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے تو پہلے اسے صلح کا پیغام دینا۔ اور اگر وہ تجھ کو صلح کا جواب دے اور اپنے پھاٹک تیرے لئے کھول دے تو وہاں

کے سب باشندے تیرے باجگذار بن کر تیری خدمت کریں۔ اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے لڑنا چاہے تو تو اس کا محاصرہ کرنا۔ اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا۔ لیکن عورتوں اور بال بچوں اور چوپایوں اور اس شہر کے سب مال اور لوٹ کو اپنے لئے رکھ لینا اور تو اپنے دشمنوں کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھ کو دی ہو کھانا۔ ان سب شہروں کا یہی حال کرنا جو تجھ سے بہت دور ہیں اور ان قوموں کے شہر نہیں ہیں پر ان قوموں کے شہروں میں جن کو خداوند تیرا خدا میراث کے طور پر تجھ کو دیتا ہے کسی ذی نفس کو جیتا نہ بچا رکھنا۔ (استثناء۲۰: ۱۰تا۱۶)

۳) جب تو اپنے دشمنوں سے جنگ کرنے کو نکلے اور خداوند تیرا خدا ان کو تیرے ہاتھ میں کر دے اور تو ان کو اسیر کر لائے۔ اور ان اسیروں میں کسی خوبصورت عورت کو دیکھ کر تو اس پر فریفتہ ہو جائے اور اس کو بیاہ لینا چاہے تو تو اسے اپنے گھر لے آنا اور وہ اپنا سر منڈوائے اور اپنے ناخن ترشوائے۔ اور اپنی اسیری کا لباس اتار کر تیرے گھر میں رہے اور ایک مہینہ تک ماں باپ کے لئے ماتم کرے۔ اس کے بعد تو اس کے پاس جا کر اس کا شوہر ہونا اور وہ تیری بیوی بنے۔'' استثنا۲۱: ۱۰تا۱۳)

۴) اور انہوں نے ان سب کو جو شہر میں تھے کیا مرد کیا عورت کیا جوان کیا بوڑھے کیا بیل کیا بھیڑ کیا گدھے سب کو تلوار کی دھار سے بالکل نیست کر دیا۔ اور یشوع نے ان دونوں آدمیوں سے جنہوں نے اس ملک کی جاسوسی کی تھی کہا کہ اس کسبی کے گھر جاؤ اور وہاں سے جیسی تم نے اس سے قسم کھائی ہے اس کے مطابق عورت کو اور جو کچھ اس کے پاس ہے سب کو نکال لاؤ۔ تب وہ دونوں جوان جاسوس اندر گئے اور راحب کو اور اس کے باپ اور اس کی ماں اور اس کے بھائیوں کو اور اس کے اسباب بلکہ اس کے سارے خاندان کو نکال لائے اور ان کو بنی اسرائیل کی خیمہ گاہ کے باہر بٹھا دیا۔ پھر انہوں نے اس شہر کو اور جو کچھ اس میں تھا سب کو آگ سے پھونک دیا اور فقط چاندی

اور سونے کو اور پیتل اور لوہے کے برتنوں کو خداوند کے گھر کے خزانہ میں داخل کیا۔

(یشوع ۶: ۲۱ تا ۲۴)

۵) اور جب عی کے لوگوں نے پیچھے مڑ کر نظر کی تو دیکھا کہ شہر کا دھواں آسمان کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اور ان کا بس نہ چلا کہ وہ ادھر ادھر بھاگیں اور جو لوگ بیابان کی طرف بھاگے تھے وہ پیچھا کرنے والوں پر الٹ پڑے۔ اور جب یشوع اور سب اسرائیلیوں نے دیکھا کہ گھات والوں نے شہر لے لیا اور شہر کا دھواں اٹھ رہا ہے تو انہوں نے پلٹ کر عی کے لوگوں کو قتل کیا۔ اور وہ دوسرے بھی ان کے مقابلہ کو شہر سے نکلے۔ سو وہ سب کے سب اسرائیلیوں کے بیچ میں جو کچھ تو ادھر اور کچھ ادھر تھے پڑ گئے اور انہوں نے ان کو مارا یہاں تک کہ کسی کو نہ باقی چھوڑا نہ بھاگنے دیا اور وہ عی کے بادشاہ کو زندہ گرفتار کر کے یشوع کے پاس لائے۔ اور جب اسرائیلی عی کے سب باشندوں کو میدان میں سے بیابان کے درمیان انہوں نے ان کا پیچھا کیا تھا قتل کر چکے اور وہ سب تلوار سے مارے گئے یہاں تک کہ بالکل فنا ہو گئے تو سب اسرائیلی عی کو پھرے اور اسے تہِ تیغ کر دیا۔ چنانچہ وہ جو اس دن مارے گئے مرد اور عورت ملا کر بارہ ہزار یعنی عی کے سب لوگ تھے۔ کیونکہ یشوع نے اپنا ہاتھ جس سے وہ برچھے کو بڑھائے ہوئے تھا نہیں کھینچا جب تک اس نے عی کے سب رہنے والوں کو بالکل ہلاک نہ کر ڈالا۔ اور اسرئیلیوں نے خداوند کے حکم کے مطابق جو اس نے یشوع کو دیا تھا۔ اپنے لئے فقط شہر کے چوپایوں اور مال غنیمت کو لوٹ میں لیا۔ پس یشوع نے عی کو جلا کر ہمیشہ کے لئے اسے ایک ڈھیر اور ویرانہ بنا دیا جو آج کے دن تک ہے۔ اور اس نے عی کے بادشاہ کو شام تک درخت پر ٹانگ کر رکھا اور جوں ہی سورج ڈوبنے لگا انہوں نے یشوع کے حکم سے اس کی لاش کو درخت سے اتار کر شہر کے پھاٹک کے سامنے ڈال دیا اور اس پر پتھروں کا ایک بڑا ڈھیر لگا دیا جو آج کے دن تک ہے۔

(یشوع ۸: ۲۰ تا ۲۹)

۶) پھر یشوع اور اس کے ساتھ سب اسرائیلی دبیر کو لوٹے اور اس سے لڑے۔ اور اس نے اسے اور اس کے بادشاہ اور اس کی سب بستیوں کو فتح کر لیا اور انہوں نے ان کو تہِ تیغ کیا اور سب لوگوں کو جو اس میں تھے بالکل ہلاک کر دیا۔ اس نے ایک کو بھی باقی نہ چھوڑا۔ جیسا اس نے حمرون اور اس کے بادشاہ سے کیا تھا۔ ویسا ہی دبیر اور اس کے بادشاہ سے کیا ایسا ہی اس نے لِبناہ اور اس کے بادشاہ سے کیا تھا۔ سو یشوع نے سارے ملک کو یعنی کوہستانی ملک اور جنوبی قطعہ اور نشیب کی زمین اور ڈھلانوں اور وہاں کے سب بادشاہوں کو مارا۔ اس نے ایک کو بھی جیتا نہ چھوڑا بلکہ وہاں کے ہر متنفس کو جیسا خداوند اسرائیل کے خدا نے حکم کیا تھا بالکل ہلاک کر ڈالا۔ اور یشوع نے ان کو قادس برنیع سے لے کر غزہ تک اور جشن کے سارے ملک کے لوگوں کو جبعون تک مارا۔ اور یشوع نے ان سب بادشاہوں اور ان کے ملک پر ایک ہی وقت میں تسلط حاصل کیا اس لئے کہ خداوند اسرائیل کا خدا اسرائیل کی خاطر لڑا۔

(یشوع ۱۰: ۳۸ تا ۴۲)

۷) اس کے بعد داؤد نے فلستیوں کو مارا اور ان کو مغلوب کیا اور داؤد نے دارالحکومت کی عِنان فلستیوں کے ہاتھ سے چھین لی۔ اور اس نے موآب کو مارا اور ان کو زمین پر لٹا کر رسی سے ناپا۔ سو اس نے قتل کرنے کے لئے دو رسیوں سے ناپا اور جیتا چھوڑنے کے لئے ایک پوری رسی سے۔ یوں موآبی داؤد کے خادم بن کر ہدیے لانے لگے۔ اور داؤد نے ضوباہ کے بادشاہ رحوب کے بیٹے ہددعزر کو بھی جب وہ اپنی دریای فرات پر کی سلطنت پر پھر قبضہ کرنے کو جا رہا تھا مار لیا۔ اور داؤد نے اس کے ایک ہزار سات سو سوار اور بیس ہزار پیادے پکڑ لئے۔ اور داؤد نے رتھوں کے سب گھوڑوں کی کھونچیں کاٹیں پَر ان میں سے سو رتھوں کے لئے گھوڑے بچا رکھے۔ اور جب دمشق کے ارامی ضوباہ کے بادشاہ ہددعزر کی کمک کو آئے تو داؤد نے ارامیوں کے بائیس ہزار آدمی قتل کئے۔ (۲۔ سموئیل ۸: ۱ تا ۵)

قرآن پاک کے جس مسئلہ پر اعتراض کیا گیا ہے۔ تو وہ مسئلہ بائبل کے مندرجہ بالا سات مقامات سے ثابت ہے مزید حوالے ہم نے خوف طوالت کی وجہ سے چھوڑ دیئے ہیں۔

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ اعتراض قرآن شریف پر نہیں بلکہ بائبل پر وارد ہوتا ہے کیونکہ بائبل قرآن مجید سے پہلے کی ہے۔ بالفاظ دیگر بائبل اپنے ماننے والوں کو میدان کارزار گرمانے اور تلوار چلانے کا حکم دیتی ہے۔

پس اس حقیقت کے پیش نظر عیسائی معترضین کی عقل وعلم کا حال عجیب ہے۔ کیونکہ بائبل پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور پھر اس کی تعلیمات پر اعتراض بھی کرتے ہیں۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جن کے سبب
انہی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

(جواب مسلم)

ہندو مذہب کی کتب سے جہاد کا ثبوت

وید اور وید کے علاوہ منوسمرتی، وغیرہ میں جن کو سوامی جی قابل سند اور معتبر مانتے ہیں جہاد کے متعلق مختلف قسم کی ہدایتیں ہیں۔

وید کی پہلی ہدایت اسلحہ جنگ کی درستی کے متعلق ہے جو رگوید منڈل اول سوکت ۲۶ منتر ۲ میں مرقوم ہے:

> ”اے فرمانبردار لوگو! تمہارے اسلحہ آتشیں وغیرہ از قسم توپ وتفنگ تیر تلوار وغیرہ شستر مخالفوں کو مغلوب کرنے اور ان کو روکنے کے لئے قابل تعریف اور بااستحکام ہوں۔ تمہاری فوج مستوجب توصیف ہو تا کہ تم ہمیشہ فتح یاب ہوتے رہو۔“

ایک مقام پر دعا یوں مرقوم ہے:

میں اس محافظ کائنات صاحب جاہ وجلال نہایت زور آور اور فاتح کل تمام کائنات کے راجہ قادر مطلق اور سب کو قوت عطاء کرنے والے پرمیشور کو جس کے آگے تمام زبردست بہادر سر اطاعت خم کرتے ہیں اور جو انصاف سے مخلوقات کی حفاظت کرنے والا اندر ہے۔

ہر جنگ میں فتح پانے کیلئے مدعو کرتا ہوں اور پناہ لیتا ہوں۔

(یجروید ادھیاء ۲۰ منتر ۵۰)

ایک جگہ پرمیشو دعا دیتا ہے:

اے انسانو! تمہارے آیدہ یعنی توپ بندوق ^ا^ وغیرہ آتش گیر اسلحہ اور تیر و کمان تلوار وغیرہ ہتھیار میری عنایت سے مضبوط اور فتح نصیب ہوں۔ بدکردار دشمنوں کی شکست اور تمہاری فتح ہو۔ تم مضبوط اور طاقتور اور کار نمایاں کرنے والے ہو تم دشمنوں کی فوج کو ہزیمت دیکر انہیں روگردان و پسپا کرو۔ تمہاری فوج جرار و کارگزار اور نامی گرامی ہو تاکہ تمہاری عالمگیر حکومت روئے زمین پر قائم ہو اور تمہارا حریف نانجار (ایسی خفگی آغاز تلوار میان کن) شکست یاب ہو اور نیچا دیکھے۔

(رگ وید اشٹک اول ادھیائے ۳ ورگ ۱۸ منتر ۲)

ا توپ بندوق سوامی کے الفاظ ہیں، ہم ان کی صحت کے ذمہ دار نہیں۔

ایک جگہ پرمان ہے:

اے دشمنوں کے مارنیوالے اصول جنگ میں ماہر بے خوف و ہراس پر جاہ جلال عزیزو! اور جوانمردو تم سب رعایا کے لوگوں کو خوش رکھو پرمیشور کے حکم پر چلو اور بدفرجام دشمن کو (ہے مہاراج اتنی خفگی؟) شکست دینے کے لئے لڑائی کا سرانجام کرو تم نے پہلے میدانوں میں دشمنوں کی فوج کو جیتا ہے۔ تم نے اس کو مغلوب اور روئے زمین کو فتح کیا ہے تم روئیں تن اور

فولاد بازو ہو، اپنے زور شجاعت سے دشمنوں کو تہ تیغ کرو تاکہ تمہارے بازو اور ایشور کے لطف و کرم سے ہماری فتح ہو۔

(اتھرو وید کانڈ ۶-انو واک ورگ ۹۵ منتر ۳)

منو جی کا پرمان یہ ہے:

”جب رعایا پرور راجا کوئی اپنے سے چھوٹا خواہ برابر خواہ بڑا جنگ کے لئے طلب کرے تو کشتریوں کے دھرم کو یاد کر کے میدان جنگ میں جانے سے ہرگز پہلوتہی نہ کرے بلکہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان سے جنگ کرے۔ جس سے اپنی فتح یابی ہو۔“

(۷-۱۸۷ استیارتھ سملاس ۶ نمبر ۲۹)

ایک جگہ حکم ہے:

”کسی وقت مناسب سمجھے دشمن کو چاروں طرف سے محاصرہ کر کے روک رکھے اور اس کے ملک کو تکلیف پہنچا کر چارہ [1] خوراک پانی اور ہیزم کو تلف اور خراب کر دے۔“

(ہے یارحم مجسم سماجیو! دہن باراج) دیکھو منو جی ۷-۱۹۵، ستیارتھ پرکاش سملائس ۶، نمبر ۵۳)

[1] مہراج! گئو ماتا کیا کھائے گی۔

ایک جگہ: پرمان ہے:

مطلب براری کے لئے مناسب یا غیر مناسب وقت میں دشمن کے ساتھ جو اپنا کسی دوست کا خطاوار ہو لڑنا چنانچہ اسی دو قسم کی بناء پر جنگ کرنی چاہئے۔ (منو جی ۷-۶۴)

(مندرجہ ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۰۵، سملاس ۶ نمبر ۴۶)

کیا اتنے حوالہ جات کے بعد بھی ہندو معترض جہاد کو منہ پر لائیں گے اور کہیں

گے کہ ''اگر قرآن کا خدا دنیا کا پرورگار ہوتا اور سب پر بخشش اور رحم کیا کرتا تو دوسرے مذہب والوں اور حیوانات وغیرہ کو مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل کرنے کا حکم نہ دیتا۔

ہمارے ان ویدک حوالہ جات سے جہاں جہاد کا مسئلہ حل ہوگیا۔ وید کی قدامت اور ابتدائے دنیا سے ہونا بھی باطل ہوا۔ ناظرین بغور دیکھیں!

اب تحقیقی جواب سنئے! قرآن میں کہیں مذکور نہیں کہ کافروں کو ان کے کفر کی وجہ سے مارو اور قتل کرو۔ بلکہ صاف ارشاد ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ.

جو تم سے لڑیں تم ان سے لڑو اور لڑنے میں زیادتی مت کرو۔ بیشک اللہ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔''

معترض صاحب! اگر کافروں کو کفر کی وجہ سے مارنے کا حکم ہوتا تو کافروں کو رعیت بنا کر کیوں رکھا جاتا۔ یہ مسئلہ ہماری تصانیف کے متعدد مواقع میں مفصل مذکور ہے۔

ہم اور بھی واضح لفظوں میں بتلاتے ہیں کہ قرآن شریف ایمان بالجبر کو کن لفظوں میں ناپسند کرتا ہے۔ غور سے سنو!

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ.''

کیا اے رسول لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ مسلمان ہو جائیں، یعنی ایسا کرنا کسی طرح جائز نہیں۔''

علاوہ اس کے یہ بھی غلط ہے کہ وید کے منتر مذہبی لڑائی کے لئے نہیں بلکہ سیاست مدنی کے لئے ہیں۔ کیونکہ ان منتروں میں جن لوگوں کو خطاب ہے یعنی جن لوگوں کی سلطنت تمام دنیا پر قائم کرنے کی خواہش کی گئی ہے۔ وہ کون لوگ ہیں یا تو وہ جو ویدک مذہب کے پابند ہوں گے یا کوئی بھی ہوں جو اس وقت دنیا میں حاکم تھے خواہ بت پرست ہوں یا صلیب پرست۔ مسلمان ہوں یا یہودی لیکن الہامی اور مذہبی کتابوں سے یہ مطلب کوسوں دور بلکہ بعید اور ناممکن ہے کہ ایسے احکام ان لوگوں کے لئے جاری کرے

جو اس کتاب کے پیرو نہ ہوں بلکہ ایسے احکام انہی لوگوں کے لئے ہوتے ہیں جو اس کتاب کے پابند ہوتے ہیں۔ پس ان معنی کو ملحوظ رکھ کر ویدک منتروں کو بغور دیکھیں کہ کیونکر ویدک دھرم کی سلطنت اور اشاعت تمام ملک میں کرنے کی ہدایت ہے۔

بھلا اگر دو ملکوں مثلاً پنجاب اور بنگال میں ویدک دھرم کے پیرو رہتے ہیں اور ان میں اگر کسی بات پر بگاڑ ہو جائے تو دونوں قومیں ان منتروں کو پڑھ پڑھ کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہوں گی۔ اور بنگالی کہیں گے کہ پنجابی ہمارے خلاف فساد پھیلانے میں کوشش کرتے ہیں اور پنجابی کہیں گے کہ بنگالی ایسا کرتے ہیں۔ جس طرح ہو سکے ہم ان کو زیر کئے بغیر نہ رہیں گے۔ کیونکہ وید مقدس میں ایشور نے ہماری ہی سلطنت کو دنیا پر قائم کیا ہے۔

ہاں ایک بات میں **قرآن شریف** کا واقعی قصور ہے کہ اس نے برخلاف تمام قوموں اور سلطنتوں کے دنیا کو صلح سے رہنے کی ایک نرالی تجویز بتلائی ہے تمام قوموں اور سلطنتوں میں یہ دستور ہے کہ جب تک فریق مقابل سر تسلیم خم نہ کرے یعنی تابع فرمان نہ ہو۔ لڑائی موقوف نہیں کرتے خواہ ہم قوم ہو یا ہم مذہب۔ انگریزوں اور بوائروں، جرمنی و فرانس وغیرہ کی لڑائیاں تمثیلاً موجود ہیں اسلام اور قرآن نے یہ تجویز تو منظور کی۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ.

اگر کافر صلح چاہیں تو تم بھی صلح پسند کرو اور اللہ پر بھروسہ کرو۔

اس کے علاوہ دوسرا طریق بھی بتلایا جس کا ہم اس موقع پر ذکر کرنے کو ہیں۔ جس سے اکثر مخالفین کو غلط فہمی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر فریق مخالف مسلمان ہو جائیں تو جنگ کا خاتمہ ہے، غور سے سنو!

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ

یعنی اگر کفار مسلمان ہو کر اسلامی احکام کے پابند ہو جائیں تو ان کا تعرض

چھوڑ دو۔

یہی آیت ہے جس سے بے سوچ سمجھے مخالفین کو شبہ ہوتا ہے کہ اسلامی جنگیں لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے کے لئے تھیں مگر حقیقت الامر اس کے خلاف ہے یہ تو **قرآن شریف** کا احسان عام اور ایک جدید طریق ہے صلح جوئی کا جو آج تک کسی مہذب قوم کو نصیب نہیں ہوا کہ فریق مقابل کے ہم مذہب ہونے پر جنگ کا خاتمہ کیا جائے کیا ۱۹۰۰ء کی انگریزوں اور بوائروں کی جنگ کو دنیا بھول گئی ہے کہ جب تک انگریزوں نے ملک کو زیر نگیں نہیں کر لیا نہیں چھوڑا۔ خواہ وہ ہزار دفعہ مسیح اور صلیب کو سجدہ کرتے رہے۔ ہاں قرآن شریف پر یہ الزام اس صورت میں عائد ہو سکتا تھا کہ صرف یہی ایک طریق صلح اور خاتمہ جنگ کا ہوتا لیکن جس صورت میں اس طریق کے علاوہ دوسرا طریق بھی موجود ہے کہ مقابل بیشک اپنے مذہب بلکہ بت پرستی پر بھی جمے رہیں مگر صلح کی درخواست کریں (یہ بھی شرط نہیں کہ وہ اسلامی خلیفہ کو شہنشاہ منظور کریں) تو فوراً لڑائی بند کی جائے گی جس کا ثبوت اوپر بیان ہو چکا۔ اب فریق مقابل کو اختیار ہے کہ وہ جس میں اپنا فائدہ سمجھے اختیار کرے لیکن اسلام اور خلیفہ اسلام کی طرف سے اس پر جبر نہ ہوگا کہ وہ مسلمان ہی ہوں تو جنگ ختم ہوگی۔ بلکہ درخواست صلح پر آزاد یا رعیت بن کر بھی صلح کر سکتے ہیں۔ مگر شر و فساد سے نہیں غور سے پڑھو۔

قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَاتَكُوْنَ فِتْنَةٌ.

لڑو ان سے جب تک فتنہ ختم ہو جائے۔

مختصر یہ کہ مہذب قوموں میں صلح کا ایک ہی طریق ہے۔ مگر قرآن مجید میں دو طریق ہیں اور یہی قرآن کی بڑی امتیازی شان ہے۔ اس لئے قرآن بزبان حال کہتا ہے ؎

مجھ میں ایک عیب بڑا ہے کہ وفادار ہوں میں
ان میں دو وصف ہیں بدخود بھی ہیں خود کام بھی ہیں

جہاد اور جنگ کا مفصل ذکر اوپر ہو چکا ہے، ہم یہاں پر صرف منو جی کا پرمان سناتے ہیں۔ جس کو سوامی جی نے بھی واجب التعمیل سمجھ کر نقل کیا ہے۔

سنئے!

''جب معلوم ہو جائے کہ فوراً لڑائی کرنے سے کسی قدر تکلیف پہنچے گی اور بعد میں کرنے سے اپنی بہتری اور فتح ضرور ہو گی۔ تب دشمن سے میل کر کے وقت مناسب تک صبر کرے۔''

''جب اپنی تمام رعایا فوج کو غائت درجہ خوشحال ترقی پذیر سعادت مند جانے اور ویسا ہی اپنے کو بھی سمجھے تب دشمن سے جنگ کریں۔

''جب اپنی مکمل طاقت یعنی فوج کو خورسند اور آسودہ اور خوشحال دیکھے اور دشمن کی طاقت برخلاف اس کے کمزور ہو جائے۔ تب دشمن کی طرف جنگ کرنے کے واسطے کوچ کرے۔''

(ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۰۶، باب ۶، نمبر ۴۷)

(حق پرکاش)

اس سے صاف طور پر ظاہر ہو گیا کہ ہندو مذہب میں بھی اپنے مذہب کیلئے مخالفوں سے لڑنے کا حکم ہے، یہ جہاد نہیں تو پھر جہاد کس کا نام ہے۔

مشروعیت جہاد کی ایک حکمت

وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ، اس آیت میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس امت میں کفار سے جہاد و قتال کی مشروعیت درحقیقت ایک رحمت ہے۔ کیونکہ وہ آسمانی عذابوں کے قائم مقام ہے کیونکہ کفر و شرک اور اللہ سے بغاوت کی سزا پچھلی قوموں کو آسمانی اور زمینی عذابوں کے ذریعہ دی گئی ہے امت محمدیہ میں ایسا ہو سکتا تھا مگر رحمۃ للعالمین کی برکت سے اس امت کو ایسے عام عذابوں سے بچا لیا گیا۔ اس

کے قائم مقام جہاد شرعی کو کر دیا گیا جس میں بہ نسبت عذاب عام کے بڑی سہولتیں اور مصلحتیں ہیں۔ اول تو یہ کہ عذابِ عام میں پوری قوم میں مرد، عورت، بچے سبھی تباہ ہوتے ہیں اور جہاد میں عورتیں بچے تو محفوظ ہیں ہی، مرد بھی صرف وہی اس کی زد میں آتے ہیں جو اللہ کے دین کی حفاظت کرنے والوں کے مقابلہ پر قتال کے لئے آکھڑے ہوں، پھر اس میں بھی سب مقتول نہیں ہوتے، ان میں بہت سے لوگوں کو اسلام وایمان کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے نیز جہاد کی مشروعیت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ جہاد وقتال کے دونوں فریق، مسلمان اور کافر کا امتحان ہو جاتا ہے کہ کون اللہ کے حکم پر اپنی جان و مال نثار کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور کون سرکشی اور کفر پر جما رہتا ہے یا اسلام کے روشن دلائل کو دیکھ کر اسلام قبول کر لیتا ہے۔

دین اسلام جنگ اور جہاد سے پھیلا ہے

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

ہندوؤں کا ایک اعتراض یہ ہے کہ دین اسلام جنگ اور جہاد کی وجہ سے رونق پذیر ہوا ہے۔ اور ہندو مذہب میں جنگ اور جہاد جائز نہیں ہے۔

جواب: یہ کھلا جھوٹ ہے کیونکہ جہاد بید کی رو سے مستحب بلکہ واجب ہے اور ہندوؤں کے پیشوا سب کے سب جہاد اور جنگ میں مصروف رہے ہیں۔

مگر جاننا چاہئے کہ فرضیت جہاد اور مشروعیت جہاد کا حکم عقل سلیم اور انبیاء کی شریعتوں اور ہندوؤں کی بیدوں اور شاستروں سے ثابت اور متحقق ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ عالم مجموعہ اجزاء متضادہ ہے اور نمونہ کل عالم یہ شکل انسانی ہے جو کچھ دنیا میں ہے وہ ایک انسان میں موجود ہے اور وجود اور نفس اور روح ایک دوسرے کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ انسان کا نفس جنس شیطان سے پیوستہ ہے۔ اور شر کی طرف مائل ہے اور انسان کی روح ملاء اعلی اور فرشتوں کی جنس سے ہے جو خیر کی طرف متوجہ

ہے۔ اور عقل کا اس پر کھلا مشاہدہ ہے کہ اس نوع کے تمام افراد روح کے تقاضے کے تابع ہیں اور یہ سب اقتضائے نفس کے تابع ہیں۔ نفس نے ایک جماعت کثیرہ پر غلبہ پایا ہے جس کے سبب عظیم شر ظاہر ہوئے مثلاً کفر' گناہ' جو نفس کی جماعت نے کھڑے کئے ہیں اس لئے مقتضائے مصلحت یہی تھا کہ ہر جگہ شر و فساد کھڑے ہوں اور اچھے لوگ شر و فساد کو ان علاقوں سے ختم کریں۔ سب سے پہلے وعظ و نصیحت سے جہالت کے رنگ کو ان کے دلوں سے دور کریں اگر مان لیں تو ان کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کریں اور اگر اس کوشش کے بعد بھی وہ گمراہی کی راہ کو نہ چھوڑیں اور نیک لوگوں کے ساتھ لڑنے پر کمر بستہ ہو جائیں تو اس گمراہی اور گمراہ کرنے کی وجہ سے ان کو اگر آزاد چھوڑ دیا جائے تو یہ نیکو کاروں پر تنگی کو پیدا کر دیں اور امن اور خدا پرستی دنیا سے ختم ہو جائے۔

اسی مضمون کی طرف قرآن پاک میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيراً۔"

(ترجمہ) اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹایا کرتا تو درویشوں کے خلوت خانے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجد میں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے ڈھا دیئے جاتے۔

اور بید کا قول بھی ایسا ہی ہے جو پال اپنکھد اتھربن بید میں موجود ہے۔

کہ چھتری کا کام ہے شمشیر باندھنا ان کو واجب ہے کہ جو دشمن گیان کا ہو اس سے سنمکھ ہو کر جُدّہ کرے راستے اور حق کو کسی حال میں ہاتھ سے نہ دے اس حالت میں جو رنج اور زخم اٹھاوے یا جان سے مارا جاوے سبب نجات کا ہے۔......الخ

معترض اگر اپنے مذہب کی باتوں سے آگاہ ہوتا تو ہمارے مذہب کی تائید خود اپنے مذہب کی کتابوں سے ڈھونڈ لیتا۔

مہابھارت بھیکم پرب میں لکھا ہے کہ:

راجہ کیکی کو بدشکل جنی نے پکڑ لیا تھا۔ راجہ نے اس کا سبب پوچھا تو جن نے کہا اگرچہ تو اپنے ملک میں عدل کرتا ہے لیکن تیری سلطنت کے قریب ایک اور بادشاہ ہے اس کے ملک میں زنا اور نافرمانی بہت ہوتی ہے۔ اس کو تو کیوں نہیں روکتا اگر باز نہیں آتا تو تو اس سے جنگ کر اور تو اس کو قتل کر اور تو اس سے ملک کو چھین لے تاکہ لوگ گمراہی میں نہ پڑیں۔ انتہی

شریعت اسلام کی اصطلاح میں خالی لڑنے اور قتل کرنے کو جہاد نہیں کہا گیا بلکہ اس میں شرط یہ ہے کہ یہ لڑائی محض اللہ کی رضا کے لئے ہو اور اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لئے ہو اور کافروں کے شر کو دور کرنے کے لئے ہو اور خدا پرستی کی راہ میں رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے ہو۔ اور یہ خدا پرستوں کو امن اور آسائش پہنچانے کے لئے ہو نہ کہ اغراض نفسانی کے لئے۔

مہا بھارت پرب دواز دہم میں مرتہہ حال مذکور ہے کہ ہوا دیوتہا سے فریاد کر کے کہنے لگے کہ اس کا نام مرتہہ ہے تجھے حکم الٰہی سے زمین میں حکومت کرنی چاہئے تاکہ تو ظالموں کا شر دور کرے اور مخلوق کو خدا تعالیٰ کی اطاعت کا حکم کرے اور ہر شخص جو اس کی بندگی سے سر موڑے اس کے سر کو تن سے جدا کرے۔

اسی کتاب میں پرب میں لکھا ہے کہ راجہ بھرتھہ کے باپ نے دعویٰ الوہیت کے بعد اپنی تصویریں لوگوں کو دیں تاکہ وہ ان کی پوجا کریں جب اس پر ایک زمانہ گزر گیا بت پرستی کا طریقہ شروع ہو گیا بعد اس کے کہ راجہ بھرتھہ حاکم ہوا تھا۔ تمام مخلوق کو خدا پرستی کا حکم کیا تھا۔ اور جس نے قبول نہیں کیا تھا اس کو اس نے قتل کر دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ مورتیاں جہاں جہاں ملیں ان کو توڑ کر جلا دیا جائے۔

(سوط اللہ الجبار ص ۲۴۶-۲۴۷)

جہاد میں عورتوں کا لالچ

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

دوسرا عورتوں کا لالچ محمدؐ صاحب نے خاص و عام سب لوگوں کو یہ لالچ دیا اگر میرے ساتھ جاؤ گے عورتیں مفت لوٹ میں ہاتھ آئیں گی تم ان سے صحبت کرنا خدا تعالیٰ کا بھی اس میں گناہ نہیں......الخ۔

(ہدایۃ المسلمین پادری عمادالدین صفحہ ۲۵۱)

جواب: اول تو آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی لڑائی میں کسی کو یہ لالچ نہیں کیا اگر سچے ہو تو ثابت کردو۔ دوم یوں کون کسی کے لالچ دینے سے کسی کے ساتھ جان دینے کو آمادہ ہو جاتا ہے۔ اب لٹیروں کو کسی کی جورو اور مال لینے سے کون مانع ہے اگر یہی مؤثر ہے تو گورنمنٹ کا ہے کہ کروڑ ہا روپیہ دے کر فوج مقابلہ میں لے جاتی ہے ایسا لالچ کیوں نہیں دیتی۔ سوم ہر لڑائی میں یہ کس کو یقین ہوتا ہے کہ ہم ہی فتح یاب ہوں گے ہاں اگر ان کو مدد آسمانی کا سہارا ہو تو ان پر حکم سماوی میں عیب کیا ہے؟ چہارم۔ اسلام میں لڑائی سے مقصود اس قوم کا ایمان لانا ہوتا ہے اگر وہ قوم ایمان لائے یا مطیع اسلام ہو جائے تو پھر ان کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا معاذ اللہ اگر آپؐ لالچی ہوتے تو خواہ کوئی چین کرے یا پین کبھی کسی کو نہ چھوڑتے جیسا کہ بائبل مقدس کے انبیاءؑ نے کیا حالانکہ یہ کبھی نہیں ہوا۔ (مقدمہ تفسیر حقانی ۱۰۱/۱)

جاہلوں کو مختلف لالچ دے کر اسلام کی طرف مائل کیا جاتا ہے

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

تیسرا لالچ جسمانی بہشت کا جس میں شراب کباب اور اچھی عورتیں اور فرش لونڈی خوب صورت وغیرہ اور بہت سی غلط اور گندی باتیں جن سے نادان بہلائے جاتے ہیں۔ محمد صاحبؐ نے عرب کو سنائیں وہ بے علم ناواقف بت پرست شہوت کے

بندے خوش ہو کر قبول کر بیٹھے اس بہشت کو علماء محمدیہ کلام الٰہی سے ثابت کریں ورنہ توبہ کریں۔ (پادری عماد الدین ہدایۃ المسلمین ص ۲۵۲)

جواب: یہی اعتراض سرسید صاحب نے بھی قرآن اور اسلام پر کیا ہے اور مدت سے پادری فنڈر وغیرہ اسی کو پیش کئے چلے جاتے ہیں مگر یہ آپ لوگوں کی کم فہمی ہے کیونکہ ان اشیاء سے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں بعینہٖ یہی دنیا کی عنصری چیزیں مراد نہیں بلکہ ان کی طرح اور لطیف چیزیں اور اس بات کو قرآن نے بھی بتلا دیا ہے۔ (۱)

دوم جنت کی کسی قدر نعماء مکاشفات۔ (۲) یوحنا میں بھی موجود ہیں کہ جس کو تم کلام الٰہی سمجھتے ہو پھر انکار محض جہالت ہے۔

سوم اگر تمہاری کتابیں جنت اور دوزخ کے بیان سے الٰہی ہیں تو یہی وجہ حضرت ﷺ کے نبی ہونے کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ جزاء وسزا دارِ آخرت میں انسان کے لئے عقلاً ونقلاً ثابت ہے اور اس کے بیان کی ضرورت ہے پس جس چیز کے ضروری بیان سے تمام کتبِ سابقہ خالی ہیں جس نے اس کو بیان کیا وہ شخص قطعی نبی ہے۔

(مقدمہ تفسیر حقانی ۱/۱۰۱)

اسلام جھوٹی دہشت ڈال کر جاہلوں کو ڈراتا ہے

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

پانچواں باعث جھوٹی دہشت دینا یعنی محمدؐ صاحب نے دوزخ اور بہت اور عذاب قبر کی بابت ایسے ایسے مضمون صریح البطلان جو ہرگز عقل ونقل قبول نہیں کرتی اس جاہل ملک کو سنا کر ڈرایا۔ (ہدایۃ المسلمین عماد الدین ۲۵۳)

جواب: ہمارے مشفق سرسید صاحب بھی آپ لوگوں کی بولی بولتے ہیں مگر افسوس کہ نہ آپ عذاب قبر کو سمجھے نہ دوزخ کو نہ بہشت کو ہماری اس کتاب کو دیکھتے تو کبھی یہ بات منہ پر نہ لاتے بھلا پادری صاحب یہ فرمادیتے کہ جب انسان کے لئے

بعد مرنے کے نہ عذابِ قبر ہے نہ دوزخ نہ جنت تو پھر نیک و بد کام کا نتیجہ کیا ہے؟ شاید یہی دنیائے فانی، اسی لئے پولوس مقدس نے شریعت پر عمل کرنے والے کو بے ایمان فرمایا اور عیسائیوں کو ہر چیز کا فتویٰ دے کر سانڈ بنایا ہے معاذ اللہ اگر یہی الہام ہے اور یہی نبوت ہے تو سخن فہمی عالم بالا معلوم شد پس۔ شیطان صاحب کو تکلیف اٹھانے کی اب کچھ ضرورت نہ رہی عیسائیوں کی کتابیں اور ان کے پادری کافی ہیں علاوہ اس کے (بائبل میں) مکاشفاتِ یوحنا میں بھی ایسی جھوٹی دہشت مذکور ہے اور اکثر انبیاء علیہم السلام کے کلام میں مسطور لیکن آپ کو بائبل پر نظر نہیں جس لئے یہ جھوٹا غرور ہے۔

(۲) چنانچہ مکاشفاتِ یوحنا باب ۷ آیت ۹، ویضاً باب ۲۱ و باب ۲۲ میں خوب بیان ہے انجیل متی باب ۲۵ میں بالخصوص انجیل متی باب ۲۶ آیت ۲۹ میں تصریح ہے کہ جنت میں انگور کا شیرہ پیا جائے گا پس جب کھانا پینا ثابت ہوا یہ پادریوں کو اختیار ہے کہ وہ فقط انگور کا شیرہ ہی پی کر بس کیا کریں اور اہل اسلام ہر چیز کھائیں پیئیں اب اپنی قسمت پر اعتراض نہ کیں نہ کہ جنت کے نعماء پر۔ (۳) کیا انور کا قصہ عماد الدین نے انجیل میں نہیں پڑھا جہاں حضرت مسیح علیہ السلام عذاب قبر اور دوزخ کا پورا فوٹو کھینچ رہے ہیں عماد الدین ایسی ضد میں آئے کہ انجیل اور عقائد عیسویہ سے بھی ہاتھ اٹھا بیٹھے۔ منہ

مسلمان دولت اور ملک گیری کیلئے جہاد کرتے ہیں

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

ہمیشہ روپیہ اور ملک گیری کی خاطر لڑتے رہے ہے یہاں تک کہ محمد صاحبؐ کے نواسے امام حسنؓ و حسینؓ بھی بادشاہت کی فکر میں مارے گئے۔

(ہدایۃ المسلمین پادری عماد الدین ص ۲۵۳)

جواب: بالکل جھوٹ یہ عیسائیوں کی لڑائیاں نہیں کہ محض دنیا کے لئے جھوٹ اور فریب اور بے ایمانی اور دغا بازی کو عمل میں لاتے ہیں اپنے سے غالب کو دب کر سلام کرتے ہیں مغلوبوں کو نہایت بے رحمی سے مارتے ہیں۔ کیا اسپین کا قصہ اور بیت المقدس میں پچاس ہزار مسلمانوں کے زن وفرزند کا باوجود ان کے قتل کرنا وغیرہ صفحۂ عالم سے محو ہو گیا ہے؟ (اور حال ہی میں عراق، افغانستان اور فلسطین وغیرہ اسلامی ممالک میں صرف اسلام دشمنی اور وہاں کی تیل اور معدنیات کے حصوں کیلئے کئی لاکھ مسلمانوں کا خون کر چکے ہیں لاکھوں بچے یتیم اور لاکھوں عورتیں بیوہ اور بے کفیل کر چکے ہیں اور امن عالم کے ٹھیکیدار بھی کہلاتے ہیں)۔

اور حضرت امام حسنؓ و حسینؓ کی شہادت محض دین کے لئے تھی کہ جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ اگر دین کے لئے شہید ہونا عیب ہے تو خود حضرت مسیحؑ اور ان کے بعض حواری بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔ (مقدمہ تفسیر حقانی ۱/۱۰۲)

کیا لوگوں کو طمع اور جان کے خوف سے مسلمان کیا

اعتراض:۔

غرض یہ سب دنیاوی طمع سے محمدؐ صاحب پر ایمان لائے تھے۔ اور ان کے بعد بادشاہوں نے طمع اور جان کے خوف سے لوگوں کو مسلمان کیا (جیسا کہ قسطنطین بادشاہ روم نے ہزار ہا بے کس لوگوں کو ظلم سے ہلاک کر کے مذہب عیسائی کو رواج دیا تھا) یہاں تک محمدؐ صاحب کا مختصر احوال سنایا۔ ان شاء اللہ اگر زمانے نے فرصت دی تو خاص محمدیؐ تاری جدی لکھ کر مفصل کیفیت سناؤں گا۔ جو پردہ میں ہے۔

(ہدایۃ المسلمین پادری عماد الدین ۲۵۴)

جواب: تم نے تاریخ محمدیؐ میں حسب وعدہ اور پادری فنڈر نے اور مصنف نیاز نامہ نے اور ماسٹر رام چندر نے رسالہ مسیح الدجال و تحریف القرآن میں اور

تمہارے مقلد لالہ اندرمن مراد آبادی وغیرہ ڈلک نے بہت سے متعصب اور نا انصاف لوگوں نے بہت کچھ کاغذ سیاہ کئے ہیں اور جھوٹ عیب ضعیف اور موضوع روایات واقوال اہل سیر سے اور کچھ اپنی طرف سے اس آفتاب جہاں تاب پر لگاتے ہیں اور آسمان کی طرف تھوکا ہے مگر وہ سب اڑ کر انہیں کے منہ پر پڑا۔

دیکھئے اب ہم آنحضرت ﷺ کے فضائل پر اہل انصاف عیسائیوں سے شہادت طلب کرتے ہیں وہ کیا کہتے ہیں؟

گاڈفری ہیگنس اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ گبن صاحب کہتے ہیں کہ چاروں خلفاء کے اطوار یکساں صاف اور ضرب المثل تھے کہ ان کی سرگرمی، دلدہی اخلاص کے ساتھ تھی۔ اور ثروت اور اختیار پا کر بھی اپنی زندگیاں اور فرائض اخلاقی اور مذہبی میں صرف کیسی یہی آدمی محمدؐ کے اول جلسہ میں شامل تھے۔ جو پیشتر اس سے کہ آپ نے اقتدار حاصل کیا آپؐ کے جانبدار ہو گئے یعنی ایسے وقت میں کہ آپ ﷺ ہدف آزار ہوئے اور جان بچا کے اپنے ملک سے چلے گئے۔ ان کے اول ہی اول تبدیل مذہب کرنے سے ان کی راستی ثابت ہوتی ہے اور دنیا کی سلطنتوں کو فتح کرنے سے ان کی لیاقت کی فوقیت معلوم ہوتی ہے۔ اس صورت میں کوئی یقین کر سکتا ہے کہ ایسے شخصوں نے ایذائیں سہیں اور اپنے ملک سے جلاوطنی گوارا کی اور اس سرگرمی سے اس کے پابند ہوئے یہ سب امور ایک شخص کی خاطر ہوں جس میں ہر طرح کی برائیاں ہوں اور اس سلسلہ فریب اور سخت عیاری کے لئے ہوں جو ان کی تربیت کے بھی خلاف ہو اور ان کی ابتدائی زندگی کے تعصبات کے بھی مخالف ہو؟ اس پر یقین نہیں ہو سکتا اور خارج از حیطہ امکان ہے، عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمدؐ کے مسائل نے اس درجہ کا نشہ دینی آپ کے مریدوں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰؑ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے اور آپؐ کا مذہب اس تیزی کے ساتھ جس کی نظیر دین عیسوی میں نہیں چنانچہ نصف صدی سے کم میں اسلام بہت سی عالیشان اور سرسبز

سلطنتوں پر غالب آ گیا۔ جب عیسیٰؑ کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے ان کا نشہ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیئے۔ بالفرض آپ کی حفاظت کرنے کی ان کو نعت تھی تو آپ کی تشفی کے لئے موجود رہتے اور صبر سے آپ کے اور اپنے ایذا رسانوں کو دھمکاتے۔ برعکس اس کے محمدؐ کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبرؐ کے گرد آئے اور آپؐ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا انتہیٰ۔

پھر خود گبن اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں: محمدؐ کا مذہب شکوک اور شبہات سے پاک ہے۔ مکہ کے پیغمبرؐ نے بتوں اور انسانوں اور ستاروں اور سیاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے رد کیا الخ۔

اس نے اپنی سرگرمی سے کائنات کے بانی کا ایک ایسا وجود تسلیم کیا ہے کہ جس کی نہ ابتداء ہے نہ انتہاء نہ کسی شکل میں محدود نہ کسی مکان میں نہ کوئی اس کا ثانی موجود ہے جس سے اس کو تشبیہ دے سکیں الخ۔ ان بڑے بڑے حقائق کو پیغمبرؐ نے مشہور کیا اور اس کے پیروؤں نے ان کو نہایت مستحکم طور پر قبول کیا اور قرآن کے مفسروں نے معقولات کے ذریعہ سے بہت درستی کے ساتھ ان کی تصریح اور تشریح کی۔ ایک حکیم جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر اعتقاد رکھتا ہو مسلمانوں کے عقائد مذکور کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایسا عقیدہ ہے جو ہمارے ادراک موجودہ اور قوی عقلی سے بہت بڑھ کر ہے الخ۔ وہ اصل الاصول جن کی بناء عقل اور وحی پر ہے محمدؐ کی شہادت سے استحکام کو پہنچے۔ چنانچہ ان کے معتقد ہندوستان سے لے کر مراکو تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں اور بتوں کو ممنوع سمجھنے سے بت پرستی کا خطرہ مٹا دیا گیا ہے۔ انتہیٰ

اور ڈاکٹر اسپرنگر صاحب کہتے ہیں: محمدؐ کو نکلتے ہوئے آفتاب برستے پانی اور اُگتی گھانس میں خدا ہی کا ید قدرت نظر آتا تھا اور عرش رعد اور آواز آب و طیور کے نغمہ میں حمد الٰہی کی آواز سنائی دیتی تھی اور سنسان جنگلوں اور پرانے شہروں کی خرابات میں

خدا تعالیٰ ہی کے قہر و آثار دکھائی دیتے تھے انتہی۔

اور راڈویل صاحب دیباچہ قرآن میں لکھتے ہیں محمدؐ کے سب کام اس نیک نیتی کی تحریک سے ہوتے تھے کہ اپنے ملک کے لوگوں کو جہالت اور ذلت بت پرستی سے چھڑا دیں اور یہ کہ نہایت مرتبہ کی خواہش آپؐ کی یہ تھی کہ سب سے بڑے امر حق یعنی توحید الٰہی کا جو ان کی روح پر بدرجہ غایت مستولی رہتی تھی اشتہار کریں الخ اور مقتضائے حوادث اور بتدریج فوز مرام اس امر کا باعث ہوا کہ انہوں نے اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا رسول امین یقین کامل کر لیا تاہم اعتقاد کامل ہوتا ہے اس میں سے کچھ نتیجے نکالے جائیں۔ ان کی ذات کریم اور سیرت صداقت مشحون سے ہمیشہ ان کو ان لوگوں میں تصور کیا جائے جن کو ایمان اور اخلاق اور اپنے ابنائے جنس کے تمام حیات دنیوی پر ایسا اختیار حاصل ہے جو حقیقت میں بجز کسی اولوالعزم کے اور کسی کو نہیں ہوتا انتہی۔

اور لارڈ ولیم میور اپنی کتاب سیرت محمدیہؐ میں لکھتے ہیں ایک زمانہ نامعلوم سے مکہ اور جزیرہ عرب کی روحانی کیفیت بالکل بے حس ہو گئی تھی گو ایک ضعیف اور ناپائیدار اثر یہودیت و نصرانیت یا فلسفہ کا عرب پر ہوا تھا جیسے کہ ایک دریاچہ غیر رواں کے سطح کا ادھر ادھر لہر کھاتا مگر تہ میں بے حس و حرکت رہنا تمام عرب توہمات و ظلم اور بدکاریوں میں غرق ہو رہے تھے۔ یہ عام رسم تھی کہ بڑا بیٹا اپنے باپ کی بیواؤں کو بیاہ لیتا تھا۔ ان کے غرور اور افلاس سے رسم دختر کشی بھی جاری ہو گئی تھی جیسے ہندوؤں میں ہے۔ ان کا مذہب حد کے درجہ کی بت پرستی تھا اور ان کا ایمان ایک مسبب الاسباب مالک علی الاطلاق پر نہ تھا بلکہ غیر مرئی ارواح کے توہم باطل کی سی ہیئت کا ان کا ایمان تھا۔ قیامت اور جزاء و سزا جو فعل یا ترک کا باعث ہو اس کی انہیں خبر نہ تھی۔ (جیسا کہ پادریان حال بالخصوص عمادالدین کو نہیں ہے) ہجرت سے تیرہ برس پیشتر (یعنی قبل نبوت) تو مکہ اسی طرح سے ایسی ذلیل حالت میں بے جان پڑا ہوا تھا۔ مگر ان تیرہ برسوں نے کیا ہی اثر عظیم پیدا کیا سینکڑوں آدمیوں کی جماعت نے بت پرستی

چھوڑ کر خدائے واحد کی پرستش اختیار کی (بخلاف پادریوں کے کہ وہ اب بھی تین خدا کی پرستش کرتے ہیں) اور اپنے اعتقاد کے موافق وحی الٰہی کی ہدایت کے مطیع و منقاد ہو گئے۔ اسی قادر مطلق سے بکثرت وشدت دعا مانگتے اسی کی رحمت پر مغفرت کی امید رکھتے اور حسنات و خیرات و پرہیز گاری اور انصاف کرنے میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ اب انہیں شب و روز اسی قادر مطلق کی قدرت کا خیال ہے اور یہ کہ وہی رازق ہمارے ادنیٰ ادنیٰ حوائج کا خبر گیراں ہے۔ ہر ایک قدرتی یا طبعی کیفیت میں ہر ایک امور متعلقات زندگانی میں اور اپنی خلوت وجلوت کے ہر ایک حادثہ اور ہر تغیرات میں وہ اسی کے ید قدرت کو دیکھتے تھے اور اس کے علاوہ وہ لوگ اس روحانی حالت کو جس میں وہ خوشحال اور حمد کناں رہتے تھے خدا تعالیٰ کے فضل خاص و رحمت باختصاص کی علامت سمجھتے تھے اور اپنے کافر اہل شہر کے کفر کو خدا تعالی کی تقدیر کیے ہوئے خذلان کا نشان جانتے تھے۔ محمدؐ کو وہ اپنی حیات تازہ بخشنے والا سمجھتے تھے الخ اس تھوڑے عرصہ میں مکہ اس عجیب تاثیر سے دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ مسلمانوں نے مصیبتوں کو تحمل اور شکیبائی سے برداشت کیا الخ ایک سو مرد و عورت نے اپنے ایمان عزیز سے انکار نہ کر کے اپنا گھر بار چھوڑ حبش کو ہجرت کر لی تھی پھر اس سے زیادہ آدمی اور ان میں نبی بھی (دیکھو نبوت کا اقرار ہے) اپنے عزیز شہر کو اور مقدس کعبہ کو چھوڑ کر مدینے کو ہجرت کر آئے اور یہاں بھی اس عجیب تاثیر نے دو یا تین برس کے عرصہ میں ان لوگوں کے واسطے ایک برادری جو نبیؐ اور مسلمانوں کی حمایت میں جان دینے کو مستعد ہو گئے تیار کر دی اہل مدینہ کے کانوں میں یہودی حقانی باتیں عرصہ سے گوش گزار ہو چکی تھیں مگر وہ بھی اس وقت خواب خرگوش سے نہ چونکے جب تک کہ روح کے کپکپا دینے والی باتیں نبی عربی کی نہیں سنیں تب البتہ ایک نئی اور سرگرم زندگانی میں دم بھرنے لگے انتہی۔

ایک جگہ اسی کتاب میں لارڈ صاحب لکھتے ہیں' ہم بلا تامل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام نے ہمیشہ کے واسطے اکثر توہمات باطلہ کو کالعدم کر دیا۔ اسلام

کی صدائے جنگ کے روبرو بت پرستی موقوف ہوگئی۔ اور خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور غیر محدود کمالات اور قدرت کاملہ کا مسئلہ حضرت محمدؐ کے معتقدوں کے دلوں اور جانوں میں ایسا ہی زندہ اصول ہو گیا ہے جیسے کہ خاص حضرت محمدؐ کے دل میں تھا۔ مذہب اسلام کی پہلی بات جو خاص اسلام کے معنی میں ہے یہ ہے کہ خدا کی مرضی پر توکل مطلق کرنا چاہئے۔ بہ لحاظ معاشرت کے بھی اسلام میں کچھ کم خوبیاں نہیں ہیں چنانچہ مذہب اسلام میں یہ ہدایت ہے کہ سب مسلمان آپس میں برادرانہ محبت رکھیں یتیموں کے ساتھ نیک سلوک کریں غلاموں کے ساتھ کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آئیں۔ نشہ کی چیزوں کی ممانعت ہے مذہب اسلام اس بات پر فخر کرسکتا ہے کہ اس میں پرہیزگاری کا ایک ایسا درجہ موجود ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا انتہیٰ۔

ہم نظر اختصار انہیں دو چار عیسائی محققوں کے قول پر انحصار کرتے ہیں اور ان محققین بالخصوص لارڈ ولیم میور صاحب بہادر کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنہوں نے بنظر انصاف مذہب اسلام اور نبی علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ کی واقعی واقعی خوبیاں کرنے میں کچھ کمی نہ فرمائی اور منصب تاریخ گوئی کو امانت سے ادا کر دیا۔ اب اگر ہمارے بھائی پادری صاحبان بھی انصاف پر آئیں اور سچے عیسائی ہو جائیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کی صداقت اور رسالت کی شہادت دینے والے یہودیوں کے جھوٹے الزامات سے بری کرنے والے فارقلیط۔ شیلا۔ حضرت خاتم النبیین محمد مصطفیٰ ﷺ کی عداوت سے باز آئیں اور جس طرح یہود حضرت مسیح علیہ السلام کی گستاخی کر کے حیات ابدی سے محروم رہے۔ نجات سے محروم نہ رہیں اور جن کتابوں میں آنحضرت ﷺ بے گناہ اور معصوم کو گالیاں دی ہیں برا بھلا کہا ہے ان کی نسبت عیب لگائے ہیں ان کو جلادیں تو کیا خوب ہو؟

دیکھو بھائیو ضد بالخصوص اللہ کے پاک اور مقدس راہبر لوگوں سے بد ہے اگر تم سچے عیسائی ہو تو برائے خدا زانو حلیہ میں بیٹھ کر سوچو کہ آنحضرت ﷺ نے دین

عیسوی کے حق میں کیا برائی کی ہے بلکہ انہوں نے تو ان کی اور حضرت مریمؑ کی اور دیگر انبیاء کرام علیہ السلام کی نہایت عظمت کی ہے۔ قرآن میں تمہارے اکابر کی محامد اور تصدیق بکثرت ہے زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ تمہارے برخلاف مسئلہ تثلیث و کفارہ والوہیت مسیح کو (کہ جس کو نہ عقل سلیم تسلیم کرتی ہے نہ کسی نبیؑ نے نہ خود حضرت مسیحؑ نے فرمایا ہے) نہیں مانتے جیسا کہ خود عیسائیوں کے محقق فرقے (جیسا کہ مارسیونی آریوس، ابیونی، یونی ٹیرین۔ ارتمن، نکلاتی، نصاریٰ نجران، وغیرہم) اس افراط اور خیال باطل کو نہیں مانتے اسلام کا فریق عجیب فرمانبردار فریق ہے کہ جس کو کسی نبی اور کتاب الٰہی سے انکار نہیں خواہ وہ کسی ملک اور کسی قوم کا ہو بشرطیکہ اس کی نبوت ثابت ہو جائے اور کتاب کا کلام الٰہی ہونا دریافت ہو جائے۔ تم کو البتہ یہود سے مخالفت اور تعصب ہو تو بجا ہے کیونکہ وہ لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کو بری بات پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی کسی کتاب آسمانی میں نہ کوئی بشارت ہے نہ کوئی خبر۔ ان کے مرید محض بے تک عہد عتیق کی آیات کو کھینچ کھانچ کر لاتے ہیں تاہم تک نہیں ملتی نہ ان کے پاس کوئی معجزہ تھا نہ کوئی کرامت گھر سے آوارگی میں بھاگ کر مصر چلے گئے وہاں بعض حکماء سے چند ادویہ مجربہ اور چند نقوش وعمل دیو و جنّ کے مجرب سیکھ آئے تھے اور یورشلیم میں آکر اپنے کرشمے دکھا کر نبی بلکہ خدا تعالیٰ کا بیٹا بن بیٹھے بہت سے احمق ان کے شعبدوں میں آگئے بہت کو سلطنت کا لالچ دیا اور چال چلن کے بھی اچھے نہ تھے چند عورتیں ساتھ رہا کرتی تھیں۔ پہلے انبیاءؑ کو چور اور بٹ مار کہتے تھے (یوحنا ۱۰ باب) پس گرفتار کیے گئے اس وقت کوئی معجزہ بھی نہ دکھا سکے اور سب شعبدے بھول گئے آخر الامر چیخ چیخ کر بڑی ذلت سے جان دیدی چنانچہ اناجیل میں یہ مرقوم ہے کہ ان کے ساتھ جو لالچی لوگ تھے سب تر بھر ہو گئے کچھ شعبدے حواریوں نے سیکھ لئے تھے ان کو دکھا کر لوگوں کو بہکاتے پھرے آخر قسطنطین بادشاہِ روم جو بڑا ظالم تھا عیسائی ہوا اس نے بزور شمشیر لوگوں کو عیسائی کیا

۔ چونکہ اس مذہب میں شریعت پر عمل کرنے والے پر لعنت ہے ان کے ہاں سور و شراب کتا گدھا وغیرہ ہر چیز مباح ہے۔ نہ عبادت ہے نہ ترقی اور تجارت اور صنعت سے یہ لوگ اور چل نکلے الخ۔

میں کہتا ہوں: پادری صاحب! کیا یہ کفریات ان کفر کی باتوں سے کم ہیں جو آپ نے سید المرسلین ﷺ کی جناب میں بکے ہیں؟ ہمارے نزدیک جو جواب ان کا ہے وہی ان کا۔ مگر آپ کا یہاں دم بند ہے۔ (مقدمہ تفسیر حقانی ۱/۱۰۶)

کیا جہاد لوٹ مار ہے؟

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

تعجب ہے کہ جو لوٹ مچائیں، ڈاکو کے کام کریں، کرائیں۔ وہ خدا، پیغمبر اور ایماندار کہلائیں۔ ساتھ ہی اللہ کا ڈر بتلاتے اور ڈاکہ مارتے جاتے ہیں۔

جواب: یہاں پر سوامی جی اور ان کے چیلوں کی خاطر منو جی کا پرمان ستیارتھ پرکاش سے سناتے ہیں:

دل لگا کر سنو! منو جی پرمان دیتے ہیں:

''اس آئین کو کبھی نہ توڑے کہ لڑائی میں جس جس ملازم یا افسر نے جو جو گاڑی گھوڑا، ہاتھی، چھتر، دولت، رسد، گائے وغیرہ جانور نیز عورت (ہیں سوامی جی! یہ کیا؟) اور دیگر قسم کا مال و متاع اور گھی و تیل وغیرہ کے لئے فتح کئے ہوں وہی اس کو لیں۔ لیکن فوج کے آدمی فتح کی ہوئی چیزوں میں سے سولہواں حصہ راجا کو دیں۔''

(ستیارتھ پرکاش صفحہ ۱۰۶، سملاس ۶، ۱۳۲)

سماجیو! یہ کہنے کے تم مجاز نہیں کہ منو جی کا کلام ہم نہیں مانتے۔ اس لئے کہ تمہارے رشی بلکہ مہرشی نے جب اس کو معتبر اور مستند سمجھ کر نقل کیا ہے تو تمہارا یہ حق ساقط۔

یہی وہ لوٹ ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے نہ یہ کہ جس کو ڈاکہ کہا کرتے ہیں۔ کیونکہ جس لفظ قرآنی کا یہ ترجمہ ہے وہ انفال ہے اور انفال جمع نفل کی ہے۔ نفل لغت میں مال غنیمت کو جو لڑائی میں غالب کے ہاتھ آتا ہے کہتے ہیں دیکھو لغت کی کتاب صراح وغیرہ۔

جنگ بدر کی فتح کے بعد جو اسلام میں پہلی فتح تھی۔ غنیمت کے مال کی تقسیم کے متعلق مسلمانوں میں باہمی تکرار ہوئی۔ اس پر یہ آیت اتری کہ مال غنیمت تمہاری رائے پر تقسیم نہ ہوگا بلکہ جس طرح اللہ اور اللہ کے بتلانے سے اس کا رسول حکم دے گا اسی طرح کرو اور اس حکم کی مخالفت کرنے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ (حق پرکاش)

جہاد پر اعتراض

اعتراض: (بیس برن لالہ اندر من ہندو کا اعتراض)

اگر مسلمانوں کے خدا میں رحمت کی صفت ہوتی تو دین اسلام میں جہاد کا حکم نہ ہوتا اور ہزاروں لاکھوں آدمی قتل نہ کیے جاتے۔

جواب: دشمنوں کے مارنے اور ان کے قتل کرنے اور ان سے جنگ کرنے کے بہت سے حالات واقعات اور حکم ہندوؤں کی کتابوں میں موجود ہیں۔ یہاں بعض حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔

باعث فتنہ وفساد مہابھارت اور قتل کنس اور جراسندہ اور سنپال اور بالآخر اس کی زبان پر یہ آنا کہ میں قاتل ہوں اور واسطے قتل خلائق کے مجسم ہوا ہوں۔ قتل میں خلقت کے مشغول ہوں۔ جتنے لشکری میدان میں موجود ہیں بالجملہ ان کے سوائے تیرے کوئی باقی نہ رہے گا۔ (ادھیائے گیارہ کرشن گیتا)

اس عبارت میں تو صاف طور پر ہندوؤں کا خدا قتل مخلوقات پر کمربستہ ہے' کیا یہ رحمت کے منافی نہیں ہے؟

ادھیائے ۸۴، اسکند دہم بھاگوت میں مذکور ہے۔

یہ (یعنی کرشن) آپ ہی برہما ہوا و بچاتے ہیں بشن ہو پالتی ہیں۔ شیو ہو سنگھارتے ہیں، ان کی گت اپرم پار ہے اس میں کچھ کسی کے بدھ کام نہیں کرتی اور اتنا ان کی کرپا سے ہم جانتے ہیں کہ سادھو کے سکھ دینے کو اور دشتوں کے مارنے کو اور سناتن دھرم چلانے کو بار بار اوتارے پر بھوآتے ہیں۔ انتہیٰ

کیا ان حوالوں میں دشمنوں کے قتل کرنے کا ذکر نہیں ہے کیا یہاں ہندوؤں کا خدا مہربان ہو گیا ہے۔ (سوط اللہ الجبار ص ۴۱۔۴۲)

آس پاس کے لوگوں سے جہاد کیوں؟

آیت کا ترجمہ:

اے ایمان والوان کفار سے جو تمہارے آس پاس ہیں جہاد کرو اور چاہیے کہ ان کو تم میں سختی معلوم ہو اور جان لو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے

(سورۃ التوبۃ: ۱۲۳)

اعتراض: (دیانند سرسوتی کا اعتراض)

دیکھئے محسن کشی کی تعلیم خدا مسلمانوں کو سکھلاتا ہے کہ پڑوسیوں اور غلاموں سے لڑائی کرو۔ اور موقع پا کر لڑو یا قتل کرو۔ ایسی باتیں مسلمانوں سے بہت پھیلی ہیں۔ گویا اسی قرآن کی تحریر سے اب تو مسلمان سمجھ کر قرآن کی ان برائیوں کو چھوڑ دیں تو بہت اچھا ہے۔

جواب: ''سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست''

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر جہاد کی نوبت آئے اور جو شرائط جہاد کی ہیں (جن کا کسی قدر ذکر ابھی ہو چکا ہے) متحقق ہو جائیں تو نزدیک والے دشمنوں سے جو ملک کی حدود سے متصل ہوں پہلے لڑنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ ان کو بغلی گھونسہ چھوڑ کر دور دراز

والوں سے لڑنے جاؤ۔ اسی کے مطابق منو جی کا پرمان سنو!

”جس طرف لڑائی ہو رہی ہو اسی طرف فوج کا سامنا کرے۔ لیکن دوسری طرف پختہ انتظام رکھے ورنہ پیچھے سے یا بغل میں سے دشمنوں کی گھات کا ہونا ممکن ہے۔“

(مندرجہ ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۰۱، سملاس ۶، نمبر ۵۲)

سماجیو! ایسی فاش غلطیاں دیکھ کر سوامی جی کی ستیارتھ پرکاش کو بند کر دو تو اچھا ہے ورنہ پچھتاؤ گے مگر کام نہ آئے گا۔ (حق پرکاش)

جنگ بدر میں نزول ملائکہ پر اعتراضات

اعتـــراض: بعض لوگ جیسا کہ ابوبکر اصم اور پھر معتزلہ اور ان کے مرید نیچریہ وغیرہم اس مقام پر یہ کہتے ہیں کہ جنگ بدر میں کیا کسی لڑائی میں بھی فرشتے نہیں آتے تھے۔ دلائل عقلیہ یہ ہیں۔

(۱) ایک فرشتہ تمام ملک کو برباد کرنے کو کافی ہے پھر ہزاروں کی کیا ضرورت تھی؟

(۲) اگر خدا کو فرشتوں ہی سے کام لینا تھا تو صرف ملک الموت کافی تھا یعنی وہ آپ ہی سب جہان کے کافروں کی روح قبض کر لیتا بلکہ اگر ایسا ہی ہے تو اس نے کافر پیدا ہی کیوں کیے؟

(۳) ملائکہ اگر اجسام کثیفہ تھے تو ضرور سب کو نظر آتے اور مسلمانوں کی جماعت کے تین سو آدمیوں کو دکھائی دیتے حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ اور اگر اجسام لطیفہ تھے تو ان میں طاقت ہی کیا تھی جو کسی کو قتل کرتے۔

دلائل نقلیہ ان آیات میں جو اس مقام پر وارد ہیں کہیں یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ نے فرشتے بھیجے بلکہ رسول کا قول نقل کیا ہے کہ جو بوقت جنگ آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے خدا تعالیٰ پر توکل کرنے کیلئے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایسا بھی کر سکتا ہے

(۴) کفار نے بار ہا استدعا کی کہ فرشتہ ہی کیوں نہ خدا تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا مگر ان کی استدعا قبول نہ ہوئی اور نہ ایسا کسی جگہ پہلے معاملہ گزرا ہے نہ یہ باتیں ممکن ہیں۔ بلکہ نیچر کے برخلاف ہیں۔

جواب:

ان دلائل کا یہ جواب ہے۔

(۱) اگرچہ ایک فرشتہ کافی تھا بلکہ اس کی بھی کیا ضرورت صرف خدا اللہ تعالیٰ کا کُن کہنا ہی کافی تھا مگر ہزاروں فرشتوں کا بھیجنا صرف اہل اسلام کی تقویت قلبی اور تقویت ایمان و اعتقاد کیلئے تھا تا کہ ان کو یہ معلوم ہو کہ خدا تعالیٰ اپنے مخلص کی یوں بھی مدد کرتا ہے جیسا کہ خود فرماتا ہے: **وما جعله الله الا بشریٰ لکم ولتطمئن قلوبکم به** اور لفظ **جعل** جو ماضی ہے اپنے حقیقی معنے کے اعتبار سے اس امر کے وقوع پر دلالت کر رہا ہے۔

(۲) اس کا بھی یہ جواب ہے کہ کافروں کے پیدا کرنے اور ملائکہ کے بھیجنے میں مبائنت ثابت کرنا رسالت کا انکار کرنا ہے کیونکہ منکر کہہ سکتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ نے رسول بھیجے تھے تو سرے سے کافر ہی کیوں پیدا کیے تھے۔

(۳) ملائکہ اگرچہ اجسام لطیفہ ہیں مگر جب چاہتے ہیں اجسام کثیفہ میں یعنی انسان کی صورت میں ظاہر ہو سکتے ہیں چنانچہ بدر میں ایسا ہوا اور بیشک وہ لوگوں کو نظر آئے یہ بات کہ سب کو یکساں کیوں نظر نہ آئے کچھ بات نہیں دیکھئے بائبل میں سینکڑوں جا ہے کہ فرشتہ ایک شخص خاص کو نظر آیا اوروں کو نہیں دکھائی دیا اور اس کا سرہم مقدمہ کتاب میں بیان کر آئے ہیں۔

دلائل نقلیہ کا جواب یہ ہے یہ کہنا (کہ فرشتوں کا بھیجنا ثابت نہیں بلکہ صرف وعدہ یا تسلی ہے) بڑی تعجب کی بات ہے کیونکہ اول تو سورہ انفال میں صاف تصریح ہے **فاستجاب لکم الآیہ**، کہ خدا تعالیٰ نے ایسا کر دیا پھر اس سے بڑھ کر اور کیا

تصریح ہوگی؟ دوم خود انہیں آیات میں لفظ جعل وارد ہے اور ضمیر متصل ارسال ملائکہ کی طرف پھرتی ہے ورنہ صرف زبانی جمع خرچ ایسی حالت میں کیا اطمینان قلب اور بشریٰ ہوسکتا تھا؟

(۲) کفار کی استدعا پر ملائکہ نہ بھیجنے کی وجہ خود قرآن مجید میں مذکور ہے وہ یہ کہ اگر ہم بجائے رسولوں کے تمہارے پاس فرشتے بھیجتے تو ضرور وہ انسان کی شکل میں ظاہر ہوکر آتے پھر جن کو رسولوں پر یہ شبہ ہے ان کی نسبت بھی وہی شبہ باقی رہتا کہ کیا معلوم یہ فرشتہ ہے یا آدمی ہے یا کوئی جن و شیطان ہے۔ علاوہ اس کے اس بات میں اور اس بات میں کوئی ملازمہ نہیں کہ جو اس سے اس کی نفی ثابت کی جائے اور یہ کہنا کہ پہلے کبھی فرشتوں سے کام لینا ثابت نہیں سخت بیبا کی ہے دیکھئے توراہ سفر پیدائش کے انیسویں باب میں صاف صریح ہے کہ سدوم اور عمورہ میں جہاں کہ لوط علیہ السلام رہتے تھے فرشتے آدمیوں کی شکل میں آئے اور جب وہاں کے اغلامی لوگوں نے لوط پر حملہ کرنا چاہا تو ان فرشتوں نے لوط کو دروازے کے اندر کھینچ لیا اور صبح کو ان بستیوں پر آگ اور گندھک برسایا اور ان کو نیست و نابود کردیا۔ اسی طرح توراۃ و انجیل و دیگر صحفِ انبیاء سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ فرشتے مخلصین کی اعانت اور خدا تعالیٰ کے دشمنوں کی سر کوبی کیلئے آئے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ بدر کے روز آنحضرت ﷺ نے فرمایا دیکھو یہ جبرئیل ہے جو گھوڑے کی باگ تھامے ہوئے مسلح ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ بدر کے روز ایک انصاری نے ایک مشرک پر حملہ کیا اور اس کے پیچھے دوڑا ہنوز اس کے پاس نہ پہنچا تھا کہ اس پر ایک کوڑا غیب سے پڑا اور یہ آواز کہ اقدم یا خیروم کہ گھوڑی خیزوم آگے بڑھ جب جاکر دیکھا تو وہ شخص مرا ہوا تھا اور اس پر کوڑے کا نشان تھا اس کا منہ پھٹ گیا تھا اس طرح صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ اس روز میں نے رسول اللہ ﷺ کے دائیں اور بائیں دو سوار سفید پوش دیکھتے جو بڑی تیزی سے جنگ کررہے تھے نہ ان کو میں نے دیکھا تھا نہ پھر وہ مجھے نظر آئے یعنی

جبرئیل و مکائیل۔ اور ممکن ہونا ان باتوں کا ہم نے مقدمہ میں ثابت کر دیا ہے۔
(تفسیر حقانی ۲/۹۰)

جنگ میں کفار کی تعداد کو خدا نے کم کر کے دکھایا تھا

شبہ:

کیا خدا تعالیٰ نے پیغمبرؐ اور اس کے اصحابؓ کو غلطی میں مبتلا کیا ہزار کو سو کر کے دکھایا؟ نفس الامری واقعہ کو مخفی کیا۔ جہل مرکب میں پھنسایا اور کیا عالم اسباب میں ایسا ممکن ہے؟

جواب: یہ رؤیت باعتبار ان کی قوت و دلیری کے تھی سو اس لحاظ سے وہ اسی قدر تھے یہ جہل مرکب نہیں نہ غلطی ہے بلکہ چشم حقیقت میں کو نفس الامر پر مطلع کیا اور کفار کا غرور و عجب مسلمانوں کی طاقت اصلی دیکھنے کے لئے حاجب ہو گیا۔ ان کو برعکس دکھائی دیا۔ دنیا میں حس غلطی کرتی ہے خدا تعالیٰ قادر مطلق ہے انسان کے جمیع قوائے اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ رات دن دنیا میں یہی ہو رہا ہے کسی کو کوئی چیز اچھی کر کے دکھاتا ہے اسی کو دوسرے کی نظر میں مکروہ بناتا ہے جس قوم اور دولت کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے ان کی نظر میں مخالف کو کمزور دکھاتا ہے۔ مخالفت کو ان پر جراءت دلا کر مقابلہ کرا دیتا ہے ان کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ مسبب اسباب کی ہر روز نئی شان ہے آنکھ ہو تو دیکھ لو۔ (تفسیر حقانی ۲/۴۷۰، ۴۷۱)

اگر خدا مجاہدوں کی پہلے مدد کرتا تھا تو اب کیوں نہیں کرتا؟

آیت کا ترجمہ:

جب آپؐ مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کیا تمہیں کافی نہیں کہ تمہاری مدد کیلئے تمہارے رب (آسمان سے) اترنے والے تین ہزار فرشتے بھیجے۔ (سورۂ عمران: ۱۲۴)۔

اعتراض: (دیانند سرسوتی کا اعتراض)

اگر مسلمانوں کو تین ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد دیتا تھا تو اب جبکہ ان کی بادشاہت بہت سی برباد ہوگئی اور ہو رہی ہے کیوں مدد نہیں دیتا۔

جواب: خوب کہی مگر سوامی جی! کیا وجہ ہے کہ ایشور کا وعدہ مندرجہ رگوید سلطان محمود غزنوی اور محمد غوری کے مقابلہ میں ظاہر نہ ہوا بلکہ آج تک بھی ویسا ہے؟

سنو! ایشور آ گیا (حکم) دیتا ہے:

تمہارے آیدہ آتش گیر اسلحہ اور تیر کمان وغیرہ ہتھیار میری عنایت سے مضبوط اور فتح نصیب ہوں۔ بدکردار دشمنوں کی شکست اور تمہاری فتح ہو، تمہاری فوج جرار کارگزار اور نامی گرامی ہو تا کہ تمہاری عالمگیر حکومت روئے زمین پر قائم ہو۔ (کبھی ہوئی بھی؟) رگ ویداشٹک ۱، ادہیائے ۳، ورگ ۱، منتر ۲

اگر کہیں کہ وید میں یہ بھی مذکور ہے کہ

جب تک لوگ دھرم پر چلتے رہتے ہیں تب تک سلطنت بڑھتی رہتی ہے اور جب بداعمال ہو جاتے ہیں تو راج نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ (منڈل ۱، سکت ۳۱، منتر ۲) تو اسی کے وزن کا قرآنی پرمان بھی سنئے! اور غور سے سنئے!

أَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ.

تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان میں مضبوط ہو گے۔

پنڈت جی! کیا ہی سچ ہے کہ

''ہٹ دھرمی مذہب کی تاریکی میں پھنس کر عقل کو زائل کر لیتے ہیں۔''

(دیباچہ ستیارتھ)

کیا سب لڑائیاں خدا کی مرضی سے ہوتی ہیں؟

آیت کا ترجمہ:

لیکن بعض تو ان میں سے ایمان لائے اور بعض نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو یہ باہم نہ لڑتے لیکن اللہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔ (سورۃ البقرۃ: ۲۵۳)

اعتراض: (پنڈت سرسوتی کا اعتراض)

کیا جتنی لڑائیاں ہوتی ہیں وہ خدا ہی کی مرضی سے ہوتی ہیں؟

جواب: سوامی جی! ہر ایک بات پر غور و فکر کرنا شرط ہے آپ نے 'رضا اور مشیت' میں فرق نہیں سمجھا۔ جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے خدا کی مشیت (ارادہ) سے ہوتا ہے۔ مشیت اس کے قانون کا نام ہے۔ بسا اوقات شاہی قانون پر عمل کرنے سے رضا حاصل نہیں ہوتی۔ کیا آج کل ممالک مغربی و شمالی کے مسلمانوں کا اردو ڈیفنس میں کانفرنس کرنا میموریل پر میموریل دینا شاہی قانون کے مطابق نہیں؟ جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ لیفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے منشاء سے ہیں یعنی گورنمنٹ کے قانون کے مطابق ہیں۔ مگر جہاں تک ہمیں قرائن سے معلوم ہے کہ لیفٹیننٹ گورنر ممالک مذکورہ کی رضا اس میں نہیں یہ ایک مثال انسانی مشیت اور رضاء کی ہے۔

اب سنئے! خدائی قانون۔ ایک ظالم کسی مظلوم پر حملہ کر کے تمام مال و اسباب چھین لیتا ہے کئی طرح کے ظلم کرتا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ قانون خداوندی کے مطابق وہ فعل ہوتا ہے یعنی خدائی قانون ہے کہ زبردست کمزور کو دبا سکے۔ خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر۔ پس کسی طاقتور کا کسی کمزور پر حملہ کر کے اس پر ظلم و ستم کرنا مطابق قانون خدا تو ہے مگر کیا اس میں رضائے خدا بھی ہے؟

سماجیو! سوچ کر جواب دینا۔

اور سنو! جوان مرد جوان عورت جب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو دونوں کے

دل میں جو جو خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ وہ قانون قدرت کے ماتحت ہوتے ہیں اس کے بعد فریقین سے جو سرزد ہو جاتا ہے جس کو ہر مذہب برا جانتا ہے۔ وہ بھی اسی قانون قدرت کے ماتحت ہوتا ہے۔ تو کیا قانون قدرت کا مالک (پرمیشور) ان افعال پر راضی ہے؟ سماجیو! نیوگ اس سے مستثنیٰ ہے اس لئے سوچ سمجھ کر جواب دینا۔

پس! آپ اس مختصر تقریر پر غور کریں اور آئندہ کو خدائی مشیت اور رضا میں فرق سمجھا کریں۔

پس اس فقرہ کی کہ کیا جتنی لڑائیں ہوتی ہیں خدا ہی کی مرضی سے ہوتی ہیں۔
یوں تصحیح کیجئے۔
''جتنی لڑائیاں ہوتی ہیں خدا ہی کی مشیت (قانون) سے ہوتی ہیں۔''
جس کا جواب ہم دیں گے۔

''ھاں''

کیونکہ بغیر مشیت خداوندی کچھ نہیں ہوسکتا۔ ''وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ'' کے بھی یہی معنی ہیں۔ قرآن کی آیت زیر بحث میں بھی یَشَاءُ کا لفظ ہے۔ جس کا دہاتو (مصدر) مشیت ہے۔ ورت مان کال (مضارع) یَشَاءُ فقرہ ''جو چاہتا ہے اللہ کرتا ہے۔'' کے بھی یہی معنی ہیں کہ جو اس کا قانون مخلوق کے متعلق ہے اسی کے مطابق کرتا ہے۔ جو ایک طرح سے آپ کی تائید تھی۔ کیونکہ آپ بھی سپر نیچرل (خلاف قانون قدرت) کو محال جانتے ہیں۔ مگر چونکہ آپ اعتراضات کے شوق میں مست ہیں اس لئے اپنی تائید کی بھی تردید کرنے بیٹھ گئے۔ کیونکہ بقول آپ کے
''ہٹ دھرم لوگ تاریکی میں پھنس کر عقل کو زائل کر لیتے ہیں۔''
(دیباچہ ستیارتھ صفحہ ۷)

شہداء کی حیات

آیت کا ترجمہ: ’’جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں۔ ان کے لئے یہ مت کہو کہ وہ مردے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں۔ (آیت: ۱۵۵)

اعتراض: (پنڈت سرسوتی کا اعتراض)

بھلاً خدا کی راہ میں مرنے مارنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ کیوں نہیں کہتے ہو کہ یہ بات اپنا مطلب پورا کرنے کے لئے ہے۔ یعنی یہ لالچ دیں گے تو لوگ خوب لڑیں گے۔ اپنی فتح ہو گی۔ مارنے سے نہ ڈریں گے، لوٹ مار کرنے سے عیش و عشرت حاصل ہو گی۔ بعد ازاں گلچھرے اڑائیں گے۔ اپنی مطلب برآری کے لئے اس قسم کی باتیں گھڑی ہیں۔

جواب: آج معلوم ہوا کہ پنڈت جی دل میں مصنفان وید کو کچھ اور ہی سمجھتے ہیں۔ صرف اپنا مطلب سیدھا کرنے کو ان کے الہام کے قائل ہیں۔

سنو! پرمیشور کہتا ہے۔

’’اے انسانو! تمہارے آید آتش گیر اسلحہ اور تیر و کمان تلوار وغیرہ ہتھیار میری عنایت سے مضبوط اور فتح نصیب ہو۔ بدکردار دشمنوں کی شکست اور تمہاری فتح ہو۔‘‘ (رگ وید اشٹاک ا، ادھیائے ۳، ورگ ۱۸، منتر ۲)

بتلایئے! ایسی جنگ میں آکر آریہ مریں تو کس کی راہ میں مریں گے؟ پرمان تو پرمیشور کا ہے پھر راہ کس کی؟ کیا یہ سچ ہے کہ یونہی بانیان وید نے گلچھرے اڑانے کو پرمیشور کا نام لے دیا۔

ورنہ دراصل ’’مطلب سعدی دیگر ست‘‘۔

جہاد پر اعتراض کرنے والوں کا اپنا چہرہ

اسلام پر حملے

پاکستان اسلام کے نعروں کے پس منظر میں ابھرا تھا۔ اس سے اگر ایک طرف ہندوؤں اور کیمونسٹوں کو پریشانی تھی تو دوسری جانب عیسائیوں اور بالخصوص مشنریوں کو شدید پریشانی لاحق ہوئی۔ عیسائی مشنری تو روز اول ہی سے اسلام کے مخالف ہیں۔ مسیحی ادیب، شعراء، مؤرخین اور وقائع نگاروں نے اسلام اور مسلمانوں کی ایسی ایسی بھیانک تصویریں اپنے قارئین کے ذہن نشین کرائی ہیں کہ ان سے پتھر کے زمانہ کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ ایک عام عیسائی بھی مسلمانوں کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے جو بڑے بڑے پادریوں اور اعلیٰ شہرت رکھنے والے ہم عقیدوں نے ان کو دیا ہے۔ ان عظیم شخصیتوں نے کسی تحقیق و تجسس کے بغیر اسلام اور اسلام کے آخری نبی ﷺ پر بے سروپا ایسے ایسے الزامات لگائے کہ ان کی نقل کرتے ہوئے بھی قلم تھراتا ہے۔

ہونا یہ چاہیے تھا کہ اب اس روشنی کے زمانہ میں عیسائی مشنری اپنا پروپیگنڈا روک دیتے اور زمان و مکان کے فاصلوں کے مٹ جانے سے غلط فہمیاں بھی کم ہو جاتیں لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اس بیسیوں صدی کے آخری نصف میں بھی بظاہر غیر مذہبی اور غیر جانبدار عیسائی ملکوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منظم طور پر کام ہو رہا ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ عیسائی حکومتیں مشنریوں کی بھرپور مدد کرتی ہیں۔ اور چاہتی ہیں کہ پوری دنیا مسیحیت قبول کر لے۔ چنانچہ مختلف ممالک میں جو کام ہوا اس کی مختصر روئیداد ہے۔

اسلام کے خلاف مواد

۱) امریکہ ____ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۸ء کے عرصہ میں۔ اسلام کے خلاف ۲۵ ہزار کتابیں، تیس ہزار پمفلٹ، ساٹھ ہزار مضامین، مقالے، تقاریر اور تین ہزار فلمیں بنائی گئیں۔ (بحوالہ ندائے ملت لاہور ۳۱ مئی ۱۹۷۰)

۲) برطانیہ ____ ۱۹۶۲ سے ۱۹۶۸ء تک اسلام کے خلاف ۲۲ ہزار کتابیں، چالیس ہزار پمفلٹ، بیس ہزار مقالے اور مضامین اور اڑھائی ہزار فلمیں تیار کی گئیں۔ (ایضاً)

۳) فرانس اور سویڈن ____ پندرہ ہزار کتابیں، بارہ ہزار پمفلٹ وغیرہ، پچاس ہزار مقالے اور تین ہزار فلمیں۔

۴) بقیہ یورپ ____ بارہ ہزار کتب، چالیس ہزار مقالے وغیرہ اور دو ہزار فلمیں۔ (ایضاً)

یہ وہ اعداد و شمار ہیں جن کو خود عیسائی ممالک نے بیان کیا ہے اور ان کی تحقیقات مسلمان زعماء نے کی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر عیسائیوں کو اسلام کے خلاف ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب میرے بجائے عیسائیوں کی زبان سے زیادہ مناسب رہے گا ڈاکٹر ڈبلیو منٹگمری واٹ جو خود ایک پادری کے صاحبزادے ہیں۔ ایڈن برا میں پہلے فلسفہ کے استاد تھے پھر عربی سیکھی اور مسلمانوں کے متعلق (ترجمہ کے بجائے) براہ راست اصل کتابیں پڑھیں۔ پھر انہوں نے خود چار کتابیں لکھیں۔ جن میں انہوں نے نسبتاً حقیقت پسندی سے کام لیا۔ اس پر ایک ہنگامہ مچ گیا۔ وہ کہتا ہے کہ ان کتابوں کی وجہ سے اپنے وطن میں انہیں بہت سی باتیں سننا پڑیں۔

وہ نومبر ۱۹۷۳ء میں ''البیرونی'' کے جشن صد سالہ میں شرکت کے لئے پاکستان آئے تھے۔ان کا انٹرویو لیا گیا۔

وہ کہتے ہیں کہ دراصل مغرب کے بیشتر فضلاء جو کسی نہ کسی حیثیت سے اہل کلیسا سے وابستہ رہے۔ اسلام سے صلیبی جنگوں کا انتقام لیتے آئے ہیں۔ چنانچہ تاریخی کتابوں، سفر ناموں اور علوم وفنون میں مسلمانوں کا تصور وحشیوں کا سا نظر آتا ہے۔ اور یورپ کی ذہنی فضاء میں یہ تاثر اس قدر رچ بس گیا ہے کہ ہم اس کے سوا کچھ اور دیکھنے سننے کے قابل نہیں رہے۔ اہل قلم اور اہل علم صلیبی جنگوں میں زیادہ سے زیادہ جوش وخروش پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اگر وہ مسلمانوں کی صحیح تصور پیش کرتے تو اس امر کا شدید خطرہ تھا کہ ان کے ہم مذہب (عیسائی) مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے انکار کر دیں اور پورا ڈرامہ نتیجہ کے بغیر ہی ختم ہو جائے چنانچہ انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کا غلط تصور تراشنے کا فیصلہ کیا۔

ماخوذ از ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور۔ فروری ۱۹۷۴ء صفحہ ۱۷۶ تا ۲۲۳۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی عوامل ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ اسلام حضرت عیسیٰؑ سمیت تمام پیغمبروں کی عظمت اور عفت کا اس حد تک قائل ہے کہ ان پر ایمان ہمارے عقائد کا بنیادی حصہ ہے جب کہ موجودہ کلیسا کی خود ساختہ عیسائیت خدا کے ان برگزیدہ اور معصوم لوگوں پر انتہائی رکیک الزامات لگاتی ہے۔ پھر عقیدہ تثلیث تو ایک ایسا گورکھ دھندا ہے جو سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن اس کے باوجود سمجھا جاتا ہے کہ یہ خلاف عقل نہیں، اس عقیدہ پر ہی موجودہ عیسائیت کی تمام چھوٹی بڑی کلیسائیں بنی ہیں۔ اسلام ان سب کی نہایت مدلل اور بہترین انداز میں تردید کرتا ہے اور مذہب میں عیسائیوں کی تحریفوں اور مذموم کوششوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کو نہایت معصوم، برگزیدہ، اور نیک ترین شخصیت بتاتا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام پر جو رکیک اتہامات لگائے جاتے ہیں پرزور الفاظ میں ان کی تردید کرتا ہے۔

عیسائی پیشواؤں کو اسلام کی یہ صداقت شدت کے ساتھ ناگوار گزری۔ انہوں نے سوچا کہ اسلام کا سیدھا سادا عقیدہ نہ صرف آسان ہے بلکہ قابل فہم بھی ہے۔ پھر مسلمان اپنے عروج کے زمانہ میں جرمنی اور فرانس تک پہنچ چکے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا سادہ اور قابل فہم عقیدہ جو مسیح اور ام مسیح کے بارے میں تھا ان لوگوں تک پہنچتا تو انہیں اندیشہ تھا کہ عیسائی اپنی عیسائیت کو چھوڑ بیٹھیں گے۔ اس لئے انہوں نے اسلام کو موجودہ عیسائیت کے خلاف سازش گردانا۔ (لوتھرن، ویسٹرن ویز آف اسلام)

ابتداء میں تو وہ عیسائیت کی مدافعت کرتے رہے۔ لیکن بعد میں اسلام کو برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ ان کے لئے یہ زندگی اور موت کی جنگ تھی۔

بیروت کالج کے ڈاکٹر جارج ای پوسٹ نے ۱۸۸۸ء میں کہا کہ یہ زندگی کی بقاء کی لڑائی ہے جو ان پر (مسلمانوں پر) فتح حاصل کرنے کے لئے ہم نے شروع کی ہے۔ ورنہ وہ ہم پر فتح پالیں گے ہم کو وسطی ایشیاء جانا چاہئے، عرب جانا چاہئے سوڈان جانا چاہئے، اور ہمیں ان لوگوں کو عیسائی بنانا چاہئے۔ ورنہ وہ صحراؤں کو عبور کریں گے۔ وہ آندھی کی طرح فراٹے بھریں گے اور ہماری عیسائیت کو ہڑپ کر جائیں گے اور اسے برباد کر دیں گے۔ (اسلام۔ اے چیلنج ٹو فیتھ)

جب پاکستان اسلامی نظریہ کے دعویٰ کے ساتھ دنیا کے نقشہ پر ابھرا تو پوری عیسائی مشزیوں میں ایک ہلچل مچ گئی۔ اور قیام کے دن سے ہی انہوں نے اس پر امداد اور ہمدردی کے روپ میں دھاوے بولنا شروع کر دیئے۔ دوسرے محاذوں کے ساتھ ساتھ ان مشزیوں نے پاکستان میں خود اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا۔ پمفلٹ لکھے، کتابیں شائع کیں اور بائیبل کارسپانڈنس اسکول کھولے۔

ان کے علاوہ جو عیسائی جرائد و رسائل ہفتہ وار، پندرہ روزہ یا ماہانہ نکلتے ہیں، ان میں بھی کہیں بین السطور اور کہیں واضح طور پر اسلام اور اکابرین اسلام پر حملوں کے ساتھ ساتھ عیسائیت کے پرچار پر ابھارنے کی تحریریں ہوتی ہیں۔ ایک مثال عیسائی

پندرہ روزہ رسالہ ''شاداب'' لاہور کی پیش کی جاتی ہے۔ یہ رسالہ مرکزی و صوبائی سرکاری اشتہارات کی اشاعت کے لئے منظور شدہ ہے۔ اس میں صفحہ ۴۴ پر بچوں کے لئے ''انگوٹھی'' کے عنوان سے ایک قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اسلوب تحریر، انداز بیان، اور خود قصہ سے صلاح الدین ایوبی کے متعلق شدید نفرت انگیز تاثر پیدا ہوتا ہے۔

(تفصیل کیلئے دیکھئے: شاداب لاہور ۱۶ اکتوبر تا ۳۱ ۱۹۷۳ء صفحہ ۴۴)

مشزیوں نے اس طرح پاکستان میں ابتدائی دن ہی سے اپنی کاوشوں کو تبلیغ عیسائیت کے لئے تیز کر دیا ہے۔ ان کی مساعی ان کی کاوشیں، ان کی اچھی مالی حالت، ان کا آپس میں تعاون، ان کی عیسائی حکومتوں کی سرپرستی یہ وہ عوامل ہیں جن کے نتیجے میں انہوں نے مغربی پاکستان میں اس حد تک کامیابی حاصل کرلی کہ صرف ایک سال ۱۹۵۷ء میں آٹھ ہزار مسلمانوں کو بپتسمہ دے کر عیسائی بنالیا۔ [۲]

[۲] دی پراسپیکٹر، کینیڈا، اکتوبر ۱۹۵۸ء۔

عیسائیوں کے مسلمانوں پر سفاکی کے کربناک منظر

نکلسن اپنی شقاوت قلبی کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

''دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کے خلاف ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیئے جس کی رو سے ہم ان کو زندہ جلاسکیں یا زندہ کی کھال اتار سکیں یا گرم سلاخوں سے اذیت دے کر ان کو موت کے گھاٹ اتار سکیں۔ ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کرنے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کیے دیتا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ کاش میں دنیا کے کسی ایسے گمنام گوشہ میں چلا جاؤں جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں حسب ضرورت سنگین انتقام لے کر دل کی بھڑاس نکال سکوں۔ [۲]

[۲] انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ صفحہ ۵۸، ۶۹ شیخ حسام الدین۔

نکلسن کی یہ آرزو پوری ہوئی۔ موری تھامسن نے بعض قیدیوں کی داستانیں سرہنری کاٹن کو ان الفاظ میں سنائیں۔

شام کے وقت ایک سکھ اردلی میرے خیمہ میں آیا اور سلام کر کے پوچھنے لگا۔ غالباً آپ یہ دیکھنا پسند کریں گے کہ ہم نے قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ کہیں قیدیوں کے ساتھ زیادتی نہ کی گئی ہو میں فوراً لپک کر ان کے خیمہ کی طرف گیا۔ جہاں پر میں نے ان بد بخت مسلمانوں کو عالم نزع میں بے حال دیکھا۔ مشکیں باندھ کر ان کو برہنہ زمین پر لٹایا ہوا تھا۔ اور سر سے پاؤں تک ان کے پورے جسم کو گرم تانبے سے داغا ہوا تھا اس روح فرسا حالت کو دیکھ کر میں نے اپنے پستول سے ان کا خاتمہ کر دینا ہی ان کے حق میں مناسب سمجھا۔ [1]

[1] ایضاً صفحہ ۵۶ تا ۶۶۔

ایک دوسرے عینی شاہد کی زبانی سنئے کہ سکھوں اور انگریزوں نے ایک زندہ مسلمان قیدی کے چہرہ کو بار بار سنگینوں سے زخمی کر کے ہلکی آگ میں کس طرح جلایا۔ بد نصیب قیدی کے جلتے ہوئے گوشت سے مکروہ بدبو نکل کر اس آس پاس کی فضاء کو مسموم کر رہی تھی۔ انیسویں صدی میں جب کہ تہذیب اور شائستگی پر ناز کیا جاتا تھا۔ ایک ایسا دردناک نظارہ دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ ایک انسان نہایت وحشیانہ طریق سے آگ میں جلایا جا رہا ہے اور سکھ اور عیسائی (یورپین) نہایت اطمینان سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر ارد گرد کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ گویا یہ ایک تفریح کا سامان ہے۔

(ایضاً صفحہ ۶۷)

ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر ڈیلین نے دنیا کو سب سے پہلے ان مظالم سے روشناس کرایا۔ اس نے اپنے ایک اداریہ میں لکھا:

''زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر

سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بد فعلی کریں۔ دنیا کی کوئی تہذیب بھی ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات کی اجازت نہیں دیتی۔ ہماری گردنیں شرم وندامت سے جھک جاتی ہیں اور یقیناً ایسی حرکات عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہیں جن کا کفارہ لازمی طور پر ہمیں ایک دن ادا کرنا پڑے گا ہمیں اس قسم کی دردناک جسمانی اور دماغی سزاؤں کے دینے کا کوئی حق نہیں۔ اور نہ ہی ہم یورپین ایسی سزائیں دینے کی جرأت کر سکتے ہیں۔" (ایضاً صفحہ ۶۹)

مسیحی انصاف اس طرح جاری تھا۔ کہ دارالخلافہ دہلی کے چاندنی چوک میں روزانہ سینکڑوں بے گناہوں کو قطار میں کھڑا کر کے باری باری پھانسی دی جاتی تھی۔ تین ماہ تک آٹھ گاڑیاں روزانہ لاشوں سے بھر کر روانہ کی جاتی تھیں۔ کئی لاشیں پھانسی پر لٹکتی رہتیں۔ اور بے گناہوں کے کرب واذیت سے خوش ہونے کے لئے انگریز مرد اور عورتیں فوارے کے گرد کرسیاں بچھا کر بیٹھ جاتے۔ عیسائی مرد اور عورتیں مسکرا مسکرا کر اور سگریٹ کے کش لگا لگا کر پھانسی کا منظر دیکھتے اور عورتیں اپنا منہ چھپا لیتی تھیں۔

ایک طرف مسیحی انصاف اس طرح پورا ہو رہا تھا۔ دوسری جانب انجیل کے حکم کی یوں پابندی کی جا رہی تھی کہ ہندوستانیوں کے مذہب پر کھلم کھلا حملے ہو رہے تھے۔ انگلینڈ سے پادری آئے جگہ جگہ مشنری اسکولز قائم ہوئے۔ یہ پادری عام اجتماعات اور میلوں میں جا کر انجیل کی بشارت سناتے دوسرے مذاہب کے بزرگوں اور متبرک مقامات کا حقارت سے ذکر کرتے۔ ان کے مذہبی رسم ورواج کا مذاق اڑاتے۔ اور اپنے ان تمام مظالم کو یسوع مسیح کی امداد و برکت سے منسوب کرتے۔

کوپر لکھتا ہے کہ عیسائیت کے فروغ کے لئے خداوند یسوع مسیح کی روشن اور ظاہر امداد و برکت کے مقابلہ میں انسانی شجاعت ودانائی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اسی صفحہ پر آگے چل کر صلیب کے نشان کو گزند نہ پہنچنے کے سلسلہ میں کہتا ہے کہ عیسائیت

نے تمام دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے بعد عیسائیوں نے ان کو معاشی طور پر تباہ کرنے کی سازشیں کیں۔ ان کی جائیدادیں ضبط کیں ان کے اثاثے لوٹے۔ انہیں ملازمتوں سے دور رکھا۔ اگر مجبوراً ملازمت دی بھی تو نہایت نچلے درجے کی۔

ہنٹر ایک متعصب سول سروس کا افسر تھا وہ مسلمانوں پر عیسائی حکومت کے ظلم و ستم کا عینی شاہد تھا وہ کہتا ہے کہ ۱۸۷۱ء میں بنگال میں سرکاری ملازمتوں کا تناسب حسب ذیل ہے:

یوروپین	۱۳۳۸
ہندو	۶۸۱
مسلم	۹۲

ہائی کورٹ کے وکلاء میں ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۸ کے دوران کل ہندو وکیل ۲۳۹ تھے۔ جب کہ مسلمان وکیل صرف ایک تھا۔

تفصیلات کے لئے انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ، الہلال ستمبر ۱۹۲۷ء دہلی کی جان کنی، اسباب بغاوت ہند وغیرہ ملاحظہ فرمائیے۔

ممکن ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ یہ اس وقت کے واقعات ہیں جب سامراج اپنا تسلط قائم کر رہا تھا اس صدی میں ایسا ممکن نہیں کیوں کہ دنیا اب زیادہ روشن خیال ہو گئی ہے یہ سامراج سمٹ رہا ہے لیکن یہ محض خوش فہمی ہے اس لئے کہ استعمار اور مشنریز اب بھی وہی ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ البتہ سائنٹی فک انداز میں۔ بیافرا میں کیا کچھ نہیں ہوا؟ اسرائیل کس طرح وجود میں آیا؟ رہوڈیشیا اب تک کیوں کر قائم ہے؟ فلپائن، انڈونیشیا اور افریقہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یسوع مسیح کی بے گناہی کے گن گانے والی قوم ان ممالک میں کیا کیا گناہ نہیں کر رہی ہے۔

فلپائن میں عیسائیوں کی زیادتیاں

مارچ ۱۹۷۳ء کے آخری ہفتہ میں بن غازی میں ۲۸ ملکوں کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس منعقد ہوئی اس کانفرنس میں مسلمانوں کے ان پیش آمدہ مسائل پر غور ہوا جو مغربی اور مشرقی سامراجیوں کے پیدا کردہ تھے۔ ان کی سازشوں سے جنم لینے والے پیچیدہ اور پریشان کن مسائل۔ ان کانفرنس میں فلپائن کے مصیبت زدہ اور ستم کش مسلمانوں کا مسئلہ بھی پیش ہوا۔ اس کانفرنس میں لیبیا کے وزیر خارجہ جناب منصور نے بتایا کہ مارکوس (فلپائن کا حکمران) اور اس کا مسلح وحشی جتھہ ایک منظم منصوبہ نافذ کرنے کے لئے فلپائن کے چالیس لاکھ مسلمانوں کی نسل کشی میں مصروف ہے۔

اسلامی سیکرٹریٹ کے سیکرٹری جنرل تنکو عبدالرحمٰن نے اپنی تقریر میں بتایا کہ فلپائنی مسلمانوں کو ان کے گھروں اور زمینوں سے جبراً نکال دیا گیا ہے۔ اور کیتھولک عیسائیوں نے ان پر قبضہ کرلیا ہے۔ بے شمار مسلمان مارے جا چکے ہیں۔

فلپائنی حکومت کے نمائندہ نے کانفرنس میں اس کی تردید کی ناکام کوشش کی تو ایک فلپائنی خاتون نورہ لقمان نے کھڑے ہوکر بآواز بلند اعلان کیا۔ ''تم جھوٹے ہو جھوٹے۔'' اسی وقت لیبیا کا ایک نمائندہ ایک فلپائنی بچہ اٹھائے ہال میں داخل ہوا۔ بچہ کی عمر سات سال تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اور ایک کان غائب تھا۔ بتایا گیا کہ اس کے والدین کو فلپائنی فوج نے مار ڈالا ہے۔ اور اس کا ایک ہاتھ اور ایک کان کاٹ ڈالا ہے۔ فلپائن میں اس وقت چالیس لاکھ مسلمان ہیں۔ اور انہیں طرح طرح سے تنگ کیا جارہا ہے۔ اور اس روشن زمانہ میں بھی ان پر عذاب کے پہاڑ توڑ جارہے ہیں۔

انڈونیشیا کے اخبار ''قبلہ'' نے یکم اپریل ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی۔ ''فلپائن کی حکمران پارٹی اور ایوان زیریں کی مصالحتی کمیٹی کے ایک ممبر تو ڈولا ناپٹو واد نے منڈاناو کے دورے کے بعد ان مظالم کی داستان سنائی جو عیسائی نوآبادکار

مسلمانوں پر کر رہے ہیں وہ ان کے کان کاٹ کر بوتلوں میں رکھ لیتے ہیں تاکہ انہیں " مقدس پانی" میں ڈبونے کے بعد بطور تعویذ استعمال کریں اور ایسے نڈر اور غیر فانی بن کر جائیں کہ مسلمانوں کے ساتھ لڑتے وقت ان پر کوئی ہتھیار اثر نہ کرے۔

دسمبر ۱۹۶۹ء سے ۱۱ فروری ۱۹۷۲ء تک عیسائیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو جان و مال کا جو نقصان اٹھانا پڑا۔ ان کا سرسری جائزہ ملاحظہ ہو گو یہ اعداد و شمار مکمل نہیں ہیں۔

مسلمان مقتولین	۱۸۴۵
مسلمان زخمی	۴۲۰
مسلمانوں کے مکانات جو جلا دیئے گئے	۲۵۶۱
مسجدیں جنہیں آگ لگائی گئی	۱۱
دیہات اور شہر جہاں سے مسلمانوں کو نکالا گیا	۱۱
زمین جس سے بے دخل کیا گیا	۵ لاکھ ہیکٹر

انڈونیشیا کے لئے مسیحی منصوبہ

انڈونیشیا کے ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء میں سامراج سے نام نہاد آزادی ملی ہے۔ اسے عیسائی مشنری اداروں نے دس سے بیس سال کے عرصہ میں عیسائی بنانے کا ایک زبردست اور جامع منصوبہ تیار کیا ہے۔ ویٹیکن (پاپائے روم) نے ایک کارڈی نل اور اکیس پادری عیسائیت کے اس حملہ کی نگرانی کے لئے تعینات کئے ہیں۔ کیتھولک کلیسا نے حال ہی میں اپنے حملہ کا آغاز ان علاقوں میں کیا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس حملہ میں مغربی ممالک کے فراہم کئے ہوئے مادی اور مالی وسائل سے کام لیا جا رہا ہے۔

پروٹسٹنٹ فرقہ نے الگ اپنا ایک ۱۰ سے ۲۰ سالہ جامع منصوبہ بنایا ہے جسے ایک کتاب کی شکل میں شائع بھی کر دیا ہے۔ کتاب کا عنوان ہے " ہمارا آج کا فرض

انڈونیشیا میں''۔ اس منصوبہ کی تیاری میں علمی تجربات مسلمانوں کے متعلق دینی و اجتماعی معلومات نیز سائنسی ایجادات سے کام لیا گیا ہے۔ اس منصوبہ کے مطابق جگہ جگہ کلیساؤں، سکولوں اور ہسپتالوں کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہے۔ جرأت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ عیسائیت کا پرچار کرنے والے مسلمانوں کے گھروں میں جا کر مردوں کی عدم موجودگی میں عورتوں کو ہر طرح کا لالچ دیتے ہیں اور اپنے دام میں گرفتار کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔

''وہاں تبشیری ادارے (عیسائی مشنری ادارے) کسی بھی بڑی سے بڑی مہم کے لئے تیار ہیں۔ وہ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اندرونی معاملات میں دخل دیتے ہیں۔ آریانا میں جب حق خودارادی کے لئے رائے شماری ہو رہی تھی۔ تو ان ہی کلیساؤں نے انڈونیشی حکومت کے خلاف بغاوت کی سازش کی جو پکڑی گئی۔

''یہ بھی یاد ہو گا کہ صدر سوئیکارنو کے عہد میں جب کمیونسٹوں کا زور تھا تو انڈونیشیا اقتصادی طور پر دیوالیہ ہو گیا تھا۔ یہ ایک معجزہ سے کم نہیں کہ انڈونیشیا نے اپنے آپ کو کمیونسٹوں کے چنگل سے چھڑا لیا۔ وہ امریکہ جس نے ویت نام میں کمیونزم کو پسپا کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ اس نے اور اس کے ساتھ دوسری مغربی طاقتوں نے اقتصادی مار سے انڈونیشیا کو ناک چنے جبوائے اور اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ تب کہیں جا کر قرضوں کی ادائیگی میں مہلت اور اقتصادی امداد دی۔ اہم بات یہ ہے کہ اس اقتصادی امداد میں تبشیری اداروں (عیسائی مشنریوں) کو باقاعدہ شریک کیا گیا۔ بہت سے پروگرام ایسے ہیں جن کی نگرانی براہ راست مبشرین (مشنریوں) کو سونپی گئی۔ مثلاً بون (مغربی جرمنی) نے جو اٹھارہ ملین (ایک کروڑ اسی لاکھ مارک) کی رقم دی۔ وہ مشنریوں کے تصرف میں ہے۔''

انڈونیشیا کے وہ علاقے جہاں کے باشندے کسی دین و مذہب سے بھی آشنا نہیں (مثلاً کالی مانتان کے دایاک قبائل) ایسے مقامات پر کلیسہ کے لوگ ''اغراء''

یعنی مادی فوائد کے ساتھ پوری طرح چھائے ہوئے ہیں۔ کالی مانتان کے علاقہ میں نقل وحمل نہروں کے ذریعہ ہے جس میں خاصی دشواری ہوتی ہے اور بہت وقت لگتا ہے۔ کلیسا کے کارندے چھوٹے ہوائی جہازوں کے مالک ہیں۔ وہ ہر قسم کی مشینیں اور آلات رکھتے ہیں۔ جولائی ۱۹۷۳ء میں جکارتا کے اخباروں نے یہ خبر شائع کی تھی کہ کیتھولک مشن نے انڈونیشی حکومت کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہے جس کی رو سے مشن کو یہ حق ہوگا کہ غذائی اشیاء اور ادویہ ڈیوٹی سے مستثنیٰ درآمد کرے۔ اور کالی مانتان کے علاقہ میں پہنچائے۔ پنج سالہ منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں بھی کلیسا نے اپنے تعاون کی پیشکش کی ہے۔"

۱۹۵۶ء میں انڈونیشیا کی پارلیمنٹ میں عیسائی ممبر تھے۔ عیسائیوں نے وہاں کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کا جو عظیم منصوبہ شروع کیا ہوا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک ہی جزیرہ میں عیسائیت قبول کرنے والوں کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی ہے۔ جب کہ یہ ملک تقریباً ۱۴ سو چھوٹے بڑے جزیروں پر مشتمل ہے۔

گلور کہتا ہے کہ صرف جاوا میں کوئی ایک لاکھ مسلمان عیسائی بن چکے ہیں۔ دنیا میں کسی جگہ بھی مشنریوں کا ایسا شاندار ریکارڈ قائم نہیں ہوا۔

(پاکستان میں مسیحیت صفحہ ۲۶۸ تا ۲۷۳)

اسلام میں غلاموں سے سلوک

اعتراض: (کفار کا اعتراض)

اسلام کے مسئلہ غلامی پر کفار کو بڑا شدید اعتراض ہے وہ ہمیشہ اس کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں مناسب ہے کہ ذیل میں اس مسئلہ کو تفصیل سے ذکر کر دیا جائے۔

جواب: حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

یہ ایک امر واقع ہے جس کی تصدیق روزمرہ واقعات سے ہو رہی ہے کہ

مسلمانوں میں مالک اور مملوک کا تعلق مغرب میں آقا اور نوکر کے تعلق سے بدرجہا بہتر ہے جو لوگ صاحب مرتبہ یا صاحب ثروت ہیں وہ غریب لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں مگر یہ تحقیران مغربی اقوام میں سب سے بڑھی ہوئی ہے جن کو اس بات پر فخر ہے کہ ہم غلامی کے رواج سے آزاد ہو چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ غلامی کے نام کو انہوں نے دور کر دیا ہے مگر اس کی حقیقت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ایک مہذب مغربی جب ایک غیر قوم کے آدمی ملازم رکھتا ہے تو وہ اسے وحشی سے بھی بدتر سمجھ کر سلوک کرتا ہے خصوصاً اس حالت میں جب ملازم کا کام ادنٰی درجہ کا ہو اور جہاں تک سختی اور سلوک کا سوال ہے کوئی شخص امتیاز نہیں کر سکتا کہ صاحب کا سلوک اپنے نوکر سے اچھا ہے یا قدیم زمانہ میں ایک رومی کا تعلق اپنے غلام سے اچھا تھا شاید ہی کوئی موسم گرما ایسا گزرتا ہوگا جب یہ آواز ہمارے کانوں میں نہ پڑتی ہو کہ ایک غریب پنکھا قلی کو آقا نے مار مار کر صرف اس لئے ہلاک کر دیا کہ اس بدقسمت کو تھک کر ذرا اونگھ آ گئی تھی اس حالت میں میں نہیں سمجھتا کہ رومی مالک کو وہ کونسا اختیار اپنے غلام پر حاصل تھا۔ جواب ایک مہذب عیسائی کو اپنے نوکر پر حاصل نہیں یا کونسی بدسلوکی وہ کرتا تھا جو اب نہیں کی جاتی اور گالیاں دینا یا معمولی طور پر مار لینا تو کوئی بات ہی نہیں۔ مہذب مغربی اقوام کو غلامی کے موقوف کرنے پر اس وقت تک فخر نہیں کرنا چاہئے جب تک حقیقت غلامی یعنی نوکروں پر ظلم اور ان کے ساتھ بدسلوکی سے وہ نجات حاصل نہ کرلیں مگر غلامی موقوف کرنے میں بڑی غرض یہ تھی کہ جو ظلم ایک مالک مملوک سے خدمت لینے میں کر سکتا ہے ان کو روکا جائے اور ان لوگوں کو جو کہ غلام کہلاتے ہیں ان کو ذلیل حالت سے نکال کر دوسرے انسانوں کی طرح ان کو سمجھا جائے تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یورپ میں سے ابھی تک غلامی کا رواج دور نہیں ہوا اور ابھی تک وہ مقصد حاصل نہیں کیا جو اسلام اس سے تیرہ سو برس پہلے حاصل کر چکا ہے کیا یہ سچ نہیں کہ یورپین دیسی ملازموں کو جن سے وہ خدمت کا کام لیتے

ہیں وحشیوں سے (بلکہ بلی کتوں سے) اچھا نہیں سمجھتے۔ پھر اتنی بات سے کیا فرق ہو جائے گا کہ وہ ان کا نام غلام نہیں بلکہ خادم رکھتے ہیں آقا اور خادم کے سچے تعلقات کو سمجھنے میں یورپ ابھی اسلام سے باوجود تیرہ صدیاں گزر جانے کے بہت پیچھے ہے جو ذلت قدیم اقوام میں غلام کے نام سے لگی ہوئی تھی اور جو ذلت آج بھی غریب اور کم حیثیت آدمیوں کی کی جاتی ہے اسلام نے اس کو غلامی کے نام سے قطعاً دور کر دیا اور نہ صرف لفظوں میں ہی بلکہ عملی طور پر اسے جڑ سے کاٹ دیا۔ اسلام کے ظہور سے آقا اور خادم ایک مالک اور مملوک کے تعلقات سچے برادرانہ تعلقات سے بدل گئے۔ آقا اپنے غلام کی محنت کے کاموں میں شریک ہونے لگا۔ اور غلام اپنے آقا کی وجاہت اور عزت میں شریک ہو گیا یہ صرف انہیں آقاؤں کی حالت نہ تھی جو سوسائٹی کے درمیانی یا نیچے درجہ میں تھے بلکہ معزز سے معزز اور دولت مند سے دولت مند آقاؤں کا بھی یہی حال تھا سب سے پہلے ہمیں قرآن شریف کی تعلیم پر غور کرنا چاہئے کہ وہ غلاموں کے ساتھ کیسا سلوک چاہتا ہے۔ اس بارے میں مندرجہ ذیل آیت قرآن کریم کی وارد ہے:

واعبدوا الله ولاتشركوا به شيئا و بالوالدين احسانا و بذى القربى واليتمىٰ والمساكين والجار ذى القربىٰ والجار الجنب وابن السبيل وما ملكت ايمانكم ان الله لا يحب من كان مختالاً فخوراً. (النساء رکوع ۶ آیت ۳۶)

یعنی اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ اور احسان کرو ماں باپ کے ساتھ اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور قرابت والے پڑوسیوں اور اجنبی پڑوسیوں اور پاس کے بیٹھنے والوں اور مسافروں اور لونڈی غلاموں کے ساتھ جو تمہارے قبضہ میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا جو اترائیں (یعنی دوسروں

کے حقوق کی پرواہ نہ کریں) اور بڑائی مارتے پھریں (یعنی دوسروں کو حقیر سمجھیں)۔

اس آیت شریف میں دو قسم کے احکام ایک ہی جگہ اکٹھے کر کے بیان کیے گئے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی مخلوق سے نیکی اور دوسرے حصہ میں بعض لوگ جن کے ساتھ انسان کو نیکی کرنی چاہیے مخصوص کر کے بیان کیے گئے ہیں۔ تا کہ ان کی طرف زیادہ توجہ ہو ان دونوں احکام کو ایک ہی جگہ بیان کرنے سے یہ مقصود ہے کہ جیسا اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور اس کا کوئی شریک نہ ٹھہرانا اسلام لانے کے لئے ضروری ہے ویسا ہی مخلوق کے ساتھ بھی نیکی کرنا ضروری ہے کیونکہ یہی دو شریعت کے بھاری اجزاء ہیں یعنی اللہ تعالیٰ سے سچا تعلق پیدا کرنا اور اس کی مخلوق سے نیکی کرنا۔

پس جہاں انجیل غلاموں کے ساتھ سلوک کرنے کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہتی قرآن کریم اسے ایسا ضروری قرار دیتا ہے جیسا والدین سے نیکی کرنا کیونکہ ایک ہی الفاظ میں دونوں احکام بیان کیے گئے ہیں۔ یہ اس قدر صاف حکم غلاموں سے نیکی کرنے کا ہے جس سے کوئی دشمن اسلام بھی انکار نہیں کر سکتا۔

چنانچہ ہلیو نے اپنی ڈکشنری آف اسلام میں اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ

یہ بالکل صاف امر ہے کہ قرآن شریف اور احادیث میں غلاموں کے ساتھ نیکی کرنے کی بڑے زور کے ساتھ تاکید کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ دینی اخوت کا سلسلہ جو اسلام نے قائم کیا وہ بجائے خود ایک زبردست محرک نیک سلوک کا تھا۔ آزاد عورتوں اور غلاموں کے درمیان اور آزاد مرد اور لونڈیوں کے درمیان نکاح جائز قرار دیئے گئے ایک مشرکہ آزاد عورت اور مسلمان لونڈی میں نکاح کے وقت ترجیح لونڈی کو دی گئی اور ایک مشرک مرد اور مسلمان غلام میں ترجیح غلام مرد کو دی گئی۔ بات بات پر غلاموں کے آزاد کرنے کا حکم دیا گیا اور

اسے بعض گناہوں کا کفارہ قرار دے کر یہ سمجھایا گیا کہ غلاموں کے ساتھ نیکی کرنا اور ان کو آزاد کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت ہی محبوب فعل ہے لونڈی اگر نکاح کے بعد فحش کی مرتکب ہو تو اس کی سزا آزاد عورت سے نصف رکھی گئی ہے۔

غلاموں کے نکاح کرنے کا خاص طور پور حکم دیا گیا چنانچہ فرمایا:

وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامائکم ان یکونوا فقراء یغنیھم اللہ من فضلہ. (النور رکوع ۴ آیت: ۳۲)

ترجمہ: اور تم میں سے جن کے ازواج نہیں ان کے نکاح کرو۔ اور نیز تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو نیک بخت ہوں ان کے بھی نکاح کرو اگر یہ لوگ محتاج ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے گا۔

قبل از اسلام جو برائیاں عرب میں لونڈی غلاموں کے معاملہ میں تھیں ان سب کو دور کیا گیا منجملہ ان کے ایک یہ بدرسم بھی تھی کہ لونڈیوں سے بدکاری کرا کر اس مال سے فائدہ اٹھاتے۔ جس کی خاص طور پر ممانعت قرآن شریف میں کی گئی ہے۔

یہ ہیں قرآن شریف کے احکام ان میں سب سے پہلے یہ امر دیکھنا چاہئے کہ ان احکام سے آنحضرت ﷺ کے اقوال اور آپ کے متبعین نے کیا سمجھا اور ان پر کیونکر عمل کیا اس غرض کے لئے احادیث میں آنحضرت ﷺ کے اقوال اور آپ کے عمل کو سب سے پہلے دیکھنا چاہئے۔ احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر زور ہمارے نبی کریم ﷺ نے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کرنے پر دیا اور پھر خود بھی اس حسن سلوک کا نمونہ دکھایا ہے اس سے اگر موازنہ کیا جائے تو یہی کہنا پڑے گا کہ کسی دوسرے مصلح نے آپ کے بالمقابل کچھ نہیں کیا سب سے پہلے میں (صحیح بخاری ۱۹۵/۳) کی احادیث کو بیان کرتا ہوں اور پھر دوسری متفرق احادیث کو۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

ان اخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ولا تکلفوھم ما یغلبھم فان کلفتموھم ما فغلبھم فاعینوھم.

ترجمہ: یعنی یہ تمہارے بھائی تمہارے خدمتگار ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارے ہاتھ کے نیچے رکھا ہے پس جس شخص کا بھائی اس کے ہاتھ کے نیچے ہو اسے چاہیئے کہ جو چیز آپ کھاتا ہے اسی میں سے اسے بھی کھلائے اور جو پوشاک آپ پہنتا ہے اسی میں سے اسے بھی پہنائے اور ان پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈالو جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو اور اگر ان کی طاقت سے زیادہ کام ان کو دو تو پھر ان کو مدد بھی دو۔

بتاؤ کہ اور کونسا ایسا انسانوں کا ہمدرد پیدا ہوا ہے یا کون مصلح ہے جس نے ایسی کامل اخوت آقا اور غلام میں پیدا کی ہو جو صرف الفاظ تک ہی محدود نہیں بلکہ عملی رنگ میں ہے کہ مالک اور مملوک کا ایک سا ہی لباس اور ایک سی خوراک ہو پھر یہی نہیں بلکہ غلاموں کی حالت بہت ہی قابل رشک معلوم ہوتی ہے جب ہم آپ کے ایک صحابیؓ کے یہ پیارے الفاظ پڑھتے ہیں:

والذی نفسی بیدہ لولا الجھاد فی سبیل اللہ والحج والرمی لاحببت ان اموت وانا مملوک.

ترجمہ: قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر اللہ کی راہ میں جہاد اور حج اور اپنی ماں کی خدمت نہ ہوتی تو میں پسند کرتا کہ غلامی کی حالت میں مروں۔

پھر غلاموں اور لونڈیوں کے ساتھ حسن سلوک صرف اسی حد تک محدود نہیں رکھا گیا کہ ان سے کام لیا جائے اور ان کے ساتھ نیکی کی جائے بلکہ ان کی عمدہ پرورش کے لئے بھی جناب رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خاص طور پر ارشاد فرمایا ہے

چنانچہ لونڈیوں کے متعلق یہ حدیث ارشاد فرمائی:

قال النبی ﷺ ایما رجل کانت له جاریة فادبها فاحسن تعلیمها واعتقها وتزوجها فله اجران. (بخاری ۱۹۵/۳)

ترجمہ: فرمایا نبی کریم ﷺ نے جس شخص کے پاس لونڈی ہو پھر وہ اس کی تادیب کرے یعنی اسے اعلیٰ درجہ کے نیک اخلاق کی تربیت دے اور اس کو نہایت عمدہ تعلیم دے پھر اس کے بعد اسے آزاد کرے اور اس سے نکاح کرے اس کے لئے دوہرا اجر ہے۔

اس حدیث کی طرف سے خصوصیت سے ان کوتاہ نظروں کو توجہ دلاتا ہوں جو یہ کہا کرتے ہیں کہ اسلام عورت کو جاہل رکھنا چاہتا ہے، وہ غور کریں کہ آزاد عورتیں تو ایک طرف رہیں اسلام تو لونڈیوں کے متعلق بھی یہ حکم دیتا ہے کہ ان کو نہایت عمدہ تعلیم اور تربیت دی جائے اسی حدیث سے نہایت صفائی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا مطمح نظر غلاموں اور لونڈیوں کو کس درجہ تک ترقی دینے کا ہے۔

بہت سی اور حدیثیں ہیں جن میں غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کے بارہ میں تاکید کی گئی ہے ان میں سے مشکوٰۃ کی بعض حدیثوں کا ترجمہ لیں۔

صاحب نے اپنے ترجمہ الف لیلہ کے نوٹوں میں دیا ہے اور انہی کو ہلیون نے اپنی ڈکشنری آف اسلام میں نقل کیا ہے ان میں سے بعض کا اردو ترجمہ میں یہاں ذکر کر دیتا ہوں۔

اپنے غلاموں کو اس کھانے میں سے کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور وہی لباس پہناؤ۔ جو تم خود پہنتے ہو اور ان کو ایسا کام کرنے کو نہ دو جو ان کی طاقت سے بڑھ کر ہو جو شخص اپنے غلام کو بلاوجہ مارتا ہے یا اس کے منہ پر مارتا ہے اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اسے آزاد کر دے۔ جو شخص اپنے غلام سے سختی کرتا ہے وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ جو شخص اپنی لونڈی کو بیچ کر

ماں اور بیٹے میں جدائی پیدا کرتا ہے اللہ تعالی قیامت کے دن اسے اس کے دوستوں سے جدا کرے گا۔

ان تمام احادیث سے نہایت صاف اور یقینی شہادت اس بات کی ملتی ہے کہ مذہب اسلام میں غلام کو غلام سمجھا ہی نہیں گیا بلکہ اس کے کام کو الگ چھوڑ کر جو اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ وہ ہر طرح سے اپنے مالک کے برابر سمجھا گیا ہے۔ تیرہ سو سال گزر چکے ہیں جب پہلے ایک سچے ہمدرد بنی نوع انسان نے یہ ہدایتیں جاری کیں نہ صرف جاری ہیں بلکہ ان پر عمل کیا اور کرایا مگر آج باوجود تیرہ سو سال گزر جانے کے اور باوجود بڑے بڑے ہمدردی کے دعووں کے کسی شخص میں اس قدر اخلاقی جرأت بھی نہیں جو ان ہدایتوں پر عمل کرنا تو در کنار رہا، نوکروں کے متعلق اسی قسم کی ہدایتیں دینے کی جرأت کرے۔

اب میں چند اور حدیثیں نقل کرتا ہوں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو کہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے کس قدر تاکید غلاموں اور لونڈیوں کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق کی ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ مرض الموت میں آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے: الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم. جس کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزوں کا خاص طور پر خیال رکھنا یعنی نماز اور غلاموں اور لونڈیوں کے ساتھ حسن سلوک کا۔

اس حدیث سے کیسی صفائی کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں انسانوں کے ساتھ اور خصوصا اس جماعت کے ساتھ جس کو دنیا کی سب قوموں نے ذلیل سمجھا اور اب تک ذلیل سمجھ رہے ہیں۔ (یعنی غلام) کیسا سچی ہمدردی کا جوش تھا اور کس قدر ان کی بہتری کا فکر و تڑپ کو تھا کہ اخیر وقت میں بھی یہی لفظ آپ ؐ کے منہ سے نکلے آپ کیا چاہتے تھے۔

ایک شخص کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ آپ کے پاس آیا اور آپ سے پوچھا کہ میں کتنی مرتبہ اپنے غلام کو معاف کیا کروں آپ نے منہ پھیر لیا اور کوئی جواب اس کے سوال کا

نہ دیا وہ دوسری دفعہ اور پھر تیسری دفعہ سامنے آیا اور یہی سوال دہرایا اور آنحضرت ﷺ اسی طرح بغیر جواب دینے کے منہ پھیر لیا۔ چوتھی مرتبہ جب اس نے سوال کیا تو آپ نے فرمایا: **اعف عن عبدک سبعین مرۃ فی کل یوم** (بخاری ۴/۱۹۵)۔ یعنی تو ہر روز ستر دفعہ اپنے غلام کو معاف کیا کر۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا آج ان اقوام میں جو مہذب کہلاتی ہیں ایک آدمی بھی ایسا ہے جو اپنے خدمتگار کو باوجود قصور کے ستر دفعہ معاف کر سکے مگر اسلام میں غلاموں کے متعلق واقعی ایسا عملدر آمد ہوا آپ کا دل یہ بھی گورا نہ کر سکتا تھا کہ غلام کو غلام پکارا جائے کیونکہ اس نام میں حقارت پائی جاتی تھی اور آپ پسند نہ کرتے تھے کہ کسی قسم کی بھی تحقیر کی جائے۔

چنانچہ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے یہ حدیث روایت کی ہے:

لایقل احدکم عبدی و امتی ولیقل فتای وفتاتی و غلامی.

چاہیئے کہ تم یہ نہ کہو کہ میرا غلام یا میری لونڈی بلکہ یوں کہو کہ میرا فتا یا فتاۃ یا اے میرے نوجوان۔

(یہ لفظ فتی ہر ایک جوان مرد اور جوان عورت پر بولے جاتے ہیں لفظ غلام بھی عربی میں عبد اور امۃ کہنے سے اس لئے روکا کہ یہ الفاظ عموماً لونڈیوں اور غلاموں پر بھی بولے جاتے تھے اور وہ الفاظ جن کے بولنے کی ہدایت کی ہے وہ عام ہیں آزاد مردوں اور عورتوں پر بھی بولے جاتے ہیں اور اس نہی کی اور توجیہہ بھی ہے۔

اس کے بعد میں یہ بیان کروں گا کہ ان ہدایات پر عمل بھی کیا جاتا تھا یا نہیں اور اگر کیا جاتا تھا تو کس حد تک مگر قبل اس کے کہ میں عمل کی نظیریں پیش کروں ایک شبہ کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ

اگر غلاموں کو اس قدر حقوق دیئے گئے تھے اور ان کی اس قدر رعایت ضروری تھی جیسا کہ حدیثوں سے پتہ لگتا ہے تو پھر مالک اور مملوک میں فرق ہی کیا تھا۔ اس کا

جواب خود آنحضرت ﷺ کی حدیث میں موجود ہے اور یہ حدیث بھی صحیح بخاری میں مذکورہ ہے۔ چنانچہ فرمایا:

کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته فالامیر الذی علی الناس راع وھو مسئول عنھم والرجل راع علی اھل بیته وھو مسئول عنھم والمرأة راعیة علی بیت بعلھا و ولدہ وھی مسئولة والعبد راع علی مال سیدہ وھو مسئول عنه.

(بخاری ۱۹۵/۲)

ترجمہ: یعنی تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور اس سے اپنی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ پس امیر جو لوگوں پر مقرر حاکم ہے اس سے ان لوگوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔ اور عورت اپنے خاوند کے گھر پر اور اس کی اولاد پر حاکم ہے اس سے ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔ اور غلام اپنے آقا کے مال پر حاکم ہے اس سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔

اس حدیث کی رو سے ہر ایک شخص کے سپرد جدا جدا کام ہے۔ اور ایک رنگ میں ایک شخص حاکم ہے اور دوسرے رنگ میں وہی محکوم ہے اسلام ایسی مساوات کی تعلیم نہیں دیتا جس سے چھوٹوں بڑوں کا امتیاز بھی اٹھ جائے اور دنیا کے کاروبار بند ہو جائیں۔ بلکہ ایک ایسی اخوت قائم کرتا ہے کہ کام بھی سب کے الگ الگ رہیں اور سوسائٹی میں بڑے بھی ہوں اور چھوٹے بھی۔ مگر اس کے ساتھ ان میں انسان اور پھر بھائی ہونے کی حیثیت سے ایک مساوات بھی نہ ہو کام مقرر کرنے سے اسلام کی پاک تعلیم کا یہ منشاء ہے کہ آقا غلام کے کام کو ذلیل سمجھ کر اسے ہاتھ نہ لگانے دے اور آقا کا کام غلام کی عزت سے بڑھ کر سمجھا جائے بلکہ یہ بھی حکم ہے کہ ضرورت کے وقت آقا کا کام غلام کے کام میں اس کی مدد کرے اور جو فوائد آقا اٹھاتا ہے غلام کو ان سے محروم نہ رکھا جائے البتہ فرق دونوں میں یہ رکھا ہے کہ آقا کو چاہیئے کہ وہ اپنے غلام سے نیکی

کرے اور احسان برتے اور غلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے آقا کی سچے دل سے فرمانبرداری کرے وہ اپنے اپنے مفوضہ کاموں کو بجالائیں باقی امور میں وہ مساوی ہیں۔

اب میں چند مثالیں بیان کرتا ہوں۔ ہمارے نبی ﷺ نہ صرف معلم ہی تھے بلکہ ہر بات میں خود ایک پاک نمونہ بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی تعلیم کا وہ زبردست اثر آپ کے صحابہؓ اور مسلمانوں پر ہوا:

حضرت انسؓ نے آپ کے واقعات خادموں کے ساتھ نیکی کرنے کے بیان کیئے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ میں دس سال تک آنحضرت ﷺ کی خدمت کرتا رہا اس عرصہ میں کبھی آپ نے مجھ کو اُف تک نہیں کہا۔ جب میں نے کوئی کام کیا تو مجھے یہ نہیں کہا کہ یہ کام تم نے کیوں کیا اور اگر کوئی کام نہیں کیا تو یہ نہیں کہا کہ یہ کیوں نہیں کیا اور آپ کا سلوک تمام دنیا سے بڑھ کر اچھا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی خادم یا کسی عورت کو نہیں مارا۔

آپ کے صادق محبت اور مخلص بھی آپ کے نقش قدم پر ہی چلتے تھے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ نے اسیران جنگ میں سے ایک اسیر ایک صحابی ابوالہیثمؓ کو بطور غلام کے دیا اور ان کو نصیحت کی کہ اس سے نیک سلوک کرنا۔ ابوالہیثمؓ اس غلام کو لے کر گھر گئے اور اپنی بی بی کو کہا آنحضرت ﷺ نے مجھے یہ غلام دیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ وصیت کی ہے کہ اس سے اچھا سلوک کرنا۔ بی بی نے کہا کہ اس نصیحت پر تم پورا کیونکر عمل کر سکتے ہو۔ سوائے اس کے کہ غلام کو آزاد کر دو چنانچہ ابوالہیثمؓ نے وہ غلام اسی وقت آزاد کر دیا۔

زنباع نے اپنے ایک غلام کو ایک لونڈی کے ساتھ پایا اور اور اس کی ناک کاٹ ڈالی غلام آنحضرت ﷺ کے پاس گیا آپ نے پوچھا کہ کس نے تیرا یہ حال کیا ہے غلام نے کہا زنباع نے چنانچہ اس وقت زنباع کو طلب کیا گیا اس نے جو دیکھا تھا بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ نے غلام کو فرمایا کہ جا تو آزاد ہے پھر غلام نے کہا یا رسول اللہ! میں کس کا مولیٰ کہلاؤں گا (یعنی میرا معاون اور مددگار کون ہوگا)؟ آپ نے فرمایا خدا

اور اس کے رسول کا مولیٰ۔ چنانچہ اسی وعدہ کے مطابق آپ جب تک جیتے رہے اس کی مدد کرتے رہے آپ کی وفات کے بعد وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا اور واقعہ آپ کو یاد دلایا اس پر حضرت ابوبکرؓ نے اس کے بعد وہ حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا آپ نے پوچھا تو کہاں جانا چاہتا ہے عرض کیا مصر میں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے حاکم مصر کے نام حکم لکھ دیا کہ اس کو اس کے گزارہ کے لئے زمین دیدو۔ سبحان اللہ کیسا پاک وعدہ تھا اس کا اور کیسا پاک ایفاء ہوا۔

ابو مسعود انصاریؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ ناگہاں میں نے اپنے پیچھے سے یہ آواز سنی۔ ابو مسعود یاد رکھو کہ جس قدر طاقتور حاکم تم اس پر ہو اس سے زیادہ طاقتور حاکم خدا تم پر ہے ابو مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جب میں نے پیچھے پھر کر دیکھا تو آنحضرت ﷺ تھے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے اسی وقت اس کو خدا کے لئے آزاد کر دیا آپ نے فرمایا کہ اگر تم اسے آزاد نہ کرتے تو تم آگ میں پڑتے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے ایک روز دیکھا کہ ایک آدمی سوار ہے اور اس کا غلام اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہے آپ نے فرمایا اسے اپنے پیچھے بٹھالو کیونکہ یہ تمہارا بھائی ہے اور اس کی روح بھی تمہاری روح کی طرح ہے۔

کہتے ہیں میں نے ابوذرؓ کو دیکھا کہ وہ ایک نیا عمدہ لباس پہنے ہوئے ہیں میں نے پوچھا تو فرمایا کہ ایک دفعہ میں نے ایک آدمی کو (اس سے مراد کوئی غلام ہے) کچھ برا بھلا کہا۔ اس نے میری شکایت نبی کریم ﷺ کے پاس کی آپ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ تم نے اس کی ماں سے اس کو عار دلائی اور پھر فرمایا کہ تمہارے غلام اور نوکر چاکر تمہارے بھائی ہیں پس جس شخص کا بھائی اس کے ہاتھ کے نیچے ہو اسے چاہیے کہ اپنے کھانے سے اسے کھلاؤ اور اپنے لباس سے کپڑا پہنا دو تم اپنے غلاموں کو ایسا کام نہ دو جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو اور اگر دو تو پھر اس کے کرنے میں خود مدد دو۔

حضرت عثمانؓ کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے ایک غلام کی نافرمانی کی وجہ

سے اس کا کان مروڑا اور پھر اپنے فعل سے توبہ کی اور اسی غلام سے کہا کہ تو بھی اسی طرح میرا کان مروڑ۔ مگر اس نے انکار کیا آپ نے اصرار کیا تو اس نے آہستہ آہستہ کان مروڑنا شروع کیا آپ نے کہا زور سے مروڑو کیونکہ میں قیامت کے دن سزا برداشت نہیں کر سکتا۔ غلام نے جواب دیا اے میرے آقا جس دن سے تو ڈرتا ہے اسی دن سے میں بھی ڈرتا ہوں۔

حضرت زین العابدین کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ ان کے ایک غلام نے بھیڑ کو پکڑتے ہوئے اس کی ایک ٹانگ توڑ دی انہوں نے کہا کہ تو نے کیوں ایسا کیا۔ کہا آپ کو غصہ دلانے کیلئے۔ آپ نے فرمایا جس نے تجھے یہ تعلیم دی میں اسے غصہ دلاؤں گا یعنی شیطان کو۔ جا تو خدا کے لئے آزاد ہے۔

غلاموں یا آزادہ کردہ غلاموں کو بڑے بڑے عہدے دیئے جاتے تھے۔ اسامہ کو جو کہ حضرت زید کے بیٹے تھے خود آنحضرت ﷺ نے ایک فوج کا افسر بنایا قبل اس کے کہ یہ فوج روانہ ہو آنحضرت ﷺ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کو لوگوں نے کہا کہ آپ کسی اور بڑے آدمی کو افسر بنائیں۔ مگر آپ بہت ناراض ہوئے کہ جو کام میرے پیارے محبوب اور آقا نے کیا ہے میں اسے منسوخ کروں۔ جب فوج کی روانگی کا وقت آیا تو آپ اسامہ کے ساتھ ساتھ پیدل روانہ ہوئے اور وہ سوار تھے۔ انہوں نے عرض کی کہ اے خلیفہ رسول اللہ یا آپ بھی سوار ہو جائیں اور یا مجھے اجازت دیں کہ میں بھی پیدل چلوں۔ مگر آپ نے نہ مانا اور کچھ دیر تک نصیحت کرتے ہوئے اسی طرح ساتھ گئے۔

جب حضرت عمرؓ نے مصر کی فتح کا ارادہ کیا تو اول صلح کا پیغام دے کر ایک جماعت حاکم مصر کے پاس بھیجی جس کا سردار عبادہؓ کو قرار دیا جو حبشی تھے اور حبشی اس زمانہ میں بطور غلاموں کے فروخت ہوتے تھے۔ جب یہ جماعت حاکم مصر کے سامنے آئی تو اس نے کہا کہ اس حبشی کو باہر نکال دو انہوں نے کہا کہ یہی تو ہمارا سردار ہے اور

جو کچھ یہ کہے گا یا کرے گا اس کے ہم پابند ہیں۔

مقوقس حیران ہوا اور پوچھا تم نے ایک حبشی کو اپنا سردار کیونکر بنالیا۔ انہوں نے کہا کہ سرداری ہمارے درمیان قومیت یا رنگ پر نہیں بلکہ فضیلت پر ہے اور یہ ہم سب میں سے افضل ہے۔

حضرت عمرؓ جیسے بادشاہ کا سلوک جو اپنے غلاموں سے تھا۔ وہ ظاہر کرتا ہے کہ ابتدائی اسلامی سوسائٹی میں غلاموں کی کیا حیثیت تھی اور وہ لوگ کس طرح اپنے پیارے نبی ﷺ کے لفظوں پر عمل کرتے تھے۔ جب حضرت ابو عبیدہؓ نے امیر المؤمنین کو لکھا تو آپ فی الفور روانہ ہو گئے آپ کے ساتھ آپ کا غلام بھی تھا۔ مگر سواری کے لئے اونٹ صرف ایک ہی تھا اس لئے خلیفہ اور غلام باری باری اس پر چڑھے اور جس کی باری نہ ہوتی وہ پیدل ہمراہ دوڑتا۔ جب آپ ابو عبیدہؓ کے ڈیرے کے قریب پہنچے تو اتفاقاً غلام کی باری سواری کی آگئی آپ اتر کھڑے ہوئے اور غلام کو سوار کیا اور آپ پیدل ہمراہ بھاگتے تھے اور تمام نظریں آپ کی طرف لگی ہوئی تھیں ابو عبیدہ نے اس بات سے ڈر کر کہ امیر المؤمنین کو اس طرح پیدل بھاگتا ہوا دیکھ کر یروشلم کے رہائشیوں پر برا اثر نہ ہوا اور مبادا جنگ رخ پلٹ دے۔ غرض کیا تمام نظریں آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں اس صورت میں یہ مناسب نہیں کہ آپ کا غلام تو سوار ہو اور آپ نوکروں کی طرح ساتھ ساتھ بھاگیں۔

حضرت عمرؓ اس بات کو سن کر غضب میں آئے اور فرمایا کہ تجھ سے پہلے مجھے ایسا کسی نے نہیں کہا۔ ہم سب لوگوں سے زیادہ ذلیل اور حقیر اور سب سے تھوڑے تھے خدا نے اسلام کے ذریعے ہمیں بڑائی اور عزت دی اور اگر ہم ان راہوں سے جو کہ اسلام نے ہمیں سکھائی ہیں الگ چل کر عزت تلاش کریں گے تو پھر خدا ہمیں ذلیل کرے گا؟ جس سے آپ کا یہ مطلب تھا کہ اسلام نے تعلیم دی ہے کہ تم اپنی عزت اسی میں سمجھو کہ اپنے غلاموں کو اپنے برابر رکھو اگر ہم اس مساوات میں اپنی ذلت سمجھنے لگیں

گے۔ تو پھر خدا ہمیں ذلیل کرے گا۔ کیونکہ اس کی بتائی ہوئی راہ کو ہم چھوڑ دیں گے۔

میں کہتا ہوں کہ آیا آج بھی دنیا میں کوئی ایسا فاتح موجود ہے یا کوئی چھوٹی سے چھوٹی ریاست کا حکمران ایسا موجود ہے یا کوئی شخص جو کسی بڑے عہدہ پر ممتاز ہو ایسا ہے کہ وہ ایسی اخلاقی جرأت دکھا سکے جو حضرت عمرؓ نے دکھائی یا نیک سلوک کا وہ نمونہ دکھا سکے جو ایک بڑے بادشاہ اسلام نے دکھایا۔

کیا حضرت عمرؓ اس سے ناواقف تھے کہ ایک نئے فتح ہوئے ہوئے ملک پر رعب کا قائم رکھنا کس قدر ضروری ہے؟ نہیں وہ خوب سمجھتے تھے بلکہ جیسا وہ ان معاملات کو سمجھتے تھے ایسا کوئی نہ سمجھتا تھا مگر اسلام کے احکام کی سچی عظمت ان کے دل میں تھی وہ صدق دل سے جانتے تھے کہ ہر ایک عزت اور شوکت انہیں راہوں پر چلنے سے ملے گی اور اگر بعد کے زمانہ میں مسلمانوں نے غلاموں اور نوکروں کے ساتھ اس طریق سے برتاؤ کو چھوڑ دیا تو یہ وہی بات ہے جو حضرت عمرؓ نے کہی تھی۔ انہوں نے اسلامی راہوں کو چھوڑ کر اور راہوں سے عزت تلاش کی تو وہ عزت کو کھو بیٹھے۔ اب بھی جو مسلمان غیر مسلمان اقوام کے نقش قدم پر چل کر دنیا میں معزز بننا چاہتے ہیں اور اسلام کی راہوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں انہیں یہی بات یاد رکھنی چاہئے۔

مگر باوجود ان عملی غلطیوں کے جن میں پچھلے مسلمان پڑ گئے اور مرور زمانہ سے نبی کریم ﷺ کی تعلیم پر کاربند ہونے سے دور جا پڑے یہ امر قابل غور ہے کہ آپ کی نیک تعلیم ایسی ان کے خونوں کے اندر رچ گئی تھی یا یوں کہو کہ آپ کی قوت قدسی ایسی ان پر غالب آ گئی تھی کہ اس پر بھی مسلمانوں کا سلوک اپنے نوکروں اور غلاموں سے غیر اقوام کے سلوک کی نسبت بدرجہا بہتر رہا ہے۔ اور یہ شکر کا مقام ہے کہ ہمیں اس کا ثبوت دینے کی کوئی ضرورت نہیں خود عیسائیوں نے اس کو تسلیم کر لیا ہے۔

لین الف لیلہ کے انگریزی ترجمہ کے نوٹوں میں لکھا ہے:

اور یہ وہ شخص ہے جو مدتوں مصر میں رہا اور مسلمانوں کی حالت کو غور کی نظر

سے دیکھتا رہا۔ وہ کہتا ہے کہ

''مسلمانوں میں غلاموں کے ساتھ عموماً نیک سلوک کیا جاتا ہے۔''

دوسرے ممالک کی نسبت وہ لکھتا ہے کہ

''جتنے سیاحوں نے دوسرے اسلامی ممالک میں سفر کیا ہے ان کی شہادت غلاموں کے ساتھ مسلمانوں کے حسن سلوک کے متعلق بہت ہی قابل اطمینان ہے۔''

اور پھر لکھتا ہے کہ

''قرآن شریف اور احادیث میں جو ہدایتیں'' غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق ہیں عموماً ان سب پر یا ان کے زیادہ حصہ پر مسلمان لوگ عمل کرتے ہیں۔''

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیم غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق عیسائیوں کے گال کے طمانچہ کی تعلیم کی طرح نہیں کہ سراہتے سراہتے ہزارہا کاغذ سیاہ کریں اور جب اس کو دیکھیں تو ایک بھی عمل دنیا میں نظر نہ آئے۔

یہ تو ایک غیر متعصب عیسائی ہے مگر پادری ہلیو کو بھی یہ امر تسلیم کرنا پڑا ہے جیسا کہ وہ لکھا ہے کہ

''مسلمانوں کے ممالک میں غلاموں کے ساتھ سلوک بہت اچھا ہے بمقابلہ اس سلوک کے جو امریکہ میں کیا جاتا ہے جہاں غلاموں کا رواج عیسائی اقوام کے نیچے رہا۔''

ایسا ہی انسائیکلوپیڈیا ببلیکا میں ایک عیسائی مضمون نویس مسلمانوں کے درمیان غلامی کے رواج پر لکھتا ہے۔

''شرقی اسلامی ممالک کی غلامی عموماً کھیت میں مزدوروں کی طرح کام کرنے کی غلامی نہیں بلکہ گھر کے کاروبار کے متعلق ہے غلام کو خاندان کے

ایک ممبر کی طرح سمجھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ محبت اور نرمی سے سلوک
کیا جاتا ہے قرآن شریف غلاموں کے ساتھ نرمی اور مہربانی سے سلوک
کرنے کی روح پھونکتا ہے اور غلام آزاد کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اب اس اسلامی تعلیم اور ان واقعات یقینی کو پیش کرنے کے بعد میں اپنے منصف مزاج ناظرین سے یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ غلامی جس کے رواج کو اسلام نے روک نہیں دیا کیا یہ ایسی غلام ہے کہ اس لفظ کے معمولی مفہوم کی رو سے جو دنیا میں سمجھا جاتا ہے اس کو غلامی کہہ سکیں نہیں بلکہ جہاں تک کہ آج کل کے نوکر کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت دنیا میں جس قدر لوگ خدام کے نام سے موسوم ہیں وہ ایک اسلامی غلام پر رشک کریں گے۔ اور وہ اس خادمی کی حالت سے اس غلامی کی حالت کو بدرجہا بہتر سمجھیں گے۔ غلامی کے معمولی مفہوم کی رو سے تو یہ کہنا بھی جائز نہیں کہ ایک حد تک بھی اسلام نے غلامی کی اجازت دی کیونکہ ہر ایک بدی جو اس سے پیدا ہوتی تھی اسلام کی تعلیم نے اس بدی کو جڑ سے کاٹ دیا جو اپنے آقا کے برابر ہے اس کو غلام کیوں کہا جائے گا۔ اور یہ مساوات اور خاندان کے ایک ممبر کی طرح ہونا صرف لفظ ہی لفظ نہ تھے بلکہ عملی بھی تھے یہ دونوں باتیں اس سے ظاہر ہوتی ہیں کہ جو کھانا آقا کھائے وہی غلام کھائے، جو لباس مالک پہنے وہی مملوک پہنے جہاں وہ رہے اسی جگہ غلام رہے طاقت سے زیادہ کام نہ دینا کبھی سختی سے اسے مخاطب نہ کرنا اور نہ مارنا اس سے بڑھ کر کونسی اصلاح کی دنیا خواہش مند ہوسکتی تھی یہ زمانہ لفظ پرست ہے اور بجائے مغز کے چھلکے پر خوش ہو جاتا ہے نام کو تو غلامی موقوف کر دی گئی مگر افسوس ہے کہ غلامی کی حقیقت ابھی تک مہذب ممالک میں اسی طرح موجود ہے۔ عنقریب دنیا دیکھ لے گی کہ جب تک خاموں کے ساتھ وہ رفق اور نیکی کا طریق نہ برتا جائے گا جس کی تعلیم تیرہ سو سال ہوئے ایک انسانوں کے سچے ہمدرد اور خدا کے برگزیدہ نبی سب سے بڑے برگزیدہ رسول نے دی تھی تب تک غلامی کی موقوفی صرف لفظ موقوفی

ہے اور حقیقۃً اس سے وہ اصلاح نہیں ہوئی جو دنیا کی اخلاقی ترقی کے لئے ضروری ہے اسلام ہی کی تعلیم وہ عملی تعلیم ہے جس پر دنیا چل سکتی ہے اور جس پر انسان انسانوں کے لئے مفید اور خدا تعالیٰ کا سچا بندہ بن سکتا ہے۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں)

اسلامی غلامی کے فوائد وخصوصیات

معاشرت میں اسلام کا ایک حکم یہ ہے کہ اپنے غلاموں کی ستر خطائیں روزانہ معاف کرو، اس سے زیادہ خطائیں ہوں تو کچھ سزا دو۔ بھلا غلاموں کے ساتھ یہ برتاؤ کوئی غیر مسلم کرسکتا ہے؟ غلام تو کیا اولاد کے ساتھ بھی کوئی ایسا برتاؤ نہیں کرسکتا۔ مگر افسوس باوجود اس قدر رعایت کے پھر بھی مخالفوں کو اسلام کے مسئلہ غلامی پر اعتراض ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام نے تو غلاموں سے وہ برتاؤ کیا ہے کہ ان کے باپ بھی ان کے ساتھ ویسا برتاؤ نہیں کرسکتے تھے۔

مسئلہ غلامی کی اصل یہ ہے کہ اس میں مخلوق کی جان بچائی گئی ہے کیونکہ جب ایک دشمن مسلمانوں کے مقابلہ میں فوج کشی کرتا ہو۔ اور اس کے ہزاروں لاکھوں آدمی مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہوں تو کوئی اب ہمیں بتلا دے کہ ان قیدیوں کو کیا کرنا چاہئے ایک صورت تو یہ ہے کہ ان سب کو رہا کردیا جاوے تے اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے۔ کہ دشمن کی ہزاروں لاکھوں کی تعداد کو پھر اپنے مقابلہ کے لئے مستعد کردیا۔ ایک صورت یہ ہے کہ سب کو فوراً قتل کردیا جائے اگر اسلام میں ایسا کیا جاتا تو مخالفین جتنا شور وغل مسئلہ غلامی پر کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اس وقت کرتے کہ دیکھئے کیسا سخت حکم ہے کہ قیدیوں کو فوراً قتل کردیا جائے ایک صورت یہ ہے کہ سب کو کسی جیل میں بند کردیا جائے ، اور وہاں رکھ کر ان کو روٹی کپڑا دیا جائے۔ یہ صورت آج کل کی گو بعض متمدن سلطنتوں میں پسندیدہ ہے مگر اس میں چند خرابیاں ہیں ایک یہ کہ اس سے سلطنت پر بڑا بار عظیم پڑتا ہے اور ان سے کمائی کرنا خودغرضی کی صورت ہے پھر جیلخانہ

کی حفاظت کے لئے ایک خاص فوج مقرر کرنا پڑتی ہے قیدیوں کی ضروریات کے لئے بہت سے آدمی ملازم رکھے جاتے ہیں۔ یہ سارا عملہ بیکار ہو جاتا ہے سلطنت کے کسی اور کام میں نہیں آسکتا۔ قیدیوں ہی کی حفاظت کا ہو رہتا ہے۔ پھر تجربہ شاہد ہے کہ جیل خانہ میں رکھ کر چاہے آپ قیدیوں کو کتنی ہی راحت پہنچائیں اس کی ان کو کچھ قدر ہی نہیں ہوتی کیونکہ آزادی کے سلب ہونے کا غصہ ان کو اس قدر ہوتا ہے کہ وہ آپ کی ساری خاطر و مدارات کو بیکار سمجھتے ہیں تو سلطنت کا اتنا خرچ بھی ہوا اور سب بے سود، کہ اس سے دشمن کی دشمنی میں کمی نہ آئی۔ پھر قید خانہ میں ہزاروں لاکھوں قیدی ہوتے ہیں۔ وہ سب کے سب علمی و تمدنی ترقی سے بالکل محروم رہتے ہیں۔ اور یہ سب بڑا ظلم ہے اسلام نے اس کے بجائے یہ حکم دیا کہ جتنے قیدی گرفتار ہوں وہ سب لشکر والوں کو تقسیم کر دو ایک گھر میں ایک غلام کا خرچہ بھی معلوم نہ ہوگا۔ اور سلطنت بار عظیم سے بچ جائے گی۔ پھر چونکہ ہر شخص کو اپنے قیدی سے خدمت لینے کا حق بھی ہے اس لئے وہ اس کو روٹی کپڑا جو کچھ دے گا اس پر گراں نہ ہوگا۔ وہ سمجھے گا کہ میں تنخواہ دے کر نوکر رکھتا جب بھی خرچ ہوتا۔ اب اس سے خدمت لوں گا اور اس کے معاوضہ میں روٹی کپڑا دوں گا۔ پھر چونکہ غلام کو چلتے پھرتے سیر و تفریح کرنے کی آزادی ہوتی ہے قید خانہ میں بند نہیں ہوتا اس لئے اس کو اپنے آقا پر وہ غیظ و غضب نہیں ہوتا جو جیل خانہ کے قیدی کو ہوتا ہے اس حالت میں اگر آقا نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اس کا احسان غلام کے دل میں گھر کر لیتا ہے اور وہ اس کے گھر کو اپنا گھر اور اس کے گھر والوں کو اپنا عزیز سمجھنے لگتا ہے یہ سب باتیں ہی نہیں بلکہ واقعات ہیں۔ پھر اس صورت میں غلام علمی و تمدنی ترقی کر سکتا ہے۔ کیونکہ جب آقا و غلام میں اتحاد ہو جاتا ہے تو آقا خود چاہتا ہے کہ میرا غلام مہذب و شائستہ ہو وہ اس کو تعلیم بھی دلاتا ہے۔ صنعت و حرفت بھی سکھلاتا ہے۔ چنانچہ اسلام میں صدہا علماء زاہدین و عابدین ایسے ہوئے ہیں کہ وہ اصل میں غلام تھے۔ غلاموں کے طبقہ نے تمام علوم میں ترقی حاصل کی بلکہ

غلاموں کو بعض دفعہ بادشاہت بھی نصیب ہوئی ہے۔

سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو مخالفین بہت بدنام کرتے ہیں کہ انہوں نے تلوار سے اسلام پھیلایا۔ مگر تاریخ میں ان کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ اس سے ان کی رحمدلی اور شفقت کا اندازہ ہو جائے گا اور یہ کہ غلاموں کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ تھا۔

ایک بار سلطان محمود نے ہندوستان پر حملہ کیا اور بہت سے لوگ گرفتار ہوئے ان میں ایک لڑکا بہت ہونہار ہوشیار تھا اس کو آزاد کر کے سلطان نے ہر قسم کے علوم وفنون کی تعلیم دی جب وہ تعلیم سے فارغ ہوا تو اس کو حکومت کے عہدے دیئے گئے حتی کہ رفتہ رفتہ اس کو ایک بڑے ملک کا صوبہ دار بنا دیا۔ صوبہ دار کی حیثیت اس وقت وہ تھی جو آج کل کے بڑے والئ ریاست کی ہوتی ہے۔ جس وقت سلطان نے اس کو تخت پر بٹھلایا اور تاج سر پر رکھا تو وہ غلام رونے لگا۔ سلطان نے فرمایا کہ یہ وقت خوشی کا ہے، یا غم کا۔ اس نے عرض کیا کہ جہاں پناہ اس وقت مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آکر پھر اپنی یہ قدر ومنزلت دیکھ کر رونا آ گیا۔ حضور جس وقت میں ہندوستان میں بچہ سا تھا تو آپ کے حملوں کی خبریں سن سن کر ہندو کانپتے تھے اور ان کی عورتیں اپنے بچوں کو آپ کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں جیسا ہوّا سے ڈرایا کرتی ہیں میری ماں بھی مجھے اس طرح آپ کے نام سے ڈرایا کرتی تھی میں سمجھتا تھا کہ محمود نہ معلوم کیسا جابر وظالم ہوگا۔ حتی کہ آپ نے خود ہمارے ملک پر حملہ کیا اور اس فوج سے آپ کا مقابلہ ہوا جس میں یہ غلام موجود تھا اس وقت تک میں آپ کے نام سے بھی ڈرتا تھا پھر میں آپ کے ہاتھوں قیدی ہوا تو میری جان ہی نکل گئی کہ بس اب خیر نہیں مگر حضور نے دشمنوں کی روایات کے خلاف میرے ساتھ ایسا برتاؤ فرمایا کہ آج میرے سر پر تاج سلطنت رکھا جا رہا ہے تو اس وقت مجھے یہ خیال کر کے رونا آ گیا کہ کاش آج میری ماں ہوتی تو میں اس سے کہتا کہ دیکھ یہ وہی محمود ہے جس کو تو ہوّا بتلایا کرتی تھی۔

ایسے واقعات اسلام میں بکثرت ہیں اور یہ اسی مسئلہ غلامی کا نتیجہ ہے اگر یہ لوگ

جیل خانہ میں قید کر دیئے جاتے تو نہ ان کو مسلمانوں سے انس ہوتا نہ مسلمانوں کو ان سے تعلق ہوتا۔ غلام بن کر یہ لوگ مسلمانوں میں ملے جلے رہے علمی ترقی حاصل کرتے رہے۔ آخر کار اپنی حیثیت کے موافق درجات و مناصب پر فائز ہوتے رہے کوئی محدث بنا، کوئی فقیہ، کوئی قاری بنا، کوئی مفسر بنا، کوئی ادیب، کوئی قاضی ہوا، کوئی حاکم، پھر رسول اللہ ﷺ نے غلاموں کی یہاں تک رعایت فرمائی ہے کہ آپ کا حکم ہے جو خود کھاؤ وہی غلاموں کو کھلاؤ جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ اور جب وہ کھانا پکا کر لائے تو اس کو اپنے ساتھ بٹھلا کر کھلاؤ، عین وصال کے وقت آپ کی آخری وصیت یہ تھی: اَلصَّلٰوۃُ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ. (مسند احمد ۳/ ۱۱۷) یعنی نماز کا خیال رکھو اور ان غلاموں کا جو تمہارے ہاتھوں کے نیچے ہیں، اس سے زیادہ اور کیا رعایت ہوسکتی ہے اور بحمد اللہ حضرات صحابہ و تابعین اور اکثر سلاطین اسلام نے غلاموں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا۔ اگر کسی ایک دو نے اس کے خلاف عمل درآمد کیا تو وہ اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے اسلام پر اس سے اعتراض نہیں ہوسکتا۔ (ایضاً ۷۵)

حضرت مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

رہا یہ اشکال کہ اسلام، جو حقوق انسانیت کا سب سے بڑا محافظ ہے، اس نے غلامی کی اجازت کیوں دی؟ سو درحقیقت یہ اشکال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی جائز کی ہوئی غلامی کو دیگر مذاہب واقوام کی غلامی پر قیاس کرلیا گیا ہے حالانکہ اسلام نے غلاموں کو جو حقوق عطاء کئے اور معاشرے میں ان کو جو مقام دیا اس کے بعد وہ صرف نام کی غلامی رہ گئی ورنہ حقیقت میں وہ بھائی چارہ بن گیا ہے اور اگر اس کی حقیقت اور روح پر نظر کی جائے تو بہت سی صورتوں میں جنگی قیدیوں کے ساتھ اس سے بہتر سلوک ممکن نہیں، مشہور مستشرق موسیو گستاؤلیبان اپنی کتاب تمدن عرب میں لکھا ہے:

”غلام کا لفظ جب کسی ایسے یورپین شخص کے سامنے بولا جاتا ہے جو تیس سال کے دوران لکھی ہوئی امریکی روایتوں کو پڑھنے کا عادی ہے تو اس

کے دل میں ان مسکینوں کا تصور آ جاتا ہے جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، ان کے گلوں میں طوق پڑے ہیں اور انہیں کوڑے مار مار کر ہنکایا جا رہا ہے، ان کی غذا ان کی سدِ رمق کے لئے بھی کافی نہیں اور انہیں رہنے کے لئے تاریک کوٹھڑیوں کے سوا کچھ میسر نہیں، مجھے یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ تصویر کس حد تک درست ہے اور انگریزوں نے چند سالوں سے امریکہ میں جو کچھ کیا ہے یہ باتیں اس پر صادق آتی ہیں یا نہیں؟...... لیکن یہ بالکل یقینی بات ہے کہ اہل اسلام کے یہاں غلام کا تصور نصاریٰ کے یہاں غلام کے تصور سے بالکلیہ مختلف ہے۔"

(منقول از دائرۃ معارف القرن العشرین لفرید وجدی، ص ۲۷۹ ج ۴ مادہ "استرقاق")

حقیقت یہ ہے کہ بہت سی صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں قیدیوں کو غلام بنانے سے بہتر کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا، کیونکہ اگر غلام نہ بنایا جائے تو تین ہی صورتیں عقلاً ممکن ہیں، یا قتل کر دیا جائے، یا آزاد چھوڑ دیا جائے یا دائمی قیدی بنا کر رکھا جائے، اور بسا اوقات یہ تینوں صورتیں مصلحت کے خلاف ہوتی ہیں، قتل کرنا اس لئے مناسب نہیں ہوتا کہ قیدی اچھی صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔ آزاد چھوڑ دینے میں بعض مرتبہ یہ خطرہ ہوتا ہے کہ دار الحرب میں پہنچ کر وہ مسلمانوں کے لئے دوبارہ عظیم خطرہ بن جائے، اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، یا تو اسے دائمی قیدی بنا کر آج کی طرح کسی الگ تھلگ جزیرے میں ڈال دیا جائے یا پھر غلام بنا کر اس کی صلاحیتوں سے کام لیا جائے اور اس کے حقوق انسانی کی پوری نگہداشت کی جائے، ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ ان میں سے بہتر صورت کونسی ہے؟ بالخصوص جبکہ غلاموں کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر وہ ہے جو ایک معروف حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالفاظ ذیل بیان فرمایا ہے:

اخوانکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدیہ فلیطعمہ ممّا یاکل ولیلبسہ ممّا یلبس ولا یکلّفہٗ مایغلبہ فان

کلّفہٗ ما یغلبہ فلیعنہٗ. (بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ)

ترجمہ: تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں جنہیں اللہ نے تمہارے زیر دست کر دیا ہے، پس جس کا بھائی اس کے زیر دست ہو اس چاہئے کہ اس کو بھی اسی میں سے کھلائے جو وہ خود کھاتا ہے اور اسی میں سے پہنائے جسے وہ خود پہنتا ہے اور اس کو ایسے کام کی زحمت نہ دے جو اس کے لئے ناقابل برداشت ہو، اور اگر اسے کام کی تکلیف دے تو خود بھی اس کی مدد کرے۔

معاشرتی اور تمدنی حقوق کے اعتبار سے اسلام نے غلاموں کو جو مرتبہ عطا کیا وہ آزاد افراد کے قریب قریب مساوی ہے، چنانچہ دوسری اقوام کے برخلاف اسلام نے غلاموں کو نکاح کی نہ صرف اجازت دی بلکہ آقاؤں کو انکحوا الأیامیٰ منکم. والی آیت کے ذریعہ اس کی تاکید کی ہے یہاں تک کہ وہ آزاد عورتوں سے بھی نکاح کرسکتا ہے، مال غنیمت میں اس کا حصہ آزاد مجاہدین کے برابر ہے اور دشمن کو امان دینے میں اس کا قول اسی طرح معتبر ہے جس طرح آزاد افراد کا، قرآن وحدیث میں ان کے ساتھ حسن سلوک کے اتنے احکام آئے ہیں کہ ان کو جمع کرنے سے ایک مستقل کتاب بن سکتی ہے، یہاں تک کہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کے جو الفاظ آخری وقت تک زبان مبارک پر جاری تھے اور جس کے بعد آپؐ خالق حقیقی سے جا ملے،، وہ یہ الفاظ تھے:

الصّلٰوۃ الصّلٰوۃ، اتّقوا اللہَ فیما ملکت ایمانکم.

ترجمہ: نماز کا خیال رکھو نماز کا خیال رکھو، اپنے زیر دست غلاموں کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ (ابوداؤد، باب فی حق المملوک)۔

غلاموں کیلئے تعلیم و تربیت کے جو مواقع اسلام نے فراہم کئے ہیں ان کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں اسلامی سلطنت کے تقریباً تمام صوبوں میں علم و فضل کے مرجع اعلیٰ سب کے سب غلاموں میں سے

تھے جس کا واقعہ متعدد کتبِ تاریخ میں مذکور ہے، پھر اس نام کی غلامی کو بھی رفتہ رفتہ ختم یا کم کرنے کے لئے غلاموں کو آزاد کرنے کے اتنے فضائل قرآن وحدیث میں وارد ہوئے ہیں کہ شاید ہی کوئی نیکی اس کی ہمسری کر سکے۔ مختلف فقہی احکام میں غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈے گئے ہیں۔ کفارہ صوم، کفارۂ قتل، کفارۂ یمین ان تمام صورتوں میں سب سے پہلا حکم یہ مذکور ہے کہ کوئی غلام آزاد کیا جائے، یہاں تک کہ حدیث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی نے غلام کو ناحق تھپڑ مار دیا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کر دیا جائے۔ (صحیح مسلم، باب صحبة المماليك)

چنانچہ صحابہ کرامؓ جس کثرت کے ساتھ غلام آزاد کیا کرتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ صاحب النجم الوہاج نے بعض صحابہؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی یہ تعداد نقل کی ہے۔

حضرت عائشہؓ	۶۹	حضرت عباسؓ	۷۰
حضرت حکیم بن حزامؓ	۱۰۰	حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۱۰۰۰
حضرت عثمان غنیؓ	۲۰	حضرت ذوالکلاع حمیریؓ	۸۰۰۰

(صرف ایک دن میں)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ۳۰۰۰۰

(فتح العلام شرح بلوغ المرام از نواب صدیق حسن خان صاحب ص ۲۳۲ ج ۲، کتاب العتق)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف سات صحابہؓ نے انتالیس ہزار دو سو انسٹھ غلام آزاد کئے اور ظاہر ہے دوسرے ہزاروں صحابہؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد اس سے کہیں زائد ہو گی۔ غرض اسلام نے غلامی کے نظام میں جو ہمہ گیر اصلاحات کیں جو شخص بھی انہیں بنظر انصاف دیکھے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسے دوسری اقوام کے احکامِ غلامی پر قیاس کرنا بالکل غلط ہے، اور ان اصلاحات کے بعد جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی اجازت ان پر ایک عظیم احسان بن گئی ہے۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا حکم صرف اباحت اور جواز کی حد تک ہے یعنی اگر اسلامی حکومت مصالح کے مطابق سمجھے تو انہیں غلام بنا سکتی ہے ایسا کرنا مستحب ہے یا واجب فعل نہیں ہے بلکہ قرآن و حدیث کے مجموعی ارشادات سے آزاد کرنے کا افضل ہونا سمجھ میں آتا ہے اور یہ اجازت بھی اس وقت تک کے لئے ہے جب تک اس کے خلاف دشمن سے کوئی معاہدہ نہ ہو اور اگر دشمن سے یہ معاہدہ ہو جائے کہ نہ وہ ہمارے قیدیوں کو غلام بنائیں گے نہ ہم ان کے قیدیوں کو، تو پھر اس معاہدہ کی پابندی لازم ہوگی۔ ہمارے زمانے میں دنیا کے بہت سے ملکوں نے ایسا معاہدہ کیا ہوا ہے، لہذا جو اسلامی ممالک اس معاہدے میں شریک ہیں ان کے لئے غلام بنانا اس وقت تک جائز نہیں جب تک یہ معاہدہ قائم ہے۔

(تفسیر معارف القرآن)

لونڈی غلاموں کی بابت بعض اعتراض کے جواب

جواب: اس وقت کے نوتعلیم یافتہ یہ کہتے ہیں کہ غلام لونڈی رکھنا انسانی ہمدردی کے برخلاف اور نہایت مکروہ کام ہے پھر تعجب ہے کہ پیغمبرؐ نے اس کو روا رکھا۔ اور بہائم کی طرح سے لونڈی غلاموں کو خدمات پر مامور کرنے کی اجازت دی، لونڈیوں سے مباشرت کرنا جائز سمجھا۔ یہ بات پہلے انبیاءؑ کے بھی برخلاف ہے۔

اس کا جواب بعض آزاد لوگوں نے قرآن و احادیث میں تاویل و تحریف کر کے یہ دیا ہے کہ اسلام میں یہ فعل درست نہیں ہے۔ مگر عقلاء کے نزدیک یہ جواب ہو نہیں سکتا۔ اس لئے کہ وہ کہاں تک قرآن و احادیث کی الٹ پلٹ کریں گے پھر بھی یہ فعل اسلام میں ثابت ہی رہے گا۔ خصوصاً یہ آیات بہ آواز بلند کہہ رہی ہیں کہ اسلام نے لونڈیوں کی معاشرت کی بابت کچھ حقوق مقرر کر دیئے ہیں اور لونڈیوں سے صحبت کرنا جائز ہے کما قال تعالیٰ قد علمنا مافرضنا علیھم فی ازواجھم وما ملکت ایمانھم اور اس سے پہلے کی یہ آیت انا احللنا لک ازواجک الّتی

اٰتیت اجورھن وما ملکت یمینک مما افاء اللہ علیک وبنات عمک ......الخ۔

اس کا صحیح جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایک آسمانی سلطنت قائم کی ہے جس کا وعدہ اگلے انبیاءؑ خصوصاً حضرت عیسیٰ کی معرفت ہوا تھا۔ اس سلطنت کا بادشاہ یا دنیا میں قائم کرنے والا حضرت محمد علیہ السلام ہیں دنیاوی سلطنتیں خاص جہاں داری اور حقوق عباد کے لئے ہیں اس سے بڑھ کر خداوندی حقوق کا وہ مطالبہ نہیں کرتیں۔ بلکہ آج کل کی شائستہ سلطنتیں ایسے حقوق کے مطالبہ کو برا جانتی ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی خدا تعالیٰ کو اور اس کے جمیع برگزیدہ انبیاء و اولیاء کو برا کہے بت کو پوجے اس کا انکار کرے کچھ پروا نہیں۔ لیکن آسمانی سلطنت سب سے اول انہیں حقوق کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ ایسے جرموں کی سزائیں دے۔ اور خصوصاً کفر وشرک کے جرم کا مطالبہ سخت کرے۔ مگر رحم ولی کے ساتھ اس سلطنت میں برتاؤ کیا گیا ہے۔ اول ان لوگوں کو سمجھایا جاتا ہے اگر نہ مانیں تو اس سلطنت کے خلاف میں ہونے سے ممانعت کی جاتی ہے اور ماتحتی پر مامور کیا جاتا ہے اگر پھر بھی وہ مقابلہ پر آئیں تو جنگ ہوتی ہے جس میں بجز قتل طرفین کے اور کیا ہوا کرتا ہے مگر عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں کو اس جوش کے وقت میں بھی اس سے محفوظ رکھا ہے پھر جو لوگ کہ قتل سے آزاد کئے جاتے ہیں ان کو لونڈی غلام بنایا جاتا ہے۔ پھر ان کے آزاد کرنے کی یہاں تک تاکید اور ثواب بتلایا گیا ہے کہ جو بہت کو آزادی دلا دی جاتی ہے اور غلامی کی حالت میں ان کے وہ حقوق قائم کئے ہیں کہ جو اور قوموں میں آزاد لوگوں کے لئے بھی نہیں یہ داغ غلامی صرف اس جرم آسمانی کی یادگاری ہے۔ اب بتاؤ کہ اس میں بے رحمی ہے یا ان کے قتل کر ڈالنے میں جیسا کہ موسیٰ کی شریعت میں ہوا۔ کیا اس میں دنیاوی جرائم کی قیدوں سے زیادہ بے رحمی ہے؟ موسیٰؑ کی شریعت میں بھی غلام لونڈی رکھے جاتے تھے۔ (دیکھو تورات سفر احبار ۲۵ باب ورس ۴۴) (تفسیر حقانی ۲۳/۴)

جواب: ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا. نبیؐ کے بعد یا آپؐ کے طلاق دینے کے بعد کسی مسلمان کو آپؐ کی بیویوں سے نکاح کرنا ہمیشہ حرام ہے۔

(۱) ایک تو اس لئے کہ وہ مسلمانوں کی دینی مائیں ہیں جو حقیقی ماؤں سے بھی تعظیم و تکریم میں بڑھ کر ہیں اور ماں سے نکاح کرنا حرام ہے۔

(۲) دوسرا یہ کہ بیوی مرد کا فراش اور محکوم ہوتی ہے اس کی خدمت کے لئے اس کو آمادہ رہنا پڑتا ہے اگر ازواج مطہرات کے ساتھ نکاح کیا جائے تو یہی ذلت ان کے لئے بھی ظہور میں آئے اور یہ شان نبوت کی پوری توہین ہے (کہ نبی کی بیوی کسی غیر نبی کی محکوم بنے) اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ان ذلکم کان عند اللہ عظیما کہ یہ اللہ کے نزدیک بڑی سخت بات ہے اور بڑا گناہ ہے۔

(۳) اور وجہ اگر کوئی کہے اس میں بیویوں کی بڑی حق تلفی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کچھ بھی حق تلفی نہیں اللہ تعالیٰ نے حضرتؐ کے بعد ان کا نان ونفقہ تو بیت المال کے ذمہ کر دیا تھا۔ اور آپؐ نے بھی اپنی حیات میں ان کو اس سے مطمئن فرما دیا تھا۔ اب رہی خواہش نفسانی سو اس سے بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو مستغنی فرما دیا تھا۔ ان کے دل میں یہ ہوس باقی نہیں رکھی تھی۔ حضرتؐ کے بعد خود ان کو کسی کی بیوی بننا گوارا نہ تھا۔ اس صحبت کے بعد ان کو کسی کی صحبت پسند آ سکتی تھی۔

ذوق الطاف تو اے کاش نمی یافت دلم
یاد ہر لحظہ تو اکنوں سبب صد الم ست

(۴) اور وجہ اور سب سے بڑھ کر ازواج مطہرات سے نکاح حرام ہونے کی ایک اور وجہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس کام کے لئے یہ حضرت نبی علیہ السلام کے نکاح میں آئی تھیں یعنی علوم دینیہ سیکھنے اور پھر اس کے پھیلانے کے لئے، یہ کام ان سے فوت ہو جاتا۔ اس لئے کہ یہ خانداری کے جھگڑوں میں اور بال بچوں کے جنجال میں پھنس کر اور دوسرے مرد کی پابند اور محکوم رہ کر کبھی اس کام کو سرانجام نہ دے سکتیں۔

(۵) اور وجہ اور ایک وجہ اور بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو گو موتِ عرفی عارض ہوئی انک میت و انھم میتون مگر اس پر بھی ایک ایسی حیاتِ ابدی حاصل تھی اور ہے کہ جو شہیدوں سے ہزار درجہ بڑھ کر ہے۔ اس ہادیٔ برحقؐ کا تعلق اب بھی دنیا میں امت سے وہی ہے اور اسی لئے جسم اطہر کو خاک نہیں کھا سکتی اور اسی لئے بہت سے آثارِ غریبہ لوگوں نے مشاہدہ کئے ہیں۔ ان لحاظات سے آپؐ زندہ ہیں اور حیات النبی مشہور ہیں پس زندہ کی بیوی کسی سے کیوں کر نکاح کر سکتی ہے؟

(۶) اور وجہ ایک اور بھی وجہ ہے کہ بزرگوں کی بیویوں کے ساتھ نکاح کرنا ان کی گستاخی ہے اس کو طبائع سلیمہ برا جانتی ہیں اور اسی لئے ہندوؤں میں یہ مسئلہ مہاراجوں اور پیشواؤں کے لئے ایجاد ہوا تھا جو ان کی دیکھا دیکھی اور شرفاء اہل ہند میں بھی رواج پا گیا۔ غلط فہمی سے برہمنوں نے ازدواج ثانی کو حرام کہہ دیا مگر اسلام نے یہ بات خاص ازواج مطہرات ہی کے لئے رکھی ہے اور کے لئے نہیں۔ ہاں طبیعت کا اختیار ہے کچھ نکاح ثانی کے لئے مجبور بھی نہیں کیا ہے مگر برسم ہنود اس کو ترک کرنا بھی ممنوع ہے۔

علماء کا اتفاق ہے کہ جو بیوی آپؐ کے نکاح میں آ گئی اس کا نکاح غیر سے حرام ہو گیا۔ خواہ صحبت کی ہو یا نہ کی ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر صحبت سے پہلے طلاق دیدی تو درست ہے کیوں کہ اس مستعیذہ نے کہ جس کو صحبت سے پہلے آپؐ نے طلاق دیدی تھی حضرت عمرؓ کی خلافت میں اشعث ابن قیس سے نکاح کیا جس کے سنگسار کرنے کا قصد کیا گیا مگر جب یہ معلوم ہوا تو چھوڑ دیا گیا (بیضاوی) اور لونڈیوں کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر حضرت ﷺ نے ان سے صحبت کی تو ان سے نکاح حرام ہے ورنہ نہیں اس بارے میں خطرات قلبی سے دل پاک رکھنے کے لئے فرماتا ہے:

ان تبدوا شیئا او تخفوہ فان اللہ کان بکل شیء علیما۔

(تفسیر حقانی ۴/۲۹ تا ۳۰)

تیرھواں باب

تعدد ازواج
کے متعلق اعتراضات کے جوابات
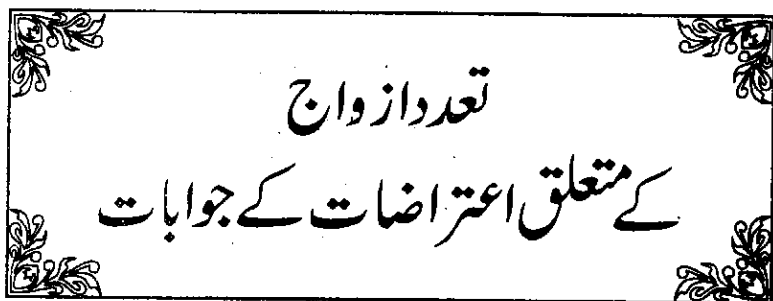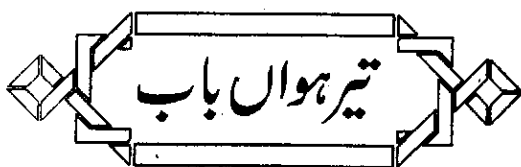
وجوہ تعددازدواج

(۱) منجملہ وجوہ تعدد ازدواج سب سے مقدم حفظ تقویٰ یعنی پرہیز گار رہنا اور بدی سے بچنا ہے۔ تقویٰ ایک ایسی پیاری چیز ہے کہ اس کا خیال ہر انسان کو اور سب باتوں سے مقدم رکھنا چاہئے۔ قدرت نے بعض آدمیوں کو معمولی آدمیوں کی نسبت زیادہ قوی الشہوت بنایا ہے اور ایسے آدمیوں کے لئے ایک عورت کافی نہیں ہوسکتی اور اگر ان کو دوسرا یا تیسرا یا چوتھا نکاح کرنے سے روکا جائے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تقویٰ کو چھوڑ کر بدکاری میں مبتلا ہو جائیں گے۔ زنا ایک ایسی بدکاری ہے جو انسان کے دل سے ہر ایک پاکیزگی کی طہارت کا خیال دور کر دیتی ہے اور اس میں ایک خطرناک زہر پیدا کر دیتی ہے اس لئے ان لوگوں کیلئے جو قوی الشہوت ہیں ضرور کوئی ایسا علاج ہونا چاہئے جس سے وہ زنا جیسی بدکاری میں پڑنے سے بچے رہیں۔ باقی رہا یہ امر کہ قوی الشہوت آدمیوں کو ایک سے زیادہ عورت کی حاجت پڑے گی یہ اظہر من الشمس ہے۔

(۲) عورت ہر وقت اس قابل نہیں ہوتی کہ خاوند اس سے ہمبستر ہو کیونکہ اول تو لازی طور پر ہر ایک مہینے میں کچھ دن ایسے آتے ہیں یعنی ایام حیض جن میں مرد کو اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

دوسرے ایام حمل عورت کے لئے ایسے ہوتے ہیں خصوصاً اس کے پچھلے مہینے جن میں عورت کو اپنے اور اپنے جنین کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ وہ مرد کی صحبت سے پرہیز کرے اور یہ صورت کئی ماہ تک رہتی ہے پھر جب وضع حمل ہوتا ہے تو پھر بھی کچھ مدت تک عورت کو مرد کی صحبت سے پرہیز کرنا لازی ہے اب ان تمام اوقات میں عورت کے لئے تو یہ قدرتی موانع واقع ہو جاتے ہیں مگر خداوند کے لئے کوئی امر مانع نہیں ہوتا تو اب اگر کسی مرد کو غلبہ شہوت کا ان اوقات میں ہو تو بجز تعدد ازدواج اس کا کیا علاج ہے ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ کثرت سے ایسے مرد ہیں جو ان وقتوں

میں دوسری عورت کرنے کے بغیر بھی تقویٰ کو قائم رکھ سکتے ہیں لیکن ساتھ ہی ہم یہ کہنے کو تیار ہیں اور کوئی عقل منداس سے انکار نہیں کرسکتا کہ دنیا میں قوی الشہوت آدمی بھی موجود ہیں اور اس قوت کا زیادہ ہونا کسی صورت میں ان کے لئے باعث الزام نہیں ہے۔ پس اگر ان ایام یا اس قسم کے اور وقفات میں دوسری عورت سے نکاح کی اجازت نہ دی جائے تو پھر اس خواہش کے تقاضا کے وقت وہ ضرور ناجائز ذرائع استعمال کریں گے۔

(۳) گرم ملکوں میں عورتیں آٹھ، نو یا دس سال کی عمر میں شادی کے قابل ہو جاتی ہیں اس لئے ان ممالک میں شادی کا زمانہ عمر کے لحاظ سے بچپن کا زمانہ ہوتا ہے۔ بیس سال کی عمر میں وہ بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ اس لئے عقل اور خوبصورتی دونوں ایک وقت ان کے اندر جمع نہیں ہوتیں۔ جب خوبصورتی کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ عورت حکومت کرے اس وقت عقل اور تجربہ کا نہ ہونا اس دعوے کا مانع ہوتا ہے اور جب عقل اور تجربہ حاصل ہوتا ہے تو خوبصورتی نہیں رہتی۔ اسی لئے عورتوں کو لازمی طور پر ایک محکومی کی حالت میں رہنا پڑتا ہے کیونکہ عقل اور تجربہ بڑھاپے کے وقت وہ حکومت پیدا نہیں کرسکتی جو جوانی اور خوبصورتی میں کرسکتی تھی پس ہر حال میں عورت بزبان حال اپنے ناکافی ہونے کا اقرار کرتی ہے۔ کیونکہ مرد کو ان دو وصفوں کے جمع کرنے کی ضرورت قدرتی طور پر ہے اور کوئی ایک عورت ان دو وصفوں کی جامع نہیں۔ اس لئے مرد اس ضرورت کو دو عورتوں کے جمع کرنے سے پوری کرتا ہے جن میں سے ایک حسن ہو اور ایک تجربہ تاکہ دونوں کے مجموعہ سے اس طرح نفع یاب ہو کہ ایک اس کے نفس کو خوش کرے، دوسرے اس کی خدمت کرے اس لئے یہ ایک بالکل قدرتی امر ہے کہ ان ممالک میں تعدد ازواج کا رواج ہو۔

(۴) ہر ملک میں مردوں کی نسبت عورتوں کے قویٰ بڑھاپے سے جلدی متاثر ہوتے ہیں۔ پس جہاں مرد کے قویٰ بالکل محفوظ ہوں جیسا کہ وہ اکثر حالات میں ہوتے ہیں

اورعورت بوڑھی ہو چکی ہو دوسری عورت سے نکاح کرنا بعض حالات میں مرد کے لئے ایسا ہی ضروری ہوگا جیسا کہ پہلے کسی وقت پہلی عورت سے نکاح کرنا ضروری تھا۔ پس جو قانون تعدد ازواج سے روکتا ہے وہ مردوں کو جن کے قویٰ خوش قسمتی سے بڑھاپے کی عمر تک محفوظ رہیں یہ راہ بتاتا ہے کہ وہ ان قویٰ کے تقاضا کو زنا کے ذریعہ سے پورا کریں۔ ایسا قانون عام انسانوں کی حالتوں کے مطابق کیونکر ہوسکتا ہے۔

(۵) مذکورہ بالا ضروریات تو مردوں کی ہیں مگر خود عورتوں کو بعض وقت ایسی مجبوریاں آپڑتی ہیں کہ اگران کے لئے راہ کھلی نہ رکھی جائے کہ وہ ایسے مردوں سے نکاح کرلیں جن کے گھروں میں پہلی عورتیں موجود ہیں تو اس کا نتیجہ بدکاری ہوگا۔ ایک ہی امر پر غور کرو کہ کس طرح ہر سال دنیا کے کسی نہ کسی حصہ میں لاکھوں مردوں کی جانیں لڑائیوں میں تلف ہو جاتی ہیں حالانکہ عورتیں بالکل محفوظ رہتی ہیں۔ اور ایسے واقعات یعنی جنگوں میں مردوں کی جانوں کا تلف ہونا ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں اور جب تک دنیا میں مختلف قومیں آباد ہیں ایسے واقعات ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے اور ہمیشہ اس سے مردوں کی تعداد میں کمی ہو کر عورتوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ تو ایک اسی امر سے اگر یہ بھی فرض کرلیں کو عورتوں کی تعداد کی یہ زیادتی کسی قوم میں ہمیشہ کی نہیں رہی تاہم اس سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ ایک مدت تک مردوں کی اس کمی کا اثر ضرور رہے گا۔ اب یہ عورتیں جو مردوں کی تعداد سے زیادہ ہوں گی ان کے لئے کیا سوچا گیا ہے۔ تعدد ازواج کی ممانعت کی صورت میں ان کا کیا حال ہوگا۔ کیا ان کو یہی جواب نہیں ملے گا کہ جس کے دل میں مرد کی طرف وہ خواہش پیدا ہو تو جو قدرت نے فطرت انسانی میں رکھی ہے وہ ناجائز طریقوں سے اسے پورا کرے۔ سوچ کر دیکھ لو کہ تعدد ازواج کی راہ کو بند کر کے ان لاکھوں عورتوں کو جو اس طرح لڑائیوں کے سبب سے بیوہ ہو گئیں یا جن کے لئے نکاح کے ذرائع نہیں رہے کیا یہی جواب نہ دینا پڑے گا تعین تعداد پر افسوس ہے کہ ایک غلط اصول کی حمایت میں انسانی ضروریات پر ایک

لمحہ کے لئے بھی غور نہیں کرتے وہ نہیں سوچتے کہ تعدد ازواج کے سوائے اور کوئی ایسی راہ نہیں جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔

(۶) گذشتہ مردم شماری میں بعض محاسبین نے صرف بنگال کے علاقہ کے مردوں و عورتوں کی تعداد پر نظر کی تھی تو معلوم ہوا تھا کہ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے جو کہ قدرتی طور پر تعداد ازواج پر ایک بین دلیل ہے جس کو شک ہو وہ علیحدہ علیحدہ مردوں و عورتوں کی تعداد کو سرکاری کاغذات مرم شاری ہند میں ملاحظہ کرے تو عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ثابت ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی ہم اس امر کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں کہ یورپ میں جس کو سب ممالک سے بڑھ کر تعداد ازواج کی ضرورت سے منزہ و مبرا سمجھا جاتا ہے عورتوں کی تعداد مردوں سے کس قدر زیادہ ہے۔ چنانچہ برطانیہ کلاں میں بوئروں کی جنگ سے پہلے بارہ لاکھ انہتر ہزار تین سو پچاس عورتیں ایسی تھیں جن کے لئے ایک بیوی والے قاعدہ کی رو سے کوئی مرد مہیا نہیں ہوسکتا۔

فرانس میں ۱۹۰۰ء کی مردم شماری میں عورتوں کی تعداد مردوں سے چار لاکھ تیس ہزار سات سو نو زیادہ۔

جرمنی میں ۱۹۰۰ء کی مردم شماری میں ہر ہزار کے لئے ایک ہزار بتیس عورتیں موجود تھیں۔ گویا کل آبادی میں ۸ لاکھ ۸۷ ہزار ۶ سو ۴۸ عورتیں ایسی تھیں جن سے شادی کرنے والا کوئی مرد نہ تھا۔

سویڈن میں ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں ایک لاکھ بائیس ہزار آٹھ سو ستر عورتیں اور ہسپانیہ میں ۱۸۹۰ء میں چار لاکھ ستاون ہزار دو سو باسٹھ عورتیں۔

اور آسٹریلیا میں ۱۸۹۰ء میں چھ لاکھ چوالیس ہزار سات سو چھیانوے عورتیں مردوں سے زیادہ ہیں۔

اب ہم سوال کرتے ہیں کہ اس بات پر فخر کر لینا تو آسان ہے کہ ہم تعدد ازواج

کو برا سمجھتے ہیں مگر یہ بتا دیا جائے کہ ان کم از کم چالیس لاکھ عورتوں کے لئے کون سا قانون تجویز کیا گیا ہے۔ کیونکہ ایک بیوی کے قاعدے کی رو سے ان کو یورپ میں تو خاوند نہیں مل سکتے۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ جو قوانین انسان کی ضروریات کے لئے تجویز کئے جاتے ہیں۔ وہ انسانوں کی ضروریات کے مطابق بھی ہونے چاہئیں یا نہیں وہ قانون جو تعدد ازواج کی ممانعت کرتا ہے ان چالیس لاکھ عورتوں کو یہ کہتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف چلیں اور ان کے دلوں میں مردوں کے لئے کبھی خواہش پیدا نہ ہو لیکن یہ تو ناممکن امر ہے جیسا کہ خود تجربہ شکایت کر رہا ہے پس نتیجہ یہ ہوگا کہ جائز طریق سے روکے جانے کے باعث وہ ناجائز طریق استعمال کریں گے۔ اس طرح یہ ان کی زنا کی کثرت ہوگی اور یہ تعدد ازواج کی مخالفت کا نتیجہ ہے اور یہ امر کہ زنا پھیلے گا۔ خیال ہی خیال نہیں بلکہ امر واقع ہے جیسا کہ انگریزی ممالک وغیرہ میں ہزار ہا ولد الحرام بچوں کی تعداد سے ثابت ہو رہا ہے جو ہر سال پیدا ہوتے ہیں۔

(۷) نکاح کے اغراض میں ایک یہ بھی ہے کہ مرد عورت ایک دوسرے کے لئے بطور رفیق کے ہوں پس اگر کوئی وجہ ایسی پیدا ہو جائے کہ جس کے سبب سے عورت مرد کے لئے بطور رفیق کے نہ رہے یا اس سے اس کو وہ خوشی حاصل نہ ہو سکے جو ایسے رفیق سے ہونی چاہئے۔ تو ان صورتوں میں بھی مرد کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ مثلاً اگر عورت کو کوئی ایسی بیماری لاحق ہو جائے جو اس کو ہمیشہ کے لئے یا بڑے بڑے وقفوں کے لئے ناقابل کر دے یعنی اس امر کے قابل نہ رہنے دے کہ خاوند اس سے تعلقات زنان وشوئی رکھ سکے تو کوئی وجہ نہیں کہ کیوں نکاح کی اصل غرض کہ مرد دوسرے نکاح کے ذریعہ سے پورا نہ کرے جیسا کہ انسانی زندگی کے حالات کا دائرہ وسیع ہے ویسا ہی ان ضروریات کا دائرہ بھی وسیع ہے جو بعض وقت مرد کو دوسرا نکاح کرنے کے لئے مجبور کر دیتی ہے ہم مانتے ہیں کہ ایسی ضروریات اکثر پیدا نہیں ہوتیں مگر جب واقعی وہ ضرورتیں پیدا ہو جائیں اور یہ ضروری ہے کہ ہر انسان

کے طبقہ میں وہ کم وبیش پیدا ہوتی رہیں تو سوائے تعدد ازدواج کے اور کوئی ذریعہ ان کے پورا ہونے کا نہیں پس اس علاج کو روکنا بیماریوں کو بڑھانا ہے۔

اسی طرح تعدد ازدواج اکثر حالات میں طلاقوں کی کمی کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔

(۸) قدرت نے عورت کو وہ سامان دیئے ہیں جو مرد کے لئے باعث کشش ہیں اور مرد وعورت کے تعلق میں ان فریفتگی اور کشش کے موجبات کی موجودگی ایک نہایت ضروری امر ہے اور صرف اسی صورت میں نکاح بابرکت ہوسکتا ہے کہ ایسے سامان کشش عورت میں موجود ہوں اور اگر عورت میں ایسے سامان موجود نہ ہوں۔ یا کسی طرح سے جاتے رہیں تو مرد کا عورت سے وہ تعلق نہیں ہوسکتا پس ایسی صورت میں اگر خاوند کو دوسری شادی کی اجازت نہ دی جائے تو یا تو وہ کوشش کرے گا کہ کسی طرح اس عورت سے نجات حاصل کر لے اور یا اگر ممکن نہ ہو تو بدکاری میں مبتلا ہوگا اور ناجائز تعلق پیدا کرے گا کیونکہ عورت کی رفاقت سے وہ خوشی حاصل نہ ہوسکے جس کا حصول فطرت انسانی چاہتی ہے تو ناچار اس خوشی کے حصول کے لئے وہ اور ذریعے تلاش کرے گا۔ ان صورتوں کے لئے تعدد ازدواج ہی ایک علاج ہے اور اسی ذریعہ سے ایک گھرانا خوشحال ہوسکتا ہے۔

(۹) تعدد ازدواج کے روکنے سے بعض اوقات نکاح کی تیسری غرض یعنی بقاء نسل انسانی حاصل نہیں ہوسکتی۔ مثلاً اگر عورت بانجھ ہو اور اس کا بانجھ پن ناقابل علاج ہو تو تعدد ازدواج کی ممانعت کی صورت میں قطع نسل لازم آئے گا۔ یہ بیماری عورتوں میں بہت پائی جاتی ہے اور سوائے تعدد ازدواج اور کوئی راہ نہیں جس سے یہ کمی پوری ہوسکے۔ ایسی صورت میں عورت کو طلاق دینے کی کوئی وجہ موجود نہیں اور ممکن ہے کہ عورت ومرد میں ایسی محبت بھی ہو کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوسکتے ہوں۔ اس بقاء نسل کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ ایسی صورتوں میں مرد کو نکاح ثانی کی اجازت دی جائے۔

علاوہ ازیں اور بھی بہت وجوہ ہیں جو تعدد ازدواج کی ضرورت کو ثابت کرتے

ہیں اوران سب کوتفصیل سے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

اصل سبب تعدد ازواج کا بدکاریوں سے بچنا ہے۔ جولوگ بحثوں میں تعدد ازواج کے مخالف ہیں وہ اندرونی خواہشات اور افعال کا مطالعہ فرمائیں۔ جس قوم نے زبان سے پاک تعدد ازواج کا انکار کیا ہے وہ عملی طور پر ناپاک تعدد ازواج یعنی زنا کاری میں گرفتار ہوئے ہیں ان کی خواہشوں کی وسعت اور دست درازی نے ایک عورت پر قناعت نہ کر کے ثابت کر دیا ہے کہ فطرت میں تعدد اور تنوع کی آرزو ضرور ہے۔ خدا تعالیٰ کے قانون کا یہ مقتضاء ہونا چاہئے کہ وہ انسان کی وسیع خواہشوں اور اندرونی میلانوں پر مطلع اور حاوی ہو کر ایسی ترتیب اور طرز پر واقع ہو کہ مختلف جذبات والی طبائع کو بھی تقویٰ اور طہارت کے دائرہ میں محدود رکھے۔

تعدد ازواج کے متعلق حضورؐ پر اعتراض

اعتراض: (غیر مسلموں کا اعتراض)

یہ اعتراض عورتوں کے بارے میں ہے جس کی پانچ صورتیں ہیں۔

(۱) مسلمانوں کے لئے چار سے زیادہ بیویاں رکھنا جائز نہیں کیا گیا، مگر محمد ﷺ نے اس تعداد پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ اپنے لئے تعداد بڑھا کر نو (۹) کر لی، اپنے متعلق خدا کا یہ حکم ظاہر کیا کہ اللہ نے مجھ کو اجازت دی ہے کہ میں چار سے زیادہ کر سکتا ہوں۔

(۲) مسلمانوں کے لئے اپنی بیویوں کے درمیان مساوات اور عدل ضروری ہے، مگر اپنے متعلق محمد ﷺ نے اللہ کا یہ حکم ظاہر کیا کہ مجھ پر یہ عدل واجب نہیں۔

(۳) آپ ﷺ زید بن حارثہؓ کے گھر میں اچانک داخل ہو گئے، اور جب پردہ ہٹایا تو آپ کی نگاہ زینب بنت جحشؓ پر پڑ گئی، جو زیدؓ کی بیوی تھیں، اور آپؐ ان پر فریفتہ ہو گئے، اور فرمایا کہ سبحان اللہ! پھر جب زیدؓ کو یہ حال معلوم ہوا تو انہوں نے بیوی کو طلاق دیدی، اور آپؐ نے ان سے شادی کر لی، اور یہ ظاہر کیا کہ خدا نے مجھ کو اس سے

شادی کرنے کی اجازت دی ہے۔

(۴) آپؐ نے ماریہ قبطیہؓ سے حضرت حفصہؓ کے مکان میں ان کی باری کے دن صحبت کی، جس پر حضرت حفصہؓ سخت غضبناک ہوئیں اور محمد ﷺ کو یہ کہنا پڑا کہ میں نے ماریہؓ کو اپنے لئے حرام کردیا، مگر آپؐ تحریم پر اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنے پر قادر نہ ہوسکے، اور یہ ظاہر کیا کہ خدا نے مجھ کو اجازت دی ہے کہ کفارہ ادا کر کے اپنی قسم کو ختم کردوں۔

(۵) آپؐ کی امت کے لئے یہ بات جائز ہے کہ اگر کوئی شخص مر جائے تو دوسرا شخص عدت گزرنے پر اس سے شادی کرسکتا ہے، مگر اپنی نسبت آپؐ نے خدا کا یہ حکم ظاہر کیا کہ کسی شخص کو اس امر کی اجازت نہیں ہے کہ میری وفات کے بعد میری کسی بیوی سے شادی کرے۔

عیسائیوں نے بڑی جدوجہد اور انتہائی کوشش کے بعد عورتوں کے سلسلے میں یہ پانچ قسم کے اعتراض کیے ہیں جو سب کے سب ان کے اکثر رسالوں میں مثلاً میزان الحق، تحقیق الدین الحق، دافع البہتان، دلائل اثبات رسالۃ المسیح، دلائل النبوت اور رد اللغو وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔

اس موقع پر ہم آٹھ باتیں بطور تمہید کے پیش کرتے ہیں، جن سے ان تمام صورتوں کا جواب نکل آتا ہے۔

جواب: گذشتہ شریعتوں میں ایک سے زیادہ شادی کرنا جائز تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کی شادیاں:

اس لئے کہ ابراہیم علیہ السلام نے پہلے سارہؓ سے نکاح کیا، اور ان کی موجودگی میں ہاجرہؓ سے شادی کی، حالانکہ وہ خلیل اللہ تھے، اور خدا کی وحی ان کے پاس آتی تھی، اور خدا ان کے اچھے کاموں کی طرف رہنمائی کرتا تھا، اگر نکاح ثانی جائز نہ ہوتا تو خدا ابراہیم کو ایسے ناجائز کام پر باقی نہ چھوڑتا، بلکہ ان کو نکاح فسخ کرنے کا حکم دیتا، اور اس

کو حرام قرار دیتا۔

حضرت یعقوبؑ کی شادیاں:

دوسرے یعقوبؑ نے چار عورتوں، لیا، راحیل، بلہا اور زلفا سے شادی کی۔ پہلی دونوں عورتیں لابن کی بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی لڑکیاں اور آپس میں حقیقی بہنیں تھیں، تیسری اور چوتھی باندیاں تھیں، حالانکہ شریعت موسوی میں دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا قطعی حرام تھا، جیسا کہ احبار ۱۸:۱۸ میں ہے۔

اب اگر ایک سے زیادہ شادیاں کرنا حرام مانا جائے تو لازم آتا ہے کہ ان عورتوں سے جو اولاد ہوئی وہ سب کی سب حرام کی اولاد تھی ،نعوذ باللہ منہ، حالانکہ ان کے پاس برابر خدا کی وحی آتی تھی، اوران کی نیک کاموں کی طرف رہنمائی کی جاتی تھی، پھر یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ خدا برے کاموں کی طرف ان کی رہبری کرتا، اور اس اہم معاملہ میں ان کو کچھ ہدایت نہ دیتا، لہذا خدا کا یعقوب کے چاروں نکاح کو بالخصوص دو حقیقی بہنوں کو برقرار رکھنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان کی شریعت میں ایسا کرنا جائز تھا۔

حضرت جدعون کی شادیاں:

نیز جدعون بن یوآس نے بہت سی عورتوں سے نکاح کیا، کتاب قضاۃ باب ۸ آیت ۳۰ میں ہے کہ

> ''اور جدعون کے ستر بیٹے تھے جو اس ہی کے صلب سے پیدا ہوئے تھے، کیونکہ اس کی بہت سی بیویاں تھیں، اوراس کی ایک حرم کے بھی جو سکم میں تھی اس سے ایک بیٹا ہوا اور اس نے اس کا نام ابی ملک رکھا۔ (آیات: ۳۰، ۳۱)

اور جدعون کا نبی ہونا کتاب قضاۃ کے باب ۶، ۷ سے اور رسالہ عبرانیہ کے باب ۱۱ سے ثابت ہے۔

حضرت داؤدؑ کی شادیاں:

نیز حضرت داؤد علیہ السلام نے بہت سی عورتوں سے شادی کی۔ سب سے پہلا نکاح میکل بنت شاول سے کیا اور مہر میں فلسطینیوں کے ایک سو آلاتِ تناسل مقرر کیے گئے تھے۔ لیکن داؤدؑ نے شاول کو دو سو آلات تناسل دیئے، پھر شاول نے داؤد کو اپنی بیٹی میکل بیاہ دی، کتاب سموئیل اول باب ۱۸ آیت ۲۷ میں ہے:

> ''اور ہنوز دن پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ داؤد اٹھا، اور اپنے لوگوں کو لے کر گیا، اور دو سو فلستی قتل کر ڈالے، اور داؤد ان کی (کھلڑیاں) لایا اور انہوں نے ان کی پوری تعداد میں بادشاہ کو دیا، تا کہ وہ بادشاہ کا داماد ہو، اور ساول نے اپنی بیٹی میکل اسے بیاہ دی۔''

بد دین لوگ اس مہر کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا شاول کی یہ غرض تھی کہ ان آلات تناسل سے ایک گدھے کا بوجھ تیار کر کے اپنی بیٹی کو جہیز میں دے، یا کوئی دوسری غرض تھی؟ مگر ہم ان کے مذاق سے قطع نظر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب داؤد علیہ السلام نے شاول سے بغاوت کی تھی تب اس نے میکل کی شادی فلطی بن لیس جلیجی سے کر دی تھی، جس کی تصریح سفر (کتاب) مذکور کے باب ۲۵ میں ہے۔

اس کے علاوہ داؤد علیہ السلام نے چھ دوسری عورتوں سے نکاح کیا

(۱) اخنوعم یزرعیلی (۲) ابیجیل (۳) معکہ بنت تلمی شاہ جسور (۴) حجیت (۵) ابیطال (۶) عجلاہ، جس کی تصریح کتاب سموئیل ثانی باب ۳ میں موجود ہے۔

ان چھ بیویوں کے باوجود میکل کی محبت آپ کے دل سے دور نہیں ہوئی، اگر چہ وہ دوسرے کے نکاح میں تھی، اسی لئے جب شاول مارا گیا تو داؤد نے اس کے بیٹے شبوست سے اپنی بیوی کا مطالبہ کیا اور کہا کہ میری بیوی مجھ کو واپس کر، جس کا مہر میں نے فلسطینیوں کے ایک سو آلاتِ تناسل دے کر ادا کر دیا تھا، مجبوراً شبوست نے فلطی بن لیس سے جبراً میکل کو لے کر داؤدؑ کے پاس بھیج دیا۔ اور اس کا شوہر فلطی اس کے

پیچھے پیچھے روتا ہوا مقام بحوریم تک آیا، پھر مجبوراً واپس ہو گیا، جس کی تصریح مذکورہ باب میں ہے۔

پھر جب دوبارہ میکل داؤدؑ کے پاس پہنچی تب ان کی مستقل بیوی بن گئی، اور سات بیویوں کا عدد مکمل ہو گیا، پھر داؤدؑ نے اور دوسری عورتوں سے نکاح کیا اسی طرح بہت سی باندیاں جمع کیں، جن کی تعداد کی تصریح عیسائیوں کی کتب مقدسہ میں نہیں ہے، کتاب سموئیل ثانی باب ۵ آیت ۱۳ میں ہے:

"داؤد نے یروشلیم سے اور حرمیں رکھ لیں، اور بیویاں کیں اور داؤد کے ہاں اور بیٹے، بیٹیاں پیدا ہوئیں۔"

حضرت داؤدؑ نے نہ صرف اس قدر شادیوں پر اکتفاء کیا بلکہ آخری عمر میں ایک نوجوان کنواری لڑکی جس کا نام ابی شاگ شوعنت ہے، اور جو بلا کی خوب صورت تھی، اس سے آپ نے نکاح کیا، جس کی تصریح کتاب سلاطین اور باب اول میں ہے۔

حضرت سلیمانؑ کی شادیاں:

چوتھے سلیمان علیہ السلام نے ایک ہزار عورتوں سے شادی کی جن میں سات سو آزاد شہزادیاں تھیں اور تین سو باندیاں تھیں، یہاں تک کہ (عیسائیوں کی بائبل کے مطابق) ان کے دام فریب میں آ کر آخر عمر میں آپ نعوذ باللہ منہ مرتد بھی ہو گئے، اور بت خانے بھی تعمیر کرائے جس کی تصریح کتاب سلاطین اول باب ۱۱ میں موجود ہے۔

تورات میں کہیں بھی کئی نکاحوں سے ممانعت نہیں:

نیز توریت کے کسی بھی مقام سے ایک نکاح سے زیادہ کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی۔ اور اگر یہ چیز حرام ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام اس کی حرمت کی اسی طرح تصریح کرتے، جس طرح دوسری حرام چیزوں کی تصریح کی ہے، اور ان کی تحریم کے اظہار میں بہت سختی کی ہے، اس کے برعکس توریت سے تعددِ ازدواج کا جواز ثابت ہوتا ہے،

کیونکہ پہلے اعتراض کے جواب میں آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ کنواری لڑکیاں جو مدیانیوں کو غنیمت سے حاصل ہوئی تھی ان کی تعداد بتیس ہزار تھی، اور ان کو بنی اسرائیل پر تقسیم کیا گیا تھا، بلالحاظ اس کے کہ وہ شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ، اس میں کوئی تخصیص کنوارے لوگوں کی تھی۔

نیز کتاب استثناء باب ۲۱ آیت ۱۰ میں ہے کہ

"جب تو اپنے دشمنوں سے جنگ کرنے کو نکلے اور خداوند تیرا خاندان کو تیرے ہاتھ میں کر دے، اور تو ان کو اسیر کر لائے اور ان اسیروں میں کسی خوبصورت عورت کو دیکھ کر تو اس پر فریفتہ ہو جائے، اور اس کو بیاہ لینا چاہے تو تو اسے اپنے گھر لے آنا، اور وہ اپنا سر منڈوائے اور اپنے ناخن ترشوائے، اور اپنی اسیری کا لباس اتار کر تیرے گھر میں رہے، اور ایک مہینہ تک اپنے ماں باپ کے لئے ماتم کرے، اس کے بعد تو اس کے پاس جا کر اس کا شوہر ہونا اور وہ تیری بیوی بنے، اور اگر وہ تجھ کو نہ بھائے تو جہاں وہ چاہے اس کو جانے دینا، لیکن روپے کی خاطر اس کو ہرگز نہ بیچنا، اور اس سے لونڈی کا سا سلوک نہ کرنا اس لئے کہ تو نے اس کی حرمت لے لی ہے۔"

اگر کسی مرد کی دو بیویاں ہوں، اور ایک محبوب اور دوسری غیر محبوبہ ہو اور محبوب اور غیر محبوبہ دونوں سے لڑکے ہوں، اور پہلوٹھا بیٹا غیر محبوبہ سے ہو تو جب وہ اپنے بیٹوں کو اپنے مال کا وارث کرے، تو وہ محبوبہ کے بیٹے کو غیر محبوبہ کے بیٹے پر جو فی الحقیقت پہلوٹھا ہے فوقیت دے کر پہلوٹھا نہ ٹھہرائے، بلکہ وہ غیر محبوبہ کے بیٹے کو اپنے سب مال کا دونا حصہ دے کر اسے پہلوٹھا مانے، کیونکہ وہ اس کی قوت کو ابتداء ہے، اور پہلوٹھے کا حق اسی کا ہے۔ (آیات ۱ تا ۱۷)

ان آیات میں صرف اس شخص سے خطاب نہیں ہے جس کی پہلی بیوی نہ ہو بلکہ

عام ہے، خواہ اس کی پہلی بیوی ہو یا نہ ہو، نیز اس میں یہ تصریح بھی نہیں ہے کہ یہ حکم ایک ہی باندی کے ساتھ مخصوص ہے، اس کے برعکس بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر مخاطب ایک سے زیادہ عورتوں کو پسند کرے اور ان کو بیویاں بنانا چاہے تو اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہوگا، لہذا ہر اسرائیلی کے لئے بہت سی عورتوں سے شادی کرنا جائز ہوا، اور یہ الفاظ کہ ''اگر کسی مرد کی دو بیویاں ہوں'' تو صاف وصریح ہمارے مدعا پر دلالت کر رہے ہیں، جس کی توضیح کی ضرورت نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ ثابت ہوگیا کہ موسیٰ کی شریعت میں کثرتِ ازدواج جائز فعل تھا، اور حرام بالکل نہ تھا، اسی بناء پر جدعون اور داؤد وغیرہما نے جوامتِ موسوی کے نیک اور صالح لوگ تھے، بہت سی شادیاں کیں۔ (بائبل سے قرآن تک)

(تو جب ان انبیاءؑ کے لئے کئی بیویاں کرنا بائبل کی رو سے درست ہے تو حضرت محمد ﷺ پر ہی اعتراض کیوں، انور)۔

جواب کی مزید تفصیل درج ذیل ہے:

جواب: تورات سے قبل، تورات کے وقت اور تورات کے بعد ایک سے زائد شادیاں ایک ہی وقت میں ملاحظہ فرمائیے!

(۱) سیدنا حضرت نوح علیہ السلام کے والد جناب لمک کی ایک ہی وقت میں دو شادیاں تھیں۔

''اور لمک دو عورتیں بیاہ لایا۔ ایک کا نام عدہ اور دوسری کا نام ضِلّہ تھا۔'' (پیدائش ۴:۱۹)

(۲) اور لمک نے اپنی بیویوں سے کہا کہ اے عدہ اور ضلہ میری بات سنو۔ اے لمک کی بیویو! میرے سخن پر کان لگاؤ۔ (پیدائش ۴:۲۳)

''جد الانبیاءؑ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک ہی وقت میں دو

بیویاں تھیں۔

حضرت سارہ علیہا السلام (پیدائش ۱:۱۶)

حضرت ہاجرہ علیہا السلام (پیدائش ۳:۱۶۔ پیدائش ۱۶:۱۶)

(۳) سیدنا حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام کی ایک ہی وقت میں چار بیویاں تھیں۔

''لیاہ (پیدائش ۲۸:۲۹) دوم۔ زلفہ (پیدائش ۲۴:۲۹)۔''

سوم (راخل (پیدائش ۲۸:۲۹) چہارم۔ بلہاہ (پیدائش ۲۹:۲۹)۔

(۴) سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک ہی وقت میں دو بیویاں تھیں۔

''تب اس نے اپنی بیٹی صفورہ موسیٰ کو بیاہ دی۔'' (خروج ۲۱:۲)

''موسیٰ کے سالے قینی'' یعنی قینی کی بہن۔ (قضات ۱۶:۱)

(۵) جدعون کے ستر بیٹے اور ایک ہی وقت میں اس کی بہت سی بیویاں تھیں۔ (قضات ۳۰:۸)۔ ''جدعون'' نبی تھے (عبرانیوں ۳۲:۱۱)۔

(۶) ''القانہ'' نیک آدمی اور اس کی دو بیویاں ایک ہی وقت میں تھیں۔ (اسموئیل ۱تا۳)۔

(۷) اشور کی دو بیویاں تھیں۔ حیلاہ اور نعراہ (۱۔ تواریخ ۵:۴)

(۸) یہویدع کاہن نے یوآس کو ایک ہی وقت میں دو بیویوں سے بیاہا۔ (۲۔ تواریخ ۲۴:۱تا۳)

(۹) اگر کسی مرد کی دو بیویاں ہوں اور ایک محبوبہ اور دوسری غیر محبوبہ ہو اور غیر محبوبہ دونوں سے لڑکے ہوں اور پہلوٹھا بیٹا غیر محبوبہ سے ہو''۔ (استثناء ۱۵:۲۱)۔

(۱۰) سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام کی ایک ہی وقت میں ایک سے زائد شادیاں اور بیویاں تھیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی بیویوں کی تعداد:

نمبر شمار	نام	حوالہ
۱	میکل	۱۔سموئیل ۱۸:۲۷۔
۲	ابی جیل	۱۔سموئیل ۲۵:۴۲۔
۳	اخینوعم	۱۔سموئیل ۲۵:۴۳۔
۴	معکہ	۲۔سموئیل ۳:۳۔
۵	حجیت	۲۔سموئیل ۳:۴۔
۶	ابیطالی	۲۔سموئیل ۳:۴۔
۷	عجلاہ	۲۔سموئیل ۳:۵۔
۸	بت سبع	۲۔سموئیل ۱۲:۲۴۔
۱۸	دس حرمیں جمع آٹھ بیویاں ۱۸	۲۔سموئیل ۲۰:۳۔
۱۹	شمونمیت ابی شاگ	۱۔سموئیل ۱:۳۔

ان کے علاوہ سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام نے اور بھی حرمیں رکھیں اور بیویاں کیں۔(۲۔سموئیل ۵:۱۳)

چنانچہ تورات اور دیگر الہامی کتابوں میں سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک سے زائد عورتوں سے نکاح اور شادی کرنا جائز و حلال ہے۔

چونکہ تورات اور عہد قدیم کی دیگر کتابوں سے یہ بات کہ ایک ہی وقت میں ایک سے زائد عورتوں سے نکاح جائز وحلال ہے۔اس لئے یہ اعتراض ہم اہل اسلام پر نہیں بلکہ عہد قدیم پر وارد ہوتا ہے کیونکہ عہد قدیم، قرآن کریم سے پہلے کا ہے۔

(جواب مسلم)

مسیحیت میں دوسری شادی:

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام نے اس حکم کو منسوخ فرمایا ہے:

''اور مَیں تم سے کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی چھوڑی ہوئی سے بیاہ کرے وہ بھی زنا کرتا ہے۔''

(متی ۱۹:۹، لوقا ۱۶:۱۸)

مسیحیوں سے ایک سوال:

چونکہ مسیحی دنیا کا آپؑ کے اس حکم پر عمل ہے اس لئے یہ لوگ ایک ہی وقت میں دوسری شادی نہیں کرتے۔ اگر اس حکم کو گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ حکم انسان کے لئے کافی نہیں کیونکہ یہ مسیحی عورت کہیں بھی دوبارہ نکاح نہیں کر سکتی۔ جو کوئی مسیحی مرد اس کے ساتھ نکاح کرے گا وہ بھی زانی شمار ہوگا۔

اب یہ مسیحی عورت نکاح کے بغیر کیا کرے گی؟ جبکہ پہلے ہی اس مسیحی عورت کو حرام کاری اور زنا کاری کا چسکا پڑ چکا ہے۔ مسیحی نوجوان مرد اور مسیحی نوجوان عورت کا نکاح ہو جاتا ہے مگر چھ ماہ بعد عورت ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے علاج و درماں سے کوئی افاقہ نہیں ہوتا۔ اب یہ مسیحی نوجوان کیا کرے گا؟ جبکہ اپنے جذبات پر قابو پانا اس کے لئے ناممکن ہے یا مرد اس مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے تو مسیحی نوجوان عورت بھی اپنے جوانی کے جذبات پر قابو نہیں پا سکتی تو ان دونوں باتوں کی بابت حضرت مسیح علیہ السلام کا فرمان مبارک کیا ہے؟

کسی مسیحی ملک سے کسی دوسرے ملک کی جنگ ہو جاتی ہے جنگ میں مسیحی نوجوان کثرت سے مر جاتے ہیں اور نوجوان مسیحی عورتیں بہت کنواری ہیں ان کو نکاح

کرنے کے لئے مسیحی آدمی نہیں ملتے اور ایک مسیحی مرد دوسرا نکاح بیک وقت کر نہیں سکتا تو یہ مسیحی نوجوان کنواری عورتیں کیا کریں گی جبکہ وہ اپنے جذبات جوانی پر قابو نہیں پا سکتیں؟

جس طرح پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کا حکم طلاق کی بابت نقل کیا گیا ہے بالکل اسی طرح آپؑ کا فرمان مبارک ان صورتوں میں کیا ہے؟

قرآن میں تعدّد ازواج

اور اسلام سے پہلے اقوام عالم میں اس کا رواج

ایک مرد کے لئے متعدد بیبیاں رکھنا اسلام سے پہلے بھی تقریباً دنیا کے تمام مذاہب میں جائز سمجھا جاتا تھا، عرب، ہندوستان، ایران، مصر، بابل وغیرہ ممالک کی ہر قوم میں کثرتِ ازواج کی رسم جاری تھی، اور اس کی فطری ضرورتوں سے آج بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا، دورِ حاضر میں یورپ نے اپنے متقدمین کے خلاف تعدد ازواج کو ناجائز کرنے کی کوشش کی، تو اس کا نتیجہ بے نکاحی داشتاؤں کی صورت میں برآمد ہوا، بالآخر فطری قانون غالب آیا، اور اب وہاں کے بابصیرت حکماء ہنود اس کو رواج دینے کے حق میں ہیں۔

مسٹر ڈیون پورٹ جو ایک مشہور عیسائی فاضل ہے، تعدد ازواج کی حمایت میں انجیل کی بہت سی آیتیں نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے۔

ان آیتوں سے یہ پایا جاتا ہے کہ تعدد ازواج صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ خدا نے اس میں خاص برکت دی ہے۔

اسی طرح پادری نکسن اور جان ملٹن اور اپزک ٹیلر نے پرزور الفاظ میں اس کی تائید کی ہے۔

اسی طرح ویدک تعلیم غیر محدود تعدد ازواج کو جائز رکھتی ہے، اور اس سے دس

دس، تیرہ تیرہ، ستائیس ستائیس بیویوں کو ایک وقت میں جمع رکھنے کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔

کرشن جو ہندوؤں میں واجب التعظیم اوتار مانے جاتے ہیں ان کی سینکڑوں بیویاں تھیں، جو مذہب اور قانون عفت وعصمت کو قائم رکھنا چاہتا ہو، اور زنا کاری کا انسداد ضروری جانتا ہو اس کے لئے کوئی چارہ نہیں کہ تعدد ازواج کی اجازت دے، اس میں زنا کاری کا بھی انسداد ہے، اور مردوں کی بہ نسبت عورتوں کی جو کثرت بہت سے علاقوں میں پائی جاتی ہے اس کا بھی علاج ہے، اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو داشتہ اور پیشہ ور کسبی عورتوں کی افراط ہوگی، یہی وجہ ہے کہ جن قوموں میں تعدد ازواج پر تو پابندی ہے، مگر بطور دوستانہ جتنی بھی عورتوں سے مرد زنا کرتا ہے اس کی اجازت ہے، کیا تماشہ ہے کہ نکاح ممنوع اور زنا جائز۔

غرض اسلام سے پہلے کثرت ازواج کی رسم بغیر کسی تحدید کے رائج تھی، ممالک اور مذاہب کی تاریخ سے جہاں تک معلوم ہوتا ہے کسی مذہب اور کسی قانون نے اس پر کوئی حد نہ لگائی تھی، نہ یہود ونصاریٰ نے نہ ہندوؤں اور آریوں نے اور نہ پارسیوں نے۔

اسلام کے ابتدائی زمانے میں بھی یہ رسم بغیر تحدید کے جاری رہی، لیکن اس غیر محدود کثرت ازواج کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ اول اول تو حرص میں بہت سے نکاح کر لیتے تھے، مگر پھر ان کے حقوق ادا نہ کر سکتے تھے، اور یہ عورتیں ان کے نکاح میں ایک قیدی کی حیثیت سے زندگی گزارتی تھیں۔ پھر جو عورتیں ایک شخص کے نکاح میں ہوتیں ان میں عدل ومساوات کا کہیں نام ونشان نہ تھا جس سے دلبستگی ہوئی اس کو نواز اگیا، جس سے رخ پھر گیا اس کے کسی حق کی پرواہ نہیں۔ (المصالح العقلیہ)

مرد کو بیک وقت تعدد ازواج کیوں جائز ہے؟

اور عورت کو کیوں ممنوع؟

عورت اولاد کے حق میں ایسی ہے جیسے زمین پیداوار کے حق میں۔ مگر پیداوار کو تو بوجہ تشابہِ اجزاء برابر بانٹ سکتے ہیں۔ اس لئے اس کی شرکت میں کچھ حرج نہیں۔ مگر ایک عورت اگر چند مردوں میں مشترک ہو تو بوجہ استحقاق نکاح ایک تو ہر دم ہر کسی کو استحقاق قضائے حاجت۔ اس صورت میں اول تو اسی وجہ سے اندیشہ فساد وعناد ہے۔ شاید ایک ہی وقت سب کو ضرورت ہو۔ دوسرے بعدِ نکاح اگر بوجہ استحقاق مذکور سب اس سے اپنا مطلب نکالتے رہیں ایک بچے کے پیدا ہونے پر بچے کو تو پارہ پارہ نہیں کر سکتے۔ جو اس طرح تقسیم کر کے اپنے ساتھ ہر کوئی لے جائے اور متعدد فرزند ہوں تو بوجہ اختلاف ذکورت وانوثت وتفاوتِ شکل وصورت وتباین خلق وسیرت وفرق قوت و ہمت موازنہ ممکن نہیں جو ایک ایک کو لے کر اپنے اپنے دل کو سمجھالیں۔

پھر بوجہ برابری محبت جملہ اولاد یہ دوسری دقت ہے کہ ایک کے وصال سے اتنا سرور نہ ہوگا جتنا اوروں کے فراق سے رنج اٹھانا پڑے گا۔ پھر اس وجہ سے خدا جانے کیا فتنہ برپا ہو۔ غرض بہر طور اس انتظام میں خرابی نظام عالم تھی۔

ہاں اگر ایک مرد ہو اور متعدد عورتیں ہوں تو جیسے ایک کسان متعدد کھیتوں اور زمینوں میں تخم ریزی کر سکتا ہے۔ ایسے ہی ایک مرد بھی متعدد عورتوں سے بچے جنوا سکتا ہے اور پھر اس کے ساتھ اور کوئی خرابی نہیں۔ عورتوں کے رنج سے چنداں اندیشہ نہیں۔ قتل وقتال کا کچھ خوف نہیں۔

القصہ (ہندو مذہب میں) ایک عورت کا پانچ پانڈوں کے نکاح میں ہونا (جیسا کہ دروپدی ارجن جی کی بیوی تھی لیکن پانچ پانڈو اس کو اپنی اپنی باری استعمال کرتے

تھے، (انور) سامان دامن گذاری نہیں۔ بلکہ اس صورت میں الٹ پنڈت جی اور ان کے دین کے بڑے پیشواؤں پر اعتراض واقع ہوگا۔

دروپدی ارجن جی کی ناری
پانچوں پانڈوں اس کو بھوگیں اپنی اپنی باری
کہو یہ کون دھرم ہے
(رسالہ کتھا سلوئی)

جنت میں ایک عورت کیلئے کئی خاوند نہ ہونے کی وجوہات

انعام میں راحت کے سامان اور اعزاز واکرام کے اسباب تو دیئے جاتے ہیں، پر رنج وتکلیف کے سامان اور تحقیر وتوہین کے اسباب انعام میں نہیں دیئے جاتے یہ چیزیں سزا کے لئے ہوتی ہیں۔

جب یہ بات دل نشین ہو چکی تو اب سنئے بہشت میں جو کچھ ہوگا بطورِ انعام وجزا ہوگا۔ اگر وہاں ایک مرد کو متعدد عورتیں ملیں تو اعزاز واکرام بھی ہے اور راحت وآرام بھی ہے اور ایک عورت کو متعدد خاوند ملیں تو راحت وآرام تو کچھ زیادہ نہ ہوگا، خاص کر اس صورت میں جب کہ مرد کی قوت سب عورتوں کی خواہشوں کے برابر یا کم زیادہ بڑھا دی جائے جیسے اہل اسلام کی روایات اس پر شاہد ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں آرام اور راحت ہرگز زیادہ نہ ہوگا۔ پر بجائے اعزاز واکرام الٹی تحقیر وتذلیل وتوہین ہوگی۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عورت موافق قواعد اہل اسلام محکوم اور مرد حاکم ہوتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو وہ مالک ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کو مالک کہا کرتے ہیں۔ اور کیوں نہ کہیں باندیاں تو مملوک ہوتی ہی ہیں۔ بیویاں نکاح کے مہر کی وجہ سے نکاح میں آنے سے ان کی خریدی ہوئی ہیں۔ وہاں اگر اعتاق ہے (غلام کو آزاد کرنا) تو یہاں طلاق ہے یعنی جیسے باندی، غلام باختیارِ خود قیدِ غلامی سے نہیں نکل سکتے۔ ہاں

مالک کو اختیار ہے وہ چاہے تو آزاد کر دے۔ ایسے ہی عورت با ختیار خود قید خاوند سے رہا نہیں ہو سکتی۔ البتہ خاوند کو اختیار ہے چاہے تو طلاق دے دے۔ جیسے باندی غلام کا نان ونفقہ مالک کے ذمہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی عورت کا نان ونفقہ خاوند کے ذمہ ہے۔ جیسے مالک ایک، اور غلام باندی کئی کئی ہوتے ہیں۔ ایسے ہی خاوند ایک اور عورتیں کئی کئی ہوتی ہیں۔

کثرت کا نہیں (کہ ایک شخص براہ راست بہت سے حاکموں کا محکوم ہو) ہاں یہ صورت ہوتی ہے کہ نیچے سے اوپر تک جتنے حکام ہوں (بالواسطہ یا بوسائط) ان سب کا یا اکثر کا یا بعض کا محکوم ہو۔ عوام رعیت کو دیکھئے وہ سب کے محکوم ہوتے ہیں اور کسی کے حاکم نہیں ہوتے۔ ان سے بڑھ کر کوئی ذلیل نہیں، اور حکام ماتحت حکام بالا دست کے تو محکوم ہوتے ہیں اور رعیت کے حاکم۔ وہ رعیت سے معزز اور حکام بالا دست سے ذلیل ہوتے ہیں۔ اسی طرح اوپر تک چلے چلو۔ بادشاہ سب کا حاکم ہوتا ہے اور کسی کا محکوم نہیں ہوتا اس سے بڑھ کر کوئی معزز ہی نہیں ہوتا۔

اس صورت میں اگر کسی عورت کے متعدد خاوند ہوں تو یوں کہو حاکم متعدد ہوئے تو جتنے حاکم زیادہ ہوں گے اتنی ہی محکوم میں ذلت زیادہ ہوگی۔ سو یہ تحقیر اور تذلیل اور توہین عورت کے حق میں اگر جائز ہوتی تو دنیا میں شاید کسی مذہب میں اس کی اجازت ہوتی۔ مگر بہشت میں جو جائے عزت و آرام ہے۔ یہ صورت تحقیر ہرگز ممکن الوقوع نہیں۔

ہاں اگر ایک خاوند سے ضرورت پوری نہ ہوتی یا لذت میں کمی رہتی تو اس وقت شاید بنا چاری یہ امران کے لئے تجویز کیا جاتا۔ مگر روایاتِ صحیحہ اہل اسلام اس پر شاہد ہیں کہ ایک ایک مرد کو بہشت میں اتنی قوت ہوگی کہ لگا تار تیس تیس عورتوں کے پاس جا سکے۔

بالجملہ ایک خاوند تو بغرض رفع ضرورت ضروری ہے۔ اس سے زیادہ میں

ضرورت تو کچھ نہیں البتہ جنتی عورتوں کی تحقیر وتذلیل ہوگی اور ظاہر ہے کہ جنت جائے اعزاز واکرام ہے، موقع تحقیر وتذلیل نہیں۔ (انتصار الاسلام)

مرد کیلئے تعداد ازواج چار تک محدود ہونے کی وجہ

مرد کیلئے چار منکوحہ عورتیں ہونے کی وجہ خدا تعالی کی کمال حکمت واتمام نعمت و مصلحت پر مبنی ہے ہم قبل ازیں لکھ چکے ہیں کہ مرد کو قوتیں اور طاقتیں بہ نسبت عورت کے زیادہ عطا کی گئی ہیں۔ اس لئے مرد کئی عورتوں سے ایک زمانہ میں نکاح کر سکتا ہے۔ تعداد ازواج کی مصلحت نکاح کے مقصد سے معلوم ہو سکتی ہے سو نکاح کا مقصد جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں سب سے اول دائم تقویٰ وعفت وتوالد ہے اور چونکہ تمام بنی آدم کی قوت یکساں نہیں ہوتی اس لئے خدا نے ان کی طاقتوں وقوتوں کے مناسب ان کے لئے اسباب فراہم کئے ہیں سو جن اشخاص کو ہیجان غلبہ شہوت زیادہ ہو ان کی حفاظت عفت کے لئے ہر سال میں چار عورتیں باری باری ان کے پاس ہونا چاہئیں اور ایسے آدمیوں کے لئے یہ عدد عین قانون قدرت کے مطابق ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایسا آدمی جب کسی ایک عورت کو نکاح میں لائے گا تو کم از کم یہ عورت اس کے لئے تین ماہ تک کافی ہے۔ کیونکہ حمل کی شناخت کم از کم تین ماہ تک مقرر ہے۔ پس اگر اس میعاد میں اس عورت کو حمل ٹھہر جائے تو ایسے ہیجان وجوش شہوت والا آدمی اگر اس عورت سے صحبت کرے گا تو جنین پر برا اثر پڑے گا اور حمل گر جانے کا اندیشہ ہے لہذا اس عورت کو آرام دے اور اس عورت سے صحبت ترک کر کے دوسری عورت نکاح میں لائے گا اگر دوسری عورت کو بھی تین ماہ میں قرار حمل ہو جائے تو اس سے بھی صحبت ترک کرنی پڑے گی۔ کیونکہ اس سے اسقاط حمل کا اندیشہ ہے اور والدین کے شہوانی جوش جنین پر برا اثر ڈالتے ہیں۔ یہ چھ ماہ ہوئے۔ اب تیسری عورت سے نکاح کرے گا اگر تیسری عورت کو بھی حمل ہو گیا تو اب اس سے

بھی اس کو صحبت ترک کرنی پڑے گی۔ یہ نو ماہ ہو گئے۔ اب پہلی عورت کا وضع حمل ہو جائے گا مگر وہ غالباً تین ماہ تک قابل صحبت نہیں ہو سکتی لہذا اس کو چوتھی عورت نکاح میں لانی پڑے گی۔ اب چوتھی عورت کے حمل کی شناخت بھی تین ماہ تک مقرر ہے یہ ایک سال ہوا اور اس اثناء میں پہلی عورت جس کو وضع حمل سے تین ماہ گذر چکے ہیں تعلقات مرد و زن کے لئے تیار ہو جائے گی۔ اس طرح وضع حمل کے بعد ہر ایک باری باری اس کے لئے مہیا ہو گی۔

پس یہ تعداد ہر ایک قوی الشہوت انسان کے لئے کافی اور عین قانون قدرت و فطرت کے مطابق ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ نے جو قرآن کریم میں دو دو تین تین چار چار تک فرمایا ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ بعض آدمیوں کے لئے ہر سال میں دو عورتیں ہی کافی ہو سکتی ہیں کیونکہ بعض عورت کے اولاد نہیں ہوتی یا دیر سے حمل ٹھہرتا ہے اور بعض کے لئے سال میں تین ہی کافی ہو سکتی ہیں اور بعض کو چار کی ضرورت پڑتی ہے۔

حاملہ کے ساتھ منع صحبت کی وجہ ایک تو اندیشہ اسقاط حمل ہے۔ دوسرے اس حمل سے جو اولاد ہو گی اس کے اخلاق و اطوار میں والدین کے شہوانی جوش مرکوز ہو کر بداخلاقی پیدا کریں گے۔ کیونکہ جوش شہوت کا اثر جنین پر بالضرور پڑتا ہے اور وہ طبیعت میں فطری ہو جاتا ہے۔ اور گو طبی قاعدہ کی رو سے اس بات پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ دودھ پلانے والی سے صحبت کرنی بچہ کے لئے مضر ہے۔ لیکن اطباء نے اس امر کی اصلاح بعض ادویہ کے ساتھ بتائی ہے لہذا یہ امر مضر نہ رہا۔

اب رہی یہ بات کہ چار سے زیادہ سے کیوں ناجائز ہوا۔ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضروری تھا کہ ایک خاص حد بیویاں کرنے کی ہوتی ورنہ اگر حد مقرر نہ ہوتی تو لوگ حد اعتدال سے نکل کر سینکڑوں تک بیویاں کرنے کی نوبت پہنچاتے اور ایسا کرنے سے ان بیویوں پر اور خود اپنی جانوں پر ظلم اور بے اعتدالیاں کرتے اور

ضرورت چار سے سے رفع ہوگئی تھی اس لئے زائد کو ناجائز قرار دیا۔

خلاصہ وجوہ تعدد ازواج

(۱) تقوی (۲) قویٰ (۳) موافقت نہیں اور طلاق کا بھی موقع نہیں (۴) بانجھ پن (۵) کثرت تولد بنات بعض بلاد اور خاندانوں میں (۶) پولیٹیکل مصالح اور سیاسی ضروریات عورت غالباً پچاس برس کے بعد قابل نسل نہیں رہتی بخلاف مردوں کے کہ وہ نوے برس تک ہمارے ملک میں اس قابل ہیں (۸) مشاہدہ کثرت زنا جن بلاد میں تعدد ازواج جائز نہیں ان بلاد میں بضرورت صحبت کسی اور سے تعلقات مندرجہ بالا اسباب ہیں جو تعدد ازواج کی ضرورت کو بیان کرتے ہیں۔ (از حضرت تھانویؒ)

عورت کیلئے ایک وقت کئی خاوند نہ کرنے کی وجہ

حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:۔

(۱) عورت کے اندر خداتعالی نے فطری ایک شرم وحیا کا وصف ایسا پیدا کیا ہے کہ وہ غیر مردوں کے سامنے آتے جھجکتی ہے عورت جب مرد سے کوئی بات کرنے لگتی ہے تو شرم کے مارے بار بار اپنی آنکھیں جھکا لیتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ فاحشہ عورتوں کے سوائے جن کی فطری قوت حیا بالکل ضائع اور معدوم ہو جاتی ہے باقی سب عورتیں اپنی نیچرل حالت میں مردوں سے حیا اور حجاب کرتی ہیں۔ مادہ حیاء جو خداتعالی نے ان کی فطرت میں پیدا کر رکھا ہے ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک ہی خاوند کے لئے ہیں کیونکہ کئی مردوں سے تعلق رکھنے میں یہ حیا رہ نہیں سکتی جیسا بازاری عورتوں میں مشاہدہ ہے۔

(۲) تجربہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ ایک مرد عندالضرورت کئی جورو (بیوی) کر لے تو بھی سب کے ساتھ نباہ سکتا ہے مگر ایک عورت دو خاوندوں کی بی بی ہو کر کبھی نباہ نہیں سکتی اس سے ظاہر ہے کہ ایک مرد کے لئے کئی بیویاں ہو سکتی ہیں مگر ایک عورت کے لئے کئی خاوند نہیں ہو سکتے۔

(۳) دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے اکثر زیادہ رہتی ہے اور یہ امر صریح دلیل ہے اس بات کی کہ ایک مرد کے لئے کئی جورویں ہو سکتی ہیں مگر اس کے برعکس قدرت کی مرضی نہیں۔

(۴) مرد کو پروردگار نے عورت کی نسبت قوی اور زبردست پیدا کیا ہے اور عورت کو نازک اور ضعیف الاعضاء۔ لہذا اس سے ظاہر ہے کہ قوی کئی زیر دستوں کو اپنے ماتحت رکھ سکتا ہے۔ نہ برعکس

عورت کیلئے کیوں ایک ہی خاوند ٹھہرایا گیا اس کی ایک اور وجہ

خدا تعالی نے مردوں کو رسالت و نبوت و خلافت و بادشاہی و امارت میں عورتوں پر فضیلت دی ہے مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا تا کہ وہ عورتوں کے مصالح و بہبودی میں کوشاں رہیں اور ان کے امور معاش کے لئے چلتے پھرتے رہیں اور خطرناک مقامات میں وارد ہوں اور جنگلوں اور بیابانوں کو طے کریں اور اپنی جانوں کو عورتوں کے لئے محنت و مشقت میں ڈالیں پس خدا تعالی نے مردوں کی قدردانی کی ہے اور ان کو وہ اختیارات دیئے ہیں جو عورتوں کو نہیں دیئے اور مردوں کو وہ طاقتیں دی ہیں جو عورتوں کو نہیں دیں جب تم مردوں کی محنت و مشقت میں غور کرو گے جو کہ عورتوں کے مصالح و بہتری میں محنت کرتے رہتے ہیں تو تم پر صاف بیاں ہو جائے گا کہ عورتوں کی محنت مردوں کا حصہ محنت و مشقت و تحمل میں زیادہ تر ہے اور یہ امر خدا تعالی کے کمال حکمت اور اس کی رحمت پر مبنی ہے پس جب کہ مرد پر اس قدر بوجھ ڈالے گئے ہیں تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس میں ان بوجھوں کی برداشت کی طاقت بھی زیادہ رکھی گئی ہے اور وہ کئی عورتوں کو بھی رکھ سکتا ہے اور جب کہ عورت پر اس قدر بوجھ نہیں ڈالے گئے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان بوجھوں کے برداشت کی طاقت نہیں رکھتی اس لئے خدا تعالی نے عورت کی فطرت و سرشت کے مطابق ہر ایک عورت کے

لئے ایک ہی خاوند تجویز فرمایا۔

کیا حوروں کے تصور سے عیاشی کا تصور پیدا ہوتا ہے؟

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

قرآن مجید میں حوروں کے حسن کا جو بیان ہے اس سے (زنا کاری، حرام کاری، شہوت پرستی، عیاشی کا تصور) پیدا ہوتا ہے۔

جواب: ملاحظہ فرمائیے کہ عیسائیوں کی بائبل کیا کہتی ہے:

(۱) اے امیر زادی تیرے پاؤں جوتیوں میں کیسے خوبصورت ہیں۔

(۲) تیری رانوں کی گولائی ان زیوروں کی مانند ہے جن کو کسی استاد کاریگر نے بنایا ہو۔

(۳) تیری ناف گول پیالہ ہے جس میں ملائی ہوئی مے کی کمی نہیں۔

(۴) تیرا پیٹ گیہوں کا انبار ہے جس کے گردا گرد سوسن ہوں۔

(۵) تیری دونوں چھاتیاں دو آہو بچے ہیں۔ جو تو اَم (جڑواں) پیدا ہوئے ہوں۔

(۶) تیری گردن ہاتھی دانت کا برج ہے۔

(۷) تیری آنکھیں بیت ربیم کے پھاٹک کے پاس حسبون کے چشمے ہیں۔

(۸) تیری ناک لبنان کے برج کی مثال ہے جو دمشق کے رخ بنا ہے۔

(۹) تیرا سر تجھ پر کرمل کی مانند ہے۔

(۱۰) اور تیرے سر کے بال ارغوانی ہیں۔ بادشاہ تیری زلفوں میں اسیر ہے۔
اے محبوبہ! عیش و عشرت کیلئے تو کیسی جمیلہ اور جانفزا ہے۔

(۱۱) یہ تیری قامت کھجور کی مانند ہے اور تیری چھاتیاں انگور کے گچھے ہیں۔
میں نے کہا میں اس کھجور پر چڑھوں گا اور اس کی شاخوں کو پکڑوں گا

(۱۲) اور تیرے سانس کی خوشبو سیب کی سی ہو۔

(۱۳) اور تیرا منہ بہترین شراب کی مانند ہو۔

جو میرے محبوب کی طرف سیدھی چلی جاتی ہے اور سونے والوں کے ہونٹوں پر سے آہستہ آہستہ بہ جاتی ہے۔ میں اپنے محبوب کی ہوں اور وہ میرا مشتاق ہے۔ (غزل الغزلات ۷: ۱ تا ۱۰)

بائبل کی مندرجہ بالا آیات میں عورت کے جسم کے تیرہ اعضاء کا جس انداز سے اظہار کیا گیا ہے کیا ان سے (ناپاک جنسی لذت کیلئے ایسی خوبصورت، محبوبہ، عیش و عشرت کے لئے جمیلہ اور جانفزا، زنا کاری، حرام کاری، تماش بینی، شہوت پرستی، عیاشی، بے حیائی اور بے غیرتی کا تصور) نہیں پایا جاتا؟

نیز انگریزی بائبل (گڈ نیوز بائبل) کی کتاب ''غزل الغزلات'' کے صفحہ ٦٦٠ پر جو دو تصویریں ایک جوان عورت کی اس کے علاوہ ایک مرد اور ایک عورت کی، اور صفحہ ٦٦٤ پر جو ایک جوان عورت کی تصویر موجود ہے۔ کیا ان تصاویر اور ان کی کیفیت و حالت سے، ناپاک جنسی لذت (فحاشی، عریانی، بے غیرتی، زنا کاری، حرام کاری، شہوت پرستی، عیاسی اور تماش بینی) کا تصور موجود نہیں؟ کیا ان تصاویر سے ان برے کاموں کو کرنے کے لئے اپنا راستہ صاف نہیں کیا گیا؟ اور لوگوں کو الہامی لبادہ کے لباس میں ایسے کام کرنے کی ترغیب و دعوت نہیں دی گئی؟ کیا اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس الہام کے ساتھ ان ناپاک، گندی، نجس اور گھناؤنی تصاویر کو بھی نازل کیا تھا؟ اور کیا قرآن مجید اور فرقان حمید میں اس طرح کی کوئی تصویر ہے؟ اگر کوئی دکھا سکے تو دکھائے؟ ورنہ شرمائے۔

نیز بائبل کا الہامی کلام سماعت فرمائیے!

میں سوتی ہوں پر میرا دل جاگتا ہے۔ میرے محبوب کی آواز ہے جو کھٹکھٹاتا اور کہتا ہے۔ میرے لئے دروازہ کھول میری محبوبہ! میری پیاری! میری کبوتری! میری پاکیزہ! کیونکہ میرا سر شبنم سے تر ہے۔ اور میری زلفیں رات کو بوندوں سے بھری ہوئی ہیں۔ میں تو کپڑے اتار چکی اب پھر کیسے پہنوں؟ میں تو اپنے پاؤں دھو چکی اب ان کو

کیوں میلا کروں؟ میرے محبوب نے اپنا ہاتھ سوراخ سے اندر کیا اور میرے دل وجگر میں اس کے لئے جنبش ہوئی۔ میں اپنے محبوب کے لئے دروازہ کھولنے کو اٹھی اور میرے ہاتھوں سے مُر ٹپکا اور میری انگلیوں سے رقیق مُر ٹپکا اور قُفل کے دستوں پر پڑا میں نے اپنے محبوب کے لئے دروازہ کھولا لیکن میرا محبوب مُڑ کر چلا گیا تھا۔ جب وہ بولا تو میں بے حواس ہوگئی۔ میں نے اسے ڈھونڈا پر نہ پایا۔ میں نے اسے پکارا پر اس نے مجھے کچھ جواب نہ دیا۔ پہرے والے جو شہر میں پھرتے ہیں مجھے ملے۔ انہوں نے مجھے مارا اور گھائل کیا۔ شہر پناہ کے محافظوں نے میری چادر مجھ سے چھین لی۔ اے یروشلیم کی بیٹیو! میں تم کو قسم دیتی ہوں کہ اگر میرا محبوب تم کو مل جائے تو اس سے کہہ دینا کہ میں عشق کی بیمار ہوں۔" (غزل الغزلات ۵:۲تا۸)

نہایت حلیمی اور بردباری سے غور فرمایئے کیا یہ مضمون شرم وحیاء سے تعلق رکھتا ہے اور کیا یہ مضمون الہامی ہوسکتا ہے؟

نیز ملاحظہ فرمایئے!

میں تجھ کو اپنی ماں کے گھر میں لے جاتی۔ وہ مجھے سکھاتی، میں اپنے اناروں کے رس سے تجھے ممزوج (ملائی ہوئی) مے پلاتی۔"

(غزل الغزلات ۸:۲)

اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ جواب ملاحظہ فرمایئے!

"اس کا بایاں ہاتھ میرے سر کے نیچے ہوتا اور دہنا مجھے گلے سے لگاتا۔"

(غزل الغزلات ۸:۳)

اس مقام سے عملی نتیجہ اخذ کیجئے؟

بادہ عصیاں سے دامن تربتر ہے شیخ کا
اس پر دعویٰ یہ کہ اصلاح دو عالم ہم سے ہے

نیز ملاحظہ فرمایئے!

تو بھی اس نے اپنی جوانی کے دنوں کو یاد کر کے جب وہ مصر کی سرزمین میں بدکاری کرتی تھی بدکاری پر بدکاری کی۔سو وہ پھر اپنے ان یاروں پر مرنے لگی جن کا بدن گدھوں کا سا بدن اور جن کا انزال گھوڑوں کا سا انزال تھا۔(حزقی ایل ۲۳: ۱۹، ۲۰)

بائبل کی جن کتابوں میں ایسی شرافت سے گری ہوئی اور اخلاق سوز عبارتیں پائی جاتی ہیں کیا وہ اس قابل ہیں کہ انہیں الہامی یا پاک کہا جائے؟ اگر یہ الہامی اور پاک ہیں تو پھر غیر الہامی اور ناپاک کسے کہیں گے؟ اور ناپاک کے کیا معنی ہوں گے؟

آ گیا داغ اس کے دل میں یہ غرور
شکل ہے دنیا میں لاثانی مری

(جواب مسلم)

چودھواں باب

خواتین کے حقوق کے متعلق اعتراضات کے جوابات

اسلامی معاشرہ میں عورت کی حیثیت

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

اسلام میں عورتوں کی معاشرہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے؟

جواب: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ الآية، یہ آیت عورتوں اور مردوں کے باہمی حقوق و فرائض اور ان کے درجات کے بیان میں ایک شرعی ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کئی رکوع میں اسی ضابطہ کی اہم جزئیات کا بیان ہوا ہے۔

'اس وقت عورت اور اس کے حقوق و فرائض کا ذکر ہے۔ اس کے متعلق آیت مذکورہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں جن کی ادائیگی ضروری ہے اسی طرح مردوں پر عورتوں کے حقوق ہیں جن کا ادا کرنا ضروری ہے۔ ہاں اتنا فرق ضروری ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے۔ اور تقریباً یہی مضمون سورۂ نساء کی آیت میں اس طرح آیا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ.

''یعنی مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی اللہ نے دی ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کیے انہوں نے اپنے مال۔''

اسلام اور اسلام سے پہلے معاشرہ میں عورت کا درجہ

اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں تمام دنیا کی اقوام میں جاری تھا کہ عورت کی حیثیت گھریلو استعمال کی اشیاء سے زیادہ نہ تھی چوپایوں کی طرح اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی، اس کو اپنی شادی بیاہ میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہ تھا۔ اس کے اولیاء جس کے

حوالے کر دیتے وہاں جانا پڑتا تھا۔عورت کو اپنے رشتہ داروں کی میراث میں کوئی حصہ نہ ملتا تھا بلکہ وہ خود گھریلو اشیاء کی طرح مال وراثت سمجھی جاتی تھی۔وہ مردوں کی ملکیت تصور کی جاتی تھی۔اس کی ملکیت کسی چیز پر نہ تھی۔اور جو چیزیں عورت کی ملکیت کہلاتی تھیں ان میں اس کو مرد کی اجازت کے بغیر کسی قسم کے تصرف کا کوئی اختیار نہ تھا ہاں اس کے شوہر کو ہر قسم کا اختیار تھا کہ اس کے مال کو جہاں چاہے اور جس طرح چاہے خرچ کر ڈالے اس کو پوچھنے کا بھی کوئی حق نہ تھا۔یہاں تک کہ یورپ کے وہ ممالک جو آجکل دنیا کے سب سے زیادہ متمدن ملک سمجھے جاتے ہیں ان میں بعض لوگ اس حد کو پہنچے ہوئے تھے کہ عورت کے انسان ہونے کو بھی تسلیم نہ کرتے تھے۔

عورت کے لئے دین و مذہب میں بھی کوئی حصہ نہ تھا نہ اس کی عبادت کے قابل سمجھا جاتا تھا نہ جنت کے،روما کی بعض مجلسوں میں باہمی مشورہ سے یہ طے کیا گیا تھا کہ وہ ایک ناپاک جانور ہے جس میں روح نہیں،عام طور پر باپ کے لئے لڑکی کا قتل بلکہ زندہ درگور کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا،بلکہ یہ عمل باپ کے لئے عزت کی نشانی اور شرافت کا معیار تصور کیا جاتا تھا۔بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ عورت کو کوئی بھی قتل کر دے تو نہ تو اس پر قصاص واجب ہے نہ خون بہا۔اور اگر شوہر مر جائے تو بیوی کو بھی اس کی لاش کے ساتھ جلا کر ستھی کر دیا جاتا تھا۔رسول کریم ﷺ کی ولادت کے بعد اور آپ کی نبوت سے پہلے ۵۸۶ء میں فرانس نے عورت پر یہ احسان کیا کہ بہت سے اختلافات کے بعد یہ قرارداد پاس کی کہ عورت ہے تو انسان مگر وہ صرف مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

الغرض پوری دنیا اور اس میں بسنے والے تمام اقوام و مذاہب نے عورت کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہوا تھا کہ جس کو سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔اس بیچاری مخلوق کے لئے نہ کہیں عقل و دانش سے کام لیا جاتا تھا نہ عدل و انصاف سے۔

قربان جائیے رحمۃ للعالمین ﷺ اور آپ کے لائے ہوئے دین حق کے،

جس نے دنیا کی آنکھیں کھولیں، انسان کو انسان کی قدر کرنا سکھلایا، عدل وانصاف کا قانون جاری کیا، عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم کئے جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں، اس کو آزاد و خود مختار بنایا، وہ اپنی جان و مال کی ایسی ہی مالک قرار دی گئی جیسے مرد، کوئی شخص خواہ باپ دادا ہی ہو بالغ عورت کو کسی شخص کے ساتھ نکاح پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اور اگر بغیر اس کی اجازت کے نکاح کر دیا جائے تو وہ اس کی اجازت پر موقوف رہتا ہے۔ اگر نا منظور کر دے تو باطل ہو جاتا ہے، اس کے اموال میں کسی مرد کو بغیر اس کی رضا و اجازت کے کسی تصرف کا کوئی حق نہیں، شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد وہ خود مختار ہے کوئی اس پر جبر نہیں کر سکتا۔ اپنے رشتہ داروں کی میراث میں اس کو بھی ایسا ہی حصہ ملتا ہے جیسا لڑکوں کو، اس پر خرچ کرنے اور اس کے راضی رکھنے کو شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے ایک عبادت قرار دیا۔ شوہر اس کے حقوق واجبہ ادا نہ کرے تو وہ اسلامی عدالت کے ذریعہ اس کو اداءِ حقوق پر ورنہ طلاق پر مجبور کر سکتی ہے۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں)

عورتوں کو مردوں کی سرپرستی اور نگرانی سے بالکل آزاد کر دینا بھی فسادِ عالم کا بہت بڑا سبب ہے

عورت کو اس کے حقوق مناسبہ نہ دینا ظلم و جور اور قساوت و شقاوت تھی جس کو اسلام نے مٹایا ہے۔ اسی طرح ان کو کھلے مہار چھوڑ دینا اور مردوں کی نگرانی و سیادت سے آزاد کر دینا اس کو اپنے گزارے اور معاش کا خود متکفل بنانا بھی اس کی حق تلفی اور بربادی ہے نہ اس کی ساخت اس کی متحمل ہے اور نہ گھریلو کاموں کی ذمہ داری اور اولاد کی تربیت کا عظیم الشان کام جو فطرتاً اس کے سپرد ہے وہ اس کا متحمل ہے۔

علاوہ ازیں مردوں کی سیادت و نگرانی سے نکل کر عورت پورے انسانی معاشرے کے لئے خطرہ عظیم ہے جس سے دنیا میں فساد و خوں ریزی اور طرح طرح

کے فتنے پیدا ہونا لازمی اور روزمرہ کا مشاہدہ ہے، اس لئے قرآن کریم نے عورتوں کے حقوق واجبہ کے بیان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ.

یعنی مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے۔

اور دوسرے لفظوں میں یہ کہ مردان کے نگراں اور ذمہ دار ہیں۔

مگر جس طرح اسلام سے پہلے جاہلیت اولیٰ میں اقوام عالم سب اس غلطی کا شکار تھیں کہ عورتوں کو ایک گھریلو سامان یا چوپایہ کی حیثیت میں رکھا ہوا تھا۔ اسی طرح اسلام کے زمانہ انحطاط میں جاہلیت اخری کا دور شروع ہوا۔ اس میں پہلی غلطی کا ردعمل اس کے بالمقابل دوسری غلطی کی صورت میں کیا جا رہا ہے۔ کہ عورتوں پر مردوں کی اتنی سیادت سے بھی چھٹکارا حاصل کرنے اور کرانے کی مسلسل کوشش جاری ہے جس کے نتیجے میں فحش و بے حیائی عام ہوگئی۔ دنیا جھگڑوں اور فساد کا گھر بن گئی۔ قتل وخون ریزی کی اتنی کثرت ہوگئی کہ جاہلیت اولیٰ کو مات دیدی۔

عرب کا مشہور مقولہ ہے:

اَلْجَاهِلُ اِمَّا مُفْرِطٌ اَوْ مُفَرِّطٌ.

یعنی جاہل آدمی کبھی اعتدال پر نہیں رہتا۔ اگر افراط یعنی حد سے زیادہ کرنے سے باز آجاتا ہے تو کوتاہی اور تقصیر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

یہی حال اس وقت ابنائے زمانہ کا ہے کہ یا تو عورت کو انسان کہنے اور سمجھنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے اور آگے بڑھے تو یہاں تک پہنچے کہ مردوں کی سیادت ونگرانی جو مردوں، عورتوں اور پوری دنیا کے لئے عین حکمت و مصلحت ہے اس کا جُوا بھی گردن سے اتارا جا رہا ہے جس کے نتائج بدروزانہ آنکھوں کے سامنے آرہے ہیں، اور یقین کیجئے کہ جب تک وہ قرآن کے اس ارشاد کے سامنے نہ جھکیں گے ایسے فتنے روز بڑھتے رہیں گے۔

آج کی حکومتیں دنیا میں قیام امن کے لئے روز نئے نئے قانون بناتی ہیں، اس کے لئے نئے نئے ادارے قائم کرتی ہیں، کروڑوں روپیہ ان پر صرف ہوتا ہے، لیکن فتنے جس چشمے سے پھوٹ رہے ہیں اس کی طرف دھیان نہیں دیتیں۔ اگر آج کوئی کمیشن اس تحقیق کے لئے بٹھایا جائے کہ فساد وخون ریزی اور باہمی جنگ وجدل کے اسباب کی تحقیق کرے تو خیال یہ ہے کہ پچاس فی صد سے زائد ایسے جرائم کا سبب عورت اور اس کی بے مہار آزادی نکلے گی۔ مگر آج کی دنیا میں نفس پرستی کے غلبہ نے بڑے بڑے حکماء کی آنکھوں کو خیرہ کیا ہوا ہے۔ خواہشات نفسانی کے خلاف کسی مصلحانہ قدغن کو گوارا نہیں کیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے قلوب کو نور ایمان سے منور فرمائیں اور اپنی کتاب اور اپنے رسول ﷺ کی ہدایات پر پوری طرح عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں کہ وہی دنیا و آخرت میں سرمایۂ سعادت ہے۔

اسلام میں عورتوں کی مردوں سے مساوات

اعتراض: (ماڈرن طبقہ کا اعتراض)

اسلام عورت کو مرد کے مساوی، حقوق نہیں دیتا؟

جواب: آجکل کے نوجوان کا یہ دعویٰ مساوات محض زبان سے ہی ہے عمل میں وہ بھی برابری نہیں کر سکتے۔ ایک متمدن قوم کو دیکھ لیا۔ کہ وہ عورتوں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ تو خود بھی اس کا اتباع کرنے لگے۔ مگر یہ نہ دیکھا کہ وہ لوگ کسی مذہب کے پابند نہیں ایسے لوگوں کی تقلید پابند مذہب قوم کیسے کر سکتی ہے۔ پھر ان کے اس طرز و انداز کے نتائج پر نظر نہ کی۔ کہ اس مساوات کا اثر ان کے حق میں مفید ہوگا یا مضر۔ غرض بالکل کورانہ تقلید کر کے عورتوں کی مساوات کے قائل ہونے لگے۔ جب خدا ہی نے عورت کو تشریعاً و تکویناً محکوم بنایا ہے تو اس کو برابر کون کر سکتا ہے۔ کیونکہ

خدا کا عورتوں کو محکوم بنانا۔ جیسا کہ آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے دلیل عقلی سے بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس بات پر سارا عالم متفق ہے کہ عورتیں مرد سے کم ہیں بہت سی باتوں میں اس کا کسی کو انکار نہیں۔ اور جس بات پر ساری دنیا کا اجماع ہو وہ عینی تقاضا اور فطری قانون ہوتا ہے۔ عقلی دلیل کے علاوہ حسی دلیل بھی اس بات پر قائم ہے کہ عورتیں مرد سے کم ہیں۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ خدا نے عورت و مرد کی خلقت میں کتنا فرق رکھا ہے مرد جسمانی قوت میں عورت سے زیادہ ہوتا ہے عقل مرد کی زیادہ ہوتی ہے۔ آواز مرد کی بلند ہوتی ہے مرد سے عورت سے رائے میں زیادہ پختہ ہوتا ہے۔ اور عورت کو دیکھا جائے تو اس کی ہر چیز مرد سے کم نظر آتی ہے۔ ظاہری اعضاء کی بناوٹ میں بھی اور عقل ورائے میں بھی۔ قرآن میں حق تعالیٰ کفار کی خرابی عقیدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ام اتخذ مما یخلق بنات واصفکم بالبنین"

کہ خدا تعالیٰ نے اپنے لئے مخلوقات میں سے لڑکیاں تجویز کی ہیں اور تم کو لڑکوں کے ساتھ منتخب کیا ہے۔

پھر فرماتے ہیں:

"اومن ینشؤ فی الحلیة وھو فی الخصام غیر مبین"

کہ خدا تعالیٰ کے لئے تجویز بھی کیں تو لڑکیاں جو ابتداء سے زیور اور گہنے میں پرورش پاتی ہیں۔

اور دوسرے یہ کہ قوت بیانیہ میں ضعیف ہیں یہ دو باتیں عورتوں میں نقص کی ایسی ہیں کہ آنکھوں سے دیکھ لو واقعی لڑکیوں میں ابتداء ہی سے زیور کا شوق ہوتا ہے۔ اور یہ دلیل ہے ان کی محدودیت نظر کی۔ چنانچہ خود مردوں ہی میں دیکھ لو جس کا زینت کا شوق ہوگا اس کے خیالات پست اور محدود ہوں گے اور جو سادہ ہوگا اس کے خیالات عالی ہوں گے اور اس کا راز یہ ہے کہ لباس وغیرہ ضرورت کی چیزیں ہیں، اصل مقصود

نہیں۔ اب سمجھ لیجئے کہ ضرورت کی چیزوں میں کتنا تعلق ہونا چاہئے سو ظاہر ہے کہ ہر عاقل ضرورت کی چیزوں سے بقدر ضرورت تعلق رکھے گا اور زیادہ کوشش اصل مقصود میں کرے گا۔ وہ شخص نہایت پست خیال ہے جو غیر مقصود چیزوں کی دھن میں لگا رہتا ہو۔ پس لڑکیوں کو زیور اور زینت سے رغبت ہونا ان کی پستی خیالات کی دلیل ہے۔ مرد اکثر سادہ ہوتے ہیں ہاں جن مردوں پر زنانہ پن غالب ہو یہاں ان کا ذکر نہیں۔ تعلیم یافتہ قوموں کو بھی دیکھ لیجئے تجربہ کار لوگوں کا بیان ہے کہ ان کی عورتیں باوجود تعلیم حاصل کر لینے کے پھر بھی مردوں سے بہت کم ہیں۔ ایک شخص کہتے تھے کہ اگر ان میں کسی عورت کو کچھ بیان کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو وہ چند جملے کہہ کر بیٹھ جاتی ہے مردوں کی طرح اس کی گفتگو میں کبھی وسعت نہیں ہوتی۔ تو یورپ کی عورتیں بھی لیاقت علمی میں مردوں کے برابر ہرگز نہیں یہ دوسری بات ہے کہ وہ دستکاری میں یا کسی خاص سلیقہ میں برابر یا زیادہ ہوں۔ غرض جس کو قدرت نے محکوم بنایا ہو۔ اس کو مساوی کون کر سکتا ہے۔ اور یہ محکومیت عورتوں کے لئے خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے اور یہ اس لئے کہا گیا تا کہ عورتیں اس تقریر کو سن کر نہ بگڑیں نعمت اس لئے ہے کہ اگر دنیا میں سب برابر درجے کے ہوتے تو انتظام قائم نہ رہ سکتا۔ تو یہ ضروری بات تھی کہ ایک گھٹا ہوا ہو۔ دوسرا بڑھا ہوا۔ اگر سارے حاکم ہی ہوتے تو کاشتکاری کون کرتا، عمارت کون بناتا، آٹا کون پیستا۔ غرض دنیا کا انتظام اس کو چاہتا ہے کہ سب ایک درجے کے نہ ہوں۔ بلکہ ایک بادشاہ ہو۔ ایک وزیر کوئی حاکم، کوئی رعیت، کوئی تاجر، کوئی مزدور۔ یہ فرق مراتب ضروری تھا۔ ہاں اس فرق مراتب کی یہ بھی ایک صورت تھی کہ عورتیں بڑھی ہوئی ہوتیں، وہ گھٹے ہوئے۔ مگر چونکہ ان کی عقل ورائے ضعیف ہے۔ اس لئے تمدن خراب ہو جاتا ہے۔ وہ خود اپنی بھی حفاظت نہیں کر سکتیں دوسروں پر حاکم بن کر ان کی نگہبانی تو کیا کرتیں۔ بیوقوف کے لئے یہی مصلحت ہے کہ کسی کے تابع ہو کر رہے۔ اگر کسی بیوقوف کو حاکم بنا دیا جائے تو دیکھو انجام کیا ہوگا۔ خود بھی ہلاک ہوگا دوسروں کو

بھی تباہ کریگا۔ اگر چھوٹے بچے کو ماں باپ کا تابع نہ کیا جائے تو وہ یقیناً ہلاک ہوگا۔ کیونکہ اس کو اپنے نفع اور ضرر کی کچھ خبر نہیں۔ تو بیوقوف کے لئے کسی کا ماتحت ہونا بھی مصلحت ہے تا کہ دوسرا اس کو روک ٹوک کر سکے۔ اور یہی راز ہے اس حدیث کا جو حضور ﷺ سے مروی ہے کہ "وہ قوم کبھی فلاح نہ پائے گی جس کی حاکم عورت ہو"۔ کسریٰ شاہ فارس کی بیٹی جب بادشاہ ہوئی تھی اس پر آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا تھا یہیں سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ آج کل ہماری خرابی و خستگی کا باعث ایک یہ امر بھی ہے کہ ہم نے عورتوں کو اپنے گھر کا حاکم بنا دیا ہے اگر چہ یہ چھوٹی سے حکومت ہے مگر اس کا نتیجہ بھی خراب ہی ہے مثلاً شادی بیاہ کی ساری رسمیں عورتوں ہی کی خواہش سے پوری کی جاتی ہیں جس کا انجام ظاہر ہے کہ کیا ہوتا ہے کس قدر خاندان ان رسوم شادی میں تباہ ہو گئے۔ یہ سارا فساد عورتوں کے حاکم بنانے کا ہے۔ عورتوں کی دلجوئی کرنا ضروری ہے مگر ان کے تابع بننا برا ہے۔ اس وقت سارا مال و اولاد عورتوں کے قبضہ میں ہم نے کر دیا ہے۔ پھر دیکھ لیجئے روپیہ کیسے بیجا مواضع میں صرف ہوتا ہے۔ اور بچوں کی صحت خراب اور اخلاق تباہ ہو رہے ہیں۔ عورتیں بچوں کو جو چاہیں کھلا پلا دیتی ہیں۔ جس سے ان کی زندگی بیماری میں کٹتی ہے۔ محبت و پیار حد سے زیادتی کرتی ہیں جس سے لڑکے شوخ ہو جاتے ہیں۔ تو اپنے مال و اولاد کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہئے۔ عورتوں کو حاکم کر دینا سخت باعث تنزل ہے جس کو جناب سرور کائنات ﷺ پہلے سے فرما گئے ہیں۔ اس حدیث پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ بعض متمدن قوموں میں عورتیں حاکم ہوتی ہیں اور بعض اب بھی ہیں اور پھر ان کو ترقی ہے۔ اول تو مال و مادیات کی ترقی فلاح نہیں۔ فلاح قومی کی اصل ترقی اخلاقی و علمی و روحانی ہے تو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ جن قوموں میں عورت بادشاہ ہے ان کو یہ ترقی نصیب ہوئی۔ دوسرے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان کی ترقی حقیقی ترقی ہے تو ہم کہیں گے کہ یہ اس کا اثر ہے کہ ان میں عورتیں خود مختار حاکم نہیں محض ضابطہ کی حاکم ہیں۔ اصل بادشاہ پارلیمنٹ ہے تو ایسی

حکومت کوئی حکومت نہیں۔ نام کی بادشاہت ہے اس سے مضمون حدیث پر کوئی غبار نہیں آسکتا میں نے اس حدیث کو اس وقت اسی لئے پڑھ دیا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ اس وقت جو ہم نے گھر باہر کا حاکم عورتوں کو بنا رکھا ہے۔ اس کو بھی ہماری پستی اور تنزل میں دخل ہے۔ اور آج کل ہم پر یہ ایسی تباہی آرہی ہے کہ بجائے متبوع بننے کے عورتوں کے بالکل تابع ہو گئے۔ اور غضب یہ ہے کہ عذر کے موقع میں کہا جاتا ہے کہ صاحب کیا کریں عورتیں نہیں مانتیں۔ سو یہ کہنا کتنی کم ہمتی کی بات ہے۔ اگر چہ یہ بھی ایک بہانہ ہے جس بات کو ان کا خود جی چاہتا ہے۔ اس میں عورتوں کے کہنے سے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ورنہ جس بات کو ان کا جی نہ چاہے مثلاً بعض لوگ اپنی عورتوں کو باپ کے گھر نہیں جانے دیتے اس میں عورتیں لاکھ تقاضا کریں کبھی نہیں مانتے۔ پس اول تو یہ عذر بالکل غلط ہے اور اگر سچ ہے تو اور بھی برا ہے۔ کہ مرد ہو کر بیوی کے غلام بن گئے۔ غرض عورت کے لئے یہی مصلحت ہے کہ مرد کے تابع ہو کر رہے۔ اور شریعت نے بھی عورتوں کو محکوم ہی بنایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ الرجال قوامون علی النساء. (شعب الایمان ص ۱۰۴)

بائبل میں بھی مرد اور عورت کے حقوق برابر نہیں ہیں

عیسائیوں کی بائبل کی کتابوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے حقوق مردوں کے برابر نہیں ہیں مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے۔

چنانچہ ملاحظہ ہو:۔

(۱) پھر اس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔" (پیدائش ۳:۱۶)

(۲) اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت سکھائے یا مرد پر حکم چلائے

بلکہ چپ چاپ رہے۔" (ا-تیمتھیس ۲:۱۲)

(۳) پس فرشتوں کے سبب سے عورت کو چاہئے کہ اپنے سر پر محکوم ہونے کی علامت رکھے۔ (ا-کرنتھیون ۱۱:۱۰)

(۴) جب تک عورت کا شوہر جیتا ہے وہ اس کی پابند ہے۔"

(ا-کرنتھیون ۷:۳۹)

مرد کو چار عورتوں سے نکاح کی اجازت

اعتراض: (کفار کا اعتراض)

شریعت محمدؐیہ نے کیوں عیسائیوں کے راہبوں اور ہندوؤں کے جوگی اور گشائیوں کی طرح ملنگ پنا تعلیم نہ کیا اور کیوں ایک ہی عورت پر قناعت کرنے کا حکم نہ دیا برخلاف اس کے مسلمانوں کو چار تک کی اجازت اور خود پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے چار سے زیادہ نو تک بیویاں ایک وقت میں رکھیں۔ آج کل رفارمروں اور عیسائی اور ملحد منش لوگوں کا اسلام پر ایک یہ بھی اعتراض ہے اور اس پر ملمع کار تقریروں سے بڑا زور دیتے ہیں بالخصوص پادری بہت غل مچاتے ہیں۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے:

(۱) یہ بات ہر عقلمند پر ظاہر ہے کہ انسان جب تک کہ اس جامۂ انسانی میں خواہ کوئی کیوں نہ ہو ولی ہو نبی ہو اس کو تمام انسانی حاجتیں پیش آتی ہیں، بھوک پیاس بھی لگتی ہے اس کے بعد نیند بھی آتی ہے، پاخانہ پیشاب بھی آتا ہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا اسی طرح اگر اس کے کسی عضو میں فتور نہیں تو منی بھی پیدا ہو کر اپنا نکلنا چاہتی ہے اس لیے خواہ مخواہ عورت کی رغبت ہوتی ہے یہ طبعی بات ہے صرف اتنا فرق ہے کہ اچھے لوگ اس کو اس کے محل پر صرف کرتے ہیں برے لوگ بے محل کام میں لاتے ہیں۔

اگر ملنگ پنا سکھایا جاتا تو علاوہ قطع نسل انسانی کے ہزاروں مصیبتیں پیش آتیں، حرام کاری کا پل ٹوٹ جاتا دیکھئے باوجود تقدس کے جب جرجیس نے وہ تالاب صاف کرایا کہ جو اُس کلیسیا سے متعلق تھا جس میں مجرد مرد و عورت رہتے تھے تو سینکڑوں کھوپڑیں حرامی بچوں کی نکلیں اور جو اِدھر اُدھر پھینک دیئے گئے تھے یا حمل گرائے گئے تھے ان کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ علاوہ اس کے بردباری وغیرہ اخلاق کی دوستی عیالداری کی بدولت نصیب ہوتی ہے اور ایک عورت پر عموماً سب کو پابند کرنا بھی بعض لوگوں کی عفت میں فرق لاتا ہے کیونکہ تجربہ سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ مرد کو عورت سے کہیں زیادہ قوت ہے اور نیز عورت تیس چالیس برس کی عمر میں دس پانچ بچے جَن کر بُڑھیا ہو جاتی ہے اور مرد کیلئے یہ عین جوش قوت کا وقت ہے پھر اس بُڑھیا پر بس کرنا یا تو اشارۃً اور مزہ اڑانے کا حکم دینا ہے یا سہل شریعت کو دشوار کر دینا ہے کہ جس کی اصطلاح کیلئے پھر کسی نبی کی حاجت پڑتی اور یہ بھی ہے کہ عورت ایام حیض ونفاس اور حمل بلکہ رضاعت کے وقت مرد قوی کو بس نہیں کرتی بالخصوص ان گرم ملکوں کے لوگوں کیلئے جن کو ایک روز بھی بغیر جماع کے چین نہیں پڑتا (مرطوب اور بلغمی لوگوں کا ذکر نہیں) پھر ان کیلئے حرام کاری کی اس قدر ممانعت کر کے (کسی کو بدنظر سے بھی نہ دیکھو کسی غیر محرم کے ہاتھ بھی نہ لگاؤ اُس سے تخلیہ میں بات بھی نہ کرو اگر کرو گے علاوہ عذاب آخرت کے دنیا میں بھی سزا پاؤ گے) ایک عورت کا پابند کرنا حکمت الٰہیہ کی مصلحت کے برخلاف ہے اس لیے شریعت نے چار تک کی اجازت دی ہے نہ یہ کہ سب کیلئے حکم دیا ہے اور اجازت میں بھی عدل شرط ہے البتہ جس قوم میں بغیر نکاح کے بھی حاجت براری ہو سکے بلکہ خوب طرح سے، ان کے

نزدیک چار کیا ایک بھی جنجال اور جان کیلئے وبال ہے۔
رہا آنحضرت ﷺ کا متعدد نکاح کرنا اور آپ کا اس حکم سے مستثنیٰ ہونا سو یہ مصالح کیلئے تھا۔ اول یہ کہ عدالت آپ کا شیوہ ذاتی تھا، معصوم تھے، دوم یہ کہ متعدد بیوئیں رکھ کر صفت توکل اور استقلال کی تعلیم دینا منظور تھا اور جلوت میں متعدد عورتوں کی معرفت عورتوں کے متعلق خلوت اور جلوت میں بے شمار مسائل شریعت کا تعلیم کرنا منظور تھا اور حضرت داؤد و حضرت موسیٰ و حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی اس لیے متعدد بیوئیں کیں ہیں جیسا کہ بائبل سے ثابت ہوتا ہے اور اب تک یہودی شریعت میں کئی بیویاں کرنا جائز ہیں۔ (تفسیر حقانی ۱۲۶/۲)

اگر متعدد بیویوں میں مساوات اور عدل پر قدرت نہ ہو تو صرف ایک بیوی پر اکتفاء کیا جائے

اللہ تعالیٰ نے چار بیویوں تک کی اجازت دے کر فرمایا:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ.

یعنی اگر تم کو اس کا خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی پر بس کرو۔ یا کنیز شرعی اصول کے مطابق تمہاری مِلک ہو اس سے گذارہ کر لو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا اسی صورت میں جائز اور مناسب ہے جبکہ شریعت کے مطابق سب بیویوں میں برابری کر سکے اور سب کے حقوق کا لحاظ رکھ سکے۔ اگر اس پر قدرت نہ ہو تو ایک ہی بیوی رکھی جائے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ ظلم عام تھا کہ ایک ایک شخص کئی کئی بیویاں رکھ لیتا تھا۔ اور بیویوں کے حقوق میں مساوات اور عدل کا مطلق خیال نہ تھا جس کی طرف زیادہ میلان ہو گیا اس کو ہر حیثیت سے نوازنے اور خوش رکھنے کی فکر میں لگ گئے اور دوسری بیویوں کے

حقوق نظر انداز کر ڈالتے، قرآن کریم نے صاف صاف فرمایا کہ اگر عدل نہ کرسکو تو ایک ہی بیوی رکھو، یا کنیز سے گذارہ کرلو۔

حاصل یہ ہے کہ اگرچہ قرآن کریم نے چار عورتیں تک نکاح میں رکھنے کی اجازت دیدی۔ اور اس حد کے اندر جو نکاح کئے جائیں گے وہ صحیح اور جائز ہوں گے۔ لیکن متعدد بیویاں ہونے کی صورت میں ان میں عدل و مساوات قائم رکھنا واجب ہے۔ اور اس کے خلاف کرنا گناہ عظیم ہے۔ اس لئے جب ایک سے زائد نکاح کا ارادہ کرو تو پہلے اپنے حالات کا جائزہ لو کہ سب کے حقوق عدل و مساوات کے ساتھ پورا کرنے کی قدرت بھی ہے یا نہیں۔ اگر یہ احتمال غالب ہو کہ عدل و مساوات قائم نہ رکھ سکو گے تو ایک سے زائد نکاح پر اقدام کرنا اپنے آپ کو ایک عظیم گناہ میں مبتلا کرنے پر اقدام کرنا ہے اس سے باز رہنا چاہئے اور اس حالت میں صرف ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرنا چاہئے۔

رسول کریم ﷺ نے سب بیویوں کے درمیان پوری مساوات وعدل کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ اور اس کے خلاف کرنے پر سخت وعیدیں سنائیں ہیں اور خود اپنے عمل کے ذریعے بھی اس کو واضح فرمایا ہے بلکہ رسول کریم ﷺ تو ان معاملات میں بھی مساوات فرماتے تھے جن میں مساوات لازم نہیں۔

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

جس شخص کے نکاح میں دو عورتیں ہوں اور وہ ان کے حقوق میں برابری اور انصاف نہ کرسکے تو وہ قیامت میں اس طرح اٹھایا جائے گا کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا ہوگا۔ (مشکوٰۃ ص ۲۷۸)

البتہ یہ مساوات ان امور میں ضروری ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں، مثلاً نفقہ میں برابری، رات گزارنے میں برابری۔ رہا وہ امر جو انسان کے اختیار میں نہیں۔ مثلاً دل کا میلان کسی کی طرف زیادہ ہو جائے۔ تو اس غیر اختیاری معاملہ

میں اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ بشرطیکہ اس میلان کا اثر اختیاری معاملات پر نہ پڑے۔ رسول کریم ﷺ نے خود بھی اختیاری معاملات میں پوری مساوات قائم فرمانے کے ساتھ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا:

اَللّٰهُمَّ هٰذَا قسمي فِيمَا اَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِيْ فِيمَا تَمْلِكُ وَلَا اَمْلِكُ. (ابوداود ۲۱۳۴)

”یا اللہ یہ میری برابر والی تقسیم ہے، ان چیزوں میں جو میرے اختیار میں ہیں، اب وہ چیز جو آپ کے قبضہ میں ہے اور میرے اختیار میں نہیں ہے اس پر مجھ سے مواخذہ نہ کرنا۔“

ظاہر ہے کہ جس کام پر ایک رسول معصوم بھی قادر نہیں، اس پر کوئی دوسرا کیسے قادر ہوسکتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم کی دوسری آیت میں اس غیر اختیاری معاملہ کا ذکر اس طرح فرمایا:

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ.

”عورتوں کے درمیان تم پوری برابری ہرگز نہ کرسکو گے۔

جس میں بتلا دیا کہ میلان قلب اور محبت ایک غیر اختیاری معاملہ ہے۔ اس میں برابری کرنا انسان کے بس میں نہیں۔ لیکن آگے اس غیر اختیاری معاملہ کی اصلاح کے لئے بھی ارشاد فرمایا: فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ. یعنی اگر کسی ایک بیوی سے زیادہ محبت ہو تو اس میں تو تم معذور ہو۔ لیکن دوسری بیوی سے کلی بے اعتنائی اور بے توجہی اس حالت میں بھی جائز نہیں۔ اس آیت کے جملے فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً میں جس عدل و مساوات کا بیان ہے یہ وہی امور اختیاریہ کا عدل ہے کہ اس میں بے اعتدالی گناہ عظیم ہے۔ اور جس شخص کو اس گناہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اس کو یہ ہدایت کی گئی کہ ایک سے زائد نکاح نہ کرے۔

1

اسلام نے تعدد ازواج پر ضروری پابندی لگائی اور عدل و مساوات کا قانون جاری کیا

قرآن نے عام معاشرہ کے اس ظلم عظیم کو روکا، تعدد ازواج پر پابندی لگائی۔ اور چار سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا۔ اور جو عورتیں ایک ہی وقت میں نکاح کے اندر ہیں ان میں مساواتِ حقوق کا نہایت مؤکد حکم اور اس کی خلاف ورزی پر وعید شدید سنائی۔

آیت مذکورہ میں ارشاد ہوا:

فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ.

یعنی جو حلال عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کر سکتے ہو۔ دو دو، تین تین، چار چار۔

آیت میں مَا طَابَ کا لفظ آیا ہے حسن بصریؒ، ابن جبیرؒ اور ابن ملکؒ نے مَاطَابَ کی تفسیر مَا حَلَّ سے فرمائی ہے یعنی جو عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں۔

اور بعض حضرات نے مَا طَابَ کے لفظی معنی کے اعتبار سے ''پسندیدہ'' کا ترجمہ کیا ہے۔ مگر ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ یہ مراد ہو سکتی ہے کہ جو عورتیں طبعی طور پر تمہیں پسند ہوں اور تمہارے لئے شرعاً حلال بھی ہوں۔

اس آیت میں ایک طرف تو اس کی اجازت دی گئی کہ ایک سے زائد دو، تین، چار عورتیں نکاح میں جمع کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف چار کے عدد تک پہنچا کر یہ پابندی بھی عائد کر دی کہ چار سے زائد عورتیں بیک وقت نکاح میں جمع نہیں کی جا سکتیں۔

رسول کریم ﷺ کے بیان نے اس قرآنی تخصیص اور پابندی کو اور زیادہ واضح کر دیا۔ اس آیت کے نزول کے بعد ایک شخص غیلان بن اسلمہ ثقفیؓ مسلمان ہوئے۔

اس وقت ان کے نکاح میں دس عورتیں تھیں۔ اور وہ بھی مسلمان ہوگئیں تھیں۔ رسول کریم ﷺ نے حکم قرآنی کے مطابق ان کو حکم دیا کہ ان دس میں سے چار کو منتخب کرلیں۔ باقی کو طلاق دے کر آزاد کردیں۔ غیلان بن اسلمہ ثقفی نے حکم کے مطابق چار عورتیں رکھ کر باقی سے علیحدگی اختیار کرلی۔

(مشکوٰۃ شریف ص ۲۷۴، بحوالہ ترمذی وابن ماجہ)

مسند احمد میں اسی روایت کے تکملہ میں ایک اور واقعہ بھی مذکور ہے۔ اس کا ذکر کرنا بھی فائدہ سے خالی نہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق بھی نسوانی حقوق سے ہے وہ یہ کہ

غیلان بن اسلمہ نے حکم شرعی کے مطابق چار عورتیں رکھ لی تھیں۔ مگر فاروق اعظمؓ کے زمانہ خلافت میں انہوں نے ان کو بھی طلاق دیدی۔ اور اپنا کل مال وسامان اپنے بیٹوں میں تقسیم کردیا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ملی۔ تو ان کو حاضر کرکے فرمایا کہ تم نے ان عورتوں کو اپنی میراث سے محروم کرنے کے لئے یہ حرکت کی ہے جو سراسر ظلم ہے۔ اس لئے فوراً ان کی طلاق سے رجوع کرو اور اپنا مال بیٹوں سے واپس لو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھو کہ تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔

قیس بن الحارث اسدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جب مسلمان ہوا تو میرے نکاح میں آٹھ عورتیں تھیں۔ میں نے رسول کریم ﷺ سے ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ ان میں سے چار رکھ لو باقی کو طلاق دیدو۔ (ابوداؤد ص ۳۰۴)

اور مسند امام شافعیؒ میں نوفل بن معاویہؓ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ جب مسلمان ہوئے تو ان کے نکاح میں پانچ عورتیں تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو بھی ایک عورت کو طلاق کا حکم دیا یہ واقعہ مشکوٰۃ شریف ص ۲۷۴ میں بھی شرح السنۃ سے نقل کیا ہے رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے اس تعامل سے آیت قرآنی کی مراد بالکل واضح ہوگئی کہ چار سے زائد عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔

پردہ پر اعتراض

اعتراض: (ماڈرن طبقہ کا اعتراض)

پردہ عورتوں کی آزادی چھیننے اور حبس بے جا کے مترادف ہے مردوں کی طرح عورتوں کو آزادی سے باہر پھرنا چاہئے اسلام کی یہ سختی روا نہیں ہے۔

جواب: مستورات اور مردوں کیلئے اسلامی پردہ کے وجوہ۔

پردہ کے متعلق اسلام نے مرد عورت کے لئے اصول بتائے ہیں۔ جن کی پابندی سے ان کی عفت وعزت پر حرف نہ آئے اور وہ بدی کے ارتکاب سے محفوظ رہیں۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قل للمؤمنين يغضوا من ابصارهم و يحفظوا فروجهم ذلك ازكىٰ لهم ان الله خبير بما يصنعون. و قل للمؤمنات يغضضن من ابصارهن ويحفظن فروجهن ولا يبدين زينتهن الا ما ظهر منها و ليضربن بخمرهن على جيوبهن الى قوله تعالىٰ ولا يضربن بار جلهن ليعلم ما يخفين من زينتهن وتوبوا الى الله جميعاً ايه المومنون لعلكم تفلحون. ولا تقربوا الزنا انه كان فاحشة وساء سبيلاء وليستعفف الذين لا يجدون نكاحاً.

ورهبانيه ابتدعوها ما كتبنها عليهم الىٰ قوله تعالىٰ رعوها حق رعايتها.

ترجمہ: یعنی ایماندار مردوں کو کہہ دے کہ آنکھوں کو نامحرم عورتوں کے دیکھنے سے بچائے رکھیں (یعنی ایسی عورتوں کو کھلے طور نہ دیکھیں جو شہوت

کا محل ہوسکتی ہوں اور ایسے موقع پر نگاہ کو پست رکھیں) اور اپنی ستر کی جگہ کو جس طرح ممکن ہو بچائیں۔ (ایسا ہی کانوں کو نامحرموں سے بچائیں یعنی بیگانے کے گانے بجانے اور خوش الحانی کی آوازیں نہ سنیں ان کے حسن کے قصے نہ سنیں جیسا دوسرے ارشادات میں ہے) یہ طریق نظر اور دل کے پاک رہنے کے لئے عمدہ طریق ہے۔ ایسا ہی ایماندار عورتوں کو کہہ دے کہ وہ بھی اپنی آنکھوں کو نامحرم مردوں کے دیکھنے سے بچائیں (نیز ان کی پرشہوات آوازیں نہ سنیں جیسا دوسری نصوص میں ہے) اپنے ستر کی جگہ کو پردہ میں رکھیں اور اپنے زینت کے اعضاء کو کسی غیر محرم پر نہ کھولیں اور اپنی اوڑھنی کو اس طرح سر پر لیں کہ گریبان سے ہو کر سر پر آ جائے یعنی گریباں اور دونوں کان اور سر اور کنپٹیاں سب چادر کے پردہ میں رہیں اور اپنے پیروں کو زمین پر (ناچنے والیوں کی طرح) نہ ماریں (یہ وہ تدبیر ہے کہ جس کی پابندی ٹھوکر سے بچا سکتی ہے) اور (دوسرا طریق بچنے کے لئے یہ ہے کہ) خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرو (اور اس سے دعا کرو تا کہ ٹھوکر سے بچائے اور لغزشوں سے نجات دے) زنا کے قریب مت جاؤ (یعنی ایسی تقریبوں سے دور رہو جن سے یہ خیال بھی دل میں پیدا ہو سکتا ہے اور ان راہوں کو اختیار نہ کرو جن سے اس گناہ کے وقوع کا اندیشہ ہو زنا کرنا نہایت درجہ کی بے حیائی ہے) زنا کی راہ بہت بری ہے (یعنی منزل مقصود سے روکتی ہے اور تمہاری اخروی منزل کے لئے سخت خطرناک ہے) اور جس کو نکاح میسر نہ آئے چاہیے کہ وہ اپنے تئیں دوسرے طریقوں سے بچائے (مثلاً روزہ رکھے یا کم کھائے یا اپنی طاقتوں سے تن آزاد کام لے اور ان لوگوں نے یہ طریق بھی نکالے تھے کہ وہ ہمیشہ عمدہ نکاح وغیرہ سے درست بردار رہے یا خوجے (مخنث) بن گئے

یا اور کسی طریق سے) انہوں نے رہبانیت اختیار کی مگر ہم نے ان پر یہ حکم فرض نہیں کیا اور پھر وہ ان بدعتوں کو بھی پورے طور پر نباہ نہ سکے۔

خدا تعالیٰ کے قوم کے عموم میں یہ مضمون کہ ہمارا یہ حکم نہیں کہ لوگ خوجے بنیں یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اگر خدا کا حکم ہوتا اور سب لوگوں اس پر عمل کرتے تو اس صورت میں بنی آدم کی قطع نسل ہو کر کبھی کا دنیا کا خاتمہ ہو چکتا اور نیز اگر اس طرح پر عفت حاصل کرنا ہو کہ عضو مردمی کو کاٹ دیا جائے یہ درپردہ اس بنانے والے خدا پر اعتراض ہے جس نے وہ عضو بنایا اور نیز ثواب کا تمام مدار تو اس بات پر ہے کہ قوت موجود ہو اور پھر انسان خدا تعالیٰ کا خوف کر کے ممانعت کی جگہ اس قوت کے جذبات کا مقابلہ کر کے اور اجازت کی جگہ اس کے منافع سے فائدہ اٹھا کر دو طور کا ثواب حاصل کرے اور جس میں بچہ کی طرح وہ قوت ہی نہیں رہی اس کو ثواب کیا ملے گا کیا بچہ کو عفت کا ثواب مل سکتا ہے ان آیات میں مع دیگر نصوص کے خدا تعالیٰ نے خلق احصان یعنی عفت حاصل کرنے کے لئے صرف اعلیٰ تعلیم ہی نہیں فرمائی بلکہ انسان کو پاک دامن رہنے کے لئے کافی علاج بھی بتلا دیئے یعنی یہ کہ اپنی آنکھوں کو نامحرم پر نظر ڈالنے سے بچانا کانوں کو نامحرموں کی آواز سننے سے بچانا نامحرموں کے قصے نہ سننا اور ایسی تمام تقریبوں سے جن میں کہ اس فعل بد کا اندیشہ ہو اپنے تئیں بچانا اور اگر نکاح نہ ہو سکے تو روزہ رکھنا وغیرہ۔

یہ اعلیٰ تعلیم ان سب تدبیروں کے ساتھ جو قرآن شریف نے بیان فرمائی ہے صرف اسلام ہی سے خاص ہے اور اس جگہ ایک نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ انسان کی وہ طبعی حالت جو شہوت کا منبع ہے۔ (جس سے انسان بغیر کسی کامل تغیر کے الگ نہیں ہو سکتا) ایسی ہے کہ اس کے جذبات محل اور موقع پا کر جوش

مارنے سے رہ نہیں سکتے یا اگر باز بھی رہ سکے تاہم سخت خطرہ میں پڑ جاتے ہیں اس لئے خدا تعالیٰ نے ہمیں یہ تعلیم نہیں دی کہ ہم نامحرم عورتوں کو بلاتکلف دیکھ تو لیا کریں اور ان کی تمام زینتوں پر نظر بھی ڈال لیں اور ان کے تمام ناز انداز ناچنا وغیرہ بھی مشاہدہ کر لیں لیکن پاک نظر سے دیکھیں اور نہ ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ ہم ان بیگانہ عورتوں کا گانا بجانا سن لیں اور ان کے حسن کے قصے بھی سنا کریں۔ لیکن پاک خیال سے۔ نہیں بلکہ ہمیں تاکید ہے کہ ہم نامحرم عورتوں کو اور ان کی زینت کی جگہ کو ہرگز نہ دیکھیں نہ پاک نظر سے اور نہ ناپاک نظر سے۔ اور ان کی خوش الحانی کی آوازیں اور ان کے حسن کے قصے نہ سنیں نہ پاک خیال سے اور نہ ناپاک خیال سے۔ بلکہ ہمیں چاہئے کہ ان کے سننے اور دیکھنے ہی سے ایسی نفرت رکھیں جیسا کہ مردار سے تا کہ ٹھوکر نہ کھائیں کیونکہ لازمی ہے کہ بے قیدگی کی نظروں سے کسی وقت ٹھوکریں پیش آئیں۔ سو چونکہ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہماری آنکھیں اور دل اور ہمارے خطرات سب پاک رہیں۔ اس لئے اس نے یہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم فرمائی۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ بے قیدگی ضرور گناہ کا موجب ہو جاتی ہے اگر ہم بھوکے کتے کے آگے نرم نرم روٹیاں رکھ دیں اور پھر امید رکھیں کہ اس کتے کے دل میں خیال تک ان روٹیوں کا نہ آئے تو ہم اپنے اس خیال میں غلطی پر ہیں۔ پس خدا نے چاہا نفسانی قوتوں کو پوشیدہ کاروائیوں کا موقع بھی نہ ملے اور ایسی کوئی تقریب پیش نہ آئے جس سے یہ خطرات جنبش کر سکیں۔

اور ہر ایک پرہیزگار جو اپنے دل کو پاک رکھنا چاہتا ہے اس کو نہیں چاہئے کہ حیوانوں کی طرح جس طرف چاہے بے محابا نظر اٹھا کر دیکھ لیا کرے بلکہ اس کے لئے اس تمدنی زندگی میں نیچی نگاہ کی عادت ڈالنا ضروری ہے اور یہ مبارک عادت ہے جس سے اس کی یہ طبعی حالت ایک بھاری خلق کے رنگ میں آ جائے گی اور اس کی تمدنی ضرورت میں فرق نہیں پڑے گا یہی وہ خلق ہے جس کو احصان اور عفت کہتے ہیں۔

کیا رمضان کی راتوں میں بیوی کے پاس جانا شہوت پرستوں کی رعایت کی خاطر جائز ہوا ہے

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

سورت بقرہ میں آیت **"احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم"** میں شان نزول کے اعتبار سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے شہوت پرستوں کی خواہش کے مطابق ایک حرام چیز کو ان پر حلال کر دیا۔

جواب: اس سے زیادہ بے ہودہ کیا بات ہو سکتی ہے وہ حکم جو فرمانبرداروں پر شاق ہو اور اس پر عمل کرنے سے تکلیف محسوس ہوتی ہو تو خدا کی رحمت کا تقاضا اس میں یہ ہے کہ بقدر وسعت مکلّف کو معاف کیا جائے اور حرمت کا حکم ہٹا دیا جائے اپنی بیویوں سے جماع کی حرمت رمضان شریف کی راتوں میں خاص اللہ تعالیٰ کا حق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بنظر رحمت اپنے حق میں ان کے لئے تصرف فرمایا اور اپنے بندوں پر وسعت پیدا فرمائی اور یہ وسعت اور تصرف ہرگز عقل کے خلاف نہیں۔

باوجود عقلی قبح کے اور کام کے حرام ہونے کے ہندو مذہب میں شہوت پرستوں کی خاطر حرام کو حلال گردانا گیا چنانچہ سری بید بیاس جو ایک عورت کے ساتھ پانچ پانڈووں کو جائز شوہر قرار دیا گیا باوجود اس کے کہ یہ بات عقلاً قبیح ہے کہ ایک عورت کے لئے ایک وقت میں پانچ شوہر ہوں ہم نے اس سے زیادہ عقل کے نزدیک گندی بات نہیں سنی حالانکہ ایک عورت کا پانچ شوہروں کے لئے بستر بننا بید شاستر کے حکم کے مطابق تا حال باقی ہے پس ان پانچ پانڈووں کی خاطر میں اس حرام حکم کو حلال قرار دینا ایسا قبیح عمل ہے جس میں کسی بھی عاقل کو تردد اور تامل نہیں ہے۔

(سوط اللہ الجبار ج ا صفحہ ۲۹)

کیا لونڈیوں سے جماع زنا ہے

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

سورت مائدہ میں ہے:

"والمحصنت من النساء إلا ما ملکت ایمانکم"

(اور وہ عورتیں بھی حرام کی گئی ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں، سوائے ان عورتوں (لونڈیوں) کے جو تمہاری مِلک میں آجائیں)۔

جو کوئی صریح زنا کا حکم کرے اس کو قدوس نہیں کہہ سکتے۔

جواب: معترض صاحب نے انتہائی جہالت کے جوش میں آکر قرآن شریف کے الفاظ پر نظر نہیں کی۔ قرآن پاک میں ہے "**ما ملکت ایمانکم**" یعنی وہ عورت جس کے تم مالک ہو جاؤ اور ظاہر ہے کہ مسلمان جب کافروں کی عورتوں کے مالک ہو جاتے ہیں اور وہ عورتیں کافروں کے نکاح سے نکل جاتی ہیں تو شریعت کا حکم ان کے لئے واضح ہوتا ہے کہ اب وہ عورتیں ان مسلمانوں کے لئے بیویوں کے درجے میں ہیں چنانچہ ایسے حکم کو زنا سے تعبیر کرنا عین حماقت ہے۔ زنا یہ ہے کہ کسی اجنبی عورت سے جو نہ اس کے حقیقی مِلک میں ہو اور نہ حکمی ملک میں ہو اس کے ساتھ جماع کیا جائے اور شریعت اسلام میں یہ صورت نہیں ہے۔

اگر غور کیا جائے تو بید اور شاستر میں نیوگ کا عمل بڑی وضاحت کے ساتھ موجود ہے کہ ایک عورت کسی مرد کے نکاح میں ہوتی ہے اس کے باوجود دوسرے آدمی کے ساتھ اولاد کے حصول کے لئے اجماع کرا سکتی ہے۔

اس سے بھی بری بات بشن بھگوان کا حکم ہے کہ اپنی بیٹی اور دیگر محرم عورتوں کے ساتھ جماع کی اجازت ہے۔ پس معترض صاحب نے بشن بھگوان پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور حیا کی آنکھ بند کر لی۔ (سوط اللہ الجبار ج ا ص ۲۹۔۳۰)

پردہ کا عقلی ثبوت

آج کل بعض ناعاقبت اندیش پردہ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں قسم سے کہتا ہوں کہ پردہ کے توڑنے میں قطع نظر خلاف شرع اور گناہ ہونے کے اتنی خرابیاں ہیں کہ آج جو عقلاً پردہ کی مخالفت کرتے اور پردہ اٹھا دینے کی کوشش کرتے ہیں ان خرابیوں کو دیکھ کر بعد میں خود ہی یہ تجویز کریں گے کہ پردہ ضرور ہونا چاہیے مگر اس وقت بات قابو سے نکل چکی ہوگی۔ اب تو بنی بنائی بات ہے اس کو نہیں بگاڑنا چاہتے ہیں پھر پچھتائیں گے اور کچھ بھی نہ ہو سکے گا آج کل ایسا مزاج بگڑ گیا ہے کہ کوئی پردہ کو خلاف فطرت کہتا ہے۔ کوئی قید اور حبس بے جا کہتا ہے کہ

ایک مسلمان انجینئر تھے ان سے ایک پادری انجینئر نے کہا کہ مسلمانوں کا مذہب بہت اچھا ہے اس میں سب خوبیاں ہیں کہ عورتوں کو قید میں رکھا جاتا ہے۔ مسلمان انجینئر نے کہا ہم نے تو کسی مسلمان عورت کو قید میں نہیں دیکھا۔ کیا وہی قید جس کا نام تم نے پردہ رکھا ہے۔ تو اس مسلمان انجینئر صاحب نے پادری سے کہا کہ پہلے آپ بتلایئے کہ قید کس کو کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قید حبس خلاف طبع کو کہتے ہیں۔ اور جو حبس خلاف طبع نہ ہو اس کو قید ہرگز نہ کہیں گے ورنہ پاخانہ میں جو آدمی پردہ کر کے بیٹھتا ہے اس کو بھی قید کہنا چاہیے کیونکہ پاخانہ میں آدمی تمام آدمیوں کی نگاہوں سے چھپ جاتا ہے مگر اس کو کوئی قید نہیں کہتا۔ کہ آج ہم بھی اتنی دیر قید میں رہے۔ ورنہ فرض کرو اگر اس پاخانہ میں کسی کو بلاضرورت بند کر دیا جائے کہ باہر سے زنجیر لگائیں اور ایک پہریدار کھڑا کر دیا جائے اور اس سے کہہ دیا جائے کہ خبردار یہ آدمی یہاں سے نکلنے نہ پائے تو اس صورت میں بے شک یہ حبس خلاف طبع ہوگا۔ اور اس کو ضرور قید کہیں گے اور اس صورت میں بند کرنے والے پر حبس بیجا کا مقدمہ قائم ہو سکتا ہے۔ بتلایئے ان دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلی صورت میں حبس خلاف

طبیعت نہیں، اور دوسری میں خلاف طبیعت ہے۔ پس ثابت ہوا کہ مطلق حبس کو قید نہیں کہہ سکتے بلکہ حبس خلاف طبع کو قید کہتے ہیں۔ پس آپ کو پہلے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ مسلمان عورتیں جو پردہ میں رہتی ہیں۔ وہ ان کی طبیعت کے موافق ہے یا خلاف اس کے بعد یہ کہنے کا حق تھا کہ پردہ قید ہے یا نہیں۔ میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ پردہ مسلمان عورتوں کے خلاف طبع نہیں ہے۔ کیونکہ مسلمان عورت کے لئے حیأ امر طبعی ہے۔ لہذا پردہ حبس موافق طبع ہوا۔ اور اس کو قید کہنا غلط ہے ان کی حیاء کا مقتضا یہی ہے کہ پردہ میں مستور رہیں۔ بلکہ اگر ان کو باہر پھرنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ خلاف طبع ہوگا اور اس کو قید کہنا چاہئے۔

ایک اور جواب

مولانا امرتسری لکھتے ہیں:

عورتوں کو گھروں میں قید رکھنے کا کوئی حکم شریعت اسلام میں نہیں۔ حکم صرف یہ ہے کہ غیر محرموں سے جن سے نکاح درست ہے اپنے آپ کو چھپائیں کہ وہ دیکھ کر فریفتہ نہ ہوں۔ یا کم سے کم انہیں برا خیال پیدا نہ ہوتا کہ زنا کاری حتی المقدور بند رہے گویا مطلب کسی تائید کا محتاج نہیں تاہم اپنے سماجی دوستوں کی خاطر سوامی جی کے قول سے اس کی تائید دکھاتے ہیں تاکہ سماجیوں کو پنڈت جی کی کمالیت کا اعتراف ہو کہ جس بات کو خود ہی بڑے مبالغہ سے بیان کرتے ہیں۔ اگر وہی حکم اسلام میں دیکھیں تو بیساختہ اعتراض سوجھ جاتا ہے۔ پس سنو! پنڈت جی کا پرمان ہے۔

"لڑکیوں کے مدرسہ میں سب عورتیں، اور مردانہ مدرسہ میں مرد ہوں۔ زنانہ مدرسہ میں پانچ برس کا لڑکا اور مردانہ پاٹ شالا (مدرسہ) میں پانچ برس کی لڑکی بھی نہ جانے پائے۔ (ستیارتھ صفہ ۴۲، سملاس ۳، نمبر ۴)۔"

اور سنئے!

''عورت مردوں کا مندروں میں میل جول ہونے سے زنا کاری، لڑائی، بھکیڑا اور بیماریاں وغیرہ پیدا ہوتی ہیں۔'' (ستیارتھ پرکاش صفحہ ۴۱۹)

کوئی پنڈت جی سے پوچھے اتنا پرہیز کیوں ہے کہ پانچ پانچ برس کی لڑکی اور لڑکے بھی آپس میں نہ ملیں۔ اس عمر میں ان کو ہوش ہی کیا ہوگا؟ تو شاید (شاید کیا یقیناً) پنڈت جی یہی کہیں گے کہ مرد و عورت کی مثال سیڈلیٹز پوڈر کی ہوتی ہے جو الگ الگ تو کچھ نہیں مل کر جوش پیدا کرتی ہے سچ ہے۔

یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ہم ان کو چھوڑ بیٹھے ہیں
جب آنکھیں چار ہوتی ہیں محبت آ ہی جاتی ہے

اور سنئے! سوامی جی اور منوجی کیا پرمان دیتے ہیں؟

''ساری اندریوں (عورتوں) کو بناء سے بس میں رکھا۔ اندریوں کو بڑے قاعدہ سے قابو کرنا چاہئے اندریوں کی کشش باہمی تعلق سے ہوتی ہے۔ چنانچہ منوجی نے فرمایا ہے اندریاں اس قدر زبردست ہیں کہ ماں، ساس اور لڑکی وغیرہ کے ساتھ بھی ہوشیاری سے رہنا چاہئے دوسروں کو تو کیا کہنا۔'' (اُپدیش مجری صفحہ ۱۷)

سوامی جی نے اس آیت پر غور نہیں کیا:

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ.

ترجمہ: بے دینی کے طریق سے باہر نہ نکلا کرو جیسے پہلے کفر کی حالت میں نکلا کرتی تھیں۔''

سوامی جی اگر آج زندہ ہوتے تو ہم انہیں ان عورتوں کا حال دکھاتے جو زیور اور لباس سے آراستہ و پیراستہ ہو کر بازاروں میں پھرتی ہیں اور جو اس وقت جوان سے لے کر بوڑھے بازاری دکانداروں پر بموجب پرمان منوجی حالت گزرتی ہے۔ ان کی زبانی داستان سنواتے۔ سماجی اگر چاہیں تو ہم ان نیم مقتولوں کی طرف سے (بحکم نقل کفر کفر

نباشد) مختصر سے لفظوں میں ادائے مضمون کر دیتے ہیں۔ ناظرین معاف رکھیں۔

سنو! کوئی اس وقت آہ و بکا کرتا ہوا کہتا ہے

''ہائے یہ زلف سیاہ ڈس گئی ناگن بن کے''

کوئی چلاتا ہوا کہتا ہے:

دیکھو اس چشم یار کی شوخی

جب کسی پارسا سے لڑتی ہے

کوئی اپنے درد کی کہانی یوں شروع کرتا ہے:

مارا بغمزہ کشت و قضا را بہانہ ساخت

خود سوئے ماندید و حیارا بہانہ ساخت

ترجمہ: ہمیں اپنی ادا سے ذبح کر ڈالا اور قضاء کا بہانہ بنالیا۔ خود ہماری طرف نہ دیکھا اور حیا کو بہانہ بنالیا۔

کسی کو یہی سوجھتی ہے:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے

ان ہی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

اگر ان سے کہیں بھائیو! اپنی نگاہیں نیچی رکھو تو اس کا وہ معقول جواب دیتے ہیں۔

سنو! وہ کہتے ہیں ؎

کون رکھتا ہے بھلا ایسا جگر دیکھیں تو

یار ہو سامنے دیکھے نہ ادھر دیکھیں تو

اور اگر ان کو زیادہ ہی دق کرتے ہیں تو وہ اور بھی بگڑ جاتے ہیں اور منہ پھٹ ہو کر کہنے لگ جاتے ہیں۔ ؎

بل بے خود بینی زاہد! کہ تیرے دیکھنے کو

منع کرتا ہے لو یہ اور تماشا دیکھو

غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔حق تو یہ ہے کہ ایسی باتوں کے اظہار میں بازاری آدمی کسی قدر معذور بھی ہیں کیونکہ ؎

دیدار مے نمائی و پرہیز مے کنی
بازار خویش و آتش ماتیز میکنی

سبحان اللہ! انہی خرابیوں کے مٹانے کو بانی فطرت نے جو انسان کی فطرت سے پورا پورا واقف ہے۔انسانی فطرت کا لحاظ رکھ کر ارشاد فرمایا ہے:

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ.

ترجمہ: عورتیں اپنی زیب و زینت چہرہ کو ظاہر نہ کریں۔سوائے اتنے کے جو کسی طرح چھپ نہیں سکتی (جیسے برقعہ) اور بازار میں چلتے وقت کپڑوں سے اور اوپر ایک بھاری چادر لیا کریں۔(حق پرکاش)

یہ تو پرانے وقتوں کے شعر اور کہاوتیں ہیں اب جب عورت باہر نکلتی ہے تو بدمعاش لوگ جو آوازیں کستے ہیں اور گندی فلمی گیت گاتے ہیں خدا سننے کو نہ دے۔

(امداد اللہ انور)

ایک اور جواب

حق تعالیٰ نے لڑکوں کو دنیا کی زینت بتلایا ہے لڑکیوں کو بیان نہیں۔اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ لڑکیوں کو خود تم نے بھی بے حقیقت سمجھ رکھا ہے کیونکہ لوگوں کو لڑکوں سے زیادہ خوشی ہوتی ہے اور لڑکیوں کو تو عموماً وبال سمجھتے ہیں تو تمہارے نزدیک وہ کیا خاک زینت دنیا ہوں گی دوسرا نکتہ لڑکی کے ذکر نہ کرنے میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ جتلا دیا کہ لڑکیاں زینت دنیا بھی نہیں ہیں بلکہ محض زینت خانہ ہیں۔اگر وہ بھی زینت دنیا ہوتیں تو حق تعالیٰ ان کو بھی یہاں ذکر فرماتے۔پس صرف لڑکوں کو زینت دنیا فرمایا اور لڑکیوں کو ذکر نہ فرمایا اس کی دلیل ہے کہ لڑکیاں دنیا کی زینت نہیں ہیں۔کیونکہ عرفاً

زینت دینا وہ سمجھی جاتی ہے جو منظر عام پر زینت بخش ہو اور وہ ایسی زینت نہیں ہیں کہ تم ان کو ساتھ لئے پھرو اور سب دیکھیں کہ ان کے اتنی لڑکیاں ہیں اور ایسی آراستہ پیراستہ ہیں۔ بلکہ وہ محض گھر کی زینت ہیں یہاں سے پردہ کی دلیل کی طرف اشارہ نکل آیا۔

دوسرے لغت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کا پردہ کرایا جائے کیونکہ اردو میں عورت کو عورت کہتے ہیں جس کے معنی لغت میں چھپانے کی چیز کے ہیں تو اس کے ساتھ یہ کہنا کہ عورت کو پردہ نہ کراؤ۔ ایسا ہے جیسا یوں کہا جائے کہ کھانے کی چیز کو نہ کھاؤ۔ پہننے کی چیز کو نہ پہنو۔ اور اس کا تو ہونا ظاہر ہے کہ عورتوں کا پردہ کراؤ۔ ان کو عورت کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ وہ پردہ میں رہنے کی چیزیں ہیں۔

ایک ترقی یافتہ کہتے تھے کہ عورتیں پردہ کی وجہ سے ترقی علم سے رکی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں اسی واسطے تو ان چھوٹی قوموں کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں بہت تعلیم یافتہ ہو گئی ہیں۔ یہ جواب سن کر وہ خاموش ہی تو رہ گئے۔

اصل بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے میں پردہ یا بے پردگی کو کوئی دخل نہیں۔ بلکہ اس میں بڑا دخل توجہ کو ہے۔

اگر کسی قوم کی عورتوں کو تعلیم پر توجہ ہو تو وہ پردہ میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں ورنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہو سکتی ہے کیونکہ تعلیم کے لئے یکسوئی اور اجتماع خیال کی ضرورت ہے۔ اور وہ گوشہ تنہائی میں زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ اس واسطے مرد بھی مطالعہ کے لئے گوشہ تنہائی تلاش کیا کرتے ہیں جیسا کہ طلباء کو اس کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ پس عورتوں کا پردہ میں رہنا تو علوم کے لئے معین ہے نہ کہ رکاوٹ، نہ معلوم لوگوں کی عقلیں کیا ہوئیں جو پردہ کو تعلیم کا منافی سمجھتے ہیں۔ ہاں علوم تجارت کے لئے سیر و سیاحت کی البتہ ضرورت ہے مگر عورتیں ناقص العقل اور کم حوصلہ ہیں۔ ان کے لئے سیر و سیاحت سے تجربے میں حقیقی یعنی اخلاقی ترقی نہ ہوگی بلکہ آزادی اور شرارت بڑھے گی۔ اس لئے شریعت نے

عورتوں کے ہاتھ میں طلاق نہیں دی۔ کیونکہ یہ ایسی کم حوصلہ ہیں کہ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ مرد تو برسوں میں کسی بہت بڑی بات پر طلاق کا قصد کرتا ہے۔ وہ بھی ہزاروں میں سے ایک ورنہ زیادہ تو ایسے ہی مرد ہیں جو عورت کی بدتمیزیوں پر صبر کرتے ہیں۔ اور اگر عورتوں کے ہاتھ طلاق ہوتی تو یہ تو ہر مہینہ شوہر کو طلاق دے کر نئی شادی کیا کرتیں۔ پس عورتوں کے لئے یہی سیر و سیاحت کافی ہے کہ اپنے گھر میں چل پھر لیا کریں۔ جن تجربوں کی ان کو ضرورت ہے وہ گھر میں رہ کر ہی ان کو حاصل ہو سکتے ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ نظر حقیقت میں سے دیکھئے تو مردوں کو بھی اس کی ضرورت نہیں۔ اگر سیر و تماشہ چاہتے ہو تو وہ بھی آپ کے اندر موجود ہے۔ دل کی آنکھوں سے دیکھ لو تم کو اپنے اندر ایسا تماشا نظر آئے گا کہ دنیا کے پھول پھلواڑیوں سے استغناء ہو جائے گا۔

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیر سرد شمن درآ
تو زغنچہ کم ندمیدۂ دردل کشا بچمن درآ

چوں کوئے دوست ہست بصرا چہ حاجت است
خلوت گزیدہ رابہ تماشا چہ حاجت است

ایک اور جواب

مردوں کو تو یہ حکم فرمایا:

قل للمؤمنين يغضوا من ابصارهم ويحفظوا فروجهم.
یعنی آپ مؤمنین سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔
اور عورتوں کے لئے یہ بھی حکم فرمایا اور اس پر اضافہ بھی فرمایا:
ولا يبدين زينتهن. یعنی بناؤ سنگار کے اعضاء ظاہر نہ کریں۔

اور ظاہر ہے کہ بناؤ سنگار کا عضو وہ ہے جو اکثر کھلا رہتا ہے جب اس کا اظہار بھی اجنبیوں کے سامنے جائز نہیں تو باقی تمام بدن کا تو کیسے جائز ہوگا۔

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے: **والقواعد من النساء التی لایرجون نکاحاً فلیس علیھن جناح ان یضعن ثیابھن غیر متبرجات بزینة.** یعنی جو عورتیں بوڑھی ہیں وہ اگر اپنے زائد کپڑوں کو اتار کر رکھ دیں جیسے اوپر تلے کپڑے ہوں اور اوپر کا کپڑا اتار دے بشرطیکہ بدن ظاہر نہ ہو تو کچھ حرج نہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی اپنے اعضاء زینت کو ظاہر نہ کریں۔ مثلاً گردن، کان کہ ان میں زیور پہنا جاتا ہے اور ارشاد ہے: **وان یستعففن خیر لھن.** یعنی ان زائد کپڑوں کے اتار کر رکھنے سے بچیں تو ان کیلئے زیادہ بہتر ہے۔ پس جب بوڑھیوں تک کے لئے یہ حکم ہے تو اے لڑکیو اور اے جوان عورتو! تم کو کہاں عجلت ہوگئی کہ دور دور کے رشتے داروں کے سامنے بے محابا آجاؤ۔ حضور ﷺ کی ذات سے زیادہ تو کوئی معصوم و محفوظ نہ ہوگا۔ حضور خود اپنے سے عورتوں کو پردہ کراتے تھے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آجکل جو بعضے نو تعلیم یافتہ کہتے ہیں کہ پردہ ضروری نہیں ہے اور ایسا پردہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں محض غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے قرآن و حدیث کو دیکھا ہی نہیں۔ بس دیکھا کیا ہے کوئی اخبار دیکھ لیا اگر کچھ عربی پڑھی ہے تو مصری اخبار دیکھ لیا۔ خوب سمجھ لو کہ یہ پردہ جو آجکل مروج ہے یہ قرآن سے بھی ثابت ہے اور حدیث سے بھی ثابت ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک عورت نے حضور ﷺ کو پردہ کے پیچھے سے خط دیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور اپنے سامنے عورتوں کو نہ آنے دیتے تھے۔ اور قرآن اوپر گزرا ہے پھر جب کہ حضور خود سے پردہ کروائیں تو کون سا پیر ہے اور کون سا رشتہ دار ہے جس سے بے حجابی جائز ہوگی۔ خواہ کوئی خالو ہو یا پھوپھا دادا لگتا ہو، یا چچا اگر محرم نہ ہو وہ اجنبی ہے، بڑا ظلم و ستم ہے کہ عورتوں کو اس کی کچھ پرواہ نہیں ہے ہم نے مانا کہ تمہارا دل پاک ہے لیکن تم کو دوسرے

کی کیا خبر اگر کہو کہ دوسرا بھی پاک ہے تو توبہ خدا اور رسول کو تم نے ظالم قرار دیا۔ کہ باوجود کہ یہ پاک تھا پھر بھی اس سے پردہ کا حکم دیا۔ اگر یہ پاک صاف ہوتے تو حق تعالی ضرور ان کا نام لکھ دیتے کہ فلاں شخص پاک ہے۔ یاد رکھو اللہ تعالی کو سب خبر ہے کہ کون پاک ہے اور کون نہیں ہے۔ انبیاء سے زیادہ پاک تو کوئی نہیں ہو سکتا ہے۔ یوسف علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے فرماتے ہیں: **وما ابریء نفسی ان النفس لا مارۃ بالسوء الا مارحم ربی.** یعنی میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا ہوں، نفس تو بری بات کا حکم کرنے والا ہی ہے مگر جس پر میرا رب رحمت فرمادے وہ مستثنیٰ ہے۔ اب بتلائیے کہ کس کا منہ ہے جو کہے کہ میرا نفس پاک ہے مجھ کو برا وسوسہ نہیں آتا اور اگر ایسا اتفاق ہوتا ہے تو وہ عارضی حالت ہے جو کہے کہ میرا نفس پاک ہے مجھ کو برا وسوسہ نہیں آتا کہ انہوں نے جب دیکھا کہ ان کو وسوسہ نہیں آتا۔ تو یوں سمجھے کہ ہمارا نفس مزکی ہو گیا ہے کہ انہوں نے غیر محرم کے اختلاط میں کوئی باک نہیں کیا۔ اور پھر کسی فتنہ میں مبتلا ہو گئے۔ خواہ وہ فتنہ قلب ہی ہو۔ اور یہ کارگزاری شیطان کی ہے کہ اس ترکیب سے کہاں سے کہاں تک لایا۔ اسی واسطے حق تعالی نے اول یہ تدبیر بتائی کہ نگاہ نیچی رکھو۔ اگر بضرورت تم کو کسی غیر محرم کے سامنے آنا پڑے تو نگاہ نیچی اور کپڑوں میں لپٹ کر آؤ۔ یہ نگاہ بظاہر ہے بہت خفیف لیکن اصل تمام پھل پھول کی یہی ہے۔ جیسے زکام ہے کہ بظاہر بہت ہلکی بیماری ہے لیکن سینکڑوں بیماریوں کا منشاء ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نظر بھی ہے اگر یہ بگڑ گئی تو آئندہ امن اٹھ گیا اسی واسطے اول اسی کو روکا ہے۔ دیکھو نبی کی بیبیوں سے تو زیادہ کوئی عورت نہیں ہو سکتی میں تم کو قصہ سناتا ہوں جس سے تم کو اندازہ ہوگا کہ پردہ کس درجہ ضروری ہے:

> حضرت عبداللہ بن مکتوم رضی اللہ عنہ ایک نابینا صحابی ہیں۔ وہ ایک مرتبہ حضور کی خدمت میں آئے۔ ازواج مطہرات میں سے غالباً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیٹھی تھیں۔ حضور نے

فرمایا کہ تم پردہ میں ہو جاؤ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ اندھے ہیں۔ حضور فرماتے ہیں:

افعمیا وان انتما لستما تبصرانہٗ.(ترمذی ۲۷۷۸،ابو داود ۴۱۱۲)

یعنی کیا تم بھی اندھی ہو اس کو دیکھتی نہیں ہو۔

دیکھو حضور کی بیویاں امہات المؤمنین، دوسری طرف نابینا صحابی، بھلا یہاں کون سے وسوسہ کا احتمال ہو سکتا ہے مگر پھر بھی کس درجہ اہتمام کرایا۔ (العفۃ ص ۷)

آیت کا ترجمہ

اور سوال کرتے ہیں تجھ سے حیض سے کہہ وہ ناپاکی ہے پس کنارہ کر عورتوں کو بیچ حیض کے اور مت نزدیک جاؤ ان کے یہاں تک کہ پاک ہوں۔ پس جب نہالیں پس جاؤ ان کے پاس اس جگہ سے حکم کیا تم کو اللہ نے بیبیاں تمہاری کھیتیاں ہیں واسطے تمہارے پس جاؤ کھیت اپنے میں، جس طرح چاہو۔ (آیت ۲۱۶-۲۱۸)

قرآن میں عورت کو کھیت سے تشبیہ دینا

اعتراض (پنڈت دیانند سرسوتی کا اعتراض)

ایام حیض میں مجامعت نہ کرنے کا حکم تو اچھا ہے لیکن عورت کو کھیت سے مشابہت دینا اور یہ کہنا کہ جس طرح چاہو۔ ان کے پاس جاؤ۔ انسان کی شہوت بھڑکانے کا موجب ہے۔

جواب: کیسا مورکھ (بیوقوف) ہے وہ منش (آدمی) جو اپنا گھر شیشوں کا بنا کر دوسروں پر پتھر برساتا ہے۔ سماجیو! سوامی جی کیسے پکش پاپی متعصب ہیں کہ جس قسم کا استعارہ وہ خود بولتے ہیں۔ اسی قسم کے استعارے والا کلام اگر قرآن میں ان کو نظر آجاتا ہے تو فوراً معترض ہوتے ہیں۔

سنو! غور سے۔

"عورت مرد کو دھیان رکھنا چاہئے کہ ویرج (نطفہ) کو بے بہا سمجھیں جو کوئی اس بیش قیمت چیز (نطفہ) کو بیگانی عورت، رنڈی، یا برے مردوں کی صحبت میں کھوتے ہیں وہ بڑے بے عقل ہوتے ہیں۔ کیونکہ کسان یا مالی جاہل ہو کر بھی اپنے کھیت یا باغیچہ کے سوائے اور کہیں بیج نہیں بوتے۔ جبکہ معمولی بیج اور جاہل کا ایسا دستور ہے تو جو شخص سب سے اعلیٰ انسانی جسم کے درخت کے بیج کو برے کھیت میں کھوتا ہے وہ بھاری بیوقوف کہلاتا ہے کیونکہ اس کا پھل اس کو نہیں ملتا۔

(ستیارتھ صفحہ ۱۵۶، سملاس ۴، نمبر ۱۴۲)۔"

بتلایئے! اس عبارت میں کھیت کس کو کہا ہے اور درخت کس کو؟ کیوں جی! سچ ہے؟ ناپاک باطنوں کو علم نہیں ہوتا۔ (بھومکا صفحہ ۵۲)

ہاں اب یاد آیا کہ سوامی جی اس فقرہ پر "جاؤ اپنے کھیت میں جس طرح چاہو" کیوں ناراض ہیں۔ پنڈت جی نے تو عورت کو کھیتی اس درجہ تک کہا تھا کہ اگر مرد کے نطفہ میں کمزوری ہو تو دوسرے سے اولاد لے کر خاوند کی وارث کر سکتی ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"جب خاوند اولاد پیدا کرنے کے ناقابل ہو، تب اپنی عورت کو اجازت دے کہ اے نیک بخت اولاد کی خواہش کرنے والی عورت تو مجھ سے علاوہ دوسرے خاوند کی خواہش کر (ساجیو! عمل کرو تو جانیں) کیونکہ اب مجھ سے اولاد نہیں ہو سکے گی۔ تب عورت دوسرے کے نیوگ کر کے اولاد پیدا کر لے۔" (ستیارتھ پرکاش صفحہ ۱۵۴، سملاس ۱۰: نمبر ۱۳۸)۔"

قرآن شریف نے بڑا غضب کیا کہ سوامی جی کی اس ترقی کو روک کر صرف خاوندوں کی کھیتیوں میں جانے کی اجازت بخشی ہے اور یہی بڑا گناہ ہے۔

مجھ میں ایک عیب بڑا ہے کہ وفادار ہوں میں

ان میں دو وصف ہیں بدخود بھی بدکام بھی ہیں

(حق پرکاش)

غیر فطری فعل اپنی بیوی سے بھی حرام ہے

اعتراض: (جاوید غامدی کا اعتراض)

اسلام میں ہم جنس پرستی جائز ہے۔

جواب: قرآن میں ہے:

وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ. لفظ من ازواجکم میں صرف مِنْ اصطلاحی الفاظ میں بیانیہ بھی ہوسکتا ہے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ تمہاری خواہش نفسانی کے لئے جو اللہ نے بیویاں پیدا فرمائی ہیں تم ان کو چھوڑ کر اپنے ہم جنس مردوں کی شہوت نفس کا نشانہ بناتے ہو جو خباثتِ نفس کی دلیل ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صرف مِنْ کو تبعیض کے لئے قرار دیں تو اشارہ اس طرف ہوگا کہ تمہاری بیبیوں کا جو مقام تمہارے لئے بنایا گیا اور جو امر فطری ہے اس کو چھوڑ کر بیویوں سے خلافِ فطرت عمل کرتے ہو جو کہ قطعاً حرام ہے۔ غرض اس دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوگیا کہ اپنی زوجہ سے خلافِ فطرت عمل حرام ہے۔ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص پر لعنت فرمائی ہے۔ نعوذ باللہ منہ (روح المعانی)

بائبل میں بھی ہم جنس پرستی اور لواطت کرنے والے کو سنگسار کرنے کا اب بھی موجود ہے۔

حرمت لواطت کی وجہ

ایسی عادت سے نسل انسانی کی بیخ کنی ہوتی ہے اس طریق سے گویا انسان نظام الٰہی کو بگاڑ کر اس کے مخالف طریقے سے قضائے حاجت کرتا ہے اس وجہ سے ان افعال کا برا اور مذموم ہونا لوگوں کی طبیعتوں میں جم گیا ہے فاسق فاجر ایسے افعال کرتے

ہیں لیکن ان کے جواز کا اقرار نہیں کرتے اگر ان کی طرف ایسے افعال کی نسبت کی جائے تو شرم وحیاء سے مرجانا گوارا کرتے ہیں ہاں جو منبع فطرت سے جدا ہو گئے ہوں تو ان کو پھر کسی کی حیا باقی نہیں رہتی اور برملاوہ ایسے افعال عمل میں لاتے ہیں۔

حکمت جواز طلاق

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

عیسائی مذہب میں عورت کو صرف زنا کاری کی وجہ سے خاوند طلاق دے سکتا ہے جبکہ اسلام میں اس طرح کی کوئی پابندی نہیں جو کہ عورت پر ظلم ہے۔

جواب: واضح ہو کہ طلاق عربی لفظ ہے جس کے معنی اردو زبان میں کھولنے یا چھوڑ دینے کے ہیں اور اصطلاح شریعت اسلام میں مرد کا اپنے عورت کو اپنے نکاح سے خارج کر دینا ہے۔ جس کا مطلب تفصیل ذیل سے بخوبی معلوم ہوگا۔

مسلمانوں میں نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں مرد کی طرف سے اسلام اور مہر اور نان ونفقہ وحسن معاشرت شرط ہے اور عورت کی طرف سے عفت اور پاک دامنی اور نیک چلنی اور فرمانبرداری کے عہد شرائط ضروریہ ہیں اور جیسا کہ دوسرے تمام معاہدے شرائط کے ٹوٹ جانے سے قابل فسخ ہو جاتے ہیں ایسا ہی یہ معاہدہ بھی شرطوں کے ٹوٹنے کے بعد قابل فسخ ہو جاتا ہے صرف یہ فرق ہے کہ اگر مرد کی طرف سے شرائط ٹوٹ جائیں تو عورت خود بخود نکاح توڑنے کی مجاز نہیں جیسا کہ وہ خود بخود نکاح کرنے کی مجاز نہیں بلکہ حاکم وقت کے ذریعہ سے نکاح کو توڑ سکتی ہے جیسا کہ ولی کے ذریعہ سے نکاح کرا سکتی ہے اور یہ کمی اختیار اس کی فطرتی شتابکاری اور نقصان عقل کی وجہ سے ہے لیکن مرد جیسا کہ اپنے اختیار سے معاہدہ نکاح کا باندھ سکتا ہے ایسا ہی عورت کی طرف سے شرائط ٹوٹنے کے وقت طلاق دینے میں بھی مرد خود مختار ہے۔

سو یہ قانون فطرتی قانون سے جو عنقریب مذکور ہوتا ہے مناسبت اور مطابقت

رکھتا ہے گویا کہ اس فطری قانون کی عکسی تصویر ہے۔ کیونکہ فطرتی قانون سے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہر ایک معاہدہ شرائط طے شدہ کے فوت ہونے سے قابل فسخ ہو جاتا ہے اور اگر فریق ثانی فسخ سے مانع ہو تو وہ اس فریق پر ظلم کر رہا ہے جو فقدان شرائط کی وجہ سے فسخ عہد کا حق رکھتا ہے۔ پس جب ہم سوچیں کہ نکاح کیا چیز ہے تو بجز اس کے اور کوئی حقیقت معلوم نہیں ہوتی کہ ایک پاک معاہدہ کی شرائط کے نیچے دو انسانوں کا زندگی بسر کرنا ہے اور جو شخص شرائط شکنی کا مرتکب ہو وہ عدالت کی رد سے معاہدہ کے حقوق سے محروم رہنے کے لائق ہو جاتا ہے اور اسی محرومی کا نام دوسرے لفظوں میں طلاق ہے پس جس مطلقہ کی حرکات سے شخص طلاق دہندہ پر کوئی بد اثر پہنچتا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک عورت کسی کی منکوحہ ہو کر نکاح کے معاہدہ کو کسی اپنی بد چلنی وغیرہ سے توڑ دے تو وہ اس عضو کی طرح ہے جو گندا ہو گیا اور سڑ گیا۔ یا اس دانت کی طرح ہے جس کو کیڑے نے کھا لیا اور اپنے شدید درد سے ہر وقت تمام بدن کو ستاتا اور دکھ دیتا ہے تو اب حقیقت میں وہ دانت دانت نہیں ہے اور نہ وہ متعفن عضو حقیقت میں عضو ہے اور سلامتی اسی میں ہے کہ اس کو اکھاڑ دیا جائے اور کاٹ دیا جائے اور پھینک دیا جائے یہ سب کارروائی قانون قدرت کے موافق ہے۔ عورت کا مرد سے ایسا تعلق نہیں ہے جیسے اپنے ہاتھ اور پاؤں کا لیکن تاہم اگر کسی کا ہاتھ یا پاؤں کسی آفت میں مبتلا ہو جائے کہ اطباء اور ڈاکٹر کی رائے اس پر اتفاق کرلے کہ زندگی اس کے کاٹ دینے میں ہے تو بھلا تم میں سے کوئی ہے کہ ایک جان بچانے کے لئے اس کے کاٹ دینے پر راضی نہ ہو پس اگر ایسا ہی کسی کی منکوحہ اپنی بد چلنی اور کسی شرارت سے اس پر وبال لائے تو وہ ایسا عضو ہے کہ بگڑ گیا ہے اور سڑ گیا ہے اور اب وہ اس کا عضو نہیں ہے اس کو کاٹ دے اور گھر سے باہر پھینک دے ایسا نہ ہو کہ اس کا زہر اس کے سارے بدن میں پہنچ جائے اور تجھے ہلاک کر دے۔ پھر اگر اس کاٹے ہوئے اور زہریلے جسم کو کوئی پرندہ یا درندہ کھا لے تو اس کو اس سے کیا کام کیونکہ وہ جسم تو اس

وقت سے تیرا جسم نہیں رہا جبکہ اس نے اس کو کاٹ کر پھینک دیا۔ (المصالح العقلیہ)

طلاق کے بعد دوسری جگہ نکاح کر کے پہلے مرد سے نکاح کرنے پر اعتراض

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

اگر کسی مسلم مومن کی مسلم مومن بیوی طلاق کے بعد پھر سے اپنے پہلے والے مومن مسلم شوہر کے ساتھ رہنے کو راضی ہو تو کیونکر اس عورت کو کسی غیر مرد کے ساتھ کچھ وقت کے لئے رہنا واجب اور مناسب ہے؟ جو کہ سراسر ہی زنا کاری اور حرام کاری اور خدا کی نظر میں گناہ کبیرہ اور ناپاکی اور زنا کاری ہے۔ کیا پاک خدا ایسے گھنونے حیوانی اور شیطانی فعل کی اجازت دے سکتا ہے۔''

جواب: سو وہ پھر اپنے ان یاروں پر مرنے لگی جن کا بدن گدھوں کا سا بدن اور جن کا انزال گھوڑوں کا سا انزال تھا۔ (حزقی ایل ۲۳:۲۰)۔ جبکہ خدا پاک اور اس کا ہر ایک سخن پاک ہے۔ (امثال ۳۰:۵)۔ تو بائبل کی ان دونوں باتوں کے پیش نظر ایسے بدترین، قابل تفرین شرافت سے گرے ہوئے، گندے، ناپاک، سراپا نجس، نہایت مذموم اور بہت گھناؤنے الفاظ الہام اور وحی الٰہی ہو سکتے ہیں؟

کچھ اس قدر تھی گرمی بازار آرزو
دل جو خریدتا تھا اسے دیکھتا نہ تھا

سب سے پہلے یہ بات سماعت فرمایئے کہ دین اسلام میں نکاح کسے کہتے ہیں؟ تو شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ قرآن پاک کی سورۃ النسآء کی آیت نمبر ۲۴ کے تحت دوسرے فائدہ میں تحریر فرماتے ہیں:

(۱) یعنی جن عورتوں کی حرمت بیان ہو چکی ان کے سوا سب حلال ہیں چار شرطوں کے ساتھ اول یہ کہ طلب کرو یعنی زبان سے ایجاب و قبول دونوں طرف سے ہو جائے۔ (۲) دوسری یہ کہ مال دینا یعنی مہر دینا قبول

کرو۔ (۳) تیسری یہ کہ ان عورتوں کو قید میں لانا اور اپنے قبضہ میں رکھنا مقصود ہو صرف مستی نکالنا اور شہوت رانی مقصود نہ ہو جیسا کہ زنا میں ہوتا ہے یعنی ہمیشہ کے لئے وہ اس کی زوجہ ہو جائے چھوڑے بغیر کبھی نہ چھوٹے مطلب یہ کہ کوئی مدت مقرر نہ ہو اس سے متعہ کا حرام ہونا معلوم ہو گیا جس پر اہل حق کا اجماع ہے۔ (۴) چوتھی شرط جو دوسری آیتوں میں مذکور ہے یہ ہے کہ مخفی طور پر دوستی نہ ہو یعنی کم سے کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اس معاملہ کی گواہ ہوں اگر بغیر دو گواہوں کے ایجاب وقبول ہوگا تو وہ نکاح درست نہ ہوگا زنا سمجھا جائے گا۔ (تفسیر فوائد عثمانیؒ)

ہمارے ہاں کسی عورت کا کسی مرد کے ساتھ کچھ وقت کے لئے رہنا نکاح نہیں اس بات کی دلیل یہ ہے کہ (مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ. یعنی قید میں لانے کو نہ مستی نکالنے کو) جب یہ معلوم ہو گیا تو اگر کسی عورت کو طلاق ہو جاتی ہے تو وہ عدت پوری کرنے کے بعد دوسرے آدمی سے نکاح کر سکتی ہے اگر یہ آدمی مر جائے یا خود طلاق دیدے تو اس عورت کو عدت پوری کرنے کے بعد یہ اختیار ہے کہ اگر پہلے خاوند کے ساتھ نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے شریعت میں اس کی اجازت ہے مگر ایسا کرنا فرض اور واجب نہیں یعنی یہ ضروری نہیں کہ پہلے خاوند ہی کے ساتھ نکاح کرے۔

یہ فقہی مسائل ہیں علم کلام میں یہ زیر بحث نہیں لائے جاتے غور فرمائیے کہ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ابا جان نے اپنے باپ کی بہن اپنی حقیقی پھوپھی سے نکاح کیا تھا۔ چنانچہ تورات نے اسے اس طرح بیان کیا ہے:

اور عمرام نے اپنے باپ کی بہن یوکبد سے بیاہ کیا اس عورت کے اس سے ہارون اور موسیٰ پیدا ہوئے۔" (خروج ۶:۲۰)

حالانکہ تورات میں اس کے خلاف حکم ہے۔ "اور تو اپنی خالہ یا پھوپھی کے بدن کو بے پردہ نہ کرنا۔" (احبار ۲۰:۱۹)

اور اب یہودیوں، مسیحوں اور مسلمانوں کے نزدیک پھوپھی سے نکاح کرنا ہرگز ہرگز جائز نہیں بہر حال ایسے فقہی اور فروعی مسائل مذاہب میں مختلف ہوتے ہیں۔ عقائد کے مواقع میں ان پر گفتگو نہیں کی جاتی بلکہ اصولوں پر کی جاتی ہیں۔

پندرہواں باب

اسلامی سزائیں
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

چوری کی سزا میں چور کے ہاتھ کاٹنے اور زنا کی سزا میں شرمگاہ نہ کاٹنے کی وجہ

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

چوری کی سزا میں چور کا ہاتھ کاٹتے ہو اور زنا کی سزا میں زانی کی شرمگاہ کیوں نہیں کاٹتے۔

جواب: چور کی سزا میں چور کا ہاتھ کاٹنا اور زنا کی سزا میں زانی کی شرمگاہ نہ کاٹنا خدا تعالی کی نہایت حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ کیونکہ خدا تعالی کی حکمت اور اس کی رحمت اور اس کی مخلوق کی مصلحت میں جائز نہیں ہے۔ کہ ہر مجرم کا وہی عضو کاٹا جائے جس سے اس نے گناہ کیا ہو کیونکہ اس طرح ہر ایک بدنظر کی آنکھ نکالی جاتی اور بری بات کے سننے والے کے کان کاٹے جاتے اور ہر بدزبانی کرنے والے کی زبان کاٹنی پڑتی اور ہر ایک ظلم سے طمانچہ مارنے والے کے ہاتھ کاٹے جاتے۔ اور اس طرح کی سزا میں جو زیادتی و تجاوز کرنا پڑتی وہ پوشیدہ نہیں ہے کیونکہ اس میں عدم لحاظ مراتب ہوتا ہے اور خدا تعالی کے اسمائے حسنی اور اس کی صفات عالیہ اور اس کے افعال حمیدہ اس امر کو نہیں چاہتے کیونکہ حد مقرر کرنا محض امن ہی کے لئے نہیں ہے ورنہ اگر اس امر کا ارادہ ہوتا تو مجرم کو قتل کرنا ہی لازم ہوتا حد مقرر کرنے سے مقصود خود مرتکب کو گناہ ڈانٹنا اور متنبہ کرنا اور سزا دینا اور آئندہ کے لئے عبرت دلانا منظور ہے اور دوسرے آدمی ایک کی سزا سے عبرت کڑیں اور نیز یہ بھی کہ مجرم عذاب و سزا سے خالص توبہ کی طرف رجوع کرے اور یہ بھی کہ حد کی سزا سے انسان کو عذاب آخرت یاد آجائے اور مصالح بنی آدم کو سمجھ کر بھی آئندہ بدیوں سے باز آجائے اور یہ مصالح قطع اعضاء کو مقتضی نہیں مطلق سزا کو مقتضی ہیں۔

پھر یہ بات کہ چور کے لئے ہاتھ کاٹنا کیوں تجویز کیا تو اس میں ایک اور بات

ہے۔ وہ یہ کہ چور چوری پوشیدہ طور پر کرتا ہے۔

جیسا کہ سرقہ کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں شخص کی طرف چوری سے دیکھتا ہے جب کہ وہ اس کو خفیہ نظر سے دیکھتا ہو اور نہ چاہتا ہو کہ اس کو کوئی معلوم کرے۔ سو چوری کرنے والا پوشیدہ اور خائف رہتا ہے کہ مبادا اس سے کوئی واقف ہو تو پکڑا جائے اور جب وہ کوئی چیز اٹھاتا ہے تو اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے بھاگنا اختیار کرتا ہے اور اس بھاگنے میں قوت ہاتھوں اور پاؤں سے ہوتی ہے کیونکہ دونوں ہاتھ انسان کے لئے ایسے ہیں کہ جیسا پرندہ کے لئے اڑنے کے دو بازو ہوتے ہیں۔ اور پاؤں کا دخل بھاگنے میں ظاہر ہے پس چور کا ہاتھ کاٹنے کی سزا اس کی بازوئے قوت کو کوتاہ کرنے اور دوبارہ چوری کرے تو اس کو بآسانی پکڑنے کے لئے ہے۔ جب پہلی دفعہ چوری کرے تو اس کا ایک بازو کاٹا جائے تاکہ اس کی دوڑ دھوپ میں کمزوری واقع ہو جائے پھر دوسری دفعہ چوری کرے تو اس کا ایک پاؤں قطع کیا جائے تاکہ اس کے بھاگنے میں زیادہ کمزوری ہو جائے اور کوئی بھی اس کو بھاگنے نہ دے۔ اور اس کے بعد تیسری چوتھی بار میں چوری کرنا اس کا نادر ہے اس طرح پھر قطع سزا میں تجویز نہیں کیا گیا۔ اگر نادر ایسا کرے محبوس کیا جائے تاکہ لوگ اس کے دکھ سے آرام پائیں۔

اور زانی کی شرم گاہ سزا میں اس لئے نہیں قطع کی جاتی کہ زانی تو سارے بدن کے ساتھ زنا کرتا ہے اور تمام بدن سے لذت لیتا اور قضائے شہوت کرتا ہے اور زنا کا فعل اکثر زانیہ کی مرضی و رضا پر بھی ہوتا ہے وہ اس امر سے نہیں ڈرتا جس سے چور ڈرتا ہے یعنی طلب کرنے اور ڈھونڈنے سے۔ اس لئے زنا میں غیر محصن (کنوارے کے سارے بدن کو درے لگانے اور محصن (شادی) کو تمام بدن کے سنگسار کرنے کی سزا دی جاتی ہے۔

باقی یہ کہ اس میں سنگساری تجویز ہی نہ ہوتی صرف دروں پر کفایت کی جاتی تو

اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ زنا سے نسب مل جاتے ہیں اور نسب مل جانے سے تعارف و شناخت اور دین کے زندہ کرنے کی امداد باطل ہو جاتی ہے اور اس میں ہلاکت کشت و تباہی نسل انسانی لازم آتی ہے پس زنا اکثر امور میں قتل سے مشابہت رکھتا ہے لہذا اس کی بعض صورتوں میں قصاص سے توبیخ، وتنبیہ کی گئی تا کہ ایسا فعل کرنے سے اور لوگ رک جائیں اور دنیا میں امن و اصلاح ہو کیونکہ اصلاح سے انسان عبادات الٰہی کی طرف رغبت کرتے ہیں اور عبادات الٰہی نعمائے اخروی حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔

نیز زانی کی شرمگاہ کو قطع کرنے میں اس کو آئندہ نسل سے محروم ٹھہرانا لازم آتا ہے اور یہ امر خدا تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کے برخلاف ہے کیونکہ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ لوگوں کی اولاد و ذریت ان کی عورتوں سے بکثرت پیدا ہوں اور قطع شرم گاہ سے قطع نسل لازم آتا ہے، لہذا یہ امر مشروع نہ ہوا۔

نیز زانی کی شرمگاہ قطع کرنے میں بے ستری بھی ہے اور یہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ سارے بدن سے جرم زنا کا مرتکب ہوتا ہے تو پھر سارے جسم کو چھوڑ کر ایک عضو کو سزا دینا خلاف عدل تھا لہذا عدل اس امر کا مقتضی ہوا کہ زانی کے سارے جسم کو سزا دی جائے۔

کیا اسلامی حدود و تعزیرات سخت وحشیانہ ہیں؟

اعتراض: (عیسائیوں اور ہندوؤں کا اعتراض)

اسلامی تعزیرات بڑی سخت اور وحشیانہ ہیں۔

جواب: آج کل متمدن اقوام نے قصاص بالسیف کی جگہ پھانسی تجویز کی ہے یہ بھی سخت، موذی ہے کیونکہ اس میں روح نکلنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ اور قتل میں جان نکلنے کا راستہ ہو جاتا ہے۔ پھانسی میں تڑپنے کی وجہ سے زبان باہر نکل آتی ہے اور صورت بگڑ جاتی ہے اور ان سے زیادہ متمدن اقوام نے ایک برقی کرسی تجویز کی ہے جس پر بیٹھتے ہی ایک سیکنڈ میں جان نکل جاتی ہے نہ معلوم اس میں کیسی کشش ہوگی

اور روح پر کیا گذرتی ہوگی۔ مگر چونکہ دیکھنے والے کو اس تکلیف کا احساس نہیں ہوتا اس لئے یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں تکلیف نہیں اور قتل میں لاش کے تڑپنے اور سر کے کٹنے کا اور خون بہنے کا منظر سامنے ہوتا ہے اس کو وحشی سزا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے ہاں یوں کہو کہ تم نے اپنی رعایت کر لی کہ تمہارے سامنے بھیانک منظر نہ ہو اور اس سے قیاس کر لیا کہ جب ہمارے سامنے بھیانک منظر نہیں تو واقع میں بھی کچھ زیادہ تکلیف نہیں۔ مگر یہ قیاس الغائب علی الشاہد ہے اور یہی اصل ہے کہ تمام اخرویات کے انکار کی، کہ جو چیز نظر سے غائب ہے وہ ان کے نزدیک معدوم محض ہے انہوں نے عدم مشاہدہ کو عدم اصل کی دلیل بنا لیا ہے حالانکہ امریکہ کا مشاہدہ پہلے ایک عرصہ تک نہ ہوا تھا تو کیا وہ اس وقت بھی معدوم اصلی تھا اور اس کا بطلان ظاہر ہے تو اب اس سوال کے کیا معنیٰ کہ جنت و دوزخ اگر کوئی چیز ہے تو وہ ہم کو نظر کیوں نہیں آتی۔ تم کو نظر نہ آنے سے یہ کیوں کر لازم آیا کہ وہ معدوم ہیں۔

اسی طرح تم کو اگر پھانسی یا برقی کرسی کی سزا میں تکلیف کا منظر نظر نہیں آتا تو اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ مرنے والے کو بھی تکلیف زیادہ نہیں ہوتی۔ دلیل عقلی کا مقتضاء تو یہ ہے کہ قتل میں مرنے والے کو کم تکلیف ہوتی ہے اور ان مہذب سزاؤں میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے کیونکہ موت نام ہے جان نکلنے کا اور جس طریقہ سے جان نکالنے کا راستہ پیدا کیا جائے یقیناً اس میں سہولت سے جان نکلے گی۔ اور جن صورتوں میں گھونٹ کر دبا کر جان نکالی جائے گی اس میں سخت تکلیف سے جان نکلے گی۔ گو دیر کم لگے یہاں سے شریعت کی قدر ہوتی ہے کہ اس نے مجرم کے ساتھ بھی احسان کیا ہے اور اس کی آسانی کی رعایت کی ہے کہ تلوار سے قصاص کا امر کیا ہے۔

شبہ: اس سے دیکھنے والوں کو وحشت ہوتی ہے۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ جس غرض سے قصاص لیا جاتا ہے وحشت اس غرض کی تحصیل میں معین ہے، یعنی زجر و تنبیہ کے اس منظر کو دیکھ کر ہر شخص خائف ہو

جائے اور جرائم پر اقدام کرنے سے رک جائے۔ اور جو صورتیں اہل تمدن نے تجویز کی ہیں ان سے تو دوسروں کو زجر و تنبیہ زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ وحشتناک منظر سامنے نہیں آتا۔ البتہ مجرم کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور یہ سخت بے رحمی ہے۔ جب ایک شخص کو جان سے مارنا ہی ہے تو اس کو راحت دے کر مارنا چاہئے۔ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حکم عام فرمایا ہے: **اذا قتلتم فاحسنوا قتلۃ و اذا ذبحتم فاحسنوا مذبحتہٗ**۔ جس میں قصاص کی بھی تخصیص نہیں بلکہ قتل کفار کو اور ذبح حیوانات کو بھی عام ہے پس شریعت نے ظالموں کی بھی رعایت کی ہے۔ دوسروں کی رعایت قصاص میں یہ ہے کہ **ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب لعلکم تتقون**. کہ قصاص میں لوگوں کو جرائم سے زجر کامل ہوتا ہے۔ (**الفناء المحبوب** ص ۴)

زنا کی اتنی بڑی سزا کیوں؟

اعتراض: (عام کفار کا اعتراض)۔

زنا کی سزا پتھر مار مار کر قتل کرنا کیوں ہے؟

جواب: زنا ایک جرم عظیم اور بہت سے جرائم کا مجموعہ ہے اس لئے اسلام میں اس کی سزا بھی سب سے بڑی رکھی گئی ہے۔

قرآن کریم اور احادیث متواترہ نے چار جرائم کی سزا اور اس کا طریقہ خود متعین کر دیا ہے کسی قاضی یا امیر کی رائے پر نہیں چھوڑا انہیں متعینہ سزاؤں کو اصطلاح شرع میں حدود کہا جاتا ہے ان کے علاوہ باقی جرائم کی سزا کو اس طرح متعین نہیں کیا گیا بلکہ امیر یا قاضی مجرم کی حالت اور جرم کی حیثیت اور ماحول وغیرہ کے مجموعہ پر نظر کر کے جس قدر سزا دینے کو انسداد جرم کے لئے کافی سمجھے وہ سزا دے سکتا ہے ایسی سزاؤں کو شریعت کی اصطلاح میں تعزیرات کہا جاتا ہے۔

حدود شرعیہ چار ہیں۔ (۱) چوری (۲) کسی پاک دامن عورت پر تہمت رکھنا

(۳) شراب پینا، اور (۴) زنا کرنا۔

ان میں سے ہر جرم اپنی جگہ بڑا سخت اور دنیا کے امن و امان کو برباد کرنے والا اور بہت سی خرابیوں کا مجموعہ ہے لیکن ان سب میں بھی زنا کے عواقب اور نتائج جیسے دنیا کے نظام انسانیت کو تباہ و برباد کرنے والے ہیں وہ شاید کسی دوسرے جرم میں نہیں۔

(۱) کسی شخص کی بیٹی، بہن، بیوی پر ہاتھ ڈالنا کس کی ہلاکت کا مرادف ہے۔ شریف انسان کو سارا مال و جائیداد اور اپنا سب کچھ قربان کر دینا اتنا مشکل نہیں جتنا اپنے حرم کی عفت پر ہاتھ ڈالنا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں روزمرہ یہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ جن لوگوں کے حرم پر ہاتھ ڈالا گیا ہے وہ اپنی جان کی پروا کئے بغیر زانی کے قتل وفنا کے درپے ہوتے ہیں اور یہ جوش انتقام نسلوں میں چلتا ہے اور خاندانوں کو تباہ کر دیتا ہے۔

(۲) جس قوم میں زنا عام ہو جائے وہاں کسی کا نسب محفوظ نہیں رہتا۔ ماں بہن بیٹی وغیرہ جن سے نکاح حرام ہے جب یہ رشتے بھی غائب ہو گئے تو اپنی بیٹی اور بہن بھی نکاح میں آسکتی ہے جو زنا سے بھی زیادہ اشد جرم ہے۔

(۳) غور کیا جائے تو دنیا میں جہاں کہیں بدامنی اور فتنہ وفساد ہوتا ہے اس کا بیشتر سبب عورت اور اس سے کم مال ہوتا ہے۔ جو قانون عورت اور دولت کی حفاظت صحیح انداز میں کر سکے ان کو ان کے مقررہ حدود سے باہر نہ نکلنے دے وہ ہی قانون امن عالم کا ضامن ہو سکتا ہے۔ یہ جگہ زنا کے تمام مفاسد اور خرابیاں جمع کرنے اور تفصیل سے بیان کرنے کی نہیں۔ انسانی معاشرہ کے لئے اس کی تباہ کاری کے معلوم ہونے کے لئے اتنا بھی کافی ہے اسی لئے اسلام نے زنا کی سزا کو دوسرے سارے جرائم کی سزاؤں سے اشد قرار دیا ہے وہ سزا آیت مذکورہ میں اس طرح بیان کی گئی ہے:
الزّانية والزّاني فاجلدوا كل واحدٍ منهما مائة جلدة. اس میں عورت زانیہ کا ذکر پہلے اور مرد زانی کا بعد میں لایا گیا ہے سزا دونوں کی ایک ہی ہے عام قیاس

بیان احکام کا یہ ہے کہ اکثر تو صرف مردوں کو مخاطب کر کے حکم دے دیا جاتا ہے عورتیں بھی اس میں ضمناً شامل ہوتی ہیں ان کا علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی سارے قرآن میں یاایھا الذین امنو. کے صیغہ مذکر سے جو احکام بیان کئے گئے ہیں عورتیں بھی اس میں بغیر ذکر شامل قرار دی گئی ہیں۔ شاید حکمت اس کی یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو مستورات رہنے کا حکم دیا ہے ان کے ذکر کو بھی ذکر رجال کے ضمن میں مستور کر کے بیان کیا گیا ہے اور چونکہ اس طرز سے یہ احتمال تھا کہ کسی کو یہ شبہ ہو جائے کہ یہ سب احکام مردوں ہی کے لئے ہیں عورتیں ان سے سبکدوش ہیں اس لئے خاص خاص آیات میں مستقلاً عورتوں کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے۔ اقمن الصلوٰۃ واتین الزکوٰۃ. اور جہاں مرد و عورت دونوں کا ہی ذکر کرنا ہوتا ہے تو ترتیب طبعی یہ ہوتی ہے کہ مرد کا ذکر مقدم عورت کا بعد میں ہوتا ہے۔ چوری کی سزا میں اسی ضابطہ عرفیہ کے مطابق السارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما فرمایا ہے جس میں مرد چور کو مقدم اور عورت کو مؤخر ذکر کیا ہے مگر سزائے زنا میں اول تو عورت کے ذکر کے ضمنی آجانے پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ صراحۃً ذکر مناسب سمجھا گیا دوسرے عورت کا ذکر مرد پر مقدم کر کے بیان کیا گیا۔ اس میں بہت سی حکمتیں ہیں اول تو عورت ضعیف الخلقۃ اور طبعی طور پر قابل رحم سمجھی جاتی ہے اگر اس کا صراحۃً ذکر نہ ہوتا تو کسی کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید عورت اس سزا سے مستثنیٰ ہے۔ اور عورت کا ذکر مقدم اس لئے کیا گیا کہ فعل زنا ایک ایسی بے حیائی ہے جس کا صدور عورت کی طرف سے ہونا انتہائی بیباکی اور بے پروائی سے ہو سکتا ہے کیونکہ قدرت نے اس کے مزاج میں فطری طور پر ایک حیاء اور اپنی عفت کی حفاظت کا جذبہ قویہ ودیعت فرمایا ہے اور اس کی حفاظت کے لئے بڑے سامان جمع فرمائے ہیں اس کی طرف سے اس فعل کا صدور بہ نسبت مرد کے زیادہ اشد ہے بخلاف چور کے کہ مرد کو اللہ تعالیٰ نے کسب اور کمائی کی قوت دی ہے۔ اپنی ضروریات اپنے عمل سے حاصل کرنے کے مواقع اس کے لئے

فراہم کیے ہیں نہ یہ کہ ان کو چھوڑ کر چوری کرنے پر اتر آئے، یہ مرد کے لئے بڑا عار اور عیب ہے۔ عورت کے چونکہ یہ حالات نہیں ہیں اگر اس سے چوری کا صدور ہو جائے تو مرد کی نسبت سے ہلکا اور کم وجہ ہے۔

زانی محصن اور غیر محصن کی سزا میں فرق کی وجہ:

محصن کی حد سنگساری اور غیر محصن کی حد درے لگانا ہے۔

اور محصن وہ ہے جس میں یہ صفات ہوں (۱) آزاد۔ (۲) مسلمان (۳) عاقل (۴) بالغ (۵) اس نے کسی عورت سے صحیح نکاح کیا ہو (۶) اس سے ہمبستر بھی ہو اور وہ عورت بھی انہیں صفات سے موصوف ہو اور رجم (سنگسار کرنے) میں ان شرائط کا ہونا اس لئے مقرر ہوا کہ رجم سزائے شدید ہے اور ان صفات میں نعمت مزید ہے چنانچہ ظاہر ہے تو اتنی نعمتوں کے باوجود جرم کا ارتکاب عقوبت شدیدہ کا موجب ہونا چاہئے۔

دوسرے یہ کہ یہ امور خاص طور پر زنا سے مانع ہیں۔ چنانچہ عقل کا مانع ہونا کون نہیں جانتا اسی طرح بلوغ سے عقل کا کمال ہوتا ہے۔ اسلام خود فواحش سے روکتا ہے۔ آزاد آدمی نکاح صحیح پر اپنے اختیار سے قادر ہے اور نکاح صحیح کے بعد وطی پر قادر ہے اور وطی سے سیری ہو جاتی ہے اور حلال سے سیر ہو جانا حرام سے خود مانع ہے جو مرغوب ہو اور یہ صفات رغبت کی مکمل ہوئیں کیونکہ مجنونہ کی صحبت سے نفرت ظاہر ہے اور نابالغہ کو چونکہ خود رغبت کم ہوتی ہے اس لئے اس کی طرف مرد کو بھی کم رغبت ہوتی ہے اور مملوکہ کی صحبت میں اس لئے بے رغبتی ہوتی ہے کہ اندیشہ اولاد کے غلام ہونے کا ہوتا ہے اور کافر عورت سے بھی بوجہ اختلاف دین کے رغبت کم ہوتی ہے۔ اور جانبین میں ان صفات کے ہونے سے نعمت اور رغبت منکوحہ کامل ہے اور دونوں بالغ قوی ہیں ارتکاب جرم سے پھر بھی ارتکاب کرنا موجب ہوگا عقوبت شدیدہ کا اور وہ رجم ہے اور ان صفات کے نہ ہونے سے موانع اتنے قوی نہیں گو موانع اس وقت

ہیں۔ کیا اسلام اور عقل و بلوغ مانع نہیں ہیں موانع کے ہونے کے سبب تو عقوبت مشروع ہوئی اور ان کے اس درجہ قوی نہ ہونے سے وہ عقوبت خفیف ہوئی اور وہ درے لگنا ہے۔ (ہدایہ ملخصا)

حاصل ان تمام شرائط کا یہ ہے کہ حد شرعی صرف اس صورت میں جاری ہوگی جبکہ شریعت مقدسہ کے مقرر کردہ ضابطہ کے مطابق جرم بھی مکمل ہو۔ اور اس کا ثبوت بھی مکمل اور مکمل بھی ایسا کہ اس کا کوئی پہلو مشتبہ نہ رہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ نے جہاں ان جرائم کی سزائیں بمقتضائے حکمت سخت مقرر کی ہیں۔ وہیں حدود شرعیہ کے نفاذ میں انتہائی احتیاط بھی ملحوظ رکھی ہے۔ حدود کا ضابطہ شہادت بھی عام معاملات کے ضابطہ شہادت سے مختلف اور انتہائی احتیاط پر مبنی ہے۔ اس میں ذرا سی کمی رہ جائے تو حد شرعی تعزیری سزا میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تکمیل جرم کے سلسلہ میں کوئی کمی پائی جائے جب بھی حد شرعی ساقط ہو کر تعزیری سزا رہ جاتی ہے۔ جس کا عملی رخ یہ ہوتا ہے کہ حدود شرعیہ کے نفاذ کی نوبت شاذ و نادر کبھی پیش آتی ہے۔ عام حالات میں حدود والے جرائم میں بھی تعزیری سزائیں جاری کی جاتی ہیں۔ لیکن جب کہیں تکمیل جرم تکمیل ثبوت کے ساتھ جمع ہو جائے گو وہ ایک فی صدی ہی ہو تو سزا نہایت سخت عبرتناک دی جاتی ہے۔ جس کی ہیبت لوگوں کے قلب و دماغ پر مسلط ہو جائے۔ اور اس جرم کے پاس جاتے ہوئے بھی بدن پر لرزہ پڑنے لگے جو ہمیشہ کے لئے انسداد جرائم اور امن عامہ کا ذریعہ بنتی ہے۔

بخلاف مروجہ تعزیری قوانین کے کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں کی نظر میں ایک کھیل ہیں جس کو وہ بڑی خوشی سے کھیلتے ہیں۔ جیل خانہ میں بیٹھے ہوئے بھی آئندہ اس جرم کو خوبصورتی سے کرنے کے پروگرام بناتے رہتے ہیں۔ جن ممالک میں حدود شرعیہ نافذ کی جاتی ہیں ان کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو حقیقت سامنے آجائے گی۔ کہ وہاں نہ آپ کو بہت سے لوگ ہاتھ کٹے ہوئے نظر آئیں گے۔ نہ سالہا سال میں آپ کو

سنگساری کا واقعہ نظر پڑتا ہے۔ مگر ان شرعی سزاؤں کی دھاک قلوب پر ایسی ہے کہ وہاں چوری، ڈاکہ اور بے حیائی کا نام نظر نہیں آتا سعودی عربیہ کے حالات سے عام مسلمان براہ راست واقف ہیں۔ کیونکہ حج و عمرہ کے سلسلہ میں ہر طبقہ و ہر ملک کے لوگوں کی وہاں حاضری رہتی ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ ہر شخص یہ دیکھتا ہے کہ دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ لاکھوں کا سامان ان میں پڑا ہوا ہے اور نہایت اطمینان کے ساتھ نماز ادا کرنے کے بعد آتا ہے۔ اس کو کبھی یہ وسوسہ بھی پیش نہیں آتا کہ اس کی دکان سے کوئی چیز غائب ہوگئی ہوگی۔ پھر یہ ایک دن کی بات نہیں۔ عمریوں ہی گذرتی ہے۔ دنیا کے کسی متمدن اور مہذب ملک میں ایسا کر کے دیکھیے تو ایک دن میں سینکڑوں چوریاں اور ڈاکے پڑ جائیں گے۔

تہذیب انسانی اور حقوق انسانی کے دعویدار عجیب ہیں کہ جرائم پیشہ لوگوں پر تو رحم کھاتے ہیں مگر پورے عالم انسانیت پر رحم نہیں کھاتے جن کی زندگی ان جرائم پیشہ لوگوں نے اجیرن بنا رکھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مجرم پر ترس کھانا پوری انسانیت پر ظلم کرنے کے مترادف اور امن عامہ کو بگاڑنے کا سب سے بڑا سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رب العالمین جو نیکوں، بدوں، اتقیاء، اولیاء اور کفار اور فجار سب کو رزق دیتا ہے، سانپوں، بچھوؤں، شیروں، بھیڑیوں کو رزق دیتا ہے اور جس کی رحمت سب پر وسیع ہے۔ اس نے جب حدود شرعیہ کے احکام قرآن میں نازل فرمائے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:

وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللهِ.

ترجمہ: یعنی اللہ کی حدود جاری کرنے میں ان مجرموں پر ہرگز ترس نہ کھایا جائے۔

اور دوسری طرف قصاص کو عالم انسانی کی حیات قرار دیا: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ.

معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حدود کے خلاف کرنے والے یہ چاہتے ہی نہیں کہ جرائم کا انسداد ہو۔ ورنہ جہاں تک رحمت وشفقت کا معاملہ ہے وہ شریعت اسلام سے زیادہ کون سکھا سکتا ہے۔ جس نے عین میدان جنگ میں اپنے قاتل دشمنوں کا حق پہچانا ہے اور حکم دیا ہے کہ عورت سامنے آجائے تو ہاتھ روک لو، بچہ سامنے آجائے تو ہاتھ روک لو، بوڑھا سامنے آجائے تو ہاتھ روک تو، مذہبی عالم جو تمہارے مقابلہ پر قتال میں شریک نہ ہو اپنے طرز کی عبادت میں مشغول ہو اس کو قتل نہ کرو۔

اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ان اسلامی سزاؤں پر اعتراض کے لئے ان لوگوں کی زبانیں اٹھتی ہیں جن کے ہاتھ ابھی تک ہیروشیما کے لاکھوں بے گناہ، بے قصور انسانوں کے خون سے رنگین ہیں۔ جن کے دل میں شاید کبھی مقاتلہ اور مقابلہ کا تصور بھی نہ آیا ہو۔ ان میں عورتیں بچے، بوڑھے سب ہی داخل ہیں۔ اور جن کی آتش غضب ہیروشیما کے حادثہ سے بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی اور تقریباً ہر ملک میں رخنہ اندازی ان کا شیوہ ہے لاکھوں لوگوں کا قتل کر چکے ہیں کروڑوں کو اپاہج، یتیم اور بیوہ بنا چکے ہیں۔ اور کھربوں ڈالر کی املاک کو آگ لگا چکے ہیں بلکہ روز کسی خطرناک سے خطرناک نئے بم کے بنانے اور تجربہ کرنے میں مشغول ہیں۔ ہم اس کے علاوہ کیا کہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی آنکھوں سے خودغرضی کے پردے ہٹا دے اور دنیا میں امن قائم کرنے کے صحیح اسلامی طریقوں کی طرف ہدایت کرے۔

جنسی بے راہ روی

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

جنسی ملاپ مرد وعورت کا فطری حق ہے اس کو آزادی کے ساتھ فریقین کو استعمال کرنے دینا چاہئے اس میں رکاوٹ ڈالنا ان کے حق پر ظلم کرنا ہے۔

جواب: اس جنسی ملاپ کے بیک گراؤنڈ کی کہانی کچھ اس طرح سے ہے کہ

اس جنسی سیلاب میں عیسائی دنیا میں نیو مارلیٹی کا نظریہ ابھرا تھا۔اس نئے اخلاقی نظریہ کی حمایت عام عیسائی ہی نہیں بلکہ ان کے پادری اور مذہبی پیشوا تک کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ٹائمز میگزین کی رپورٹ ہے۔

''اخلاقیات کا یہ مذہبی نظریہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی وکالت کرنے والوں کا اثر انداز ہونے والا بڑا گروہ موجود ہے۔''

مجھے عیسائی دنیا میں رات دن واقع ہونے والی جنسی بے راہ روی کے واقعات کا احاطہ مقصود نہیں۔ اس کے لئے تو دفتر درکار ہیں۔صرف ایک تھیالوجیکل کالج سے شائع شدہ کتاب کے کچھ ضروری اور مختصر اقتباس پیش کروں گا۔۱۹۶۴ء-۱۹۶۸ء کے درمیان اس کتاب کے پانچ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ جب کہ کتاب نا قابل فروخت فہرست میں شامل ہے۔اس کا نام ہے ''خدائی اخلاقیات پر صاف صاف بولتا ہے۔'' God speaks out on new morality

(۱) کم عمر لڑکوں کا آجکل سویڈین میں یہ حال ہے کہ اپنی دوست لڑکی کو وہ اپنے گھر لاتے ہیں تا کہ وہ رات بھر ان کے ساتھ سوئے۔(صفحہ ۷۹)

(۲) سویڈن میں ایسے واقعات کی حوصلہ شکنی نہیں کی جاتی بلکہ وہاں حکومتی ادارے ہیں جو مانع حمل تدبیریں اور مباشرتی بیماریوں سے بچنے کے طریقے بتاتے ہیں جب کوئی کنواری حاملہ ہو جاتی ہے تو وہاں پبلک ویلفیئر ایجنسیاں ہیں جو اس کی مدد کرتی ہیں۔اگر وہ بچہ چاہتی ہے تو اس کو بشمول زچگی وغیرہ سہولتیں دی جاتی ہیں اگر وہ بچہ نہیں چاہتی تو اس کو قانونی اجازت دلائی جاتی ہے کہ وہ اسقاط حمل کر لے۔(صفحہ ۸۰)

(۳) لندن میں پارک شدہ کاروں میں مباشرت کی کھلی اجازت ہے۔ پولیس کو مداخلت کی اجازت نہیں۔(صفحہ ۸۲)

(۴) لاس اینجلز کے ہائی اسکول میں ۴ لڑکیاں اپنے گریجویشن کورس میں شرکت سے محروم رہیں بوجہ پیشگی حمل۔(صفحہ ۸۲)

(۵) امریکہ کی پبلک ہیلتھ سروس کی اطلاع ہے کہ سالانہ اوسطاً اڑھائی لاکھ ناجائز بچوں کی پیدائش ہوتی ہے۔گذشتہ دس برسوں میں یہ ۶۰ فی صد اضافہ ہے۔(صفحہ ۸۳)

(۶) اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً بیس لاکھ غیر قانونی اسقاط حمل ہر سال ہوتے ہیں۔(صفحہ ۸۳)

(۷) لندن ڈیلی میل میں خبر شائع ہوئی کہ آکسفورڈ کے منتہی طلبہ نے (جن میں دو لڑکیاں بھی تھیں) گذشتہ دن یونیورسٹی حکام کو ایک ''جنسی منشور'' (سیکس چارٹر) پیش کیا۔(صفحہ ۸۶)

(۸) ڈیلی ٹیلیگراف لندن رپورٹ دیتا ہے کہ پیدا ہونے والے چھ بچوں میں ایک حرامی ہوتا ہے۔سرسری طور پر ہر تین میں سے دو بیس سال سے کم عمر لڑکیوں کے حمل شادی سے قبل ہو جاتے ہیں۔(صفحہ ۸۷)

(۹) ۱۹۶۴ء کے موسم گرما میں انٹرنیشنل پلانڈ پیرنٹ فیڈریشن International Planed Parenthood Federation ۔ نے لندن کے چرچ ہاؤس میں کانفرنس کی جس میں چھیالیس قوموں کے نمائندے شریک تھے۔ اجلاس کے شرکاء میں عمومی طور پر شادی سے پہلے جنسی تعلقات میں ہم آہنگی تھی۔حتی کہ کم سن لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان بھی۔(صفحہ ۱۰۱)

اب تو یہ خبریں اسلامی ملکوں کے اخبارات میں عام طور پر شائع ہوتی ہیں اور انگریزی ٹی ویوں پر بالکل ننگے کھلے عام زنا کے مناظر اور ہر طرح سے بے حیائی کے مناظر دیکھائے جاتے ہیں کہ ایسی شیطانی حرکتیں شریف میاں بیوی بھی آپس میں کرنے سے شرماتے ہیں اوران زنا کی بالکل ننگی فلموں کو لوگ اپنے گھروں میں تنہا اور فیملی اور بچوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔اور زنا کے کھلے عام مظاہرے بھی انگریزی ممالک میں عام ہیں زنا کے اڈوں اور کلبوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں بعض ممالک میں ہر گھر زنا کا اڈا بنا ہے بلکہ ناجائز جنسی عمل اب تو اعزاز وافتخار کا

عمل بن کر رہ گیا ہے اور کسی سے اس کا باپ کا نام پوچھنا اس کی توہین ہو گیا ہے۔ اللہ تعالی مسلمانوں کو اس منحوس عمل سے محفوظ رکھے۔

بے راہ روی کی انتہاء

عیسائیوں کی جنسی پیاس، مخالف صنف کو بالکل عریاں کر کے بھی نہ بجھی تو وہ ہم جنس پرستی پر اتر آئے۔ اس کے لئے باقاعدہ تقریبیں منعقد کی جانے لگیں۔ جشن منائے جانے لگے کلب اور گے ہالوں Gay HaL میں مقابلے ہونے لگے۔ ٹائمز میگزین، نیو یارک نے امریکہ میں جنس پرستی پر سات صفحوں کا مضمون شائع کیا ہے اس کے اقتباس درج ذیل ہیں۔

سان فرانسسکو میں ۱۹۶۲ء سے ہر سال ہم جنس پرستوں کی ایک خصوصی تقریب منعقد کی جاتی ہے جو ہر سال بڑھ رہی ہے۔ ایسی ہی تقاریب لاس اینجلز، نیو یارک، ہوسٹن اور سینٹ لوئیس میں ہوتی ہیں صرف ایک شہر سان فرانسسکو میں ستر (۷۰) Gay Bars ہیں۔

ڈبلیوک ڈی لِگ W.D.Lig ایجوکیشنل ڈائریکٹر لاس اینجلز کہتا ہے میں اس وقت تک خوش نہیں ہوں گا جب تک تمام گرجے ہم جنسوں کے رقص کی اجازت نہ دیں اور والدین بالکنی میں بیٹھے ہوئے کہیں نہیں۔ جان اور ہنری! باہم رقص میں اور گرم جوشی دکھاؤ۔

واشنگٹن ڈی سی کی فیڈرل اپیل کورٹ نے ایک کیس کے بارے میں فیصلہ دیا کہ کوئی سرکاری شعبہ کسی ملازم کو اس وقت تک نہیں نکال سکتا جب تک پہلے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس کی ہم جنسی پرستی کی وجہ سے شعبہ کے کام میں واضح مداخلت ہوتی ہے۔

کنسے Kinsiy رپورٹ کے مطابق دس فیصد امریکی مرد زیادہ یا کم مدت سے لواطت باز ہیں۔ مگر چار فی صد ایسے ہیں (جن میں سے ۲ فی صد عورتیں شامل ہیں)

جو زندگی بھر سے ہم جنس پرست ہیں۔

گریٹ نیک نیویارک میں لونڈے بازوں کے لئے ایک فرم کمپیوٹر سروس چلاتی ہے۔

سان فرانسسکو کا Adoins Book Store تقریباً ۳۶۰ مختلف رسائل تقسیم کرتا ہے۔ جن میں شہوت انگیز لٹریچر، ننگی تصاویر، حرام کاری کے طریقے، فحش حرکات اور میڈم سوٹو ووس Soto Voce کے مشورے شامل ہوتے ہیں۔

لواطت کرنے والے چار افراد میں سے ایک تاجر ہے۔ اس کا بیان ہے کہ میں مکمل طور پر گے ورلڈ Gay World میں رہتا ہوں۔ میرا وکیل گے ہے، میرا ڈاکٹر گے ہے، میرا دندان ساز گے ہے، میرا بینکر گے ہے اور جو گے نہیں ہے وہ میرا مکان والا ہے۔

نیدر لینڈ کے بارے میں اطلاعات آ رہی ہیں کہ ڈچ لوگوں نے ایک عجیب و غریب انداز سے سیاحت کو فروغ دینے کی ابتدا کی ہے۔ جن سے یہاں غیر ملکی ہم جنس پرستوں کی تعداد بڑھی رہی ہے وہ یہاں آ کر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ ایمسٹرڈم (ہالینڈ) ہم جنس پرستوں کا اڈا بن گیا ہے بہت سے لائسنس یافتہ ہیں، لواطت بازوں کی باقاعدہ انجمنیں اور لیگیں قائم ہو چکی ہیں۔

یہ تو کچھ عرصہ پہلے کی صورت حال ہے اس وقت عیسائی دنیا جس درجہ بے حیائی اور فحاشی، زنا کاری اور لواطت میں مبتلا ہو چکی ہے۔ شاید ایک فیصد بھی یہ لوگ ان گناہوں سے پاک نہیں ہوں گے۔

فحش فلموں اور ٹی وی پروگراموں میں مادر زاد، ننگی بے حیائی اور زنا کاری کے سینکڑوں چینل حیا سوز، شرمناک، گندی فلمیں، جنسی تعلقات قائم کرتے ہوئے دکھائے جاتے ہیں جن کو مرد عورت، نابالغ بچے بچیاں اور بوڑھے سب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور فیملی کے سب افراد اکٹھے بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔ اور اس کو جدید فیشن سمجھا جاتا ہے۔ نہ اس کی تعلیم بائبل نے دی ہے نہ کسی اور مقدس آسمانی کتاب اور مذہب نے دی ہے۔ یہ بے حیائی کی شرح افراط عیسائیوں کی ہے۔ الحمدللہ مسلمان ممالک

ابھی تک اس گندگی سے بہت حد تک محفوظ ہیں اگر بے حیائی آرہی ہے تو وہ انہی عیسائی کمیونٹیوں کی طرف سے آرہی ہے۔ اللہ تعالی مسلمانوں کو فحاشی کے اس عذاب سے بچا کے رکھے۔ (امداد اللہ انور)

ہم جنس پرستی مذہب کی نظر میں

ہم جنس پرستی کا کریہ اور شرمناک فعل عیسائی مذہبی پیشواؤں کے نزدیک بھی جرم نہیں رہا۔ اسی لئے وہ بڑھ بڑھ کر اس کی شدت سے حمایت کر رہے ہیں۔

کنٹر بری کے آرچ بشپ نے دارالامراء میں کہا کہ برطانیہ کے قانون میں ایسی تبدیلی کی جائے۔ جس کی رو سے باہمی رضا مندی سے بالغوں کے لئے ہم جنس پرستی قانوناً جرم نہ ہو۔ اس نے کہا کہ کسی کو بھی اپنا اخلاقی ضابطہ بنانے اور اس کو ماننے کے حق ہے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ آرچ بشپ مسیحی دنیا کا عظیم پیشوا ہوتا ہے۔

ایک کانگیر شلیٹ منسٹر پادری رابرٹ ڈبلیو وڈ R.W.Wood نے مسیح اور ہم جنس پرست Christ & Homeos sexeul کے عنوان سے کتاب لکھی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک اخبار نے لکھا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر وڈ یہ ثابت کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ ہم جنس پرستی خدا کی اختراع ہے اسی لئے یہ اچھی ہے جیسی خدا کی دوسری مخلوق وہ آگے چل کر کہتا ہے کہ ہم جنس پرستی کا مطلب شہوت و مستی خدا کی نظروں میں سچے ساکرامنٹس کی طرح مقدس ہو سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ایک ہم جنس پرست کامیاب پادری ہو سکتا ہے اور وہ تائید میں حوالہ دیتا ہے کہ پادریوں میں لواطت بازی کی شرح دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ "بگاڑ" آبادی کے اضافہ کے مسئلہ کو حل کریگا۔ اور یہ کہ ہم جنس پرستی کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ خاص شرائط کے تحت یہ ایک "اخلاقی حل" ہے۔

یسوع مسیح کے بعض پیشہ ور پادری کہتے ہیں کہ بائیبل میں کہیں بھی زنا کاری یا

ہم جنس پرستی کی مذمت نہیں ہے۔ (حالانکہ پادریوں کی یہ بات جھوٹ ہے بائبل میں دونوں گناہوں کی مذمت ہے چناچہ بائبل میں تورات کی پانچویں کتاب استثناء ۲۳:۱۷ میں ہے ''اسرائیلی لڑکیوں میں کوئی فاحشہ نہ ہو اور نہ اسرائیلی لڑکوں میں کوئی لوطی ہو تو کسی فاحشہ کی خرچی یا کتے (یعنی لوطی) کی اجرت کسی منت کیلئے خداوند اپنے خدا کے گھر میں نہ لانا کیونکہ یہ دونوں خداوند تیرے خدا کے نزدیک مکروہ ہیں۔)

رومن کیتھولک پادریوں نے ہم جنس پرست جوڑے کی شادی کی اجازت دی ایک اسپیشل میرج (خصوصی شادی) کی مذہبی رسوم ایک چھوٹے رورٹرڈیم چیپل میں ہوئی۔ اس میں باقاعدہ انگوٹھیوں کا تبادلہ ہوا۔ ''نیو یارک پوسٹ'' کی خبر ہے۔'' گذشتہ ہفتے دو مرد ہم جنس پرستوں نے خفیہ شادی کی۔ اس شادی کی رسم ادا کرنے والا بھی ایک رومن کیتھولک پادری تھا۔ رومن کیتھولک پادریوں میں اس قسم کی ایک مضبوط تحریک بھی چل رہی ہے کہ جس طرح مخالف جنسوں کے مابین تعلقات موجود ہیں اسی روشنی میں ہم جنسوں کے تعلقات پر بھی غور کیا جائے.

یہ اخلاق باختہ تہذیب اور یہ بگاڑ والی ثقافت جدید تہذیب کے نام سے ہو یا ترقی کے عنوان سے ہو جہاں جہاں بھی پہنچتی ہے وہاں جنسی اور معاشرتی گندگیوں کا فروغ پانا لازمی امر ہے خواہ جدید لغت میں اس کا کوئی شاندار نام ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔

سولھواں باب

توبہ واستغفار کے متعلق اعتراضات کے جوابات

گناہ معاف کرنا عدل کے خلاف ہے

آیت کا ترجمہ: اور کہو کہ معافی مانگتے ہیں ہم معاف کریں گے تمہارے گناہ اور زیادہ نیکی کرنے والوں کے۔ (آیت ۵۹)

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

بھلا یہ خدا کی ہدایت سب کو گنہگار بنانے والی ہے یا نہیں۔ کیونکہ جب گناہ معاف ہونے کا سہارا آدمی کو ملتا ہے تب گناہوں سے کوئی بھی نہیں ڈرے گا۔ اس واسطے ایسا کہنے والا خدا اور یہ خدا کی بنائی ہوئی کتاب نہیں ہوسکتی۔ وہ عادل ہے۔ بے انصافی کبھی نہیں کرتا اور گناہ معاف کرنے سے تو بے انصاف ہو جاتا ہے۔ مگر جیسا قصور ہو ویسی سزا دینے سے ہی عادل ہوسکتا ہے۔ (از دیانند سرسوتی)

جواب: یہ مسئلہ سوامی جی کا قابل غور ہے۔ اس کو پنڈت جی نے کئی ایک موقعوں پر لکھا ہے جن سب کا مطلب یہی ہے کہ توبہ قبول نہیں ہوتی۔ ہم حسب وعدہ پہلے وید منتر مسلمہ سوامی جی کو بیان کر کے اس کا مدعا سماجیوں سے پوچھتے ہیں۔

منتر مذکور سے پہلے خود پنڈت جی بھومکا میں ایک تمہید لکھتے ہیں وہ بھی قابل غور ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

> ''اس ایشور کی ہدایت کئے ہوئے دھرم کو ماننا ہر انسان پر یکساں فرض ہے اور چونکہ اس کی مدد کے بغیر سچے دھرم کا علم اور پابندی اور تکمیل کامیابی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے ہر انسان کو ایشور سے اس طرح مدد مانگنی چاہیے۔''
>
> ''اے اگنی (پرمیشور) عہد و صداقت کے مالک و محافظ میں سچے دھرم پر چلوں گا۔ یعنی اس کی پابندی کروں گا۔ اے پرمیشور مجھے سچے نیک چلن اور دھرم پر عمل کرنے کی طاقت ہو۔ آپ مجھے ہمت دیجئے کہ میرا یہ سچے

دھرم کا عہد آپ کی عنایت سے پورا ہو۔(عہد یہ ہے) میں آج سے سچے دھرم کی پابندی اور جھوٹ کھوٹے چلن اور ادھرم سے دوری اختیار کرتا ہوں۔" (یجروید ادھیائے ۱، منتر ۵)

اب سوال یہ ہے کہ اس عہد کے مطابق جس کو اسلامی محاورہ میں توبہ کہتے ہیں اس عہد (توبہ) کرنے والے کو کیا فائدہ خدا کے سامنے تو ایسی عاجزی سے اظہار اخلاص کیا اور وہاں سے جواب ملا کہ تیرے پچھلے گناہ تو بدستور ہیں۔ جن کی پاداش میں تو ایک دفعہ پاخانہ کا کرم یا جنگل کا بندر یا بن کا سور بنے گا کیونکہ بغیر اس کے ہمارا عدل اور رحم بگڑتا ہے۔ البتہ آئندہ کو اگر تو نے کچھ نیک کام کیے تو ان کا تجھے عوض ملے گا۔ پر بتایئے ایسے ایشور سے تو معمولی بنئے دکاندر بھی کئی درجے اچھے ہیں یا نہیں؟ جن کے نوکر اگر اخلاص سے توبہ کریں اور آئندہ کو فرمانبرداری اور نیک چلنی کا عہد کریں تو وہ بھی ایک دو دفعہ ان کو بخش ہی دیتے ہیں۔ مگر پرمیشور ایسا دیالو (مہربان) ہے کہ باوجودیکہ اسے بندے کے دل کا حال بھی بخوبی معلوم ہے کہ وہ محض اخلاص سے میرے آگے گڑگڑاتا ہے۔ تاہم اس کے حال پر رحم کر کے اس کے قصور معاف نہیں کرتا۔ سچ پوچھو تو پرمیشور بھی سچا ہے وہ (بقول آریہ سماج) اسی طرح توبہ پر گناہ معاف کرتا جائے تو اس کے ملک اور حکومت میں خلل آتا ہے کیونکہ انہیں بدکاروں کو تو اس نے حیوانی قالبوں میں ڈال ڈال کر دنیا کو آباد رکھنا ہے اگر یہی بٹیریں ہاتھ سے نکل گئیں تو وہ لائے گا کہاں سے؟

زیادہ تعجب تو یہ ہے کہ سوامی جی کے منہ سے بھی کبھی کبھی بلا اختیار سچی بات نکل جاتی ہے گو کسی پیرایہ میں نکلے۔ آپ خود ستیارتھ پرکاش باب ۷ نمبر ۱۳ میں مانتے ہیں کہ عدل اور رحم خداوندی آپس میں متضاد ہیں۔ پس ہم بھی پنڈت جی کی تقریر کی تشریح کرنے کو انہیں اور ان کے چیلوں کو بتلاتے ہیں کہ عدل کے معنی ہیں وضع الشيء في محله. (ہر ایک چیز کو اس کے ٹھکانے پر رکھنا) اور رحم کے معنی ہیں ارادہ

خیر" "یا کسی کی حالت زار پر ترس کھانا۔" یہ صفت پنڈت جی بھی خدا کی نسبت مانتے ہیں۔ (دیکھو ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۳۵، سملاس ۷، نمبر ۱۹)

پس آپ بتلائیے کہ ایک شخص جو دلی اخلاص سے خدا کے آگے بغیر کسی عذاب دیکھنے کے گڑگڑاتا ہے توبہ کرتا ہے تو اس کا عدل (جس کے معنی تھے ہر ایک چیز کو ٹھکانے پر رکھنا) اس توبہ کے لئے بھی کوئی محل تجویز کرے گا اور اس کی گریہ وزاری اور بے دیکھے آہ و بکا کا بھی کوئی محل ہے؟ بندوں کے ہر ایک فعل کے لئے جب کوئی نہ کوئی محل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس فعل (توبہ) کا کوئی محل نہ ہو۔ پس بتلائیے کہ قبول توبہ عین عدل اور رحم دونوں ہے یا نہیں۔ بلکہ توبہ کا قبول نہ ہونا اور گناہوں کا معاف نہ ہونا سراسر ظلم اور خلاف عدل ہے۔ کیونکہ وضع الشیئ فی محله. (چیزوں کا ٹھکانے پر رکھنے) کے خلاف ہے۔ اصل میں سوامی جی کو حقوق العباد (بندوں کے حقوق) اور حقوق اللہ (خدا کے حقوق) میں اشتباہ ہو گیا۔ سوامی کی تقریر سے جو صفحہ ۳۵۰ ستیارتھ پرکاش سملاس (۷) پر ہے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو دونوں میں تمیز نہیں۔ پس ہم اپنے سماجی دوستوں کو بتلاتے ہیں کہ ان میں بہت بڑا فرق ہے اور ہم بھی قسم اول میں قبول توبہ کے قائل نہیں۔ جب تک وہ شخص جس کا کچھ نقصان کیا ہو معاف نہ کرے۔ کیونکہ اس سے انتظام عالم بگڑتا ہے اور قسم ثانی میں قبول توبہ کو مانتے ہیں۔ بشرطیکہ صدق دل اور خاص نیت سے محض خدا کے عذاب اور اپنی سوء عاقبت کے خوف سے توبہ کرے۔ نیز یہ بھی شرط ہے کہ توبہ کرتے وقت آئندہ کا پختہ خیال جی میں اس کام کے نہ کرنے کا کرے۔ سنو!

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ.

ترجمہ: اللہ کے نزدیک توبہ انہی لوگوں کی قبول ہوتی ہے جو غلبہ نفسانی میں پھنس کر برے کام کرتے ہیں پھر جھٹ سے توبہ کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ.

ترجمہ: معافی ان لوگوں کے لئے ہے جو گناہ کر کے خدا کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور (جانتے ہیں کہ) خدا کے سوا کوئی گناہ بخش نہیں سکتا، اور اپنے کیے پر جانتے ہوئے اڑے نہیں رہتے۔

سوامی جی! نے اس پر بھی غور سے کام نہیں لیا کہ جتنی صفات کمال دنیا میں ہیں ان سب کا سرچشمہ صفات خداوندی ہیں۔ مثلاً سخاوت ایک صفت کمال ہے تو دراصل اسی سرچشمہ کا ایک نشان ہے۔ ایسا ہی عدل، رحم، محبت وغیرہ صفات کمال سب کی سب اسی سرچشمہ کے نشان ہیں۔ جس کو اللہ، پرمیشور، گاڈ، خدا وغیرہ کہتے ہیں۔ پس جب ہم دنیا میں بہت سے مقدمات میں مدعیان اور مستغیثان کو معاف کرتے بھی دیکھتے ہیں۔ اور ان کی تعریف کرتے ہیں اور بسا اوقات کہا کرتے ہیں کہ

درعفو لذتے ست کہ درانتقام نیست

تو خدا کی نسبت کونسی دلیل اس صفات کمال کے ماننے سے ہمیں مانع ہے، ہاں سوامی جی کا یہ کہنا کہ توبہ سے گناہوں کی جرات ہوتی ہے۔ عجب حیرت افزاء ہے۔ پنڈت جی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ دنیاوی کاروبار میں جس میں بندوں کو اپنے قصور کی معافی کا علم بھی ہو جاتا ہے۔ معافی سے جراءت اور دلیری نہیں ہوتی۔ تو خدائی معافی میں جس کا علم بھی دنیا میں قطعی طور پر نہیں ہو سکتا۔ کس طرح موجب جراءت ہوگا؟ ہاں ایسے آدمیوں کی توبہ اسلام میں بھی قبول نہیں۔ جو گناہ کرتے ہوئے یہ دلیری رکھیں کہ توبہ سے گناہ معاف کرالیں گے۔ پس ہم فرمان خداوندی سنا کر اس فقرہ کو ختم کرتے ہیں۔ سنو! اور غور سے سنو۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ

رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا.

ترجمہ: (اللہ کی طرف سے) کہہ دیجئے! اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں، بے شک اللہ سب گناہ بخش دے گا، واقعی وہ گناہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی طرف سے جواب

جواب (۱): اور کتابوں کو تو شاید پنڈت جی نہ مانیں، پر چاروں بیدوں کی نسبت تو وہ اقرار تحریری ہمارے خط کے جواب میں کر چکے ہیں کہ ان کا ایک فقرہ بھی غلط نہیں۔

اتھربن بید میں ہے کہ تارک کے ذکر سے جنموں کے گناہ برطرف ہوتے ہیں الخ۔ اگر موافق عدل سزا کا ملنا ضروری تھا تو بے سزا اس (جنموں کے گناہوں کی) برطرفی کی کیا وجہ ہے۔

اگر یہ یادالٰہی کی برکت ہے تو قطع نظر اس سے کہ موافق ارشاد پنڈت صاحب یہ معافی مخالفِ عدل ہے تو توبہ میں بھی خدا ہی کی یادگاری ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پشیمانی کے پیرایہ میں خدا کی یادگاری پر معافی جس قدر قرین قیاس ہے اس قدر اور یادگاریوں پر یہ معافی قرین قیاس نہیں۔

استدلال مذکور میں تو ذکر تارک اور توبہ میں ایک قدر مشترک (یعنی یادِ خداوندی) پر استدلال کی بناء تھی کہ یاد خدا پر جو نتیجہ وہاں مرتب ہونا مسلم ہے وہ یہاں یعنی توبہ میں بھی ماننا پڑے گا۔ اب آگے صراحت کے ساتھ توبہ پر معافی کا ثبوت "مہابھارت" سے پیش کرتے ہیں۔ اگر پنڈت جی اس کتاب کو نہیں مانتے نہ مانیں مگر ہنود کا بہت بڑا طبقہ تو اس کو معتبر مانتا ہی ہے، فرماتے ہیں:

علاوہ بریں خود توبہ ہی سے معافی کی سند لیجئے۔

مہابھارت بھی معتبر کتاب ہے اس میں ہے:

''اگر کسے مرتکبِ گناہے شدہ باز پشیمان گردوزود تدارکِ آں نماید از گناہ خلاصی یابد۔''

یعنی اگر کوئی گناہ کا مرتکب ہو کر پھر پچھتائے اور جلد اس کا تدارک کرے تو گناہ سے نجات پالے گا۔

اب فرمایئے پشیمانی توبہ نہیں تو اور کیا ہے توبہ میں بھی پشیمانی ہی تو ہوتی ہے۔

اب آگے بطور دفع دخل مقدر اس شبہ کا جواب دیتے ہیں کہ گناہ میں حق اللہ فوت ہوتا ہے۔ یہ ایک مستوجب عذاب ''فعل'' ہے۔ اور توبہ ایک ''قول'' ہے اور فعل اور قول متحد الجنس نہیں ہیں کہ ایک دوسرے کی تلافی کرسکیں۔ اس لئے قول سے اس فعل کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے توبہ سے فعل گناہ کا تدراک نہیں ہوسکتا۔

علاوہ بریں متحد الجنس یعنی ہم جنس اشیاء کی تساوی ترازو اور پیمانہ وغیرہ کے وسیلہ معلوم ہوسکتی ہے۔ پر مختلف الاجناس اشیاء کی تساوی بجز مساواتِ قیمت ونرخ اور کسی طرح متصور نہیں۔ سو حق اللہ اور توبہ میں اگر اختلافِ جنس ہے تو حق اللہ اور ذکر تارک بھی (جس کا ذکر اتھربن بید کے حوالہ سے اوپر گذر چکا) متحد الجنس نہیں۔ اگر حق اللہ اور ذکر تارک کا موازنہ باعتبار نرخ ہے تو حق اللہ اور توبہ کے نرخ کا برابر نہ ہونا پنڈت جی کو کاہے سے معلوم ہوگیا؟

اور اگر خدا نے برضائے خود بے لحاظ نرخ ثواب ذکر تارک کو اپنے حق کے عوض میں قبول کرلیا تو یہاں کون روکنے والا ہے۔

جواب (۲): دوسروں کے حق کا نہ دینا، یا حاکم ہو کر اہل حق کا حق نہ دلوانا تو بیشک ظلم ہے۔ پر اپنے حق کا چھوڑ دینا سوائے پنڈت جی کے اور کسی کے نزدیک ظلم نہیں ہوسکتا۔ اس اعتراض کے پیرایہ میں (درحقیقت) وہ یہی کہتے ہیں کہ اپنے

حق کا چھوڑ دینا بھی ظلم ہے۔

اگر عدل اس کو کہتے ہیں کہ صاحب حق خواہ مخواہ اپنا حق لیا کرے تو یوں کہو کہ پنڈت جی کے نزدیک ''کرم'' بڑا ہی ظلم ہے۔ کون نہیں جانتا کہ درگذر اور چشم پوشی اور اپنے حقوق سے دست برداری عمدہ اقسام کرم و الطاف میں سے ہے۔

توبہ اور استغفار کے حکم اور اسرار

اس علیم و حکیم نے انسان کو خطا اور نسیان سے مرکب پیدا فرمایا ہے۔ لغزش اور تقصیر کو اس کی فطرت اور خمیر میں رکھا ہے۔ پس اگر انسانی لغزشوں اور خطاؤں کے بغیر جزاء اور سزا میں خدا کی طرف سے معافی ناممکن ہو تو پھر نجات کی کوئی سبیل نہیں۔ اس صورت میں نجات ایک لفظ بے معنی رہ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس علیم و حکیم نے انسان کو سراپا تقصیر اس لئے بنایا۔

(۱) تاکہ خدا کی ذات ستودہ صفات کا بے عیب ہونا اس کو منکشف ہو جائے اور یہ سمجھ لے کہ میں سرتاپا عیب ہوں اور وہ قدوس و سلام تمام عیبوں سے پاک اور منزہ ہے۔

(۲) اور تاکہ اس علیم و قدیر کی کمال قدرت اور کمال تصرف کا علم ہو کہ وہ مصرف القلوب کس طرح ہمارے ظاہر اور باطن میں متصرف ہے۔ اور کس طرح ہمارے دلوں کو کبھی طاعت کی طرف پھیرتا ہے اور کبھی معصیت کی طرف کبھی نیکی کی جانب اور کبھی بدی کی جانب۔

(۳) اور تاکہ بندہ کو اپنا مجبور و مقہور ہونا معلوم ہو جائے اور یہ اس پر منکشف ہو جائے کہ بغیر حق جل و علا کی عصمت و اعانت اور بغیر اس کی توفیق کے کوئی طاعت اور نیکی نہیں ہو سکتی۔ جب وہ اپنی اعانت اور توفیق روک لیتا ہے اسی وقت بندہ سے خطائیں اور لغزشیں شروع ہو جاتی ہیں **ولا حول ولا قوۃ الا باللہ**۔

(۴) اور تاکہ اس کی ستاری اور پردہ پوشی کا کچھ اندازہ کر سکے کہ وہ علیم و خبیر کہ جس

کی بے چون وچگون نگاہ سے قلب اور سینہ کا کوئی حال مخفی نہیں وہ میری خطائیں دیکھ رہا ہے مگر پھر بھی پردہ پوشی کر رہا ہے لوگوں میں مجھ کو رسوا نہیں کیا۔

(۵) اور تا کہ اس علیم وحکیم کے حلم وبردباری کا علم ہو کہ اس نے اپنے حلم وکرم سے میری خطا پر فوراً کوئی گرفت نہیں کی اگر چاہتا تو فوراً زمین میں دھنسا دیتا یا اور کسی عذاب سے ہلاک کر ڈالتا مگر وہ حلیم وکریم ہے مواخذہ میں جلدی نہیں فرماتا بلکہ مہلت دیتا ہے شاید بندہ پھر اس کی طرف رجوع کرے۔

دو کونش یکے قطرہ در بحر علم
گنہ بیند و پردہ پوشد بحلم

اگر برجفا پیشہ بشت افتے
کہ از دست قہرش اماں یافتے

پس پردہ بیند علمہائے بد
ہمو پردہ پوشد بالائے خود

بعض خدا کے بندے خطا اور لغزش کے بعد تھوڑی دیر کے لئے اپنی خطا اور لغزش سے تو غافل ہو جاتے ہیں مگر اس حق جل شانہ کی کریمی اور ستاری حلیمی اور بردباری کے مشاہدہ اور مراقبہ میں مستغرق ہو جاتے ہیں جس کا ثمرہ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ندامت اور حجالت، پشیمانی اور شرمساری میں اور غرق ہو جاتے ہیں اور ہر رگ وپے میں حق جل شانہ کی محبت کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں کہ ہم تو روسیاہ اور نابکار ہیں اور وہ حلیم اور ستار ہے۔

گنہ بیند و پردہ پوشد بحلم

گناہ دیکھ رہا ہے اور اپنے علم سے پردہ پوشی کر رہا ہے۔

(۶) اور تا کہ بندہ تذلل اور تمسکن خشوع اور خضوع، عجز وانکسار، احتیاج اور افتقار کے کل مدارج ومراحل طے کر کے مولائے برحق کا کامل بندہ بن سکے اور نفس امارہ

فرعونیت کے مادہ سے بالکل پاک اور صاف ہو جائے۔

نفس حقیقت میں شیطان کا عینی اور جڑواں بھائی ہے اس کے مزاج میں بھی وہی علو اور استکبار ہے جو ابلیس کے مزاج میں ہے جب موقع ملتا ہے فرعون کی طرح انا الحق کہہ کر خدائی کا مدعی بن جاتا ہے اور علی الاعلان اس دعویٰ کی نشر واشاعت کرتا ہے اور جب مجبور ہو جاتا ہے تو دعویٰ خدائی کو مخفی اور مضمر رکھتا ہے۔

نفس اژدہاست کے مردہ است
وازغم بے آلتی افسردہ است

اسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے جہاد نفس کو جہاد اکبر فرمایا ہے۔ اس لئے کہ یہ اندرونی اور قریبی دشمن ہے کفار اور مشرکین تو بیرونی دشمن ہیں اور ظاہر ہے کہ اندرونی دشمن کا استیصال زیادہ اہم اور مشکل ہے۔

وقال تعالی: "یا ایها الذین امنو قاتلوا الذین یلونکم من الکفار". (التوبة)

ترجمہ: اے ایمان والو! قریب کے کافروں سے قتال کرو۔

اس لئے نبی اکرم ﷺ نے قریبی کافر اور اندرونی دشمن یعنی نفس کے جہاد کو جہاد اکبر فرمایا۔ اسی وجہ سے آپ نفس کے شر سے پناہ مانگنے کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔ ہر خطبہ میں **نعوذ باللہ من شرور انفسنا** ضرور فرماتے یعنی ہم اللہ کی اعانت اور امداد کے ذریعہ اپنے نفوس کی برائیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

"اللهم لا تکلنی الی نفسی طرفة عین"

ترجمہ: اے اللہ! ایک لمحہ کے لئے بھی مجھ کو میرے نفس کے حوالہ اور سپرد نہ فرما۔

یعنی اگر نفس کے حوالہ ہو گیا تو سوائے ہلاکت کے اور کیا انجام ہوگا۔

عبودیت کا تذلل ہی نفس کو فرعونیت کے شائبہ سے پاک کرسکتا ہے۔ تذلل کے مراتب کہ جن کے بغیر نفس کا تزکیہ نہیں ہوسکتا حسب ذیل ہیں:

پہلا مرتبہ

ذلت احتیاج: یہ ذلت تمام مخلوق میں مشترک ہے اس لئے سبع سمٰوات اور سبع ارضین اور کائنات کا ہر ہر ذرہ اس کا محتاج ہے اور وہ غنی حمید سب سے مستغنی اور بے نیاز ہے اس لحاظ سے ساری مخلوق اس کبیر متعال اور عزیز ذوالجلال کے سامنے ذلیل اور حقیر ہے۔

دوسرا مرتبہ

ذلت اطاعت: یہ اختیاری تذلل ہے جو مطیعین کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے کہ ہر مطیع اپنے مطاع کے سامنے اور عابد اپنے معبود کے سامنے ذلیل اور پست ہے۔ عبادت نام ہی اس کا ہے کہ کسی کو عظیم و جلیل سمجھ کر اس کے سامنے تذلل اور تمسکن خشوع اور خضوع کو اختیار کیا جائے۔

تیسرا مرتبہ

ذلت محبت: یہ ذلت محبین اور مخلصین، عشاق کے ساتھ مخصوص ہے۔ محبت کی اساس اور بنا ہی ذلت پر ہے۔ ہر محب اپنے محبوب کے سامنے ذلیل و خوار ہے۔

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن دل

بدست دگرے دادن و حیراں بودن

اَذِلُّ لِمَن اھوی لا کسب عزۃ

وکم عزۃ قد نالھا المرء بالذل

اپنے محبوب کے سامنے ذلیل ہوتا ہوں تا کہ عزت حاصل کروں اور بہت سی عزتیں ذلت ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔

اذا کان من تھوی عزیزاً ولم تکن

ذلیلًا له فاقرء السلام علی الوصول

اگر تیرا محبوب عزیز ہو اور تو اس کے سامنے ذلیل ہو تو پھر وصل پر بھی سلام پڑھنا۔

جواب (۴): ذلت خطاء و تقصیر: یہ ذلت گنہگاروں کے ساتھ مخصوص ہے حق جل شانہ کی معصیت اور نافرمانی کے بعد انسان اپنے اندر ایک خاص ذلت اور خواری کو محسوس کرتا ہے۔ جب انسان میں یہ ساری ذلتیں جمع ہو جائیں اپنے کو محتاج اور فقیر مطلق اور حق تعالیٰ شانہ کو بے نیاز اور غنی مطلق اپنے کو بندہ اور اس کو معبود اپنے کو محب اور اس کو محبوب اپنے کو روسیاہ اور خطا کار، گنہگار اور نابکار اور اس کو غفار و ستار سمجھنے لگے تب عبودیت کا خلعت اس کو عطا ہوتا ہے کہ جس سے بڑھ کر اور کوئی خلعت نہیں۔

لا تدعنی الا بیا عبدھا

فانہ اشرف اسمائی

مجھ کو مت پکارا کرو مگر اس کا عبد اور غلام کہہ کر اس لئے کہ یہی نام میرا سب سے بہتر ہے۔

اگر یک بار گوید بندۂ من

از عرش بگذرد خندۂ من

داغ غلامیت کرد پایۂ خرد بلند

میر ولایت شود بندہ کہ سلطان خرید

(۷) اور تا کہ ذنب اور معصیت میں ہونے سے نفس میں کثرت عبادت کی وجہ سے جو عجب (خود پسندی) پیدا ہو گیا ہے اس کا ازالہ ہو جائے جب نفس میں اپنی عبادت کی وجہ سے اعجاب اور خود پسندی کا مرض پیدا ہو جائے تو ایسی حالت میں ذنب اور

معصیت میں مبتلا ہونا ہزار طاعتوں سے زائد نافع اور مفید ہوتا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ بعض مرتبہ صحت اور عافیت اتنی مفید اور کار آمد نہیں ہوتی جتنا کہ مرض مفید اور کار آمد ہوتا ہے۔ اس لے کہ مرض کے آتے ہی طبیعت علاج کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور طبیعت کی رائے سے تنقیہ اور مسہل لیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فاسد مادہ خارج ہو کر طبیعت پہلے سے زائد صاف ہو جاتی ہے اور اس کے بعد لطیف غذاؤں کے استعمال سے پہلے سے زائد قوی ہو جاتا ہے۔

اسی طرح گناہ میں مبتلا ہو کر بارگاہ خداوندی میں تضرع اور ابتہال گریہ اور زاری کرنا عجب اور خود پسندی کے مادۂ فاسدہ کا بالکل استیصال کر دیتا ہے اور پہلے سے زائد بہتر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک اثر الٰہی میں ہے۔

انین المذنبین احب الی من تسبیح المذنبین.

یعنی گنہگاروں کی اوں اوں، دوزخیوں کی تسبیح سے میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے۔

(۸) اور تا کہ اس کی شان عفو اور مغفرت کا اظہار ہو اس لئے کہ اس کے اسماء حسنٰی میں **غفور رحیم** اور **عفو کریم** اور **تواب حکیم** بھی ہے اس لئے ضروری ہے کہ دیگر اسماء حسنٰی کی طرح ان اسماء حسنٰی کے آثار بھی اس عالم میں ظاہر ہوں۔ اس محی اور ممیت نے شان احیاء اور اماتت کے ظاہر کرنے کے لئے موت اور حیات کو پیدا فرمایا۔ تا کہ ان کے گناہوں کی مغفرت اور ان کی خطاؤں کو معاف فرمائے اگر گنہگار نہ ہوں تو پھر مغفرت کس کی ہو اور توبہ اور معذرت کس کی قبول ہو۔

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے:

لو لم تذنبوا لذهب الله بكم ولجاء بقوم يذنبون و يستغفرون الله فيغفر لهم. (مسلم التوبہ ب ۲ حدیث نمبر ۱۱، مسند احمد ۲/ ۳۰۹)

ترجمہ: اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالی تم کو فنا کر دیتا اور تمہارے بدلہ میں ایسی قوم لاتا کہ جو گناہ کر کے اللہ سے استغفار کرتی اور اللہ تعالی ان کی مغفرت فرماتا۔

(۹) اور تا کہ بندہ ذنب اور معصیت میں مبتلا ہو کر بارگاہ خداوندی میں تضرع اور زاری، عجز اور انکساری کے ساتھ رجوع کرے تو حق جل شانہ کی طرف سے اس کو محبوبیت کا خلعت عطاء ہو حبیب اللہ کے لقب سے سرفراز ہو۔

جیسا کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں:

ان للہ یحب التوابین ویحب المتطھرین." (سورۃ البقرۃ)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

بارگاہ خداوندی میں کوئی قربت اور کوئی طاعت اس قدر پسندیدہ اور محبوب نہیں، جس قدر کہ توبہ اور استغفار عجز اور انکسار، استدعا اور سوال، تضرع اور ابتہال اس کو پسندیدہ اور محبوب ہے۔ اس لئے حق جل شانہ نے تمام کائنات اور تمام مخلوقات میں انسان کو اپنا محبوب بنایا ہے تمام مخلوقات پر اس کو شرف اور فضیلت عطاء کی تمام کائنات کو اس کے لئے پیدا کیا اور اس کو اپنے لئے پیدا کیا۔ خود دست قدرت سے اس کو بنایا اور اپنی طرف سے خاص روح اس میں پھونکی مسجود ملائک بنایا۔ زمین کو اس کے لئے فرش اور آسمان کو چھت بنایا قسم قسم کے لذائذ وطیبات فواکہ وہ ثمرات زمین سے اس کے لئے اُگائے، ملائکہ اللہ کو ان کی حفاظت کیلئے مقرر کیا کہ سوتے جاگتے سفر اور حضر میں ان کی حفاظت کریں کہ جنات اور شیاطین ان کو اچک نہ لیں۔ علم اور معرفت، خلافت اور امامت، نبوت اور رسالت محبت اور خلت سے اس کو سرفراز کیا۔ ان کے دشمن اور حاسد ابلیس لعین کو مقام قرب سے نکالا اور بتلا دیا کہ یہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس سے موالات اور دوستی نہ کرنا اور اس کے بہکائے میں نہ آنا اور یہ بھی بتلا دیا کہ ہم

اکرم الاکرمین اور ارحم الراحمین اور اجود الاجودین ہیں یعنی سب سے زائد کرم کرنے والے سب سے زائد رحم کرنے والے سب سے زائد جود و انعام کرنے والے ہیں ہماری رحمت ہمارے غضب پر ہمارا حلم ہماری عقوبت پر ہمارا عفو ہمارے مواخذہ پر سابق اور مقدم ہے۔ ہمارے نزدیک عفو انتقام سے، رحمت عقوبت سے، فضل عدل سے کہیں زائد محبوب اور پسندیدہ ہے۔ تمام خیر ہمارے قبضہ میں ہے رحمت کے بے شمار خزائن ہمارے ہاتھ میں ہیں اگر تمام آسمان اور زمین والے، اولین اور آخرین، جن اور انس، خشک اور تر سب مل کر ہم سے وقت واحد میں سوال کریں اور ہم اپنے ایک ادنیٰ اشارہ سے سب کی حاجتیں ان کے وہم وگمان سے زائد پوری کردیں تو ہمارے خزائن رحمت میں ایک ذرہ برابر بھی کمی نہ ہوگی۔

ہم جواد مطلق ہیں ہم باوجود غنائے مطلق اور بے نیازی کے جود اور احسان، انعام و اکرام سے اس قدر مسرور اور خوش ہوتے ہیں کہ تم باجود فقیر مطلق ہونے کے خدا کی نعمتوں کو لے کر اس کا عشر عشیر بھی مسرور اور خوش نہیں ہوتے۔

ایک شاعر اپنے بادشاہ کی مدح میں کہتا ہے:

کانّ کل سوال فی مسامعہ

قمیص یوسف فی اجفان یعقوب

سائلین کا سوال بادشاہ کے کانوں کو اس قدر خوشگوار معلوم ہوتا ہے جیسا کہ یوسف علیہ السلام کا کرتہ یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر۔

اذا سالوا شکرتھم علیہ

وان سکتوا سالتھم اسئولا

اگر لوگ تجھ سے سوال کرتے ہیں تو سائلین کا ممنون اور مشکور ہوتا ہے اور اگر خاموش رہتے ہیں اور تجھ سے سوال نہیں کرتے تو ان سے سوال کا سوال کرتا ہے یعنی تو ان سے یہ درخواست اور سوال کرتا ہے کہ آؤ میں جواد اور کریم ہوں مجھ سے سوال کرو اور مانگو۔

دیکھا مخلوق کو انعام اور احسان کس درجہ لذیذ اور خوشگوار ہے تو اس سے کچھ اندازہ لگاؤ کہ ارحم الراحمین اور اجود الاجودین کو انعام و احسان کس درجہ محبوب اور پسندیدہ ہوگا فقراء اور مساکین انعام لے کر اس قدر خوش نہیں ہوتے جتنا کہ سخی اور کریم لوگ انعام دے کر مسرور ہوتے ہیں۔ مساکین اس کریم کی دی ہوئی نعمت کی مسرت اور خوشی میں مشغول ہیں ان کو معلوم نہیں کہ منعم اور محسن کا قلب کس قدر فرحت اور مسرت سے لبریز ہے بندہ جب اپنے ہم جنس کی فرحت اور مسرت کا کما حقہ اندازہ نہیں کر سکتا تو اس اجود الاجودین اور اکرم الاکرمین کے جود و کرم کے بے چون وچگون مسرت کا کہاں اندازہ کر سکتا ہے۔

چنانچہ انجیل لوقا باب ۱۵، ورس ۲۳، میں حضرت مسیح علیہ السلام سے کھوئے ہوئے بیٹے کی تمثیل ذکر کی گئی ہے۔

کہ ایک باپ کے دو بیٹے تھے ایک فرمانبردار اور دوسرا نافرمان۔

چند روز بعد وہ نافرمان بیٹا نادم ہو کر باپ کے پاس واپس اپنے قصور کا اقرار کرنے کے لئے آ ہی رہا تھا کہ باپ کو ترس آیا۔

اور دوڑ کر اس کو گلے لگالیا اور بوسے لئے اور اس کے لئے عمدہ لباس اور نیا جوتہ اور نئی انگوٹھی تیار کرائی اور خوشی میں ایک پلا ہوا بچھڑا ذبح کیا اور احباب کی دعوت کی اور کہا کہ آؤ ہم سب کھا کر خوشی منائیں کیونکہ یہ میرا بیٹا مردہ تھا اب زندہ ہوا۔ کھویا ہوا تھا اب ملا ہے۔

بتیسویں ورس تک اس تمثیل کا ذکر ہے۔

اسی طرح خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص اونٹنی پر سوار تھا۔ اسی پر اس کا ناشتہ اور پانی تھا ایک لق و دق میدان میں ایک درخت کے نیچے اترا۔ وہاں آرام کیا سو کر جو اٹھا تو دیکھا کہ اونٹنی ندارد ہے سخت حیران اور پریشان ہوا۔ بہت تلاش کیا کہیں نام و نشان نہ ملا جب بالکل ناامید ہو گیا اور سمجھ لیا

کہ اب زندگی محال ہے یکایک دیکھتا کیا ہے کہ اونٹنی چلی آرہی ہے اور ناشتہ اور پانی سب اسی طرح موجود ہیں اس حالت میں جو گم شدہ اونٹنی ملنے کی اس کو مسرت اور فرحت ہوتی ہے حق جل شانہ کو جب اس کا گم شدہ بندہ تائب ہو کر واپس آتا ہے اس سے لاکھ درجہ بڑھ کر مسرت اور خوشی ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ انسان کی جو شان ہے وہ کسی مخلوق کی نہیں انسان، رب العالمین کا محبوب ہے اس پر خدا کا جو فضل و کرم مبذول ہوا وہ کسی مخلوق پر نہیں ہوا۔ ماں اپنے بچے پر وہ رحم نہیں کر سکتی جو اس ارحم الراحمین نے اپنے بندوں پر فرمایا۔ اس پر بھی اگر بندہ اپنے مولا اور منعم سے سرتابی کرے اور اس کو چھوڑ کر اس کے دشمن یعنی شیطان سے موالات اور دوستی شروع کر دے تو کیا اس ارحم الراحمین کو شاق نہ گذرے گا۔

مادر مہربان

جس ماں نے بچے کو ہزار ناز و نعمت میں پرورش کیا ہو اگر وہ بچہ ماں کی اطاعت نہ کرے تو ماں اس کو گھر سے نکال کر دروازہ بند کر لیتی ہے لیکن اگر وہ بچہ یہ سمجھ کر کہ میں نے غلطی کی۔ مادر مہربان سے زائد میرے لئے کوئی شفقت اور مہربانی کرنے والا نہیں۔ یہ سمجھ کر نہایت ندامت اور شرمساری کے ساتھ واپس ہوا۔ اور دروازہ کی چوکھٹ پر سر رکھ کر نہایت ندامت کے ساتھ اپنے قصور کی معذرت کرنے لگا۔ اور یہ کہنے لگا کہ اے ماں تجھ سے زائد میرا کوئی شفیق اور مربی نہیں مجھ سے قصور ہوا آئندہ سے ایسا نہ ہوگا اس وقت ماں کی مسرت اور خوشی کا حال نہ پوچھو کہ اس کا بھاگا ہوا لخت جگر اور نور بصر پھر واپس آ گیا۔ فرط مسرت اور جوش محبت میں بچے کو سینہ سے چمٹا لیتی ہے۔ اور یہ کہتی ہے کہ اے میرے نادان بچے تو کہاں چلا گیا تھا۔ میرے سوا تیرا کہاں ٹھکانہ تھا۔ مجھ سے زائد تیرا کون شفیق اور مہربان اور خیر خواہ اور ہمدرد تھا۔

اسی طرح جب خدا کا بھاگا ہوا بندہ اور اس کا حبیب مخصوص اس کے جود و کرم اور

اس کے بے شمار آلاء ونعم کو یاد کر کے پھر واپس آتا ہے اور خدا کے در پر سر رکھ کر نہایت تضرع اور زاری اور عجز اور انکساری، ندامت اور شرمساری سے اپنے قصور کی معافی چاہتا ہے اور یہ عرض کرتا ہے کہ اے میرے پروردگار تیرے سوا میرا کوئی ماویٰ و ملجا نہیں، تیرے سوا میرا کوئی سہارا اور پناہ نہیں۔تو ارحم الرحمین اور تواب ورحیم اور جواد کریم ہے۔ہم تیرے فضل کے محتاج ہیں۔(علم الکلام)

سترہواں باب
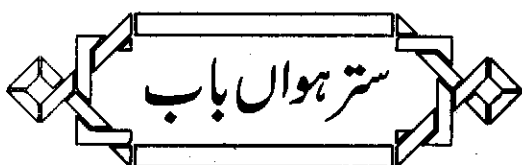
قبر
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

کیا مرنے کے بعد روح بھی ختم ہو جاتی ہے

روح کو ایک گروہ عقلا صرف یہی کہتا ہے کہ وہ خون کی لطیف بھاپ ہے جس کے زور سے ذی روح کی کل چل رہی ہے جب وہ نہیں تو سب کام بگڑ جاتا ہے اس ذی روح کے مرنے کے بعد پھر کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ یورپ کے دہری اور مادی لوگ اسی کے قائل ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد ان پر نہ کوئی ثواب ہے نہ عذاب ہے کیوں کہ وہ باقی تو رہی نہیں۔

اگرچہ یہ خیال محض مغالطہ ہے جس کی غلطی کا اب یورپ کے حکماء پر بھی انکشاف ہوتا چلا ہے کیوں کہ ایک جماعت حکماء قائل ہوگئی ہے کہ مرنے کے بعد روح ایک نورانی پیکر میں جو جسم اول سے مناسبت رکھتا ہے قائم رہتی ہے۔ ہم کو پہلی باتیں سب یاد رہتی ہیں وہ رنج و راحت بھی پاتی ہے۔ حکماء یونان کا بھی یہی خیال ہے اور اکثر اہل ادیان بھی اسی کے قائل ہیں۔ جزئیات احوال روح میں۔ البتہ بڑا اختلاف ہے ہنود کا ایک گروہ اس کو قدیم ذاتی کہتا ہے اسی طرح اس کے بقاء کی بابت بھی کلام ہے بعض ابدی ذاتی کہتے ہیں آریہ وغیرہ بعض زمانہ دراز تک بقا مانتے ہیں۔ ہنود یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک بدن کو چھوڑ کر جزا اور سزا بھگتنے کے لئے دوسرے جسم میں آتی ہے اور اس عالم عنری کے میدان میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے ان کے نزدیک گویا یہی عالم قدس ہے۔ اسلام نے قرآن و احادیث میں روح کے متعلق دوسرے عالم میں ثواب و عذاب کی بہت تصریح فرمائی اور اصل حالات سے آگاہ کیا ہے۔

(تفسیر حقانی ۱۷۴/۳)

موت زوالِ حیات کا نام ہے پھر پیدا کرنے کا کیا معنی

اعتراض: ایک بات قابل بحث یہ باقی ہے کہ موت زوال حیات کا نام

ہے۔پھراس کے پیدا کرنے کے کیا معنی؟

جواب(۱): موت وحیات میں مقابلہ ہے تقابل عدم وملکہ کا۔کس لئے کہ موت اس کے حس وحرکات کا زوال ہے کہ جس میں اس حس وادراک کی صلاحیت ہو اس لئے لکڑی پتھر کو مردہ یا زندہ نہیں کہتے۔اور عدم ملکہ محض نہیں بلکہ اس میں وجود کا شائبہ ہے اس لئے اس کا مخلوق ہونا بعید از قیاس نہیں۔

جواب(۲): بعض روایات سے ثابت ہے کہ عالم مثالی میں موت وحیات وجودی چیزیں ہیں موت کو اس عالم میں ابلق مینڈھے سے مشابہت ہے اور حیات کو ابلق گھوڑے سے اس لئے ان پر خلق کا لفظ استعمال کرنا درست ہے۔لیکن بعض علماء نے خلق کو بمعنی جعل قرار دیا کہ موت اور زندگی بنائی۔(تفسیر حقانی ۵/۵،۶)

جلانے سے دفنانا بہتر ہے

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

ہنود کہتے ہیں کہ دفنانے سے جلانا بہتر ہے، اول یوں کہ آگ پاک کردیتی ہے اور زمین کو ناپاک کرنا وہاں مردے کو سڑانا بے جا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ آگ پاک نہیں کرتی بلکہ فنا کرتی ہے اور جلانے میں مردے کی لاش کی بڑی بے حرمتی ہے۔ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں دور دور بدبو پھیلتی ہے اور پھر راکھ پاؤں میں روندی جاتی ہے اڑتی پھرتی ہے ناپاک چیزوں پر بھی اڑ کر جاتی ہے اور پھر مردے کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا نہ دوستوں عزیزوں کا اس کی یادگار دیکھنے اور عبرت حاصل کرنے کا موقع رہتا ہے نہ محبوں کو قبر دیکھ کر دل ٹھنڈا کرنے کی جگہ رہتی ہے۔ اور اسی لئے قبر میں دفنائی ہوئی میت کو اپنی لاش سے ایک روحانی تعلق باقی رہتا ہے اور یہی سبب ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام واولیاء کرام کی قبروں سے برکات وفیوض مشاہدہ ہوتے ہیں برخلاف جلا دینے کے کہ جسم سے بالکل تعلق منقطع ہو جاتا ہے اور

دھوئیں اور آگ سے ارواح کو آمیزش ہو کر شیاطین و جنات سے مشابہت ہو جاتی ہے دفنانے میں اور بھی مصالح ہیں۔

(اول) یہ کہ انسان کا مادہ خاک ہے تو اسکو اس کی اصل خاک ہی کی طرف پھیر لانا چاہئے جیسا کہ فرمایا **منھا خلقنکم وفیھا نعیدکم ومنھا نخرجکم تارة اخرىٰ**۔ یہ آگ سے نہیں بنا تھا کہ اس کو آگ کے حوالے کیا جاتا ہے۔

(دوئم) اس دفنانے میں انسان کے فطرتی سفر اور اس کے منازل اور ان کی مشابہت کو باقی اور برقرار رکھنا ہے۔ برخلاف جلا دینے کے۔ کیونکہ ماں کا پیٹ اس کی ایک منزل تھی جس کے بعد وہ اس عالم میں آیا ہے اب یہاں کا سفر تمام کرنے کے بعد جب قبر میں دفنایا گیا تو گویا دوسرے جہان کی رستخیز کے لئے ایک اور نئے حمل میں آیا اس جہان کی سو پچاس برس کی عمر کے لئے حمل مادری نو مہینے کا کافی تھا مگر اس جہان کی زندگی ابدی ہے اس کے لئے حمل بھی ایسا ہی طویل و دراز مدت ہونا چاہئے پس نفخ صور ایک دروازہ ہے جس کے بعد حمل قبری سے لوگ پیدا ہو کر ایک ابدی جہان میں آئیں گے اور اسی لئے اس حمل قبری کے زمانے کو برزخ کہتے ہیں جو حیاتِ دنیا اور حیاتِ آخرت کے درمیان ہے اور اسی لئے کبھی اس کو خواب سے اور قبر کو خواب گاہ سے تعبیر کرتے ہیں اور قبر کو مرقد کہتے ہیں۔

(سوئم) جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو گویا حق سبحانہ اپنی ایک امانت ودیعت رکھتا ہے پھر جس طرح اس کو پالا پرورش کیا جاتا اسی طرح روح نکلنے کے بعد اس کو دفنانا اور زمین کے سپرد کرنا گویا امانت کو مالک کے حوالے کر دینا ہے اور امانت وخزائن کے لئے زمین ہی موضوع ہے نہ کہ آگ۔ انہیں معانی کو خیال کر کے ایک شاعر کہتا ہے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

(چہارم) اپنے دوست یا بزرگ کی لاش کو آپ دہکتی آگ میں جلانا اور لاٹھیوں

سے اس کی ہڈیوں کو چورا چورا کرنا علاوہ بے ادبی کے انسانی رحم دلی و مروت و محبت کے بھی برخلاف ہے۔ برخلاف اس کے باعزت و شان اس کو ایک شائستہ طور پر زمین میں دفن کرنا گویا اس کو ایک مکان یا تہ خانہ میں پہنچاتا ہے۔

(پنجم) دفنانے میں بسا اوقات بہت سی جانیں جو حکماء کے اشتباہ سے مردہ سمجھ کر دفن کردی گئیں کسی وجہ سے جلد قبر کھل جانے پر زندہ نکل آئے اور پھر برسوں جیئے۔ جلا دینے میں یہ احتمال بھی باقی نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ جو ظالموں نے کسی کو زہر دے کر یا گلا گھونٹ کر یا قتل کر کے دفن کیا تھا موقع پر مطلع ہو جانے کے بعد لاش سے ملاحظہ جرم بھی ممکن ہے مگر جلا دینے میں تو پورا پورا اخفاء واردات ہے جس میں ستمگاروں کو اپنی اس وحشیانہ حرکت پر پورا اطمینان ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ ہیں۔ (تفسیر حقانی ۵/۲۴۳، ۲۴۴)

مردے کو دفنانا بہتر ہے یا جلانا؟

اعتراض: (ہندوؤں کا اعتراض)

مسلمان مردے کو دفن کر کے زمین کو ناپاک کرتے ہیں اس لئے جلانا بہتر ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

جواب (۱): ہندو مُردوں کو جلا کر اس کی بدبو سے ہوا کو سڑا دیتے ہیں۔ اور اس ہوا سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے دفن کرنا بہتر ہے۔

ہوا کی سڑاہند سے ہر دماغ کو تکلیف پہنچتی ہے، نہ صرف یہ کہ حیوانات ہی تک اس کا اثر محدود رہتا ہے بلکہ نباتات پر بھی اس کے دھوئیں کا بُرا اثر پڑتا ہے۔ مرگھٹ کو آبادی سے دور رکھنا پڑتا ہے۔ بخلاف دفن کے کہ جو کچھ تغیرات جسمانی ہیں وہ دو گز زمین میں محدود رہتے ہیں۔

جواب (۲): پس اگر بوجہ ناپاکی مُردوں کا زمین میں دفن کرنا ممنوع اور بوجہ

بدبو زمین کا بچانا ضروری ہے تو پاخانہ پیشاب سے زمین خداوندی کا آلودہ کر دینا کیونکر جائز ہو جائے گا۔ اس لئے لازم یوں ہے کہ پنڈت جی اور ان کے مُرید پاخانہ پیشاب کو زمین پر نہ گرنے دیا کریں۔ پاخانہ کو پلے میں باندھ لیا کریں اور پیشاب کو برتنوں میں رکھ لیا کریں۔ اور جھٹ پٹ جلا پھونک خشک کرا کر زمین ہوا وغیرہ خدا کی مخلوقات کو عذابِ ناپاکی و بدبو سے نجات دیا کریں۔

ہائے افسوس! اہل اسلام پر اعتراض کیے جائیں تو یہ اعتراض کیے جائیں، جن کی خوبی ہر کس وناکس پر آشکار ہو۔ کوئی پنڈت جی سے پوچھے دفن کرنے سے تو زمین سڑتی ہے اور ناپاک ہوتی ہے۔ پاخانہ پیشاب سے کون سا عطر گلاب ومشک زمین پر برستا ہے۔ یہاں تو نکلتے ہی دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ زمین ناپاک ہو جاتی ہے۔ ہوا سڑ جاتی ہے۔ گھر گھر اور کوچہ کوچہ یہ بلائے عام جاں گزا ہوتی ہے۔ مُردوں میں یہ بات کہاں۔ اول تو وقتِ مرگ وہی رنگ، وہی روغن، وہی حسن، وہی جمال۔ اس وقت نہلا دھلا کر، خوشبو لگا کر زمین کے نیچے دبا دیں، تو نہ بنی آدم کو اس وقت تک کچھ تکلیف، نہ زمین میں کچھ آلودگی، دبانے کے بعد اگر پھولا پھٹا تو بنی آدم وحیوانات تو اس تکلیف سے محفوظ رہے۔

یہ بنائے اعتراض ہی غلط ہے کہ دفن کرنے سے زمین ناپاک ہو جاتی ہے:

زمین بظاہر چندروز کے لئے ناپاک ہو جاتی ہے مگر حقیقت میں دیکھئے تو مُردوں کی ناپاکی کا اثر زمین پر نہیں پڑتا بلکہ زمین کی پاکی کا اثر مردے پر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چندروز کے بعد وہ ہم رنگِ زمین بن جاتا ہے۔ اور نہ وہ ناپاکی رہتی ہے نہ وہ بدبو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ زمین مؤثر ہے اور یہ مردہ اس کے مقابل قابل اور منفعل اور متاثر۔ اور ظاہر ہے کہ مؤثر کا اثر متاثر کی طرف آیا کرتا ہے۔ متاثر کا اثر مؤثر کی طرف نہیں جایا کرتا۔ ورنہ مؤثر مؤثر نہ رہے اور متاثر متاثر نہ رہے۔ یہی وجہ

ہے کہ آفتاب کے نور سے پاخانہ پیشاب روشن ہو جاتا ہے۔ پر نورِ آفتاب پاخانہ پیشاب سے ناپاک نہیں ہوتا۔ اس صورت میں زمین نہ حقیقت میں ناپاک ہو، نہ متعفن ہو۔ پاخانہ پیشاب کے اجزاء ہی ناپاک اور متعفن ہوتے ہیں۔

لیکن چونکہ ہم دفن کرنے میں کچھ خرابی نہیں دیکھتے تو پاخانہ پیشاب کی وجہ سے بھی کچھ اعتراض ہم پر واقع نہیں ہو سکتا۔

محبت واحترام کا تقاضا بھی یہی ہے کہ دفن کیا جائے، جلا کر خاک نہ بنایا جائے:

محبتِ باہمی اقرباء تو ظاہر ہی ہے مگر غور کیجئے تو بمقابلہ اور انواع واجناس کے تمام بنی آدم باہم قرابتی ہیں اور کیوں نہ ہوں۔ آخر ایک ماں باپ کی سب اولاد ہیں اور اس محبت باہمی کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک دوسرے کا حافظ محافظ ہے جیتے جی کی حفاظت میں تو کچھ کلام ہی نہیں۔ مرنے کے بعد بھی یوں جی نہیں چاہتا کہ ''تن مردۂ اقرباء'' کو علیحدہ کر دیجئے۔ یہی وجہ ہے کہ جدائی کے وقت کس قدر روتے دھوتے ہیں اور جنازہ اٹھاتے ہیں تو کیا غل مچتا ہے۔ اس صورت میں اگر بوجہ مجبوری پاس نہ رہنے دیجئے تو کیا مقتضائے محبت یہی ہے کہ یوں جلا کر خاک سیاہ بنا دیجئے۔ نہیں اہل محبت سے یہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں تا مقدور آلائش ظاہری سے پاک صاف کر کے اچھا لباس پہنا کر حفاظت سے ایک طرف رکھ لیجئے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

مگر یہ بات بجز خو کردگان محبت اور کون جانے۔ وحشیان بے انس کو اس کی کیا خبر ہو گی جو امید تصدیق ہو۔ اور نا تجربہ کاران عشق کو یہ بات کیا معلوم ہو گی جو تائید کی توقع ہو۔ (انتصار الاسلام صفحہ ۹۴ تا ۱۰۲ ملخصا)

حضرت تھانویؒ کی طرف سے جواب:

اسلام کی خوبی یہ ہے کہ دفن کا حکم دیا اور جلانے کی ممانعت کر دی کہ دفن میں اکرام، اور احراق میں اس اصل سے عدول ہے۔

بعض مدعیین فلسفہ جلانے کو خوبیاں بیان کرتے ہیں اور دفن کی خرابیاں کہ اس سے مٹی خراب ہو جاتی ہے اور اس سے جو بخارات اٹھتے ہیں وہ گندے زہریلے اور متعفن ہوتے ہیں۔ اس طرح کے نکتوں سے ثابت کرتے ہیں کہ جلانا اچھا ہے مگر ہم تو اس کے خلاف مشاہدہ کر رہے ہیں کہ کسی مدفون کی قبر پر ہمیں بدبو نہیں آتی، مگر مرگھٹ پر تو اس قدر متعفن اور گندی ہوا ہو جاتی ہے کہ ناک نہیں دی جاتی۔ ایسے مہمل نکتے تو ہر چیز میں بیان ہو سکتے ہیں۔ مگر سلامتی فطرۃ حق و باطل کا فیصلہ خود کر لیتی ہے بلکہ عقل تو دفن کو پسند کرتی ہے کہ اس میں بدن کو اس کی اصل میں پہنچا دیا باقی خاک اصل ہونا سو اس کی دلیل یہ ہے کہ ہر عنصر کا اپنی چیز کی طرف طبعی میلان ہوتا ہے اگر کوئی انسان کوٹھے پر سے اچھلے اگر وہ اوپر چلا جاتا تو ہوا یا نار غالب ہوتی۔ اب تو خاک غالب ہے یا آب اور آب کا غلبہ نہ ہونا بھی ظاہر ہے، ورنہ آپ میں پہنچ کر عمق کی طرف نہ جاتا بس خاک کا غلبہ متعین ہو گیا اور یہ قاعدہ عقلی ہے کہ کُلُّ شَیْئٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ تو خاک میں دفن کرنا بالکل عقل کے موافق اور اس کے ماسوا سب فطرۃ سلیمہ اور عقل کے بالکل خلاف ہے۔

باقی احراق (جلانے) کی رسم کیسے نکلی؟ تو ایک بزرگ فرماتے تھے کہ ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں پرانی تاریخ میں اوتار اور دیوتاؤں کی معاشرت کا ذکر ہے اور وہ جن تھے سو غالباً ان کے شرائع (اور احکام) اور تھے اور انسان کے اور تو ان کے عنصر غالب یعنی نار کا مقتضائے عقلی یہ تھا کہ بعد موت ان کے ابدان کو اسی میں ملا دیا جائے چونکہ ان میں آگ غالب تھی اس لئے آگ میں جلا دیئے جاتے تھے، یہ قصے ان کی کتابوں میں مذکور ہوں گے، جہالت اور نادانی سے خدا بچائے یہ ایسے بزرگوں کی سنت سمجھ کر خود بھی یہی کرنے لگے۔ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند گو یہ بات تاریخ سے ثابت نہیں مگر آثار و قرائن اسی کے مؤید ہیں۔ (الجح والنتج ص ۱۲)

عذاب وثواب قبر پر اعتراضات اور ابن قیمؒ کے فلسفیانہ جوابات

اعتراضات:

حضرت ابن قیمؒ کے سامنے مندرجہ ذیل اعتراضات عذاب وثواب قبر کے متعلق پیش کیے گئے کہ ملحد وزندیق منکران عذاب وثواب قبر کو ہم کیا جواب دیں جو کہتے ہیں کہ قبر دوزخ کے گڑھوں میں سے گڑھا یا بہشت کے باغوں میں سے باغ کیونکر ہوسکتی ہے اور کیونکر کشادہ اور تنگ ہوسکتی ہے جب کہ میت نہ اس میں بیٹھ سکتی ہے اور نہ کھڑی ہوسکتی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم قبر کھودتے ہیں تو اس میں نہ تو اندھے اور گنگے فرشتے دیکھتے ہیں جو مردوں کو لوہے کے گرزوں اور ہتوڑوں سے مارتے ہوں اور نہ وہاں سانپ اور اژدھے دیکھتے ہیں اور نہ بھڑکتی ہوئی آگ ہم محسوس کرتے ہیں اور اگر میت کے احوال میں سے کوئی حال قبر کھود کر معلوم کریں تو ہم میت کو اسی ایک حالت غیر متغیرہ پر پاتے ہیں اور ہم اگر اس کی آنکھ پر سیماب اور اس کے سینے پر رائی کا دانا رکھیں تو ہم اس کو اسی ایک ہی حالت غیر متغیرہ پر پاتے ہیں اور مردہ پر تا حد نظر قبر کس طرح فراخ یا تنگ ہوسکتی ہے حالانکہ ہم اس کو اسی ایک حالت پر دیکھتے ہیں اور قبر کی کشادگی کو اسی حد پر پاتے ہیں جس حد پر کہ ہم نے اس کو کھودا تھا نہ زیادہ ہوتی ہے اور نہ تنگ ہوتی ہے اور قبر کی لحد میں تنگی کس طرح ممکن ہوسکتی ہے اور فرشتے اور وہ صورت جو مردہ کے ساتھ انس پکڑیں یا اس کو ڈرائیں قبر میں کس طرح سما سکتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہر ایک بات جو عقل و مشاہدہ کے برخلاف ہو وہ کہنے والے کی قطعی خطا ہے وہ کہتے ہیں مصلوب کو ہم مدت دراز سے لکڑی پر آویزاں دیکھتے ہیں وہاں پر نہ اس سے منکر ونکیر کا سوال ہوتا ہے نہ وہ حرکت کرتا ہے اور نہ اس کے جسم پر آگ

دہکتی ہوئی دیکھی جاتی ہے اور جس کو درندوں نے پھاڑ کھایا ہو اور پرندوں نے نوچ لیا ہو اور اس کے ٹکڑے درندوں کے پیٹوں اور پرندوں کے پوٹوں اور سانپوں کے شکموں اور ہواؤں کے طبقوں میں الگ الگ ہو جاتے ہیں اس کے ٹکڑوں سے باوجود الگ الگ ہونے کے کس طرح سوال و جواب ہونا ممکن ہوسکتا ہے اور جس کے جسم کے ٹکڑوں کی یہ حالت ہو جائے اس کے ساتھ دو فرشتوں منکر ونکیر کا سوال و جواب کرنا کس طرح ممکن ہے اور ایسے شخص پر قبر بہشت کے باغوں میں سے باغ یا دوزخ کے گڑھوں میں سے گڑھا کس طرح ہونا ممکن ہے اور کس طرح قبر اس پر تنگ ہوسکتی ہے یہاں تک کہ مردہ کی پسلیاں قبر کے ملنے سے اِدھر کی اُدھر ہو جائیں۔

جوابات: واضح ہو کہ ہم پہلے چند باتیں بطور تمہید ذکر کرتے ہیں جن سے جوابات واضح ہو جائیں۔(۱) رسولوں نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی جس کو عقلیں محال جانیں اور وہ اس کے محال ہونے پر قطعی حکم دے سکیں بلکہ رسولوں کی خبر دینا دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو وہ جس پر عقل اور فطرت گواہی دے دوسرے وہ جن کو محض عقلیں دریافت نہ کر سکیں۔ مثلاً غیب کی باتیں جو رسولوں نے عالم برزخ اور قیامت اور عذاب کے متعلق مفصل بیان فرمائی ہیں باقی ہر حال میں رسولوں کی خبریں از روئے عقول سلیمہ محال نہیں ہوتی ہیں (اور اگر وہ ظاہراً عقلاً محال ہو اور سند صحیح سے نسبت بھی اس کی ثابت ہو تو اس موقع پر دوسرے قواعد شرعیہ کے موافق تاویل واجب ہوگی) پس قبر کے واقعات دوسری قسم کی خبر ہے جو عقلاً محال نہیں مگر وہاں تک عقل کی خود رسائی نہیں وہ وحی کی محتاج ہے۔

باقی جو شخص اس کو محال سمجھتا ہے وہ محض اس شخص کا ایک خیال اور وہم ہے جس کو صاحب خیال اپنے فہم غلط میں معقول صریح جانتا ہے۔

دوسرا امر یہ ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مراد کو بغیر افراط وتفریط کے سمجھا جائے اور آپ کے کلام سے وہ مراد نہ سمجھی جائے جس کا آپ نے ارادہ نہ کیا ہو جو شخص

کا مزہ چکھنے کے لئے ایک جسم ملتا ہے اور وہ جسم اس جسم کی قسم سے نہیں ہوتا بلکہ ایک نور سے باریک تاریکی سے جیسی اعمال کی صورت ہو وہ جسم تیار ہوتا ہے گو اس عالم برزخ میں انسان کی عملی حالتیں جسم کا کام دیتی ہیں اور اگرچہ یہ راز ایک دقیق راز ہے مگر غیر معقول نہیں ہے انسان کامل اسی زندگی میں ایک نورانی وجود اس کثیف جسم کے علاوہ پاتا ہے اور عالم مکاشفات میں اس کی بہت مثالیں ہیں جن کو عالم مکاشفات میں سے کچھ حصہ ملا وہ اس قسم کے جسم کو جو کہ اعمال سے تیار ہوتا ہے تعجب اور استبعاد کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ غرض یہ جسم جو کہ اعمال کی کیفیت سے بنتا ہے یہی عالم برزخ میں نیک و بد کی جزا کا محل ہو جاتا ہے اصحاب مکاشفہ کو عین بیداری میں مردوں سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ فاسقوں اور گمراہی اختیار کرنے والوں کا جسم ایسا سیاہ دیکھتے کہ گویا وہ دھوئیں سے بنایا گیا ہے بہر حال مرنے کے بعد ہر ایک کو ایک نیا جسم ملتا ہے خواہ نورانی ہو خواہ ظلمانی لیکن خدا تعالی نے ان امور آخرت کو بواسطہ عقل مکلفوں کے دریافت کرنے اور پانے سے در پردہ اور پوشیدہ رکھا ہے اور یہ بات خدا تعالی کی کمال حکمت پر دال ہے تا کہ مؤمن ایمان بالغیب کے ساتھ منکرین سے جدا ہو جائیں۔

چنانچہ فرشتے قریب الموت آدمی پر اترتے ہیں اور اس کے نزدیک آکر بیٹھتے ہیں اور وہ ان کو دیکھتا ہے اور اس کے پاس اس کے لئے کفن اور خوشبو بہشت میں یا بدبو دوزخ میں سے ہوتی ہے اور وہ حاضرین کے سلام اور دعاء پر آمین کہتے ہیں اور بسا اوقات بعض قریب الموت آدمی کہتے ہیں ''خوش آمدید'' اور مردہ کے سوا حاضرین میں سے ان فرشتوں کو کوئی بھی نہیں دیکھتا اس بارہ میں بیشمار واقعات ہیں۔

امور آخرت میں سے یہ پہلا امر ہے جو اس دنیا میں ہمارے درمیان واقع ہوتا ہے اور باوجود اس دنیا میں واقع ہونے کے ہم کو دکھائی نہیں دیتا حالانکہ یہ سب کچھ اسی دنیا میں واقع ہوتا ہے پھر فرشتہ روح کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کو قبضہ کر لیتا ہے اور روح سے بات چیت کرتا ہے ار حاضرین نہ فرشتے کو دیکھتے ہیں نہ اس کی آواز سنتے

ہیں پھر روح نکلتی ہے اور اس کا نور آفتاب کی شعاعوں کی طرح اور اس کی خوشبو مشک سے زیادہ ہوتی ہے اور حاضرین ان سب میں سے کسی کو بھی نہیں دیکھتے اور نہ خوشبو کو سونگھ سکتے ہیں پھر وہ فرشتہ روح کو لے کر ملائکہ کے گروہ میں جا ملتا ہے اور حاضرین یعنی آدمی اس کو دیکھ نہیں سکتے پھر روح ایک خاص اعتبار سے واپس آ کر مردہ کا نہلانا اور اس کا اٹھانا دیکھتی ہے۔ اور کہتی ہے مجھے آگے لے چلو یا کہتی ہے مجھے کہاں لئے جاتے ہو مجھے کہاں لئے جاتے ہو اور لوگ اس کی کوئی بات بھی نہیں سن سکتے۔

لحدِ قبر میں مردہ کے پاس فرشتہ پہنچنے کی صورت

اسی طرح جب مردہ کو لحد میں رکھا جاتا ہے اور اس کی قبر پر مٹی ڈالی جاتی ہے تو مٹی فرشتوں کو مردہ کے پاس جانے سے روک نہیں سکتی بلکہ اگر پتھر بھی کندہ کیا جائے اور مردہ کو اس میں رکھ کر اس پتھر کو قلعی سے سر بمہر کر دیا جائے تو بھی مردہ کے پاس فرشتے کے پہنچنے سے یہ امر مانع نہیں ہو سکتا کیونکہ اجسام کثیفہ ارواح لطیفہ کے خرق کو مانع نہیں ہوتے بلکہ ان اجسام کثیفہ سے تو جن بھی گزر جاتے ہیں خدا تعالیٰ نے پتھر اور مٹی کو فرشتوں کے لئے ایسا کیا ہے جیسا فضاء پرندوں کے لئے ہے جس میں وہ اڑتے پھرتے ہیں اور قبر کی فراخی و کشادگی بالذات روح کے لئے ہوتی ہے اور بدن کو روح کی متابعت میں کشادگی مل جاتی ہے ورنہ جسم تو بہت تھوڑی جگہ میں سمایا ہوتا ہے۔

قبر کے فرشتوں اور آتش جہنم و نعمائے جنت کے نہ دکھائی دینے کی وجہ

قبر کی آگ اور سبزی نہ دنیا کی آگ کی قسم میں سے ہوتی ہے اور نہ دنیا کی کھیتی سبزہ کے مانند ہے جو دیکھ کر معلوم ہو سکے وہ تو آخرت کی آگ اور آخرت کی سبزی کی قسم سے ہوتی ہے اور اس کو اہل دنیا معلوم نہیں کر سکتے اور یہ امر اس لئے ہوا کہ ایمان بالغیب کی حکمت قائم رہے پس اس بنا پر ممکن ہے کہ دو شخصوں کو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو دفن کیا جائے اور ان کے اعمال متفرق ہوں تو ان میں سے ایک دوزخ کے

جب کہ جزا و سزا دونوں کا مدار تناسخ پر ٹھہرا اور دیر خلاف عدل ہے اور تناسخ بغیر موت کے ممکن نہیں تو اس سے لازم یہ آتا ہے کہ نیک یا بد کام کرتے ہی فوراً مر جائے تا کہ تناسخ کا وقوع ہو سکے اور جزا یا سزا میں تاخیر نہ ہو جائے اور عدل خداوندی پر بٹہ نہ لگے۔ کیونکہ تناسخ کا وجود موت پر موقوف ہے زندگی میں تناسخ نہیں ہو سکتا تو یہ نظر اس مشاہدے کی بناء پر بھی ظاہر البطلان ہے۔

خدا دنیا میں سزا دے کر آخرت میں کیوں دیتا ہے

ترجمہ آیات:

ان کیلئے اللہ کے رسول (صالحؑ) نے کہا تھا اللہ کی اونٹنی اور اس کے پانی پلانے کی حفاظت کرنا۔ پھر انہوں نے صالحؑ کو جھٹلایا پھر اونٹنی کے پاؤں کاٹے تو ان کو ان کے گناہوں کے سبب ان کے رب نے الٹ مارا۔ (سورہ شمس: آیت ۱۳، ۱۴)

اعتراض: (پنڈت دیانند کا اعتراض)

خدا دنیا میں سزا دے کر آخرت میں کیوں دیتا ہے؟

جواب: خدائے تعالیٰ کا یہ بھی قاعدہ ہے کہ کبھی کبھی بدکاروں کو دنیا میں بھی سزا دیا کرتا ہے اور آخرت میں بھی دیتا ہے اور دے گا جیسا کہ آریہ ورت کے ہندوؤں کو غازی محمود غزنوی مرحوم کے ہاتھ سے دنیا میں شکست دلائی اور پرلوک میں بھی کچھ بنائے گا۔ چنانچہ آپ نے بھی اس مضمون کو ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۹۸ باب ۸ میں ادا کیا ہے۔

خطا کار روح ہوتی ہے یا انسان کی چوٹی بھی

ترجمہ آیات:

کیا آپؐ نے دیکھا اگر اس نے جھٹلایا اور منہ موڑا۔ اس نے یہ نہ جانا کہ اللہ دیکھتا ہے۔ کچھ نہیں اگر وہ باز نہ آئے گا تو ہم اس کو چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ وہ

چوٹی جو جھوٹی خطا کار ہے۔ (سورہ علق، آیات: ۱۳ تا ۱۶)

اعتراض: (پنڈت جی کا اعتراض)

اس ذلیل چپراسیوں کے گھسیٹنے کے کام سے بھی خدا نہ بچا! بھلا پیشانی بھی کبھی جھوٹی اور قصوروار ہو سکتی ہے؟ سوائے روح کے۔ یہ کبھی خدا ہو سکتا ہے کہ جو جیل خانہ کے دراروغہ کو طلب کرے؟

جواب: ''تو آشنائے حقیقت نہ خطا اینجاست''

''ہائے کیسا پاپی ہے وہ منش جو متکلم کے خلاف منشاء کلام کے معنی کرتا ہے اور مذہب کی تاریکی میں پھنس کر عقل کو زائل کر لیتا ہے۔'' (دیباچہ ستیارتھ صفحہ ۷)

پنڈت جی کو خدائی کاموں میں ہمیشہ شبہ رہتا ہے یہی سمجھتے ہیں کہ خدا خود ہی آ کر اپنے ہاتھ سے کام کرتا ہے۔ افسوس سوامی جی کو خبر نہیں کہ

''پرمیشور کے ہاتھ نہیں لیکن اپنی طاقت کے ہاتھ سے سب کو بناتا اور قابو رکھتا ہے پاؤں نہیں۔ لیکن محیط کل ہونے کے باعث سب سے زیادہ صاحب سرعت ہے۔'' (ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۴۴، سملاس ۷، نمبر ۳۶)

پس سوامی جی اور ان کے چیلے چانٹے خود ہی بتلائیں کہ خدا اگر کسی فعل کو اپنی طرف نسبت کرتے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ہاتھ سے کرتا ہے؟

سنو! وید بتلاتا ہے:

پیدائش عالم سے پہلے پرمیشور اس پیدا شدہ عالم کا ایک بے عدیل مالک یا محافظ تھا اس نے زمین سے لے کر اکاش (آسمان) تک تمام کائنات کو بنایا اور وہی اس کو قائم رکھتا ہے۔

(رگ وید اشٹک ۸، ادھیائے ۷، ورگ ۳، منتر ۱)

کون ایسا پاجی ناستک (دہریہ) ہے جو اس پاکیزہ کلام مندرجہ وید پر اعتراض کرے کہ پرمیشور اس ذلیل کام معماری اور بوجھ برداری سے بھی نہ بچا۔

یہ تو مزدوری کا حال تھا اور اگر انعام وسزا کا قصہ ہو تو پھر تو تاخیر میں کچھ حرج ہی نہیں۔ کیونکہ غیر کا حق نہ دینا ظلم ہے اور حق غیر معاملات میں بیع اور اجارے ہی کی صورت میں اپنے ذمہ ثابت ہوتا ہے۔ انعام اور سزا میں اپنے ذمہ کوئی بات ثابت نہیں ہوتی جو تاخیر میں ظلم کا احتمال ہو۔

باقی یہ بات خود عیاں ہے کہ جیسے غیر کے ادائے حق غیر تاخیر میں بری ہے اپنے حق کے وصول میں تاخیر عمدہ ہے۔ اس لئے اپنے حقوق کی سزا میں تو تاخیر بری ہو ہی نہیں سکتی۔ رہا انعام وہ کوئی حق واجب نہیں ہوتا جو اس کی تاخیر بری ہے۔

ہاں حقوق العباد کے دلوانے میں شاید تاخیر بری معلوم ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حکام دنیا کو جو کچھ خدا کی طرف سے عدل وانصاف کی تاکید ہے اس پر سب اہل مذہب اور تمام اہل عقل شاہد ہیں۔ دنیا میں جو کچھ وصول ہو سکے ہے۔ اس کے دلانے میں تو خدا کی طرف سے تعجیل ضروری ہو چکی۔

اس سب کے باوجود آخرت کا قصہ جدا رہا۔ مگر چونکہ خدا بندوں کے حق میں فقط حاکم ہی نہیں، والدین سے زیادہ شفیق اور مہربان بھی ہے تو اگر وہ ان کے وقت ضرورت کے لئے ان کے حقوق کو رہنے دے اور اس وقت لے کر ان کے حوالہ کرے تو اس سے بہتر ہے کہ قبل وقتِ ضرورت اس کو کھو بیٹھیں۔ اس وقت کمال ضرورت تو وہی وقت ہے، جب کہ عالم اسباب سراسر خراب اور برباد ہو جائے اور کوئی حیلہ وسیلہ اور سبب اور ذریعہ کمائی کا باقی نہ رہے۔ اسی وقت کو ہم قیامت کہتے ہیں۔ اس وقت نہ کوئی حیلہ ہوگا نہ کوئی سامان۔ فقط خدا کی رحمت یا ظاہر میں اپنے حقوق ہوں گے۔ خلاصہ جواب یہ ہے کہ دنیا میں اقتضائے عدل غالب ہے۔ اس لئے یہاں جس قدر احکام ہیں ان میں حقوق العباد کے دلوانے میں تعجیل کے پہلو نمایاں ہیں۔ لیکن آخرت میں اقتضائے لطف وکرم کے غلبہ سے تاخیر واقع ہوتی ہے کہ آخرت میں اس دنیا کے حقوق کے بدلے میں وہ چیزیں ملیں گی جو وہاں کے مناسب اور کارآمد ہوں گی کہ اگر

وہ یہاں مل جائیں تو وہاں کے فائدے سے محروم رہ جائیں۔ (انتصار الاسلام)

تاخیر کا تعلق صرف انعام اور سزا سے ہوتا ہے جس میں ظلم کا شائبہ بھی نہیں

حضرت مولانا قاسم نانوتوی لکھتے ہیں:

جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو آگے سنئے۔ یہ کارخانۂ دنیا تو عبادت کے لئے بنایا گیا ہے" چنانچہ دلائل ابطال تناسخ میں اس کی شرح و بسط گذر چکی" اور ظاہر ہے کہ عبادتِ خداوندی، حق واجب خدا ہے، کیونکہ بندہ مملوک خدا ہے اور مملوک کے ذمہ تعظیم مالک اور اطاعت مالک لازم ہے اور "حق واجب" کے مقابلہ میں کوئی چیز واجب نہیں ہوتی۔ یوں اپنی طرف سے بطور انعام کوئی کچھ دیدے تو اختیار ہے۔

یعنی جو حق واجب الادا ہے اور جس کا ادا کرنا ضروری ہے اس کی ادائیگی پر کچھ کسی قسم کا انعام یا عطیہ ملنا ضروری نہیں ہوتا۔ مثلاً مالگزاری یا ٹیکس یا خراج کہ ان کے ادا کرنے پر گورنمنٹ کسی کو بھی انعام نہیں دیتی۔ ہاں اگر ادا نہ کیا جائے تو گرفتاری فوراً عمل میں لائی جاتی ہے۔

سو غلاموں کو حسن خدمت کے مقابلہ میں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ انعام ہوتا ہے، مزدوری نہیں ہوتی جو اس کو واجب الاداء کہے اور تاخیر ادا سے کچھ وہم ظلم ہو۔ اور تقصیر خدمت کے مقابلہ میں جو کچھ تدارک کیا جاتا ہے اس کو سزا کہتے ہیں اور سزا دینے والے کا حق ہوتا ہے اس کو تاخیر میں اپنے حق کے وصول کرنے میں تاخیر ہوتی ہے کسی دوسرے کے حق کے ادا کرنے میں تاخیر نہیں ہے۔ (انتصار الاسلام)

اٹھارہواں باب

قیامت
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا

اعتراض: (کفار کا اعتراض)

مرنے کے بعد انسان نیست نابود ہو جاتا ہے دوبارہ زندہ نہیں ہوتا اسلام کا ایک امر محال نظریہ ہے جس کو ہماری عقل میں نہیں مانتی۔

جواب: تمام اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ معاد جسمانی حق ہے۔ کتاب اور سنت کی اور نا قابل تاویل نصوص سے یہ امر ثابت ہے کہ یہی بدن دوبارہ زندہ ہوں گے اور ان ہی میں روح ڈالی جائے گی۔ معاد عود بمعنی رجوع سے مشتق ہے۔ معاد دوبارہ زندہ کرنے کو اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اجزاء بدن عدم کے بعد وجود کی طرف لوٹتے ہیں اور تفرق کے بعد اجتماع کی طرف رجوع کرتے ہیں اور روح طویل مفارقت کے بعد پھر دوبارہ بدن کی طرف واپس آتی ہے اور جسم پھر موت سے حیات کی طرف رجوع کرتا ہے جس میں خداوند قدیر نے اس عالم جسمانی کو اول بار پردہ عدم سے نکال کر وجود کا خلعت پہنایا اور نابود محض سے بود کیا۔ وہ خدا دوبارہ اسی طرح زندہ کرنے اور وجود میں لانے پر قادر نہیں؟

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اللہ یبدؤ الخلق ثم یعیدہ. (الروم)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

کما بدأنا اول خلق نعیدہ وعدا علینا انا کنا فاعلین. (الانبیاء)

ترجمہ: جس طرح پہلی بار پیدا کیا اسی طرح دوسری بار پیدا کریں گے یہ

ہمارے ذمہ وعدہ ہے ہم ضرور اس کو پورا کریں گے۔

کفار اس عالم کے فنا ہونے اور پھر دوبارہ پیدا ہونے کو محال اور خلاف عقل سمجھتے تھے اور آنحضرت ﷺ سے اکثر بحث اسی مسئلہ پر رہتی تھی۔ اس بارہ میں جس قدر آیتیں نازل ہوئیں وہ شمار سے باہر ہیں اور اس قدر صاف اور صریح ہیں کہ کہیں تاویل کی گنجائش نہیں۔ فلاسفہ بھی معاد جسمانی کے منکر ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمینوں کے نیست و نابود ہونے کے قائل نہیں وہ ان کو ازلی اور ابدی سمجھتے ہیں۔ یہ عقید صریح کفر ہے اس لئے کہ یہ عقیدہ رکھنا نصوص قطعیہ اور کل انبیاءؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اجماع کا انکار ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اذا السماء انشقت، اذا السماء انفطرت، واذا النجوم انکدرت.

ان آیات میں صراحۃً آسمانوں کا پھٹنا مذکور ہے اور اس قسم کی آیتیں قرآن کریم میں بکثرت موجود ہیں۔ یہ مسئلہ ضروریات دین اور قطعیات اسلام میں سے ہے۔ جو شخص اس کا انکار کرے وہ بلاشبہ کافر و مرتد ہے محض کلمہ شہادت کا اقرار اسلام کے لئے کافی نہیں۔ جب تک دین کی تمام باتوں کو نہ مانے۔

اعتراضات:

معاد جسمانی کے منکرین نے جو اعتراضات کئے ہیں ان میں سب سے زیادہ قوی اور مشہور اعتراض یہ ہے کہ

(۱) جب ایک انسان دوسرے کو کھا جائے اور وہ اس کا جزو بدن بن جائے اور دونوں مل کر ایک ہو جائیں تو اگر بعثت کے وقت دونوں کو متحد الاجزاء ہو جانے کی وجہ سے ایک جسم کے ساتھ زندہ کیا جائے تو دو روحوں کا ایک انسان کے متعلق ہونا لازم آتا ہے اور اگر آکل (کھانے والے) اور ماکول (جس کو کھایا گیا) کو علیحدہ علیحدہ زندہ کیا جائے اور حشر کے وقت آکل سے ماکول کے اجزاء علیحدہ کر لئے جائیں تو کھانے

والے کا بعینہٖ اور تمام اجزاء کے ساتھ حشر نہ ہوا۔ حالانکہ فرض یہ کیا گیا تھا کہ حشر بعینہٖ بجمیع اجزاء ہے۔

(۲) اور ایک اعتراض یہ ہے کہ پرانے مُردوں کی لاشوں کے اجزاء اکثر زمین میں مل جاتے ہیں اور پھر اس زمین پر کاشت کرتے ہیں جو غلہ ان اجزاء سے مل کر اس زمین میں پیدا ہوتا ہے وہ دوسروں کی غذا بنتا ہے۔ غرض اس طرح سے بہت لوگوں کے اجزاء متحد ہو گئے لہٰذا ہر شخص کا اگر علیحدہ علیحدہ اعادہ کیا جائے تو چونکہ سب کی اصل اور مادہ ایک ہے تو شے واحد کا مختلف اشکال اور مختلف صورتوں کے ساتھ مصور اور متشکل ہونا لازم آتا ہے۔

(۳) اور ایک اعتراض یہ ہے کہ انسان نام صورت کا ہے مادہ کا نہیں۔ کیونکہ اگر انسانی صورت باطل ہو جائے تو مادہ تو عناصر اربعہ کی طرف لوٹ جاتا ہے اور مادہ محل ثواب اور عقاب نہیں اور نہ مکلف ہے پس جب انسان کی وہ صورت ہی باقی نہ رہی تو اس انسان کو ثواب اور عقاب نہ ہوا تو دوسرے انسان کو ثواب اور عقاب دینا لازم آیا ہے۔

جواب: جواب یہ ہے کہ بدن انسانی میں دو قسم کے اجزاء ہیں ایک اجزاء اصلیہ کہ جو اول سے آخر تک باقی رہتے ہیں اور دوسرے اجزاء زائدہ اور عارضہ کہ جن میں تغیر اور تبدل کمی اور زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ جیسا انسان بچہ اور جوان اور بوڑھا ہوتا ہے اول عمر سے اخیر عمر تک زید ہی کہلاتا ہے۔ حالانکہ اس مدت میں اس کے جسم میں ہزاروں تغیر اور تبدل پیش آئے اور وقتاً فوقتاً جسم گھٹتا اور بڑھتا رہا۔ معلوم ہوا کہ زید کے اجزاء اصلیہ میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ صرف اجزاء زائدہ میں تغیر و تبدل ہوتا رہا۔ پس حشر کے وقت ہر انسان کے اجزاء اصلیہ علیحدہ علیحدہ کر دیئے جاویں گے اور ہر شخص اپنے اجزاء اصلیہ وہ ہیں کہ جو اس انسان کے کھانے سے قبل اس میں موجود تھے لہٰذا ہر شخص کا حشر اپنے اپنے اجزاء اصلیہ کے ساتھ ہوگا۔ الحمد للہ اب کوئی اعتراض وارد نہ ہوگا۔

تفصیل: تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان اور بدن میں فرق ہے۔ کیونکہ بدن میں فربہی اور لاغری کی وجہ سے کمی اور زیادتی ہوتی رہتی ہے مگر انسانیت میں کوئی کمی اور زیادتی نہیں ہوتی۔ قرآن کریم میں شہداء کو زندہ کہا گیا ہے حالانکہ بدن ان کا مردہ ہے۔ نیز نصوص شرعیہ سے جن لوگوں کا مسخ ثابت ہے ان کی نسبت یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ وہ حالت مسخ میں انسان رہے یا نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ بحالت مسخ وہ انسان باقی نہیں رہا تو یہ کہنا پڑے گا کہ وہ انسان جس کو مسخ کیا گیا وہ تو بالکل معدوم اور فنا ہو گیا اور یہ بندر اور سور جس کی صورت پر مسخ ہوا یہ حیوان از سرنو پردۂ عدم سے وجود میں لایا گیا اور یہ ظاہر البطلان ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ مسخ ہونے کے بعد انسان تو وہی ہے جو پہلے تھا مگر ہیئت وصورت بدل گئی۔ اصل حقیقت وہ ہے جو پہلے تھی تو پھر ہمارا مدعا ثابت ہے کہ انسان اس بدن اور اس ہیئت مخصوصہ کا نام نہیں نیز انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ صاحب عقل اور صاحب ادراک ہو اور ظاہر ہے کہ بدن میں ادراک عقلی مفقود ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوا کہ انسان بدن کے مغائر ہے اور اصل اور بالذات مدرک روح ہے۔ لیکن انسان فقط روح کا نام نہیں بلکہ "انسان" روح اور جسم کے مجموعہ کو کہتے ہیں اور جسم میں دو قسم کے اجزاء ہیں۔ ایک اجزاء اصلیہ کہ جو اول عمر سے اخیر عمر تک باقی رہتے ہیں اور ان میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہوتا اور دوسرے اجزاء زائدہ اور انسان کے اجزاء اصلیہ وہی ذرات ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے عہد لینے کے لئے نکالے گئے تھے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

واذ اخذ ربک من بنی آدم من ظهورهم ذریتهم واشهدهم علی انفسهم الست بربکم قالوا بلی۔ (الاعراف)

اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کو ان کی پشت سے ذرات کی ہیئت اور شکل پر نکالا۔ اور عجب نہیں کہ یہ ذات چھوٹے ہونے

کے اعتبار سے اجزاء لاتجزیٰ ہوں اور صورت اور ہیئت کے اعتبار سے انسان ہوں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان پر ذریت کا اطلاق فرمایا۔ ذرات کا لفظ نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ ذریت کا اطلاق جب ہی آتا ہے کہ صورت بن چکی ہو۔ (الاعراف)

پس روح کا اصل تعلق انہیں اجزاء اصلیہ اور ذرات کے ساتھ ہے۔ انہیں سے عہد الست لیا گیا اور پیدائش کے وقت بھی روح کا اصل تعلق ان اجزاء اصلیہ کے ساتھ ہوتا ہے اور اجزاء زائدہ ملا کر جسم کو مکمل کر دیا جاتا ہے۔ اور اسی طرح نفخ صور کے بعد روح کا تعلق ان ہی اجزء کے ساتھ ہوگا اور اجزائے زائدہ ملا کر شخص تام یعنی مکمل اور پورا انسان بنا دیا جائے گا اور اسی طرح سے انسان کا دوبارہ زندہ کرنا بعینہ اعادہ سمجھا جائے گا۔ مرنے کے بعد انسان کے اجزاء کتنے ہی متفرق اور منتشر ہو جائیں مگر اللہ کے علم ازلی اور قدیم میں اجزاء اصلیہ اور اجزاء زائدہ سب علیحدہ علیحدہ محفوظ اور ممتاز ہیں۔ وہاں ذرہ برابر کوئی اختلاط اور انتشار نہیں۔

ذرہ کو در ہوا شد یا کہ ریخت
از خزینۂ قدرت تو کے گریخت

لہٰذا ممکن ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد اجزاء اصلیہ بمشیت ایزدی محفوظ رہیں اور جس وقت ایک حیوان دوسرے حیوان کو کھا جائے تو اجزاء اصلیہ اس کا جزء بننے سے محفوظ رہیں اور پہلے حیوان کے صرف اجزاء زائدہ دوسرے حیوان کا جزء بن جائیں اور دراصل اعتبار اجزاء اصلیہ ہی کا ہے۔ اجزاء زائدہ کا اعتبار نہیں۔ جس طرح گھاس اور درختوں کے بیج کے اجزاء ریت میں ملے رہتے ہیں اور جب بارش ہوتی ہے تو مختلف قسم کی گھاس اور مختلف قسم کے درخت اس سے اُگ جاتے ہیں۔ پس حقیقی انسان جو احکام شرعیہ کا مخاطب اور مکلف ہے۔ وہ روح اور ان اجزاء اصلیہ کے مجموعہ کا نام ہے۔

اسی انسان سے قبر میں سوال ہوتا ہے اور یہی انسان بعینہ دوبارہ زندہ کیا جائے گا

اور اسی کو ثواب اور عقاب ہوگا۔ اس تقریر سے بحمد اللہ تعالی تمام اشکال دور ہو گئے۔ نہ دوسرے شخص کا ثواب اور عقاب لازم آیا اور نہ جسم واحد کے ساتھ دو روحوں کا متعلق ہونا لازم آیا پس اصل انسان روح اور ان ذرات کے مجموعہ کا نام ہے اور یہ ذرات اس قدر لطیف اور باریک ہیں کہ لطافت کی وجہ سے ان کا مشاہدہ بھی نہیں ہو سکتا۔ الا یہ کہ جس کو اللہ تعالی دوربین نگاہ عطا فرمادیں اس کے لئے مشاہدہ ممکن ہے اور کائنات میں ہزاروں ایسی چیزیں ہیں جو اپنی لطافت کی وجہ سے حواس سے پوشیدہ ہیں۔ جیسے گیس اور ایتھر وغیرہ اور عجب نہیں کہ یہ اجزاء ہیں اور اجزاء زائدہ کم وبیش ہوتے رہتے ہیں اور ان ہی اجزاء اصلیہ کے ساتھ جب روح کا تعلق ہوتا ہے تو حیات آتی ہے اور جب تعلق منقطع ہوتا ہے تو موت آتی ہے۔

اس تقریر سے منکرین کا ایک شبہ یہ رفع ہو گیا۔ جس کا کان اور ناک کٹ گئی ہو وہ شخص دوبارہ کس طرح زندہ کیا جائے گا اگر اس کو ناک اور کان کے ساتھ دوبارہ زندہ کیا جائے تو بعینہ حشر نہ ہوا۔ اور اگر بغیر کان اور ناک کے اٹھایا جائے تو نصوص شرعیہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ نصوص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندہ ہونے والوں کے ناک اور کان سب سالم ہوں گے۔ جواب کی صورت ظاہر ہے اور اس قسم کے شبہات اور ان کے جوابات الیواقیت والجواہر مصنفہ علامہ شعرانیؒ میں بالتفصیل مذکور ہیں۔ حضرات اہل علم اصل کی طرف مراجعت فرمائیں۔

فلاسفہ کا شبہ:

فلاسفہ معاد جسمانی کے انکار پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ معاد جسمانی میں اعادہ معدوم کا لازم آتا ہے اور اعادہ معدوم کا بعینہ محال ہے۔

جواب: یہ کہنا کہ اعادہ معدوم محال ہے۔ محض ایک دعویٰ ہے جس پر کوئی دلیل نہیں۔ جس طرح ایجاد معدوم کی ممکن بلکہ واقع ہے۔ اسی طرح معدوم کی ایجاد ثانی یعنی اعادہ بھی ممکن ہوگا۔ وجود اور عدم موت اور حیات نفس ماہیت کے عوارض میں

سے ہیں۔ نہ عین ماہیت ہیں نہ لازم ماہیت جس طرح نیند اور بیداری اور حرارت اور برودت کا ماہیت واحدہ پر وارد ہونا اور ایک دوسرے کے بعد آنا جائز ہے اسی طرح وجود اور عدم کا وارد ہونا بھی ماہیت (حقیقت) واحدہ پر جائز ہے ایجاد اور اعدام۔ زندہ کرنے اور مارنے کا امکان کسی خاص زمانہ پر موقوف نہیں۔ لہذا یہ کہنا کہ پہلی بار زندہ کرنا زمانہ سابق میں ہونے کی وجہ سے ممکن ہے اور دوسری بار زندہ کرنا زمانہ لاحق میں ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے غیر معقول ہے۔ اس لئے زندہ کرنے اور مارنے کے لئے زمانہ ظرف ہے شرط نہیں۔ ہاں اگر زمانہ اول کی شرط کے ساتھ دوبارہ زندہ کرنا ہمارا مذہب ہوتا۔ تب بے شک مذہب اسلام پر ایک محال بات لازم آتی۔ پس جس طرح معدوم کی ایجاد زمانہ اول میں ممکن تھی بعینہ اسی طرح دوسرے زمانہ میں اس معدوم کی ایجاد ثانی بھی ممکن ہوگی۔ زمانہ کے بدلنے سے جو ایجاد ممکن تھی۔ وہ محال نہ بن جائے گی۔

تفصیل کے لئے شرح مواقف اور شرح مقاصد اور اتحاف شرح احیاء العلوم کی مراجعت کی جائے (علم الکلام ص ۳۴۲)

حقیقت قیامت

حقیقت قیامت کا مضمون حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مضمون کا انتخاب ہے جو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

واضح ہو کہ جو اشیاء مختلف الاغراض چیزوں سے مرکب ہوا کرتی ہیں جیسے کھیتی کہ اس کا غلہ آدمیوں کے لئے اور بھس گھانس جانوروں کے لئے ایسی چیزوں کو انجام کار توڑ پھوڑ کر جدا جدا کر کے اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیتے ہیں اور ان کے مناسب ان کو کام میں لاتے ہیں مثلاً کھیتی کو ایک روز کاٹ چھانٹ توڑ پھوڑ بھس اور غلہ کو جدا جدا کر کے بھس کو کوپوں میں اکٹھا کر دیتے ہیں اور غلہ کو ٹھیوں کھاتوں برتنوں میں جمع کر

لیتے ہیں اور پھر اس کو وقتاً فوقتاً جانوروں کو کھلاتے رہتے ہیں اور غلہ کو بقدر ضرورت آپ کھاتے رہتے ہیں پھر اپنے کھانے میں بھی یہ تفریق ہے کہ چھان پھوڑ کر اچھے اچھے غلہ کو اپنے لئے رکھتے ہیں اور ناقص کو خدام اور شاگرد پیشوں اور جانوروں کو کھلاتے ہیں۔

مگر غور سے دیکھا تو اس عالم اجسام کو بھی مختلف الاغراض اجزاء سے بنایا ہوا پایا چنانچہ اس کے ہر رکن اور ہر ہر طبقہ سے نمایاں ہے کہ یہ اور کام کا اور وہ اور کام کا، اس میں اور کچھ خاصیت ہے، اس میں اور کچھ خاصیت ہے زمین میں اور ہی خوبیاں ہیں اور پانی میں اور ہی کچھ فائدے ہیں۔ مومن اور کام کے کافر اور کام کے، علماء اور کام کے فقراء اور کام کے، ذکی اور غبی میں فرق ہے سخی اور بخیل میں فرق مرد اور نامرد میں اختلاف، مرد و عورت میں افتراق غرض جس چیز کو دیکھے اس کا رنگ و بو کچھ اور ہی ہے

ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است

اس میں بھی یہی ہونا چاہئے کہ ایک روز توڑ پھوڑ کر سب کو جدا جدا کر دیں یہاں تک کہ نیکوں کو ان کے ٹھکانے میں اور بدوں کو ان کے جیل خانہ میں پہنچا دیں پس اس طرح سے اپنے موقع میں پہنچ جانے کا نام جزا و سزا یوم القیامت ہے۔

اور سنئے مجموعہ عالم کو دیکھئے یہ ایسے ہے جیسے آدمی یا کسی جانور کا جسم جیسے چشم و گوش، دست و پا وغیرہ اعضاء جدا جدا کام کے ہیں ایسے ہی اس مجموعہ عالم میں زمین و آسمان وغیرہ ارکان جدا جدا مصرف کے ہیں جیسے اس جسم خاکی میں عناصر اربعہ کی جدا جدا خاصیت ہے ایسے ہی اس عالم ناپائیدار میں علویات اور سفلیات کی جدا جدا طبیعت اور خواہشات نفسانی کی جدا جدا تاثیر ہے جسم خاکی میں اگر کسی خلط کے غلبہ کے باعث مزاج اصلی میں تغیر آ جاتا ہے تو اس کا نام مرض ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے اگر روح کو مفارقت جسم سے کرنی پڑے تو اس کا نام موت ہے۔

ایسے ہی اس عالم ناپائیدار میں کسی رکن یا خواہش کے غلبہ کے باعث اگر

ترکیب اصلی میں فرق آجائے اور کوئی کیفیت تازہ ظہور میں آئے تو اس کا نام علامت قیامت ہے اور اس کی وجہ سے اس روح اعظم کو جو بمقابلہ روح انسانی اس مجموعہ کے لئے ہونا چاہئے چنانچہ نظام عالم اور اس کے حسن انتظام سے ظاہر ہے۔ اس مجموعہ سے اگر مفارقت کا اتفاق ہو جائے تو اس کا نام قیامت ہے مگر یہ ہے تو جیسے بعد مرگ تفرق اجزاء جسم انسانی وحیوانی ضرور ہے یہاں بھی بعد مفارقت مذکورہ تفرق اجزاء عالم ضرور ہونا چاہئے سو جیسے بعد اجزاء جسم انسانی ہر جزو کو اپنے اپنے کرہ کے ساتھ اتصال لازم ہے ایسے ہی بعد تفرق اجزاء عالم ہر جزو کو اپنے اپنے طبقہ میں جانا لازم ہے سو نیکیوں کا طبقہ جنت میں جانا اور بدوں کا طبقہ دوزخ میں جانا یہی جزا و سزا ہے۔

اور سنئے باورچی سے کھانا پکواتے ہیں اور درزی سے کپڑا سلواتے ہیں جب ہو جاتا ہے تب کہیں اس کو مزدوری عنایت کرتے ہیں اور وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ اجرت اس کام کے عوض دیتے ہیں اگر وہ کام حسب دلخواہ دیکھا تو اس کو اس کی اجرت حوالہ کرتے ہیں ورنہ الٹا تاوان بربادی جامہ وجنس کا اس سے تقاضا کرتے ہیں مگر چونکہ یہ بات بعد ہی میں بن پڑتی ہے اس لئے مزدوری بھی بعد ہی میں ملتی ہے اور اگر وہ کام ایسا ہو کہ ایک آدمی نہیں کر سکتا اور ایک دن میں نہیں ہو سکتا تو بہت سے آدمی بہت سے دنوں میں اس کو پورا کرتے ہیں تو مزدوری کے وصول میں اور بھی دیر لگتی ہے۔ بالخصوص جب کہ وہ کام ٹھیکہ پر کرایا جائے یہ تو مزدوری کا حال تھا اور اگر انعام وسزا کا قصہ ہو تو پھر تاخیر میں کچھ حرج ہی نہیں کیونکہ حق غیر کا نہ دینا ظلم ہے اور حق غیر معاملات میں بیع اور اجارہ کی صورت میں اپنے ذمہ ثابت ہوتا ہے انعام اور سزا میں اپنے ذمہ کوئی بات ثابت نہیں ہوتی جو تاخیر میں ظلم کا احتمال ہو۔ باقی یہ بات خود عیاں ہے کہ جیسے ادائے حق غیر میں تاخیر بری چیز ہے اپنے حق کے وصول میں تاخیر عمدہ ہے اس لئے اپنے حقوق کی سزا میں تو تاخیر بری ہو ہی نہیں سکتی۔ رہا انعام وہ کوئی حق واجب نہیں ہوتا جو اس کی تاخیر بری ہو۔

ہاں حقوق العباد کے دلوانے میں شاید تاخیر بری معلوم ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حکام دنیا کو جو کچھ خدا کی طرف سے عدل و انصاف کی تاکید ہے اس پر سب اہل مذہب اور تمام اہل حق شاہد ہیں دنیا میں جو کچھ وصول ہو سکے اس کے دلانے میں تو خدا کی طرف سے تعجیل ضرور ہی ہو چکی۔ بایں ہمہ آخرت کا قصہ جدا رہا مگر چونکہ خدا بندوں کے حق میں فقط حاکم ہی نہیں والدین سے زیادہ شفیق اور مہربان ہے تو ان کے وقت ضرورت کے لئے ان کے حقوق کو رہنے دے تو اس وقت لے کر ان کے حوالے کر دے تو اس سے بہتر ہے کہ قبل وقت ضرورت اس کو کھو بیٹھیں سو وقت کمال ضرورت تو وہی وقت ہے جب کہ عالم اسباب سراسر خراب اور برباد ہو جائے کوئی حیلہ و وسیلہ اور ذریعہ کمائی کا باقی نہ رہے اس وقت نہ کوئی حیلہ ہو گا نہ کوئی سامان فقط خدا کی رحمت یا ظاہر میں اپنے حقوق ہوں گے۔ (المصالح العقلیہ ۲۸۰)

اثباتِ قیامت اور وجہ عبادت

جواب تو پنڈت جی کے اعتراض کا اتنا ہی ہے کہ عبادت اور گناہ کی جزا اور سزا کی تاخیر میں کچھ ظلم نہیں۔ مگر بغرض اثباتِ قیامت اتنا عرض ہے کہ عبادت حسب دلخواہ (حسب مرضی) خداوندی جب ہی متصور ہے کہ تمام اسماء و صفاتِ خداوندی کے مقابلہ میں عجز و نیاز و تضرع و زاری وقوع میں آئے۔

مگر جب عبادت کاملہ ظہور میں آئے تو پھر جیسے کھانے پک جانے اور تمام روٹی سالن چاول وغیرہ کے طبخ کامل ہو جانے کے بعد باورچی خانہ کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں اور گھر کے کاموں کو بڑھانا شروع کرتے ہیں۔ ایسے ہی یہاں بھی سمجھ لیجئے۔ اس کارخانہ دنیا کے بڑھا دینے کا وقت ہو گا۔ اگر کیا جائے گا تو اس کا انتظار کیا جائے گا کہ ایک بار وہ دین تمام عالم میں پھیل جائے اور کوئی فرد بشر بظاہر ایسا نہ بچے کہ وہ دین خاتم النبیین ﷺ کا پابند نہ ہو۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر چیز ایک مصرف کے لئے ہوتی ہے۔ جب تک اس مصرف میں صرف نہ ہو اس کا ہونا بیکار ہے۔ روٹی پکائیں اور نہ کھائیں اور پانی لائیں اور نوش جان نہ فرمائیں تو کس کام کی روٹی اور کس کام کا پانی۔

دین خاتم النبیین کو دیکھا تو تمام عالم کے لئے دیکھا۔ وجہ اس کی یہ ہوئی کہ بنی آدم میں حضرت خاتم النبیین اس صورت میں بمنزلہ بادشاہ اعظم ہوئے۔ جیسے اس (بادشاہ اعظم) کا حکم تمام اقالیم میں جاری ہوتا ہے۔ ایسے ہی حکم خاتم یعنی دین خاتم تمام عالم میں جاری ہونا چاہئے۔ ورنہ اس دین کو لے کر آنا بے کار ہے۔

الغرض حضرت خاتم جیسے بمقابلہ معبود عبدِ کامل ہیں ایسے ہی بمقابلہ دیگر بنی آدم حاکم کامل ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں سب سے افضل ہوئے تو سب پر حاکم بھی ہوں گے اور اس لئے یہ ضرور ہے کہ ان کا حکم سب حکموں کے بعد صادر ہو۔ کیونکہ ترتیب احکامات سے ظاہر ہے کہ حکم حاکم اعلیٰ سب کے بعد ہوتا ہے۔ مگر جب حاکم اعلیٰ ہوئے تو یہ بھی ضرور ہے کہ ان کا حکم طوعاً وکرہاً ایک بار سب تسلیم کرلیں۔

غرض ''کمال عبادت'' تو عبادتِ خاتم میں ہے اور ''کمال سلطنتِ خاتم''۔

الحاصل علم خداوندی اور قدرت خداوندی اور تمام سامانِ قدرت خداوندی کا اس عالم کو اجمال کہیے اور کیونکر نہ کہیے، تفصیل ہوتی تو تمام معانی متشکل ہوتے۔

حاصل کلام

یہ ضرور ہے کہ جیسے بزور قوتِ نامیہ وقوتِ مصورہ مادہ بیضوی کی صورت منقلب ہو کر صورت بیضہ پاش پاش ہو جاتی ہے ایسے ہی بزور قوت نامیہ وقوت مصورہ یہ شکل عالم پاش پاش ہو کر مادہ عالم کو اور شکل عطا ہو۔

اثباتِ قیامت عام سیاسی نقطہ نظر سے

اور سنئے حکام دنیا کا یہ دستور ہے کہ جس شہر یا قصبے والے باغی ہو جاتے ہیں اور

راہ پر نہیں آتے تو ان لوگوں کو سزائے سخت پہنچاتے ہیں۔ یعنی ان کو توقتل کرتے ہیں یا دائم الحبس کرتے ہیں اور شہر کو جلا پھونک کر خاک سیاہ کر دیتے ہیں۔ اور عمارات کو توڑ پھوڑ، مسمار کر۔ اینٹ سے اینٹ مار دیتے ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ جرم بغاوت سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں۔ اس کے مناسب یہی ہے کہ وہ سزا دی جائے جس سے بڑھ کر کوئی سزا نہ ہو۔

مگر غور سے دیکھا تو بنی آدم رعیت خداوندی اور یہ زمین و آسمان ان کے رہنے کا مکان، کیونکہ ان ہی کے لئے بنایا ہے۔ چنانچہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔ پھر ان کا یہ حال کہ بالاتفاق تمام عالم میں تمرد اور سرکشی روز افزوں ہے۔ اگر کبھی راہ پر چند روز کے لئے آگئے تو وہ ایسا ہے جیسا چراغ مردہ سنبھالا لیتا ہے اس لئے ایسا ہونا یقینی ہے۔

روز جزاء کی حقیت اور عقلاً اس کی ضرورت

یہاں چند باتیں قابل غور ہیں:-

اول یہ کہ روزِ جزا کس دن کا نام ہے، اور اس کی کیا حقیقت ہے؟

دوسرے یہ کہ اللہ تعالی کی ملکیت تمام کائنات پر جس طرح روز جزا میں ہوگی ایسے ہی آج بھی ہے، پھر روز جزاء کی کیا خصوصیت ہے؟

جوابات:

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ روز جزاء اس دن کا نام ہے جس کو اللہ تعالی نے نیک و بد اعمال کا بدلہ دینے کے لئے مقرر فرمایا ہے، لفظ ''روز جزاء'' سے ایک عظیم الشان فائدہ یہ حاصل ہوا کہ دنیا نیک و بد اعمال کی جزاء و سزا کی جگہ نہیں۔ بلکہ ایک دار العمل فرض ادا کرنے کا دفتر ہے۔ تنخواہ یا صلہ وصول کرنے کی جگہ نہیں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ دنیا میں کسی کو عیش و عشرت، دولت و راحت سے مالا مال دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول و محبوب ہے۔ یا کسی کو رنج و مصیبت میں مبتلا پا

کر یہ نہیں قرار دیا جا سکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک معتوب و مبغوض ہے۔ جس طرح دنیا کے دفتروں اور کارخانوں میں کسی کو اپنا فرض ادا کرنے میں مصروف محنت دیکھا جائے تو کوئی عقل منداس کو مصیبت زدہ نہیں کہتا۔ اور نہ وہ خود اپنی مشقت کے باوجود اپنے آپ کو گرفتار مصیبت سمجھتا ہے بلکہ وہ اس محنت و مشقت کو اپنی سب سے بڑی کامیابی تصور کرتا ہے۔ اور کوئی مہربان اس کو اس مشقت سے سبکدوش کرنا چاہے تو وہ اس کو اپنا بدترین دشمن خیال کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اس تیس روزہ محنت کے پس پردہ اس راحت کو دیکھ رہا ہے جو اس کو تنخواہ کی شکل میں ملنے والی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور ان کے بعد اولیاء اللہ سب سے زیادہ مصیبت و بلا میں مبتلا ہوتے ہیں اور وہ اپنی اس حالت پر نہایت مطمئن اور بسا اوقات مسرور نظر آتے ہیں۔

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

الغرض دنیا کی عیش و عشرت حق و صداقت کی اور رنج و مصیبت بد عملی کی یقینی علامت نہیں ہے ہاں کبھی کبھی کسی کسی عمل کی جزاء یا سزا کا ہلکا سا نمونہ دنیا میں بھی ظاہر کر دیا جاتا ہے وہ اس کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، محض متنبہ کرنے کے لئے ایک نمونہ ہوتا ہے، اس کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے:

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ ط لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ.

ترجمہ: یعنی ہم لوگوں کو (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے (بعض اوقات) دنیا میں ایک عذاب قریب کا مزہ چکھا دیتے ہیں تا کہ وہ باز آ جائیں۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

كَذَٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ.

ترجمہ: ایسا ہوتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب بہت بڑا ہے، اگر وہ سمجھیں۔

الغرض دنیا کی راحت و مصیبت بعض اوقات تو امتحان اور آزمائش ہوتی ہے اور کبھی عذاب بھی ہوتی ہے مگر وہ عمل کا پورا بدلہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک نمونہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ چند روزہ اور محض عارضی ہے۔ مدار و معیار وہ راحت و کلفت ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے اور جو اس عالم کے گذرنے کے بعد عالم آخرت میں آنے والی ہے۔ اسی کا نام روزِ جزاء ہے اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ نیک و بد عمل کا بدلہ یا پورا بدلہ اس دنیا میں نہیں ملتا۔ اور عدل و انصاف اور عقل کا تقاضا ہے کہ نیک و بد، اچھا اور برابرابر نہ رہے۔ بلکہ ہر عمل کی جزاء یا سزا ملنی چاہیے۔

اس لئے ضروری ہے کہ اس عالم کے بعد کوئی دوسرا عالم ہو۔ جس میں ہر چھوٹے بڑے اور اچھے برے عمل کا حساب اور اس کی جزاء یا سزا انصاف کے مطابق ملے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں روز جزاء یا قیامت یا آخرت کہا جاتا ہے۔ قرآن نے خود مضمون کو سورۂ مؤمن میں وضاحت سے بیان فرمایا ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ط قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ. اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا. وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ.

ترجمہ: یعنی بینا اور نابینا اور (ایک) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور (دوسرے) بدکردار باہم برابر نہیں ہو سکتے۔ تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو۔ قیامت تو ضرور ہی آ کر رہے گی (تاکہ ہر ایک عمل کا پورا بدلہ اس کو مل جائے) اس کے آنے میں کسی طرح کا شک ہے ہی نہیں۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (معارف القرآن جلد-۱-صفحہ ۸۴)

خدا گناہوں کی سزا دنیا ہی میں کیوں نہیں دیدیتا

اعتراض:

منکرین قیامت اکثر یہ شبہ کیا کرتے ہیں کہ دنیا میں نیکی اور بدی کی جزاء اور سزا دینے سے کون مانع ہے اگر خدا تعالی ہے اور وہ بندوں کی زندگی جزا سزا دینے کے نیک و بد اعمال پر بھی نظر رکھتا ہے اور وہ جزا و سزا پر قادر ہے تو پھر اسی جہان میں کیوں بدلہ نہیں دیتا تا کہ جلدی قصہ طے ہو جائے۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی حکمت کاملہ کا مقتضی یہ ہے کہ اس بدلہ دینے میں قیامت کا انتظار کیا جائے اس لئے کہ انسان کی دو حالت ہیں: ایک اس کی یہ زندگانی، دوسری موت اور بعد کا زمانہ۔ پہلی حالت سزا و جزا کے لئے کافی نہیں اس لئے دوسری حالت پر موقوف رکھا ہے کیونکہ اس جہان میں انسان کی تمامی عمر دار آخرت کے لئے سامان جمع کرنے کے واسطے مقرر ہے کہ اخیر تک تحصیل کمالات کرے اور نیز ہر ایک کے ساتھ بہت سے لوگوں کے حقوق و آسائش بھی متعلق ہیں۔ اور نیز بعض ایسے بھی لوگ ہیں کہ جن پر ظلم و ستم ہوئے ہیں اور ظالم زندہ ہے مظلوم مر گئے اب اگر اس کو اسی جہان میں سزا دی جائے تو

(اول) تو اسی کو اس کہنے کی جگہ باقی رہے کہ جلدی کیوں کی؟ میں آئندہ توبہ و استغفار و عبادت کرنے کو تیار تھا مافات کی تلافی کا وقت مجھے باقی تھا۔

(دوم) اس کے سزا دینے سے اس کے متعلقین پر ایک مصیبت کا دروازہ کھلتا اس کے عیال و اطفال اور دیگر اہل حقوق اپنے حقوق سے محروم رہ جاتے۔

(سوم) جن مظلوموں پر ظلم ہوا اگر ان کے بعد ظالموں کو سزا ہوئی تو انہیں کیا؟ وہ دیکھتے تو دل ٹھنڈا بھی ہوتا ہے یا وہ اپنے حقوق کا اس سے مطالبہ کرتے ہیں۔

(چوتھے) اس عالم میں جزا و سزا ہونے پر بندوں کی وہ آزمائش جو دنیا میں آزادانہ زندگی پر منحصر ہے باقی نہ رہتی۔

اس لئے اس کی سزا و جزا کے لئے یہ زندگانی کافی نہیں بلکہ ایک دوسرا جہان ہے جہاں نہ یہ عذر باقی رہے گا کہ میرے لئے تلافی کا وقت باقی تھا۔ نہ اس کی جزا و سزا سے اس کے متعلقین کی آسائش میں کچھ فرق آئے گا نہ ان کے حقوق تلف ہوں گے۔ اور جہاں مظلوم بھی موجود ہوگا اور ظالم بھی ہوگا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر دل ٹھنڈا کرے گا۔ پس اس جہان کا انتظار کرنا چاہئے کیونکہ دنیا میں بھی بہت سی باتیں فوراً ہی نہیں ہو جایا کرتیں انتظار ہی کرنا پڑتا ہے۔ فجر کو دیکھو کہ اکثر لوگ اپنے کام اور ضرورتوں کے سرانجام کے لئے اس کا انتظار کیا کرتے ہیں، بیمار و عشاق تو رات میں تڑپ تڑپ کر صبح کی آرزو کیا کرتے ہیں۔ پرند اور چرند جب خالی پیٹ ہو جاتے ہیں تو صبح کے انتظار میں کلبلانے لگتے ہیں، علی ہذا القیاس۔ (تفسیر حقانی ۳۴۹/۵، ۳۵۰)

آخرت کا دن ایک ہزار سال ہونے کا مطلب

آیت مذکورہ میں جو یہ فرمایا ہے: **انّ یوما عند ربک کالف سنة.** یعنی آپ کے رب کے پاس ایک دن دنیا کے ایک ہزار سال کے برابر ہوگا۔ اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اس دن سے مراد قیامت کا دن لیا جائے اور اس کا ایک ہزار سال کے برابر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس دن کے ہولناک واقعات اور ہیبت ناک حالات کی وجہ سے یہ دن اتنا دراز محسوس ہوگا جیسے ایک ہزار سال، بہت سے حضرات مفسرین نے اس کے یہی معنی قرار دیئے ہیں۔ (اس کو اشتداد کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے)۔

دوسرے یہ کہ واقع میں عالم آخرت کا ایک دن ہمیشہ کے لئے دنیا کے ایک ہزار سال ہی کے برابر ہو بعض روایات حدیث سے اسی معنی کی شہادت ملتی ہے۔ (مسند احمد ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز

فقراء مہاجرین کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم کو میں قیامت کے روز مکمل نور کی بشارت دیتا ہوں اور یہ کہ تم اغنیاء اور مالداروں سے آدھا دن پہلے جنت میں جاؤ گے اور اللہ کے یہاں ایک دن ہزار سال کا ہوگا اس لئے فقراء اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ (رواہ الترمذی وحسنہ، مظہری)

خلاصۂ تفسیر میں اس دوسرے معنی کو بلفظ امتداد تعبیر کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

(معارف القرآن ۶:۲۷۴)

ایک شبہ کا جواب

سورۂ معارج میں جو آخرت کے دن کو پچاس ہزار سال کے برابر قرار دیا ہے کان مقدارہ خمسین الف سنة. اس میں بھی دونوں تفسیریں اشتداد و امتداد کی ہوسکتی ہیں اور ہر شخص کی شدت و مصیبت چونکہ دوسروں سے مختلف اور کم وبیش ہوگی اس لئے وہ دن کسی کو ایک ہزار سال کا محسوس ہوگا کسی کو پچاس ہزار سال کا۔ اور اگر دوسرے معنی لئے جاویں کہ حقیقۃً آخرت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا تو ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہوتا ہے کہ ایک میں ایک ہزار سال اور دوسری میں پچاس ہزار سال کا ذکر ہے تو اس کی تطبیق سیدی حکیم الامت قدس سرہٗ نے بیان القرآن میں فرمائی ہے جو اہل علم کے لئے علمی اور اصطلاحی الفاظ ہی میں نقل کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تفاوت ایک ہزار سال سے پچاس ہزار سال تک اختلاف آفاق کے اعتبار سے ہو جس طرح دنیا میں معدل النہار کی حرکت کہیں دولابی ہے کہیں حمائلی کہیں رجوی اور اسی وجہ سے خط استواء پر ایک رات دن چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے اور عرض تعین (قطب شمالی) پر ایک سال کا اور ان دونوں کے درمیان مختلف مقادیر پر مختلف ہوتا چلا جاتا ہے اسی طرح ممکن ہے کہ اول شمس کی حرکت جو معدل کے ساتھ ہے بطور خرق عادت و اعجاز اسقدر سست ہو جائے کہ ایک افق پر ایک ہزار سال کا دن ہو اور جو افق اس سے پچاس حصے ہٹا ہوا ہو اس پر پچاس ہزار برس کا ہو اور درمیان میں اسی نسبت سے

متفاوت ہو۔ واللہ اعلم (معارف القرآن ۶:۴:۲۷)

قیامت کا دن کتنا لمبا ہوگا؟

اعتراض: (بیں برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

سورت سجدہ میں لکھا ہے کہ قیامت کا دن ہزار سال کے برابر ہے اور سورت معارج میں ہے کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال اور سورت نحل میں آیا ہے کہ "وَمَا اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ بِالْبَصَرِ" قیامت کا معاملہ ایک لحہ میں ہو جائے گا۔

جواب: مولانا عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے تفسیر عزیزی میں لکھا ہے ہر معاملہ جو دنیا میں واقع ہوتا ہے ملائکہ اور ارواح اس حکم کے پورا کرنے اور اس کی تدبیر میں تنہا تنہا یا اجتماعی شکل میں شریک ہوتے ہیں شروع مقدمات سے لے کر انتہائے حصول مقصود تک اس میں مصروف رہتے ہیں جب مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو یہ فرشتے اور روحیں جہان سے آئیں تھیں وہیں عروج کر جاتی ہیں اس اعتبار سے کہ بعض اپنی کامل استعداد کو فعلیت سے بدل دیتے ہیں اور ان کو کمال کی ایک نوع حاصل ہوتی ہے اور ان کا عروج کی طرف رجوع کرنا بعینہٖ حواس و قوائے نفس انسانی کے رجوع کی طرح ہے جو لذت کے پورے ہونے اور مطلب کے حاصل ہونے کے بعد مطالب عمدہ سے لے کر وفور استعداد تک خود کو اپنے مالک کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور دوسرے داعیہ کے عمل کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی تو یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ اللہ تعالی کی طرف فرشتوں کے اٹھنے کا معنی دنیا میں اللہ کی تدبیروں کا مکمل کرنا ہے۔ اور یہ تدبیریں مختلف ہیں بعض ان میں سے ایک لمحہ کے اندر پوری ہو جاتی ہیں جیسا کہ حضرت جبرائیلؑ کے بارے میں منقول ہے کہ حضور علیہ السلام نے ان سے پوچھا کہ اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ مقامات کون سے ہیں؟ تو حضرت جبرائیل فوراً اوپر کی طرف عروج کر گئے اور جواب لے آئے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ مقامات مسجدیں ہیں اور بعض کام کی مقدار ایک دن

کے برابر ہوتی ہے۔ چنانچہ انسان کے روزانہ کے اعمال کو جو فرشتے لے کر جاتے ہیں تو وہ ایک دن میں اس عمل کو پورا کرتے ہیں صبح سے عصر تک اور عصر سے صبح تک اور ان فرشتوں کا ہمیشہ یہ معمول رہتا ہے اور بعض فرشتے تین چار روز میں یہ عمل کرتے ہیں۔ کہ سوموار اور جمعرات کے دن بندے کے کیے ہوئے اعمال کو اللہ کے سامنے پیش کرتے ہیں اور بعض ان میں سے ایک ہفتہ کی مدت میں عمل کرتے ہیں اور بعض ایک ماہ اور بعض ایک سال کی مدت میں جیسا کہ وہ فرشتے جو رزق کے پہنچانے پر مؤکل ہیں اور ایک سال کے کاموں کے بارے میں ان کی تعیین کی گئی ہے۔ جیسے لیلۃ البرات کی رات میں وہ آسمان کی طرف عروج کرتے ہیں علیٰ ہذا القیاس وہ بعض عمدہ تدبیرات جو طویل حکومتوں کے ختم کرنے کے اور باقی ماندہ ملتوں کے منقطع کرنے کے متعلق ہیں ایک ہزار سال کی مدت میں فرشتے یہ کام کر کے اوپر جاتے ہیں چنانچہ سورت الم سجدہ میں مذکور ہے اور تمام معلوم زمانوں میں طویل ترین بشری زمانہ اس عروج میں مدت تدبیر وقائع قیامت ہے۔ جو قیامت کے پہلے نفخے کی ابتداء سے لے کر بہشتیوں کے بہشت میں اور دوزخیوں کے دوزخ میں پہنچ جانے تک کے زمانے پر مشتمل ہے اور یہ پچاس ہزار سال کا عرصہ ہے۔ تمام فرشتے اور تمام اقسام کی مخلوقات کی روحیں اس میں شریک ہوں گی۔ اتنی مدت گزرنے کے بعد یہ بڑا کام سرانجام ہوگا۔ اس کے بعد یہ فرشتے عروج کر جائیں گے پس اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ پہلی آیت میں جس موت کا بیان ہے وہ اور کام کی مدت ہے اور جو دوسری آیت میں مدت کا بیان ہے یہ دوسرے کام کے متعلق ہے اور جس آیت میں **وما امر الساعة الا کلمح البصر اوھو اقرب** کا ذکر ہے یہ اللہ کے علم کے مطابق ہے اگرچہ قیامت کا قائم ہونا دیر سے ہوگا جیسے تم بھی کسی قریب آنے والی چیز کے بارے میں کہتے ہو **کلمح البصر اوھو اقرب** کہ اس کے قریب ہونے میں مبالغہ کرتے ہو۔

(سوط اللہ الجبار ص ۲۶۴)

مولانا عبدالحق حقانی لکھتے ہیں:

اس کا جواب یہ ہے کہ اس روز بڑی سختی ہوگی اور نہایت دہشت وہیبت، سو یہ ہر ہر شخص کی نسبت جداگانہ ہوگی کیونکہ جیسا جرم ویسی دہشت، اور مصیبت کے دن کی درازی بمقدار مصیبت ہوا کرتی ہے۔ وہ دن تو ایک معمولی دن ہوگا۔ مگر کفار کو پچاس ہزار برس کے برابر معلوم ہوگا اور گنہگاروں کو ہزار برس کے برابر اور نیکوں کو فریضۂ نماز کے وقت کے برابر۔ پس اس لئے کبھی اس کو پچاس ہزار برس کے برابر کہہ دیا، کبھی ہزار برس کے، کبھی صلوٰۃ مکتوبہ کے۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ میں آیا ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ البتہ دراز معلوم ہوگا تکلیف کے سبب سے اور اس کی درازی کو اعداد مختلفہ کے ساتھ تعبیر کردیا۔ جیسا کہ جب ہم کو انکار محض منظور ہوتا ہے تو کہا کرتے ہیں تو سو بار بھی کہے گا تو یہ کام نہ کروں گا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس کے جواب میں کہہ دیتے ہیں تو ہزار بار بھی کہے گا تو نہ کروں گا۔ یہ بات ایک محاورہ کے متعلق ہے یعنی محض کثرت مراد ہے۔

(تفسیر حقانی جلد۳/صفحہ۵۸۶-۵۸۷)

قیامت کے دن کی مقدار کتنی ہے؟

جواب: فی یوم سے مراد جمہور کے نزدیک قیامت کا دن ہے۔ بعض کہتے ہیں دنیا کا دن ہے۔

مقدار خمسین الف سنة پچاس ہزار برس کی درازی جمہور کے نزدیک در اصل ہوگی۔ لیکن ایمان داروں کے حق میں نہ ہوگی، دلیل اس پر آیت اصحب الجنة یومئذ خیر مستقرا واحسن مقیلا. اور یہ حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے جو ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ یا حضرت پچاس ہزار برس کی درازی اس دن کی بڑی درازی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے اس کی قسم کہ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے وہ مؤمن پر بہت کم ہوگا

یہاں تک کہ وہ دن نماز پڑھنے کے وقت کے برابر ہوگا۔
(اخرجہ احمد وابویعلی وابن جریر وابن ابی حاتم والبیہقی فی البعث)

لیکن اس کی سند میں دراج وابی الہیثم دوراوی ضعیف ہیں۔ اسی طرح ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ اس دن کی درازی مؤمن پر اس قدر ہوگی کہ جس قدر عصر اور ظہر کا وقت ہے (اخرجہ ابن ابی حاتم والحاکم والبیہقی)۔

بعض کہتے ہیں عدد حقیقۃً مراد نہیں بلکہ درازی مراد ہے اس تقدیر پر اس آیت اور سورہ سجدہ کی اس آیت میں **یدبر الامر من السماء الی الارض ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ مما تعدون.** کچھ بھی منافات نہیں کس لئے کہ اسی درازی کو کبھی ہزار برس سے کبھی زیادہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اول تقدیر پر مطابقت یوں ہوگی کہ دنیا سے لے کر اول آسمان تک مقدار رفعت ہزار برس ہے اور اسفل عالم سے لے کر انتہاء عرش تک پچاس ہزار پس سورہ سجدہ میں اول رفعت بیان ہوئی اور اس سورت میں دوسری کچھ بھی منافات نہیں۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ اس سے کثرت اندوہ ورنج مراد ہے اور رنج واندوہ کے دن کی درازی محاورہ میں بہت بڑی بیان کی جاتی ہے۔ شب فراق اور روز جدائی و ایام مصیبت کی درازی ہزاروں برس کی بیان کرنا کمال بلاغت اور قوم کی بول چال کی رعایت ہے نہ کہ جھوٹ یا مبالغہ۔

(۱) ان اقوال پر لحاظ کر کے آیت کے معنی میں چند اقوال ہیں:

(۲) یہ کہ ملائکہ اور ارواح (جو اس عالم کی تدبیر وتصرف میں مصروف ومعین تھے جن کی طرف **ذی المعارج** میں اشارہ تھا۔ اس لئے کہ ہر چیز عالم کے ساتھ ایک فرشتہ اور روح مدبر حق سبحانہ کی طرف سے معین ہے وہی اس مادہ کو ان قوالب میں ڈھال رہے ہیں اور وہ بحکم الٰہی ان کے نمو اور بقاء اور استکمال وتولید وتناسل وتوالد کے محافظ ہیں) سب اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو جائیں گے اور چونکہ وہ نور ہیں

اپنے حیز اصلی نور الانوار حق سبحانہ تعالی کی بارگاہ قدس تک چڑھیں گے اور وہ بارگاہ عالم ناسوتی سے بہت بلند ہے یہاں تک کہ اگر کوئی تیز رفتار چڑھ کر جائے تو پچاس ہزار برس میں بھی وہاں تک نہ پہنچے۔ اور یہ کس دن ہوگا قیامت کے دن جو بڑا مصیبت کا دن ہوگا۔ اس تقدیر پر فی یوم تعرج کے متعلق ہوگا۔

(۲) یہ کہ اس روز جو بڑے سے بڑا عاقل اور ذکی فیصلہ کرنے بیٹھے تو پچاس ہزار برس میں بھی فیصلہ نہ کر سکے اور وہ ایام دنیا کے آدھے دن میں کر دے گا۔ اور اس دن ملائکہ اور روح اپنے اپنے مواضع و مواقع رفعت میں بہت جلد عروج کر جائیں گے اگر اور کوئی وہاں تک چڑھے تو پچاس ہزار برس میں چڑھ سکے۔ یہ وہب اور مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔

(۳) ابی مسلم کہتے ہیں کہ یہ دنیا کا تمام دن ہے جس کی ابتداء اول آفرینش اور انتہاء آخر فنا ہے پھر حق سبحانہ نے بیان فرمادیا کہ دنیا کے دن میں ملائکہ کا عروج ونزول ضرور ہے اور اس دن کی مقدار پچاس ہزار برس ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم کو قیامت کا دن وقت معلوم ہو جائے اس لئے کہ نہیں معلوم کہ اس دن میں سے کس قدر گزر گیا اور کس قدر باقی رہا۔ (تفسیر کبیر)

(۴) صاحب عرائس فرماتے ہیں کہ ملائکہ اور روح کے عالم ملکوت میں مقامات معینہ ہیں، پھر جب کوئی فرشتہ موقع نزول سے مرتبہ معلومہ کی طرف چڑھتا ہے تو ایک ایسے دن بھر میں چڑھتا ہے کہ جس کی مقدار ہمارے نزدیک پچاس ہزار برس کے مساوی ہے اور وہ تو ایک ساعت سے بھی کم (وقت) میں چڑھ جاتے ہیں۔ اور حق کے لئے کوئی مکان اور منتہی نہیں کہ جہاں مخلوق چڑھ کر جاتی ہو بلکہ اس کی عزت وجلال کا ظہور ہر ذرہ سے عیاں ہے پھر جب قرب و بعد مسافت نہیں اور افہام اور اوہام اٹھا دیئے تو روح کے حق سبحانہ تعالی کے ساتھ وصال میں کچھ دیر نہیں۔

(تفسیر حقانی ۵/۶۸،۶۹)

وزنِ اعمال کس طرح ہوگا

بخاری و مسلم میں براویت ابو ہریرہؓ یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز بعض موٹے فربہ آدمی آئیں گے جن کا وزن اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوگا۔ اور اس کی شہادت میں آپ ﷺ نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی:

فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا.

یعنی قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قرار نہ دیں گے۔ (مظہری)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مناقب میں یہ حدیث آئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ان کی ٹانگیں ظاہر میں کتنی پتلی ہیں لیکن قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ قیامت کے میزانِ عدل میں ان کا وزن احد پہاڑ سے بھی زیادہ ہوگا۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث جس پر امام بخاری نے اپنی کتاب کو ختم کیا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر بہت ہلکے ہیں مگر میزانِ عمل میں بہت بھاری ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہیں اور وہ کلمے یہ ہیں:

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ.

(بخاری: آخری حدیث)

اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے۔ کہ سُبْحَانَ اللّٰهِ کہنے سے میزانِ عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے باقی آدھا پورا ہو جاتا ہے۔

اور ابوداؤد، ترمذی، ابن حبان نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابو الدرداءؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میزانِ عمل میں حسن خلق کے برابر کوئی عمل

وزنی نہیں ہوگا۔

اور حضرت ابوذر غفاریؓ سے رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں ایسے دو کام بتاتا ہوں جن پر عمل کرنا انسان کے لئے کچھ بھاری نہیں۔ اور میزان عمل میں وہ سب سے زیادہ بھاری ہوں گے۔ ایک حسن خلق، دوسرے زیادہ خاموش رہنا۔ یعنی بلا ضرورت کلام نہ کرنا۔

اور امام احمدؒ نے کتاب الزہد میں بروایت حضرت حازمؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مرتبہ جبرئیل امین تشریف لائے تو وہاں کوئی شخص خوف خدا تعالیٰ سے رو رہا تھا تو جبرئیل امین نے فرمایا کہ انسان کے تمام اعمال کا وزن ہوگا مگر خدا و آخرت کے خوف سے رونا ایسا عمل ہے جس کو تولا نہ جائے گا۔ بلکہ ایک آنسو بھی جہنم کی بڑی سے بڑی آگ کو بجھادے گا۔ (مظہری)

ایک حدیث میں ہے کہ میدان حشر میں ایک شخص حاضر ہوگا جب اس کا نامۂ اعمال سامنے آئے گا تو وہ اپنے نیک اعمال کو بہت کم پاکر گھبرائے گا کہ اچانک ایک چیز بادل کی طرح اٹھ کر آئے گی اور اس کے نیک اعمال کے پلے میں گر جائے گی۔ اور اس کو بتلایا جائے گا کہ یہ تیرے اس عمل کا ثمرہ ہے جو تو دنیا میں لوگوں کو دین کے احکام و مسائل بتلاتا اور سکھاتا تھا۔ اور یہ تیری تعلیم کا سلسلہ آگے چلا تو جس جس شخص نے اس پر عمل کیا ان سب کے عمل میں تیرا حصہ بھی لگایا گیا۔ (مظہری عن ابن المبارک)

طبرانی نے بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کے میزان عمل میں سب سے پہلے جو عمل رکھا جائے گا وہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنے اور ان کی ضروریات پورا کرنے کا نیک عمل ہے۔

اور امام ذہبیؒ نے حضرت عمران بن حصینؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن علماء کی روشنائی جس سے انہوں نے علم دین اور احکام دین لکھے ہیں اور شہیدوں کے خون کو تولا جائے گا تو علماء کی روشنائی کا وزن شہیدوں

کے خون کے وزن سے بڑھ جائے گا۔

اس طرح کی روایاتِ حدیث قیامت کے وزن اعمال کے سلسلہ میں بہت ہیں۔ یہاں چند کو اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ ان سے خاص خاص اعمال کی فضیلت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان تمام روایاتِ حدیث سے وزن اعمال کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل کرنے والے...... انسان تولے جائیں گے۔ وہ اپنے اپنے عمل کے اعتبار سے ہلکے بھاری ہوں گے۔ اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نامہ اعمال تولے جائیں گے۔ اور بعض سے ثابت ہوتا ہے کہ خود اعمال مجسم ہو جائیں گے وہ تولے جائیں گے۔ امام تفسیر ابن کثیرؒ نے یہ سب روایات نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ ہوسکتا ہے کہ وزن مختلف صورتوں سے کئی مرتبہ کیا جائے، اور ظاہر ہے کہ پوری حقیقت ان معاملات کی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں اور عمل کرنے کے لئے اس حقیقت کا جاننا ضروری بھی نہیں، صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ہمارے اعمال کا وزن ہوگا۔ نیک اعمال کا پلہ ہلکا رہا تو عذاب کے مستحق ہوں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ حق تعالیٰ کسی کو خود اپنے فضل و کرم سے یا کسی نبی یا ولی کی شفاعت سے معاف فرما دیں اور عذاب سے نجات ہو جائے۔

کفار کے اعمال کا وزن ہوگا یا نہیں

سوال: ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ فلا تظلم نفس شیئاً. (انبیاء:۴۷) ہم قیامت کے دن انصاف کے لئے ترازو قائم کریں گے پھر کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔

یہ آیت...... اس آیت کے مخالف اور صریح نقیض ہے جس میں فلا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنا کے الفاظ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کفار کے

اعمال کا وزن نہیں ہوگا۔

جواب: اس آیت میں وزن نہ قائم کرنے سے مراد ان کے اعمال بد کی بے قدری مراد ہے۔ یعنی کفار کے اعمال بے قدر ہو جائیں گے۔ پس پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ کفار کے اعمال کو تولا جائے گا۔ دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ تولنے کے بعد ان کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ کیونکہ ان کے اعمال بے کار اور بے وزن ہوں گے اس لئے کہ اعمال کا وزن ایمان کے ساتھ ہوتا ہے جب ایمان نہیں تو کتنا اچھا عمل بھی کیوں نہ ہو اس کا آخرت میں کوئی وزن نہیں ہوگا۔ بلکہ ایسے کافر کو اس کے اچھے عمل کا انعام نیک نامی یا دنیا کی عیش و عشرت کی صورت میں دیدیا جائے گا۔

(امداد اللہ انور)

کیا کفار کا حساب ہوگا یا نہیں

لا یسال عن ذنبه انس و لا جان.

اعتراض: اس قسم کی آیات کی کہ جہاں نہ پوچھے جانے کا ذکر ہے وہ آیات مخالف نہیں کہ جہاں سوال کرنے کا ذکر آیا ہے (جیسا کہ یہ آیت **فوربک لنسئلنهم اجمعین** کہ تیرے رب کی یعنی اپنی قسم کہ ہم ہر ایک سے ضرور ہی پرسش کریں گے)۔

جواب: اس لئے کہ یہ سوال کرنا ایک مقام خاص پر مراد ہے اور نہ سوال کرنا دوسری جگہ ہوگا۔ یا یہ کہ وہ سوال کرنا بطور دریافت کرنے کے نہ ہوگا بلکہ سرزنش اور تہدید کے طور پر اور یہاں بھی سوال نہ کئے جانے سے یہی مراد ہے کہ بطور دریافت کے سوال نہ ہوگا اس لئے کہ ان کے چہروں سے معلوم ہو جائے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے۔ (امداد اللہ انور)

مردوں کا زندہ ہونا ہم نے آج تک نہیں دیکھا

اعتراض: (دیانند سرسوتی کا اعتراض)

مردوں کا زندہ ہونا ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔

جواب : آج تک ہم بھی باوجود دو ارب سال گزرنے کے ''پرلے'' (بالکل فنا) نہیں دیکھا اور اس کے بعد پرمیشور اگئی۔ وایو وغیرہ کو خلاف قاعدہ جوان پیدا کرکے دنیا کی آبادی چلائے گا اور آئندہ کو پھر شیر خوار پیدا کرے گا۔ سوامی جی جس طرح ''پرلے'' کا آنا کئی ارب سال کے بعد آپ مانتے ہیں یا جس طرح کوئی دمدار ستارہ سالہا سال بعد نکلا کرتا ہے۔ اسی طرح مردوں کے زندہ ہونے کا بھی ایک وقت ہے۔

(حق پرکاش صفحہ ۱۶۰)

انیسواں باب

جنت۔جہنم
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

جنت اور دوزخ کہاں ہے

عقلی (معقولی) جواب

یہ سوال از روئے عقل قابل استماع نہیں موجود ہونے کے لئے یہ لازم نہیں کہ ہم کو معلوم ہی ہوا کرے خود اس زمین پر ہزار ہا مقامات اور اشیاء ایسی ہیں کہ ہم کو معلوم نہیں۔ پس اگر زمین و آسمان کے اندر ہو اور ہمیں معلوم نہ ہو تو کیا محال ہے اور اگر زمین و آسمان کے باہر ہو تو کیا ممتنع ہے۔ (المصالح العقلیہ)

جنت اور دوزخ کا مقام

نقلی (منقولی) جواب

بیہقی نے دلائل نبوت میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے روایت کیا ہے کہ جنت آسمان میں ہے اور جہنم زمین میں۔

اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ قرآن کریم میں جو یہ آیا ہے کہ قیامت کے روز جہنم کو لایا جائے گا و جیئ یومئذ بجھنم، اس کا مطلب یہ ہے کہ جہنم کو کہاں سے لایا جائے گا تو آپ نے فرمایا کہ جہنم کو ساتویں زمین سے لایا جائے گا۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم ساتویں زمین میں ہے وہیں سے بھڑک کر سارے سمندر اور دریا اس کی آگ میں شامل ہو جائیں گے اور سب کے سامنے آ جائے گی۔ (معارف القرآن جلد ۶ صفحہ ۶۹۵)

جنت ساتویں آسمان کے اوپر عرش رحمٰن کے نیچے ہے۔ گویا ساتواں آسمان جنت کی زمین اور عرش رحمٰن اس کی چھت ہے۔ دوزخ کا محل وقوع کسی آیت قرآن یا روایتِ حدیث میں صراحۃً نہیں بتلایا۔ سورہ طور کی آیت وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ

سے بعض مفسرین نے یہ مفہوم نکالا ہے کہ دوزخ سمندر کے نیچے زمین کی گہرائی میں ہے۔ جس پر اس وقت کوئی بھاری اور سخت غلاف چڑھا ہوا ہے جو قیامت میں پھٹ جائے گا اور اس کی آگ پھیل کر پورے سمندر کو آگ میں تبدیل کر دے گی۔

زمانہ حال میں یورپ کے بہت سے ماہرین نے جو زمین کو برما کر ایک طرف سے دوسری طرف جانے کا راستہ بنانے کی کوشش سالہا سال جاری رکھی۔ اور بڑی سے بڑی مشینیں اس کام کے لئے ایجاد کیں۔ مختلف جماعتوں نے اس پر محنت خرچ کی۔ سب سے زیادہ جو جماعت کامیاب ہوئی وہ مشینوں کے ذریعہ زمین کی گہرائی میں چھ میل تک پہنچ سکی۔ مگر چھ میل کے بعد سخت پتھر نے ان کو عاجز کر دیا تو پھر دوسری جگہ سے کھدائی شروع کی۔ مگر وہی چھ میل کے بعد سخت پتھر سے سابقہ پڑا۔ متعدد جگہوں میں اس کا تجربہ کرنے کے بعد ان کی تحقیق یہ قرار پائی کہ چھ میل کی گہرائی کے بعد کوئی پتھر کا غلاف پوری زمین پر چڑھا ہوا ہے جس میں کوئی مشین کام نہیں کر سکتی۔ زمین کا قطر جو ہزاروں میل کا ہے اس میں سائنس کے اس عروج کے زمانہ میں سائنس کی رسائی صرف چھ میل تک ہو سکی۔ آگے پتھر کے غلاف کا اقرار کر کے اپنی کوشش چھوڑنا پڑی۔ اس واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ پوری زمین کسی پتھر کے غلاف سے بند کی ہوئی ہے اگر کسی روایت صحیحہ سے جہنم کا محل وقوع اس غلاف کے اندر رہنا ثابت ہو جائے تو کچھ بعید نہیں۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

(معارف القرآن ۶: ۲۰۰)

جنت کی نعمتوں پر سرسید کا اعتراض

سوال: وہ عالم اگر تسلیم بھی کیا جائے تو وہ ایک عالم قدس ہوگا کہ جس میں کھانا پینا عورتوں سے لذت اٹھانا عمدہ عمدہ باغ اور نہریں اور خوبصورت عورتیں عیش اڑانے کو کہاں؟ جنت یہ ہے کہ نفس ناطقہ اپنے ادراکات سے حظ اٹھائے گا اور جہنم اور

آگ یہ ہے کہ اپنے ملکاتِ رذیلہ اور حقائق الاشیاء کے نہ جاننے پر بڑا تاسف کرے گا، پچھتائے گا۔

جواب: یہ سب چیزیں عالم قدس میں موجود ہیں اور پھر عالم قدس کے تقدس میں کوئی بھی فرق نہیں آتا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ عالم اس عالم کا دوسرا پہلو ہے یہاں جو کچھ ہے وہ وہیں کا ظل ہے اور پھر یہاں کی چیزیں وہاں جا کر متمثل ہو جاتی ہیں۔ اس سرِ مکتوم کا اظہار نہ تحریر سے ہو سکتا ہے نہ تقریر سے انبیاء علیہم السلام یا ان کے متبعین پر کچھ کشف وشہود سے یہ راز کھلا وہی خوب جانتے ہیں۔ البتہ سمجھانے کے لئے ایک مثال یا نظیر (کہ جس کو اصل ممثل لہٗ سے ادنیٰ سی مناسبت ہے درنہ زمین و آسمان کا فرق ہے) بیان کرتا ہوں اور وہ یہ کہ آئینہ میں ہاتھی گھوڑے درخت بڑے بڑے پہاڑ اپنی حقیقی صورت پر دکھائی دیتے ہیں۔ اور جس طرح آئینہ سے بیرونی وجود میں باہم امتیاز ہے اسی طرح آئینہ کے وجود میں بھی ان چیزوں میں حقیقی امتیاز ہے۔ گھوڑا جدا دکھائی دیتا ہے اور ہاتھی الگ پھر چلتا ہوا اور پہاڑ وقار سے زانو جمائے ہوئے بیٹھا ہوا نظر آتا ہے آسمان و زمین بھی باوجود اس وسعت کے آئینہ میں موجود ہیں۔ حالانکہ بالشت دو بالشت کا آئینہ ہے اور اس میں ایسی بڑی بڑی چیزیں موجود ہیں پھر کیا بات صرف یہ کہ یہ چیزیں تو وہی ہیں مگر یہاں اور حال ہے اور باہر اور پس باہر کے حالات کو آئینہ فرض کر کے محال جاننا اور انکار کرنا کوتاہ فہمی ہے۔

اور سنئے! خواب میں جب کہ ہم لحاف میں منہ لپیٹ کر سوتے ہیں تو ہزاروں عجائبات دیکھتے ہیں۔ کبھی باغوں میں جاتے کھانا کھاتے جماع کرتے انزال کا اثر صبح کو کپڑے پر پاتے ہیں اسی طرح صدہا مصائب بھی دیکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ صورتیں صرف خیال میں ہوتی ہیں کہ جس میں ہاتھ بھر کی چیز کی بھی گنجائش نہیں نہ اس میں عورت آسکتی ہے نہ درخت گھس سکتا ہے۔ پس ان چیزوں کے وجود خارجی کے حالات سے وجود خیالی کا انکار کرنا اور یہ کہنا کہ یہ اس کی وسعت کے مخالف ہے جہل

مرکب ہے۔ یہی حال اس عالم کا ہے کہ وہاں سب کچھ ہے مگر یہاں جسم عنصری فانی اور وہاں لطیف باقی۔ اس رمز کی طرف اس آیت میں اشارہ کر دیا ہے:

فلا تعلم نفسٌ ما اخفی لهم مّن قُرَّةِ اَعْيُنٍ الآية.

اور اسی طرح حدیث میں وارد ہے:

قال رسول الله ﷺ: اعدّت لعبادی الصالحین مالا عین رآت ولااذن سمعت وما خطر علٰی قلب بشر. (رواہ البخاری ومسلم)

یہ شبہ بھی بے بنیاد وسوسہ ہے۔ (تفسیر حقانی ۱/۱۳۳، ۱۳۴)

خان صاحب کہتے ہیں کہ

جنت کی ماہیت جو خدا اور رسول نے آیت **فلا تعلم نفس ما اخفی لهم مّن قرّة اعين** اور حدیث **اعدّت لعبادی الصّالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علٰی قلب بشر** میں بتائی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو کوئی نہیں جانتا، اس لئے کہ انسان اسی چیز کو جان سکتا ہے کہ جو حواس خمسہ سے محسوس ہو اور جنت کا کسی نے حواس خمسہ سے حس نہیں کیا۔ پس اس کا بیان کرنا (گو خدا تعالیٰ ہی چاہے) محال بلکہ محال سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس لئے کہ انسان کی کیفیات دنیا رنج و خوشی کی بھی کوئی کیفیت نہیں بتا سکتا اس تقدیر پر اگر جنت کی حقیقت یہی باغ اور نہریں اور موتی اور چاندی اور سونے کی اینٹوں کے مکانات اور دودھ اور شراب اور شہد کے سمندر اور لذیذ میوے اور خوبصورت عورتیں اور لونڈی ہوں تو یہ آیت وحدیث کے برخلاف ہے۔ کیونکہ ان کو انسان جان سکتا ہے۔ غایۃ الامر اس قسم کی عمدہ چیزوں کو حواس سے نہیں جانتا تو یہ کچھ بات نہیں کیونکہ عمدگی ایک امر اضافی ہے اس کو جہاں تک ترقی دیتے جاؤ انسان کے دل میں اس کا خیال گزر سکتا ہے۔

پس یہ چیزیں بقدر طاقت بشری تمثیل کے طور پر سمجھانے کے لئے مذکور ہوئی ہیں ورنہ درحقیقت یہ بہشت میں نہیں اور بہشت و دوزخ راحتوں اور لذتوں اور رنج اور تکلیفوں کا نام ہے مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کے واسطے مصلحتاً بہت سی باتوں سے منع کرنا اور بہت سی باتوں کا عمل میں لانا بیان کرنا پڑتا ہے اور آدمی کی جبلی بات ہے کہ وہ کسی کام سے جو باز رہتا ہے تو کسی خوف سے اور کرتا ہے تو کسی لالچ سے پس اس راحت و رنج کو ہر نبی نے لوگوں کے حسب حال تعبیر کیا ہے۔ موسیٰ ؑ نے جنت کو فراخ دستی کثرت اولاد و مال و صحت و فتح مندی کے ساتھ اور دوزخ کو قحط و وبا مغلوبی کے ساتھ تعبیر کیا ہے کیونکہ بنی اسرائیل ان ہی باتوں سے رغبت اور ان ہی چیزوں سے نفرت رکھتے تھے اور محمد مصطفیٰ ﷺ نے ان کو ایسی تشبیہوں ...... میں بیان کیا ہے کہ جو تمام جہان کی طبیعتوں پر حاوی ہے۔ اس لئے کہ خواہ کوئی کسی گرم و سرد ملک کا رہنے والا ہو اس کو عمدہ مکان اور باغ اور خوبصورت عورت اور لذیذ کھانوں سے رغبت ہوتی ہے۔ اور آگ میں جلنے اور لہو پیپ کھانے سے دل ڈرتا ہے اور رفارہ مریعنی ناصحوں کا یہی کام ہے۔ انتہیٰ ملخصاً

اس قول کے اجمالی جواب کیلئے میں یہاں اس قدر کہتا ہوں

(۱) کہ آیت اور حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جنت کو کوئی نہیں جان سکتا بلکہ یہ مطلب ہے کہ جنت میں جو کچھ جزئیات امور دن بدن پیش آئیں گے۔ اور تفصیلی حالات ہیں ان کو کوئی شخص نہیں جان سکتا۔ اور نہ دل میں ان کا خیال آسکتا ہے۔ اس لئے کہ اس عالم کا اور ہی حال ہے اسی عالم میں دیکھئے کہ جنہوں نے لندن اور پیرس کے مکانات اور دیگر لوازمات عیش نہیں دیکھے، نہ ان کا نقشہ دیکھا نہ تفصیلاً حال سنا اور اس پر یہ شخص کسی گاؤں کا رہنے والا بھی ہو کہ جہاں چھپر اور کھپریل کے سوا اور

کچھ نہیں ہوتو کہہ سکتے ہیں کہ وہ جزئیات تفصیلاً اس کے خیال میں نہیں آسکتے باوجود یکہ اس سے وہاں کے اجمالی حالات بھی بیان کیے جائیں (کہ وہاں عمدہ عمدہ کمرے اور نفیس نفیس بلور وشیشے کے آلات وظروف اور نہایت خوبصورت خدّام اور نہایت عمدہ کھانے ہیں) مگر تب بھی باعتبارِ علم تفصیلی کے اس پر یہ صادق آتا ہے کہ اس نے نہ ان چیزوں کو آنکھ سے دیکھا ہے نہ کانوں سے سنا ہے نہ اس کے دل میں ان چیزوں کا خیال گزرا ہے۔

الغرض اجمالاً علم ہونا اور تفصیلاً اس علم کا سلب کرنا کچھ منافات نہیں رکھتا۔ جس نے ایسا غوجی بھی پڑھی ہوگی یہ تو وہ بھی جانتا ہوگا کہ تناقض میں اتحادِ جہت شرط ہے۔ پس جنت میں حور اور باغ اور دیگر امور مذکورہ فی القرآن کا ہونا اس آیت و حدیث کے برخلاف نہیں۔

(۲) اگر یہی مطلب تسلیم کیا جائے کہ آیت وحدیث سے جنت کی حقیقت کا مطلقاً علم نہ ہونا ثابت ہے تو پھر خان صاحب کا یہ کہنا بھی (کہ جنت و دوزخ کی حقیقت ہر طرح کا راحت و رنج اور یہ حُور و آگ جو بیان ہوئے تو تمثیلاً نہ کہ حقیقۃً الخ) آیت وحدیث کے برخلاف ہے کیونکہ وہاں تھا کہ کوئی جانتا ہی نہیں۔ یہاں جانا تو سہی اور نہیں اس قدر تو جنت کو جانا کہ وہ راحت ہے۔ **وفیہ تناقض صریح لاینفیہ من لہ ادنٰی شعور۔** (اس میں واضح تناقض ہے جس کو کوئی عقل مند نہیں کرسکتا)

(۳) اگر بفرض محال علم اور ادراک کا انحصار حواس خمسہ ہی پر تسلیم کیا جائے تو بندہ کے قصور سے خداوند تعالیٰ قادر میں کیوں عجز لازم آیا کہ جو اس کو جنت کا بتلانا محال بلکہ محال سے بھی بڑھ کر ہوگیا باوجودیکہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد ﷺ نے بلکہ آپ نے بیان کردیا۔ اب عام ہے کہ حقیقت جنت کا علم بالکنہ یا بکنہ ہو بالوجہ ہو یا بوجہ ہو۔

(۴) آپ کے نزدیک جنت اس راحت کا نام ہے کہ جس کو موسیٰ علیہ السلام نے ترقی رزق وغیرہ امور دنیا سے تعبیر کیا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس عالم میں آرام پانا جنت ہے۔ **وذٰلک فاسد لایقول به احد من اهل الکتاب و اهل الاسلام۔**

(۵) آپ کے بیان سے ثابت ہوا کہ دراصل جنت و دوزخ کچھ نہیں۔ پیغمبر یارِ فارمروں کو جب لوگوں کو کسی فعل یا اس کے ترک پر آمادہ کرنا منظور ہوتا ہے تو وہ جنت و دوزخ کا اڑتلہ بنا کر بیان کرتے ہیں۔ اور محض بے اصل بات کو (یعنی حور و قصور باغ وانہار کو یا آگ وطوق کو) شاعروں کی طرح خیالات بندی کر کے دکھلاتے ہیں۔ معاذ اللہ اس سے بڑھ کر کیا الحاد ہوگا۔ چند روز صبر کیجئے معلوم ہو جائے گا اور بالفرض آپ کا خیال صحیح نکلا تو ہمیں کیا فکر ہے۔ مگر جب آپ کا خیال غلط نکلا تو دیکھئے اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ بہرطور آپ خطرہ میں ہیں نہ کہ ہم۔ (تفسیر حقانی ۱/۱۳۶، ۱۳۷)

کیا جنت جہنم صرف ڈرانے یا خوش کرنے کیلئے ہے

اعتراض: (بعض معقولیوں کا اعتراض)

جنت و دوزخ کی کوئی چیز نہیں محض پھسلانے کیلئے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے۔

جواب: بعض کا خیال ہے کہ جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں ہے محض تخویف اور ترغیب کے لئے یہ نام بیان کئے گئے ہیں۔ (**نعوذ باللہ من ذٰلک**) ان لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن میں جتنی وعیدیں چوری، زنا، ظلم و ستم، کفر و معصیت پر ہیں یہ سب ایسی ہیں جیسے بچوں کو ڈرایا جاتا ہے کہ چپ رہو ہوا آ جائے گا۔ ایسے ہی جتنے انعامات جنت وغیرہ بیان کئے جاتے ہیں یہ بھی محض پھسلانا ہے جیسا کہ بچوں کو پھسلایا کرتے ہیں میں ان لوگوں سے جواب میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ بات ایک ادنیٰ حاکم کے کلام میں ہونا بھی سخت عیب ہے چہ جائیکہ احکم الحاکمین کے کلام میں ہو کیونکہ اس کو تو جھوٹ

موٹ بہکانا بولتے ہیں۔اور خدا تعالیٰ جھوٹ سے بالکل بری ہے۔

تعالیٰ اللہ من ذلک علوًا کبیرًا

وَمن اصدق من اللہ حدیثاً.

لیکن اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ جنت و دوزخ محض ترغیب و ترہیب کے لئے ہے اور واقع میں کچھ بھی نہیں تو رغبت و رہبت اسی وقت تک ہو سکتی ہے جب تک کہ مخاطب کو یہ راز معلوم نہ ہو۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ بعد اصل حال معلوم ہو جانے کے یہ ترغیب و ترہیب ایک غیر واقعی امر ہے رغبت و خوف بالکل نہیں رہ سکتا۔ پھر ان لوگوں کا اس امر کے معلوم ہونے کا دعویٰ کرنا کہ جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں سراپا غلط ٹھہرا۔

غرض اول تو اس کے خلاف واقعہ جاننے سے معاذ اللہ کلام اللہ پر لغویت کا دھبہ آتا ہے جس کو کوئی کلام الٰہی کے لئے ہر گز گوارا نہیں کر سکتا۔ پھر جو مقصو حضور علیہ السلام کو ان وعیدوں اور ان کاموں کے بیان کرنے سے ہے کہ لوگوں کو مکلّف و مقید بنایا جائے۔ اس صورت میں ہر گز حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایسا شخص جس کا ان وعیدوں کے بارے میں ایسا خیال ہے کہ یہ غیر واقعی ہیں یقیناً ارتکاب جرائم میں دلیر ہوگا۔ اول تو یہ سب کے سامنے جو چاہے کرے گا اگر سامنے کرنے میں کسی کا پاس ولحاظ ہو تنہائی میں تو ہر گز نہ چوکے گا۔ مثلاً فرض کرو ایک شخص اس خیال کا جنگل میں ہے اور وہاں ایک دوسرا شخص بھی موجود ہے۔ سوائے ان دو شخصوں کے وہاں کوئی موجود نہیں نہ پولیس نہ چوکی کا پہرہ اب فرض کرلو کہ اتفاق سے اس دوسرے شخص کی موت آگئی اور اس کے پاس ایک لاکھ روپے کا نوٹ ہے اور اس کے کاغذات سے اس کا پتہ بھی معلوم ہو گیا کہ فلاں خاندان کا فلاں شہر کا باشندہ ہے اور یہ بھی اسے خبر ہے کہ وارث ایک یتیم بچہ ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر اس واقعہ کی کسی کو خبر نہیں کہ یہ شخص کہاں مرا۔ اور اس کے پاس مرتے وقت کیا سامان تھا نہ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے نہ مقدمہ چل سکتا ہے۔ بتلائیے ایسی حالت میں یتیم بچہ تک روپیہ پہنچا دینے پر کوئی قوت اس شخص کو سوائے

خوف خدا وعذاب آخرت کے مجبور کرسکتی ہے اور کیا ایسا شخص جو وعید الٰہی کو محض تخویف سمجھتا ہے اس روپے کو اصل وارث تک پہنچاوے گا۔ بالخصوص اس صورت میں جبکہ اس کو روپے کی حاجت بھی ہو۔ یہ اسی شخص کا کام ہے جو خدا کے تمام وعدے وعید کو حق سمجھتا ہے اور اس کے دل میں عذاب آخرت کا خوف ہے۔ اس کے عقیدے سے جہاں مصالح شرعیہ برباد ہوتی ہیں مصالح تمدنیہ بھی بالکل فوت ہوئے جاتے ہیں۔ اب آپ کو معلوم ہوگیا کہ تمدن کے لئے مذہب کی کس قدر ضرورت ہے صرف حکومت سے تمدن ہرگز نہیں قائم ہوسکتا۔ کیونکہ حکومت کا زور محض ظاہر تک منحصر ہے دل میں شائستہ اخلاق مذہب ہی سے پیدا ہوسکتے ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہے کہ تمدن کے مدعی مذہب کی ضرورت سے کیوں ناواقف ہیں۔ اگر کوئی ضروری چیز ہے تو مذہب اس سے پہلے ضروری ہوگا۔ مذہب کی ضرورت نہ مان کر کوئی تمدن قائم کرنا چاہے تو ناممکن ہے۔ دعوائے تمدن کے بعد مذہب سے لاپروائی کرنا ایسا ہی ہے کہ ؎

یکے بر سر شاخ و بن مے برید
خداوند بستاں نگہ کرد و دید

تو یہ لوگ جس تمدن کی شاخ پر بیٹھے ہوئے ہیں اسی کی جڑ کو کاٹ رہے ہیں پس عجیب بات ہے کہ قول سے تو ضرورت تمدن کی ثابت کی جاتی ہے اور فعل سے اس کی نفی کرتے ہیں۔ غرض آپ کو معلوم ہوگیا کہ جنت ودوزخ واقعی چیزیں ہیں۔

(وعظ شعب الایمان ص ۱۰۸)

حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

دنیا کی کوئی تکلیف راحت سے اور کوئی راحت تکلیف سے خالی نظر نہیں آتی۔ منافع مضرتوں سے مضرتیں منافع سے خالی نہیں غذا کیسی ہی لطیف اور عمدہ کیوں نہ ہو مگر پیشاب اور پاخانہ کی تکلیف سے خالی نہیں اور دوا کیسی ہی تلخ اور بدمزہ کیوں نہ ہو

وہ منافع سے خالی نہیں۔ بہر حال اس عالم میں تکلیف اور آرام نفع اور ضرر خوشی اور غم سب مخلوط اور ملے جلے ہیں۔

الخير والشر مقرونان في قرن.

یعنی یہاں خیر اور شر دونوں ایک ہی رسی میں بندھے ہوئے ہیں۔ جس طرح انسان کا مزاج عناصر اربعہ سے مرکب ہے۔ اسی طرح اس عالم کا مزاج تکلیف اور آرام اور نفع اور ضرر خیر اور شر دونوں سے مرکب واقع ہوا ہے۔

اور جو چیز مختلف اجزاء سے مرکب ہوتی ہے تو اس کے اجزاء کے لئے کوئی معدن اور منبع ضرور ہوتا ہے کہ ابتداء ترکیب میں ان اجزاء کو وہاں سے لیا گیا ہو اور وہ اجزاء مجتمعہ اگر منفصل ہو جائیں تو انفصال کے بعد اپنے اپنے معدن اور منبع میں پہنچ جائیں اور اپنی اپنی اصل میں جا ملیں۔

انسان میں حرارت اور برودت، رطوبت اور یبوست کے آثار ظاہر ہونے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جسم مختلف التاثیر اور مختلف المزاج اجزاء سے مرکب ہوا ہے ورنہ ایک شے سے دو مختلف اور متضاد کیفیتوں کا پیدا ہونا محال ہے۔ پس ضروری ہے کہ ہر ایک کے لئے جدا جدا مخزن اور علیحدہ علیحدہ معدن ہو۔ اس لئے حکماء نے غور وخوض کے بعد اس کا سراغ لگایا کہ حرارت کا مخزن کرۂ آگ ہے۔ اور رطوبت کا معدن کرۂ آب ہے اور یبوست اور برودت کا منبع کرۂ زمین اور طبقہ ہوا ہے۔

اور جب جسم انسانی کی ترکیب کا شیرازہ بکھر جاتا ہے تو پھر تحلیل کے بعد تمام اجزاء اپنی اپنی اصل میں جا ملتے ہیں۔ اس لئے تجزیہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اگر کسی جزء خاکی کو سطح زمین سے کتنا ہی بلند کیوں نہ لے جائیں جب اس کو چھوڑیں گے زمین ہی کی طرف دوڑے گا اور اگر کسی جز ہوائی کو کتنا ہی زیر آب لے جائیں جب چھوڑیں گے تو اوپر ہی جائے گا۔ آگ کا یہ حال ہے کہ اوپر کو دوڑتی ہے مشعل کا سر کتنا ہی نیچے جھکائیے مگر شعلہ اوپر ہی کی طرف جائے گا۔

اسی طرح اس عالم کو جس کا مزاج کلفت اور راحت خوشی اور غم سے مرکب ہے۔ حرارت اور برودت وغیرہ کی طرح کلفت اور راحت کا جدا جدا معدن اور خوشی اور غم کا علیحدہ علیحدہ مخزن ہونا چاہئے۔ ایک معدن راحت و آرام کا ہو جہاں تکلیف اور رنج کا نام ونشان نہ ہو۔ اسی کو اہل اسلام جنت اور بہشت کہتے ہیں اور ایک معدن کلفت اور منبع مصائب و آلام ہو کہ جاں راحت و آرام کا نام ونشان نہ ہو۔ اسی کو اہل اسلام جہنم اور دوزخ کہتے ہیں۔

اور جب اس عالم کا شیرازہ بکھر جائے تو دونوں قسم کے اجزاء اپنے اپنے ٹھکانہ پر پہنچ جائیں اور اپنی اپنی اصل سے جا ملیں۔ اخیار و ابرار یعنی نیک اپنے ٹھکانہ پر پہنچ جائیں اور اشرار و فجار یعنی بد اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں۔ خلاصہ یہ کہ جس طرح حرارت و برودت یبوست اور رطوبت ان کیفیات جسمانیہ کے لئے جدا جدا طبقہ ماننا لازم ہے۔ اسی طرح تکلیف و آرام کے لئے بھی علیحدہ علیحدہ طبقہ ماننا لازم اور ضروری ہے۔

اور جس طرح معدن حرارت یعنی کرۂ نار کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں برودت کا نام ونشان نہ ہو اور معدن برودت یعنی ہوا کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں حرارت کا نام ونشان نہ ہو۔ اسی طرح معدن راحت و آرام یعنی بہشت کے لئے ضروری ہے کہ اس میں تکلیف، رنج و غم کا نام ونشان نہ ہو اور معدن مصائب و آلام۔ یعنی دوزخ کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں راحت و آرام کا نام ونشان نہ ہو۔

ایک ضروری تنبیہ:

قرآن اور حدیث میں جو جنت اور جہنم کی نعمتوں اور مصیبتوں کی تفصیل آتی ہے۔ ان میں کوئی امر بھی محال اور خلاف عقل نہیں۔ خصوصاً جبکہ ان کا نمونہ دنیا میں بھی دکھلا دیا گیا تو پھر انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

جو لوگ جنت اور جہنم کا مذاق اڑاتے ہیں وہ درحقیقت اپنی عقل کا مذاق اڑاتے ہیں کہ بے سوچے سمجھے ایک ممکن شئے کو محال سمجھ کر ٹھٹھا کر رہے ہیں۔

اللہ یستھزئ بھم ویمدھم فی طغیانھم یعمھون.

الغرض قرآن کریم کی بے شمار نصوص اور بے شمار احادیث سے ثابت ہے کہ کفار ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور کبھی ان کی نجات نہ ہوگی اور اسی پر تمام کا اجماع اور اتفاق ہے۔ جیسا کہ شرح مواقف اور شرح مقاصد اور کتب کلامیہ میں اس کی تصریح ہے کہ اسی پر تمام امت کا اجماع ہے اور عقل سلیم بھی اس کو تسلیم کرتی ہے کہ کفر اور شرک سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں۔ حاکم الحاکمین اور اس کے وزراء یعنی انبیاءؑ اور مرسلین سے کھلی ہوئی بغاوت ہے اس کی سزا دائمی عذاب ہی ہونی چاہئے۔ جیسے ایمان کی جزاء دائمی ثواب ہے۔ نیز اگر کافر کی مغفرت ممکن ہو تو پھر انبیاءؑ کرام کی بعثت سے کیا فائدہ ہوا اور صحیفے کس لئے نازل ہوئے اور امتوں پر عذاب کیوں آیا۔ مقصود ان سب سے کفر کا دروازہ بند کرنا ہے۔ لہٰذا اگر کافر کی مغفرت ممکن ہو تو پھر کفر کا دروازہ بند نہ ہوگا۔

علاوہ ازیں کافر کا ارادہ اور اس کی نیت یہ تھی کہ اگر عمر دوائی میسر آتی تو ہمیشہ اسی کفر پر قائم اور دائم رہتا اس کے ارادہ اور اس کی نیت کے اعتبار سے دائمی عذاب اس کے لئے تجویز ہوا۔

جنت میں ہمیشہ رہنے پر شبہ

شبہ:

قرآن میں جنت اور جنتیوں کے متعلق خَالِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا (ہمیشہ اس میں رہیں گے) وارد ہے جس سے صاف واضح ہے کہ جنت کو کبھی فنا نہ ہوگا۔ نہ اہل جنت کبھی اس سے نکلیں گے۔

مگر اس کے متعلق ایک آیت سے طالب علمانہ اشکال ہوتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اس آیت سے اس عقیدہ میں کوئی تردد یا تزلزل وتذبذب لازم آیا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ شاید بعض ضعیف الفہم طبیعتوں کو اس سے خلجان ہو جائے۔ اس لئے میں اس اشکال کو بطور جملہ معترضہ کے یہاں پر رفع کر دینا چاہتا ہوں۔ جو ان شاء

اللہ مفید ہوگا وہ یہ کہ سورہ ہود کی ایک آیت ہے:

فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّ سَعِيْدٌ. فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ. خَالِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ط اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ. وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ ط عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ.

ترجمہ: پھر (آگے) ان میں (یہ فرق ہوگا کہ) بعضے تو شقی (یعنی کافر) ہوں گے اور بعضے سعید (یعنی مؤمن) ہوں گے سو جو لوگ شقی ہیں وہ تو دوزخ میں ایسے حال میں ہوں گے کہ اس میں ان کی چیخ پکار پڑی رہے گی (اور) ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں ہاں اگر خدا ہی کو (نکالنا) منظور ہو تو دوسری بات ہے (کیونکہ) آپ کا رب جو کچھ چاہے اس کو پورے طور سے کر سکتا ہے اور رہ گئے وہ لوگ جو سعید ہیں سو وہ جنت میں ہوں گے (اور) وہ اس میں داخل ہونے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں ہاں اگر خدا ہی کو (نکالنا) منظور ہو تو دوسری بات ہے وہ غیر منقطع عطیہ ہوگا (یعنی ختم نہ ہونے والا)۔

اس میں اہل جنت و اہل جہنم دونوں کے لئے خالدین فیھا کے ساتھ ما دامت السمٰوات والارض. کی قید ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ جنت و نار میں خلود مطلق نہ ہوگا بلکہ مقید بقاء سمٰوات و الارض ہوگا اور اگر اس میں کچھ تاویل بھی کر لی جائے تو آگے اِلَّا مَاشَاءَ رَبُّكَ میں دوام سے استثناء ہے یہ بھی خلود کو مقید بالمشیت کر رہا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ خلود لازم نہیں۔ بلکہ مشیت پر ہے کہ جب چاہیں باہر نکال دیں۔

جواب: اب سنئے کہ ما دامت السموٰات والارض کی تو دو توجیہیں ہیں ایک علماء ظاہر کے قول پر ایک صوفیہ کے قول پر یہ مطلب نہیں کہ جواب ثانی میں کچھ اصول تصوف کو دخل ہے بلکہ چونکہ وہ توجیہ علماء صوفیہ سے منقول تھی اس لئے میں نے علماء صوفیہ کی طرف اس کو منسوب کر دیا۔

علماء ظاہر نے تو یہ کہا ہے کہ سموٰت والارض سے اس آیت میں یہ آسمان و زمین مراد نہیں بلکہ جنت و دوزخ کے آسمان و زمین مراد ہیں۔ کیونکہ عالم آخرت میں بھی آسمان و زمین موجود ہیں۔

مولانا رومی فرماتے ہیں

غیب را ابرے و آبے دیگر است
آسمانے آفتابے دیگر است

حکیم سنائی فرماتے ہیں ؎

آسماں ہاست درولایت جاں
کار فرمائے آسمانِ جہاں

دررہ روح پست و بالا ہاست
کوہ ہائے بلند و صحرا ہاست

گوان اشعار میں جنت و دوزخ کا بیان نہیں بلکہ لطیفہ قلب کی وسعت کا ذکر ہے کہ اس میں بھی عالم محسوس کا نمونہ موجود ہے۔ مگر میں نے مناسبت کی وجہ سے ان کو پڑھ دیا ہے۔ کیونکہ اس کو عالم آخرت سے بہت مناسبت ہے۔ بہر حال اب وہ اشکال ختم ہو گیا کیونکہ جب جنت و دوزخ کے لئے خلود ثابت ہے تو ان کے سماوات وارض کے لئے بھی خلود ہوگا فنا نہ ہوگا۔ پس اب سعداء و اشقیاء کے خلود فی الجنۃ والنار کو مادامت السموات والارض کے ساتھ محدود کرنے سے اشکال تحدید کا نہیں ہو سکتا۔

رہا یہ شبہ کہ سموات والارض کا لفظ تو عربی لفظ ہے عربی لفظ سے وہی معنی مراد ہو سکتے ہیں جو لغۃً اس سے مفہوم ہو سکیں اوران الفاظ سے تو لغۃً عالم ناسوت کے آسمان و زمین مفہوم ہوتے ہیں نہ کہ جنت و دوزخ کے پھر یہ تاویل کیونکہ لفظ عام ہے فالسماء ما یظلک والارض ما یتلک. اور عموم کی دلیل یہ ہے کہ سماء وارض کو اہل لغت نے اس آسمان اور زمین کا علم نہیں قرار دیا ورنہ پھر چاہئے کہ آسمان دوم وسوم تا ہفتم کو اور اسی طرح طبقات ستہ ارض کو سماء وارض نہ کہہ سکیں کیونکہ اول اول تو لوگوں کو ایک ہی آسمان اور ایک ہی زمین کا علم ہوا تھا انہی کے علم ہو گئے بقیہ سموات وارضین کا علم تو بعد میں ہوا۔ (پھران پر یہ لفظ کیونکر صادق آیا۔بس جس طرح ان پر صادق آنا لغۃً صحیح ہے اسی طرح اگر اور فرد سماء یا ارض کا محقق ہو جائے اس پر بھی ان لفظوں کا اطلاق لغۃً صحیح ہوگا ۱۲ ظ)۔

دوسرے اسی میں اختلاف ہے کہ واضع لغت کون ہے راجح یہ ہے کہ حق تعالی واضع لغت ہیں اور انہوں نے آدم علیہ السلام کو سب اسماء کی تعلیم فرمادی تھی۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا.

(ترجمہ) اور علم دیا اللہ تعالی نے (حضرت آدم علیہ السلام) کو (پیدا کر کے) سب چیزوں کے اسماء کا۔

سماء وارض کو بمعنی علم ہی وضع فرمایا ہے جس میں جنت و نار کے سماء وارض بھی داخل ہیں۔گویا اہل لغت کو ان افراد کا علم نہ ہو۔چنانچہ جنت کے متعلق ارض کا اطلاق تو خود قرآن میں موجود ہے فرماتے ہیں:

وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ.

ترجمہ: اور ہم کو اس سرزمین کا مالک بنادیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں ٹھہریں:

اور بقیہ اطلاقات کی تصحیح کے لئے یہ نظیر کافی ہے۔

رہا یہ کہ اس تقیید سے فائدہ کیا ہوا کہ اول مادامت السمٰوات والارض کی قید لگائی پھر اس پر شبہ وارد ہوا پھر جواب کی ضرورت ہوئی۔

تو بات یہ ہے کہ اس قید کا فائدہ محاورات میں غور کرنے سے معلوم ہوگا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ لوگ آج کل علوم درسیہ پہلے پڑھتے ہیں۔ پھر قرآن کے الفاظ کو اصطلاحات درسیہ پر محمول کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اشکالات میں مبتلا ہوتے ہیں حالانکہ قرآن کا نزول محاورات پر ہے (اس وقت ان درسی اصطلاحات کا کہیں وجود بھی نہ تھا)۔

اب محاورات میں غور کر کے دیکھئے کہ اگر ہم کسی شخص کو اپنا مکان رہنے کے لئے دیں اور وہ یہ کہے کہ جناب یہ مکان مجھے کتنی مدت کے واسطے دیا گیا ہے اور یہ میرے پاس کب تک رہے گا۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ جب تک یہ مکان رہے گا اس وقت تک تمہارے ہی پاس رہے گا۔ بتلائیے کیا محاورات میں اس سے زیادہ کوئی عنوان دوام و بقاء سکونت کو ظاہر کر سکتا ہے ہرگز نہیں گو اس جگہ اس سے بحث نہیں ہوتی کہ اس مکان کو فی نفسہ دوام و بقاء ہے یا نہیں مگر سائل کو جو تردد ہوا تھا کہ شاید ایسا بھی ہو کہ یہ مکان رہے اور ہم اس میں نہ رہیں یہ شبہ اس جواب سے بالکل رفع ہوگیا اور اس عنوان سے زیادہ کوئی صورت تسلی کی نہیں اسی طرح یہاں بتلایا گیا ہے کہ جب تک جنت و دوزخ موجود ہیں (کیونکہ وجود عمارت کا سقف وارض ہی سے ہوتا ہے تو سمٰوات وارض جنت و نار کا وجود خود ان کا وجود ہے ۱۲)۔ اس وقت تک اہل جنت جنت میں اور اہل نار نار میں رہیں گے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ جنت کے ہوتے ہوئے جنتی اس سے نکال دیئے جائیں یا دوزخ کے ہوتے ہوئے دوزخ والے (یعنی کفار ۱۲) اس میں نہ رہیں اس عنوان سے اہل دار کا لزوم دار کے ساتھ بتلا دیا گیا جو اس کے بغیر ظاہر نہیں ہوسکتا تھا۔

رہا یہ کہ لزوم دائمی ہے یا محدود اس کو دوسرے مقام پر بیان کیا گیا ہے جہاں

خالدین فیہا کے ساتھ ابداً کی بھی تصریح ہے یہ توجیہ تو علمائے سے منقول ہے۔

اور بعض صوفیہ نے یہ کہا ہے کہ سمٰوات وارض سے مراد سمٰوات وارض ملکوت نہیں بلکہ یہی عالم ناسوت کے سمٰوات وارض مراد ہیں مگر بحالت موجودہ نہیں بلکہ بعد تبدیل کے کیونکہ جس طرح قیامت میں اموات زندہ ہوں گے اور مردے قبروں سے اٹھیں گے اسی طرح آسمان وزمین بھی دوبارہ پیدا ہوں گے ارشاد ہے: يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ. اور ظاہر ہے کہ مردے جو زندہ ہوں گے وہ بعینہ وہی ہوں گے جو مرنے سے پہلے تھے اسی طرح آسمان زمین بھی بعد حشر ونشر کے بعینہ یہی ہوں گے اور زمین کو جو نص میں غیر الارض کہا گیا ہے اس سے مغایرت بعض صفات کی مراد ہے۔ مثلاً اس وقت جبال واشجار اور پستی وبلندی نہ ہوگی بلکہ ساری زمین ہموار ہوگی اور مغایرت وصف سے تغایر ذات لازم نہیں آتا (دیکھو اگر کوئی کالا آدمی گورا ہو جائے تو یہ نہ کہیں گے کہ یہ دوسرا آدمی ہو گیا وہ نہیں رہا ۱۲)۔

اور شیخ اکبر کا کشف ہے کہ یہ سمٰوات وارض ناسوت بعد حشر ونشر کے پھر فنا نہ ہوں گے جیسے اہل سمٰوات وارض یعنی جن وانس بھی بعد حشر ونشر کے فنا نہ ہوں گے۔

پس خلود کو مادامت السمٰوات والارض کے ساتھ نص میں مقید کرنا عدم خلود اہل جنت وغیرہ کو مستلزم نہیں ہے کیونکہ حالت مذکورہ کے بعد یہ سمٰوات وارض بھی دائی و مستمر ہوں گے اور نص میں ان کی اسی حالت کے ساتھ خلود اہل جنت ونار کو مقید کیا گیا ہے تو اشکال نہ رہا۔

اور شیخ اکبر کا یہ کشف کسی نص کے بھی خلاف نہیں اور کوئی نص اس کی مصادم بھی نہیں اس لئے اس کے مان لینے کا مضائقہ نہیں مگر میں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ ہر کشف اپنی ذات سے ظنی ہے اس پر جزم (یقین) نہ کیا جائے کیونکہ اس میں امر غیر مجزوم فی نفسہٖ کے ساتھ جزم ہوگا جو کہ شرعاً جائز نہیں۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

ولا تقف مالیس لک بہ علم.

(اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر عمل درآمد مت کیا کرو)

اور ارشاد ہے: **ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً.**

اس لئے گو شیخ اکبر کا یہ کشف کسی نص سے مصادم نہیں مگر مؤید بالنص بھی نہیں ہے اس لئے اس پر یقین نہ کیا جائے پس بعد حشر ونشر کے آسمان وزمین کے خلود پر اعتقاد جازم نہ کیا جائے اور ایک جواب **مادامت السموٰت والارض** کے اس اشکال کا نہ ہو پس اس صورت میں خلود اہل جنت ونار کی بقاء سمٰوات وارض کے ساتھ تحدید کرنا اس اثر کے اعتبار سے جو عام ذہنوں میں ہے دوام واستمرار ہی کو مستلزم ومفید ہوگا کیونکہ عوام کے مذاق میں بیان دوام کی یہی صورت ہے۔ اسی لئے شیطان کے بارہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وان علیک لعنتی الی یوم الدین.

ترجمہ: تجھ پر قیامت تک میری لعنت ہے۔

اس سے مراد یہ نہیں کہ قیامت کے بعد لعنت نہ رہے گی بلکہ دوام مراد ہے اور محاورات میں دوام کو یوں ہی تعبیر کیا کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ بخدا میں قیامت تک یہ کام نہ کروں گا یعنی کبھی نہ کروں گا۔

اسی طرح **الی یوم الدین** اس نص میں بیان دوام واستمرار کے لئے ہے اور ایسے ہی **مادامت السموٰت والارض** عام بول چال اور عام محاورہ کے اعتبار سے دوام ہی کو مفید ہے (گو اہل معقول کے نزدیک مفید نہ ہو)۔

بہرحال **مادامت السموٰت والارض** کی قید کے تو متعدد جواب دیئے گئے ہیں مگر **الا ما شاء ربک** کی تاویل میں لوگ بہت چکر گئے ہیں۔

بعض نے تو کمال کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ استثنا عذیادت کے لئے ہے نقص و اخراج کے لئے نہیں مطلب یہ ہوا کہ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں بقاء سمٰوات

وارض تک رہیں گے مگر یہ کہ خدا چاہے اور بھی زیادہ رکھے کیونکہ بقاء سمٰوات وارض تو محدود ہے اور خلود جنت غیر محدود ہے اور ثانی کا اول سے زائد ہونا ظاہر ہے۔ مگر نہ معلوم یہ زیادت علی المستثنیٰ منہ استثناء کی کونسی قسم ہے۔

اور میرے نزدیک صحیح جواب اور لطیف وہ ہے جو شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے بیان فرمایا ہے جس کو میں اصطلاحی الفاظ میں بیان کرتا ہوں ورنہ شاہ صاحب نے تو ایسے سلیس عنوان سے بیان کیا ہے کہ عامی دیکھنے والا یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ اس جگہ شاہ صاحب نے اتنا بڑا مضمون حل کیا ہے۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ **الا ما شاء ربک** میں **ما** مصدریہ ہے **ای الا وقت مشیئة ربک کما فی قوله اتیتک خفوق النجم ای وقت خفوقه.** پس معنی یہ ہوئے کہ **یخلدون فیها الا وقت ان یشاء ربک عدم خلودهم فتقطع خلودهم.** (ہمیشہ رہیں گے اس میں مگر اس وقت کہ اللہ تعالی ان کے خلود کو نہ چاہیں پس اگر اللہ نے چاہا تو خلود ختم ہو جائے گا)۔

رہی یہ بات کہ اس قید کی ضرورت ہی کیا تھی اس کا جواب شاہ صاحب نے دیا کہ اس میں توحید کی حفاظت کی گئی ہے کہ خلود واجب اور خلود ممکن میں فرق ظاہر کر دیا گیا تاکہ کوئی خلود کی خبر سن کر بقاء دائم میں شریک ہو کر مساوات مع الواجب کا دعویٰ نہ کرنے لگے گو ہم جہنم میں جائیں گے سہی مگر یہ فخر تو ہمارے لئے ثابت ہو گیا کہ مثل واجب کے خلود و دوام کے ساتھ متصف ہو جائیں گے تو بتلا دیا گیا کہ مساوات کا دعویٰ کیا لئے پھرتے ہو تمہارے خلود میں اور واجب کے خلود میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ واجب کا خلود کسی کی مشیت کے تابع نہیں اور تمہارا خلود ہماری مشیت کے تحت میں ہے جب چاہیں سب کو کان پکڑ کے نکال سکتے اور سب کو فنا کر سکتے ہیں گو ایسا نہ کریں مگر ایسا نہ کرنے کی صورت میں بھی تم کو خلود اس طرح نصیب ہوگا کہ ہر دم ہماری طرف سے افاضہ وجود ہوگا ورنہ تم کیا وجود اپنے باپ کے گھر سے لائے تھے۔

نیا وردم از خانہ چیزے نخست
تو دادی ہمہ چیز، من چیز تست

تو حاصل یہ ہوا کہ خلود تو ہوگا لیکن اگر ہم چاہیں تو خلود نہ رہے۔

سبحان اللہ کیسی بات فرمائی ہے اور آپ کو حیرت ہوگی اگر آپ شاہ صاحب کے الفاظ دیکھیں کہ انہوں نے اصطلاحی الفاظ کو چھوڑ کر سلیس لفظوں میں کس طرح اس دقیق مضمون کو بیان فرمایا ہے اور یہ واقعی بڑا کمال ہے۔

اور دوسرا جواب میرے ذہن میں آیا ہے کہ **ما شاء ربک** میں ما بمعنی من اور محققین نے لکھا ہے کہ لفظ **ما** اصل لغت میں ذوی العقول وغیر ذوی العقول دونوں کے لئے عام ہے۔ اردو کی ''ماں'' بھی تو عام ہے (کہ انسان کی ماں بھی ماں ہے اور جانور کی ماں بھی ماں ہے) ہاں من ذوی العقول کے لئے خاص ہے اور یہ جو مشہور ہے کہ **ما** غیر ذوی العقول کے لئے خاص ہے صحیح نہیں۔ پس **الا ما شاء ربک** کے معنی ہیں۔ **الا من شاء ربک** ایک مقدمہ تو یہ ہوا کہ **ما** بمعنی **من** ہے دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ متکلمین نے عقائد میں یہ مسئلہ طے کر دیا ہے۔ **السعید قد یشقی والشقی قد یسعد**. شرح عقائد میں اس کی تصریح ہے۔

اور اس میں شقی وسعید سے وہ مراد نہیں جو علم الٰہی میں شقی یا سعید ہو بلکہ ظاہری سعید و شقی مراد ہے جن خاص حالات سے شریعت مؤمن و کافر کہتی ہے تو ایسا شقی یعنی کافر کبھی علم الٰہی میں سعید یعنی مؤمن ہوتا ہے اور اسی طرح کبھی سعید علم الٰہی میں شقی ہوتا ہے۔

مثلاً کوئی شخص ظاہر میں کافر معلوم ہوتا ہے ہمارے نزدیک تو وہ **خالدین فی النار** سے ہے لیکن ممکن ہے کہ مرتے ہوئے اس کو اسلام نصیب ہو جائے تو علم الٰہی میں وہ سعید ہو۔

جیسے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے نانوتہ میں ایک بنیا مرا مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اس کو خواب میں دیکھا کہ جنت میں پھر رہا ہے۔ پوچھا لالہ جی تم یہاں کہاں۔ کہا مولوی جی میں نے مرتے ہوئے کلمۂ شہادت پڑھ لیا تھا وہ قبول ہو گیا اور خدا تعالیٰ نے مجھے بخش دیا تو دیکھئے ساری عمر تو لالہ جی نے سود بٹا کھایا اور سود ہی میں جنت بھی لے مرا۔

ایسی نظیریں اور بھی نہ معلوم کتنی ہوں گی۔

اب آیت کا حل یوں ہوگا:

فاما الذین شقوا (وکفروا فی الظاهر) ففی النار لهم فیها زفیر و شهیق خالدین فیها مادامت السمٰوات والارض الا ما شاء ربک (أی الا من شاء ربک من الاشقیاء فیسعد ویؤمن ویدخل الجنة) واما الذین سعدوا (فی الظاهر) ففی الجنة خالدین فیها ما دامت السمٰوات والارض الا ما شاء ربک (ای الا من شاءه من السعداء فیشقی و یدخل النار).

حاصل یہ ہے کہ جو لوگ ظاہر میں سعداء ہیں وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ مگر جس کو خدا چاہے گا کہ بعضے سعید علم الٰہی میں شقی ہیں ان کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے وہ جنت میں نہ رہیں گے اور جو لوگ ظاہر میں اشقیاء ہیں وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے مگر جس کو خدا چاہے بعضے شقی علم الٰہی میں سعید ہیں ان کا خاتمہ اسلام پر ہونے والا ہے وہ جہنم میں نہ رہیں گے۔ اب اشکال کچھ نہیں رہا۔

مگر میں یہ پھر کہوں گا کہ شاہ عبدالقادر صاحب کا جواب بہت عجیب اور نہایت زوردار ہے۔ میں نے جو ما کو بمعنی من لیا ہے۔ یہ کچھ تاویل بعید نہیں بلکہ وَنَفْسٍ وَمَا سَوّٰاهَا اور وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا وغیرہ میں خود مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہاں ما بمعنی من ہے۔

دوسرے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک ایسی ہی آیت کی تفسیر میں ما کا بمعنی من کے ہونا منقول ہے پارہٗ ولو اننا کے دوسرے رکوع کے اخیر) میں یہ آیت:

وَقَالَ اَوْلِيَاۗءُ هُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا. قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ.

یہاں بھی کفار کے لئے خلود کو ثابت کر کے الا ما شاء اللہ سے استثناء کیا گیا ہے۔ پس یہاں بھی بعینہٖ وہی اشکال ہیں جو خالدین فیھا مادامت السموات والارض الا ما شاء ربک پر ہے جب وہاں ما بمعنی من صحیح ہوسکتا ہے۔ تو یہاں صحیح نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ پس میرا جواب ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول سے موید ہے اور مجھے اس کی بہت مسرت ہوتی ہے کہ اپنے قول کی تائید سلف کے اقوال میں مل جائے بعض لوگ تو سلف سے اپنا علم منقول دیکھ کر افسردہ ہو جاتے ہیں کہ ہائے ہمارا تفرد باطل ہوگیا اور میں خوش ہوتا ہوں کہ الحمد للہ وہیں ذہن گیا جہاں مقبولان الٰہی کا ذہن گیا تھا۔ اکابر کے علوم سے اپنے علوم کی موافقیت بڑی دولت ہے جو نعمت صحتِ مذاق و سلامتِ فہم کی علامت ہے۔ (البدائع صفحہ ۳۵۹ تا ۳۶۲)

خدا رحمٰن اور رحیم ہے تو جہنم کافروں سے کیوں بھرے گا؟

اعتراض: (بیس برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

اکثر قرآن پاک کی آیات میں آیا ہے کہ خدا رحمٰن اور رحیم ہے اور سورت اعراف کی اور سورت ھود کی آیات میں اس کے خلاف ہے کہ اللہ تعالی نے بہت سے جنات اور انسانوں کو جہنم کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ بلا شک خلاف رحمت ہے۔

جواب: جو اعتراض معترض نے کیا ہے یہ خود ان کے مذہب کی کتاب بید سے ثابت ہے کہ یہ جہان مجموعہ اعیان و اغراض متضادہ ہیں مثل عناصر و اعمال و افعال

خیر وشر اور یہ سب ایک جامع صفات جمالیہ اور جلالیہ سے ظاہر ہوا ہے کچھ لوگ اس نے بہشت کے لئے اور کچھ دوزخ کے لئے۔ خیر اور اخیار بھی اسی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور شر اور اشرار بھی اسی سے وجود میں آئے ہیں۔

جوگ بشسٹ میں ہے:

پہلے وجود عالم سے وہ اکارن تھا جب مایا ہوئی بہت نام ونشان سے موسوم ہوا اور وہی صورت آئینہ ہستی کی نمایاں ہوئی۔ انتہی

اس بات پر ہمارا اور بید کے معتقدوں کا اتفاق ہے کہ جملہ خیر وشر، علم وجہل، اخیار واشرار، اور ابرار اور اہل نار اس مجموعے کے اجزاء ہیں جس کو بید میں برہم چکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

چنانچہ اپنکھد دوم ججر بید جوسنت اسر اپنکھد کے نام سے موسوم ہے تصریح ہے۔

جب اس روشنی سے مایا شامل ہوئی۔ یعنی اس نے ارادہ پیدا کرنے عالم کا کیا پس مایا سے پچاس شے پیدا ہوئیں۔ اس ہیئت مجموعی کا نام برہم چکر ہے در مرتبہ ۹ عمل نیک اور مرتبہ ۱۳ عمل بد، اور ۱۴ جہل، اور ۴۹ اسر یعنی شیطان و بد افعال، اور ۵۰ ارواح شیطانوں کی پس مذکورہ تحقیق سے ثابت ہوا کہ جہنم اور جہنمی خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں پس بید کے معتقدوں کو اللہ تعالیٰ کے اس قول "وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيراً مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ" کے تسلیم کرنے اور اس قول کے حق ہونے میں کوئی گنجائش نہیں رہی۔ (سوط اللہ الجبار ص ۲۶۲)

کیا درجات جنت بغض کا سبب بنیں گے

اعتراض: (بیں برن لالہ اندرمن ہندو کا اعتراض)

مسلمان دعویٰ کرتے ہیں کہ جنت کے آٹھ درجے ہیں اس کی کوئی اصل نہیں اگر جنت کے درجات میں کمی بیشی ہو تو جنتیوں میں آپس میں بغض ہوگا اور اگر جنت کے

درجات واقعی آٹھ ہوں تو نجات پانے کے بعد بھی جنتی بغض سے خالی نہیں ہوں گے۔

جواب: اعتراض اگر جنت کے درجات کی تعداد میں ہے اور معترض کے خیال میں بہشت کے درجات نہیں ہیں تو یہ سراسر بے جا اور عین خطا ہے کیونکہ بہشت کے درجات خود وید سے ثابت ہیں چنانچہ چھانڈوک اپنکھد شام بید میں مذکور ہے۔

حوض کوثر تیسری بہشت میں ہے۔

اور منڈوک اپنکھد اتھربن بید میں لکھا ہے۔

کہ اس کے نتیجہ میں ساتویں بہشت میں جگہ ملے۔ انتہی

اور درجات کی کمی بیشی کوئی عذر نہیں یہ جہالت ہے اگر جنت میں درجات کی کمی بیشی نہ ہو تو جنتیوں کے درجات کی تمیز کس طرح ہو؟

باقی رہا جنتیوں میں حسد اور بغض کی بات تو یہ جہالت پر مبنی ہے خود ہندوؤں کے خاص لوگ جیسے راجہ جدھشٹر جو ہندو دھرم کے اوتار میں سے ہیں اور اس کی طرح کے اور لوگ راجہ در جودھن کے جنت میں مواقع عزت کا مشاہدہ کرتے وقت راجہ اندر کے ساتھ حسد کیا تھا اور جاہلانہ گفتگو کی تھی چنانچہ یہ معاملہ مہا بھارت سے تفصیل کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ ہندوؤں کے خاص لوگ مرنے کے بعد بھی حسد اور بغض کی آتش میں جلتے ہیں اور اس سے نجات نہیں ملتی۔

مذکورہ بالا مہابھارت کے حوالوں سے معلوم ہوا کہ جنت کے مختلف درجات ہیں تو یہ دیوتایان مثلاً برہما، بشن، اور مہیش وغیرہ یہ سب اپنی شان اور مرتبے کے باوجود حسد وغیرہ کی آگ میں جلتے ہیں۔ اور ان کو اس سے نجات حاصل نہیں ہے۔ بخلاف اہل اسلام کے کہ جب وہ بہشت میں داخل ہوں گے۔ تو ان کے دلوں سے حسد اور کینہ نکال دیا جائے گا چنانچہ اللہ تعالی نے فرمایا ہے: وَنَزَعْنَا مَافِيْ صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ.

(سوط اللہ الجبار ص ۲۹۸۔۲۹۹)

کفار کے ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا شبہ اور جواب

سوال: حافظ ابن قیم نے رسالہ شفاء العلیل اور حادی الارواح میں جمہور کے خلاف جہنم کے فنا ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ جس سے کفار کے لئے دائمی عذاب کی نفی ہوتی ہے جو صراحتہً قرآن و حدیث کے خلاف ہے۔ اور مسئلہ چونکہ ضروریات دین سے ہے اس لئے ان نصوص میں تاویل کی بھی گنجائش نہیں حافظ ممدوح نے اس دعوے میں گو بعض روایات حدیث سے بھی تمسک کیا ہے۔ لیکن روایات مذکورہ عموماً ضعیف اور مجروح ہیں جو نصوص قطعیہ اور ان کی واضح دلالت کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتیں یا ماؤل ہوں گی۔ اس لئے ان کے جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ جو چیز خلود نار کے بارے میں کچھ تذبذب پیدا کرسکتی ہے وہ ان کا ایک عقلی استدلال ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ عقوبت اور سزا کی غایت گناہ سے روکنا ہوتی ہے تاکہ سزا بھگت کر خاطی (خطاکار) ڈر جائے اور آئندہ کے لئے تائب ہو کر اس معصیت سے رک جانے کا ہمیشہ کے لئے عزم کرلے۔ ظاہر ہے کہ جب اہل جہنم کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا تو ایسے شدید عذاب سے بڑھ کر تخویف اور جرم کے لئے انز جار (گناہ سے روکنے) کا موجب اور کیا ہوسکتا ہے اور پھر اس تعذیب سے بڑھ کر توبہ کی باعث بھی اور کونسی سزا ہوسکتی ہے چنانچہ مجرمین فوراً توبہ پر آجائیں گے اور آئندہ کے لئے پختگی سے کفر سے باز رہنے کا وعدہ کریں گے جیسا کہ درج ذیل نصوص کریمہ میں واضح ہے:

دوزخیوں کی بات نقل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظَالِمُوْنَ.

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم کو اس (جہنم) سے (اب) نکال دیجئے پھر اگر ہم دوبارہ ایسا کریں تو بے شک پورے قصوروار ہیں۔

وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيهَا رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْهَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ.

ترجمہ: اور وہ لوگ اس (دوزخ) میں چلائیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو (یہاں سے) نکال لیجئے (اب خوب) اچھے (اچھے) کام کریں گے برخلاف ان کاموں کے جو کیا کرتے تھے۔

وَلَوْ تَرٰى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُؤُسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ.

اور اگر آپ دیکھیں تو عجب حال دیکھیں جبکہ یہ مجرم لوگ اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوں گے کہ اے ہمارے پروردگار! بس ہماری آنکھیں اور کان کھل گئے سو ہم کو پھر بھیج دیجئے ہم نیک کام کریں گے ہم کو پورا یقین آ گیا ہے۔

پس چونکہ عقوبت کی غایت پوری ہوگئی اور مجرمین نے توبہ بھی کر لی۔ اور آئندہ احتراز کا وعدہ جازمہ بھی کر لیا تو اب عقلاً کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ پھر بھی اس تعذیب اور عذاب کو باقی رکھا جائے۔ اس لئے فناء نار ہو جانا اور خلود نہ رہنا معقول ہوا۔ حافظ ابن قیمؒ نے اس اشکال سے مرعوب ہو کر جمہور کا مسلک چھوڑا اور یہ فناء نار کا مسلک اختیار کیا ہے اس کا کیا جواب ہے؟

جواب۲ بحالت عذاب یا بحالت خوف عذاب مجرمین کے وعدے دو طرح پر ہوتے ہیں۔ ایک حقیقی وعدہ جو دل سے ہوتا ہے اور جس میں واقعی نافرمانی سے بچنے کا پختہ ارادہ ہوتا ہے اور ایک دفع الوقتی یعنی دل میں حقیقی عزم احتراز نہ ہو۔ صرف مصیبت سے رہائی پانے کے لئے جھوٹا وعدہ کیا جائے۔ اس مصلحت سے کہ اس وقت تو جان بچا لینی چاہئے۔ آئندہ دیکھا جائے گا۔ کفار معذبین کے یہ وعدے اسی دوسری قسم کے ہوں گے جو محض کذب اور دفع الوقتی ہوں گے۔ چنانچہ خود قرآن کریم ہی میں

ان کی اس دفع الوقتی اور کذب بیانی کی تصریح صاف الفاظ میں موجود ہے:

ارشاد ہے:

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ. بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ.

اور اگر آپ اس وقت دیکھیں جبکہ یہ دوزخ کے پاس کھڑے کئے جائیں گے تو کہیں گے ہائے کیا اچھی بات ہو کہ ہم پھر واپس بھیج دیئے جائیں اور اگر ایسا ہو جائے تو ہم اپنے رب کی آیات کو جھوٹا نہ بتائیں اور ہم ایمان والوں سے ہو جائیں بلکہ جس چیز کو اس کے قبل دبایا کرتے تھے وہ ان کے سامنے آ گئی ہے۔ اور اگر یہ لوگ پھر واپس بھیج دیئے جائیں تب بھی یہ وہی کام کریں گے جس سے ان کو منع کیا گیا تھا اور یقیناً یہ بالکل جھوٹے ہیں۔

اگر سوال کیا جائے کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس وقت نافرمانی سے بچنے کا پختہ ارادہ نہ ہوگا۔

جواب یہ ہے کہ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (یقیناً یہ بالکل جھوٹے ہیں) اس کی دلیل ہے۔ کیونکہ اپنے فعل اختیاری میں مستقبل کے وعدہ کے صادق یا کاذب ہونے کا مدار یہی عزم کا ہو یا عزم نہ ہونا ہے۔

اور اگر سوال کیا جائے کہ معائنہ عذاب کے بعد وقوع کفر فی الدینا کیسے ممکن ہے۔ جواب یہ ہے کہ کفر اعتقاد خلاف حق ہی میں منحصر نہیں انکار بھی کفر ہے بلکہ اعتقاد خلاف حق سے بھی اشد کفر کفر انکار ہے اور اس کا کفر ہونا قرآن مجید میں منصوص ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَجَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا.

ترجمہ: (اور غضب یہ تھا کہ ظلم اور تکبر کی راہ سے) ان (معجزات) کے بالکل) منکر ہو گئے حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا۔

اور اس پر تعجب نہ کیا جائے کہ ایسے شدید وقت میں جھوٹ کیسا؟ فساد طینت ایسی ہی چیز ہے۔ چنانچہ اسی یوم شدید میں ان کا ایک اور جھوٹ بھی قرآن میں مذکور ہے:

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ.

ترجمہ: پھر ان کے شرک کا انجام اس کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوگا کہ وہ یوں کہیں گے کہ قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی ہم مشرک نہ تھے، ذرا دیکھو تو انہوں نے کس طرح جھوٹ بولا اپنی جانوں پر۔

مگر فساد طینت سے وہ معذور نہ ہوں گے کیونکہ فساد سے قدرت و اختیار سلب نہیں ہوتا اور مدار تکلیف یہی قدرت و اختیار ہے نہ کہ طینت کہ اس کا اثر صرف میلان ہے نہ کہ فعل کا صدور لازم یا اس کا ارادہ لازمہ اور ظاہر ہے کہ جب یہ حقیقی توبہ اور واقعی نافرمانی سے بچنے کا پختہ ارادہ نہ ہوا۔ بلکہ دفع الوقتی ہوئی۔ اور اوپر سے بحالت معائنہ عذاب بھی حق تعالیٰ کو دھوکہ دینے کی معصیت کا ارتکاب ہوا تو اس عقلی استدلال کی بناء ہی منہدم ہو گئی جس پر فناء نار کا دعویٰ مبنی تھا۔ اور جمہور کے مسلک پر الحمد للہ کوئی اشکال نہ رہا۔

کافر کو عذاب دائمی ہونے پر شبہ کا جواب

اعتراض: (کفار کا اعتراض)

شریعت میں کفر کی سزا دائمی عذاب جہنم کیوں ہے حالانکہ سزا مناسب جنایت ہونی چاہئے۔

جواب (۱): بر سبیل وعظ فرمایا کہ کافر کو جو ابدی عذاب ہے۔ اس میں کوئی

ظلم نہیں کیونکہ کافر اللہ تعالی کی ہر ہر صفت کے حقوق ضائع کرتا ہے۔ اور اس کی صفات لامتناہی ہیں اور خود ہر صفت کے حقوق بھی غیر متناہی ہیں۔ تو چاہیے تو یہ تھا کہ ہر صفت کے انکار پر لامتناہی سزا ہوتی اور پھر ہر صفت کے حقوق پر اسی طرح غیر متناہی سزا ہوتی۔ پھر زیادتی کہاں ہوئی۔ بلکہ ایک معنی کر کے کمی ہے۔ بغاوت کی سزا قید دائمی ہی ہوتی ہے جس کا دوام حکام ظاہری کے اختیار میں ہے۔ یعنی تا حیات وہ اپنے باغیوں کے لئے مقرر کرتے ہیں اور جس قسم کا دوام حاکم الحاکمین کے اختیار میں ہے یعنی اصلی وہ اپنے باغیوں کے واسطے تجویز فرمائیں گے۔ اس میں ظلم اور زیادتی کچھ بھی نہیں۔ بلکہ عین عدل ہے۔

اعتراض (۲): سزا مناسب جنائت و جرم ہونی چاہیے۔ اور یہاں جنائت و جرم متناہی سے کیونکہ عمر کافر کی متناہی ہے۔ تو سزا بھی متناہی ہونی چاہیے۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارا یہ مقدمہ (بات) تو مسلّم ہے کہ سزا مناسب جنایت ہونی چاہیے مگر کیا تناسب سب کے یہی معنی ہیں کہ جنایت اور سزا دونوں کا زمانہ بھی مناسب ہو اگر یہی بات ہے تو چاہیے کہ جس جگہ دو گھنٹہ تک ڈکیتی پڑی ہو۔ اور ڈاکو گرفتار ہو کر آئیں۔ تو حاکم ڈاکوؤں کو صرف دو گھنٹے کی سزا دے دے۔ اگر حاکم ایسا کرے تو کیا آپ اس کو انصاف مانیں گے؟ ہرگز نہیں اس سے معلوم ہوا کہ سزا اور جنایت میں مناسبت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دونوں کا زمانہ مناسب و مساوی ہو۔

بلکہ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ سزا میں شدت بقدر شدت جرم ہو۔ اب تم خود فیصلہ کر لو کہ شریعت نے کفر کی سزا میں جو شدت بیان کی ہے وہ شدت جرم کے مناسب ہے یا نہیں۔ اور یہ جرم شدید ہے یا نہیں۔

شاید آپ یہ کہیں کہ جرم تو شدید ہے مگر نہ ایسا شدید کہ اس کی سزا ابدالآباد جہنم ہو۔ میں کہوں گا کہ یہ خیالِ آپ کو اس لئے پیدا ہوا کہ تم نے صرف فعل کی ظاہری

صورت پر نظر کی ہے۔ حالانکہ سزاو جزا کا مدار محض اس کی ظاہری صورت پر نہیں ہے۔ بلکہ نیت کو بھی اس میں بہت بڑا دخل ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مدار نیت پر ہی ہے۔

چنانچہ ایک شخص دھوکہ سے شراب پی لے تو اس کو گناہ نہیں ہوا۔ گو صورت گناہ موجود ہے کیونکہ نیت نہ تھی۔ اور اگر ایک شخص شراب پینے کے لئے دوکان پر جائے اور دکان دار بجائے شراب کے اس کو کوئی شربت دیدے۔ جسے یہ شراب سمجھ کر پئے تو اس کو گناہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی نیت تو شراب پینے ہی کی تھی۔

اس لئے فقہاء نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے مجامعت کرے۔ مگر وہ اندھیرے میں یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری بیوی نہیں بلکہ کوئی اجنبی عورت ہے تو اس کو گناہ ہوگا۔ اسی طرح اگر مجامعت میں کسی اجنبیہ سے مجامعت کر رہا ہو اور اس کی صورت ذہن میں حاضر کر کے اس سے لذت لے تب بھی گناہ ہوگا اور اگر شب زفاف میں عورتوں نے اس کے پاس غلطی سے بجائے اس کی بیوی کے کسی دوسری عورت کو بھیج دیا جس کے ساتھ یہ شخص یہ سمجھ کر ہمبستر ہوا کہ یہی میری بیوی ہے تو اس کو گناہ نہ ہوگا اور یہ وطی زنا شمار نہ ہوئی بلکہ وطی بالشبہ ہوگی۔ جس سے ثبوت نسب بھی ہو جاتا ہے اور عدت لازم ہوتی ہے۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی تو سمجھو کہ ظاہر میں گو کافر کا کفر متناہی ہے مگر اس کی نیت یہ تھی کہ اگر زندہ رہا تو میں ابدا الاباد اسی حالت پر رہوں گا۔ اس لئے اپنی نیت کے موافق اس کو ابدا الاباد جہنم کا عذاب ہوگا اسی طرح مسلمان کا اسلام گو بظاہر متناہی ہے۔ مگر اس کی نیت یہ ہے کہ اگر میں ہمیشہ زندہ رہوں تو ہمیشہ اسلام پر مستقیم رہوں گا۔ اس لئے اس کے لئے ابدالآباد ثواب جنت ہے۔ (محاسن الاسلام ص ۳۰)

کافر کو جہنم میں دائمی سزا کیوں

اعتراض: (پنڈت سوامی جی کا اعتراض)

جواب: سوامی جی کو اگر عدالت مل جاتی تو شاید چور کو اتنی ہی مدت قید کرتے جتنی اُس نے چوری کرنے میں خرچ کی ہوتی۔ پنڈت جی اگر اعمال کے وقت جتنی جزا سزا ہے تو کرشن جی گیتا میں کیوں کہتے ہیں کہ روح نیک اعمال کر کے تناسخ کے چکر سے چھوٹ جاتی ہے گو آپ اس کو کسی خاص وجہ سے نہ مانتے ہوں۔

لیکن کرشن جی کا پرمان آپ کے گمان سے کہیں بڑھ کر ہے۔ آپ کسی دلیل سے بتلا دیں کہ اعمال کیوقت سے مساوی جزا سزا کا ہونا ضروری ہے حالانکہ قانون شاہی میں ہم ایسے جرم بھی دیکھتے ہیں کہ تھوڑے سے وقت میں کیے جاتے ہیں۔ اور عمر بھر قید اُن کی سزا ہے۔

چنانچہ آپ بھی بحوالہ منوجی (ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۰۱ سملاس چھٹا نمبر ۴۲) پر لکھتے ہیں کہ

"سرکاری ملازم کو رشوت لینے پر ضبطی جائداد اور تمام عمر کیلئے جلا وطن اور جھوٹی گواہی دینے پر زبان کاٹ ڈالی جائے اور بعد مرگ راحت سے بے نصیب۔"

فرمایئے! مدت کے مساوی سزا ملی یا زیادہ۔ سچ پوچھو تو اپنی من گھڑت باتوں کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی کو بجز ندامت کے کچھ نصیب نہیں ہوتا۔

(حق پرکاش صفحہ ۵۷ ملخصا)

جہنم میں درخت کیسے سلامت رہے گا

انها شجرة تخرج في اصل الجحيم وہ جہنم کی تہہ میں سے اُگے گا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ جس طرح جنت میں طوبیٰ کا سایہ ہر ایک گھر میں ہوگا اسی طرح تمام اہل جہنم کیلئے یہ ایک درخت کافی ہوگا ہر جگہ اس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہوں گی۔

جواب: یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ آگ میں ایک کیڑا پیدا ہوتا ہے جس کو سمندر کہتے ہیں اور آگ ہی اس کی غذا ہے۔ اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے پھر وہ تو حیوان

ہو کر آگ میں رہتا ہے۔ پس پیڑ جو جسم نباتی ہے اس کی نسبت سخت ہے بدرجہ اولیٰ رہ سکتا ہے۔ اس کی قدرت کی عجیب رنگینیاں ہیں۔

حیوان کی زندگی تنفس یعنی سانس لینے پر ہے سینکڑوں کیڑے مٹی میں ایسے دبے ہوئے رہتے ہیں جہاں ہوا کا گزر بھی نہیں اور ہزاروں جانور پانی میں رہتے ہیں جہاں ہوا کا وجود نہیں۔

ہم ایک اور بات سناتے ہیں جس سے اس پیڑ کی کیفیت پوری سمجھ میں آ جائے گی۔ بحر شور یعنی سمندر میں جہاں پانی صاف ہوتا ہے تہہ میں عمدہ عمدہ جھاڑ ہوتے ہیں پتھر کے۔ ان کی شاخیں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسا کہ زمین کے جھاڑوں کی ہوتی ہیں۔ ان میں نمو بھی ہے اور باہر لائی جاتی ہیں تو حجریت معلوم ہوتی ہے اسی طرح اس شجرۂ زقوم کو جہنم کی آگ سے مناسبت ہو تو کیا تعجب ہے ہاں ابو جہل جیسا کوئی بدعقل اور کوڑھ مغز تعجب کرے تو کچھ تعجب نہیں۔ (تفسیر حقانی ۴/۱۰۷)

آسمانوں اور زمین اور ارزاق کو سات دن میں پیدا کیا یا آٹھ میں

اعتراض:

آیت میں زمین کا پیدا کرنا دو روز میں فرمایا اور اس کے اقوات و ارزاق کی تدبیر و درستی کرنا چار روز میں فرمایا۔ یہ چھ روز ہوئے پھر آسمانوں کا بنانا دو روز میں ذکر ہوا فقضٰهن سبع سموٰت فی یومین. اس حساب سے یہ آٹھ روز ہوتے ہیں حالانکہ قرآن مجید میں اکثر جگہ ان سب کا چھٹے روز میں پیدا ہونا بیان کیا ہے ستة ایام کا لفظ آیا ہے پس ان دونوں کلاموں میں تعارض پایا گیا۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ اربعة ایام جداگانہ نہیں جس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے بلکہ وہ پہلے دو روز مل کر کہ جن میں زمین کا پیدا ہونا بیان ہوا ہے اور محاورۂ عرب میں پہلے کام کی مدت کو اس کے بعد کے دوسرے کام کی مدت میں جو اسی جنس کا

ہو شامل کر کے مجموعی مدت بیان کر دیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس مثال میں سرت من البصرة الی بغداد فی عشرة ایام وسرت الی الکوفة فی خمسة عشر یوما۔ کہ میں نے بصرہ سے بغداد تک کی منزل کو دس روز میں تمام کیا اور کوفہ تک پندرہ روز میں پہنچا۔ یعنی کل پندرہ روز میں پہنچا یعنی کل پندرہ روز میں جو بصرہ کے سفر سے شمار کئے جاتے ہیں نہ یہ کہ بغداد سے کوفہ کی منزل کو پندرہ دن میں تمام کیا۔ چونکہ متصل ایک ہی قسم کا سفر تھا اس لئے مجموعی مدت لگائی گئی۔ زبان نہ جاننے سے ایسے شبہات پیدا ہوتے ہیں واللہ اعلم بالصواب۔ (تفسیر حقانی ۴/۲۰۷، ۲۰۸)

حق تعالیٰ بغیر ابتلاء وامتحان کے جنت کیوں نہیں دیتے

اعتراض:

حق تعالیٰ بغیر ابتلاء وامتحان کے جنت کیوں نہیں دیتے۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک حق تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ بغیر ابتلاؤ امتحان کے سب کچھ عطا فرما دیتے مگر وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ انسان کو ابتلاء و تکلیف کے بعد ہی دولت قرب عطاء فرماتے ہیں اور قرب ہی کا نام نجات ہے اور ہلاکت فراق و بعد کا نام ہے۔

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعان گفت
فراق یار نہ آں مے کند کہ بتواں گفت

حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر
کنایتیست کہ از روزگار ہجران گفت

چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ. رہا یہ کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ سو اس کے بارہ میں ہمارے بزرگوں کا مسلک یہ ہے کہ حکم کی تفصیل میں بات چیت نہیں فرماتے ان کا طریقہ یہ ہے ابھموا

کما ابھم اللہ یعنی جس چیز کو خدا تعالی نے مبہم رکھا ہے تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو۔

پس اجمالاً ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ابتلا میں حکمت ضرور ہے گو ہم کو معلوم نہ ہو۔

اور اس باب میں ایک بات جو بے ساختہ دل میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان سے اطاعت بغیر ابتلاء مقصود ہوتی تو اس کے لئے ملائکہ پہلے سے موجود تھے انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ ملائکہ بغیر ابتلاء کے اطاعت کے کرتے ہیں ان میں منازعت کا مادہ ہی موجود نہیں اور انسان کے اندر مقاومت و منازعت احکام کا مادہ رکھا گیا ہے مگر وہ ایک خاص درجہ پر ہے اور وہ بھی تکمیل اجر کے لئے اس میں رکھا گیا ہے کہ کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت منازعت افضل ہے۔

جنت کی لذتیں

اعتراض: (عیسائیوں کا اعتراض)

جنت میں جسمانی لذتیں کچھ نہیں محض مسلمانوں کو ورغلانے کیلئے جنت کی جسمانی لذتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جواب: جنت حور و قصور اور دوسری نعمتوں پر مشتمل ہے۔ عقلی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ نیز مسلمان یہ نہیں کہتے کہ جنت کی لذتیں جسمانی لذتوں تک محدود ہیں۔ جس طرح فرقہ پروٹسٹنٹ کے علماء غلطی سے یا عوام کو غلطی میں ڈالنے کے لئے کہتے ہیں بلکہ ہم قرآنی نصوص اور تصریحات کی بناء پر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جنت روحانی اور جسمانی ہر دو قسم کی لذتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلی لذت دوسری سے بڑھی ہوئی ہے۔ مؤمنین کو دونوں قسم کی لذتیں نصیب ہوں گی۔ سورۂ توبہ میں حق تعالی کا ارشاد ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَ

رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ. ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ.

ترجمہ: اللہ نے مؤمن مردوں اور عورتوں سے ان باغات کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور غیر فانونی باغات میں پاکیزہ رہائش گاہوں کا وعدہ کیا ہے۔ اور اللہ کی رضا اور خوشنودی ان سب سے بڑھ کر ہے۔ یہی عظیم کامیابی ہے۔

اس میں رضوان من اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی خوشنودی اور رضا پچھلی بیان کردہ جنت کی تمام نعمتوں سے مرتبے اور درجے میں بڑی ہے۔ باغات سے بھی اور نہروں سے بھی۔ اور عمدہ عمدہ مکانوں سے بھی۔ یہ ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جنت میں اللہ کا سب سے بڑا عطیہ روحانی لذتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جسمانی لذتیں بھی ملیں گی۔ اسی وجہ سے آگے فرمایا کہ وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ. کیونکہ انسان کی خلقت دو جوہروں سے ہوئی ہے۔ ایک لطیف علوی، اور دوسرا کثیفِ سفلی، جسمانی سعادت وشقاوت کا حصول ان دونوں ہی کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ جب جسمانی منافع اور فوائد کے ساتھ ساتھ روحانی سعادتوں کا حصول بھی ہو تو بلاشبہ روح ان سعادتوں کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتی ہے۔ جو اس کے لائق اور مناسب ہیں۔ اسی طرح جسم ان سعادتوں کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔ جو اس کی شان کے لائق ہیں۔ یقیناً فوز عظیم کا مصداق صرف یہی ہوسکتا ہے اور اگر علماء پروٹسٹنٹ یہ کہیں کہ جنت میں ان دونوں قسموں کی لذتوں کا اجتماع بھی ہمارے خیال میں نا مناسب ہے۔ تو ہم اس کے جواب میں صرف اس قدر کہیں گے کہ گھبرائیے نہیں۔ خدا نے چاہا تو آپ کو یہ لذتیں نصیب نہیں ہوں گی۔

جنت کی لذتوں کے بارے میں عیسائی نظریات

عیسائیوں کے نظریے کے مطابق جنتیوں کا فرشتوں کے مشابہ ہونا خود ان کی

کتابوں کے فیصلے کے مطابق کھانے اور پینے کے منافی نہیں ہوسکتا۔ کیا ان حضرات کو معلوم نہیں کہ وہ فرشتے جو ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور آپ نے ان کے آگے بھنا ہوا بچھڑا، گھی اور دودھ پیش کیا تھا وہ فرشتے ان سب چیزوں کو نوش جان کر گئے چنانچہ اس کی تصریح کتاب پیدائش کے باب ۱۸ میں موجود ہے۔

اسی طرح وہ دو فرشتے جو لوط علیہ السلام کے پاس آئے۔ اور انہوں نے ان کے لئے کھانا، روٹی اور پرندے کا سالن تیار کیا تھا۔ دونوں فرشتوں نے خوب کھایا۔ جیسا کہ کتاب پیدائش کے باب ۱۹ میں صاف طور پر لکھا ہے۔

زیادہ تعجب تو اس پر ہے کہ جب عیسائی حضرات حشر جسمانی کے قائل ہیں۔ تو پھر جسمانی لذتوں کے مستبعد ہونے کے کیا معنی؟ ہاں اگر وہ مشرکین عرب کی طرح سرے سے حشر ہی کے منکر ہوتے یا ارسطو کے ماننے والوں کی طرح حشر جسمانی کے منکر اور حشر روحانی کے قائل ہوتے تو بھی بظاہر ان کے استبعاد کے لئے کوئی گنجائش ہوسکتی تھی۔

نیز عیسائیوں کے نظریے کے مطابق اللہ کا جسمانی ہونا اور کھانا پینا اور جملہ جسمانی لوازمات اس لحاظ سے ہیں کہ وہ انسان بھی ہے۔ ادھر عیسیٰ علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام کی طرح ریاضت گذار اور نفیس کھانوں اور شراب نوشی سے احتراز و اجتناب کرنے والے نہیں تھے۔ جس کی بناء پر ان کے منکرین ان کو بسیار خوری اور بسیار نوشی کا طعنہ دیتے تھے۔ (جیسا کہ انجیل متی کے باب ۱۱ میں تصریح موجود ہے)۔ ہمارے نزدیک گو ان کی ذات گرامی پر یہ اعتراض بالکل نامعقول ہے۔ تاہم یہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلاشبہ عیسیٰ علیہ السلام جسمانی لحاظ سے خالص انسان ہی انسان تھے۔ پھر جس طرح اس دنیا میں رہتے ہوئے عمدہ کھانے اور مشروبات ان کے حق میں روحانی لذتوں سے مانع نہیں بن سکتے بلکہ آپ پر روحانی احکام ہی کا غلبہ رہا۔ اسی طرح جسمانی لذتیں جنتیوں کے لئے روحانی لذتوں سے مانع نہیں ہوسکیں گی۔ جب کہ وہ جنت میں ہوں گے۔ (بائبل سے قرآن تک ۳: ۲۴۵)

جنتی مردوں کو ستر حوریں ملیں گی تو جنتی عورتوں کو بھی ستر مرد ملنے چاہئیں

اعتراض: (پنڈت سرسوتی کا اعتراض)

مسلمان کہتے ہیں کہ جو کوئی کسی کا روزہ افطار کرادے گا تو جنت میں اس کے انعام میں ستر حوریں ملیں گی تو چاہئے کہ جو کوئی عورت کسی کا روزہ افطار کرادے تو اس کو ستر مرد اس کے انعام میں ملیں۔

جواب (۱): افطار کرانے کے انعام میں ستر حوروں کا ملنا اہل اسلام کی کسی کتاب میں دیکھا نہ سنا۔ ہاں یہ مسلّم ہے کہ مردوں کو بہشت میں اپنے اپنے رتبہ کے موافق متعدد حوریں ملیں گی۔ اور عورتوں کو سوا ایک خاوند کے دوسرا خاوند بہشت میں نہ ملے گا۔ غرض جیسے دنیا میں اہل اسلام کے نزدیک عورتوں کا تعدد ایک مرد کے لئے روا ہے اور مردوں کا تعدد ایک عورت کے لئے روا نہیں۔ اسی کے موافق بہشت میں بھی انعام ملے گا۔

سو اگر یہ قابل اعتراض ہے تو وجہ اعتراض کی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ عورتوں اور مردوں کو برابر رکھنا چاہئے تھا۔ یہ فرق کیوں ہوا؟

مگر وجہ برابری کی سوا اس کے اور کیا ہوگی کہ کیا بروئے عقل ہر حکم میں عورت اور مرد کی برابری ضرور ہے۔ یا یوں کہئے نیک کاموں کے انعام میں جو کچھ انعام مردوں کو ملے وہی انعام عورتوں کو ملنا چاہئے۔ کیونکہ انعام تو کام کی قیمت ہے۔ جب مردوں کے لئے ایک نرخ نکل چکا تو وہی قیمت عورتوں کو بھی دلانا چاہئے۔ انہوں نے کیا قصور کیا ہے جو ان کے حق میں یہ کمی ہے۔

اگر وجہ اعتراض برابری احکام ہے تو لازم یوں ہے کہ بقیاس کثرتِ ازواج سرس کرشن وغیرہ پنڈت جی عورتوں کو بھی کثرت ازدواج کی اجازت کیوں نہیں دیتے۔ جب دونوں احکام میں متساوی الاقدام ہیں تو پھر عورتوں نے کیا قصور کیا ہے جو ان کو سوا

ایک خصم کے اور دوسرے کی اجازت نہ ہو۔ اور مردوں کو کثرتِ ازدواج جائز ہو۔

اور اگر وجہِ اعتراض یہ ہے کہ قیمت خدمت اور انعام کام برابر ہونا چاہئے کام کرنے والا اور خدمت بجالانے والا کوئی ہو مرد ہو یا عورت اس فرق سے قیمت میں فرق مناسب نہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کی اجازت بغرض رفع ضرورت ہے۔ اگر قیمت اور انعام میں فرق کرنا مخالف عدل انصاف ہے تو ایک کی ضرورت کے رفع کرنے میں اتنی عنایت اور ایک کی ضرورت کے رفع کرنے میں اتنی کفایت بھی مخالف کرم و اخلاق ہے۔ عدل و انصاف اگر منجملہ صفاتِ خدا ہے تو کرم و اخلاق اور رحمت و الطاف اس سے بھی پہلے اس کی صفتیں ہیں۔ پھر یہ کیا اخلاق و الطاف ہیں کہ ایک پر تو دوسرے کے سامنے یہ عنایت ہو۔ اور دوسروں سے یہ کم توجہی اور بے نیازی۔ اگر ایک کو دوسرے کے حال کی اطلاع نہ ہو تو بوجہ بے خبری چنداں اندیشہ دل شکنی نہیں جو لطف و کرم اور رحمت پر کچھ بڑا اعتراض ہو۔ پر درصورتِ اطلاع عام۔ یہ فرق عام ہر گز مناسب شانِ خداوندی نہیں۔

مگر شاید پنڈت جی اس فتوے میں (کہ ایک عورت کے بہت سے خصم ہوں) پریشان نہ ہوں۔ اس لئے کہ بیاس جیو نے دروپدی کو راجہ جدھشٹر بھیم سین، ارجن، نکل، سہدیو پانچ بھائیوں کے حوالہ کر دیا تھا۔ اور کرشن جی نے اس میں کچھ چون و چرا نہ فرمائی تھی۔ لیکن اس کو کیا کریں کہ اول تو تمام مذاہب یہاں تک کہ بروئے دھرم شاستر خود مذہبِ ہنود اس کے مخالف۔ ادھر تمام علماء اور حکماء اور عقلاء کو یہ امر ناپسند۔

شراب دنیا میں حرام ہے تو جنت میں حلال کیوں

اعتراض: (پنڈت سرسوتی کا اعتراض)

مسلمان دنیا میں تو شراب کو حرام کہتے ہیں اور ان کی جنت میں شراب کی نہریں

ہیں۔ تماشا ہے کہ جو چیز یہاں حرام ہے وہاں حلال ہوگئی۔ اگر وہ نہریں ہیں تو کتنا طول وعرض رکھتی ہیں اوران کا منبع کہاں ہے؟ اگر بہتی ہیں تو کدھر سے کدھر کو اور نہیں تو سڑتی کیوں نہیں؟

جواب (۱): اعتراض کی بات تو اس اعتراض میں اتنی ہی ہے کہ حرام چیز حلال کیونکر ہوگئی۔

باقی رہا طول وعرض اور منبع کا قصہ اور سڑنے اور نہ سڑنے کا جھگڑا۔ نہ اہل فہم کے سننے کا اور نہ اہل علم کے کہنے کا۔ ایسی باتوں کے سننے سے اہل فہم کو خفقان ہو جائے تو دور نہیں۔ چہ جائیکہ زبان پر لائیں۔

مگر جہاں پنڈت جی میں اور کمال ہیں۔ ایک یہ بھی کمال ہے کہ ایسی باتیں بے تکلف زبان پر لاتے ہیں اور کچھ نہیں گھبراتے۔ مگر ہم کو تو سب ہی کا جواب دینا ہے۔ بجبوری قلم اٹھاتے ہیں اور یہ عرض کئے جاتے ہیں کہ کولنک اپنکھدرکھ بید میں جو شراب کے حوض اور دونہروں کا ذکر ہے۔ اس حوض کی نسبت تو ہمارا یہ سوال ہے کہ وہ سڑتا کیوں نہیں؟ اور پھر اس حوض اور ان نہروں کی نسبت یہ التماس ہے کہ ان کا طول و عرض کتنا ہے اور ان کا منبع کہاں ہے۔ اگر بہتی ہیں تو کدھر کو کدھر سے اور نہیں تو سڑتی کیوں نہیں۔

علاوہ بریں ہم نے اگر عرض وطول ومنبع اوران کے بہاؤ کی سمت کا کچھ ذکر کیا تو پنڈت جی کو اعتبار کیوں کر آئے گا۔ اس وقت ہم کو بجبوری یہ کہنا پڑے گا کہ اعتبار نہ آئے تو جایئے دیکھ آیئے۔ اور پنڈت جی اس کے جواب میں یہ فرمائیں گے کہ ہم جا نہیں سکتے۔ اس لئے اس کا نتیجہ بجز غاں غاں کے اور کچھ نہ ہوگا اس سے بہتر یہ ہے کہ پنڈت جی اس باب میں لب نہ ہلائیں۔ نہیں تو حوض مذکور اور ان دونہروں کی پیمائش کا فکر فرمائیں۔ وہاں تک جانا دشوار ہو تو اس کھائی ہی کا عرض وطول وعمق جس کا نام ''رواز'' ہے اور اس ندی کا عرض وطول اور اس کے بہنے کی سمت کو جس کا نام ''برجا'' ہے

بتائیں۔ یہ دونوں تو رکھ بید کے بیان کے موافق بہشت سے ورے ہی ہیں۔ اگر جانا دشوار ہوگا تو بہشت میں دشوار ہوگا۔ ندی مذکور اور کھائی مسطور تک جانا تو دشوار نہیں۔

اور اسے بھی جانے دیجئے۔ پنڈت جی دنیا ہی کی ندیوں اور نالوں اور جھیلوں اور تالابوں کے عرض وطول و عمق اور سمت بیان فرمائیں۔ یہ بھی دشوار ہو تو ہندوستان ہی کی ندیوں اور نالوں اور تالابوں کے عرض وطول و منبع وغیرہ کی شرح بیان فرمائیں۔

خیر یہ بات واہیات تو ہو چکی۔ اب اصل اعتراض کا جواب عرض کرتا ہوں۔

دنیا میں حرام چیز کے بہشت میں حلال ہونے کا الزامی جواب

مہابھارت کے پرب اول میں ہے کہ ''شراب پہلے زمانے میں گو برہمنوں کو حلال تھی۔ مگر جس دن سے کنج مارا گیا۔ اس کے استاد سکر دیوتا نے اس کو برہمنوں پر حرام کر دیا۔''

اب بعد حرمت شراب اگر برہمنوں کو بہشت میں جانے ہی نہیں دیتے، تب تو خیر اعتراض مذکور کا یہ جواب نہ ہوگا کہ تمہارے یہاں بھی یہی صورت ہے۔ جو تم جواب دو گے وہی ہماری طرف سے سہی۔ مگر اس صورت میں پنڈت جی اور ان کے اور برہمن تبدیل مذہب کا فکر فرمائیں۔

اور اگر ہنوز برہموں کو بہشت میں جانے سے ممانعت نہیں تو پنڈت جی یہ فرمائیں کہ جو چیز دنیا میں حرام تھی وہ بہشت میں جا کر کیونکر حلال ہوگئی۔

جواب (۲): منبع اور عرض وطول اور عمق اور بہنے کی سمت کچھ شرطِ اعتقاد انہار ہوا کرے (یعنی نہروں پر اعتقاد رکھنے کی شرط اگر یہ چیزیں ہوا کریں) تو یوں کون معتقد ہو۔ بعد مشاہدہ بھی گنجائش انکار باقی رہے۔

گنگا کا منبع اور طول کس کس کو معلوم ہے۔ ہزاروں (ہندو) آنکھوں سے گنگا کو دیکھ آئے۔ اشنان کر کے سب پاپ اس میں چھوڑ آئے۔ مگر باوجود اس مشاہدہ اور اس

تمتّع اور انتفاع کے بھی ہنود کو یہ خبر نہیں کہ منبع کہاں ہے اور طول کتنا ہے اور عرض کتنے گز ہے اور عمق کہاں کہاں کتنا کتنا ہے۔ اور خیر منبع کی نسبت تو یوں کہہ بھی سکتے ہیں کہ فلانے پہاڑ سے نکلی ہے۔ مگر اور باتوں میں کیا کریں گے ادھر جس پہاڑ سے نکلی ہے اس میں بھی معلوم نہیں جس غار سے نکلی ہے وہ غار کتنی لمبی ہے اور کہاں اس کا اختتام ہے۔

اس کے بعد یہ گذارش ہے کہ بہنے کی صورت میں تو پنڈت جی کے نزدیک بھی شراب سڑ نہیں سکتی۔ اس لئے اب اس کے جواب کی کچھ حاجت نہیں۔ مگر با ایں ہمہ ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ بہتی ہوئی چیزیں اگر فقط بوجہ قدرت اور حفاظت خداوندی نہیں سڑتیں تو بہشت میں خدا کی قدرت میں کون سا نقصان آجاتا ہے۔ (انتصار الاسلام ۸۸)

شراب دنیا میں حرام ہے تو جنت میں حلال کیوں

اعتراض: شراب جو دنیا میں ممنوعات اور محرمات سے ہے کیونکر بہشت میں جائز ہو جائے گی۔

جواب: حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

خداتعالی فرماتا ہے کہ بہشتی شراب کو اس دنیا کی فساد انگیز شرابوں سے کچھ مناسبت نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بہشتی شراب کی صفت یوں فرمائی ہے۔

وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا.

ترجمہ: یعنی لوگ بہشت میں داخل ہوں گے خدا ان کو پاک شراب طہور پلائے گا۔ جو خود بھی پاک ہوگی اور دل کو کامل طور پر پاک کردے گی۔

اور بہشتی شراب کے متعلق یہ بھی فرمایا ہے:

بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ . لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ الی قولہ تعالی لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا . اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا.

ترجمہ: آبخورے اور کوزے اور صاف شراب کے پیالے لئے ہوئے۔ جس سے نہ سر دکھے گا اور نہ بکواس کریں گے۔.......... وہ وہاں بکواس نہیں سنیں گے اور نہ کوئی گناہ کی بات۔ مگر سلام ہی سلام کی آواز۔

حاصل یہ ہے کہ وہ شراب صافی کے پیالے جو آب زلال کی طرح مصفی ہوں گے بہشتیوں کو دیئے جائیں گے وہ شراب ان سب عیبوں سے پاک ہوگی کہ دردسر پیدا کرے یا بیہوشی اور بدمستی اس سے طاری ہو اور بہشت میں کوئی لغو اور بیہودہ بات سننے میں نہیں آئے گی اور نہ کوئی گناہ کی بات سنی جائے گی۔ بلکہ ہر طرف سلام سلام جو رحمت اور محبت کی نشانی ہے سننے میں آئے گا۔

شرح اس کی یہ ہے کہ شراب میں دو باتیں ہوتی ہیں ایک نشہ دوسرا سرور اور ان دونوں میں باہم تضاد ہے۔ نشہ بیہوشی کا نام ہے اور بیہوشی میں نہ رنج ہوتا ہے۔ نہ راحت نہ غم، نہ خوشی۔ اس صورت میں ان دونوں کا اجتماع ایسا ہوگا جیسا کہ تمام مرکبات عنصریات میں گرمی و سردی کا اجتماع ہوتا ہے مگر جیسے بایں وجہ کہ گرمی سردی باہم متضاد ہیں ایک شئی کی تاثیر یہ دونوں نہیں ہوسکتیں اس وجہ سے پانی اور آگ کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ نشہ کسی اور چیز کی خاصیت ہے اور سرور کسی اور چیز کی خاصیت۔ اگر شراب میں وہ چیز نہ رہے جس کی خاصیت نشہ ہے بلکہ قدرت الٰہی کی چھلنی سے چھان کر اس کو جدا کردیں تو پھر اس صورت میں شراب میں فقط لذت اور سرور ہی رہ جائے گا۔ اور بے شک ہر عاقل کے نزدیک وہ شراب حلال ہوگی۔

غرض یہ ہے کہ علت حرمت شراب کی تمام عقلاء اور قائلان حرمت کے نزدیک یہی نشہ ہے اور اہل اسلام اس کی حرمت کے جبھی قائل ہیں جب تک اس میں نشہ ہو۔ اگر شراب سرکہ بن جائے اور نشہ نہ رہے تو وہ پھر اس کے پینے میں تامل نہیں کرتے۔ ادھر قرآن وحدیث وفقہ میں بھی یہی وجہ مذکور ہے اور ظاہر ہے کہ شراب کو جو کوئی پیتا ہے وہ بوجہ سرور پیتا ہے۔ بوجہ بیہوشی نہیں پیتا سو کلام اللہ میں لذت کا ثبوت ہے جو مایہ

سرور ہے اور نشہ کی نفی ہے جو وجہ ممانعت تھی چنانچہ لفظ **لا لغو فیھا و لا تیم**. اس پر شاہد ہے پھر دنیا میں نشہ کی چیزوں کی اسی وجہ سے ممانعت تھی کہ نشہ کے وقت حکام خداوندی ادا نہیں ہو سکتے سو یہ اندیشہ زندگانی دنیا تک ہی ہے بعد مرگ تمام احکام ساقط ہو جاتے ہیں بہشت میں ہر کوئی فرائض دواجبات وغیرہ سے فارغ البال ہوگا۔ وہاں اگر شراب حلال ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ (المصالح العقلیہ ص ۲۲۸)

کیا جنت میں چوری بھی ہوتی ہوگی

اعتراض: (پنڈت دیانند سرسوتی کا اعتراض)

اگر جنت میں کسی کو کم زیور ملتا ہوگا تو چوری بھی ہوتی ہوگی۔ اور وہ بہشت میں سے نکال کر چوری کرنے والوں کو دوزخ میں بھی ڈالتا ہوگا۔ اگر ایسا ہوگا تو یہ بات کہ ہمیشہ بہشت میں رہیں گے جھوٹ ہو جائے گی۔

جواب: نہ کوئی کسی کا زیور چرائے گا نہ کسی کو برا بھلا کہے گا۔ بلکہ سب کے سب پریم اور محبت سے رہیں گے۔ سنو!

اِخوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقَابِلِیْنَ.

ترجمہ: بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے مقابل تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔

کیا جنت میں بیماری بھی ہوگی

اعتراض (پنڈت سرسوتی کا اعتراض)

جب ایک عورت سے مباشرت کرنا بیماری کا باعث ہے۔ تو جو کئی عورتوں سے مباشرت کرتا ہے۔ اس کی کیا ہی بری حالت ہوتی ہوگی؟ اس لئے مسلمانوں کا بہشت میں رہنا ہمیشہ آرام دہ نہیں ہو سکتا۔

جواب: ہم اسی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ بہت سے آدمی ایک ہی قسم کی غذا کھاتے ہیں۔ جن میں سے بعض صحیح وسالم رہتے ہیں اور بعض اسی غذا سے مریض ہو

کر مر بھی جاتے ہیں۔تو جس جگہ پر یہ قانون ہی نہ ہوگا کہ کوئی غذا کسی جسم کو مضر ہو سکے۔ وہاں پر یہ اعتراض کرنا ''جسم والا بیمار ہوئے بغیر ہر گز نہیں رہ سکتا۔'' بالکل اسی کے مشابہ ہے جو گرمیوں میں شملہ یا کشمیر والوں کی حالت سن کر کہ وہ گرم کپڑے پہنتے ہیں۔سوال کرے کہ گرمیوں میں بغیر پنکھے کے کوئی کیونکہ گزارہ کر سکتا ہے اور گرم کپڑے کس طرح پہن سکتا ہے؟لہذا شملہ اور کشمیر کا قصہ غلط ہے۔

جو کوئی عورتوں سے جماع کی طاقت نہ رکھتا ہوگا۔اس کو کوئی عورتیں نہ ملیں گی۔ بلکہ اگر کسی کو ایک عورت سے بھی (مثال آپ کے کیونکہ آپ ساری زندگی مجرد ہی رہے تھے) تکلیف پہنچے گی تو ایک بھی نہ ملے گی۔غرض جو چیز موجب تکلیف ہوسکتی ہے وہاں نہ ہوگی اور بس۔

سماجیو! سنتے ہو؟ سوامی جی کیا فرماتے ہیں ایک عورت سے بھی مباشرت کرنا بیماری کا باعث ہے۔اگر ہماری رائے غلط نہ ہوتو سوامی جی چاہتے ہیں کہ تم لوگ اپنی استریوں (بیویوں) کو چھوڑ چھاڑ کر پنڈت مہاراج کی طرح لنگوٹ باندھ لو۔ انصاف سے کہنا اپنے چوتھے اصول کو یاد کر کے بتلانا کہ نیچر کی تعلیم یہی ہے۔

حقیقت پل صراطِ آخرت

عالم آخرت میں ہر ایک سعید اور شقی کو متشکل کر کے دکھلایا جائے گا کہ وہ دنیا میں سلامتی کی راہوں میں چلا یا اس نے ہلاکت اور جہنم کی راہیں اختیار کیں سو اس دن وہ سلامتی کی راہ جو کہ صراط مستقیم اور نہایت باریک راہ ہے اور جس سے تجاوز کرنا اور ادھر ادھر ہونا درحقیقت جہنم میں گرنا ہے تمثل کے طور پر نظر آئے گی اور جو لوگ دنیا میں صراط مستقیم پر چل نہیں سکتے وہ اس صراط پر بھی چل نہیں سکیں گے۔کیونکہ وہ صراط درحقیقت دنیا کی روحانی صراط کا ہی ایک نمونہ ہے اور جیسا کہ ابھی روحانی آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے صراط کے دائیں بائیں درحقیقت جہنم ہے اگر ہم صراط کو چھوڑ

کر داہنے طرف ہوئے تب بھی جہنم میں گرے اور اگر بائیں طرف ہوئے تب بھی گرے اور اگر سیدھے صراط مستقیم پر چلے تب جہنم سے بچ گئے۔ یہی صورت جسمانی طور پر عالم آخرت میں ہمیں نظر آئے گی اور ہم آنکھوں سے دیکھیں گے کہ درحقیقت ایک پل صراط ہے جو پل کی شکل پر دوزخ پر بچھایا گیا ہے۔ جس کے داہنے بائیں دوزخ ہے تب ہم مامور کئے جائیں گے کہ ان پر چلیں سو اگر ہم دنیا میں صراط پر چلتے رہے ہیں اور اپنے داہنے بائیں نہیں چلے تو ہم کو اس صراط سے کوئی خوف نہیں اور نہ جہنم کی بھاپ ہم تک پہنچے گی اور نہ کوئی فزع اور خوف ہمارے دل پر طاری ہوگا بلکہ نور ایمان کی قوت سے چمکتی ہوئی بجلی کی طرح ہم اس سے گذر جائیں گے۔ کیونکہ پہلے دنیا میں اس سے گزر چکے ہیں۔

صراط اخروی کی فلاسفی حضرت ابن عربی کے الفاظ میں:

قداتی فی صفة الصراط انه ادق من الشعر واحدّ من الصیف وکذا الشریعة فی الدنیا لا یعلم وجه الحق فی المسئلة عند الله ولا من هو المصیب من المجتهدین بعینه فحکمها بالشرع احدّ من السیف وادق من الشعر فی الدنیا فالشرع هنا هو الصراط المستقیم ولا یزال فی کل رکعة من الصلٰوة یقول العبد اهدنا الصراط المستقیم فهو احدمن السیف وادق من الشعر فظهوره فی الأخرة محسوس بین واضح من ظهوره فی الدنیا الالمن دعا الی الله عالی البصیرة کالرسول و اتباعه فالحقهم الله بدرجات الانبیاء فی الدعاء الی الله علی بصیرة ای علی علم و کشف و قد ورد فی خبران الصراط یظهر یوم القیامة لا

بصار علی قدر نور المارین علیه فیکون دقیقافی حق قوم و عریضافی حق اٰخرین یصدق ھٰذا الخبر قوله تعالی نورھم یسعیٰ بین ایدیھم وبایمانھم والسعی مشی وما طریق الا الصراط وانما قال بایمانھم لان المؤمن فی الاٰخرة لا شمال له کما ان اھل النار لایمین لھم ھذا بعض احوال مایکون علی الصراط واما الکلالیب والخطاطیف والحسک ھی من صور اعمال بنی اٰدم تمسکھم علی الصراط فلا ینتھون الی الجنة ولا یقعون فی النار حتی تدرکھم الشفاعة والعنایة الا لھیة فمن تجاوزھنا تجاوز اللّٰہ عنه ھناک ومن انظر مسعرا انظره اللّٰہ ومن عفوا اعفا اللّٰہ عنه ومن استقصی حقه ھنا من عباده استقصی اللّٰہ حقه منه ھناک ومن شدد علی ھذه الامة شدد اللّٰہ علیه وانما ھی اعمالکم ترد علیکم فاستلزموا مکارم الاخلاق فان عذایعا ملکم اللّٰہ بما عاملتم به عباده کان ما کان وکان ما کانوا۔

ترجمہ: پل صراط اخروی کی صفت میں آیا ہے کہ وہ بال سے باریک تر اور تلوار سے تیز تر ہے اور ایسا ہی دنیا میں علم شریعت کا حال ہے کہ اکثر مسائل میں راہ راست جو عنداللہ مقبول و پسندیدہ ہو قطعاً معلوم نہیں ہوتا پس دنیا میں مسائل کا حکم شرع میں تلوار سے تیز تر اور بال سے باریک تر ہے۔ پس شریعت یہاں صراط مستقیم ہے اسی لئے بندہ نماز کی ہر رکعت میں کہتا ہے: اھدنا الصراط المستقیم. پس وہ تلوار سے تیز تر اور بال سے باریک تر ہے اور آخرت میں دنیا کی بہ نسبت اس کا ظاہر ہونا واضح تر ہوگا۔ مگر جنہوں نے علی وجہ البصیرت خدا تعالیٰ کی طرف دعوت کی مثل رسولوں اور ان کے اتباع کے ان کو خدا تعالیٰ انبیاء کے درجہ کے ساتھ ملحق کر دے گا اور

احادیث میں آیا ہے۔

''صراط'' قیامت میں گزرنے والوں کے نور کے موافق ظاہر ہوگا پس وہ ایک کے حق میں باریک ظاہر ہوگا اور دوسرے گروہ کے حق میں کشادہ۔

اور اس خبر کی تصدیق خدا تعالی کے اس کلام سے ہوتی ہے کہ

مؤمنوں کا نور ان کے آگے اور داہنے طرف دوڑتا ہوا نظر آئے گا

اور وہاں صراط کے بغیر کوئی راہ نہ ہوگی اور خدا تعالی کے کلام میں جو آیا ہے کہ ان کا نور داہنے طرف دوڑتا ہوگا یہ اس لئے ہے کہ آخرت میں مؤمن کا کوئی بایاں نہ ہوگا۔ جیسا کہ دوزخیوں کے لئے داہنا نہ ہوگا۔

یہ تو صراط اخروی کے بعض احوال ہیں مگر زنبور اور اچکنے والے اور گوکھرو کے کانٹے یہ تو بنی آدم کے عملوں کی صورتیں ہوں گی جو ان کو پل صراط پر بند کرلیں گے پس ابھی نہ بہشت میں جائیں گے اور نہ دوزخ میں گریں گے یہاں تک کہ ان کو شفاعت اور عنایت الٰہی پہنچ جائے گی پس جس نے یہاں پر درگزر کیا خدا تعالی اس کو معاف کرے گا اور جو کوئی بندوں سے اپنا حق کاوش کرکے لے گا تو خدا تعالی وہاں اس سے اپنا حق کاوش کرکے لے گا اور جو کوئی اس امت پر سختی کرے گا خدا تعالی اس پر سختی کرے گا یہ صرف تمہارے اعمال ہیں جو تم پر وارد ہوں گے پس اچھے اخلاق کو لازم پکڑو کیونکہ خدا تعالی کل تم سے وہی معاملہ کرے گا جو تم بندوں کے ساتھ کرو گے۔

بیسواں باب

متفرق مسائل
کے متعلق اعتراضات کے جوابات

کیا اصحاب کہف کا وہی عقیدہ تھا جو موجودہ عیسائیوں کا ہے

سوال:
سورۃ کہف کی آیات سے اصحابِ کہف کی ایمانداری اور مدح ثابت ہوتی ہے اور اس کا سبب بظاہر دین عیسوی قبول کرنا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس عہد تک دین عیسوی غیر محرف تھا اور جہاں تک تاریخ کی کتابوں کو دیکھا گیا اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے عیسائیوں کا بھی یہی عقیدہ تھا جو آج کے زمانہ کے عیسائیوں کا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلا کہ آج کل جو مذہب عیسائیت پر الزام تحریف لگایا کرتے ہیں محض تعصب ہے۔

جواب: جس نے مذہب عیسوی کی تاریخیں دیکھی ہیں اس پر یہ بات ہرگز مخفی نہیں کہ حضرات حواریوں کے زمانہ ہی میں اختلاف کی بنیاد قائم ہوگئی تھی۔ پولوس اور شمعون اور دیگر لوگوں میں جو کچھ اختلاف پڑا وہ خود حواریوں کی تاریخ یعنی کتاب اعمال حوارئین ہی سے ثابت ہے جس کو عیسائی انجیل کہتے ہیں۔ اور پولوس کے ناموں سے بھی جو انجیل مانے جاتے ہیں اور پھر بعد میں جو کلیساؤں میں اختلاف ہوا اور مختلف فرقے اول اور دوسری صدی عیسوی میں پیدا ہوئے ان کا بیان کرنا طوالت ہے چوتھی صدی عیسوی میں جب روم کے قیصروں میں سے سب سے اول قسطنطین عیسائی ہوا۔ اس نے انہیں اختلافات دور کرنے کے لئے اور نیز الوہیت مسیح و دیگر اصول مذہب قائم کرنے کے لئے اور نیز الوہیت مسیح و دیگر اصول مذہب قائم کرنے کے لئے شہر نائس میں بڑے زور شور سے ایک انجمن منعقد کی اور پھر برسوں تک انجمنیں منعقد ہوتی رہیں مگر تاہم بہت سے فریق جدا ہی رہے عیسائیوں میں الوہیت مسیح کے منکر بھی باقی رہے اور اب تک عیسائیوں میں ان مخالف فریقوں کے پیرو باقی

ہیں پس جب یہ ہے تو اب کون کہہ سکتا ہے کہ افسوس کہ عیسائیوں کا مذہب آج کل کے فرقہ پراٹسٹنٹ یا فرقہ رومن کیتھولک کا مذہب تھا جو آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت ملکوں میں پھیلا ہوا تھا جس میں بے شمار تحریفات ہیں اور جن کی اصلاح کے لئے نبی آخرالزمان علیہ السلام بھیجے گئے۔ حق یہ ہے کہ اصحابِ کہف حواریوں کے اصلی مذہب پر تھے تثلیث والوہیتِ مسیح سے ان کے کان بھی آشنا نہ تھے۔ ان پر پولوس کی تعلیم کا اثر نہ پڑا تھا۔

(تفسیر حقانی ۳/۱۹۶، ۱۹۷)

نماز کا طریقہ قرآن میں کیوں مذکور نہیں

اعتراض: (عیسائی پادری کا اعتراض)

قرآن میں کیونکر پانچ یا پچاس نمازوں کی ترتیب وطریقہ کا ذکر نہیں۔ جبکہ نماز اسلام کا ایک اہم ستون ہے؟ مگر اس ستون کی بنیاد قرآن میں نہیں۔

جواب: پانچوں نمازوں کی فرضیت قرآن پاک سے ثابت ہے۔ باقی رہا ان کے ادا کرنے کا طریقہ تو آنحضرت ﷺ نے جس طریقہ سے ان نمازوں کو ادا فرمایا یہ طریقہ احادیث صحیحہ میں موجود ہے۔ ہم اسی طریقہ سے یہ نمازیں ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں قرآن میں حضور پاک ؐ کیلئے یہ فرمان مبارک ملا ہے:

" فَاتَّبِعُونِی " پس میری اتباع کرو۔ (آل عمران: ۳۱)

جبکہ موجودہ عیسائیت میں تثلیث (باپ، بیٹا اور روح القدس) پر ایمان لانا فرض، اس کا منکر کافر اور دوزخی ہے اور تثلیث کی تعریف یہ ہے۔

خدا ایک میں تین ہے۔ ایک قادر مطلق ذات جس میں تین اقنوم ہیں جنہیں باپ، بیٹا اور روح القدس کہتے ہیں۔ (تحقیق حق صفحہ ۳۸)

جبکہ یہ عقیدہ مسیحیت کا ستون ہے تو اس ستون کی بنیاد یعنی تثلیث کا لفظ اور اس

کی تعریف بائبل میں کیوں نہیں؟

نیز

''روح القدس'' صرف ''باپ'' سے صادر ہے۔

''سچائی کا روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے۔'' (انجیل یوحنا ۱۵:۲۶)

مگر مسیحی کلیسیا کا عقیدہ یہ ہے کہ ''باپ اور بیٹا'' دونوں سے ''روح القدس'' صادر ہے چنانچہ پادری ولیم جی، ینگ صاحب لکھتے ہیں۔

''مسیح خدا سے خدا ہے''۔ اور روح القدس ''باپ اور بیٹے سے صادر ہے۔''

(رسولوں کے نقش قدم پر صفحہ ۲۲۱)

جبکہ مسیحی کلیسیا کا عقیدہ تثلیث اور اس کی تعریف انجیل میں کیوں مفقود ہے؟

(جواب مسلم صفحہ ۱۰۲)

افعال واحکام حج پر اعتراض

اعتراض: (مخالفین اسلام کا اعتراض)

مخالفین اسلام یہود اور عیسائی اور ہندو حج کے بارے میں اعتراض کیا کرتے ہیں کہ یہ عرب کے جاہلوں کا میلہ ہے جو بغرض تجارت قائم ہوا تھا۔

چنانچہ نیچری مفسر بھی ص ۲۴۹ میں کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے بغرض آبادی مکہ اور ترقی تجارت کے لئے لوگوں کو حج کی ترغیب دی۔ پس نبی علیہ السلام نے انہیں رسمیات کو (کہ جو بعید از عقل ہیں اور صرف جسمانی باتیں ہیں کہ ننگا سر کر کے ایک چوکھونٹے مکان کے گرد گھومو اور وحشیانہ وضع بناؤ تہبند باندھو پھر دو پہاڑوں کے درمیان دیوانوں کی طرح ہیرے پھیرے کرو بے فائدہ منیٰ اور عرفات میں رہو پتھر کے مناروں کو کنکریاں مارو سر منڈاؤ۔ ناحق جانوروں کو ذبح کر کے جنگل کو سڑاؤ) فرض واجب بنا دیا ہے''

جواب: اس کا جواب بہت سہل ہے اہل کتاب کہ جو توراۃ کو مانتے ہیں ان کیلئے تو یہ اعتراض کرنا شیشہ کے گھر میں بیٹھ کر مخالف پر پتھر پھینکنا ہے کیونکہ بائبل بالخصوص توراۃ سفر احبار میں متعدد مقامات پر بنی اسرائیل کے لئے خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی معرفت وہ احکام فرض کیے ہیں کہ جو خداوند کے لئے سونا اور چاندی اور رنگ برنگ کی چیزیں لاویں جس سے بغلی ایل اور اہلیاب جو بڑے کاریگر تھے خداوند کے لئے

(۱۱) مسکن اور خیمہ اس کا گھٹاٹوپ اس کا اور آنکڑے اس کے اور تختے اس کے اور ستون اس کے اور پاؤں اس کے صندوق اور چوبیں اس کی اور سرپوش اس کا اور پردہ اس کا میز اور چوبیں اس کی اور سب برتن اس کے اور نذر کی روٹیاں شمعدان روشنی کے لئے اور اس کے سرانجام اور اس کے چراغ اور جلانے کا تیل اور قربان گاہ بخور کے لئے اور چوبیں اس کی اور ملنے کا تیل اور بخور خوشبو مصالح کا اور پردہ مسکن کے دروازہ کا اور مذبح سوختنی قربانی کا اور اس کے لئے پیتل کا آتش دان اور چوبیں اس کی اور حوض و کرسی اور پردہ صحن کے دروازہ کا اور میخیں مسکن کی اور صحن کی میخیں اور ڈوریاں ان دونوں کی اور خدمت کا لباس مقدس میں عبادت کے لئے اور مقدس لباس ہارون کاہن کے لئے اور لباس اس کے بیٹوں کا کاہنوں کے لئے بنایا۔

اور پھر ہر ایک کے اندر جو قیدیں لگیں کہ ایسا رنگ ہو اور اتنا طویل اور اتنا عرض اور ایسا خیمہ اور ایسا کروبیوں کی تصویریں پیتل کی اور کاہن کا لباس ایسا اور ایسا اور چناں اور چنیں پھر ان احکام کی ایسی سخت تاکید کہ جو کوئی ذرا بھی سرتابی یا خلاف کرے تو بیچارا مارا جائے۔ اب اگر حج کے ارکان کہ جن کی وجہ ہم ابھی بیان کرتے ہیں فضول ہیں تو یہ بکھیڑا کیا معقول ہے؟ پھر اگر اس سے موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور توراۃ کے

کتاب الٰہی ہونے میں کچھ فرق نہیں آیا تو قرآن اور نبی آخر الزمان علیہ السلام کی نبوت میں کیوں نکتہ چینیاں ہوتی ہیں؟ لطف یہ کہ ارکان حج میں تو سراسر روحانیت ہے اور ان میں محض جسمانیت پھر ان سے اعراض کر کے ان پر منہ مارنا عجب بات ہے۔ علاوہ اس کے اور جو کچھ سوختنی قربانی اور اس کا خون چھڑکنا اور تیل کا پکوان پکانا وغیرہ احکام مندرج توراۃ عجیب حیرت انگیز ہیں۔ طرفہ یہ کہ عیسائیوں کے ہاں باوجود یہ کہ شریعت سے مطلقاً آزادی ہے مگر عشاء ربانی کہ جس میں خمیری روٹیاں مسیح کا گوشت تصور کر کے کھائی جاتی ہیں اور پھر بپتسمہ کہ حوض میں تمام گناہوں سے پاک ہونے کے لئے غوطہ دلایا جاتا ہے۔ کیا نا معقول چیز ہے اور پھر اس کو دین کا اصول قرار دینا کیا امر فضل ہے۔

پادری صاحب ان باتوں کی کوئی معقول وجہ بیان فرمائیں ورنہ غیروں پر طعن کرنا تو کچھ بڑی بات نہیں۔ اور وید اور شاستر اور پوران تو پوجا پاٹ سے بھرے پڑے ہیں جن میں عناصر آفتاب و ماہتاب اور اندر دیوتا اور دیگر لوگوں کی پرستش کے عجائب طریقے لکھے ہیں اور بلدان اور یگ کا دستور کہ یوں آگ جلاویں اور کرچھی میں فلاں چیز کا عرق چواویں اور صبح و شام یوں کریں اور سینکڑوں باتیں بعید از عقل سلیم ان کی کتب مسلمہ میں موجود ہیں۔ اور عام دستور گنگا جمنا کا اشنان اور ایک تھیلے میں پوجا کے آلات کہیں چھوٹی چھوٹی پیالیاں اور صندل گھسنے کا پتھر اور بتوں کو پانی پلانے کے چھوٹے پیتل اور تانبے کے چمچے اور بجانے کا سنکھ ہر مہاراج کی بغل میں بھان متی کا پٹارا دبا ہوا ہوتا ہے۔ آریہ جو آج کل نئے محقق نکلے ہیں اور اپنے پوچ مذہب کو عقل کے مطابق کرنا چاہتے ہیں اور جو نہیں مطابق ہوتا تو اس کا انکار کرتے ہیں بایں معنیٰ تاویل کرتے ہیں۔ وہ اپنی وید اور اس کے اپنشد اور شاستروں کی تو خبر لیں مگر بے چارے ناواقف ہیں کسی قدر انگریزی پڑھ لی چلو شوامی جی مہاراج کی تقریر سن کر وید اور شاستروں کو عام خیال میں کچھ اور ہی سمجھ بیٹھے ڈھٹائی کے زور سے

مقدس اور پاک مذہب پر منہ آنے لگے۔ اب ہم ملحدوں کے مقابلہ میں اسرار ارکان حج بیان کرتے ہیں اگر عقل سلیم کے تابع ہیں تو ضرور ہمارے قول کی تصدیق کریں گے ورنہ تعصب کا کچھ علاج نہیں۔ (تفسیر حقانی ۱/۵۶۴)

حجر اسود کو ہاتھ لگانے اور چومنے پر اعتراض کا جواب

اعتراض: (ہندوؤں اور عیسائیوں کا اعتراض)

مسلمان حجر اسود کو ہاتھ لگا کر اور چوم کر پتھر کی پرستش کرتے ہیں۔

جواب: آریہ اور عیسائی بتائیں کہ عبادت کسے کہتے ہیں۔ عبادت میں استتی (حمد) اور پرارتھنا (یعنی دعا) اور اپاشنا (یعنی دھیان) ضرور ہے۔ بتائیں مسلمان کب اس پتھر سے دعا اور اس کا دھیان اور اس کی استت کرتے ہیں۔ کسی اسلامی عبادت میں اس پتھر کا ذکر بھی نہیں بلکہ عبادات اسلامیہ میں تو مکہ کا بھی ذکر نہیں اس کی کیا ہوگی۔ اگر اس کو ہاتھ لگانا یا چومنا عبادت ہے تو سب لوگ بیاہی ہوئی عورتوں کے عابد اور زمین کے پوجاری ہوں گے۔

بات یہ ہے کہ مقدس مقام میں تصویری زبان کے اندر یہ بات چیت ہے کہ نبوت کے محل سرا کونے کا پتھر یہاں مکہ سے نکلا ہے بلکہ مسیح ابن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے متی باب ۲۳ میں خود کہا ہے کہ یہ تمثیل ہے۔

حجر اسود تصویری زبان کا نمونہ ہے

اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں بہت مدت سے تصویری زبان کا رواج تھا اور اب بھی ہے۔ چنانچہ رامچند رجی اور شیو جی کی تصویری قصص ہندوؤں کے پاس خصوصاً ہند کے قدیم مصوروں کے پاس موجود ہیں۔ سکندر رومی جس کو حضرت دانیال رومی نے ذوالقرن یعنی ایک سینگ کا بکرا خواب میں دیکھا یہ تصویری زبان کی شہادت ہے۔ دیکھو دانیال باب ۸۔ اسی طرح دارا ایرانی بادشاہ کی تصویری زبان میں گفتگو عام

نظموں میں موجود ہے۔ تصویری زبان کی کتابیں اور اخبارات ہند میں بکثرت موجود ہیں۔ اسکندریہ ملک مصر کے ایک جریدہ نگار نے ایک رسالہ قدیمی تصویری زبان کے متعلق لکھ کر شائع کیا ہے جس میں صرف حیوانات وآلات واشجار وغیرہ کی اشکال ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں پہلے اس زبان کا عام رواج تھا اب بھی یہ تصویری زبان ان علاقوں میں جہاں تعلیم کا رواج کم ہوتا ہے یا بالکل نہیں ہوتا زیادتر استعمال کی جاتی ہے بلکہ اکثر تصویری زبان بہ نسبت تحریری کے زیادہ قوی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے یادگاروں کو عقلاؤ حکماً اکثر تصویری تحریروں میں ادا کرتے ہیں۔

یوشع بن نون نے یردن سے گذرتے وقت بارہ پتھر اٹھائے یوشع باب ۶ وہ بقول عیسائیوں کے بارہ حواریوں کی پیشین گوئی تھی۔ یہودی اور عیسائی غیر قوموں کو اور بعض خواص کو پتھر کہتے تھے یہ ان کا محاورہ تھا بطرس کو پتھر اس لئے کہا کہ کلیسیا کے لئے وہ فون ڈلیش ستون یعنی بنیادی پتھر ہوا۔ ان باتوں پر خوب غور کرو۔

اب تمہید کے بعد کتب مقدسہ میں ایک پیشین گوئی بہ نسبت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ بہت زور سے درج تھی۔ دیکھو لوقا ۲۰ باب ۱۶ اور ۱۷ آیت۔ وہ پتھر جسے راجگیر وں (معماروں) نے رد کیا وہی کونے کا سرا ہوا اور دیکھو زبور ۱۸۔۲۲ پتھر جسے معماروں نے رد کیا کونے کا سرا ہو گیا۔

متی باب ۲۱۔ آیت ۴۲۔۴۴۔ غرض یہ ایک بشارت ہے جو کئی قدیم کتب میں درج ہے۔ اس بشارت اور پیشین گوئی کے اظہار و تصدیق کے لئے مکہ معظّمہ کی بڑی عبادت گاہ میں بطور تصویری زبان کے حجر اسود کونے پر رکھا گیا تھا۔ محمدیوں سے صدہا سال پہلے سے یہ پتھر ابراہیمی عبادت گاہ کے کونے پر منصوب تھا اور عرب کے لوگ اسے چومتے اور اس کے ہاتھ ملا کرتے گویا قدیمی زمانہ میں بنی عرب سے پہلے یہ فقرہ تصویری طور پر مکہ معظّمہ کی مقدس مسجد پر رکھا تھا کہ اس شہر میں وہ کونے کا پتھر ظاہر ہو گا۔ جسے یوں کہا جائے گا کہ نبوت اور رسالت کی عظیم الشان اور مستحکم عمارت جو کہ انبیاء اور

رسولوں کی وجود ذی جود سے تیار ہوئی ہے۔اسی پتھر سے پوری ہوئی اور اسی کونے کے پتھر کی یہ شان ہوگی کہ ان کی بیعت رحمان کی بیعت اور ان کی اطاعت رحمان کی اطاعت ہے حضرت رسالت مآب ﷺ نے بھی اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:

مثلی و مثل الانبیاء کمثل قصر احسن بنیانه و ترک منه موضع لبنة الی ان قال فکنت انا سددت موضع لبنة وفی روایة فانا تلک اللبنة. (مشکوٰۃ)

ترجمہ: یعنی میری اور دوسرے نبیوں کی مثال اس محل کی ہے کہ وہ بہت خوبصورت بنایا گیا اور ایک پتھر کی جگہ اس میں خالی رکھی گئی۔جس کو میں نے پر کردیا اور ایک روایت میں یوں ہے کہ پس وہ پتھر میں ہوں۔

کیا جھوٹ بولنا جائز ہے

اعتراض: (عیسائی پادری کا اعتراض)

اسلام میں شوہر کو بیوی سے اور جھگڑے میں صلح کرانے کیلئے جھوٹ بولنے کی اجازت ہے۔

جواب: ان دونوں اعتراضوں میں بظاہر تو میاں، بیوی اور دو مسلمانوں کی لڑائی ہے مگر اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس میں بہت بڑا فتنہ اور فساد نظر آتا ہے کیونکہ میاں، بیوی اور دونوں مسلمانوں کے خاندانوں میں یہ بات پھیل کر کدورت و نفرت کا رنگ اختیار کرلے گی۔ اور اس سے ہاتھ پائی تک نوبت پہنچے گی اس سے مسلمانوں کی جماعت میں نااتفاقی پیدا ہوگی جو بہت نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اس لئے اس خطرناک فتنے کو روکنے کے لئے جھوٹ کے ذریعہ دو مسلمانوں میں صلح ہوسکے تو جھوٹ بولنا جائز ہے اور بیوی کو خوش کرنے کے لئے بھی خاوند کو بعض مواقع میں

جھوٹ کی اجازت ہے۔ مسیحی دنیا کے مایۂ ناز رسول جناب پولوس کا انداز تبلیغ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ جناب پولوس لکھتے ہیں:

اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے؟ اور ہم کیوں برائی نہ کریں تاکہ بھلائی پیدا ہو؟ چنانچہ ہم پر یہ تہمت لگائی بھی جاتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ان کا یہی مقولہ ہے مگر ایسوں کا مجرم ٹھہرنا انصاف ہے۔ (رومیوں ۳:۷،۸)

لیجئے صاحب! مسیحی دنیا کے مایہ ناز رسول جناب پولوس نے یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے۔ اس فتویٰ کی بنیاد یہ ہے کہ "خدا کی سچائی" "زیادہ ظاہر ہوئی" یعنی مسیحت جھوٹ بولنے سے زیادہ پھیلتی ہے اس لئے تبلیغی میدان میں جھوٹ بولنا جائز ہے۔ اس عاجز کا تجربہ ہے کہ پادری فانڈر صاحب سے لے کر زیر نظر اعتراضات تک ان لوگوں کی جتنی بھی کتابیں نظر سے گزری ہیں ان میں کوئی کتاب بھی ایسی نہیں گزری جس میں جھوٹ کا جذبہ کارفرمانہ ہو چونکہ ان کے رسول جناب پولوس صاحب کا فتویٰ اور ذاتی عمل اسی طرح ہے اس لئے یہ لوگ بلا خوف وخطر اپنے رسول جناب پولوس کی پالیسی پر عمل پیرا اور گامزن ہیں۔ (جواب مسلم صفحہ ۲۱۷)

کیا اسلام میں ختنہ یہودیوں کی نقل ہے

اعتراض: (عیسائی پادری کا اعتراض)

اسلام میں مردانہ ختنہ تو یہودیوں کی صاف صاف نقل ہے۔

جواب: ختنہ کرانا اللہ تعالیٰ کا ابدی حکم ہے۔ (پیدائش ۱۷:۱۰تا۱۴)

چونکہ یہ حکم ابدی ہے اس لئے یہ منسوخ نہیں ہوسکتا۔

نیز سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے (پیدائش ۱۷:۲۳ تا ۲۷)
یہ یہودیوں کی نقل نہیں کیونکہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت میں یہودی ہرگز نہ تھے۔
اگر بالفرض محال کوئی اس بات پر بضد ہو کہ یہ یہودیوں کی نقل ہے تو عہد قدیم کو ماننا بھی یہودیوں کی نقل ہے۔
نیز عیسائیوں کا ختنہ نہ کرانا بھی مشرکوں، بت پرستوں اور کافروں کی نقل ہے کیونکہ یہ لوگ ختنہ نہیں کراتے۔

وراثت میں مرد کا حصہ عورت سے دوہرا کیوں؟

اعتراض: (ماڈرن لوگوں کا اعتراض)

مرد طاقتور ہے عورت کمزور ہے تو کمزور کو میراث میں دوہرا حصہ ملنا چاہئے نہ کہ مرد کو اسلام نے یہاں اس مسئلہ میں عورتوں کے حق میں ظلم کیا ہے۔

جواب: خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثین فان کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ما ترک وان کانت واحدۃ فلھا النصف.

ترجمہ: یعنی سکھاتا ہے اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد میں (میراث بانٹنا) کہ مرد کے لئے برابر دو عورتوں کے حصہ ہے۔ پھر اگر عورتیں دو سے زیادہ ہوں پس ان کو میت کے ترکہ کا دو تہائی ملے گی اور اگر ایک ہے تو اس کے لئے آدھا ہے۔

مرد کا حصہ عورت سے دوہرا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

الرجالو قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما انفقوا.

ترجمہ: یعنی مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس لئے کہ خدا تعالی نے بعض کو بعض پر بزرگی و فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ انہوں نے مال خرچ کئے ہیں اپنی عورتوں کی حاجتوں میں۔

شراب اور جوئے کی حرمت کی وجہ

اعتراض: (عام لوگوں کا اعتراض)

شراب میں چونکہ آدمی کو بہت لذت حاصل ہوتی ہے اور جوئے میں دولت بغیر محنت و مشقت کے حاصل ہوتی ہے اس لئے ان کو جائز اور حلال ہونا چاہئے نہ کہ حرام جیسا کہ اسلام نے ان کو حرام قرار دیا ہے۔

جواب: چونکہ لوگوں کی معاش اور خانگی تدابیر اور ملکی سیاست بغیر عقل و تمیز کے مکمل نہیں ہو سکتی اور شراب خوری کی عادت سے تمام انسانی انتظامات میں ہلچل پڑ جاتی ہے۔ اس سے جنگ وجدال اور ذاتی رنجشیں پیدا ہوتی ہیں اور طبائع انسان میں جو بیہودہ خواہشیں ہیں وہ بھی عقلوں کو مغلوب کر لیتی ہیں پھر ان میں ایسے ایسے رذائل کا میلان ہو جاتا ہے اور تمام تدابیر کو وہ تلف کر دیتے ہیں اگر ایسی ایسی حرکات کی روک تھام نہ کی جائے تو لوگ تباہ ہو جائیں۔ اسی روک ٹوک کے لئے شراب کو حرام کیا گیا۔

شراب میں بہت سی خرابیوں کا اندیشہ ہے جن سے خدا تعالی کی ناخوشی ہوتی ہے۔ شراب کی وجہ سے خدا کی جانب خالص توجہ نہیں ہو سکتی تمدن اور خانہ داری کے انتظامات سب درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے شریعت نے شراب کو نجاسات میں داخل کیا ہے۔

چنانچہ خدا تعالی فرماتا ہے شراب ناپاک اور شیطان کا فعل ہے رجس من عمل الشیطان اس لئے خدا نے اس کو بہت تاکید کے ساتھ حرام کیا ہے۔

حکمت الٰہیہ کا یہی اقتضا ہوا کہ اس کو پیشاب اور پاخانہ کے برابر کر دیا جائے تا

کہ لوگوں کے سامنے اس کی برائی متمثل ہو جائے اور اس سے خود بخود ان کے دلوں کو اس کی طرف سے کشیدگی ہو جائے اور اس کی حرمت کے اور بھی وجوہ ہیں جو فسادات کا مجموعہ ہیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوة والبغضاء فی الخمر والمیسر و یصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوة فھل انتم منتھون۔

ترجمہ: شیطان چاہتا ہے کہ ڈالے تم میں دشمنی اور بغض شراب اور جوئے سے اور روکے تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے پھر اب تم باز بھی آؤ گے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

ما اسکر کثیرہ فقیلہ حرام۔

یعنی جو چیز بہت نشہ آور ہو وہ تھوڑی بھی حرام ہے۔

قمار بازی اس لئے حرام ہے کہ اس سے مال ضائع ہوتا ہے اور جھگڑے پیدا ہوتے اور تدابیر مطلوبہ متروک ہو جاتی ہیں اور معاونت جس پر کہ تمدنی زندگی کا دارو مدار ہے اس سے انسان اعراض کرتا ہے اگر ہمارے اس بیان کی تصدیق نہ ہو تو پھر غور و کرو کہ کہیں تم نے جواریوں کو ان باتوں سے خالی اور آسودہ حال نہ دیکھا ہوگا ایسا ہی شراب پینے والے کا حال ہے ان کے نقصانات اور خرابیاں بیشمار ہیں۔

اور جس گھر یا قوم و ملک میں شراب کی کثرت ہوگی وہاں مصائب کی کثرت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپی ممالک میں کثرت شراب نوشی کے باعث مصائب اور جرم کی بھی دن بہ دن ترقی ہو رہی ہے۔ دور نہ جاؤ یورپ میں بلجیم ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کی آبادی ۳،۱۳ ملین سے زائد ہے، لیکن ایک لاکھ نو ہزار شراب خانے ملک میں موجود ہیں یعنی ہر پینتیس (۳۵) شخصوں کے لئے جن میں عورتیں اور لڑکے بھی شامل ہیں ایک شراب خانہ ہے گذشتہ نصف صدی میں بلجیم کی آبادی میں فی صدی

پچاس کی ترقی ہوئی لیکن شراب خانہ فی صد دو سو اٹھاون (۲۵۸) زیادہ ہوئے۔

اہل بلجیم ایک سال میں ۵۵ گیلن شراب پیتے ہیں اور مجموعی مقدار دو کروڑ دس لاکھ چالیس ہزار پونڈ شراب خرچ ہوتی ہے فی کس ۱۳/۳ پونڈ اور فی خاندان پندرہ پونڈ سالانہ کا حساب بالاوسط ہے اس شراب خوری و اسراف کا نتیجہ یہ ہے کہ تعداد جرائم بہت بڑھی ہوئی ہے مجرموں میں فی صدی اسی ۸۰ خودکشی کرتے ہیں ۴۷ قید خانہ رہتے ہیں ۷۹ فقر و فاقہ میں بسر کرتے ہیں اور ۷۵ فی صد مجنون اور پاگل ہیں۔ حقیقت میں اسلام نے شراب کو حرام کر کے نوع انسانی پر غیر معمولی احسان کیا ہے۔

اسلام میں مسکرات کی ممانعت صاف طور پر بتاتی ہے کہ اس پاک مذہب کو شہوانیت سے کس قدر نفرت ہے ہم اس جگہ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر خلاف اسلام کوئی مذہب نفسانیت کی راہ نہیں بتاتا تو کیوں اس میں شراب جیسی بری چیز کی کوئی ممانعت نہیں۔ کیونکہ یہ مضمون اس وقت زیر بحث نہیں مگر ہم پوچھتے ہیں کہ اگر شراب شہوانی خیالات کو ابھارنے والی ہے جیسا کہ کل دنیا تسلیم کر رہی ہے تو کیا کسی مذہب کا شراب سے منع کرنا اور شراب خواری کو قطعاً روک دینا اس امر کی یقینی اور قطعی شہادت نہیں ہے کہ وہ شہوانی خیالات سے چھڑانے والا اور راست بازی اور روح و دل کی پاکیزگی کی طرف بلانے والا ہے۔ اگر اسلام ایک نفسانی مذہب تھا اور اس کی غرض بھی یہی تھی کہ شہوانی خواہشات کو پورا کرنے کے ذریعے بتا دے اور ان کی راہ کھول دے تو پھر اس نے شراب کو کیوں منع کیا اور شراب خوری کو کیوں جڑ سے کاٹا۔

ہمیں اور بھی تعجب ہوتا ہے جب ہم بعض نام کے مسلمانوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ اسلام کے اصول ایک ابتدائی سوسائٹی کے لئے تجویز کئے گئے تھے جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ گویا یہ اصول ایک وحشی قوم کے لئے تجویز کئے گئے تھے اور آج کل مہذب اقوام کے لئے وہ موزوں نہیں۔

بہر حال ان مہذبوں سے جو آج کل شراب خوری سے تباہ ہو رہے ہیں یہ وحشی

قوم ہی اچھی رہی افسوس ہے کہ لوگ واقعات کی بناء پر نتائج پیدا نہیں کرتے بلکہ جو ایک خیال دل میں بیٹھ گیا ہے اسی کی پیروی کرتے ہیں کوئی پاکیزگی اس پاکیزگی کے برابر نہیں جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے مگر اس حقیقی پاکیزگی کو نفسانیت کہا جاتا ہے حالانکہ اس شہوانیت کو جس کی طرف شراب خوری انسانوں کو لے جارہی ہے پاکیزگی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ شراب ہی وہ چیز ہے جو انسان کے نفسانی جذبات کو جوش میں لاتی ہے اسی شراب خوری کی علت کو اسلام نے جڑ سے کاٹ کر انسانوں کو حیوانی جذبات سے آزاد کر دیا ہے۔ ابھی تک بہت سی دنیا اس حقیقی نور سے بے خبر ہے مگر وہ زمانہ بہت قریب آیا جاتا ہے کہ جب دنیا کی آنکھیں اس نور کے دیکھنے کے لئے کھولی جائیں گی۔ اور جب اسلام کے اصول پوری دنیا کو معلوم ہوں گے تب سمجھ میں آئے گا کہ وہ پاکیزگی ان لوگوں کے وہم و گمان سے بھی برتر ہے جو اسلام سکھاتا ہے۔

حرمت سود کی وجہ

اعتراض: (کفار کا اعتراض)

سود کاروبار تجارت کی ترقی کا اہم ذریعہ ہے بلکہ ریڑھ کی ہڈی ہے اور اسلام اس سے نابلد ہے اس لئے وہ لوگوں کو سود کے لین دین وغیرہ سے روکتا ہے

جواب: سود کی ایک کثیر الوقوع صورت یہ ہے کہ مقروض نے جتنا قرض لیا ہے اس سے زیادہ یا بہتر کو ادا کرے یہ حرام اور باطل ہے کیونکہ تمام مقروضوں کا یہ قاعدہ ہے کہ اس قسم کا قرض اپنی حاجت اور پریشانی کی وجہ سے لے تو لیتے ہیں لیکن حسب وعدہ اس کا ایفاء نہ کرنے سے دو چند سہ چند ہوتا چلا جاتا ہے کہ اس سے خلاصی کبھی ممکن ہی نہیں اور اس میں جھگڑوں کا گمان غالب ہے اور جب کہ مال کے بڑھانے کا اس طرح طریقہ ہو جائے گا تو اس کی وجہ سے کھیتیاں اور تمام صنعتیں متروک ہو جائیں گی اس لئے اس پیشہ کو حرام ٹھہرایا گیا۔

عن ابن مسعودؓ قال لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربوا وموکلہ و شاھدیہ و کاتبہ.

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے سود لینے والے اور دینے والے اور سود کا معاہدہ لکھنے والے اور سود کے گواہوں پر سب پر لعنت فرمائی ہے۔ (مسلم وترمذی شریف)

اور خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مؤمنین. فان لم تفعلوا فأذنوا بحرب من اللہ ورسولہ.

ترجمہ: اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو سود رہ گیا ہے اگر تم نے سود کو نہ چھوڑا تو خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔

اور دینے کی ممانعت اس لئے ہے کہ اگر سود دینے والے ہی نہ ہوں یعنی سود پر قرض کوئی نہ لے تو پھر سود خور بھی کوئی نہ رہے بلکہ اس قبیح رسم کی بیخ کنی ہو جائے پس اس اعتبار خاص سے یہ تو گناہ ان لوگوں کے ہے جو سود کے دینے کے معاہدہ پر قرض لیتے اور پھر سود کھانے والے لوگوں سے قرض لیتے ہیں جن قوموں کا پیشہ سود خواری کا تھا وہ بالآخر ذلیل ومطرود ہو گئیں۔

نیز سود خواروں کے اخلاق بہت برے ہوتے ہیں۔ ایک شخص حکایت کرتے تھے کہ میں نے ایک فقیر کے لئے ایک سود خوار سے سفارش کی تو وہ کہنے لگا کہ پانچ روپے میں دیدوں گا مگر میرے پاس رہتے تو سو برس میں سود در سود ۱۴/ لاکھ ہو جاتا۔ لکھنؤ میں ایک سلطنت تھی وہ بھی محض سود سے تباہ ہوئی ۔ پہلے ان کے مبلغات پر میسری نوٹوں کے بدلہ میں گئے پھر وہ جنگ کرنے کے قابل نہ رہے اور آخر وہ وقت آیا کہ یہ سلطنت برباد ہو گئی بعض نابکار لوگ کہتے ہیں کہ سود کے بغیر کام نہیں چل سکتا

حالانکہ بارہ سو برس کا (بارہ سو برس میں نے اس لئے کہ تیرھویں صدی میں مسلمانوں نے سود لینا دینا شروع کر دیا) تجربہ بتایا ہے کہ بغیر سود کے سب کام چل سکتے ہیں۔
(احکام اسلام عقل کی نظر میں صفحہ ۲۴۰)

داڑھی رکھنے اور مونچھوں کے کٹوانے کی وجہ

داڑھی ایسی چیز ہے کہ اس سے چھوٹے بڑے کی تمیز ہو سکتی ہے اور مردوں کے لئے ایک قسم کا جمال اور ان کی شکل کو پورا کرنے والی ہے۔ اس واسطے اس کا بڑھانا ضروری ہوا اور اس کا ترشوانا مجوسیوں کا طریقہ ہے اور اس میں تخلیق الٰہی کی تغیر بھی پائی جاتی ہے داڑھی ترشوانے کی وجہ سے بڑے بڑے سردار اور خاندانی لوگ رذیلوں میں شمار ہو جاتے ہیں تمام انبیاءؑ، صلحاء داڑھی رکھتے آئے ہیں اگر داڑھی منڈوانے میں کوئی مصلحت اور فائدہ ہوتا تو وہ سب سے پہلے منڈواتے کیونکہ ایسے لوگ تمام دنیا کے لئے بہتری و بھلائی کا نمونہ بن کر آیا کرتے ہیں اور مونچھیں کٹوانے کی وجہ یہ ہے کہ جس کی مونچھیں بڑی بڑی ہوتی ہیں جب وہ کچھ کھاتا پیتا ہے اس میں بھر جاتی ہیں اور میل کچیل میں آلودہ رہتی ہیں اور یہ بھی مجوس کا طریقہ ہے جس کی نسبت آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:

خالفوا المشرکین احفوا الشوارب اوفوا اللحی.
(بخاری ۲۰۶/۷ مسلم طہارۃ ب ۱۶ حدیث ۵۴)

ترجمہ: یعنی مشرکوں کی مخالفت کرو مونچھیں ترشواؤ اور داڑھیاں بڑھاؤ۔

زکوٰۃ نکالنے سے مال کیسے بڑھتا ہے

اعتراض: (عام لوگوں کا اعتراض)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو گن کر روپے رکھتے اور زکوٰۃ دینے کے بعد پھر گنتے ہیں تو کم ہو جاتے ہیں بڑھنا تو درکنار برابر بھی نہیں رہتے۔

جواب: بات یہ ہے کہ بڑھنے کی حقیقت اور غرض پر اگر نظر ہوتی تو یہ شبہ نہ ہوتا۔ مال کے بڑھنے سے غرض یہ ہے کہ وہ بڑھا ہوا مال اپنے کام آئے۔ چنانچہ اگر کسی کے پاس کروڑوں روپیہ ہو اور اس کے کام نہ آئے بلکہ فضولیات میں ضائع ہو جائے۔ اور ایک شخص کے پاس دس روپے ہیں لیکن دس کے دس اس کے کام آئے۔ یہ شخص اس سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ ہم کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے ہیں کہ دو شخص ہیں اور ان کی آمدنی برابر ہے۔ مگر فرق اتنا ہے کہ ایک زکوٰۃ دیتا ہے اور تمام حقوق واجبہ ادا کرتا ہے۔ تو اس کی چین و آرام سے زندگی گزرتی ہے۔ اور دوسرا شخص جو حقوق ادا نہیں کرتا وہ ہمیشہ پریشانی میں رہتا ہے آج چوری ہو گئی کل کوئی مقدمہ قائم ہو گیا۔ خود بیمار ہو گئے بچے بیمار ہو گئے، دوائیوں میں یہاں روپیہ جا رہا ہے۔ طبیب کی فیس میں روپیہ جا رہا ہے۔ بخلاف پہلے شخص کے کہ جس قدر آمدنی ہے وہ سب اس کے کام آ رہی ہے جو مال کے بڑھنے سے غرض ہے وہ اس کو حاصل ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ جس قدر لیتے ہیں اس سے زیادہ دیتے ہیں اور پھر جو لیتے ہیں وہ اپنے لئے نہیں وہ بھی تمہارے ہی لئے ہے۔ (ذکر الموت ص ۹۸)

کلمۃ الحمد والشکر

انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے کیا کام لینا ہے بہت سے ارادے انسان کے دل میں ہوتے ہیں کہ اب یہ کام کروں گا پھر یہ کروں گا لیکن ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ دونوں رمضان المبارک کی حرمین شریفین کی حاضریوں میں حضرت اقدس مدرس حرم جناب فضیلۃ الشیخ حضرت مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم العالیہ نے بڑی شد و مد سے اس بات کا احساس دلایا کہ اس وقت جس موضوع پر لکھنے کی

شدید ضرورت ہے وہ کفار کے اسلام پر مختلف اعتراضات کو یکجا کر کے ان کے جوابات دینا ہے۔ کیونکہ اس وقت پوری دنیا اسلام کی طرف متوجہ ہے بعض اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اور بعض اسلام پر تنقید کر کے مسلمانوں اور کفار کو اسلام سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ تا کہ مسلمان اسلام کو چھوڑ دیں اور کفار اسلام کا مطالعہ کر کے اسلام کو قبول نہ کریں۔ اس لئے کفار کے اعتراضات کو جمع کر کے ان کے جوابات لکھ دیئے جائیں تا کہ اس زمانہ کی یہ ضرورت پوری ہو جائے۔

جب مخالفین اسلام کے اعتراضات کو جمع کر کے ان کے جواب لکھے جائیں گے اور ان کو اردو عربی انگریزی میں چھاپ کر عام کیا جائے گا تو ان مخالفین کا ناطقہ بند ہو سکے گا جو اسلام قبول کرنے والوں کو ایسے اعتراضات میں پھنسا کر اسلام سے دور کرنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو اسلام سے ہٹانا چاہتے ہیں۔

چنانچہ اللہ کی توفیق سے اور حضرت کی توجہات سے اکابرین اسلام کی کتابوں کے مطالعہ سے مخالفین اسلام کے اعتراضات اور ان کے جوابات کو گذشتہ صفحات میں جمع کیا گیا ہے تا کہ موجودہ دور کی اس ضرورت کو احسن طریقے پر پیش کیا جائے۔

الحمدللہ یہ کام تیار ہو کر قارئین کے سامنے ہے اس سے مستفید ہو کر اس کی اپنے حلقہ احباب میں بلکہ حتی الوسع جہاں تک ہو سکے اس کی لوگوں میں مختلف زبانوں میں اشاعت کی جائے تا کہ اعتراضات سے لوگوں کے دل صاف ہوں اور کفار حلقہ بگوش اسلام ہوں۔

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سر عام رکھ دیا

امداداللہ انور

کان اللہ لہ وکان ہو للہ

یکم رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ

بمطابق 12 اگست 2010ء

مآخذ و مصادر کتب اسلام

(۱) قرآن کریم

(۲) الآثار الباقیۃ عن القرون الخالیۃ — ابوریحان محمد بن احمد البیرونی

(۳) آفتاب ہدایت — مولانا کرم الدین دبیرؒ

(۴) آنے والے انقلاب کی تصویر کا دوسرا رخ — شیخ حسام الدین

(۵) احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم — شمس الدین ابی عبداللہ محمد بن احمد المقدسیؒ

(۶) اعلام الموقعین — ابن القیم الجوزیہؒ

(۷) الاکمال فی اسماء الرجال — خطیب تبریزیؒ

(۸) انتصار الاسلام حجۃ الاسلام — حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

(۹) الادب المفرد — امام بخاریؒ

(۱۰) اصول الشاشی — علامہ ابوعلی شاشیؒ

(۱۱) ابن ابی شیبہ (مصنَّف) — امام ابن ابی شیبہؒ

(۱۲) اشرف الجواب لشفاء المرتاب — حضرت تھانویؒ

(۱۳) اظہار الحق (گجراتی ترجمہ) — مولانا غلام محمد

(۱۴) اظہار الحق (انگریزی ترجمہ)

(۱۵) ایک اسلام — مولانا سرفراز خان صفدرؒ

(۱۶) اخبار وکیل

(۱۷) اخبار مدینہ بجنور

(۱۸) اخبار وحدت

(۱۹) احکام اسلام عقل کی نظر میں (المصالح العقلیہ) حضرت تھانویؒ
(۲۰) البعث والنشور امام بیہقی
(۲۱) بائبل سے قرآن تک (اردو ترجمہ اظہار الحق) مولانا اکبر علیؒ مولانا تقی عثمانی
(۲۲) البدایہ والنہایہ امام ابن کثیرؒ
(۲۳) پاکستان میں مسیحیت ڈاکٹر نادر رضا صدیقی
(۲۴) التعلیق الممجد حاشیہ موطا محمد علامہ لکھنویؒ
(۲۵) تفسیر ابن المنذر امام ابن المنذرؒ
(۲۶) تقریر دلپذیر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
(۲۷) تکمیل الایمان شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ
(۲۸) تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ
(۲۹) تفسیر ابن کثیر امام ابن کثیرؒ
(۳۰) تفسیر بحر محیط ابو حیان اندلسیؒ
(۳۱) تفسیر حقانی حضرت مولانا ابو محمد عبدالحق حقانیؒ
(۳۲) تفسیر ارشاد العقل السلیم الی مزایا کتاب الرب الکریم مفتی ابوالسعودؒ
(۳۳) تفسیر الاتقان علامہ جلال الدین سیوطیؒ
(۳۴) تفسیر طبری امام محمد بن جریر طبریؒ
(۳۵) تفسیر القرآن الکریم امام ابن ابی حاتم
(۳۶) تفسیر الجامع لاحکام القرآن علامہ قرطبیؒ
(۳۷) تفسیر بیان القرآن حضرت تھانویؒ
(۳۸) تفسیر غرائب القرآن علامہ نیشاپوریؒ
(۳۹) تفسیر روح المعانی علامہ آلوسیؒ
(۴۰) تفسیر کبیر امام رازیؒ

(۴۱)	تفسیر جلالین	علامہ سیوطی ومحلی
(۴۲)	تفسیر الکشاف	علامہ زمخشریؒ
(۴۳)	تفسیر	حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ
(۴۴)	تفسیر مدارک التنزیل	علامہ نسفیؒ
(۴۵)	تفسیر عثمانی	علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
(۴۶)	تفسیر بیضاوی	قاضی بیضاویؒ
(۴۷)	تفسیر موضح القرآن	حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ
(۴۸)	تقویم البلدان	عماد الدین اسماعیل ابوالفداء
(۴۹)	تدوین حدیث	مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
(۵۰)	تدریب الراوی	علامہ سیوطیؒ
(۵۱)	تاریخ فرشتہ	ابن بطوطہؒ
(۵۲)	جامع ترمذی	امام ترمذیؒ
(۵۳)	جمع الفوائد	ابوسلیمانؒ
(۵۴)	الجامع الصغیر	علامہ سیوطیؒ
(۵۵)	الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح.	علامہ ابن تیمیہؒ
(۵۶)	جواب مسلم	حضرت مولانا بشیر احمد حسینی
(۵۷)	الحبائک فی اخبار الملائک	علامہ سیوطیؒ
(۵۸)	حادی الارواح الی بلاد الافراح	علامہ ابن القیم
(۵۹)	حواشی بائبل سے قرآن تک	مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم
(۶۰)	حجۃ الاسلام	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
(۶۱)	حق پرکاش	مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ
(۶۲)	الخصائص الکبری	علامہ سیوطیؒ

(۶۳) دلائل النبوۃ — امام ابونعیم اصبہانیؒ
(۶۴) دائرۃ معارف القرن العشرین — فرید وجدی مصری
(۶۵) زوائد زہد — امام عبداللہ بن امام احمد بن حنبلؒ
(۶۶) سنن ابوداودؒ — امام ابوداود
(۶۷) سنن بیہقیؒ — امام بیہقیؒ
(۶۸) سنن ابن ماجہؒ — امام ابن ماجہؒ
(۶۹) سنن نسائیؒ — امام نسائیؒ
(۷۰) سوط اللہ الجبار مولانا محمد علی بچھرایونیؒ جلد اول (فارسی) اردو ترجمہ امداد اللہ انور
(۷۱) سوط اللہ الجبار مولانا محمد علی بچھرایونیؒ جلد دوم (قدیم اردو) تجدید امداد اللہ انور
(۷۲) سوط اللہ الجبار مولانا محمد علی بچھرایونیؒ جلد سوم (قدیم اردو) تجدید امداد اللہ انور
(۷۳) سیرت النبیؐ — سید سلیمان ندویؒ
(۷۴) شعب الایمان — امام بیہقیؒ
(۷۵) شرح موطا امام مالکؒ — علامہ ابوالولید باجیؒ
(۷۶) شرح مواہب لدنیہ — علامہ قسطلانیؒ
(۷۷) شہادۃ الاقوام — حضرت تھانویؒ
(۷۸) شفاء العلیل — ابن القیم الجوزیہؒ
(۷۹) صراط مستقیم — مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ
(۸۰) صاوی شرح جلالین — علامہ صاویؒ
(۸۱) صحیح بخاری — امام بخاریؒ
(۸۲) صحیح مسلم — امام مسلمؒ
(۸۳) طبقات الشافعیۃ الکبریٰ — علامہ تقی الدین السبکی
(۸۴) علوم القرآن — مولانا محمد تقی عثمانی صاحب

(۸۵) علم الکلام — مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
(۸۶) فرشتوں کے عجیب حالات — امداد اللہ انور
(۸۷) فیض القدیر — علامہ محمد عبد الرؤف مناویؒ
(۸۸) فتح الباری شرح صحیح البخاری — حافظ ابن حجر عسقلانیؒ
(۸۹) فتح العلام شرح بلوغ المرام — نواب صدیق حسن خان
(۹۰) قبلہ (انڈونیشیا کا اخبار)
(۹۱) کتاب الفصل بین اہل الاہواء والنحل — ابو محمد ابن حزمؒ م ۴۵۶ھ
(۹۲) کتاب البلدان — ابو بکر احمد بن محمد الہمدانی معروف بہ ابن الفقیہؒ
(۹۳) مؤطا امام مالکؒ — امام مالکؒ
(۹۴) مؤطا امام محمدؒ — امام محمد
(۹۵) مسند امام احمدؒ — امام احمدؒ
(۹۶) مکتوبات مجدد الف ثانی — حضرت مجدد الف ثانیؒ
(۹۷) معارف القرآن — حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ
(۹۸) ماہنامہ نور علی نور — مولانا عبد الرشید انصاری
(۹۹) مشکوٰۃ المصابیح — خطیب تبریزیؒ
(۱۰۰)
(۱۰۱) مقدمہ تفسیر — حضرت مولانا ابو محمد عبد الحق حقانیؒ
(۱۰۲) المسالک والممالک — ابن اسحاق ابراہیم بن محمد الفارسی الاصطخری الکرخیؒ
(۱۰۳) المسالک والممالک — ابو القاسم بن حوقل
(۱۰۴) مراصد الاطلاع علی اسماء الامکنۃ والبقاع — یاقوت حموی
(۱۰۵) مسند ابو یعلی موصلیؒ
(۱۰۶) مستدرک حاکم — امام ابو عبد اللہ الحاکمؒ

(۱۰۷)	مقدمہ ابن خلدونؒ	علامہ ابن خلدونؒ
(۱۰۷)	مثنوی	مولانا رومیؒ
(۱۰۹)	مقدس رسول	مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ
(۱۱۰)	ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور	
(۱۱۱)	ماہنامہ شاداب لاہور	
(۱۱۲)	المصالح العقلیۃ (احکام اسلام عقل کی نظر میں)	حضرت تھانویؒ
(۱۱۳)	نوید جاوید	حضرت مولانا شرف الحق صدیقیؒ
(۱۱۴)	نوویؒ شرح صحیح مسلمؒ	امام نوویؒ
(۱۱۵)	نیل الاوطار	علامہ شوکانیؒ
(۱۱۶)	نور الانوار	ملا احمد جیونؒ
(۱۱۷)	نزہۃ المشتاق فی ذکر الامصار والاقطار والبلدان والجزر والمدائن والآفاق	علوی ادریسی
(۱۱۸)	وعظ مجادلات معدلت دعوات عبدیت	حضرت تھانویؒ
(۱۱۹)	وعظ افناء المحبوب	حضرت تھانویؒ
(۱۲۰)	وعظ ترغیب الاضحیہ	حضرت تھانویؒ
(۱۲۱)	وعظ شرط الایمان	حضرت تھانویؒ
(۱۲۲)	وعظ غایۃ النجاح	حضرت تھانویؒ
(۱۲۳)	وعظ العید والوعید	حضرت تھانویؒ
(۱۲۴)	وعظ روح الحج العج والثج	حضرت تھانویؒ
(۱۲۵)	وعظ تقوم الزیغ	حضرت تھانویؒ
(۱۲۶)	وعظ روح الجوار	حضرت تھانویؒ
(۱۲۷)	وعظ الوقت	حضرت تھانویؒ
(۱۲۸)	وعظ البدائع	حضرت تھانویؒ

(۱۲۹) وعظ الرفع والوضع	حضرت تھانویؒ
(۱۳۰) وعظ محاسن الاسلام	حضرت تھانوی
(۱۳۱) وعظ الحدود والقیود	حضرت تھانویؒ
(۱۳۲) وعظ ذم النسیان	حضرت تھانویؒ
(۱۳۳) وعظ اکمال السعدۃ	حضرت تھانویؒ
(۱۳۴) وعظ الظاہر	حضرت تھانویؒ
(۱۳۵) وعظ الحیاۃ	حضرت تھانوی
(۱۳۶) وعظ ایواء التیامی	حضرت تھانویؒ
(۱۳۷) وعظ تقلیل الکلام	حضرت تھانویؒ
(۱۳۸) وعظ سبیل النجاح	حضرت تھانوی
(۱۳۹) وعظ الشکر	حضرت تھانویؒ
(۱۴۰) وعظ ازالۃ الغفلۃ	حضرت تھانویؒ
(۱۴۱) وعظ شعب الایمان	حضرت تھانویؒ
(۱۴۲) وعظ العفہ	حضرت تھانویؒ
(۱۴۳) وعظ ترجیح الآخرۃ	حضرت تھانویؒ
(۱۴۴) وعظ شعب الایمان	حضرت تھانویؒ
(۱۴۵) وعظ ذکر الموت	حضرت تھانویؒ
(۱۴۶) وعظ نفی الحرج	حضرت تھانویؒ
(۱۴۷) ہفتہ روزہ ندائے ملت لاہور	
(۱۴۸) الہلال	مولانا ابوالکلام آزاد
(۱۴۹) ہدایہ	علامہ مرغینانیؒ

مآخذ کتب عیسائیت

(۱)	استثناء	(بائبل کی کتاب)
(۲)	احبار	(بائبل کی کتاب)
(۳)	اسرائیل کا نبی یا جہان کا منجی	پادری برکت اللہ ایم اے
(۴)	انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا	
(۵)	اسلام۔اے چیلنج ٹو فیتھ	ڈاکٹر جارج ای پوسٹ
(۶)	الف لیلہ کا انگلش ترجمہ از لین	
(۷)	انسائیکلو پیڈیا ببلیکا	
(۸)	ایوب	(بائبل کی کتاب)
(۹)	انجیل متی	(بائبل کی کتاب)
(۱۰)	انجیل مرقس	(بائبل کی کتاب)
(۱۱)	انجیل لوقا	(بائبل کی کتاب)
(۱۲)	انجیل یوحنا	(بائبل کی کتاب)
(۱۳)	پیدائش (سفرِ تکوین)	(بائبل کی کتاب)
(۱۴)	پطرس کا خط	(بائبل کی کتاب)
(۱۵)	تاریخ اخلاق یورپ	مسٹر لیکی
(۱۶)	تاریخ صحف سماوی	نواب علی
(۱۷)	تاریخ محمدی	پادری عماد الدین
(۱۸)	تفسیر بائبل	آدم کلارک

(۱۹)	تاریخ شام	
(۲۰)	تمدن عرب	ڈاکٹر گستاولی
(۲۱)	تفسیر مرقس	پادری جے علی بخش
(۲۲)	تاریخ کلیسا	ولیم میور
(۲۳)	تفسیر عہد جدید	اے ناکس
(۲۴)	تحقیق حق	پادری ایم ایچ فن لے
(۲۵)	تھسلنیکیوں کے نام خط	(بائبل کی کتاب)
(۲۶)	تیمتھیس	(بائبل کی کتاب)
(۲۷)	حیات مسیح	
(۲۸)	حزقی ایل (حزقیال)	(بائبل کی کتاب)
(۲۹)	خروج	(بائبل کی کتاب)
(۳۰)	دیباچہ قرآن	مسٹر راڈویل صاحب
(۳۱)	دی پراسپیکٹر۔ کینیڈا	
(۳۲)	دی فال آف دا آئیڈلز	
(۳۳)	ڈکشنری آف اسلام از ہلیو	
(۳۴)	رسولوں کے اعمال	(بائبل کی کتاب)
(۳۵)	رسولوں کے نقش قدم پر	(بائبل کی کتاب)
(۳۶)	رومیوں کے نام خط	(بائبل کی کتاب)
(۳۷)	زبور	(بائبل کی کتاب)
(۳۸)	زوال مغرب	سپنگلر
(۳۹)	سموئیل اول	(بائبل کی کتاب)
(۴۰)	سموئیل دوم	(بائبل کی کتاب)

(۴۱) سلاطین اول (بائبل کی کتاب)
(۴۲) سلطنت روما کا انحطاط وزوال ڈاکٹر گبن
(۴۳) سیرت محمدیہ لارڈ ولیم
(۴۴) صحت کتب مقدمہ پادری برکت اللہ ایم اے
(۴۵) طریق الاولیاء پادری ولیم اسمتھ
(۴۶) ططس کے نام خط (بائبل کی کتاب)
(۴۷) عبرانیوں (بائبل کی کتاب)
(۴۸) غزل الغزلات (بائبل کی کتاب)
(۴۹) قضاۃ (بائبل کی کتاب)
(۵۰) قدامت واصلیت اناجیل اربعہ پادری برکت اللہ ایم اے
(۵۱) قربت الٰہی پادری والشس
(۵۲) قاموس الکتاب پادری خیر اللہ
(۵۳) کیتھولک پریڈ
(۵۴) کرنتھیوں (بائبل کی کتاب)
(۵۵) گنتی (عدد) (بائبل کی کتاب)
(۵۶) گڈ نیوز بائبل
(۵٦) گوڈ اینڈ ایول ڈاکٹر جوڈ
(۵۸) لوتھرن ویسٹرن ویز آف اسلام
(۵۹) محمد عربی پادری برکت اللہ ایم اے
(٦۰) مرآۃ الصدق پادری تھامس
(٦۱) مکاشفہ یوحنا (بائبل کی کتاب)
(٦۲) میزان الحق پادری فانڈر

(۶۳) نیویارک ٹائمز

(۶۴) نورافشاں — پادری کیلسو

(۶۵) ہارنک۔ایف واٹ — کرسچیانٹی

(۶۶) ہوسیع — (بائبل کی کتاب)

(۶۷) ہدایۃ المسلمین — پادر عمادالدین

(۶۸) یعقوب کا خط — (بائبل کی کتاب)

(۶۹) یسعیاہ (اشعیاء) — (بائبل کی کتاب)

(۷۰) یشوع — (بائبل کی کتاب)

(۷۱) یرمیاہ (ارمیاء) — (بائبل کی کتاب)

(۷۲) Motive رسالہ

(۷۳) Tim. April. 18.1966

(۷۴) Is the bile really the word of god

(۷۵) National observer-January 31-1966

(۷۶) Is the Bible really the word of god.

(۷۷) The agae of melbourne feb 16-1961

(۷۸) Is the Bible quality the word of god.

(۷۹) Ibid

(۸۰) Wand J.W.C. the church to day

(۸۱) God spedaks out on new morality

(۸۲) Clementine Homiles and Recognitions

ماخذ کتب ہندو مت و آریہ دھرم

(۱)	آریہ مسافر	
(۲)	اسگند پوران کاشی کھنڈ	
(۳)	اسگندر پوران	
(۴)	اپنکھد	
(۵)	اسرپ اپنکھد رکھ بید	
(۶)	آریہ مسافر	پنڈت لیکھ رام
(۷)	اُیدیشن منجری	ازمنوجی
(۸)	اتھروید	
(۹)	اتھربن بید	
(۱۰)	بید	
(۱۱)	بھومکا	سوامی دیانند
(۱۲)	بھاگوت	
(۱۳)	تحفۃ الاسلام	بیس برن لالہ اندرمن
(۱۴)	تحریف القرآن	ماسٹر رام چندر
(۱۵)	جوگ بشسٹ	
(۱۶)	ججر بید	
(۱۷)	چھانڈوک اپنکھد شام بید	
(۱۸)	رگ وید	

(۱۹)	رنگیلا رسول	
(۲۰)	ستیارتھ پرکاش	سوامی دیانند
(۲۱)	سوانح عمری کلاں	پنڈت کمل نین جی
(۲۲)	شاستر	
(۲۳)	کلیات آریہ مسافر	
(۲۴)	گیتا	سری کرشن
(۲۵)	مہابھارت	
(۲۶)	مہایگیہ ودھی	سوامی دیانند
(۲۷)	مسیح الدجال	ماسٹر رام چندر
(۲۸)	منوسمرتی	
(۲۹)	منڈوک اپنکھد اتھربن بید	
(۳۰)	وید	
(۳۱)	یجروید	

حوالوں میں ہندی کے مشکل الفاظ کے معانی

	ہندی الفاظ	اردو معانی
(۱)	سانکھ	(حصہ)
(۲)	سانت پرب	(حصہ)
(۳)	اشلک	(حصہ)
(۴)	اشٹاک	(حصہ)
(۵)	اسٹک اول	(حصہ)

(۶) ادھیاء (باب)
(۷) منتر (فقرہ)
(۸) سملاس (فصل)
(۹) انورواک روگ (باب)

کتب منکرین حدیث

(۱) اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (منکر حدیث)
(۲) تفسیر القرآن سر سید احمد خان
(۳) دواسلام غلام جیلانی برق (منکر حدیث جو بعد میں مسلمان ہو گئے)

کتب اہل تشیع

(۱) تفسیر مجمع البیان (شیعہ تفسیر)
(۲) شرح کلینی ملا صادق (شیعہ)
(۳) مصائب النواصب قاضی نور اللہ شوستری (شیعہ)

تراجم عربی کتب

از حضرت مولانا امداد اللہ انور مدظلہ
موبائل نمبر:0300-6351350

آنسوؤں کا سمندر
آثار السنن
الادب المفرد
استغفارات حسن بصریؒ
اکابر کی تمنائیں
اکرام مسلم
اوصاف ولایت
اولیاء کرام کے درود وسلام
اولیاء کرام اور ان کی پہچان
بادشاہوں کے واقعات
پرہیزگاروں کے واقعات
ترجمہ قرآن پاک
ترجمہ القراءۃ الراشدہ
تفسیر ابن عباسؓ
تفسیر مبہمات القرآن
تفسیر عائشۃ الصدیقہؓ
تاریخ جنات وشیاطین
تکمیل ترجمہ اعلاء السنن
جنت البقیع میں مدفون صحابہؓ
جواہر الاحادیث
جہنم کے خوفناک مناظر
حکایات دعا
حل قال بعض الناس
خواص القرآن الکریم
رحمت کے خزانے
رونے والوں سے اللہ کا پیار
سنن دارمی شریف
ساٹھ علوم
سیلاب مغفرت
صحابہ کرامؓ کے جنگی معرکے
عبادت سے ولایت تک
عذاب الٰہی کے واقعات
عشق مجازی کی تباہ کاریاں
علم پر عمل کے تقاضے
فرشتوں کے عجیب حالات
فضائل شادی
فضائل شکر
فضائل صبر
فضائل شہادت
فضائل غربت
فضائل مصائب وامراض
قبر کے عبرتناک مناظر
قیامت کے ہولناک مناظر
کرامات اولیاء
مختصر تفسیر کبیر امام رازیؒ
المیت
منتخب حکایات
مشاہیر علماء اسلام
نفیس پھول

تالیفات حضرت مولانا امداد اللہ انور مدظلہ

آداب زیارت نبوی
آداب الحرمین
اسماء النبی الکریم
اسرار کائنات
اسلاف کے آخری لمحات
اسم اعظم

اکابر کی مجرب دعائیں	اشاریہ بائبل	اکابر کا مقام عبادت
احکام تجارت	احکام عشر	احکام زراعت
امر بالمعروف	برکات رزق	تاریخ علم اکابر
تصاویر مدینہ	تیسیر المنطق (آسان اردو میں)	جنت کے حسین مناظر
الحسنؓ والحسینؓ	حکایات علم وعلماء	خدمت والدین
خشوع نماز	خصوصیات اسلام	دفاع اسلام
دوزخ کے انگارے	دعوت الی اللہ	رکعتین بعد الوتر
زیارت النبی ﷺ	سیدنا علیؓ	سنت وبدعت
سکرات سے قبر تک	شرح اسماء اللہ الحسنٰی	شہسواران اسلام
صحابہ کرامؓ کی دعائیں	الصرف الجمیل	عورت کی سربراہی
فتاویٰ جدید فقہی مسائل	فضائل تلاوت قرآن	فضائل حفظ القرآن
فضائل شب قدر	گنہگاروں کی مغفرت	لذت مناجات
مجموعہ مقالات	محبوب کا حسن وجمال	محدثین صحابہ کرامؓ
مستند نماز حنفی	معارف الاحادیث	معجزات رسول اکرمؐ
تفسير أحكام القرآن	إيصال الثواب في الإسلام	اللواطة و تعزيره
أحاديث حرمة اللواطة	ادعية الصحابةؓ	تراجم مدوني الفقه الحنفي
حد الرجم على المحصن	حكم الدعوات عقيب الصلوات	حكم الرقى و التعويذات
مناجاة الصالحين	كرامات الأولياء	كرامةُ الإنسان
نجاسة المني	نقمة الاغبياء بعصمة الأنبياء	وجوب الأضحية
وجوب التقليد	وراثة الأنبياء	
مسیحی ذرائع تبلیغ وترقی اوران کا سدباب	خوف خدا اور اللہ سے ڈرنے والوں کے واقعات	

حضرت مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم مدرس حرم کعبہ کی کتب

ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم	اسلام میں عورت کا مقام
تفسیر مکی حجازی	قصص الانبیاءؑ
منہاج المسلم	